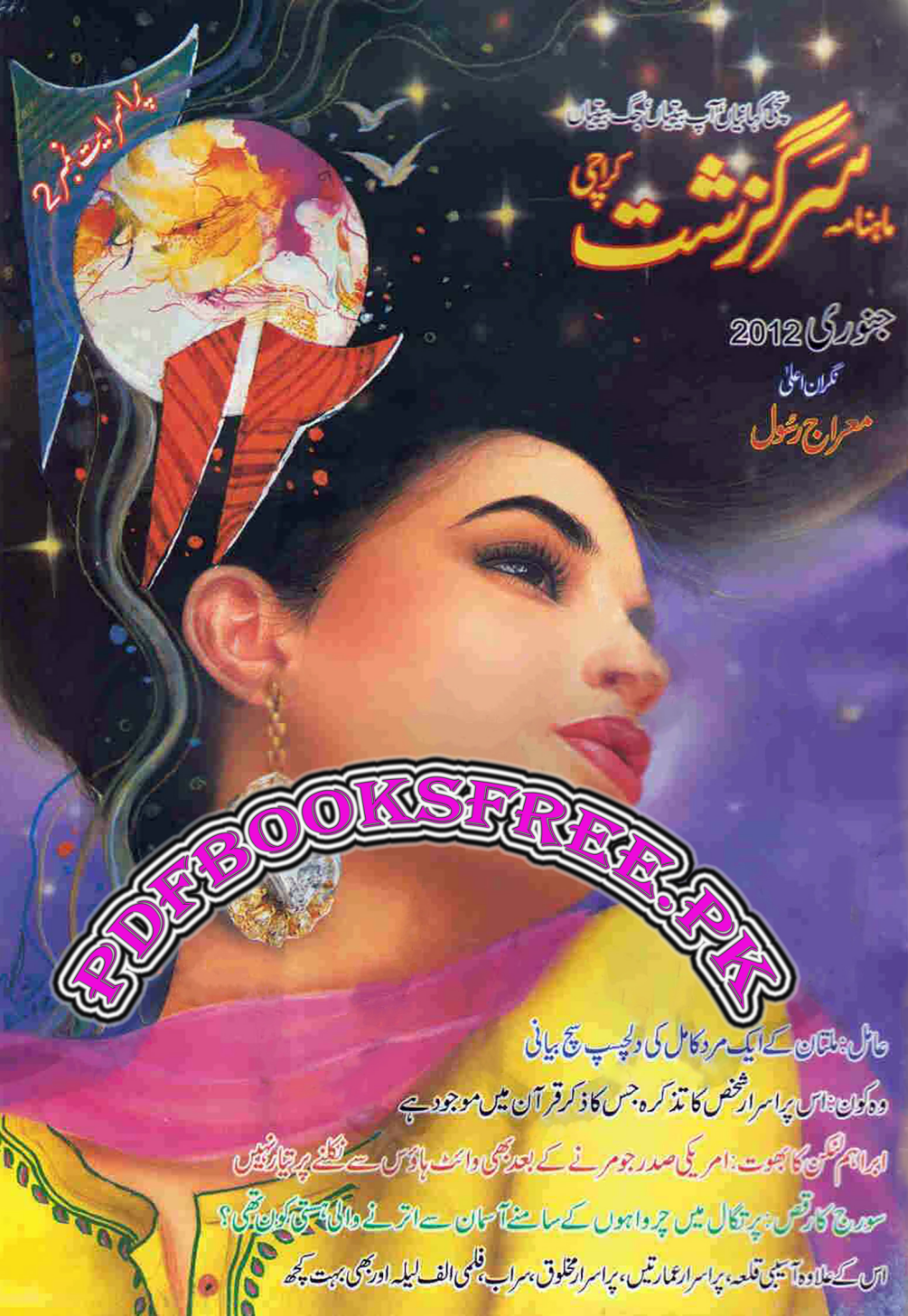

سچی کہانیاں آپ بیتیاں جگ بیتیاں
ماہنامہ
سرگزشت
کراچی
پلاٹینم ایڈیشن نمبر 2
جنوری 2012
نگران اعلیٰ
معراج رسول
PDFBOOKSFREE.PK
عامل: ملتان کے ایک مرد کامل کی دلچسپ سچ بیانی
وہ کون: اس پراسرار شخص کا تذکرہ جس کا ذکر قرآن میں موجود ہے
ابراہام لنکن کا بھوت: امریکی صدر جو مرنے کے بعد بھی وائٹ ہاؤس سے نکلنے پر تیار نہیں
سورج کا رقص: پرتگال میں چرواہوں کے سامنے آسمان سے اترنے والی ہستی کون تھی؟
اس کے علاوہ آسیبی قلعہ، پراسرار عمارتیں، پراسرار مخلوق، سراب، فلمی الف لیلہ اور بھی بہت کچھ

- 15 — سرگزشت — **قاطع سحر** — ادارہ
  ایک صفحہ میں مکمل، مختصر مختصر ایک نادر روزگار کا تعارف
- 16 — گفت و شنید — **شہرِ خیال** — مدیرِ اعلیٰ
  آپ کی باتیں، آپ کے خیال، آپ کے مشورے اور آپ کے سوال
- 24 — پراسرار شخصیت — **وہ کون** — ڈاکٹر ساجد امجد
  اس پراسرار شخص کا تذکرہ جس کا ذکر قرآن میں بھی آیا ہے
- 51 — پراسرار ہستی — **لنکن کا بھوت** — ڈاکٹر روبینہ نفیس
  امریکا کا وہ صدر جو مرنے کے بعد بھی وائٹ ہاؤس سے نکلنے پر تیار نہیں
- 57 — پراسرار سفرکتھا — **آسیبی قلعہ** — ابن کبیر
  راجستھان کے ایک ایسے قلعے کا احوال جس سے حکومتِ ہند خائف ہے
- 77 — پراسرار قصہ — **حیات بعد الموت** — احسان قریشی
  موت کے بعد دوبارہ زندہ ہوجانے والوں کا قصۂ مآل
- 83 — پراسرار تذکرے — **پُراسرار عمارتیں** — نزہت قادری
  دنیا بھر سے چند مشہور آسیب زدہ عمارتوں کا تذکرہ
- 91 — فلم و صحافت — **فلمی الف لیلہ** — علی سفیان آفاقی
  فلم و صحافت کی کہی ان کہی کہانیاں، معروف قلمکار کے حقیقی شب و روز
- 113 — پراسرار واقعات — **محوِ حیرت ہوں** — قارئین
  قارئین کی جانب سے ارسال کردہ تحقیق شدہ دلچسپ مضامین
- 125 — پراسرار علاقہ — **گورکھا مل** — ڈاکٹر عبدالرب بھٹی
  سندھ کا وہ پراسرار علاقہ جہاں ""مم"" نظر آتے ہیں
- 131 — پراسرار ماجرا — **سورج کا رقص** — ذوالفقار ارشد گیلانی
  یورپ کے ایک دور افتادہ علاقے میں نظر آنے والی ہستی کیا بنتِ رسول اللہ تھیں؟
- 147 — پراسرار فن — **کمرشل جادو** — محمد امجد اوسلو
  شعبدہ بازی پر ایک مختصر سا مضمون
- 149 — پراسرار حادثہ — **بدروح** — الف کاف
  دھند بھری رات میں قبرستان کے گیٹ پر وہ کیوں نظر آتی تھی
- 171 — پراسرار معلومات — **پُراسرار مذہب** — مریم کے خان
  ایک ایسا خطرناک مذہب جو کئی ممالک میں خونی انقلاب کا سبب بنا
- 184 — معاشرت — **سراب** — کاشف زبیر
  بلند حوصلوں اور بے مثل ولولوں سے گندھی تہلکہ خیز داستان
- 226 — پہلی پراسرار سچ بیانی — **عامل** — پروفیسر یوسف عطاری
  وہ ایک کروڑ پتی گھرانے کا فرد ہے مگر باطنی طور پر مثلِ ولی ہے
- 241 — دوسری پراسرار سچ بیانی — **جن گزیدہ** — شمیم
  اس لڑکی کی روداد جس پر ایک جن عاشق ہوگیا تھا
- 251 — تیسری پراسرار سچ بیانی — **ایمان فروش** — محمد اکرم چوہدری
  چند روپوں کی خاطر اس نے ایمان کا سودا کرلیا تھا
- 263 — چوتھی پراسرار سچ بیانی — **عذاب کا گڑھا** — محمد سلیم اختر
  شہید کی بیوہ کے ساتھ بدسلوکی کا یہی انجام ہوتا ہے
- 268 — پانچویں پراسرار سچ بیانی — **قبر گزیدہ** — اسلم انصاری
  وہ نوکری کی تلاش میں مردوں کے ہاں پہنچ گیا تھا
- 274 — چھٹی پراسرار سچ بیانی — **بمبئی کے شاہ جی** — انور فرہاد
  انڈین فلمی دنیا کی ایک انتہائی پراسرار ہستی کا تذکرہ
- 277 — ساتویں پراسرار سچ بیانی — **دلدل** — زیبی نور
  گناہوں کی کھیتی کرنے والے مکروہ لوگوں کی کتھا

ماہنامہ سرگزشت میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے جملہ حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں، کسی بھی فرد یا ادارے کے لئے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

● تمام اشتہارات نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کیے جاتے ہیں۔ ادارہ اس معاملے میں کسی بھی طرح ذمے دار نہ ہوگا۔

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بےحرمتی سے محفوظ رکھیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جلد 22 ✿ شمارہ 03 ✿ جنوری 2012ء

ماہنامہ سرگزشت کراچی

مدیرہ اعلیٰ : عذرا رسول

مصور: شاہد حسین

شعبۂ اشتہارات

منیجر اشتہارات محمد شہزاد خان 0333-2256789

نمائندہ کراچی محمد رمضان خان 0333-2168391

رانا محمد حمید 0323-2895528

نمائندہ لاہور فرخ علی بخش 0300-4214400

◈◈◈

قیمت فی پرچہ 50 روپے ✿ زرِ سالانہ 600 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول

مقامِ اشاعت: C-63، فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ، کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن

مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس، ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط کتابت کا پتا ● پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone :35804200 Fax :35802551
E-mail: jdpgroup@hotmail.com

MEMBER APNS CPNE

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قارئین کرام!

السلام علیکم!

ہر طرف عجیب سی پُراسراریت کی دھند ہے کہ ہمارا مستقبل بھی دھندلایا ہوا محسوس ہو رہا ہے۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ اب کیا ہوگا؟ بس ایک لایعنی سی آواز ہے، خطرہ، خطرہ، خطرہ۔

پاکستان کو بھارت سے خطرہ ہے
کابل کی کٹھ پتلی حکومت سے خطرہ ہے
امریکا کی دخل اندازی سے خطرہ ہے
پختونخواہ میں دراندازوں سے خطرہ ہے
بلوچستان کے شورش پسندوں سے خطرہ ہے
پنجاب کے موقع پرستوں سے خطرہ ہے
سندھ کے قوم پرستوں سے خطرہ ہے
فرقہ واریت، لسانیت اور دہشت گردی سے خطرہ ہے۔

گویا ہم خطروں کے ڈھیر پر بیٹھے ہیں۔ 64 سال سے ہم صرف خطروں کی کاشت کر رہے ہیں اور اسے سینچنے والے بھی کم پُراسرار نہیں ہیں۔ دیواروں پر ان کی حمایت میں نعرے ہوتے ہیں۔ اخبارات میں بیانات ہوتے ہیں، ٹی وی پر مذاکرے ہوتے ہیں مگر وہ کون ہیں، انہیں کوئی نہیں پہچانتا، کوئی ان کے نام نہیں لیتا؟ پولیس بھی نامعلوم لکھ کر کیس داخل دفتر کر دیتی ہے۔

ملک و ملت کو کمزور سے کمزور تر کرنے والے یہ کون لوگ ہیں؟ کون ان پُراسرار ہستیوں کی پرورش کر رہا ہے؟ ان اسرار کا جواب کسی کے پاس نہیں ہے، بقول منیر نیازی

منیر اس ملک پر آسیب کا سایہ ہے، کیا ہے
کہ حرکت تیز تر ہے اور سفر آہستہ آہستہ

معراج رسول

قاطع سحر

یہ ایک بڑا اعزاز تھا۔ جئے پال کو راجا پتھوڑا نے بلایا تھا، خصوصی طور پر آنے کی دعوت دی تھی۔ اس وقت وہ ہستینا پور (دہلی) میں تھا۔ خبر سنتے ہی نکل پڑا تھا۔ اس کے ساتھ ساحروں کا ایک جم غفیر تھا۔ ان میں ساکردار بھی تھا۔ اس کا سب سے قابل شاگرد۔ ساکردار کا پردادا ہیم پال کھیما بھی اپنے دور کا بہت بڑا ساحر تھا۔ وہ آریہ ورت (بھارت) کے سب بڑے جامعہ ساحری ''وکرم شیلا و شویدالیہ'' کا پرادھیک (مہتمم) تھا۔ وکرم شہلا و شویدالیہ کی عمارت کو جادو ٹونے کی اعلیٰ تعلیم دینے کی وجہ سے ''انگھ راج'' کے راجا نے حملہ کر کے نذرِ آتش کر دیا تھا۔ (انگھ راج مشرقی بہار و شمالی بنگال تک پھیلا ہوا تھا) وکرم شیلا کی تباہی کے بعد ہیم پال ہستینا پور راج (دہلی) آ گیا۔ یہیں اس کے پوتے ساکردار نے جنم لیا۔ اس نے سحر و ساحری کی کچھ تعلیم دادا سے حاصل کی پھر جئے پال کی شاگردی میں آ گیا کیونکہ ان دنوں پورے آریہ ورت (ہند) میں جئے پال کا طوطی بول رہا تھا۔ اس وقت بھی اس کا کمال سب کی نظروں کے سامنے تھا۔ ایک عجیب شان سے وہ راجا پرتھوی راج چوہان کی راج دھانی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کا انداز کچھ یوں تھا کہ وہ خود ہرن کی کھال پر بیٹھا ہوا تھا اور وہ کھال ہوا میں اُڑتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی اور نیچے شیروں پر سوار اس کے شاگردوں کی فوج تھی۔ سب کے ہاتھوں میں زہریلے سانپوں کا کوڑا تھا۔ سب سے آگے ساکردار تھا جو رہ رہ کر منہ سے آگ کے شعلے نکالتا جو سامنے آنے والی جھاڑیوں کو جلا کر راستہ صاف کر دیتا۔ یہ سب راجا پرتھوی راج چوہان المعروف راجا پتھوڑا کی دعوت پر آ رہے تھے۔ راجا پتھوڑا نے انہیں ایک گروہ سے نمٹنے کے لیے بلایا تھا۔ کچھ ہی دنوں قبل 587 ہجری میں راجا پتھوڑا نے تھانیسر سے چودہ میل دور تراوڑی (ترائن) کے مقام پر مغربی سرحد سے آ جانے والے سلطان شہاب الدین کو شکست دے کر واپسی پر مجبور کر دیا تھا۔ اب سلطان کے ہی دھرم کے کچھ صوفی اس کے راج میں آ گئے تھے۔ انہوں نے اس کے جانوروں کی چراگاہ میں ڈیرا ڈالا جب انہیں وہاں سے بھگایا گیا تو انہوں نے بددعا دے دی کہ یہاں انسان نہیں اونٹ بیٹھ سکتے ہیں تو اب وہی بیٹھیں، اس بددعا کے اثر سے تمام اونٹ بیٹھے کے بیٹھے رہ گئے۔ جب ساربانوں نے معافی مانگی تب جا کر اونٹ اُٹھے تھے پھر اس گروہ نے وہاں سے دہلی علاقے ''اناساگر'' میں ڈیرا ڈال دیا۔ اناساگر میں شاہی مندر تھا جہاں لوگ پوجا پاٹھ کے لیے جاتے تھے۔ پوجا کو آنے والے اس گروہ میں شامل صوفیوں کی باتوں میں آ کر پوجا پاٹھ سے تائب ہو کر اَن دیکھے خدا پر ایمان لانے لگے تھے اسی لیے راجا نے جئے پال کو بلایا تھا کہ وہ جادو کے زور پر ان لوگوں کو بھگا دے۔ جئے پال شاگردوں کی فوج کے ساتھ شہر میں داخل ہوا تو مقامی افراد خوش ہو گئے۔ سب نے سمجھ لیا تھا کہ دور دیش سے آنے والے ان ''درویشوں کے گروہ'' کی اب خیر نہیں۔ اس گروہ کے سربراہ نے اپنے ساتھیوں کے گرد حصار کھینچا اور مطمئن ہو کر بیٹھ گیا۔ سب سے پہلے جئے پال نے ان کو کچلنے کے لیے جادو کے زور پر ایک بڑی سی چٹان ان پر پھینکی جسے سربراہ نے اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے ہاتھ کے اشارے سے ہوا میں روک دیا (وہ چٹان آج بھی زمین سے ایک ہاتھ اوپر ہوا میں معلق ہے۔ اناساگر جانے والے اس عجیب نظارے کو دیکھ کر دنگ رہ جاتے ہیں) اس نے پے در پے بہت سارے حربے آزمائے، کبھی انگارے برسائے، کبھی سانپوں کا جتھا مگر وہ سب حصار تک پہنچتے ہی غائب ہو جاتے۔ حصار سے بس ایک ہی آواز آتی ''ابھی بھی وقت ہے، ہم درویشوں کی عبادت میں خلل مت ڈالو، کفر ترک کر کے دائرہ اسلام میں آ جاؤ۔'' مگر جئے پال کچھ سننے پر تیار نہ تھا۔ وہ غصے میں اُچھلا اور کسی پرندے کی طرح ہوا میں پرواز کرتا ہوا حصار کے اوپر پہنچا، تبھی حصار میں بیٹھے سربراہ نے اپنی کھڑاؤں (نعلین) اُتاری اور اسے پھینک ماری۔ اب ہوا میں ایک نئی جنگ شروع ہو گئی۔ جئے پال غوطے لگا لگا کر بچنے کی کوشش کرتا اور وہ کھڑاؤں تاک تاک کر اس کی گنجی کھوپڑی پر برستی۔ کچھ ہی دیر میں وہ نڈھال ہو گیا اور حصار میں بیٹھے سربراہ کے قدموں میں آ گرا۔ معافی مانگتے ہوئے اس نے اسلام قبول کر لیا پھر ریاضت اور مجاہدے نے اس کا مقام اتنا بلند کر دیا کہ وہ عبداللہ بیابانی کے نام سے پہچانا جانے لگا۔

عبداللہ بیابانی حضرت معین الدین چشتیؒ کے خلفا میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ شادی دیو نامی غلام چشتی ہی ساکردار ہیں، جن کا مزار تارا گڑھ پہاڑ پر موجود ہے۔ اور اس گروہ صوفیا کے سردار حضرت معین الدین چشتیؒ تھے جن کی کرامات کی وجہ سے پورا شہر مشرف بہ اسلام ہوا تھا۔

☆☆☆

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شہرِ خیال

✉ **خالد کبیر کا مکتوبِ خاص، لاہور سے** ”قارئین کرام! آپ کی خدمت میں سال 2011ء کی سالانہ رپورٹ مع حاضری رجسٹر پیش کرتا ہوں، سال 2011ء کے دوران جنوری تا دسمبر مختصر تعارف المعروف یک صفحی سرگزشت کچھ اس طرح رہی، غلام جیلانی برق، یاس یگانہ چنگیزی، فیض احمد فیض، شیخ عبداللہ، مولانا ظفر علی خان، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، فیثا غورث، ستیہ نرائن راجو چارتھی، مولانا مظہر الدین، تالیس، دمقراط اور ابوالعلا المعری، اس کی کچھ اس طرح تقسیم ہوئی۔ ادب، 6۔ سائنس، 3۔ سیاست، 2۔ شعبدہ باز، 1۔ اب سرورق کی سرگزشت کی طرف آتے ہیں۔ جو بالترتیب اس طرح سے تھیں، سید امیر علی، لیلیٰ مجنوں، احمد شاہ ابدالی، مہدی حسن، صلاح الدین ایوبی، ابوالفضل صدیقی، ابن رشد، ابن مقنع، مہاراجا رنجیت سنگھ، چارلی چپلن، سید احمد علی اور مولانا اشرف علی تھانوی۔ ان میں طویل ترین حالات زندگی مہاراجا رنجیت سنگھ کے جو کہ 32 صفحات پر مشتمل تھے اور نسبتاً کم یعنی 22 صفحات پر مولانا اشرف علی تھانوی کی سوانح عمری شائع ہوئی۔ اوسطاً 30 صفحات ہر سرورق سرگزشت پر لکھے گئے اور حسبِ معمول جناب ڈاکٹر ساجد امجد صاحب نے سب سے زیادہ حصہ ڈالا یعنی سوانح عمریاں 10 تحریر کیں۔ جبکہ ذوالفقار ارشد گیلانی، رضا کرار صاحبان نے ایک ایک سرگزشت لکھی۔ اب رنگا رنگ خطوط سے آراستہ شہرِ خیال کا احوال معلوم کرتے ہیں۔ اس سال کا خاص نمبر پراسراریت نمبر تھا جب سے ادارے کی طرف سے اس نمبر کا اعلان ہوا تب سے قارئین کا تجسس بھی بڑھ گیا خود اعلان ہی اتنا پراسرار اور پرکشش تھا۔ میری ذاتی رائے میں ایک بہترین نمبر تھا جو مزہ دے گیا۔ (پراسراریت نمبر 2، پہلے نمبر سے زیادہ اثر دار ہے) ادارہ سرگزشت خاص نمبر کو جاری رکھنے کی روایت جاری رکھے اور ہر سال کم از کم ایک نمبر کسی موضوع پر ضرور شائع کرے۔ (انشاء اللہ بہت جلد ایک اور منفرد خاص نمبر کا اعلان کیا جائے گا) جنوری میں شائع ہونے والے نمبر کو اگلے سال کے کوٹے میں نہ لائے۔ شہرِ خیال کی حاضری رجسٹر پر نگاہ ڈالتے ہیں کہ کن کن کا نیا داخلہ ہوا ہے اور کون کون غیر حاضر رہا ہے؟ گزشتہ سال کے اعجاز حسین سہتار جو تعداد کے لحاظ سے اول رہنے والے تھے، انہوں نے اس سال بھی اپنی رفتار کم نہ کی یعنی 11 خطوط لکھے اور ان کے ساتھ ایم اے خالق بھٹی، ملک جاوید محمد خان سرکانی درانی، سدرہ بانو ناگوری بھی اسی رفتار میں رہیں۔ آپ تمام کو بہت بہت مبارک۔ دیگر نمایاں لکھنے والوں میں راجا ثاقب نواز ثاقب، سعید احمد چانداور طاہر الدین بیگ، افتخار احمد گھمن، رانا محمد سجاد، احمد خان توحیدی، بشیر احمد بھٹی، الف جیم صدیقی، اکبر بیگ، رانا محمد شاہد علی وفا بروہی، سلطان مسعود رہے۔ شہرِ خیال کے پرانے ساتھی ناصر حسین رند کم آئے لیکن تبصرے خوب لکھے۔ سال 2011ء کا بہترین خطوط لکھنے والے میری رائے میں اعجاز حسین سہتار رہے۔ آپ کو عمر کی سعادت بھی نصیب ہوئی، مبارک ہو۔ مرد اور خواتین کی تعداد کا تناسب بالترتیب 85% اور 15% رہا۔ گزشتہ چند سالوں میں خواتین کی شمولیت کا گراف نیچے گر رہا ہے۔ (خواتین کے لیے لمحہ فکریہ) اگرچہ سالِ گزشتہ کی نسبت اس سال خواتین کی تعداد میں معمولی اضافہ ہوا ہے لیکن پھر بھی شہرِ خیال میں تعداد کم نظر آئی، خواتین میں بہترین لکھنے والی سدرہ بانو ناگوری صاحبہ رہیں۔ اس عمر میں ایسا علمی اور ادبی شوق قابلِ رشک ہے اور مونا گل بھی نمایاں رہیں۔ اب ذرا غیر حاضر و کم آنے والے احباب کا ذکر ہو جائے۔ انور اعجاز خان (ان کی خیریت مطلوب ہے) ذوالفقار انجم اوسلو ناروے، یونس بلوچ، رانا ادیب، ابنِ مقبول صدیقی، شان احمد گشکوری، سید محمد عظیم شاہ بخاری، ثمینہ کوثر لطیف، روبینہ ثاقب انصاری، ماریہ عرفان، نور، بشریٰ افضل، ملیکہ رانی اور انتساب عباس اس سال کم ہی نظر آئے۔ بیت بازی بھی خوب رہی۔ شہرِ خیال کے ہی باسی یہاں نظر آئے لیکن دوسرے قارئین بھی موجود رہے جن میں حسنین عباس بلوچ، نوشین ناز، مہوش رضا، پروین صبا، نصرت شاہین، ایرج گل، عفت زریں، طٰہٰ یاسین نمایاں رہے۔ اب علمی آزمائش کی طرف آتے ہیں۔ جس میں چند سطر پر مشتمل کسی مشہور شخصیت کا خاکہ دیا جاتا ہے۔ یہاں قارئین کی بہت بڑی تعداد اس کا درست جواب دیتی ہے مگر پانچ خوش نصیب بذریعہ قرعہ اندازی انعام کے حق دار پاتے ہیں۔ اوسطاً 300 قارئین درست جواب ارسال کر رہے ہیں۔ حصہ لینے والوں میں کراچی تا خیبر کے قارئین ہیں۔ دیارِ غیر والے بھی پیچھے نہیں رہے اگرچہ ان کی تعداد قلیل ہے۔ سراب بھی قسط وار شائع ہو رہا ہے۔ سراب کی قسط تقریباً 40 صفحات پر ہوتی ہے جو سرگزشت میں شامل دیگر تمام مضامین سے طویل ہوتی ہے کیا اس کے صفحات کم کر کے دیگر مضامین کے لیے جگہ نہیں دی جاسکتی؟ اب ماہ بہ ماہ جائزہ لیتے ہیں۔ جنوری کے مہینے میں زلفی شاہ سالٹ رینج کی سیر کروا رہے تھے۔ اسی ماہ اسکائی اسکریپر پر مضمون آیا۔ گریم برادرز کا تعارف بھی ہوا۔ آفاقی صاحب فلمی الف لیلہ کی 192 ویں قسط کے ساتھ حاضر تھے۔ سولہ سال سے مستقل مزاجی سے لکھ رہے ہیں اور فلمی صنعت کے بارے میں نہایت مفید معلومات پہنچا رہے ہیں۔ جاپان کی سیر الطاف شیخ کے ہمراہ ہوئی۔ ماہ فروری میں خوش قلم میں علم

[illegible] پر [illegible] معلوماتی مضمون تھا۔ وکی لیکس جس کا اس سال بہت چرچا ہوا، اس کے بانی جولین اسانج کی زندگی پر بات ہوئی۔ جاپان کی سیر بھی [illegible] کا مضمون بھی آیا۔ مارچ میں نوبل انعام یافتہ مصری ادیب نجیب محفوظ کے حالاتِ زندگی شائع ہوئے۔ گیلانی صاحب تاج محل کی [illegible] کے ساتھ آئے۔ جاپان کی سیر جاری رہی، شیرنیوں کا قاتل بھی مارچ میں آئیں، اپریل میں فنکارہ گلوکارہ گوہر جان کے حالات زندگی [illegible] ملے، طاعون جسے کالی موت بھی کہا جاتا ہے، اس پر مضمون آیا۔ ناصر کاظمی کی یاد آئی۔ نیویارک کا بادشاہ بھی آیا۔ مئی میں جہنم کدہ، جاپان [illegible] پر مضمون تھا۔ اٹلی کا پیسا ٹاور پر بعنوان محفوظ عجوبہ، مریم کے خان نے لکھا۔ استاد توکل حسین کے گوشۂ زندگی سے پردہ اٹھا۔ بے چین روح [illegible] روسی نامور ادیب دوستوفسکی کے حالاتِ زندگی پر بات ہوئی۔ راکٹ مسلمانوں کی ایجاد معلوماتی مضمون تھا۔ جون کے شمارے میں فیس بک کے جواں سال بانی کے حالاتِ زندگی بھی معلوم ہوئے۔ مریم کے خان اپنا خاص مضمون سفر کا سفر لے کر آئیں۔ پاکستان کے نامور اداکار معین اختر جن کو مرحوم لکھتے ہوئے نہ دل نہ ہاتھ بالکل ساتھ نہیں دیتے، ان کی فنی زندگی پر روشنی پڑی۔ زلفی شاہ کے ہمراہ قلعۂ روہتاس کی سیر بھی خوب رہی۔ اپنی نوعیت کا خاص مضمون اوشینا کی دریافت بھی اسی ماہ شامل رہا۔ جولائی میں نانگا پربت جو قاتل پہاڑ کہلاتا ہے، اس پر آصف ملک نے خوب لکھا۔ سیر پاکستان میں اٹک برج پر بھی مضمون آیا۔ مریم کے خان کیمیائی ہتھیار لے کر آئیں۔ ابن کبیر نے ڈریکولا پر تاریخی معلوماتی مضمون لکھا۔ جل پری، ٹائیگر، ڈولفن بھی اسی شمارے کی زینت بنے۔ اب آتے ہیں اس سال کے خاص شمارے یعنی پراسراریت نمبر کی جانب۔ یہ واقعی ایک خاص نمبر تھا جو ماہ اگست میں شائع ہوا۔ اس میں شامل تمام مضامین لاجواب، تحقیقی تھے۔ اس شمارے میں پراسرار شخصیات، مقامات اور واقعات کے بارے میں لکھا گیا۔ مایا تہذیب کے کلینڈر کے بارے میں 21 دسمبر 2012ء پر لکھا گیا۔ اہراموں کے اسرار پر سے مریم کے خان پردہ اٹھا رہی تھیں۔ گمشدہ سلطنت یعنی اٹلانٹس پر بھی معلوماتی مضمون آیا۔ پیش گو میں ناسٹر ڈیمس کے حالاتِ زندگی اور اس کی پیش گوئیوں کے بارے میں لکھا گیا۔ جاپانی جوگی، ناسکا لکیریں، برموداٹکون، ڈیوڈ کاپر فیلڈ بھی اس شمارے کے خاص مضامین تھے۔ قارئین نے دل کھول کر داد دی۔ ستمبر میں فیلڈ مارشل ایوب خان پر خاص مضمون تھا۔ ایپل کمپیوٹر کے بانی اسٹیو جابس جو طلسماتی شخصیت کے طور پر جانے جاتے تھے، جو 5 اکتوبر کو اس دنیا سے [illegible]، ان پر مضمون آیا۔ الطاف شیخ کے ہمراہ اسٹیو جابس کے دیس یعنی امریکا کی سیر بھی ہوئی۔ روانڈا کے قتلِ عام کی دلخراش داستان پڑھی۔ [illegible] منفرد مصور گل جی کے بارے میں پڑھا۔ زلفی شاہ کراچی ٹرام وے کا قصہ سنا رہے تھے۔ نہ معلوم ایسے اور کتنے قصے ہمیں پڑھنے کو [illegible] بھی اپنی نوعیت کی منفرد شکار کتھا تھی جب شکار کرنے والا خود شکار ہو جاتا ہے۔ جب مردہ وہیل کے پیٹ سے زندہ شارک نکل آتی [illegible] میں راکھ کا آسیب میں آتش فشاں سے نکلتی ہوئی راکھ جس نے یورپ کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا اس کے سامنے جدید دنیا بھی بے بس [illegible] دی، پر اچھا مضمون تھا۔ سملی ڈیم کا زلفی شاہ نے اچھا تعارف کروایا۔ جگجیت سنگھ کی مختصر داستان بھی سننے کو ملی۔ بھینسے کتنے خطرناک ہوتے ہیں، [illegible] میں پڑھا۔ امریکا کا سفر بھی جاری رہا۔ دور کے ڈھول سہانے والی بات ہے۔ یہ صرف پردیس جا کر ہی معلوم ہوتا ہے۔ کس محنت سے [illegible] ہیں، یہ اور بات کہ ہمارے حکمرانوں کو بڑی آرام سے یہاں ہی مل جاتے ہیں۔ آخر میں دسمبر کے شمارے پر بات ہو جائے۔ اس ماہ مولانا اشرف علی تھانوی کی حیات کے بارے میں پڑھا۔ پہلے وقتوں میں کئی گھرانے اپنی بیٹیوں کے جہیز میں مولانا کی مشہور تصنیف بہشتی زیور دیا کرتے تھے۔ آج کی نسل کو تو اس کا پتا بھی نہیں۔ تھانوی صاحب بحث و مباحث سے گریز کیا کرتے تھے۔ ساری توجہ راہِ حق کے طالبوں کی ذاتی تربیت پر صرف کرتے۔ صحارا کے باغیوں کے بارے میں پڑھا۔ صحرائے صحارا کے رسوم و رواج پر بھی بات ہوئی۔ وہاں کے لوگ نسل در نسل اپنے حقوق کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ وہاں کے شدید موسمی حالات کا تصور بھی کرنا مشکل ہے۔ مشہور و معروف فلمی گانوں کے شاعر خواجہ پرویز کی حالاتِ زندگی کے بارے میں معلوم ہوا۔ افسوس کہ پاکستانی فلمی انڈسٹری کے زوال کی وجہ سے ایسے عظیم لوگ بھی ہماری یادوں سے محو ہو جائیں گے۔ اس ماہ کا خاص الخاص مضمون کولمبس ہی کیوں تھا۔ جس میں مریم کے خان بہت ہی چشم کشا تاریخی معلومات لے کر آئیں۔ جس میں تاریخی واقعات کو پڑھ کر ان سے نتائج نکالنے کی صلاحیت کو اجاگر کیا گیا۔ ایسے مضامین آنے چاہئیں۔ سندھ کا ورثہ بھی اچھا تحقیقی مضمون تھا۔ فلمی الف لیلہ میں مغلیہ دورِ حکومت پر ہندوستان اور پاکستان میں بننے والی فلموں پر بحث ہوئی۔ رنگ محل جو کہ لاہور کا معروف ترین بازار ہے اس کے بارے میں بتایا گیا۔“

✉ **سید محمد عظیم شاہ بخاری، خان پور کٹورہ سے لکھتے ہیں** ”دسمبر کے شمارے پر نظر پڑی تو ٹائٹل نے جھٹ بھانڈا پھوڑ دیا کہ اس بار سچ بیانی [illegible] متعلق ہوگی اور ہوا بھی یہی۔ نئے سال کی آمد آمد ہے اور سردیاں بھی عروج پر۔ ایسے میں رات کو کمبل اوڑھ کر چائے کے ساتھ سرگزشت کا لطف ہی اور ہے (بالکل درست فرمایا) یک صفحی سرگزشت کی شخصیت میرے لیے واقعی نئی تھی۔ عجیب سا خوشگوار احساس ہوا یہ دیکھ کر کہ شہرِ خیال کی رونق دن بہ دن بڑھتی جا رہی ہے، ماشاء اللہ۔ تبصرے کا آغاز کرتے ہیں سچ بیانیوں سے۔ پہلی سچ بیانی اچھی تھی مگر اتنی مزے دار نہ تھی کہ اسے [illegible] کیونکہ اس بار باقی سچ بیانیاں بازی لے گئیں۔ پہلے نمبر کی حق دار میری نظر میں ”تلافی“ رہی جس میں زندگی کی حقیقتوں سے روشناس کرایا گیا۔ [illegible] جو کیا گو وہ انجانے میں کیا مگر اسے ایسے کسی کی باتوں پر بغیر تحقیق کیے کان نہیں دھرنے چاہیے تھے۔ اگر وہ اپنی دشمن نما دوست کی باتوں کی ذرا سی تحقیق کرتی تو شاید اپنے باپ کو نہ کھوتی۔ ”شکستِ شبِ تار“ رہی دوسرے نمبر پر۔ شہریار جیسے امیر اور عیش پرست نوجوان سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اتنی بہادری کی توقع نہ تھی۔ بہرحال اس نے اپنی ماں کو اپنی آستین کے سانپ چچا سے بچالیا۔ ''خون کا اثر'' رہی تیسرے نمبر پر۔ اس کہانی نے ذاتی طور پر مجھے دکھی کیا ہے۔ نہ جانے اس قوم کے بھولے بھالے لوگ کب تک جعلی عاملوں اور پیروں کے چکر میں پھنسے رہیں گے۔ ستم تو یہ کہ ہمارے کئی اخبارات ورسائل میں اس تواتر اور دھڑلے سے ان کے اشتہارات نظر آتے ہیں کہ ماتم کرنے کو دل چاہتا ہے۔ نوراں کو چاہیے تھا کہ وہ پیر کو کالے بکرے دینے کے بجائے اپنے شوہر کا علاج کراتی اور خدا پر بھروسا کرتی۔ ''تحریر شناس'' بھی ایک اچھی کہانی تھی۔ ''بیٹا برائے فروخت'' آج کے معاشرے کے اکثر لوگوں کے ذہنوں کی عکاسی کرتی نظر آئی۔ یعنی اولاد نہ ہوئی، لاٹری کا ٹکٹ ہوگیا۔ ''ریگستان میں پھول'' اور ''مکافاتِ عمل'' اچھی رہیں۔ ''سندھ کا ورثہ'' نے وہ مزہ نہ دیا جس کی توقع تھی۔ زلفی انکل کی کیا بات ہے۔ آجائیں انکل، میں آپ کا انتظار کروں گا جنوری کے شمارے میں۔ ''کولمبس ہی کیوں'' واقعی ایک نئی سوچ سوچنے پر مجبور کردینے والا مضمون تھا۔ محمد عفان نے اس بار کمال مہارت سے افریقی ملک نائیجر کے توارگی قبائل کے مسائل اجاگر کیے۔ ''باغی کمانڈرز'' ایک اعلیٰ درجے کا معلوماتی مضمون تھا۔ ہر بغاوت طاقت اور فوج سے نہیں کچلی جاتی جیسا کہ ہمارے وطنِ عزیز میں کیا جاتا ہے۔ آفاقی انکل، آپ چھا گئے۔ فلمی الف لیلہ اس بار کمال کی تھی۔ مغلوں کے متعلق فلمی معلومات اچھی تھیں لیکن سب سے اچھے تھے انکل کے بھارتی ثقافتی یلغار کے متعلق خیالات۔ انکل نے سچ کہا ''جو کام فوجیں نہیں کرسکتیں، وہ فلمیں کررہی ہیں۔'' کشمیر پر پاکستان کے خلاف بھارتی فلموں نے پوری دنیا کو اپنی طرف کرلیا۔ مسلمانوں کو بسنت منانے پر مجبور کردیا۔ ان کی خالص اردو میں ہندی کی ملاوٹ کردی۔ یہ کام فوجیں نہیں کرسکتی تھیں۔ ان کے پہناوے کو کلائی سے کندھے اور ٹخنے سے گھٹنوں تک یہ فلمیں لے آئیں۔ اور اب یہ حال ہے کہ کوئی بھی بھارتی اداکار یا سیاست داں ہمارے ملک سے ہوکر جاتا ہے تو بھارت جاکر یہی کہتا نظر آتا ہے کہ سرحد پار بھی ویسے ہی لوگ اور ماحول ہے جیسا یہاں بھارت میں ہے۔ نہ جی، ہمارا تو سب کچھ بھارتیوں سے مختلف تھا جب واقعی سرحدوں کے آرپار ایک ہی قسم کے لوگ اور ماحول ہوگا تو پھر سرحد کی کیا ضرورت رہ جائے گی؟ حکومت کو چاہیے کہ ایک تو پاکستان میں بھارتی چینلز پر پابندی لگائے دوسرا بھارتی فلموں کی نمائش روکنی چاہیے۔ آفاقی انکل نے سچ لکھا ہے کہ بھارتی فلم ساز دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونک رہے ہیں۔ دنیا کے غریب ترین ملک (بھارت میں خطِ غربت سے نیچے زندگی گزارنے والے لوگ ایتھوپیا اور صومالیہ سے بھی زیادہ ہیں) میری پاکستان کے لوگوں سے گزارش ہے کہ بھارتی ڈراموں اور فلموں پر نہ صرف بندش کا مطالبہ کریں بلکہ ان کے کلچر، رہن سہن اور زبان سے متعلق کسی بھی چیز کی چھاپ اپنے بچوں پر نہ پڑنے دیں۔ اس کے بجائے اپنے کلچر کو پروموٹ کریں۔ اپنے ڈرامے دیکھیں، پاکستانی ڈراما انڈسٹری بہت اعلیٰ جارہی ہے اور آہستہ آہستہ نوجوان نسل کو اپنی جانب متوجہ کرنے میں کامیاب رہی ہے۔ اداریہ بہت اچھا تھا مگر دسمبر کے ساتھ منحوس مہینا لکھا دیکھ کر بہت افسوس ہوا کیونکہ یہ میری پیدائش کا مہینا ہے۔ مہینا یا سال کوئی منحوس نہیں ہوتا۔ اگر دسمبر میں بُرے واقعات پیش آئے ہیں تو کئی اچھے واقعات بھی تو ہوئے ہیں۔ ہاں سقوطِ ڈھاکا ایک سانحہ ہوا مگر ہمارے ملک میں تو ہر مہینے بلکہ ہر ہفتے کوئی نہ کوئی سانحہ ہوتا ہے۔ اسی لیے کسی واقعے کو کسی دن یا مہینے سے منسوب کرکے اسے منحوس نہیں گردانا جاسکتا۔ اسلام بھی یہی کہتا ہے کہ کوئی دن، کوئی ماہ برا نہیں۔'' (آپ نے درست فرمایا، ہمارا مقصد بھی مہینے کو برا کہنا نہیں بلکہ اس ماہ رونما ہونے والے واقعے کی طرف توجہ مبذول کروانا تھا۔ آپ کو جو تکلیف پہنچی، اس پر ہم معذرت خواہ ہیں)

✉ ملک محمد جاوید سرکانی درانی، چھچھ سے رقم طراز ہیں ''اس ماہ کا اداریہ مسلمانوں کی بے اتفاقی اور ملی انتشار کی تاریخ کا مختصر خلاصہ تھا، دعا ہے کہ ملتِ اسلامیہ اس روش کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کی رسی کو پھر سے پکڑ لے (آمین) بینا نابینا کے عنوان سے ابوالعلاء مصری کی یک صفحی سوانح شائع کی گئی۔ ابوالعلا مصری بلاشبہ ایک نابغہ شخصیت تھا مگر صد افسوس کہ گمراہی کا شکار ہوگیا۔ وہ اپنے اشعار میں اسلامی عقائد اور فقہی مسائل پر اعتراض کرتا تھا مثلاً وہ کہتا تھا کہ وہ انسانی ہاتھ جس کی دیت پانچ سو دینار سرخ ہے، محض نصف دینار کی چوری میں نہیں کٹنا چاہیے۔ وہ یہ نہ سمجھ سکا کہ پانچ سو دینار سے کم کی چوری پر ہاتھ نہ کٹے تو چوری عام ہوجائے اور دیت اگر معمولی رقم ہو تو لوگ اپنے دشمنوں کے ہاتھ ہی کاٹ لیا کریں۔ مصری کے علاوہ بھی بہت سارے نابینا صاحب علم وکمال گزرے ہیں کہ دیدہ ور کاملین بھی جن پر رشک کرتے ہیں جن میں سے کچھ نام یہ ہیں۔ قتادہ بن دعامہ، محمد بن حازم، بشار بن برد، شافع بن علی عسقلانی، علی بن احمد آمدی، ابوالبقا عکبری، عبدالرحمان اندلسی، موئل کوفی، ابوالعینا اور مشہور نابینا صحابی رسول حضرت عبداللہ بن ام مکتومؓ کا تو یہ مرتبہ تھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جب کوئی سفر درپیش آتا تو ان کو اپنا نائب مقرر فرماتے۔ ویسے ایک تجویز ہے کہ پراسراریت نمبر کی طرح اگر نابینائی نمبر شائع کیا جائے تو اپنے موضوع کے لحاظ سے ایک بہت بڑے تحقیقی کارنامے کی حیثیت رکھے گا۔ (آپ کا مشورہ قابلِ غور ہے، نوٹ کرلیا) شہر خیال میں داخل ہونے کے بعد سب سے پہلے اعجاز سٹھار صاحب کو منانا ہے، بھائی صاحب آپ تو ذرا سی تنقید سے روٹھ گئے۔ ہمارا مطلب تو یہ تھا کہ بجائے ادھر اُدھر کی باتوں کے رسالے پر تبصرہ ہونا چاہیے۔ پھر بھی سو سو معافی۔ رانا سجاد، سعید احمد چاند اور عبدالخالق بھٹی صاحب تبصرہ پسند کرنے پر شکریہ۔ حسنین عباس بلوچ بیت بازی کی محفل سے ہوتے ہوئے شہر خیال میں آگئے۔ خوش آمدید، اگر آپ کے ساتھی گوندل صاحب بے قصور ہیں تو اللہ تعالیٰ کی مدد انہیں ضرور حاصل ہوگی۔ سعید چاند، سدرہ ناگوری، طاہر الدین بیگ، عزیز میرٹھی، شاہد عالم، راجا ثاقب اور سٹھار صاحب کے تبصرے بہترین رہے۔ عبدالخالق بھٹی نے تو بس حاضری

کی رسم ادا کی۔ ڈاکٹر روبی اللہ تعالیٰ آپ کو صحتِ کاملہ عطا فرمائے۔ ڈاکٹر ساجد امجد مولانا تھانوی کی داستانِ حیات لے کر آئے۔ اب ان پر لازم ہے کہ مولانا احمد رضا خان اور مولانا احسان الٰہی ظہیر وغیرہ کی سوانح حیات بھی تحریر فرمائیں تاکہ دیگر مسالک کا بھی حق ادا ہوجائے۔ محمد عفان، طارق عزیز خان، انور فرہاد، سعید ظفر یوسفی، الطاف شیخ، مریم کے خان اور علی سفیان آفاقی بھی اپنی بہترین نگارشات کے ساتھ موجود تھے۔''

✉ جویریہ قاضی، منظفر گڑھ کا خلوص نامہ ''سرورق سے ہوتے ہوئے شہر خیال میں پہنچے جو اعلیٰ درجے کے خیالات رکھنے والوں کی آماجگاہ ہے۔ رانا محمد سجاد، راجا ثاقب نواز ثاقب، سعید احمد چاند، سدرہ بانو ناگوری اور اعجاز حسین سٹھار کے تبصرے قابلِ تحسین تھے۔ باقی سب کے تبصرے بھی اچھے تھے۔ ''چراغِ فروزاں'' بہت اچھی کاوش تھی۔ مولانا اشرف علی تھانوی کی سرگزشت ایمان افروز تھی۔ آپ سے گزارش ہے کہ اولیائے کرام اور دوسرے جید علما کے بارے میں تفصیلی معلومات بہم پہنچاتے رہا کریں۔ ہوسکتا ہے کہ آپ کا یہ عملِ خدا کے ہاں مقبول ہوجائے۔ ''باغی کمانڈرز'' ایک معلومات افزا اور پراثر تحریر تھی۔ توارگی قبائل کے بارے میں جاننا ایک دلچسپ تجربہ تھا۔ ''فلمی الف لیلہ'' کی چکاچوند وقت گزرنے کے ساتھ اور بڑھتی جارہی ہے۔ اس دفعہ انہوں نے ہمیں دوسری بہت سی معلومات کے ساتھ ساغر صدیقی کے بارے میں بہت کچھ بتایا۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ ''کولمبس ہی کیوں'' ایک تحقیقی تحریر تھی۔ اس تحریر نے بہت سے پوشیدہ رازوں سے پردہ اٹھایا۔ یہ سارا فساد اسی کولمبس کا لایا ہوا ہے نہ یہ امریکا دریافت کرتا اور نہ ہم لوگ پریشانی میں پھنستے۔ (کسی کی دریافت کا غلط فائدہ اٹھانے والوں کی سزا دریافت کرنے والے کو نہیں دینی چاہیے) ''امریکا اوامریکا'' امریکا کے بارے میں ایک معلوماتی اور دلچسپ تحریر ہے۔ امریکا میں وہاں کے شہریوں کو جتنی سہولتیں حاصل ہیں انہیں پڑھ کر منہ میں پانی بھر آیا۔ کاش پاکستان میں بھی ایسا کچھ ہوسکتا۔ (یقیناً اگر ہم اسلامی اقدار کی پاسداری کرتے) ''سراب'' ہمیشہ کی طرح اپنی دلکشی، دلچسپی، دل آویزی اور برق رفتاری برقرار رکھے ہوئے تھی۔ سچ بیانیاں تمام کی تمام ہی بہت عمدہ تھیں۔ پراسرار نمبر 2 کا شدت سے انتظار ہے۔ امید ہے کہ وہ پہلے پراسرار نمبر سے بھی بازی لے جائے گا۔'' (پراسراریت نمبر 2 حاضرِ خدمت ہے۔ اپنی رائے سے ضرور آگاہ کیجیے گا)

✉ جی اے مغل، چیچیاں شمس، گجرات سے ''ہم آپ سے سخت ناراض ہیں اس لیے کہ آپ نئے لکھنے والوں کی بالکل حوصلہ افزائی نہیں کرتے۔ آپ کے تینوں رسائل میرے مطالعے میں رہتے ہیں لیکن نئے لکھنے والوں کو بہت ہی کم چانس ملتا ہے۔ یہ بات ٹھیک ہے کہ نئے لکھاری آپ کے منجھے ہوئے لکھاریوں کا مقابلہ نہیں کرسکتے لیکن یہ بھی تو سوچیں ناں کہ منجھے ہوئے لکھاری بھی کبھی نئے تھے۔ آپ نے ان کو چانس دیا تو وہ آپ کے صفحات میں مستقل جگہ پانے میں کامیاب ہوئے نا؟ ہم نے بھی دو تحاریر بھیجی تھیں، وہ کوئی فرضی کہانی نہیں بلکہ تاریخی حقائق پر مبنی تھیں لیکن آپ نے ان کو ردی کی ٹوکری کی نذر کردیا۔ چلیں یہ بات درست ہی سہی، تحریر پختہ نہ سہی لیکن کچھ نمک مرچ آپ بھی لگا کر تھوڑی سی جگہ تو دے دیتے۔ (اگر تھوڑی بہت کمی ہو تو بغیر بولے درست کردیتے ہیں۔ مسترد وہی کہانی، مضمون ہوتا ہے جو درستی کے لیے بہت زیادہ وقت طلب ہو) اس دفعہ کچھ حقائق ہم بھیج رہے ہیں۔ پاکستان نے ماہ اکتوبر میں بہت سے نشیب وفراز دیکھے، بہت کچھ کھویا اور بہت کچھ پایا۔ اس حوالے سے تھوڑی سی تحقیق کی ہے، نظرِ عنایت فرمایئے گا ضرور۔ (ایسے مختصر مضامین بچوں کے پرچے میں ضرور بھیجیں) یک صفحی سرگزشت پڑھ کر حیرت دوچند ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ نے کیسی نابغۂ روزگار ہستیاں دنیا میں بھیجیں مگر ہم نے ان کی قدر نہ کی، مغرب کی اندھی تقلید میں اپنوں کو بھول گئے۔ یک صفحی سرگزشت سے اگلا اسٹیشن شہر خیال کا آیا۔ کرسیِ صدارت پر جناب رانا محمد سجاد کو بیٹھے پایا۔ ان کا تبصرہ کوئی خاص تاثر نہ چھوڑ سکا۔ ہمیں بھی حسرت ہے کہ کبھی کرسی صدارت ہمیں بھی ملے۔ ایک بات تو آپ کو ماننا پڑے گی۔ سرگزشت کے قاری بھی اپنی جگہ محقق ہیں اور آپ کے لیے محرک۔ شہر خیال کے بعد لمبی چھلانگ لگائی اور پہنچے سراب تک، جس کے ہم دیوانے ہیں۔ اس دفعہ شہباز ملک نے کچھ ایکشن دکھایا ورنہ پچھلے تین ماہ سے تو باتوں میں ہی قسط گزر جاتی تھی۔ امید ہے یہ ایکشن اب کچھ ماہ چلے گا۔ امریکا اوامریکا معلوماتی تو ہے لیکن اگر ان میں آفاقی صاحب کے سفرناموں کی چاشنی ہو تو کیا کہنے؟ اب آتے ہیں سچ بیانیوں کی طرف ریگستان میں پھول ایک منفرد اور ناقابلِ فراموش کہانی تھی۔ تلافی اور تحریر شناس پڑھ کر یہ پتا چلا کہ کئی دفعہ جو کچھ دکھتا ہے وہ حقیقت نہیں ہوتا۔ خون کا اثر میں نام نہاد پیروں کا ذکر ملا، ہم خود نام نہاد پیروں کے سخت خلاف ہیں، یہ سچ بیانی پڑھ کر ان سے نفرت اور بڑھ گئی۔ آخری مقدمہ، بیٹا برائے فروخت، مکافاتِ عمل بس ایویں ہی تھیں۔ طارق عزیز خان کی شوق پرواز ہم جوؤں کے لیے ایک زبردست کاوش تھی۔ آفاقی صاحب سے گزارش ہے کہ ذرا دورِ جدید کے فنکاروں کا ذکر بھی دیا کریں۔ ڈاکٹر ساجد امجد صاحب ویسے ہی ہمارے لیے قابلِ تقلید معلومات اور تاریخی حقائق حاصل کرنے کا بہت بڑا ذریعہ ہیں۔ اس دفعہ بھی وہ برصغیر کی ایک علمی اور ادبی شخصیت کا تعارف لے کر آئے۔ اس پر ہم ڈاکٹر صاحب کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں۔ یہ بھی بتائیں کہ سرگزشت میں اکثر بہت ہی منفرد تحریریں پڑھنے کو ملتی ہیں جیسے برصغیر میں پہلوانی وغیرہ تو یہ کیا مضامین کتابی شکل میں مل سکتے ہیں؟ اور کہاں سے؟ ایک دفعہ انکل معراج کا انٹرویو پاس میں چھپا تھا، کیا کوئی تازہ انٹرویو سرگزشت میں نہیں چھپ سکتا؟ سوچیے گا اس پر بھی۔''

✉ ابنِ مقبول جاوید احمد صدیقی کا خلوص نامہ، راولپنڈی سے ''محترم معراج رسول صاحب کا اداریہ ایک بار پھر ادراک کا در وا کر گیا۔ مسلمانوں میں ہمیشہ اپنے ہی میر صادق اور میر جعفر نکلے اور ان ''چاروں'' کو بھی یہی غداریاں لے ڈوبیں۔ کاش اتحاد واتفاق سے ہم مسلمان نمونہ بن

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جائیں، آمین۔ آج بھی سیلاب زدہ علاقوں کے لوگ حسرت ویاس کی تصویر بنے بیٹھے ہیں کہ آسمان اور زمین کے درمیان کچھ بھی نہیں ہے ان کے سروں پر۔ امداد آئے، یہ ہڑپ کر جائیں اور ان کا ڈوب مرنے کا مقام ہے کہ جو امداد دیتے ہیں وہ اس کی صحیح تقسیم کے لیے اپنے بندے بھیج دیتے ہیں کہ حساب کتاب درست رہے۔ کاش وہ زمانہ بھی آئے کہ ہمارے پیغمبر آخری نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرح ہم بھی صادق وامین کا نمونہ بن کر دکھائیں، مگر کاش...... کاش۔ نابینا پینا تو آنکھیں کھولنے کے لیے تھا۔ زبردست مگران جیسے انمول لوگوں کے خزانوں یعنی کتابوں کی مسلمان حفاظت نہ کر سکے۔ لیجیے اب شہر خیال کی یاترا ہو جائے اور رانا محمد سجاد، مبارک باد کے حق دار ٹھہرے۔ ہاں بھئی رانا صاحب، یہ تمام حالات نہ جانے کتنے لوگوں کو بلڈ پریشر کا مریض بنا چکے ہیں۔ دعائے خیر ہی کیجیے۔ تبصرہ بہت اچھا تھا۔ ریما اور کشف بھئی، تفصیلی تبصرے کے ساتھ محفل میں حاضر ہوں نا۔ انتظار رہے گا۔ ڈاکٹر روبینہ انصاری، آپ کے آنے سے بے حد خوشی ہوئی اور اللہ کریم آپ کو مکمل صحت سے ہمکنار کرے، آمین۔ ہمارا بھکر سے ناتا سالوں پرانا تھا۔ اتفاق بابرکت بتاؤں کہ 1954ء میں ہم بھکر میں تھے اور ہمارے پرائمری کے ہیڈ ماسٹر محترم غلام نبی مرحوم صاحب ہمیں پڑھانے آیا کرتے تھے۔ انہوں نے ہی مجھے اب پ اور 321 لکھنا پڑھنا سکھایا اور اللہ کی رحمت سے 1975ء میں میری شادی میں ماسٹر صاحب نے نہایت کرم نوازی سے شرکت کی اور میرا سر فخر سے بلند ہو گیا۔ بشیر احمد بھٹی نے فردوس کے بارے میں نئی معلومات دیں، شکریہ۔ انجینئر شاہد عالم جی، بس آپ اتنا ہی کرنے کے لیے تشریف لائے؟ بھئی صحیح تبصرہ کے ساتھ محفل میں حاضر ہوا کریں۔ حسنین بلوچ جی، ہم مناظر علی گوندل کی رہائی کے لیے خوب دعا گو ہیں۔ افتخار گھمن صاحب، پراسراریت نمبر 2 کے لیے تو سارے قارئین ہی بے صبری سے انتظار کر رہے ہیں۔ راجا ثاقب نواز ثاقب کا ایک ایک پر تبصرہ اور نصیحتیں کرتے ہوئے تبصرہ، پورا پڑھتے چلے گئے۔ بہت اچھا تبصرہ تھا۔ آپ ایسے ہی اچھے اور بھرپور تبصرے کے ساتھ حاضر ہوا کریں۔ جی ہاں، یہ سعید احمد چاند اس مرتبہ ذرا صنف نازک کے متعلق زیادہ ہی تبصرہ کر گئے ہیں۔ فکر نہ کریں، یہ سب آیا کریں گی محفل میں۔ ملک جاوید محمد نے تبصرہ اچھا کیا۔ لوڈشیڈنگ تو بھئی شاید اس قوم کا مقدر بن گئی ہے۔ پیارے طاہر الدین بیگ تشریف لائے ہیں اور بڑا بھرپور تبصرہ بھی لائے۔ محترم جناب عزیز میرٹھی کے تبصرے میں بھرپور طور پر احاطہ کیا گیا تھا۔ ہاں بیا اعجاز حسین سٹھار، آپ کو کس نے کہا کہ تبصرہ اچھا نہ تھا، بھئی آپ کئی بے حد اچھا تبصرہ کرنے والوں پر بھاری ہیں۔ آپ کا تبصرہ گہرائی لیے اور بھرپور تھا۔ رانا شاہد کو نکاح مبارک۔ ایم اے خالق مختصر ترین تحریر کے ساتھ تشریف لائے۔ باقی تبصرے مختصر تھے مگر اچھے تھے۔ ابھی بھی بہت سے پرانے لکھنے والوں کے تبصروں سے محفل محروم ہے۔ کیا قارئین مجھے بھول گئے ہیں؟ چراغِ فروزاں تو حقیقت میں وقت کے بہت بڑے ولی بلکہ مجدد کی داستان ہے جو کروڑوں دلوں میں بستے ہیں۔ باغی کمانڈر نے بھی معلومات میں بے انتہا اضافہ کیا۔ شوقِ پرواز انسانی جدوجہد کی ایک انمٹ اور لازوال داستان۔ خواجہ پرویز انتہائی زرخیز دماغ کے مالک تھے۔ ایسے نغمہ نگار جو اوج کمال تک پہنچے۔ الف لیلہ میں مغل بادشاہوں پر فلم جو بنی ان پر بھرپور تبصرہ۔ کاش ہمارے مغل بادشاہ عیاشیوں میں پڑ کر محض باغات اور عمارتوں کے پیچھے پڑنے کے بجائے تعلیم، ریسرچ اور بڑے بڑے منصوبوں پر کام کرتے اور اس عیاشی کا اثر ابھی تک مسلمانوں پر منحوس سایہ کیے ہوئے ہے۔ پھر بھارت کی فلموں پر تبصرہ۔ انڈیا فلموں پر پابندی ہو یا نہ ہو، آفاقی صاحب اس صنعت کو بدمعاشوں، عیاشوں اور گندے ترین افراد نے اغوا کر لیا اور آخر یہ صنعت آپ اپنی موت مر گئی ہے۔ ہاں جنوبی ہند تامل ناڈو کی فلموں کے بارے میں خوب معلومات ملیں۔ ساغر صدیقی کا احوال واقعی مکمل معلومات لیے ہوئے تھا۔ دل بے حد دکھ گیا۔ لاہور کی قدیم یادگاروں کا تفصیلی جائزہ۔ بہت ہی معلومات سے بھرپور، واہ۔ موسیقی کی تاریخ، ناچ گانا جو ایک طبقے کی خاصیت رہی اور خوب یہ فن پروان چڑھا اور آخر میں قلم شکار کا بھرپور تذکرہ۔ تمام بے حد معلوماتی تھا۔ کولمبس کے متعلق، بہت عرصہ قبل بھی تھوڑا بہت پڑھا تھا مگر مریم کے خان نے انتہائی گہرائی میں جا کر یہ معلومات مہیا کی ہیں۔ بے حد شاندار مضمون، مدد پُرخطر جذباتی اور معنویت رکھنے والی داستان کہ قاری شروع سے آخر تک ڈوبا رہتا ہے۔ امریکا او امریکا اختتام کو پہنچا۔ اب اچھا سا سلسلہ شروع فرمایئے جو اس کا صحیح نعم البدل ہو۔ سندھ کا ورثہ میں خاص شہر کا دور سنہری اور پھر نئی پود کو اس کا علم دینا ایک مہارت کی بات ہے۔ مختار آزاد صاحب انتہائی قیمتی اور نایاب تحریر لائے ہیں۔ سراب تو کاشف صاحب کی ایک ایسی کہانی ہے جو مدتوں یاد رہنے والی چیز ہے۔ سچ بیانیاں تو سرگزشت کا سرمایۂ حیات ہیں، ایک سے بڑھ کر ایک۔ ریگستان میں پھول نہ بھولنے والی کہانی ہے۔ باقی آخری مقدمہ، بیٹا برائے فروخت، تحریر شناس اور تلافی زبردست رہیں۔ باقی بھی بے حد اچھی تھیں۔ اصل میں آپ کا چناؤ کا معیار ہر دوسرے رسالوں کی سچ بیانیوں سے بالکل مختلف اور اعلیٰ ترین ہے۔ یہ پرکھ ہی آپ کو دوسرے لوگوں کے چناؤ پر فوقیت دیتی ہے اور ہم قارئین بھی...... دوسرے رسالوں سے مقابلہ ہے ہی نہیں، بس بات مختصر ہے، بیت بازی میں معیاری اشعار پڑھنے کو ملے، اچھی چوائس ہے۔ ہماری طرف سے تمام احباب مجلس کو سلام ودعا۔ محترم پرویز بلگرامی کے بیٹے علیل تھے، دعائیں ہی دعائیں ہیں، اب کیسے ہیں؟" (کچھ افاقہ ہے)

✉ سدرہ بانو ناگوری کا مکتوب، کراچی سے "سب سے پہلے تو تمام اہلِ وطن کو نئے سال کی مبارک باد۔ سال 2011ء میں ہمیں بہت سی خوشیوں اور تکلیف دہ لمحات کا سامنا کرنا پڑا۔ پچھلے کچھ عرصہ کراچی میں ناخوشگوار واقعات پیش آئے اور ہماری پاک فوج کے جوانوں کو شہید کیا گیا تو دوسری طرف اردو ادب کے مشہور ومعروف ادیب حمید اختر ہم سے بچھڑ گئے لیکن میرے لیے گزرے برس سب سے بڑی خوشی یہ رہی کہ میرے 12 میں سے 11 خطوط شہر خیال کی زینت بنے اور شہر خیال کے ساتھیوں نے انہیں پسند کیا۔ دسمبر کے سرورق پر حسینہ مضطرب اور پریشان

سی نظر آئی۔ انکل کا اداریہ تلخ حقائق پر مبنی کہ جسے پڑھ کر دل سے یہی دعا نکلی کہ کاش 2012ء ہمارے لیے خوشیوں بھرا ثابت ہو، ایک ایسے پھول کی طرح خوشبو بکھیرتا ہوا کہ جس کی خوشبو ہمیں مدتوں اپنی گرفت میں رکھے۔ شہر خیال میں تمام ساتھیوں نے اچھا تبصرہ کیا۔ امریکا او امریکا اپنے اختتام کو پہنچی۔ امریکا میں سب کچھ باہر سے آیا ہے حتیٰ کہ ان کا مجسمۂ آزادی بھی فرانس نے دیا ہے مگر وہاں اتنی آزادی کے باوجود بھی عورت خود کو محفوظ نہیں تصور کر سکتی۔ ابراہام لنکن اور جان ایف کینیڈی کی زندگی اور موت میں حیرت انگیز مماثلت پائی گئی، انتہائی حیرت انگیز معلومات کا خزانہ الطاف شیخ نے اکٹھا کیا اور قارئین کی نذر کیا۔ کرسٹوفر کولمبس ہی کیوں، مریم کے خان جب لکھتی ہیں تو گویا تاریخ کے بخیے ہی ادھیڑ کر رکھ دیتی ہیں۔ کولمبس کی روح اگر یہ تحریر پڑھ لے تو تڑپ تڑپ اٹھے۔ مدد پُرخطر پڑھ کر بہت لطف آیا۔ جانوروں کی مدد کے لیے یہ اہلِ مغرب کس حد تک چلے جاتے ہیں اور دوسرے انسانوں، خاص طور پر مسلمانوں کی نسل کشی میں بھی یہ اپنی تمام حدیں پھلانگ چکے ہیں۔ فلمی الف لیلہ میں آفاقی انکل اس دفعہ ایک الگ روپ میں نظر آئے، کہیں انہوں نے مغل بادشاہوں پر بنائی جانے والی فلموں کی روداد بیان کی۔ پاکستان میں انڈین فلموں کی نمائش اور اس کے مضر اثرات پر روشنی ڈالی اور یہ کسی عام آدمی کی نگاہ نہیں بلکہ ایک ایسے شخص کی رائے ہے جس نے اپنی زندگی کے شب وروز اسی فلمی دنیا کی سیاحی میں گزارے ہیں۔ اتنی روانی اور دکھی دل کے ساتھ انہوں نے مطلب پرستوں کے چہروں سے نقاب اٹھایا ہے کہ انہیں برہنہ کر دیا ہے۔ خاص طور پر ساغر صدیقی کے تذکرے میں پبلشروں کے کردار جو کہ فنکاروں کا گوشت نوچ نوچ کر کھاتے رہے ہیں۔ اس دفعہ انکل ماضی میں نکل گئے اور ان فلموں اور فنکاروں کا تذکرہ کیا جن کے نام سے میرے والد بھی ناواقف نکلے۔ آپ بیتیوں میں سب سے پہلی کہانی ریگستان میں پھول اچھی تحریر ہے۔ مقدمہ ایک دلچسپ کہانی ہے مگر کبھی کبھی دوسروں کی زندگی میں اپنی مرضی چلانے والے خود بھی برے پھنس جاتے ہیں۔ بیٹا برائے فروخت نے حیرت میں مبتلا کر دیا کہ اب لوگوں نے شادی کو بھی کاروبار بنا لیا ہے۔ تحریر شناس کے بارے میں اتنا ہی لکھوں گی کہ کبھی کبھی اپنے علم پر بے انتہا بھروسا ہمیں پچھتاوے کی آگ میں جلنے پر مجبور کر سکتا ہے۔ جوڑ بے جوڑ زبردست تحریر ہے۔ موصوف اگر بن بلائے مہمان بننے کا طریقہ بتا دیتے تو بہتوں کا بھلا ہو جاتا۔"

✉ انتساب عباس نے راولپنڈی سے لکھا ہے "اقبال ڈے آپ سب کو مبارک اور اشرف علی تھانوی کو چھاپنے پر مجھے 56 علوم کے ماہر اعلیٰ حضرت احمد رضا خان، فاضل بریلوی کی یاد آ گئی، کیا ان پر کچھ منفرد چھپنے کا امکان ہے؟ یہ خط لکھنے کا محرک وہ واقعہ ہے جو میرے ساتھ پیش آیا۔ میں چونکہ وارد استعمال کرتا ہوں تو وارد ہی کے کسی نمبر سے مجھے پانچ لاکھ جیتنے پر مبارک باد دی گئی۔ میں نے اس کو کئی بار کہا کہ انعام میرے بعد کسی اور کو قرعہ اندازی میں دے دیا جائے الحمدللہ میرا تعلق ایک کھاتے پیتے گھرانے سے ہے مگر اس نے سنی ان سنی کر دی اور مجھے قرعہ اندازی کا فرضی نمبر لکھوا دیا اور کہا کہ ہماری کمپنی میں آپ کی چار فائلز مکمل ہیں اور پانچویں نامکمل ہے۔ غرض یہ ایک لمبی گیم تھی اور صفحات میرے پاس محدود ہیں، مختصر یہ کہ مجھ سے سو سو کے نو کارڈ ری چارج کروا لیے گئے۔ دسواں کارڈ ایک ہندسہ غلط بتانے سے بچ گیا۔ وہ جو اپنے آپ کو کسی ایریا کا آفیسر بھی ظاہر کر رہا تھا، پانچ پانچ سو کے پانچ کارڈ ٹیلی نار کے اور پانچ وارد کے مانگ رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ بینک پانچ لاکھ کے چیک سائن کے 5500 مانگ رہا ہے، آپ یہ کسی بھی قریبی ایزی پیسا شاپ میں جمع کروا دیں تو آپ کا انعام پکا۔ میں نے اپنے کزن سے اس واقعے کا ذکر کر دیا حالانکہ اس مکروہ شخص نے بار بار کہا تھا کہ اس انعام کا ذکر کسی سے مت کرنا، کوئی دوسرا آپ کے نمبر کی ڈپلی کیٹ سے انعام لے اڑے گا۔ اتفاق سے وہ بھی اس پھیر میں پڑنے سے بال بال بچے تھے، ان کے سمجھانے پر میں نے ٹھنڈے دل سے غور کیا تو یہ سارا معاملہ مجھے مشکوک لگا اور میں نے فوراً وارد کی نئی سم لے لی۔ میں اب اس شخص کو کیا کہوں جو........ مجھے بلیک میل کرتا رہا۔ قارئین شہر خیال، خدارا آنکھیں کھلی رکھیے کہ یہ دنیا والے بہت ظالم ہیں۔ یہ ساری گیم پری پلاننگ ہوتی ہے۔ میرے ذہن میں لالچ کا تصور تک نہ تھا، میں چونکہ ہمیشہ سے ایک کنفیوزڈ شخص رہا ہوں لہٰذا اس بار بھی استعمال ہو گیا۔" (آپ نے ایک ایسے واقعے کی جانب توجہ دلائی ہے جس کا شکار ہر دوسرا موبائل فون استعمال کرنے والا ہوتا ہے۔ چند sms میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپ اس میسج کو فلاں نمبر پر بھیج دیں تا کہ انعامی رقم آپ کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کر دی جائے۔ اس قسم کے فراڈ سے بچنے کے لیے ہمارا مشورہ ہے کہ جس کسی کو بھی ایسے ایس ایم ایس ملیں وہ فوراً اپنی موبائل کمپنی کی ہیلپ لائن پر رابطہ کر کے شکایت درج کروائے تا کہ ایسے افراد یا گروہ کو قرار واقعی سزا مل سکے۔ یہاں ہم اپنے قارئین کو گوش گزار کرنا چاہیں گے کہ رقم بٹورنے کا ایک اور طریقہ موبائل پر نہایت پریشانی کا میسج بھیجنا اور یہ درخواست کرنا کہ اس نمبر پر 30 یا 50 روپے کا بیلنس بھیج دیں)

✉ راجا ثاقب نواز ثاقب کا نوازش نامہ، رتی ٹبی ساہیوال سے "معراج رسول جی کے سوالات کا جواب کم سے کم میرے پاس تو نہیں ہے۔ ابو العلا المعری کے حالات زندگی نے متاثر کیا مگر ان کے خیالات نے پریشان کر دیا۔ خطوط کی محفل میں افتخار احمد گھمن، سعید احمد چاند اور ملک جاوید محمد سرکائی ور ائی نمایاں رہے۔ ادی ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری پہلے آپ جلدی سے صحت یاب ہوں پھر میں آپ کو آپ کے سوال کا جواب دوں گا۔ ایم اے خالق بھٹی، آپ نے سنا تو ہوگا کہ شادی وہ لڈو ہے جو کھائے، وہ بھی پچھتائے اور جو نہ کھائے وہ بھی پچھتائے۔ اب آپ ہی انصاف کریں چار لڈو دیکھ کر میرے منہ میں پانی آ گیا تو اس میں میرا کیا قصور؟ مختصر تبصروں میں نزہت ناز نمایاں لگیں۔ مولانا اشرف علی تھانوی کے حالات

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

زندگی سے واقف ہوئے تو بے ساختہ لبوں سے نکلا" کیا کیا صورتیں تھیں جو خاک میں پنہاں ہوگئیں" نائیجیریا کے آزادی پسند جنگجو قبیلے کے حالاتِ زندگی متاثر کن رہے۔ شوقِ پرواز میں امدادی ہیلی کاپٹر کو کریش ہوتا دیکھ کر کلیجا منہ میں آ گیا مگر متاثرین کو بچالیا گیا۔ ذہن رسا میں انور فرہاد شاید یہ ذکر کرنا بھول گئے کہ خواجہ پرویز کچھ عرصہ ایک مشہور پاکستانی روزنامہ اخبار میں کالم نویسی بھی کیا کرتے تھے۔ فلمی الف لیلہ پڑھ کر حال ہی میں رؤف خالد کے چلے جانے کا زخم تازہ ہوگیا۔ کولمبس ہی کیوں اور امریکا اوامریکا کو دانستہ ایک ساتھ پڑھا، جس کا اختتام ہوا۔ عین ممکن ہے کہ یہ سفرنامہ تو کچھ عرصہ بعد قارئین کی یادداشت سے محو ہو جائے مگر حال ہی میں جس قسم کی بزدلانہ کارروائی کر کے ہمارے نوجوانوں کو شہید کیا گیا ہے، وہ بھولنے سے بھی نہیں بھولتی۔ مدد پُرخطر میں برفانی ریچھنی اور اس کے بچوں کو بچالیا گیا۔ سندھ کا ورثہ میں استاد عنایت اللہ کے قتل کا بے حد صدمہ ہوا۔"

☒ علی مغل، کلوال مانسہرہ سے لکھتے ہیں" دسمبر 2011ء کا شمارہ سرگزشت تاخیر سے ملا۔ وقت کے دامن میں اتنی گنجائش کہاں کہ آبائی گاؤں کلوال سے مانسہرہ شہر آنا محض سرگزشت کے لیے۔ ہر ماہ یہ دوڑ دھوپ پورے دن کی قربانی مانگتی ہے۔ چنانچہ گفت وشنید ہو۔ حالِ دل کھل کر بیان کروں۔ کوئی اپنے احوال سنائے میری سنے، ایسا مسیحا ایسا محسن درکار تھا جو شاید سرگزشت کے توسط سے میسر آچکا ہے۔ ایاز بھائی کی کال کا شدت سے انتظار رہے گا۔ راولپنڈی کے سلیم اختر صاحب کی گزشتہ کہانیوں محسنہ اور توبہ کا انداز تحریر وہی اپنا رنگ لیے ہوئے ہے۔ اس دفعہ تو ڈاکٹر ساجد امجد کے قلم نے ایک مذہبی شخصیت کو اپنا موضوع بنایا ہے اور میں بھی اپنی ناقص عقل کے مطابق چاہتا ہوں کہ سرگزشت کا ٹائٹل بھی ایسا ہو کہ مذہبی ذہن کے لوگوں کی نگاہیں نہ صرف رکیں، چپکیں بلکہ علم کے خزانے سے مالا مال بھی ہوں۔ سرگزشت سے کتنی دل لگی ہے، کتنا پیار ہے، کتنا مان ہے اب کیسے بتائیں۔ پلیز ہمیں نظرانداز نہ کیا کریں۔ باقی رانا محمد سجاد صاحب اور راجا ثاقب نواز ثاقب کا تبصرہ قابلِ داد تھا۔ مریم کے خان نے کرسٹوفر کولمبس کی خوب نقاب کشائی کی، بہت کچھ پڑھ کر بھی تشنگی باقی رہی۔ گزشتہ کی طرح سچ بیانیاں بھی کافی اچھی رہیں۔"

☒ رانا محمد سجاد رقم طراز ہیں شاہ جمال سے" ماہ محرم کے مہینے میں دسمبر کا سرگزشت 26 تاریخ کو ملا، اپنی خوبصورت رعنائیوں کے ساتھ۔ ماہ محرم کا مہینا ہمیں خاندانِ رسالت کی لازوال قربانیوں کی یاد دلاتا ہے اور اہل بیت کے سربراہ حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے جرأت مندانہ موقف اور بے پناہ استقامت اور قوتِ برداشت کا سبق دیتا ہے۔ لیکن یہ کیسی محبت اور عقیدت ہے کہ عملی زندگی میں ہم اسوہ شبیریؓ پر چلنے کا خیال دل میں نہیں لاتے۔ ان مظالم کو سہنے کے پیچھے جو روح یا سوچ کارفرما ہے اس کی طرف ہمارا دھیان نہیں جاتا۔ اصل میں شہادت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہمیں دعوتِ فکر دیتی ہوئی نظر آتی ہے کہ جب بھی حق و باطل میں کشمکش ہو تو کس طرف جانا ہے۔ مصلحت وقت یا زمینی حقائق کا نعرہ بلند نہیں کرنا اسی وجہ سے تو آج یزیدی سوچ کے حامل افراد عالمی امن اور خلوص کو تہس نہس کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان یزیدوں کا راستہ آنسو، آہیں نہیں روک پائیں گی۔ ان کے لیے گلی گلی، شہر شہر سے نعرۂ حسینیؓ بلند کرنا ہوگا تیغ عباسؓ کو ہاتھ میں لینا ہوگا۔ بربریت کے سینے پر خیموں کی چوبیں گاڑنا ہوں گی۔ ان یزیدوں نے اعلانیہ کربلائی میدان سجائے ہوئے ہیں۔ عراق، افغانستان، کشمیر، فلسطین، ان کے اعلانیہ میدان بن چکے ہیں۔ ان حربوں کو حسینیؓ استقامت سے ہی روکا جاسکتا ہے اور ہمیں عہد کرنا ہے کہ عصرِ حاضر کے یزیدوں کا حسینیؓ جرأت سے مقابلہ کریں گے اور اس کے لیے کسی بھی مصلحت کو آڑے نہیں آنے دیں گے (انشاء اللہ) معراج رسول صاحب کی باتیں پڑھیں جو کہ دسمبر کے حوالے سے تھیں۔ یقیناً ایک محبِ وطن انسان کے لیے یہ انتہائی افسردہ کردینے والی باتیں تھیں۔ دسمبر کا مہینا ہی وہ کرب ناک مہینا ہے کہ جس میں اپنوں کی غداری اور اغیار کی سازشوں نے بانی پاکستان کے اس ملک کو دو حصوں میں تقسیم کردیا اور سقوطِ ڈھاکا جیسا شرمناک باب رقم کیا۔ انشاء اللہ ہم اس ملک کو مضبوط بنائیں گے اور دوبارہ اپنا حصہ واپس لیں گے۔ 26 نومبر کو نیٹو کے طیاروں نے وطن عزیز کی سرحدوں کو پامال کرتے ہوئے دو درجن سے زائد نوجوانوں کو شہید کردیا، ردعمل میں نیٹو کی سپلائی لائن بند کردی ہے پاکستان نے، خدا ہمیں اس فیصلے پر ثابت قدم رہنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔ یک صفحی سرگزشت کی شخصیت کے متعلق سسپنس میں پڑھ چکے ہیں۔ شہرِ خیال میں حاضری دی۔ کچھ پرانے ساتھیوں سے بھی ملاقات ہوئی۔ روبینہ نفیس صاحبہ، اب آپ کا شکوہ دور ہوگیا، اب ہمارا جوابی شکوہ ہے کہ آپ نے سب کو بھلادیا ہے۔ محمد شاہد عالم اتنی کم عمری سے سرگزشت سے تعلق ہے آپ کا، بڑی خوشی ہوئی۔ افتخار احمد گھمن صاحب کا تبصرہ مختصر تھا۔ راجا ثاقب نواز ثاقب کا تبصرہ بھی پسند آیا۔ سعید احمد چاند کا تبصرہ تو اچھا لیکن زیادہ رومانس کی کیا ضرورت ہے؟ سدرہ بانو ناگوری، ملک جاوید کا تبصرہ شہرِ خیال میں مزید خوبصورتی کا باعث ہے۔ طاہر الدین بیگ صاحب کے خیالات سے متفق ہیں۔ کاش یہ لوگ اپنی قابلیت اور ہنرمندی اس نئی انڈسٹری کو دیتے اور سرگزشت کا خوبصورت تبصرہ عزیز میرٹھی صاحب نے کیا۔ میری درخواست ہے کہ عزیز میرٹھی صاحب کی یادداشتیں لکھیں۔ اعجاز حسین سٹھار صاحب ہمیشہ کی طرح طویل اور خوبصورت تبصرہ لائے۔ غزالہ شاہین، نزہت ناز، عظیم شاہ بخاری کا تبصرہ بھی پسند آیا۔ ایم اے خالق بھٹی صاحب اس بار آپ آخر میں حاضر ہوئے آئندہ جلد حاضری دیجیے گا۔"

☒ ولی محمد جوہر، باجوڑ ایجنسی سے لکھتے ہیں" میں 2003ء سے سرگزشت کا باقاعدہ لیکن خاموش قاری ہوں اور پہلی مرتبہ شہرِ خیال میں شامل ہونے کی جسارت کر رہا ہوں۔ امید ہے کہ حوصلہ افزائی کریں گے۔ (خوش آمدید) سرگزشت سے میرا ناتا اس وقت جڑا جب میں میٹرک کا

طالب علم تھا اور آج جب میں نے ایم اے کا امتحان دیا ہے، تو بھی سرگزشت کے ساتھ تعلق برقرار ہے۔ سرگزشت کی وجہ سے ہی میرا قومی زبان اردو کے ساتھ دلی لگاؤ بڑھتا گیا اور میں نے اردو لٹریچر میں ایم اے کرنے کا ارادہ کیا (ماشاء اللہ) سرگزشت کے ساتھ میرے تعلق کی وجہ مشہورِ زمانہ کہانی "تاوان" تھی لیکن رفتہ رفتہ مجھ پر اس کے دوسرے جوہر بھی کھلتے گئے جیسا کہ ہر ماہ ایک نابغۂ روزگار ہستی کا مکمل زندگی نامہ، سیاست، کھیل، سفرنامہ، شکاریات، ایڈونچر، فلمی الف لیلہ اور سب سے بڑھ کر سچ بیانیاں یہ سب وہ خصوصیات ہیں جس کی وجہ سے سرگزشت نے مجھے جکڑ کر رکھا اور مجھے دوسری طرف دیکھنے نہ دیا۔ ہمارے علاقے میں سرگزشت بہت دیر سے پہنچتا ہے اس لیے دسمبر کے شمارے پر میں تبصرہ نہیں کرسکتا لیکن مجموعی طور پر کچھ گزارشات کرتا ہوں۔" (پابندی سے خط لکھیں، ہم شامل کرنے کی کوشش ضرور کریں گے)

☒ ناصر حسین رند کا خلوص نامہ، بہاولپور سے" دیکھیں اس پراسراریت نمبر 2 کی پٹاری میں سے کیا کیا نکلتا ہے جو کہ ہمارے لیے سرپرائز ہوگا کیونکہ اس دفعہ آپ نے اشتہار میں پہلے سے آگاہی نہیں دی (پراسراریت بجائے خود اتنا وسیع ہے کہ ایک یا دو شماروں میں مکمل پیش نہیں کیا جاسکتا، تاہم ہماری کوشش ہے کہ جتنی زیادہ معلومات ہوسکے ہم اپنے قارئین کو پہنچادیں) اور کیا خوب آپ نے منصوبہ بندی کی کہ پچھلی بار جب پراسراریت نمبر ملا تو اس وقت پورے پاکستان میں بارشوں کی مار دھاڑ تھی۔ اب جب پراسراریت نمبر 2 ملے گا تو پورا پاکستان دھند اور زبردست سردی کی لپیٹ میں ہے (گویا پراسراریت بڑھانے کا سبب بنا ہے) ویسے بھی پراسرار خوفناک اور دہشت انگیز کہانیاں اور مضمون پڑھنے کا مزہ تب آتا ہے جب سردیوں کا موسم ہو۔ رات کا سناٹا ہو اور مکمل خاموشی ہو۔ رات کے وقت سڑکیں اور گلیاں سنسان ہوجاتی ہیں تب خود بخود انسان پر ایسی کہانیاں پڑھ کر دہشت طاری ہوجاتی ہے۔ ویسے بھی آج کل پوری دنیا پر دہشت طاری ہے۔ بالخصوص پاکستان پر عجیب و غریب اور دہشت انگیز واقعات ہورہے ہیں کوئی آدم خور انسان قبروں سے مردے نکال کر کھا رہا ہے، تو کوئی مردے قبروں سے نکال کر ان سے رونگٹے کھڑے کردینے والا فعل کر رہا ہے۔ ڈھرکی میں ایک خوفناک گدھ جتنے چمگادڑ نے کافی لوگوں کو زخمی کیا، پورا گاؤں اور علاقہ خوف کا شکار رہا۔ (اگر آپ اس واقعے کی تفصیل ہمیں بھیج سکیں تو یقیناً ہم اس سچ بیانی کو بھی ضرور شائع کریں گے) بہاولپور کے علاقے جھانگی والا میں ایک خوفناک بلے نے پورے قصبے کو دہشت میں مبتلا کر رکھا ہے۔ لوگ رات کے وقت لاٹھیاں اور لالٹین اور بندوقیں لے کر پہرا دے رہے ہیں۔ رانا محمد شاہد کو نکاح کی بہت بہت مبارک باد۔ روبینہ نفیس انصاری صاحبہ کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ آپ کو صحتِ کاملہ عطا فرمائے۔ باقی تمام کے تبصرے بھی پسند آئے۔ آخر میں معراج صاحب سے گزارش کہ اگر پراسراریت نمبر 2 میں سے کچھ مواد بچ جائے تو اسے ضائع نہ کیجیے گا۔ اسے اگلے عام شمارے میں شائع کردیجیے گا۔ اس طرح عام شمارہ جزوی پراسراریت نمبر ہوجائے گا۔" (جی بہت اچھا، ہم ضرور غور کریں گے)

☒ ایم اے خالق بھٹی، صدر پریس کلب اللہ آباد، رحیم یار خان سے محو تحریر ہیں" اداریہ لکھتے ہوئے واقعی انکل کا قلم قوم کے نفاق، اپنوں کے زخم اور حکمرانوں کے ظلم و ستم سے آنسو بہا رہا تھا۔ نابینا بینا میں متنازع شخصیت ابوالعلا المعری کا ذکر تھا۔ ان کی پرہیزگاری قابلِ ستائش لیکن عورتوں کی مخالفت سمجھ سے بالاتر تھی۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی چراغ فروزاں، محمد عفان کی باغی کمانڈر، طارق عزیز خان کی شوق پرواز، انور فرہاد کی خواجہ پرویز، مریم کے خان کی کولمبس ہی کیوں۔ ظفر سعید کی مدد پرخطر، الطاف شیخ کا سفرنامہ اور مختار آزاد کی سندھ کا ورثہ معلومات اور حقیقت سے پُر ناقابلِ فراموش تحریریں پڑھنے کو ملی ہیں۔ مسز غزالہ شاہین عبدالقیوم آپ کی کاوش سونے کے کنگن لیٹ پڑھی تھی واقعی لاجواب تحریر ہے۔ اللہ آپ کو مزید ترقی عطا فرمائے، آمین۔ کرسی صدارت پر رانا محمد سجاد خوب جچ رہے تھے۔ ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری کیوں بھئی اتنی چھٹیاں کس کھاتے میں کرتی ہیں؟ پرویز بلگرامی صاحب کے فرزند ارجمند کے لیے صحت اور لمبی عمر کے لیے دعاگو ہیں۔ باقی تمام ساتھیوں کے تبصرے بھی شاندار رہے۔"

☒ اعجاز حسین سٹھار نے نور پور تھل سے لکھا ہے" کل کی بات لگتی ہے لیکن اکیس سال بیت گئے ہیں۔ پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو آہ نکل جاتی ہے کیا کچھ کھودیا ہے لیکن اپنے سرگزشت پر خوب جوانی آئی ہے۔ آج کل فرقہ بندی کی بحث اور اختلاف میں مولانا اشرف علی تھانوی کے افکار اور کتابوں کے حوالے سننے اور پڑھنے میں آتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ایسے نیک لوگوں کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق دے، آمین۔ باغی کمانڈر عزم و ہمت اور بہادری کی بے مثال داستان ہے۔ ذہن رسا میں خواجہ پرویز اس لحاظ سے باکمال شاعر تھے کہ موقع محل اور سچویشن کے مطابق کم وقت میں گیت لکھ لیتے تھے۔ فلمی الف لیلہ میں ساغر صدیقی کے ذکر کے علاوہ واقعات پھیکے رہے، بھی گزارہ چلانا پڑتا ہے۔ باقی کہانیاں بھی خوبصورت تھیں۔"

اب ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہوسکے۔

عبدالعزیز، کراچی۔ ارسلا افضل، روہڑی۔ عدنان صدیقی، ملتان۔ ہاشم خان، چکلالہ۔ ہارون رند، گھوٹکی۔ جنید خان، جرمنی۔ محبوب علی، مالاکنڈ۔ سید محفوظ علی، پرتھ آسٹریلیا۔ متین احمد، ڈیلس یو ایس اے۔ شکیلہ قریشی، فیصل آباد۔ مولا بخش، میرپور ساکرو۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ کون؟

ڈاکٹر ساجد امجد

تاریخ کے دبیز پردے نے اس دو سینگوں والے کی شخصیت کو مکمل طور پر ڈھک دیا ہے۔ وہ ہ کون ہے جس کا تذکرہ قرآن مجید میں بھی آیا ہے، جس نے یاجوج ماجوج کی دراندازی روکنے کے لیے لوہے، سیسے اور تانبے سے بنی دیوار کھڑی کی تھی۔ ایسی دیوار آہن جس کے باقیات اب بھی نظر آتے ہیں، جس نے فتوحات کا سلسلہ سا قائم کیا تھا، عقل سے ماوریٰ کارنامے انجام دیے تھے مگر اس کی شخصیت اس طرح مخفی ہے کہ تحقیق کرنے والے قیاس کے گھوڑے دوڑانے کے علاوہ اب تک کچھ بھی نہیں کرپائے۔ حتمی طور پر اس کی شخصیت کا فیصلہ آج بھی ہونہیں پایا ہے کہ وہ نبی تھے یا برگزیدہ بندے یا ایک رحم دل بادشاہ؟

اس دو سینگوں والے کا تذکرہ جس کا ذکر قرآن میں آیا ہے

دن کی دھوپ نے دبے قدموں آگے بڑھنا شروع کیا تھا کہ قریش مکہ کے دو سردار نضر بن حارث اور عقبہ بن معیط اونٹنیوں پر سوار مدینہ کی طرف روانہ ہوئے۔ ان کی رفتار بتا رہی تھی کہ وہ بہت جلدی میں ہیں۔ اس تیز رفتاری سے یہ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ انہیں صرف جانا نہیں ہے بلکہ بہت جلد واپس بھی آنا ہے۔

چند چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کو عبور کرنے کے بعد یہ دونوں صحرا میں داخل ہوئے اور گرد و غبار میں گم ہو گئے۔ ان پہاڑیوں سے گزرتے ہوئے چرواہوں نے ان دونوں کو دیکھا ضرور لیکن وہ یہ کیسے بتا سکتے تھے کہ یہ دونوں کس کام سے مدینہ کی طرف بھاگے جا رہے ہیں۔

''نضر بن حارث، کیا اب ہم اتنے کمزور ہو گئے ہیں کہ ہم محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو شکست دینے کے لیے یہود سے مدد کے طالب ہوئے ہیں۔''

''بات کمزوری کی نہیں مصلحت کی ہے، عقبہ! جب تک ہمارا بس چلا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور ان کے ساتھیوں کو دبانے کی کوشش کرتے رہے لیکن یہ لوگ نہ جانے کس مٹی کے بنے ہیں اور اب تو کئی طاقتور قبیلے ان کے ساتھ ہو گئے ہیں۔ اب اگر تلوار چلی تو بڑا کشت و خون ہوگا۔ اب مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھیوں کے دل ان سے پھیر دیے جائیں۔ ان کے دلوں میں ایسے شکوک ڈال دیے جائیں کہ وہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت کی طرف سے بددل ہو جائیں۔''

''مجھے تو امید نہیں، ویسے تم اپنی سی کوشش کر کے دیکھ لو۔ میں صرف تمہارے کہنے سے تمہارے ساتھ آ گیا ہوں۔''

''علمائے یہود، پیغمبروں کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں۔ ان کے پاس الہامی کتب بھی موجود ہیں۔ ان سے پوچھا تو جائے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنے دعوے میں سچے ہیں یا جھوٹے۔'' (نعوذ باللہ)

''اس کا مطلب ہے، اب تمہارے دل میں بھی یہ بات آ گئی ہے کہ شاید وہ سچے ہیں۔'' عقبہ بن معیط نے دھوپ سے نظریں بچاتے ہوئے کہا۔

''سچی بات تو یہ ہے کہ کبھی کبھی ہم میں سے بہت سے یہ سوچنے لگتے ہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنے دعوے میں سچے ہیں لیکن دل کہتا ہے کہ کسی طرح انہیں جھٹلا دیا جائے۔ علمائے یہود ضرور اس میں ہماری مدد کریں گے۔ وہ یہ کبھی نہیں چاہیں گے کہ وہ جن پیغمبروں کو تسلیم کرتے ہیں، ان کی جگہ کوئی اور لے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ.....

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دعوے کی صداقت سے متعلق ان کی الہامی کتب میں کوئی علامت موجود ہو۔ وہاں جا کر یہ فیصلہ بھی ہو جائے گا۔

اس کے بعد دونوں خاموش ہو گئے۔ وقت گزرتا رہا، سفر کٹتا رہا۔

ایک ہفتے کے طویل انتظار کے بعد یہ دونوں پھر اپنے قبیلے (قریش) میں تھے۔ ایک مکان میں قریش کا اجلاس منعقد ہوا اور آنے والوں سے پوچھا گیا کہ علمائے یہود نے کیا جواب دیا۔ سب یہ سمجھ رہے تھے کہ علمائے یہود نے کوئی فتویٰ جاری کر دیا ہوگا جس کا سہارا لے کر ہم محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھیوں کو ورغلا سکیں گے لیکن معلوم ہوا ابھی ایک مرحلہ اور باقی ہے۔

''علمائے یہود نے تین سوالات دیے ہیں۔ اگر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان سوالوں کے جوابات دے دیے تو یہود کہتے ہیں، ان کی پیروی واجب ہے۔''

''یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ اگر انہوں نے سوالوں کے جوابات دے دیے تو پھر انہیں جھٹلانے کے لیے ہمارے پاس کیا بہانہ رہ پائے گا؟'' ایک سردار چیخ اٹھا لیکن باقی لوگوں نے اس سے اختلاف کیا۔

''محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) امی ہیں۔ ان سوالوں کے جواب کبھی نہیں دے سکتے۔ اگر دے بھی دیے تو ہمارے پاس انہیں جھٹلانے کے اور بہت سے ہتھیار ہیں۔''

''وہ کہتے ہیں ان پر خدا کی وحی آتی ہے۔''

''یہ بھی پتا چل جائے گا۔''

اب سوال یہ تھا کہ یہ سوال پوچھنے کون جائے۔؟ سب نے طے کیا کہ انہی دونوں حضرات کو جانا چاہیے جو مدینہ گئے تھے اور یہود سے ملاقات کی تھی۔

حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لیے ان دنوں یہ مشہور ہو گیا تھا کہ جو، ان سے ایک مرتبہ مل لیتا ہے، وہ اس پر ایسا جادو کر دیتے ہیں کہ وہ ان ہی کا ہو کر رہ جاتا ہے اس لیے تمام لوگ نصر اور عقبہ کو سمجھانے لگے کہ ذرا ہوشیاری سے کام لیں۔ ایسا نہ ہو کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو جادو کرنے کا موقع مل جائے۔ اتنی دیر میں ایک آدمی یہ خبر لے کر آ گیا تھا کہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس وقت حضرت ابوبکر صدیقؓ کے مکان پر تشریف فرما ہیں، لہٰذا ان دونوں کو وہیں جانا تھا۔ یہ دونوں اس مکان سے نکلے۔ راستے میں بازار پڑتا تھا۔ اس بازار سے گزرتے ہوئے بھی یہ دونوں ڈینگیں مارتے ہوئے گئے کہ بس اب محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا بھرم کھلنے والا ہے۔

یہ دونوں قریش اس طرح اعلان کرتے ہوئے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے مکان پر پہنچ گئے۔ ہلکی سی دستک پر حضرت بلالؓ دروازے پر آئے لیکن ان دونوں کو دیکھتے ہی فوراً اندر چلے گئے کہ نہ معلوم یہ کس ارادے سے آئے ہیں، پہلے اندر خبر کرنی چاہیے۔ انہوں نے اندر جا کر خبر دی اور اجازت ملنے پر دروازہ کھول دیا۔

حضرت بلالؓ نئے نئے حلقۂ اسلام میں داخل ہوئے تھے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اسلام تو وہ بہت پہلے لے آئے تھے، حلقۂ غلامی سے اب آزاد ہوئے تھے اور حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سایۂ عاطفت میں تھے اور کاشانۂ نبوت کے پہرے داری کے فرائض انجام دے رہے تھے۔

وہ دونوں سردارانِ قریش اندر آئے اور حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے ذرا فاصلے پر ہٹ کر بیٹھ گئے۔ اس میں ادب کا دخل نہیں تھا بلکہ ان کے کانوں میں یہ آواز گونج رہی تھی کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جادوگر ہیں۔''

نصر بن حارث نے سلسلۂ کلام کا آغاز کیا ''محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یہ مت سمجھنا کہ ہم تم پر ایمان لے آئے ہیں اس لیے آئے ہیں۔''

''کاش تم ایمان لے آتے، بہرحال کہو کیا کہنا ہے؟''

''ہمارے تین سوال ہیں۔ اگر تم نے ان سوالوں کے جواب دے دیے تو بے شک تمہاری پیروی ہم پر واجب ہو جائے گی، وہ سوال یہ ہیں۔

1۔ اس شخص کا حال بیان کیجئے جو مشرق و مغرب تک فتوحات کرتا چلا گیا۔

2۔ ان چند نوجوانوں پر کیا گزری جو کافر بادشاہ کے خوف سے پہاڑ پر چھپ گئے تھے۔

3۔ روح کے متعلق بیان کیجئے۔

حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان سوالوں کو غور سے سنتے رہے پھر فرمایا ''تم لوگوں کو معلوم ہے، میں کوئی بات اپنی طرف سے نہیں کہتا۔ میں اس کا جواب وحی آنے پر دوں گا۔'' چنانچہ بذریعہ وحی آپؐ پر سورۂ کہف نازل ہوئی جو آپؐ نے ان کے سامنے تلاوت کر دی۔

''اے پیغمبر! تم سے ذوالقرنین کا حال دریافت کرتے

ہیں۔ تم کہہ دو میں اس کا کچھ حال تمہیں پڑھ کر (کلام الٰہی میں) سنا دیتا ہوں۔ ہم نے اسے زمین میں حکمرانی دی تھی نیز اس کے لیے ہر طرح کا ساز و سامان مہیا کر دیا تھا تو (دنیا میں) اس نے (پہلے) ایک مہم کے لیے ساز و سامان کیا (اور پچھم کی طرف نکل کھڑا ہوا) یہاں تک کہ (چلتے چلتے) سورج کے ڈوبنے کی جگہ پہنچ گیا۔ وہاں اسے سورج ایسا دکھائی دیا جیسے ایک سیاہ دلدل کی جھیل میں ڈوب جاتا ہے اور اس کے قریب ایک گروہ کو بھی آباد پایا۔ ہم نے کہا (اب یہ لوگ تیرے اختیار میں ہیں) تو چاہے انہیں عذاب میں ڈال چاہے اچھا سلوک کر کے اپنا بنا لے۔ ذوالقرنین نے کہا ''ہم ناانصافی کرنے والے نہیں۔ جو سرکشی کرے گا اسے ضرور سزا دیں گے پھر اسے اپنے پروردگار کی طرف لوٹنا ہے، وہ (بداعمالوں کو) سخت عذاب میں مبتلا کرے گا، اس کے بعد اس نے پھر تیاری کی اور (پورب) کی طرف نکلا۔ یہاں تک کہ سورج نکلنے کی آخری حد تک پہنچ گیا۔ اس نے دیکھا سورج ایک گروہ پر نکلتا ہے جس سے ہم نے کوئی آڑ نہیں رکھی ہے۔ اس نے پھر ساز و سامان تیار کیا اور تیسری مہم میں نکلا۔ یہاں تک کہ دو پہاڑوں کی دیواروں کے درمیان پہنچ گیا۔ اس قوم نے کہا اے ذوالقرنین! یاجوج اور ماجوج اس ملک میں آ کر لوٹ مار کرتے ہیں۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ آپ ہمارے اور ان کے درمیان ایک روک بنا دیں اور اس غرض سے ہم آپ کے لیے کچھ خراج مقرر کر دیں۔ ذوالقرنین نے کہا، میرے پروردگار نے جو کچھ میرے قبضے میں دے رکھا ہے، وہی میرے لیے بہتر ہے مگر تم اپنی قوت سے میری مدد کرو۔ میں تمہارے اور یاجوج ماجوج کے درمیان ایک دیوار کھڑی کر دوں گا۔ اس کے بعد اس نے حکم دیا، لوہے کی سلیں میرے لیے مہیا کر دو پھر جب تمام سامان مہیا ہو گیا اور دونوں پہاڑوں کے درمیان دیوار اٹھا کر ان کے برابر بلند کر دی تو حکم دیا (بھٹیاں سلگاؤ اور) اسے دھونکو پھر جب (اس قدر دھونکا گیا کہ) بالکل آگ کی طرح لال ہو گئی۔ نہ تو (یاجوج و ماجوج) اس پر چڑھ سکتے تھے نہ اس میں سرنگ لگا سکتے تھے۔ ذوالقرنین نے کہا یہ جو کچھ ہوا، میرے پروردگار کی مہربانی ہے۔ جب میرے پروردگار کی فرمائی ہوئی بات ظہور میں آئے گی تو وہ اسے ڈھا کر ریزہ ریزہ کر دے گا اور میرے پروردگار کی فرمائی ہوئی بات سچ ہے، ٹلنے والی نہیں۔''

ذوالقرنین نام نہیں لقب تھا۔ اس شخص کو قرآن نے اپنی جانب سے ذوالقرنین کا لقب نہیں دیا بلکہ سوال کرنے والوں کے سوال کے پیشِ نظر اس کو دُہرایا۔

قرآن نے کہا ''وہ تجھ سے دریافت کرتے ہیں کہ ذوالقرنین کا حال بتاؤ۔''

یہ لقب ہی اس شخصیت کو پُراسرار بنانے میں مددگار ہوا۔ لوگ اس کی تحقیق میں مشغول ہو گئے اور یہ معاملہ اُلجھتا چلا گیا۔ جتنا جتنا سوچا گیا، یہ شخصیت پُراسراریت کا روپ دھارتی چلی گئی اور طرح طرح کے سوالات سامنے آتے گئے۔

قرآن کریم نے سورۂ کہف میں ایک ایسے بادشاہ کا ذکر کیا ہے، جس کا لقب ذوالقرنین ہے اور جس نے مشرق و مغرب تک فتوحات کیں اور ان فتوحات کے دوران وہ ایک ایسے مقام پر پہنچا جہاں کے بسنے والوں نے اس سے یہ شکایت کی کہ یاجوج و ماجوج ہم کو ستاتے اور وحشیانہ حملے کر کے فساد مچاتے اور بربادی لاتے ہیں، آپ ہم کو ان سے نجات دلا دیجیے۔ ذوالقرنین نے یہ سن کر ان کو تسلی و تشفی دی اور لوہے اور تانبے کو پگھلا کر دو پہاڑوں کے درمیان ایک ایسی حد قائم کر دی کہ شکایت کرنے والے یاجوج و ماجوج کے فتنے سے محفوظ ہو گئے۔

کفارِ عرب یہ پہلے ہی کہہ چکے تھے کہ اگر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان سوالوں کے جواب دے بھی دیے تو انہیں جھٹلانے کے لیے ہمارے پاس اور بہت سے ہتھیار ہیں۔ انہوں نے زور شور سے یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ حقیقی واقعہ نہیں بلکہ عرب کی ایک فرسودہ داستان اور بے سروپا کہانی کو وحی الٰہی کی حیثیت دے دی گئی ہے ورنہ تاریخی دنیا میں ذوالقرنین اور یاجوج ماجوج کی شخصیتیں اور دیوار کھڑی کرنے کا وجود کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ بعد میں مستشرقین یورپ نے بھی بے سروپا داستان ہی کہا۔

مسلمانوں کا یہ فرض تھا کہ وہ اسے داستان نہ سمجھیں۔ قرآن کہہ رہا تھا اس لیے یہ حقیقت تھی لیکن اعتقاد سے قطع نظر اسے تاریخی نقطۂ نگاہ سے ثابت کرنے کی بھی ضرورت تھی.....

ذوالقرنین کا نام کیا تھا۔ اس کا یہ لقب کیوں پڑا۔ یہ کہاں کا بادشاہ تھا، زمانہ کون سا تھا؟ یاجوج ماجوج کون سی قوم اور کہاں تھی؟ یہ وہ سوالات تھے جن کا جواب دینا ضروری تھا۔ ان سوالوں کا جواب دینے کی دقتوں نے ذوالقرنین کو عرصہ دراز تک پُراسرار شخصیت بنائے رکھا۔ اتنے اقوال سامنے آ گئے کہ یہ واقعہ واقعی داستان معلوم ہونے لگا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بعض حضرات کو یہ مغالطہ ہوا کہ سکندر مقدونی ہی وہ ذوالقرنین ہے جس کا ذکر سورۂ کہف میں کیا گیا ہے۔

اس مغالطے کی وجہ یہ ہوئی کہ قرآن میں مذکورہ ذوالقرنین وسیع حکومت کا مالک رہا ہے اور سکندر مقدونی بھی وسیع حکومت کا حکمراں رہا ہے یا اس لیے کہ وہ دو بادشاہتوں روم اور فارس کا بادشاہ ہو گیا تھا۔ لوگ اسی کو ذوالقرنین سمجھتے رہے۔ پھر اس قول کا بھانڈا بھی پھوٹ گیا۔ پُراسراریت اور بڑھ گئی۔ جب یہ نہیں تو کون؟ اور یہ نہیں تو کیوں؟

قرآن کا بیان کردہ ذوالقرنین موحد و صاحب ایمان تھا۔ اس کے محاسن میں اس کا نیک سیرت و نیک نفس ہونا شامل تھا جبکہ سکندر مقدونی یونانیوں کے قدیم مذہب اور دیوتاؤں کی پرستش کا مقلد تھا۔ اس کا ایمان ایک خدا پر نہیں تھا۔

سیرت کے اعتبار سے جابر و قاہر تھا نہ کہ نیک سیرت و نیک نفس۔

یہ بات بھی مسلم ہے کہ اس کی فتوحات کا سلسلہ مغرب کی جانب نہیں بڑھا۔

یہی وجہ ہے کہ ابن تیمیہ، ابن حجر، ابن کثیر جیسے محققین نے اس مغالطے کی پوری طرح تردید کر دی۔ کہاں ایک بت پرست جابر و ظالم سکندر مقدونی اور کہاں موحد اور نیک سیرت ذوالقرنین۔

امام رازی نے سکندر مقدونی کو ذوالقرنین کا لقب دیا ہے مگر ان کو بھی یہ اقرار ہے کہ ذوالقرنین نبی تھے اور سکندر مقدونی کافر۔

اسحٰق بن بشر نے بہ روایت سعید بن بشر نقل کیا ہے کہ ذوالقرنین کا نام سکندر تھا اور یہ سام بن نوح کی نسل سے تھا لیکن سکندر مقدونی کو بھی ذوالقرنین کہنے لگے جو رومی اور بانی اسکندریہ ہے۔

وسعت حکومت کے لحاظ سے جس طرح بعض حضرات نے سکندر مقدونی کو ذوالقرنین کا لقب دے دیا اسی طرح یمن کے بعض بادشاہوں کو اہل مغرب وسعت حکومت کی بنیاد پر ذوالقرنین کہتے آئے ہیں۔ ایک شاعر نے اپنے دادا کی تعریف ایک شعر میں بیان کی۔

"میرا دادا ذوالقرنین مسلمان تھا اور ایسا پرشوکت بادشاہ تھا کہ بہت سے بادشاہ اس کے تابع فرمان اور اس کے سامنے پست تھے۔"

عرب کے مشہور شعراء امراء القیس، اوس بن حجر اور طرفہ بن عبدہ وغیرہ کے کلام میں بھی حمیری بادشاہوں کو ذوالقرنین کہا گیا ہے۔

اسی طرح ایرانی بادشاہوں میں سے اہل عرب کیقباد اور فریدوں کو بھی ان کی قاہرانہ فتوحات کی وجہ سے ذوالقرنین کہتے تھے۔

ذوالقرنین کے نام کی طرح اس کے لقب کی وجہ تسمیہ کے بارے میں بھی بہت سی آرا سامنے آئیں جو ایک دوسرے سے متصادم بھی تھیں اور حقیقت سے دور بھی۔ فتح الباری، ابن کثیر اور دائرۃ المعارف وغیرہ میں یہ اقوال اس طرح درج ہیں۔

1۔ ذوالقرنین اس لیے کہا گیا کہ وہ روم و فارس دو مملکتوں کا مالک تھا۔

2۔ وہ فتوحات کرتا ہوا اقصائے مشرق و مغرب تک پہنچا اور دونوں جہات میں بہت سے ممالک پر قابض ہوا۔

3۔ اس کے سر میں دونوں جانب سینگ کے مشابہ تانبے کے دو غدود ابھرے ہوئے تھے۔

4۔ اس کی زلفیں دراز تھیں اور وہ ہمیشہ اپنے بالوں کے دو حصے کرتا اور ان کی پٹیاں باندھ کر دونوں کاندھوں پر ڈالے رکھتا تھا۔ ان دونوں کو "قرن" سے تشبیہ دے کر اس کو یہ لقب دیا گیا۔

5۔ اس نے ایک جابر بادشاہ کو، اپنی قوم کو توحید کی دعوت دی۔ بادشاہ یا قوم نے غضبناک ہو کر اس کے سر کے ایک جانب ایسی سخت چوٹ لگائی کہ وہ مر گیا۔ اس کے بعد دوبارہ زندہ ہو کر پھر تبلیغ کا فرض انجام دیا۔ اس مرتبہ دوسری چوٹ مار کر قوم نے اس کو شہید کر دیا۔ ضرب سے اس کے سر پر جو دو نشان پڑ گئے تھے اس وجہ سے اس کو یہ لقب دیا گیا۔

6۔ وہ نجیب الطرفین تھا اس لیے والدین کی نجابت کو قرنین کے ساتھ تشبیہ دی گئی اور ذوالقرنین لقب ہوا۔

7۔ اس نے اس قدر طویل عمر پائی کہ انسانی دنیا کے دو قرون (صدیوں) تک زندہ رہا۔

8۔ وہ جب جنگ کرتا تھا تو بہ یک وقت دونوں ہاتھوں سے تلوار چلاتا بلکہ دونوں رکابوں سے بھی ٹھوکر لگاتا تھا۔

9۔ اس نے زمین کی تاریکی اور روشنی دونوں حصوں کی سیاحت کی۔

10۔ وہ ظاہر و باطن دونوں علوم کا حامل تھا۔

علمائے سلف کے یہ اقوال بھی ذوالقرنین کی شخصیت تک پہنچنے میں مدد نہیں دیتے بلکہ پُراسراریت میں اور اضافہ

کر دیتے ہیں۔ کہیں سکندر مقدونی کو ذوالقرنین مان کر اس کے لقب کی توجیہہ کی گئی ہے، کہیں کہیں محض اندازے سے کام لیا گیا ہے۔

معاملہ پھر اسی طرح اُلجھا رہا۔

علمائے متاخرین میں سے بعض نے تو اسی غلط بات کو اختیار کر لیا کہ سکندر مقدونی ہی قرآن میں مذکور ذوالقرنین ہے اور بعض علما نے علمائے قدم کے قول کو نقل کرنے پر اکتفا کیا اور اس پر اپنی رائے کا اظہار نہیں کیا اور بعض نے بغیر کسی دلیل کے یمن کے حمیری بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ کو زیر بحث ذوالقرنین بنا دیا۔

علمائے متاخرین میں مولانا ابوالکلام نے اس سلسلے میں جو تحقیق فرمائی ہے البتہ وہ ضرور قابل توجہ ہے اور اس لائق ہے کہ اس کا خلاصہ کر کے ذوالقرنین کی شخصیت تک پہنچا جا سکتا ہے۔

علما کو مغالطے اس لیے ہوتے رہے کہ انہوں نے ذوالقرنین کی شخصیت کو قرآن کی اطلاع سمجھ کر اس پر بحث کی۔ اس بنیادی نکتے کو فراموش کر دیا کہ یہ قرآن کا بیان نہیں بلکہ یہود کی جانب سے پوچھے گئے سوال کا جواب ہے۔ اس لیے قرآن نے مزید کسی طرح صراحت محسوس نہیں کی کیونکہ یہود اس نام سے واقف تھے۔ توریت میں بھی ذوالقرنین کا نام کم از کم ایک جگہ موجود تھا۔

یہود نے اس سوال میں درحقیقت ایک ایسی شخصیت کا انتخاب کیا ہے جو ان کی مذہبی زندگی کے سلسلے میں بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اسی شخصیت کی بدولت بنی اسرائیل نے بابل کی غلامی سے نجات پائی اور ان کے قومی مرکز یروشلم (بیت المقدس) ہر قسم کی تباہی اور بربادی کے بعد اسی کے ہاتھوں دوبارہ آباد ہوا۔ یہود کے نزدیک وہ نجات دہندہ خدا کا مسیح اور خدا کا چرواہا کہلایا۔ ان کے نبیوں کے مقدس صحیفوں میں اس کے یہی القاب درج ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے سوالات میں اس شخصیت کے مسئلے کو بھی منتخب کیا۔

☆☆☆

700 ق۔م میں عراق میں دو عظیم الشان حکومتیں اپنے قاہرانہ و جابرانہ تسلط کے ساتھ قائم تھیں۔ ایک آشوری حکومت، اس کا دارالحکومت نینویٰ تھا اور دوسری بابلی حکومت۔ اس کا دارالحکومت بابل تھا لیکن 612 ق۔م میں نینوا کی حکومت کو زوال آ گیا اور اب بابلی حکومت بلاشرکتِ غیرے دونوں حکومتوں کے مقبوضات کی مالک اور وقت کی بہت بڑی طاقت بن گئی۔

ساتویں صدی ق م کے آخری دور میں بابل کی حکومت پر ایک زبردست جری اور ظالم بادشاہ سریر آرائے سلطنت ہوا۔ اس کا نام نبو کدنذر تھا اور عرب اس کو بخت نصر کہتے تھے۔ نینویٰ کی تباہی کے بعد بابل کا عروج بہت بڑھ گیا۔ ایران کی مختلف قبائلی حکومتیں بھی اس کی باج گزار بن گئیں۔ اب بخت نصر کی نظریں شام و فلسطین کے علاقوں پر بھی پڑنے لگیں جو یہود کا علاقہ کہلاتا تھا چنانچہ وہ اس کی جانب بڑھا۔ جب یہودیا کی سرزمین کے باشندوں نے یہ سنا تو ان کے ہوش و حواس جاتے رہے۔

ایک عرصے سے بنی اسرائیل کی روحانی، اخلاقی اور اجتماعی زندگی کو گھن لگ چکا تھا اور بداعمالیوں نے اس درجہ ذلیل و خوار کر دیا تھا کہ جو انبیا ان کی رشد و ہدایت کے لیے مبعوث ہوتے اور ان کو وعظ و نصیحت کرتے تو یہ ان کو قتل کر دینے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔

خدا کا عذاب نازل ہونے والا تھا۔ اس وقت کے نبی یرمیاہ علیہ السلام انہیں آگاہ کر رہے تھے۔

"دیکھو، وہ گھٹا کی طرح چڑھ آئے گا۔ اس کے ساتھ رتھ گردباد کے مانند اور اس کے گھوڑے عقابوں سے تیز تر ہیں ہم پر افسوس کہ ہم غارت ہو گئے۔

اے یروشلم! تو اپنے دل کو شرارت سے پاک کرتا کہ تو رہائی پائے۔ بُرے خیالات کب تک تیرے دل میں رہیں گے کیونکہ دان سے ایک آواز آتی ہے اور افرائیم کے پہاڑ سے مصیبت کی خبر ہے۔ قوموں کو خبر دو، دیکھو یروشلم کی بابت منادی کرو کہ محاصرہ کرنے والے دور کے ملک سے آتے ہیں اور یہوداہ کے شہروں کے مقابل للکاریں گے۔ کھیت کے رکھوالوں کے مانند وہ اسے چاروں طرف سے گھیریں گے کیونکہ اس نے مجھ سے بغاوت کی۔"

انبیا سمجھاتے رہے لیکن کوئی بات ان کی سمجھ میں نہیں آئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بخت نصر فلسطین و شام کے شہروں اور آبادیوں کو ویران و مسمار کرتا ہوا یروشلم کے دروازے پر آ کھڑا ہوا۔ لشکر سمیت داخل ہوا اور بادشاہ سردار اور تمام امرا کو قید کر لیا اور شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ تمام مال و متاع اور ہیکل میں رکھے سونے چاندی کے ظروف لوٹ لیے اور تورات کے تمام نسخے جلا دیے اور ایک لاکھ یہودیوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ہانکتا ہوا بابل لے گیا۔

اب مایوسی کے سوا بنی اسرائیل کے پاس کچھ نہیں رہ گیا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھا۔ اس گھٹاٹوپ اندھیرے میں اگر روشنی کی کوئی کرن تھی تو وہ حضرت یسعیاہ علیہ السلام اور یرمیاہ نبی کے مکاشفات اور پیش گوئیاں تھیں جن میں حضرت یسعیاہ علیہ السلام نے تقریباً ایک سوساٹھ سال پہلے اور یرمیاہؑ نبی نے ساٹھ سال قبل یہ بشارت دی تھی کہ بیت المقدس کی تباہی سے ستر سال کے بعد بنی اسرائیل دوبارہ اپنے وطن میں آزاد ہوکر واپس آجائیں گے اور خدا کا ایک مسیح (مبارک) خدا کا چرواہا (نگہبان) کہ جس کا نام خورس ہوگا، وہ بنی اسرائیل کی نجات اور یروشلم کی دوبارہ آبادکاری کا باعث بنے گا۔

ان یہودیوں کو حضرت یسعیاہ علیہ السلام کی پیش گوئی یاد آئی۔ اب تک انہوں نے اس پر توجہ نہیں دی تھی بلکہ شاید یقین بھی نہ ہو کہ ایسا ہوگا لیکن اب یروشلم کی تباہی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا اور دیکھ لیا کہ ان کے بت انہیں نہیں بچاسکے جن کے لیے وہ خوشبوئیں جلاتے رہے، وہ ان کے کام نہیں آئے۔ وہ کاہن، وہ بادشاہ جو، ان کی مذہبی اور اجتماعی زندگی کے ضامن تھے، خود گرفتار بلا ہوگئے تو انہیں یسعیاہؑ نبی کی باتیں یاد آئیں۔

''اے یعقوبؑ، اے اسرائیل! ان باتوں کو یاد رکھ کیونکہ تو میرا بندہ ہے۔ میں نے تجھے بنایا تو میرا خادم ہے۔ اے اسرائیل، میں تجھ کو فراموش نہ کروں گا۔ میں نے تیری خطاؤں کو گھٹا کے مانند اور تیرے گناہوں کو بادل کے مانند مٹا ڈالا۔ میرے پاس واپس آجا کیونکہ میں نے تیرا فدیہ دے دیا ہے...... خداوند تیرا فدیہ دینے والا ہے جس نے رحم ہی سے تجھے بنایا، یوں فرماتا ہے کہ میں خداوند سب کا خالق ہوں۔ میں ہی اکیلا آسمان کو تاننے والا اور زمین کو بچھانے والا ہوں۔ کون میرا شریک ہے؟ میں جھوٹوں کے نشانوں کو باطل کرتا اور فال گیروں کو دیوانہ بناتا ہوں۔ اور حکمت والوں کو رد کرتا ہوں اور ان کی حکمت کو حماقت ٹھہراتا ہوں اپنے خادم کے کلام کو ثابت کرتا اور اپنے رسولوں کی مصلحت کو پورا کرتا ہوں جو یروشلم کی بابت کہتا ہوں کہ وہ آباد ہوجائے گا اور یہوداہ کے شہروں کی بابت کہ وہ تعمیر کیے جائیں گے اور میں اس کے کھنڈروں کو تعمیر کروں گا۔ جو سمندر کو کہتا ہوں کہ سوکھ جا اور میں تیری ندیاں سکھا ڈالوں گا۔ جو خورس کے حق میں کہتا ہوں کہ وہ میرا چرواہا ہے اور میری مرضی بالکل پوری کرے گا۔ اور یروشلم کی بابت کہتا ہوں کہ وہ تعمیر کیا جائے گا اور ہیکل کی بابت کہ اس کی بنیاد ڈالی جائے گی۔

خداوند اپنے مسیح خورس کے حق میں یوں فرماتا ہے کہ میں نے اس کا داہنا ہاتھ پکڑا کہ امتوں کو اس کے قابو میں کروں اور بادشاہوں کی کمریں کھلوا ڈالوں اور دروازے اس کے لیے کھول دوں اور پھاٹک بند نہ کیے جائیں گے۔ میں تیرے آگے آگے چلوں گا اور ناہموار جگہوں کو ہموار کردوں گا۔ میں پیتل کے دروازوں کو ٹکڑے ٹکڑے کردوں گا اور لوہے کے بینڈوں کو کاٹ ڈالوں گا اور میں ظلمات کے خزانے اور پوشیدہ مکانوں کے خزانے تجھے دوں گا تاکہ تو جانے کہ میں خداوند اسرائیل کا خدا ہوں جس نے تجھے نام لے کر بلایا۔ میں نے تجھے ایک لقب بخشا اگرچہ تو مجھ کو نہیں جانتا۔ میں نے تیری کمر باندھی اگرچہ تو نے مجھے نہ پہچانا تاکہ مشرق سے مغرب تک لوگ جان لیں کہ میرے سوا کوئی نہیں۔''

اسی سلسلے میں دوسری پیش گوئی حضرت یرمیاہ علیہ السلام کی طرف سے سامنے آئی۔

''تم قوموں کے درمیان بیان کرو اور اشتہار دو اور جھنڈا کرو، منادی کرو۔ مت چھپاؤ کہو کہ بابل لے لیا گیا بعل رسوا ہوا۔ اس کے بت خجل ہوئے، اس کی مورتیں پریشان کی گئیں کیونکہ اتر (شمال) سے ایک قوم اس پر چڑھتی ہے جو اس کی سرزمین کو اجاڑ کر رکھ دے گی یہاں تک کہ کوئی اس میں نہ رہے گا۔ وہ بھاگے ہیں، وہ روانہ ہوئے۔ کیا انسان کیا حیوان۔ اور اسی وقت خدا کہتا ہے بنی اسرائیل آئیں گے۔ وہ اور بنی یہوداہ ایک ساتھ روتے ہوئے چلے جائیں گے اور خداوند اپنے خدا کو ڈھونڈیں گے۔ وہ اس طرف متوجہ ہوکے صیہون کی راہ پوچھیں گے کہ آؤ ہم آپ ہی خداوند سے مل کر اس کے ساتھ ایک ابدی عہد کریں جو کبھی فراموش نہ ہو۔''

یرمیاہؑ نبی سے خدا نے یہ عہد بھی کیا تھا۔

''خداوند فرماتا ہے جب ستر برس پورے ہوں گے تو میں شاہ بابل کو اور اس قوم کو اور کسدیوں کے ملک کو ان کی اور بدکرداری کے سبب سے سزا دوں گا اور میں اسے ایسا اُجاڑ دوں گا کہ ہمیشہ تک ویران رہے۔''

''خداوند کہتا ہے جب بابل پر ستر برس گزر سکیں گے تو میں تمہاری خبر لینے آؤں گا۔ تب تم مجھے پکاروگے اور میں جواب دوں گا۔ تم مجھے ڈھونڈو گے اور مجھے پالو گے۔ میں تمہاری اسیری ختم کردوں گا اور تمہیں تمہارے مکانوں میں واپس لے آؤں گا۔''

''اسرائیل کی کنواری! میں تجھے پھر آباد کروں گا اور تو

آباد ہوجائے گی۔ تو پھر دف اُٹھا کر آراستہ ہوگی اور خوشی کرنے والوں کے ناچ میں شامل ہونے کو نکلے گی۔ تو پھر سامریہ کے پہاڑوں پر تاکستان لگائے گی۔ باغ لگانے والے لگائیں گے اور اس کے پھل کھائیں گے...... دیکھو، میں شمالی ملک سے ان کو لاؤں گا اور زمین کی سرحدوں سے ان کو جمع کروں گا۔ ان کی بڑی جماعت یہاں واپس آئے گی۔ وہ روتے اور مناجات کرتے ہوئے آئیں گے، میں ان کی رہبری کروں گا۔ میں ان کو پانی کی ندیوں کی طرح راہِ راست پر چلاؤں گا جس میں وہ ٹھوکر نہ کھائیں گے کیونکہ میں اسرائیل کا باپ ہوں اور افرائیم میرا پہلوٹھا ہے اور دور کے جزیروں میں منادی کر اور کہو کہ جس نے اسرائیل کو تتر بتر کیا وہی اسے جمع کرے گا اور اس کی ایسی نگہبانی کرے گا جیسی گڈریا اپنے گلہ کی۔''

توریت ہی کے بیان کردہ زکریاہ نبی (یہ قرآن میں بیان کردہ زکریا علیہ السلام نہیں ہیں) نے تو کلام الٰہی کی زبانی ذوالقرنین کے لقب کی تصریح بھی کردی۔

''رب الافواج یوں فرماتا ہے کہ دیکھ وہ شخص جس کا نام مشاخ (سینگ) ہے اس کے زیر سایہ خوش حالی ہوگی اور وہ خداوند کے ہیکل کو تعمیر کرے گا۔ ہاں وہی خداوند کے ہیکل کو بنائے گا اور وہ صاحب شوکت ہوگا اور اس کے ساتھ کاہن بھی تخت نشین ہوگا اور دونوں میں صلح اور سلامتی کی مشاورت ہوگی۔

ان پیش گوئیوں میں بتادیا گیا تھا کہ یہود کو بابل کی غلامی سے نجات دینے والی ہستی کا ایران سے ظہور ہوگا اور اس کا نام خورس ہوگا اور لقب ذوالقرنین۔

☆☆☆

635ق۔م ایران میں قبائلی طرز حکومت رائج تھا اور ایران دو حصوں پر تقسیم تھا۔ جہاں دو چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم تھیں۔ ان میں سے شمال مغربی حصہ میڈیا کہلاتا تھا اور جنوبی حصہ پارس کے نام سے موسوم تھا مگر اس دور میں چونکہ بابل ونینوا کی حکومتیں زبردست اور قاہر حکومتیں تھیں اس لیے یہ دونوں ریاستیں نینوا کی حکومت کے زیرِ اثر اور ماتحت سمجھی جاتی تھیں لیکن جب نینوا تباہ ہوگیا اور آشوری حکومت کا خاتمہ ہوگیا تو اگرچہ میڈیا کو آزادی نصیب ہوگئی اور وہاں قومی حکومت کے جذبات اُبھرنے لگے اور ایک حکمراں شاہی خاندان بھی پیدا ہوگیا تاہم پارس اور میڈیا دونوں ریاستوں کو آزاد سلطنت قائم کرلینے کی جرأت نہ ہوسکی اور بابلی حکومت کو بے حد فروغ ہوگیا۔ بابل کے سامنے یہ ریاستیں بے اثر تھیں۔ ایسے میں قدرت نے ایک غیر معمولی ہستی کو نمایاں کیا جو ابتدا میں اگرچہ ایک چھوٹی سی ریاست انشان کا رئیس تھا لیکن حیرت انگیز طور پر اس کے عدل وانصاف اور تدبر نے میڈیا اور فارس دونوں کے اس کے قبضۂ اقتدار میں دے دیا۔ یہی وہ ہستی ہے جسے اہلِ فارس گورش، یہود خورس اور عرب کے خسرو کہتے ہیں۔

وہ خورس اوّل کے پوتے تیس پاس کی آل سے تھا۔ اس کے باپ کا نام کمبی سس (کمبوچہ یا کیقباد) تھا۔ اس کی ماں کا انتقال بچپن ہی میں ہوگیا تھا۔ یہ لوگ ہخامنشی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ کمبوچہ پُرسکون اور امن وامان کی زندگی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گزارنے کا عادی تھا۔ اسے یہ شوق نہیں تھا کہ دوسرے جنگجو حکمرانوں کی طرح میدانِ جنگ میں جائے اور دوسرے علاقے فتح کرے۔ اس کے پاس جو کوہستانی علاقہ تھا وہ اسی پر شاکر تھا۔ بس اتنا کرتا تھا کہ جب میڈیا کو مالی یا فوجی امداد کی ضرورت ہوتی، وہ آگے بڑھ کر مدد کر دیتا۔ اس سے وہ انکار نہیں کر سکتا تھا کیونکہ باج گزار تھا۔ اس کی اس شرافت سے اس کے سسرال والے ناخوش تھے اور بیوی کے مرجانے کے بعد تو سسرال والوں نے اس کا جینا حرام کر دیا تھا۔ اس کی حکمرانی چھیننے کے لیے طرح طرح کی سازشیں کرتے۔

کمبوچہ تشدد کی راہ اختیار کرنے کا تو قائل ہی نہیں تھا لیکن اپنی ثابت قدمی سے ان سازشوں کو ناکام بناتا رہا۔ ایک روز اس کے سسرالی قبیلے کا ایک بااثر آدمی کمبوچہ کے پاس آیا اور بڑی ہمدردی جتا کر اصل مطلب پر آ گیا۔

"کمبوچہ! ہم سب تمہارے ہمدرد ہیں اور رشتہ دار بھی۔ ہم کبھی نہیں چاہیں گے کہ تمہیں کوئی نقصان پہنچے لیکن یہ کہے بغیر رہا بھی نہیں جاتا کہ تمہیں نقصان پہنچنے ہی والا ہے۔"

"جب میں کسی کو نقصان نہیں پہنچاتا تو کوئی مجھے کیوں نقصان پہنچائے گا؟"

"جب نقصان پہنچانے والا کوئی ایسا دشمن نہیں جو نظر آتا ہو۔"

"جب کوئی سامنے ہی نہیں تو مجھے اس کی فکر کیوں ہو؟"

"فال نکالنے والوں نے ہمیں بتایا ہے کہ یہ جگہ تمہارے اور تمہارے بیٹے کے لیے منحوس ہے۔ تمہارا بیٹا اکلوتا بھی ہے اور کم سن بھی۔ تمہاری تو بیوی بھی مر چکی ہے۔ اگر اسے کچھ ہو گیا تو دوسرے بیٹے کی تم تمنا بھی نہیں کر سکتے۔ اس سے اچھا ہے کہ انشان چھوڑ کر کہیں چلے جاؤ۔ اپنے سسرالی رشتے داروں میں سے کسی کو جانشین بنا دو۔ جب خطرہ ٹل جائے تو واپس چلے آنا۔"

"یہ تو بہت بڑا فیصلہ ہے جو مجھے کرنا ہوگا۔ یہاں تین بڑے قبیلے ہیں جن میں سے ایک میرا سسرالی قبیلہ بھی ہے، میں چاہوں گا کہ سب قبیلے مل کر بیٹھیں۔ اگر وہ بھی یہی کہتے ہیں جو تم کہہ رہے ہو تو پھر بات دوسری ہوگی۔"

وہ شخص یہ سمجھ رہا تھا کہ کمبوچہ امن پسند آدمی ہے۔ کسی حجت کے بغیر اس کی بات مان لے گا۔ اسے ایسے ذہانت کے فیصلے کی توقع نہیں تھی جو کمبوچہ کی طرف سے سامنے آیا۔

تینوں قبائل اکھٹے ہوئے۔ کئی دن تک اس پر بحث ہوتی رہی کہ یہ جگہ منحوس ہے یا نہیں۔ پھر ایک عقل مند نے کھڑے ہو کر کہا کہ اگر انشان منحوس ہوتا تو سب کے لیے ہوتا۔ سب یہ جگہ خالی کر کے چلے جائیں صرف کمبوچہ کیوں؟ یوں ان قبائل میں اختلاف ہو گیا اور یہ طے ہوا کہ کمبوچہ کہیں نہیں جائے گا۔

قبیلوں کے سامنے اس کے سسرال والے خاموش ہو گئے لیکن اپنی خصلت سے باز نہیں آئے۔ اسے برابر تنگ کرتے رہے، کمسن خورس بڑا ہوتا رہا۔ وہ شروع ہی سے اپنے باپ کے برعکس نظر آتا تھا۔ نڈر اور بہادر۔ جب اپنے ملازم کے ساتھ گھوڑے پر بیٹھ کر نکلتا تو چھوٹا بادشاہ معلوم ہوتا۔ اس کا ملازم لوگوں سے کہتا بھی تھا کہ خورس یقیناً ایک بہترین بادشاہ ثابت ہوگا۔

خورس بارہ تیرہ سال کی عمر کو پہنچا تو کمبوچہ کے دشمنوں کی بری نظریں اس پر پڑنے لگیں۔ ماپسی قبیلہ سب سے طاقتور تھا، اس قبیلے کے کچھ لوگوں نے یہ سازش تیار کی کہ اگر خورس کو راستے سے ہٹا دیا جائے تو کمبوچہ کے بعد کوئی حکومت سنبھالنے والا نہیں ہوگا۔ اس کے بعد حکومت خود بہ خود ہمارے ہاتھ آ جائے گی۔ اس سازش میں انہوں نے خورس کی ننھیال والوں کو بھی شامل کر لیا۔ ماپسی قبیلے کا ایک نوجوان مہرور کو یہ کام سونپا گیا کہ وہ خورس کو راستے سے ہٹا دے۔ یہ کام اس کے ذمے اس لیے لگایا گیا تھا کہ وہ خورس سے دو ایک سال ہی بڑا تھا اور دونوں کے درمیان اچھی دوستی تھی۔ ایک دن وہ خورس کے پاس آیا اور اسے لے کر ایک تفریحی مقام پر چلا گیا۔

"خورس، تو نے کبھی یہ سوچا کہ تیرا باپ صرف عیلام (انشان) کا حکمراں کیوں ہے؟ میڈیا کے بادشاہوں یا بابل کے بادشاہ کی طرح بڑا بادشاہ کیوں نہیں بن گیا؟"

"مجھے کیا خبر لیکن اسے بڑا بادشاہ ضرور بننا چاہیے تھا۔"

"وہ اس لیے بڑا بادشاہ نہیں بن سکا کہ اس نے اس دیو کو ابھی تک ہلاک نہیں کیا جو اس علاقے کو منحوس بنائے ہوئے ہے۔ اگر تو اسے کسی طرح ہلاک کر دے تو تیرا باپ بہت بڑا بادشاہ بن جائے گا۔ وہ اگر بڑا بادشاہ نہیں بنا تو یقیناً تو بہت بڑا بادشاہ بن جائے گا۔ پوری دنیا پر حکومت کرے گا۔ کیا سمجھا!" مہرد نے کہا اور پھر خود ہی منہ میں ہی بڑبڑانے لگا لیکن تو اس دیو کو کیسے مار سکتا ہے، اس دیو سے لڑنا کوئی مذاق ہے۔ تیرے باپ میں ہمت نہیں ہوئی، تو تو ابھی بچہ ہے۔ ڈر کے مارے بھاگ آئے گا۔"

"تو نے یہ کیا بات کہی۔ میں بھاگنے والوں میں سے

نہیں ہوں۔ میری عمر کم ہے لیکن میرا نشانہ بہت پکا ہے۔ تو بس مجھے اس دیو کا ٹھکانا بتا دے پھر دیکھ، میں کیسا تاک کے تیر مارتا ہوں۔"

"خورس یہ خیال چھوڑ دے۔ میں تو تجھے بتا کر پچھتایا۔ خواہ مخواہ اپنی جان کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔ میں تیرے ساتھ جا نہیں سکتا۔ تجھے اکیلے جانا ہوگا اور رات بھر وہاں بیٹھنا ہوگا۔ کیا خبر کس وقت وہ دیو وہاں آئے۔ تو ڈر گیا تو دیو تجھ پر حاوی ہو جائے گا۔ تجھے کچھ ہو گیا تو خواہ مخواہ میں پکڑا جاؤں گا۔"

مہرد برابر اسے ورغلا رہا تھا لیکن اس طرح جیسے وہ اس کا ہمدرد ہو۔ خورس کے دل میں دیو سے مقابلہ کرنے کا شوق بڑھتا جا رہا تھا بالآخر مہرد نے ہامی بھر لی کہ وہ اسے اس ویرانے میں لے جائے گا جہاں وہ دیو رہتا ہے۔

"تمہیں اکیلے وہاں جانا ہوگا۔ اپنے گھوڑے کو بھی اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتے۔ میں بھی کچھ فاصلے پر تمہارا انتظار کرتا رہوں گا۔"

"میں نے کہہ جو دیا کہ میں کسی کو ساتھ نہیں لے جاؤں گا۔"

"تو پھر کل اندھیرا ہوتے ہی ہم یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔ وہاں پہنچتے پہنچتے رات ہو ہی جائے گی۔"

"کل کیوں، آج کیوں نہیں؟"

"آج تو آج سہی، اسی جگہ مل جانا۔"

مہرد دل ہی دل میں ہنس رہا تھا کہ خورس کو مرنے کی کتنی جلدی ہے۔ دیو تو کیا آئے گا، یہ بے چارہ اس ویرانے کی دہشت سے ہی مر جائے گا۔ کسی کو لاش ملی تو ملی ورنہ لاش کا بھی پتا نہیں چلے گا۔

وہ دونوں رات کا وعدہ کر کے اپنی اپنی راہ ہو لیے۔

رات کو خورس وہاں پہنچا تو اس کا کتا اس کے ساتھ تھا۔

"تم اپنے کتے کو کیوں ساتھ لے آئے؟ میں نے کہا تھا، کوئی تمہارے ساتھ نہیں جائے گا۔"

"میں نے اسے بہت دھتکارا لیکن یہ مانتا ہی نہیں۔"

مہرد چپ ہو گیا۔ اس نے سوچا یہ بے زبان کتا اگر اس کے ساتھ چلا بھی گیا تو کیا فرق پڑتا ہے۔ یہ بے چارہ تو بتا بھی نہیں سکے گا کہ اس کا مالک کیسے مر گیا۔ مہرد نے جگہ کا انتخاب پہلے ہی کر لیا تھا۔ وہ اسے لے کر اس خطرناک مقام کی طرف چل دیا جس کے متعلق واقعی یہ مشہور تھا کہ وہاں دیو رہتا ہے۔ اسی لیے لوگ اس طرف آتے ہوئے کتراتے تھے۔ رات کا اندھیرا پوری طرح قبضہ کر چکا تھا۔ دونوں طرف بڑی بڑی جھاڑیاں تھیں۔ تیز ہوا جب ان سے ٹکراتی تھی تو عجیب عجیب آوازیں نکلتی تھیں۔ ایک اونچے ٹیلے کے پاس پہنچ کر مہرد رک گیا۔

"بس خورس! اس سے آگے میں نہیں جا سکتا۔ اب تمہیں خود جانا ہوگا۔ گھوڑا بھی یہیں چھوڑنا ہوگا البتہ کتے کو چاہو تو لے جاؤ۔"

"مگر میں جاؤں کہاں؟ مجھے تو رستہ ہی سجھائی نہیں دے رہا ہے۔"

مہرد نے اسے راستہ سمجھا دیا۔ اس نے اس کے کہنے کے مطابق جھاڑیاں پار کیں اور کچے راستے پر اندازے سے چلنے لگا۔ یہ عجیب زمین تھی کہ پاؤں دھنس رہے تھے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ آگے دلدل ہو۔ یہ سوچتے ہی وہ واقعی خوف زدہ ہو گیا۔ اس نے سوچا واپس لوٹ جائے لیکن اس حرکت سے اس کی بہادری پر حرف آتا۔ وہ سنبھل سنبھل کر چلتا رہا۔ پھر وہ نشانی اسے نظر آ گئی جو اسے بتائی گئی تھی۔ زمین پر ایک بڑی چٹان اُبھری ہوئی تھی اور چاروں طرف گھنی جھاڑیاں تھیں۔ لگتا تھا اب آگے راستہ ہی نہیں ہوگا۔ وہ اسی چٹان پر بیٹھ گیا۔ اس کے کتے نے اس کے قریب ہی بیٹھ کر اپنے دونوں پاؤں آگے بڑھا دیے۔

خورس کو اب دیو کا انتظار تھا۔ اس نے کندھے سے کمان اُتار کر چٹان پر رکھ دی۔ اس کی نظریں جھاڑیوں کی طرف تھیں۔ ان جھاڑیوں کی طرف سے ہی دیو کو آنا تھا۔

وہ بیٹھے بیٹھے اُکتانے لگا تھا۔ اب اسے نیند بھی پریشان کرنے لگی تھی۔ سو بھی نہیں سکتا تھا کہ کیا خبر کس وقت وہ دیو آ جائے۔

وہ چٹان پر لیٹ گیا۔ اس کا ہاتھ قریب رکھی کمان پر تھا۔ اسی عالم میں اس کی آنکھیں بند ہو گئیں لیکن فوراً ہی ایک آہٹ پر وہ جاگ بھی گیا۔ یہ جھاڑیوں کے پیچھے کسی کے چلنے کی آواز تھی۔ اس نے لپک کر کمان اُٹھا لی لیکن ساتھ ہی اپنے کتے کی طرف دیکھا۔ اتنی واضح آہٹ ہے لیکن کتا بھونکا کیوں نہیں؟ اس کی رگوں میں خون جمنے لگا۔ وہ پہلی مرتبہ خوف زدہ ہوا تھا۔ دیو کا خوف ایسا ہے کہ کتا بھی بھونکنا بھول گیا ورنہ کسی اجنبی کی آہٹ پر اسے ضرور بھونکنا چاہیے تھا۔ پھر اسے ایک بھیانک آواز سنائی دی۔

"اے آدم زاد! اب تو چٹان سے اُتر اور زمین پر لیٹ جا۔ تو میری غذا بننے والا ہے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خورس نے پھر کتے کی طرف دیکھا۔ وہ ساکت بیٹھا اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ اس آواز پر بھی وہ بھونکنا بھول گیا تھا۔ خورس نے تیر کمان میں جڑھایا اور اس طرف چلا دیا جہاں سے آواز آئی تھی۔ کوئی چیخ نہیں اُبھری۔ اس کا مطلب ہے دیو بچ گیا لیکن اس کے بعد کوئی آواز بھی نہیں اُبھری۔ کوئی دھمکی سنائی نہیں دی۔

اب اس کا خوف دور ہو گیا تھا اور ذہن سوچنے کے قابل ہو گیا تھا۔ اس کا ذہن پھر اپنے کتے کی طرف گیا۔ قدموں کی آہٹ کسی اجنبی کی نہیں تھی۔ شاید اسی لیے کتے نے بھونکنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ وہ اجنبی نہیں تھا تو پھر کون تھا؟ مہرور یقیناً وہی تھا مگر وہ کیوں تھا؟ اب پوری بات سمجھ میں آنے لگی تھی۔

دن نکل آیا تھا۔ اب تک کوئی دیو نظر نہیں آیا تھا۔ وہ وہاں سے اُٹھا اور واپس چل دیا۔ اس کا کتا اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔

وہ واپس پہنچا تو مہرور نے پوچھا ”تو نے دیو کو دیکھ لیا؟“

”میں توصبح تک جاگتا رہا۔ مجھے تو کوئی دیو نظر نہیں آیا۔“

”آواز بھی نہیں سنی؟“

”آواز ضرور آئی تھی، مگر وہ تیری آواز تھی۔ تو مجھے ڈرانے آیا تھا۔“

”میں کیوں آؤں گا تجھے ڈرانے؟“

”تاکہ میں خوف سے مر جاؤں۔“

”تب نہیں تو اب مرے گا۔“ مہرور نے کہا اور اسے غافل دیکھ کر تلوار کا بھرپور وار کیا لیکن خورس نے وار کو خالی جانے دیا اور پلک جھپکتے کمان میں تیر جڑھا کر چلا دیا۔ یہ تیر مہرور کے گھٹنے میں پیوست ہو گیا۔ خورس گھوڑے پر سوار ہوا اور مہرور کے گھر پہنچ گیا۔

کبوچہ کا بیٹا آیا تھا۔ اس کی خاطر تواضع ان پر لازم تھی اور جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ سازش پکڑی گئی ہے تو انہوں نے اس کی اور بھی دلداری کی کہ کہیں وہ باپ کو جا کر نہ بتا دے۔

”خورس بیٹا! قبائل کا دستور ہے کہ جب کوئی شخص کسی قبیلے کا نمک کھا لیتا ہے تو دشمنی ختم ہو جاتی ہے۔ تم نے بھی ہمارا نمک کھا لیا ہے۔ تم بھی اپنے باپ کو جا کر کچھ نہیں بتاؤ گے۔ آج سے ہمارا کوئی آدمی تمہاری مخالفت نہیں کرے گا۔“

خورس خود بھی یہی چاہتا تھا اسی لیے وہ اپنے گھر جانے کے بجائے اس قبیلے میں آیا تھا۔ اب اسے یا اس کے باپ کو اس قبیلے کی طرف سے کوئی فکر نہیں رہی تھی۔ یہ اس کی ایسی ذہانت تھی جو اس کے مستقبل کا پتا دے رہی تھی۔

خورس پندرہ سال کا ہوا تھا کہ اس کے باپ کو میڈیا کی طرف سے بلاوا آ گیا۔ اسے کسی مہم پر اپنی فوج کو لے جانا تھا۔ خورس اب جوان ہو چکا تھا۔ اس کی شادی بھی ہو چکی تھی اب جانشینی کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اس نے خورس کو اپنی جگہ چھوڑا اور خود چلا گیا۔

اس کی غیر موجودگی میں خورس کو اپنی صلاحیتیں دکھانے کا خوب موقع ملا۔ وہ میڈیا سلطنت کی شان و شوکت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ اس کے دل میں بھی امنگ پیدا ہوئی کہ وہ اپنے علاقے کی خوش حالی کے لیے تگ و دو کرے۔ سوچتے سوچتے وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ کسی ملک کی خوش حالی کا مطلب ہوتا ہے عوام کی خوش حالی۔ اگر عوام خوش حال ہوں گے اور اپنے حکمرانوں سے خوش ہوں گے تو کوئی ملک اس پر غالب نہیں آ سکتا۔ اس نے کسانوں کو طلب کیا اور ان سے باز پرس کی کہ وہ فصلیں کیوں نہیں اُگاتے۔ انہوں نے بتایا کہ ان کے پاس نہ اچھے ہل ہیں، نہ دوسرے زرعی آلات جس کی وجہ سے زمینیں بنجر پڑی ہوئی ہیں۔ خورس نے حکومتی کارندوں کو حکم دیا کہ وہ شاہی خزانے سے کسانوں کی ضروریات پوری کریں اور لوہاروں کو حکم دیں کہ وہ ان کے لیے زرعی آلات بنائیں۔

خزانے میں بہت کچھ تھا لیکن ساری دولت شاہی گھرانے کے کام آتی تھی جبکہ خورس کا کہنا تھا کہ دولت بادشاہوں کے ذاتی عیش و آرام کے لیے نہیں ہے بلکہ اس لیے ہے کہ رفاہِ عالم کے کاموں میں صرف ہونی چاہیے۔

کسانوں کو نئے آلات ملے تو ان میں کام کرنے کا جذبہ پیدا ہوا۔ لوہاروں کو روزگار ملا تو وہ بھی خورس کو دعائیں دینے لگے۔

اس نے یہ سنا تھا کہ ہر اس بڑے شہر کے گرد فصیل ہوتی ہے جہاں حکمراں قیام پذیر ہوتے ہیں۔ اس کے شہر کے گرد کوئی فصیل نہیں اور نہ ہی اس کا شاہی محل شاندار ہے۔ اگر تعمیراتی کام شروع کر دیے جائیں تو ایک طرف مزدوروں کو روزگار ملے گا۔ دوسری جانب اس کی شان و شوکت میں اضافہ ہو جائے گا۔ اس نے اردگرد سے معمار اور مزدور جمع کرنے شروع کر دیے۔ میڈیا اور فارس تک سے کاریگر آئے اور اس کا ہاتھ بٹانے لگے۔ ان لوگوں کو خورس کو قریب

سے دیکھنے کا موقع ملا تو وہ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

فصیل شہر تیار ہو گئی۔ شاہی محل بھی شاندار بن گیا۔ معمار اور مزدور اپنے اپنے علاقوں میں گئے تو خورس کے سفیر بن کر گئے۔ انہوں نے خورس کے انداز حکمرانی اور رحم دلی کی تعریف کی۔

جب کبوچہ میڈیا کی مہمات سے فارغ ہو کر گھر آیا تو اس نے علاقے کی حالت ہی بدلی ہوئی دیکھی۔ سمجھ گیا کہ جوان بیٹے نے باپ دادا کی جمع پونجی لٹا دی ہے۔ سر پکڑ کر بیٹھ گیا لیکن اب اس کی صحت اتنی گر گئی تھی کہ حکومت کے کام سنبھال نہیں سکتا تھا۔ صبر کر کے بیٹھ گیا کہ خورس جو کرتا ہے کرتا رہے۔ کچھ دن بعد اس کا انتقال ہو گیا اور خورس اس کی جگہ بادشاہ بن گیا۔

خورس نے اپنی حکومت کے شروع ہی میں فارسی قبائل کو اپنے گرد جمع کر لیا۔ اس کے بعد اس نے میڈیا کے خلاف بابل کے ساتھ اتحاد کر لیا۔ میڈیا کے بادشاہ استیاگیس نے اس بغاوت کو کچلنے کی کوشش کی۔ استیاگیس کمزور حکمران تھا۔ خورس کی دریا دلی اور ہمدردی کی شہرت پھیل چکی تھی اور پھر بابل سے اس کا اتحاد ہو چکا تھا۔ میڈیا کی فوج نے اپنے بادشاہ کے خلاف بغاوت کر دی اور بادشاہ کو پکڑ کر خورس کے حوالے کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایران کے شمال مغربی حصے میڈیا اور جنوبی حصے فارس کی ریاستوں نے اس کو اپنا واحد شہنشاہ تسلیم کر لیا۔

ابھی خورس نے اپنے نئے دارالخلافہ اکتابان یا ہمدان میں اچھی طرح قدم بھی نہیں جمائے تھے کہ اسے مغرب کی جانب ایک مہم پر جانا پڑا۔

یہ مہم اس لیے پیش آئی کہ خورس سے بہت پہلے میڈیا اور فارس کے مغرب میں واقع حکومت لیڈیا ایشیائے کوچک کے درمیان رقیبانہ جنگ رہتی تھی لیکن خورس کے معاصر لیڈیا کے بادشاہ گرڈیس نے صلح کر لی تھی اور یوں جنگ و جدال کا خاتمہ ہو گیا تھا لیکن جب خورس نے میڈیا اور فارس کو متحد کر کے ایک مضبوط سلطنت قائم کر لی تو گرڈیس اسے برداشت نہ کر سکا اور میڈیا پر حملہ آور ہو گیا۔ یہ دیکھ کر خورس بھی دارالخلافہ اکتابان یا ہمدان سے نکلا۔ وہ بابل کو ایک طرف چھوڑ کر دریائے دجلہ کے ساتھ ساتھ آگے بڑھا اور دریائے فرات کو عبور کر گیا۔ اس نے گرڈیس کی طرف صلح کا ہاتھ بڑھایا لیکن گرڈیس نے طاقت کے گھمنڈ میں صلح کا ہاتھ جھٹک دیا۔

دونوں فوجیں میدان میں اُتریں لیکن لڑائی فیصلہ کن ثابت نہیں ہوئی۔ موسم سرما کی آمد آمد تھی، لہٰذا گرڈیس نے اپنی فوج کو برخاست کر دیا اور تھوڑی سی حفاظتی فوج لے کر اپنے دارالحکومت سارڈیس پہنچ گیا۔ خورس بھی ہمدان کی طرف واپس ہو رہا تھا کہ اسے معلوم ہوا کہ گرڈیس نے بابل، مصر اور یونان سے مدد کی درخواست کی ہے۔ اس سے پہلے کہ یہ طاقتیں گرڈیس کا ساتھ دیں خورس نے سارڈیس کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ گرڈیس کی فوجوں نے باہر نکل کر مقابلہ کیا لیکن شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ گرڈیس کو گرفتار کر کے خورس کے سامنے پیش کر دیا گیا۔

خورس نے اپنی روایتی رحم دلی سے کام لیتے ہوئے سارڈیس کو لوٹنے سے گریز کیا بلکہ عام معافی کی منادی کرا دی البتہ گرڈیس کے لیے حکم ہوا کہ اسے چتا میں رکھ کر زندہ جلا دیا جائے لیکن یہ محض ایک مذاق یا امتحان تھا۔ وہ گرڈیس کی جواں مردی کا امتحان لینا چاہتا تھا۔ گرڈیس اس امتحان میں پورا اُترا۔ وہ مردانہ وار چلتا ہوا گیا اور چتا میں جا کر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر ذرا بھی گھبراہٹ یا خوف نہیں تھا۔ خورس نے اسی وقت اس کے لیے بھی معافی کا اعلان کر دیا۔

صرف چودہ دن اور دو جنگوں کے بعد خورس نے میڈیا کے مضبوط دارالحکومت کو مسخر کر لیا۔

اب اگرچہ بحرِ اسود تک تمام ایشیائے کوچک اس کے زیرِ نگیں تھا مگر پھر بھی وہ آگے بڑھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ مغربی ساحل پر جا پہنچا یعنی دارالحکومت سے چودہ سو میل کے فاصلے پر۔

اہلِ جغرافیہ کہتے ہیں کہ لیڈیا کا دارالحکومت سارڈیس مغربی ساحل کے قریب تھا اور ایشیائے کوچک کے مغربی ساحل کی حالت یہ ہے کہ یہاں چھوٹے چھوٹے جزیرے نکل آنے کی وجہ سے تمام ساحل جھیل کی طرح بن گیا ہے اور بحرِ ایجین کے اس ساحل کا پانی خلیج کی وجہ سے بہت گدلا رہتا ہے اور شام کے وقت سورج غروب ہوتے ہی ایسے معلوم ہوتا ہے گویا ایک گدلے حوض میں ڈوب رہا ہے۔

قرآن حکیم کا فرمان ہے ”ہم نے کہا اے ذوالقرنین تو چاہے انہیں عذاب میں ڈالے، چاہے اچھا سلوک کرے۔ ذوالقرنین نے کہا، ہم ناانصافی کرنے والے نہیں، جو سرکشی کرے گا اسے ضرور سزا دیں گے۔ پھر اسے اپنے پروردگار

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی طرف لوٹتا ہے۔"

خورس نے میڈیا والوں سے یہی سلوک کیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے وہی ذوالقرنین ہے۔

اس نے گدلے پانی میں سورج ڈوبتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ مطلب یہ نہیں کہ سورج وہاں ڈوب رہا تھا۔ بلکہ ایسا لگتا تھا کہ سورج اسی گدلے پانی میں اُتر گیا ہے۔

قرآن نے یہ بھی کہا۔

"پس اس نے سازوسامان کیا اور پچھم کی جانب نکل کھڑا ہوا۔ یہاں تک کہ سورج کے ڈوبنے کی جگہ پہنچا، وہاں اسے سورج ایسا دکھائی دیا جیسے ایک سیاہ دلدل میں ڈوب جاتا ہے۔"

واضح ہو کہ ایسا تھا نہیں ایسا دکھائی دیا۔

یونانی مورخ ہیروڈوٹس اور بعض دوسرے مورخین اس پر متفق ہیں کہ خورس کو سب سے پہلی اور اہم مہم پچھم کی جانب پیش آئی جبکہ لیڈیا (ایشیائے کوچک) کے بادشاہ کرڈیس کے غدارانہ طرزِ عمل کے خلاف اس کو میڈیا پر حملہ کرنا پڑا بلکہ پہل اس نے کی تھی خورس کو تو اپنے دفاع میں نکلنا پڑا تھا۔

یہ مقام ایران کی جانب مغرب میں واقع ہے اور اس کا دارالحکومت۔ "سارڈیس" ایشیائے کوچک کے آخری مغربی ساحل کے قریب تھا۔ ہیروڈوٹس کہتا ہے یہ مہم ایسی معجزانہ انداز میں تھی کہ وہ مغرب کی جانب فتوحات کرتا ہوا چودہ روز کے اندر ایشیائے کوچک کے آخری ساحل پر جا کھڑا ہوا اور سارڈیس جیسے مضبوط شہر کو تسخیر کرلیا۔ اب اس کے سامنے سمندر کے سوا کچھ نہ تھا یعنی اس کے بعد آبادی ختم ہوگئی تھی۔

سمرنا کے قریب ایجین کا حال یہ ہے کہ اپنے اندر چھوٹے چھوٹے جزیرے رکھنے کی وجہ سے جھیل بن گیا ہے اور اس کا پانی بہت گدلا رہتا ہے اور شام کے وقت جب سورج ڈوبتا ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے گویا سیاہ دلدل میں ڈوب رہا ہے۔

ہیروڈوٹس کا بیان وہی ہے جو جغرافیہ دان کہتے چلے آئے ہیں اور قرآنِ عزیز کا بیان بھی اسی کی ہو بہو تصویر ہے۔

"اسے سورج ایسا دکھائی دیا جیسے ایک سیاہ دلدل میں ڈوب جاتا ہے"

اس مہم کے بعد اس کو ایران کے مشرق میں ایک اہم معرکہ آرائی پیش آئی کیونکہ مشرقِ بعید کے بعض وحشی اور صحرانشیں قبائل نے سرکشی اور بغاوت کی تھی۔ یہ باختر کے قبائل تھے اور بعض تاریخی حوالوں سے یہ تشریح ملتی ہے کہ جس مقام کو آج کل بکتران کہتے ہیں اس جگہ کے خانہ بدوش قبائل نے یہ سرکشی کی تھی۔ یہاں بھی وہ مشرقِ بعید تک گیا۔ اس کے بعد انسانی آبادی ختم ہوگئی تھی۔ پہاڑ تھے جنہوں نے آگے بڑھنے کے لیے راہ روک دی تھی۔ یہ مشرق کی سمت تھی اس لیے قرآن نے اسے مطلع الشمس سے تعبیر کیا کہ وہ مطلع الشمس تک گیا تھا۔

☆☆☆

بابل میں بخت نصر کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس کا جانشین بعل شفر بہادری سے عاری اور نہایت عیاش تھا۔ اس کے دور میں حضرت دانیال نبی تھے۔ جو اس کے دربار کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر اس سے الگ ہو گئے تھے۔ اب وہ دن بھی قریب آرہے تھے جب خدا کا وعدہ پورا ہونے والا تھا۔ بہتری کی کوئی صورت نہیں تھی یہ بجز اس کے کہ وہ پیش گوئیاں پوری ہوں جو پہلے کے نبی کرتے چلے آرہے تھے۔

حضرت دانیال نے ایک خواب دیکھا جو توریت میں انہی کی زبانی درج ہے۔

"مجھ دانی ایل کو رویا (خواب) نظر آئی۔ ایسا معلوم ہوا کہ میں قصرِ سوسن میں ہوں جو صوبہ عیلام میں ہے پھر میں نے دیکھا کہ میں دریائے اولائی کے کنارے پر ہوں۔ تب میں نے آنکھ اُٹھا کر نظر کی اور کیا دیکھتا ہوں کہ دریا کے پاس ایک مینڈھا کھڑا ہے جس کے دو سینگ ہیں۔ دونوں سینگ اونچے تھے لیکن ایک، دوسرے سے بڑا تھا اور بڑا سینگ دوسرے کے بعد نکلا تھا۔ میں نے اس مینڈھے کو دیکھا کہ مغرب و شمال وجنوب کی طرف سینگ مارتا ہے، یہاں تک کہ نہ کوئی جانور اس کے سامنے کھڑا ہو سکا اور نہ کوئی اس سے چھڑا سکا پر وہ جو کچھ چاہتا تھا، کرتا تھا۔ پھر وہ بہت بڑا ہو گیا۔

اور میں سوچ ہی رہا تھا کہ ایک بکرا مغرب کی طرف سے آیا، اس بکرے کی دونوں آنکھوں کے درمیان ایک عجیب سینگ تھا۔ وہ اس دوسینگ والے مینڈھے کے پاس آیا اور اپنے زور کے زور سے اس پر حملہ آور ہوا۔ اس نے مینڈھے کو مارا اور اس کے دونوں سینگ توڑ ڈالے اور مینڈھے میں اس کے مقابلے کی تاب نہیں تھی کوئی نہ تھا جو مینڈھے کو اس سے چھڑا سکے۔

جب بکرا نہایت بزرگ ہوا اور زور آور ہوا تو اس کا بڑا سینگ ٹوٹ گیا اور اس کی جگہ چار عجیب سینگ نکل آئے۔

اس خواب میں جبریلؑ انسانی شکل میں ظاہر ہوئے اور حضرت دانیالؑ کو اس کی تفسیر یوں بتائی۔

"اے آدم زاد! سمجھ لے کہ یہ رویا آخری زمانے کی بابت ہے۔ جو مینڈھا تو نے دیکھا اس کے دونوں سینگ میڈیا اور تایس کے بادشاہ ہیں اور وہ جسم بکرا یونان کا بادشاہ ہے اور اس کی آنکھوں کے درمیان کا بڑا سینگ پہلا بادشاہ ہے اور اس کے ٹوٹ جانے کے بعد اس کی جگہ جو چار اور نکلے وہ چار سلطنتیں ہیں جو اس کی قوم میں قائم ہوں گی لیکن ان کا اقتدار اس کا سا نہ ہوگا۔"

حضرت دانیال کے مکاشفہ اور جبریل کی تعبیر نے ان دو حکومتوں کے اتحاد کی بنا پر ہی خورس کو دو سینگوں والا (ذوالقرنین) بادشاہ کہا اور اسی تخیل کی بنا پر بنی اسرائیل میں اس کا لقب ذوالقرنین مشہور ہوا۔

یشعیاہ نبی کی پیشین گوئی کے مطابق ستر سال ہو چکے تھے اور اب بنی اسرائیل کی اسیری کے دن ختم ہونے والے تھے۔ اس کے لیے کسی سبب کی ضرورت تھی اور اس کا بہانہ بننے والا تھا۔ خورس ہی کو بیت المقدس دوبارہ آباد کرنا تھا اور بابل کی غلامی سے نجات دلانی تھی کیونکہ تمام صحیفوں میں اس نجات دہندہ کو اتر (شمال) سے آنے والا بتایا گیا تھا۔

بخت نصر کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس کا جانشین بعل شفر تھا۔ اس کی عیاشی اسے مجبور کرتی رہتی تھی کہ وہ گاہے بہ گاہے نوشی کی محفلیں برپا کرتا رہے۔ اس روز بھی ایک بڑی ضیافت تھی۔ اس کے امرا بیگمات سمیت موجود تھے۔ مے نوشی جاری تھی۔ عورت ہو یا مرد کسی کو اپنا ہوش نہیں تھا۔ خود بعل شفر کا حال یہ تھا کہ اس کی محبوبہ اس کے زانو پہ سر رکھے لیٹی تھی اور وہ جام پر جام چڑھا رہا تھا۔ اس کی محبوبہ اچانک تڑپ کر اُٹھ گئی اور جام اس کے ہاتھ سے کھینچ لیا۔

"تم اتنے عظیم الشان بادشاہ ہو اور ایسے معمولی برتنوں میں شراب پی رہے ہو۔"

"یہ..... یہ معمولی برتن نہیں ہیں میری جان، خالص سونے کے بنے ہوئے ہیں۔ بابل کے علاوہ کس بادشاہ کو یہ نصیب ہوں گے اور تم خوش قسمت ہو کہ میرے زانو پہ تمہارا سر ہے۔"

"مجھے ایک خیال آیا ہے اگر تم پورا کرسکو؟"

"میں تمہارے لیے کچھ بھی کرسکتا ہوں۔"

"تمہارا باپ یروشلم کے ہیکل سے جو ظروف نکال لایا تھا وہ ابھی تک خزانے میں پڑے ہوئے ہیں، آج وہ دن ہے کہ ان برتنوں میں شراب پی جائے۔ ان امرا کو بھی تو معلوم ہو کہ تم کتنے عظیم باپ کے کتنے عظیم بیٹے ہو۔"

"بنی اسرائیل تو ان برتنوں کو مقدس کہتے چلے آئے ہیں۔ کیا میں ان میں شراب پی لوں؟"

"ان غلاموں کو بھی تو معلوم ہو کہ ہمارے دیوتا مقدس ہیں یا ان کا خدا۔ دانیال اور اس کے ساتھی جنہیں تمہارے باپ نے نجانے اتنی آزادی کیوں دے دی تھی کہ اسے اہم عہدے پر فائز کیا تھا؟ وہ ہر وقت تمہاری مخالفت کرتا رہتا ہے، خود کو نبی کہتا ہے۔ یروشلم کے برتنوں میں شراب پینے سے اس کا سر بھی نیچا ہو جائے گا۔"

بعل شفر اس کی کوئی بات نہیں ٹالتا تھا اور اس وقت اس کا نشہ بھی آخری حدوں کو چھو رہا تھا۔ اس نے حکم دیا کہ پروشلم کے ظروف حاضر کیے جائیں۔

یہ حکم جاری ہوتے ہی اس کے بے دین امرا خوشی سے چلا اُٹھے اور اپنے دیوتاؤں کے نعرے بلند کرنے لگے۔ تھوڑی دیر میں یہ برتن حاضر ہو گئے۔ امرا اور ان کی بیویاں ان برتنوں میں مے نوشی کرنے لگیں اور ساتھ ساتھ لکڑی اور پتھر کے بتوں کے حمد یہ گیت گانے لگے۔ خدا کے غضب کو جوش آگیا۔ خدا کو وہ وعدہ یاد آیا جو اس نے یرمیاہؑ سے کیا تھا۔

"دیکھ میں ان کی سرزمین سے بڑی قوموں کے ایک گروہ کو برپا کروں گا اور بابل پر لے آؤں گا۔ بابل لوٹا جائے گا۔ سب جو اسے لوٹیں گے آسودہ ہوں گے۔ اس لیے خداوند بھی کہتا ہے دیکھ میں تیری حجت ثابت کروں گا اور تیرا انتقام لوں گا اور بابل کے دریا سکھا دوں گا اور اس کے سوتے خشک کردوں گا اور بابل کھنڈر ہو جائے گا اور گیدڑوں کا مقام اور حیرانی کا باعث ہوگا اور بڑی ہلاکت کی صدا بابل کی سرزمین سے آتی ہے کیونکہ خداوند کو بابل کو غارت کرنا ہے ..... بابل کے بھاری شہر کی دیواریں سراسر ڈھائی جائیں گی اور اس کے بلند پھاٹک آگ سے جلا دیے جائیں گے۔

یروشلم کے برتنوں میں شراب پی جارہی تھی کہ اچانک پُراسرار انگلیاں ظاہر ہوئیں اور انہوں نے شمعدان کے مقابل بادشاہی محل کی دیوار پر کچھ لکھ دیا۔ بعل شفر نے ان انگلیوں کو لکھتے ہوئے دیکھا۔ پہلے تو وہ سمجھا کہ اسے نشہ ہو گیا ہے جو وہ ایسی انہونی بات دیکھ رہا ہے۔ اس نے آنکھیں مل کر پھر دیکھا پھر اس نے اپنی محبوبہ سے کہا جو میں دیکھ رہا ہوں کیا تم بھی وہ دیکھ رہی ہو۔ وہ تو ایسا ڈری کہ بے ہوش ہو گئی۔ بعل شفر بھی ایسا خوف زدہ ہوا کہ اس کے پاؤں کانپنے لگے۔ اتنی دیر میں ہاتھ غائب ہو چکا تھا لیکن دیوار پر جو لکھا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گیا وہ لکھا تھا۔ اس کے امرا نے آگے بڑھ کر عبارت کو پڑھا'' منے منے تقیل وفرسین'' عبارت پڑھی جارہی تھی لیکن کوئی اس کا مفہوم سمجھنے سے قاصر تھا۔ نہ یہ ظاہر ہوتا تھا کہ یہ کس زبان میں لکھا گیا ہے۔

''نجومیوں اور فال گیروں کو حاضر کیا جائے'' بعل شضر خوف زدہ آواز میں چلآیا۔

اس کے امرا اتنے خوفزدہ تھے کہ بہت سے تو سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے کہ نہ جانے آگے کیا ہو اور وہ کس مصیبت میں پھنس جائیں لیکن انہوں نے باہر نکل کر اس کا اظہار ضرور کردیا جس سے عام لوگ بھی واقف ہوگئے کہ محل کے اندر کیا واقعہ ظہور میں آیا ہے۔

بابل میں نجومیوں اور فال گیروں کی کمی نہیں تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے حاضر ہوگئے۔

''جو کوئی اس نوشتے کو پڑھے اور اس کا مطلب مجھ سے بیان کرے ارغوانی خلعت پائے گا اور اس کی گردن میں زریں طوق پہنایا جائے گا اور وہ مملکت میں تیسرے درجے کا حاکم ہوگا۔

اس لالچ میں یہ سب ایک دوسرے پر گرتے پڑتے تھے۔ ہر ایک کی کوشش تھی کہ وہ پہلے اس کا مطلب بیان کردے اور انعام کا مستحق ہو لیکن ان میں سے کوئی بھی نہ تو اس نوشتے کو پڑھ سکا نہ مطلب بیان کرسکا۔ اس امید کو ہاتھ سے جاتے دیکھ کر بعل شضر کے چہرے کا رنگ متغیر ہوگیا۔ اب کون ایسا ہے جو اس عبارت سے مجھے آگاہ کرے گا؟ بہت سے امرا نے اسے یہ بھی مشورہ دیا کہ وہ پروانہ کرے اور اور اس عبارت کو بھول جائے لیکن اس نے بھی تہیہ کرلیا تھا کہ عبارت کا مفہوم جانے بغیر چین سے نہیں بیٹھے گا۔ وہ رات بھر کروٹیں بدلتا رہا۔ صبح تک اس کی حالت بیماروں سے بدتر ہوگئی۔ تب اس کی ماں اسے دیکھنے کے بہانے محل میں آئی۔

''ماں، اس عبارت میں شاید میری موت لکھی گئی ہے۔ اس لیے میری یہ حالت ہوئی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ پڑھنے والے اسے پڑھتے کیوں نہیں مجھے معلوم تو ہو اس میں لکھا کیا ہے؟''

''میرے بیٹے تو ابد تک جیتا رہ۔'' اس کی ماں نے اسے تسلی دی ''تیری مملکت میں ایک شخص ہے جس میں قدوسی روح ہے۔ تیرے باپ نے اسے ساحروں اور نجومیوں کا سردار بنایا تھا۔ تو بھی اسے بلا اور اس سے اپنا مطلب نکال۔''

''تم کہیں دانیال کی بات تو نہیں کررہی ہو جس کو میرا باپ یہوداہ سے لایا تھا اور یہاں اس نے خود کو نبی مشہور کررکھا ہے۔''

''وہ خود کو کچھ بھی سمجھتا رہے لیکن خوابوں کی تعبیر عقدہ کشائی اور حل مشکلات کی قوت اس میں ہے۔''

''میں نے اسے اپنے دربار سے دور کردیا ہے۔ اب میری عزت یہ گوارہ نہیں کرتی کہ اسے بلاؤں۔''

''اس کے علاوہ کوئی دوسرا شخص نہیں ہے جو اس عبارت کو پڑھ سکے۔''

بعل شضر، حضرت دانیال کو بلانا نہیں چاہتا تھا لیکن اب مشکل ایسی آن پڑی تھی کہ اس کے بغیر چارہ بھی نہیں تھا۔ مجبور ہوکر اس نے اجازت دے دی اور حضرت دانیال کو اس کے حضور حاضر کردیا گیا۔

''اس نوشتے کو پڑھ اور اس کا مطلب بیان کر۔ اگر تو نے اسے پڑھ لیا تو ارغوانی خلعت پائے گا اور تیری گردن میں زریں طوق پہنایا جائے گا اور تو مملکت میں تیسرے درجے کا حاکم ہوگا۔''

حضرت دانیال نے فرمایا ''مجھے تیرے انعام سے سروکار نہیں لیکن میں تیرے لیے اس عبارت کو ضرور پڑھوں گا۔'' حضرت دانیال آگے بڑھے اور عبارت پر نظر ڈالتے ہوئے بادشاہ سے مخاطب ہوئے۔

''اے بادشاہ! خدا تعالیٰ نے تیرے باپ کو سلطنت اور عزت بخشی، مگر اس کے دماغ میں گھمنڈ سا گیا۔ اس کا تخت جاتا رہا اور وہ بنی آدم کے درمیان سے ہانک کر نکال دیا گیا۔ خدا تعالیٰ انسان کی مملکت میں حکمرانی کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے اس پر قائم کرتا ہے۔''

''اے بادشاہ! تو اس کا بیٹا ہے، تیرے باپ پر جو گزری تو اس سے واقف بھی تھا لیکن افسوس تو نے اپنے دل سے عاجزی نہ کی بلکہ آسمان کے خداوند کے حضور اپنے آپ کو بلند کیا اور اس کی ہیکل کے ظروف میں تو نے شراب پی اور لکڑی کے بتوں کی حمد کی جو نہ دیکھتے ہیں، نہ سنتے ہیں۔ اس خدا کی بزرگی بیان نہ کی جس کے ہاتھ میں تیرا دم ہے۔ پس اس طرف سے ہاتھ کا یہ حصہ بھیجا گیا اور یہ نوشتہ لکھا گیا۔''

''میں نے تجھ سے باتیں بنانے کے لیے نہیں کہا ہے۔ مجھے تو یہ پڑھ کر سنا کہ اس نوشتہ میں لکھا کیا ہے؟''

''اس نوشتے میں لکھا ہے۔ ''منے منے تقیل وفرسین'' اور اس کے معنی یہ ہیں ''خدا نے تیری مملکت کا حساب کیا اور اسے

تمام کر ڈالا۔ تو ترازو میں تولا گیا اور کم نکلا۔ تیری مملکت تقسیم ہوئی اور فارسیوں کو دے دی گئی۔''

اس واقعے کی خبر جب عام ہوئی تو بابل کی رعایا نے چند افسروں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ خورس کے پاس جائیں اور اس سے عرض کریں کہ آپ کی ایمان داری، عدل وانصاف اور رعایا پروری کی شہرت نے ہم کو مجبور کیا کہ ہم آپ کو دعوت دیں کہ آپ ہم کو بعل شضر کے مظالم سے نجات دلا کر اپنی رعایا بنالیں۔ لوگوں کو یہ خیال اس لیے بھی آیا تھا کہ وہ انبیا کی پیش گوئیاں سنتے آرہے تھے اور اس لیے بھی کہ خورس کی فتوحات اور اس کی عدل گستری کا اس وقت تک شہرہ ہوچکا تھا۔

اس وفد نے خورس سے ملاقات کی۔ خورس نے ان کا خیر مقدم کیا اور ان کو اطمینان دلایا کہ وہ مشرقی مہم سے فارغ ہوکر ضرور بابل پر حملہ کرے گا اور ان کو بعل شضر کے مظالم سے نجات دلائے گا۔

یہ وہ وقت تھا کہ خورس کی فتوحات اس درجہ وسیع ہوچکی تھیں کہ ایران کے مغرب میں وہ بحرۂ شمالی سے لے کر بحیرۂ اسود کے آخری ساحل تک قابض ہوچکا تھا اور مشرق اقصیٰ میں مکران کے پہاڑوں تک بلکہ دریائے سندھ تک فتح کرچکا تھا اور شمال یا کاکیشیا کے پہاڑی سلسلے تک۔ اور اب اسے بابل کی طرف متوجہ ہونا پڑ رہا تھا۔ وہ یہ موقع گنوانا نہیں چاہتا تھا کیونکہ بابل کی رعایا اس کی گرویدہ ہوچکی تھی۔ بعل شضر کی فوج کے کئی اعلیٰ عہدے دار خورس کے ساتھ مل گئے تھے۔ انہی میں حکومت بابل کا ایک حکمران بھی تھا جسے خورس نے اس مہم کا سردار بنایا۔

بابل کو فتح کرنا آسان نہیں تھا۔ اس عہد میں بابل سے زیادہ ناقابلِ تسخیر کوئی اور مقام نہیں تھا۔ اس لیے کہ اس کی شہر پناہ اس درجہ تہ در تہ اور مستحکم تھی کہ کوئی فاتح اس کی تسخیر کی جرأت نہیں کرسکتا تھا لیکن بابل کی رعایا خورس کے ساتھ تھی اور پھر اسرائیلی پیغمبروں کی خوش خبریاں اس تک پہنچتی رہی تھیں۔ انہی کے سہارے وہ نکلا۔ اس نے اپنی فوجوں کو پہاڑی دروں میں سے گزارا اور زرخیز میدانی علاقوں میں آ نکلا۔ راستے میں آنے والے شہر اس کے سامنے ہتھیار ڈالتے چلے گئے۔ بلآخر بابل کے اُفق پر اس کا لشکر طلوع ہوا۔

بعل شضر بہادر نہیں تھا لیکن بابل کا بادشاہ ہونے کا غرور تو رکھتا تھا۔ اس نے بھی تیاری شروع کردی۔ خورس نے اس وقت بہترین جنگجو ہونے کا ثبوت دیا۔ وہ جانتا تھا کہ بابل ناقابلِ تسخیر ہے۔ اس کی فصیلوں کو سر کرنا آسان نہیں۔ معمولی سی فوج بھی دفاع کرسکتی ہے۔ اس کی منشا تھی کہ بابل کی فوج کو میدان میں لایا جائے۔

بعل شضر کی ناتجربہ کاری اسے بے قرار کررہی تھی کہ وہ اپنی فوج کو کھلے میدان میں لڑنے کے لیے بھیجے۔ خورس کو پَل پَل کی خبریں مل رہی تھیں۔ اسے خبر ملی کہ بعل شضر کل سورج طلوع ہونے کے بعد اپنی فوجیں باہر نکالے گا۔ تجربہ کار خورس رات کے اندھیرے میں معائنے کے لیے نکلا۔ اس کے سپاہی بیچ میدان میں خندق کھودنے میں مشغول تھے۔ یہ کام کئی راتوں سے ہو رہا تھا اور اب مکمل ہونے کو تھا۔ یہ خندق نہ زیادہ گہری تھی نہ چوڑی لیکن جس مقصد کے لیے کھودی گئی تھی اس کے لیے بہت تھی۔ اس نے اپنے پیدل دستے کو خندق کے کنارے کنارے کھڑا کردیا۔ سوار اور تیرانداز پیچھے تھے۔

یہ عجیب ترتیب تھی ورنہ آگے تو سوار دستہ ہوتا ہے۔ جب بعل شضر کا ٹڈی دل لشکر میدان میں آیا تو اس نے بھی عجیب وغریب ترتیب کو دیکھا اور خورس کی بے وقوفی پر ہنسے بغیر نہ رہ سکا۔ ان کے گھڑ سواروں نے نیزے سیدھے کیے اور تیز رفتاری سے پیدل دستے کی طرف دوڑنا شروع کیا۔ خورس کے سپاہی ساکت کھڑے تھے۔ بابلی لشکر کے تصور میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ راستے میں خندق کھودی جاچکی ہے۔ ان کی آنکھیں خورس کے لشکر پر جمی ہوئی تھیں۔ ان کے گھوڑے ہوا سے باتیں کررہے تھے کہ اچانک خندق سامنے آگئی۔ گھوڑے خندق عبور نہ کرسکے اور ایک دوسرے سے ٹکراتے ہوئے خندق میں گرتے چلے گئے۔ جس نے رُکنے کی کوشش کی وہ خندق میں نہیں تو خندق سے باہر گرا۔ بس یہ انجام دیکھتے ہی خورس کے تیراندازوں نے تیروں کی بوچھاڑ کردی۔ بابلی فوجی اس قدر سراسیمہ ہوگئے تھے کہ تیر کھا کھا کر گر رہے تھے لیکن تیر چلانے کی ہمت نہیں تھی۔ پھر ایسی بھگدڑ مچی کہ جس کا جس طرف منہ اُٹھا بھاگ کھڑا ہوا۔ ان کا تعاقب کرتی ہوئی خورس کی فوج بابل میں داخل ہوگئی۔ شہری گھروں میں دبکے بیٹھے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ جب شہر فتح ہوتے ہیں تو شہروں کو لوٹا جاتا ہے لیکن کہیں سے کوئی چیخ سنائی نہیں دی تھی۔ کسی عمارت سے آگ کے شعلے بلند نہیں ہوئے تھے۔ پھر انہوں نے یہ منادی سنی۔

''بادشاہوں کا بادشاہ خورس۔ میڈیا اور فارس کو متحد

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرنے والا خورس۔ شہریوں سے کچھ لینے نہیں انہیں کچھ دینے آیا ہے۔ کسی کمزور پر ہاتھ نہیں اُٹھایا جائے گا۔ کسی گھر کو نذر آتش نہیں کیا جائے گا۔ کوئی فصل برباد نہیں کی جائے گی۔ ہاں جو مقابلے پر آئے گا اس سے جنگ کی جائے گی۔"

شہریوں نے اس آواز کو سنا۔ دروازے کھڑکیاں کھلنے لگیں۔ لوگ گھروں سے باہر نکل آئے۔ انہوں نے ایسا رحم دل بادشاہ نہیں دیکھا تھا۔ وہ بے خوف تھے اور اس کی شان میں گیت گا رہے تھے۔

پورے بابل میں صرف ایک جگہ تھی جہاں سپاہیوں کا ہجوم تھا اور وہ تھا شاہی محل۔ تھوڑی دیر میں خبر آ گئی کہ بعل شضر قتل کر دیا گیا۔

اس قتل کے خلاف کہیں سے بھی کوئی آواز بلند نہیں ہوئی۔ بابل کے شہری بعل شضر کے مظالم سے اتنے تنگ تھے اور خورس کی منادی نے انہیں اتنا خوش کر دیا تھا کہ کوئی بھی اس قتل کے خلاف بولنے کو تیار نہیں تھا۔

جب شہر کے انتظامات مکمل ہو گئے تو خورس گھوڑے پر سوار ہوا اور شہر میں داخل ہو گیا۔ اس کی پذیرائی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ لوگوں نے اسے چھڑانے والا مان لیا۔

یرمیاہ نبی نے پیش گوئی کی تھی کہ جلاوطنی کا زمانہ 70 برس پر محیط ہے۔ اس کے بعد بابل تباہ ہو جائے گا اور اسیر اپنے وطن کو واپس لوٹیں گے۔

اس نبوتی پیغام کی تحریری نقلیں بابل پر گردش کرتی رہی تھیں۔ خورس کی آمد کے بعد ان پر انہیں بھی یقین آ گیا جو پہلے یقین نہیں کرتے تھے۔

خورس نے دربار جمایا تو یہوداہ کے رہنما حضرات عزرا فقیہہ، حضرت دانیال، حجی نبی اور زکریا بن برقیاہ جو، اب تک جلاوطنوں کا حوصلہ بڑھاتے رہے تھے اور انہیں اسیری سے رہائی کی خوش خبری سناتے رہے تھے، خورس کے پاس آئے۔ ان حضرات نے خورس کو وہ پیش گوئیاں دکھائیں جو حضرت یرمیاہ علیہ السلام نے یہود کو غلامی سے نجات دلانے والی ہستی کے متعلق کی تھیں۔

خداوند کا کلام جو یرمیاہؑ کی زبانی آیا تھا، پورا ہوا۔ خداوند نے شاہ فارس خورس کا دل ابھارا۔ اپنی مملکت کے پہلے ہی سال میں اس نے منادی کروائی اور اس تحریر کا فرمان جاری کیا۔

"شاہ خورس یوں فرماتا ہے کہ خدا نے زمین کی سب مملکتیں مجھے بخشی ہیں اور مجھے تاکید کی ہے کہ میں یروشلم میں اس کے لیے ایک مسکن بناؤں۔ پس تمہارے درمیان کوئی اس قوم میں سے ہے اس کا خدا اس کے ساتھ ہو اور یروشلم کو جو یہوداہ میں ہے، جائے اور خداوند اسرائیل کے خدا کا گھر جو یروشلم میں ہے، بنائے (خواہ ہی ہے) جو نہ چاہے وہ چاندی اور سونے اور مال سے مدد کرے اور علا اس کے وہ خدا کے گھر کے لیے جو یروشلم میں ہے رضا ہدیہ دے۔"

جو برتن یروشلم سے لائے گئے تھے اور جن میں بعل شضر نے شراب پی تھی، خورس نے خزانچی سے نکلوائے اور گن کر یہوداہ کے امیر شیس بضر کو دیے۔

تقریباً پچاس ہزار یہودی، بیل گاڑیوں اور دیگر ذرائع آمدورفت کو استعمال کرتے ہوئے بابل سے یروشلم کی طرف روانہ ہوئے۔

یہی وہ احسان تھا جسے یہودیوں نے ہمیشہ یاد رکھا اور خورس کو اپنا نجات دہندہ کہتے رہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس سے اچھی طرح واقف تھے اور اسی کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کیا۔

☆☆☆

بابل کی فتح سے پہلے وہ مغرب و مشرق کی مہمات سر کر چکا تھا۔

معتبر تاریخی شہادتیں ثابت کرتی ہیں کہ خورس نے تین قابل ذکر مہمات سر کیں۔ چنانچہ بابل کی فتح کے بعد ہم اسے ایران سے شمال کی جانب پیش قدمی کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔

اس مہم میں وہ بحر کیسپین (خزر) کو داہنی جانب چھوڑتا ہوا کاکیشیا کے پہاڑی سلسلے تک پہنچ گیا۔ ان پہاڑوں میں اس کو ایک درہ ملا جو دو پہاڑوں کے درمیان پھاٹک کی طرح نظر آتا تھا۔ یہاں اس کو ایک ایسی قوم ملی جس کی زبان سے وہ ناواقف تھا۔ پھر بھی کسی نہ کسی طرح اس قوم نے اس سے یاجوج ماجوج قبائل کے تاراج کی شکایت کی۔ یہ وحشی قبائل اس درے سے نکل کر آتے تھے اور تاخت و تاراج کر کے لوٹ جاتے تھے۔ ہر حملے میں سیکڑوں جانیں جاتی تھیں اور مال و اسباب الگ لٹ جاتا تھا۔ وہ قوم چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی کہ ہمیں یاجوج ماجوج سے نجات دلاؤ۔ اس سے بچاؤ کے لیے ایک ہی صورت تھی کہ دونوں پہاڑوں کے درمیان ایک دیوار کھڑی کر دی جائے۔ خورس نے اس قوم سے کہا کہ

لوہے کے ٹکڑے جمع کر کے اس کے پاس لائے۔ ان ٹکڑوں سے اس نے ایک دیوار بلند کر دی پھر حکم دیا بھٹیاں سلگاؤ اور اسے دھونکو۔ اس قدر دھونکا گیا کہ لوہا آگ کی طرح لال ہو گیا اور ایک مضبوط دیوار تیار ہو گئی۔ یاجوج ماجوج نہ اس پر چڑھ سکتے تھے اور نہ اس میں سرنگ لگا سکتے تھے۔

جب دیوار اُٹھ چکی تو خورس نے اس قوم سے کہا کہ......

"یہ جو کچھ ہوا میرے پروردگار کی مہربانی ہے۔ جب میرے پروردگار کی مہربانی ہوئی، بات ظہور میں آئے گی تو وہ اسے ڈھا کر ریزہ ریزہ کر دے گا۔ یعنی میں نے اپنی کوشش سے تمہیں یاجوج ماجوج کے حملوں سے نجات دلانے کے لیے دیوار کھڑی کر دی ہے اب خدا کی مرضی وہ اس دیوار کو کب تک قائم رکھتا ہے۔"

☆☆☆

جس طرح ذوالقرنین کی شخصیت عرصہ دراز تک پُراسراریت کا لبادہ اوڑھے رہی اور پھر عقدہ یہ کھلا کہ ایرانی خورس ہی ذوالقرنین تھا جسے یونانی سائرس کہتے تھے۔ اسی طرح یاجوج ماجوج کا افسانہ بھی کچھ کم پراسرار نہیں بلکہ ابھی تک ان کے بارے میں طرح طرح کی روایتیں مشہور ہیں۔

ان تمام روایات میں قدرِ مشترک یہ ہے کہ یاجوج وماجوج ایک ایسے قبائل کا مجموعہ ہیں جو جسمانی و معاشرتی اعتبار سے عجیب و غریب زندگی کے حامل ہیں۔

☆☆☆

یاجوج وماجوج کی پُراسراریت مرحلہ بہ مرحلہ کھلتی چلی گئی اور علمائے تاریخ بہ زور تحقیق اس نتیجے پر پہنچے کہ اقوام وقبائل کے دو بڑے سرچشمے رہے ہیں جہاں سے انسانی سیلاب نکلے اور دوسرے علاقوں تک پھیلتے چلے گئے۔ ایک سرزمین حجاز اور دوسرا منگولیا کا وہ علاقہ جو شمال مشرق میں واقع ہے اور سطح زمین کا بلند اور مرتفع حصہ ہے۔ یاجوج وماجوج کا تعلق اسی علاقے سے تھا جو منگولیا تاتار کہلاتا ہے۔ ہمسایہ چینی قوم ان کے دو بڑے قبائل کو موگ اور یوچی کہتے تھے۔ یہ آج کی نہیں ہزاروں سال پہلے کی بات ہے۔ یہی "موگ" ہے جو تقریباً چھ سو برس قبل مسیح یونان میں میگ اور میگاگ بنا اور عربی میں ماجوج ہوا اور یہی "یوچی" یونان میں یوگاگ اور عبرانی و عربی میں جوج اور یاجوج کہلایا چنانچہ یہ نام توریت میں بھی بیان ہوئے ہیں۔ حزقیل علیہ السلام کے صحیفے میں یوں کہا گیا ہے۔

"اور خداوند کا کلام مجھ کو پہنچا اور اس نے کہا کہ اے آدم زاد! تو جوج کے مقابل جو ماجوج کی سرزمین کا ہے اور روش اور مسک اور توبال کا سردار ہے اپنا منہ کر اور اس کے خلاف نبوت کر اور کہہ کہ خداوند یہوداہ یوں کہتا ہے کہ دیکھ اے جوج روش اور مسک اور توبال کے سردار میں تیرا مخالف ہوں اور میں تجھے سزا دوں گا اور تیرے جبڑوں میں ہنسیاں۔ دیکھ میں تیرا مخالف ہوں۔ اے جوج روش اور مسک اور توبال کے سردار، اور میں تجھے پلٹ دوں گا۔"

ان ناموں کی تفصیل میں توریت کے مفسرین کہتے ہیں، جوج سے مراد یوگاگ سے اور ماجوج سے میگاگ اور روش سے روس اور مسک سے مراد ماسکو اور توبال سے بحر اسود کا بالائی علاقہ مراد ہے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ توریت بھی اس سے اتفاق کرتی ہے کہ لفظ یاجوج اور ماجوج ان قبائل کے لیے مخصوص تھا جو منگولیا اور کاکیشیا سے لے کر دور تک مشرق میں پھیلتے چلے گئے تھے۔ یہ مزید معلوم ہوتا ہے کہ حزقیل علیہ السلام کے زمانے تک روس کا علاقہ تہذیب و تمدن سے دور وحشی قبائل کا وطن تھا۔

تقریباً ایک ہزار قبل مسیح سے لے کر خزر اور بحرِاسود کا علاقہ وحشی اور خونخوار قبائل کا مرکز بنا ہوا تھا جو مختلف ناموں سے موسوم ہوتے رہے ہیں۔ انہی میں ایک زبردست قبیلہ تھا جو تاریخ میں "سنتھین" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ وسطِ ایشیا سے بحرِاسود کے شمالی کناروں تک پھیلا ہوا تھا اور اطراف میں مسلسل حملے کرتا رہتا تھا۔ وہ یاجوج وماجوج جن کی شکایت ذوالقرنین (خورس، سائرس) تک پہنچی یہی سنتھین قبائل تھے۔ یہ ایک اور ثبوت اس بات کا ہے کہ خورس ہی ذوالقرنین تھا۔ قرآن نے یوں تذکرہ کیا ہے۔

"اے ذوالقرنین! یاجوج وماجوج اس ملک میں آ کر لوٹ مار کرتے ہیں۔"

اس تاریخی بحث سے پُراسراریت کا تار و پود بکھر کر رہ گیا اور معلوم ہوا کہ وہ کوئی عجیب الخلقت مخلوق نہیں بلکہ عام انسانوں کی طرح ہیں اور انسانوں کی عام آبادی کی طرح وہ بھی حضرت نوح علیہ السلام کی ذریت میں سے ہیں اور یہ وہی ہیں جن کا تعلق منگولیا (تاتار) کے وحشی قبائل سے ہے جنہیں چینی لوگ موگ اور یوچی کہتے تھے جو بگڑ کر یاجوج اور ماجوج ہو گیا۔

حافظ عمادالدین ابن کثیر بھی اپنی تاریخ میں اس نتیجے پر پہنچے ہیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"یافث (بن نوحؑ) تاتاریوں کا نسلی باپ ہے، پس یاجوج وماجوج تاتاریوں ہی کی ایک شاخ ہیں اور منگولیا کے قبائل کے منگولی ہیں اور دوسرے تاتاریوں کے مقابلے میں بہت زیادہ طاقتور اور بہت زیادہ فسادی اور لوٹ مار مچانے والے ہیں۔"

مشہور مورخ ابن خلدون کا بھی یہی خیال ہے "ساتویں اقلیم کے نویں حصے میں مغرب کی جانب ترکوں کے وہ قبائل آباد ہیں جن کو قپچاق اور چرکس کہا جاتا ہے اور مشرق کی جانب یاجوج کی آبادیاں اور دونوں کے درمیان کوہ قاف حد فاصل ہے۔ اور ساتویں اقلیم کے دسویں حصے میں ماجوج کی بستیاں ہیں جو مسلسل آخر تک چلی گئی ہیں۔

جب یہ قبائل دنیا کے مختلف حصوں میں جا کر آباد ہوئے اور بہت سے قبائل اپنے مرکز ہی میں وحشی اور صحرائی بنے رہے تو اس اختلاف تمدن ومعیشت نے ایسی صورت اختیار کرلی کہ ان قبائل کے وحشی جنگجو تو اسی طرح یاجوج وماجوج کے نام سے موسوم رہے مگر متمدن اور شہری قبائل نے مقامی خصوصیات وامتیازات کے ساتھ ساتھ اپنے ناموں کو بھی بھلا دیا اور نئے ناموں سے شہرت پائی مثلاً ہندوستان کے آرین اصل کے اعتبار سے منگولین نسل ہونے کے باوجود تاریخ میں ان ناموں (یاجوج ماجوج) سے یاد نہیں کیے جاتے۔ یاجوج وماجوج کا نام صرف ان قبائل کے لیے مخصوص کردیا گیا جو اپنی گزشتہ غیر متمدن زندگی میں اپنے مرکز کے اندر موجود ہیں۔

ان قبائل کو روکنے کے لیے ہی ذوالقرنین سے "سد" بنانے کی فرمائش کی گئی تھی۔

سد کا معاملہ بھی نہایت پُراسراریت کا حامل ہے۔ مختلف تاریخی زمانوں میں متعدد "سد" تعمیر کی گئیں۔ ان میں سے کون سی "سد" خورس (ذوالقرنین) نے تعمیر کی تھی اور کہاں؟

یاجوج وماجوج کی تاراج کا دائرہ نہایت وسیع تھا۔ ایک طرف کاکیشیا کے نیچے بسنے والے ان کے ظلم وستم سے نالاں تھے تو دوسری جانب تبت اور چین کے باشندے بھی ان کی دستبرد سے محفوظ نہ تھے۔ ان کی لوٹ مار سے بچنے کے لیے مختلف مقامات پر سدیں تعمیر کی گئیں۔

ان میں سے ایک "سد" وہ ہے جو دیوار چین کے نام سے مشہور ہے۔ یہ دیوار ایک ہزار میل طویل ہے۔ دوسری سد وسطِ ایشیا میں بخارا اور ترمذ کے قریب واقع ہے اور اس کے محل وقوع کا نام دربند ہے اور پُرلطف بات یہ ہے کہ روسی علاقے داغستان میں واقع تیسری سد بھی دربند کے نام سے مشہور ہے۔

داغستان سے مغرب کی جانب کاکیشیا کے اندرونی حصوں میں بڑھا جائے تو یہاں ایک چوتھی سد ملتی ہے جو قفقاز یا جبل قاف کی سد کہلاتی ہے۔ یہ سد دو پہاڑوں کے درمیان بنائی گئی ہے۔

یہ سب دیواریں شمال میں ہیں اور ایک ہی ضرورت کے تحت بنائی گئی ہیں، لہٰذا یہ معلوم کرنا سخت مشکل ہوجاتا ہے کہ ان میں ذوالقرنین کی سد کون سی ہے۔ دیوار چین کو چھوڑ کر باقی تین سدوں پر بحث ہوتی رہی۔ مورخین کا اختلاف برقرار رہا۔

قرآن نے اس دیوار سے متعلق چند نشانیاں بتادی تھیں۔ ایک یہ کہ یہ دیوار دو پہاڑوں کے درمیان ہے اور دوسری یہ کہ یہ دیوار اینٹ گارے سے نہیں بنائی گئی ہے بلکہ لوہے کے ٹکڑوں سے تیار کی گئی ہے جس میں پگھلا ہوا تانبا شامل کیا گیا تھا۔

"یہاں تک کہ جب ذوالقرنین دو پہاڑوں کے درمیان پہنچا تو ان دونوں کے اس طرف ایک ایسی قوم کو پایا جن کی بات وہ پوری طرح نہیں سمجھتا تھا۔ کہنے لگے اے ذوالقرنین، بلاشبہ یاجوج وماجوج اس سرزمین میں فساد مچاتے ہیں۔"

"میں تمہارے اور اس کے (یاجوج وماجوج) درمیان ایک موٹی دیوار قائم کردوں گا۔ تم میرے پاس لوہے کے ٹکڑے لے آؤ۔ یہاں تک کہ پہاڑ کی دونوں چوٹیوں کے درمیان جب دیوار کو برابر کردیا تو اس (ذوالقرنین) نے کہا کہ دھونکو یہاں تک کہ جب دھونک کر اس کو آگ کردیا، کہا لاو میرے پاس پگھلا ہوا تانبا کہ اس پر ڈالوں۔"

قرآن کی اس روشنی میں وسطِ ایشیا میں بخارا اور ترمذ کے قریب واقع سد کو سدِ ذوالقرنین نہیں کہہ سکتے کیونکہ یہ اینٹ اور گارے سے بنی تھی۔ داغستان میں واقع سد بھی پوری لوہے کی بنی ہوئی نہیں ہے صرف پھاٹک لوہے کے ہیں البتہ وہ سد جو داغستان سے مغرب کی سمت آگے بڑھ کر دربال میں پہاڑ کی دو چوٹیوں کے درمیان بنائی گئی ہے، قرآنی تصریحات کی ترجمانی کرتی ہے کہ یہ دیوار لوہے اور پگھلے ہوئے تانبے سے تیار کی گئی ہے۔ یہی وہ دیوار ہے جسے ذوالقرنین (خورس) نے تعمیر کیا۔

ان تینوں دیواروں میں سے کسی ایک کو بھی سدِ سکندری نہیں کہہ سکتے اس لیے کہ سکندر کی فتوحات کی تاریخ جو کہ سامنے ہے اس سے کسی طرح یہ ثابت نہیں ہوتا کہ سکندر کو اس غرض کے لیے کسی سد کے قائم کرنے کی ضرورت پیش آئی ہو کیونکہ اس کے دور میں یاجوج اور ماجوج کا کوئی حملہ تاریخ میں موجود نہیں۔ سدِ سکندری اس لیے مشہور ہوئی کہ بہت دن تک سکندر ہی کو ذوالقرنین سمجھا جاتا رہا تھا۔

سد ذوالقرنین کے لیے یہ روایت مشہور ہے کہ یاجوج وماجوج "سد" کو کھودتے رہتے ہیں پھر یہ کہہ کر کام ختم کردیتے ہیں کہ اب وہ اس قابل ہوگئی ہے کہ کل اس کو کھود کر گرا سکوں گے لیکن جب دوسرے دن آتے ہیں تو اسے پہلے سے بھی زیادہ مستحکم ومضبوط دیکھ کر پھر کھودنا شروع کردیتے ہیں۔ مدت سے یہ عمل جاری ہے۔ پھر جب قیامت قریب آئے گی تو یہ دیوار گر جائے گی۔ اس قوم کا خروج ہوگا۔ یہ تمام دنیا کا پانی پی جائیں گے اور فتنہ وفساد پھیلائیں گے، وغیرہ۔

یہ روایات اس لیے جڑ پکڑ گئیں کہ سورۂ کہف کی بیان کردہ عبارت کو بعض مفسرین نے فرمانِ الٰہی سمجھ لیا۔

"یہ میرے پروردگار کی رحمت ہے۔ پھر جب میرے رب کا وعدہ آئے گا تو اس کو گرا کر ریزہ ریزہ کردے گا اور میرے پروردگار کی فرمائی ہوئی بات سچ ہے۔"

سورۂ انبیا میں کہا گیا "یہاں تک کہ جب کھول دیے جائیں گے یاجوج وماجوج اور وہ زمین کی بلندیوں سے دوڑتے ہوئے آئیں گے۔"

ان دونوں باتوں سے عام طور پر مفسرین نے یہ سمجھا کہ یاجوج وماجوج سدِ ذوالقرنین میں محصور ہوگئے ہیں اور یہ سد قیامت تک اسی طرح صحیح سالم کھڑی رہے گی۔

ان دونوں بیانات کو جوڑ کر مفسرین نے یہ نتیجہ نکالا کہ قیامت تک یہ دیوار کھڑی رہے گی جبکہ ذوالقرنین نے صرف یہ کہا تھا کہ جب تک خدا چاہے گا دیوار کھڑی رہے گی اور سورۂ انبیا میں صرف یہ مذکور ہے کہ قیامت کے قریب اس قوم کا خروج ہوگا۔ اس میں سد کا کہیں ذکر نہیں۔ صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ قبائل بے پناہ سیلاب کی طرح امڈ پڑیں گے اور تمام کائنات میں فسادِ عظیم برپا کریں گے۔ اس کے بعد قیامت برپا ہوگی لیکن اس خروج سے ذوالقرنین کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ اس سے پہلے ہی ٹوٹ پھوٹ چکی ہوگی چنانچہ ہوا بھی یہی۔ عرصہ دراز کے بعد ان قبائل نے بحیرۂ یورال اور بحرِ خزر کا درمیانی راستہ پالیا۔ پھر سدِ ذوالقرنین میں بھی رخنہ آ گیا۔

ان قبائل میں سے چند منگولین قبائل نے اپنے مرکز سے نکل کر قرب وجوار میں پھیلنا اور چھوٹے چھوٹے حملے کرنا شروع کردیا۔ آخرکار چھٹی صدی ہجری میں چنگیز خان ان کا قائد بن گیا۔

☆☆☆

ایران کے قدیم مذہب میں خدائے واحد کا کوئی تصور موجود نہیں تھا۔ عقائد کی بنیاد اس تصور پر قائم تھی کہ کائنات کا نظام دو مخالف قوتوں کی کارفرمائی میں ہے۔ ایک خیر اور نیکی کے دیوتا ہیں اور دوسرے شر اور بدی کے دیوتا ہیں جن سے صرف بدی اور بُرائی کا دور ہوتا ہے یعنی خالق خیر ایک جدا قوت ہے اور خالق شر دوسری قوت ہے اور تمام عالم پر ان ہی دو متضاد قوتوں کی حکومت ہے اور ان ہی کے تصادم پر نظام کائنات میں خیر وشر کا غلبہ ہوتا رہتا ہے۔ خیر کا دیوتا یزداں ہے اور شر کا دیوتا اہرمن۔

اس لیے آگ کو روشنی کا میدا قرار دے کر یزداں کی قربت حاصل کرنے کے لیے قابل پرستش سمجھا گیا اور آتش پرستی کو مذہب کا جزو اعظم سمجھا گیا۔ آتش پرستی ان کا مذہب بن گیا جس کے پیرو موگوش (مجوسی) کہے جاتے تھے۔

جس سال یعنی 550 میں خورس نے میڈیا کے تخت پر قدم رکھا (اسی سال شمال مغربی ایران میں ایک ہستی کا ظہور ہوا۔ یہ ابراہیم زردشت کی شخصیت تھی۔ مورخین کہتے ہیں ابراہیم زردشت دانیالؑ یا یرمیاہؑ کے شاگرد اور فیض یافتہ تھے)

ابراہیم زردشت نے ایران کے مجوسیوں میں دین الٰہی کا اعلان کیا۔ انہوں نے بتایا کہ کائنات میں خیر وشر کے دیوتاؤں کا کوئی تصور نہیں بلکہ سارے عالم پر صرف ایک ہستی بلاشرکت غیرے مالک ہے۔ یہ "اہورامزدا" ہے۔ وہی تمام کائنات کا خالق ہے حتیٰ کہ دیوتا بھی (جنہیں تم سمجھتے ہو) دیوتا نہیں اس کی مخلوق ہیں۔ پھر کیسی عجیب بات ہے کہ تم خالق کو چھوڑ کر مخلوق کی پرستش کرتے ہو۔ آگ کی پرستش محض گمراہی ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ اس عالم کے علاوہ ایک دوسرا عالم (آخرت) ہے اور وہاں دو جدا جدا مقامات ہیں۔ ایک نیکوکاروں کے لیے اور دوسرا بدکاروں کے لیے۔ اس لیے گناہوں کو چھوڑو اور نیکی کو اختیار کرو۔

ابراہیم زردشت کی کتاب "اوستا" کے مضامین کی ابتدا شیطانی وسوسوں سے پناہ اور خدائے رحمٰن ورحیم کی مدح وثنا سے ہوتی ہے جس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ زردشت کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تعلیم دینِ حق کی تعلیم ہے۔ بہت سی الہامی کتابوں کی طرح اوستا بھی اب اصلی حالت میں نہیں، لیکن یہ جملے اب بھی محفوظ ہیں۔

ابراہیم زردشت کی تبلیغ سے ایران میں دین حق کا اجرا ہوا لیکن ایران اس تعلیم کو زیادہ دیر قائم نہیں رکھ سکا۔ 400 ق م کے بعد اس مذہب کا انحطاط شروع ہوگیا۔ ایک جانب روم و یونان کے خارجی اثرات نے اس کو متاثر کیا اور دوسری جانب ایران کے قدیم مذہب مجوس نے دوبارہ سر اُٹھایا۔ اس کے خدوخال بگڑنے لگے اور آہستہ آہستہ قدیم مجوسی مذہب کے امتزاج کے ساتھ اس نے ایک نئی شکل اختیار کرلی۔ اب یہی مجوسی مذہب کے نام سے موسوم ہے۔ آتش پرستی اس کا جزواعظم ہے۔

خورس بھی ایران کے قدیم مذہب (مجوس) کے بجائے دین حق کا تابع اور ایمان باللہ اور توحید الٰہی کا داعی تھا اور اس کے بیٹے اور جانشین دارا کا بھی یہی مذہب تھا۔

خورس کے جانشین دارا نے اپنے زمانہ حکومت میں مضبوط چٹانوں پر کتبے نقش کرائے تھے۔ ان میں سے ہر ایک پر یہ عقیدہ نقش ہے۔

''خدائے برتر اہورموزہ ہے۔ اسی نے زمین پیدا کی، اسی نے آسمان بنایا اور وہی ہے جس نے دارا کو بہتوں کا تنہا حکمران بنایا۔''

تعمیر بیت المقدس کے لیے جو فرمان خورس نے جاری کیا اس میں صاف لکھا تھا ''خداوند آسمان کے خدا نے زمین کی ساری مملکتیں مجھے بخشیں...... وہی خدا ہے جو یروشلم میں ہے۔''

''سنہرے روپہلے برتن یروشلم کی ہیکل میں اپنی اپنی جگہ میں پہنچائے جائیں اور خدا کے گھر میں رکھے جائیں۔''

خورس اور دارا کے مومن ہونے اور ایران کے قدیم مذہب سے بیزار رہنے پر سب سے بڑی شہادت دارا کا یہ تبلیغی اعلان ہے۔

''یہ وہی زندہ خدا ہے جو ہمیشہ سے قائم ہے اور اس کی سلطنت لازوال ہے اور آخر تک رہے گی۔ وہی چھڑاتا اور بچاتا ہے اور آسمان وزمین میں وہی نشانیاں دکھاتا ہے۔''

خورس ایک خدا پر ایمان رکھتا تھا۔ وہ جس ہستی کو اہورموزہ کہہ کر پکارتا ہے، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ دینِ حق پر تھا۔ عربی کا ''ایل'' اور ایران کا اہورموزہ ایک ہی ہستی کے دو نام ہیں۔

قرآن میں جس ذوالقرنین کا ذکر ہے وہ موحد اور صاحبِ ایمان ہے۔ خورس بھی اپنے وقت کے سچے دین کا پیرو تھا۔ خدائے واحد کا پرستار اور آخرت کا قائل تھا۔ اس اعتبار سے خورس ہی دراصل ذوالقرنین تھا۔

یسعیاہ نبی کی پیش گوئی اور تاریخ دونوں اس بات پر متفق ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا بھی یہی خیال ہے کہ ایران کا یہ بادشاہ خورس تھا جس نے میڈیا اور فارس کو ملا کر بادشاہت کی۔ یہودیوں کو اس سے اس لیے دلچسپی تھی کہ ان کے انبیا کے الہامات کے مطابق وہ ان کا نجات دہندہ تھا۔ توریت میں ایک جگہ اسے ذوالقرنین لکھا گیا ہے، اس کا یہی لقب قرآن میں دُہرایا گیا تاکہ یہود اچھی طرح سمجھ لیں کہ قرآن کس سے مخاطب ہے۔

خورس کا یہ لقب شاہی خاندان میں بھی مقبول تھا۔ اسی لیے اس کے مرنے کے بعد اس کا جو مجسمہ بنوایا تھا وہ اس کے اس لقب کی ترجمانی کرتا تھا۔ 1838ء میں یہ سنگی مجسمہ اصطخر کے قریب کھنڈرات سے دریافت ہوگیا۔ اس دریافت کے بعد شک وشبے کی ہر دیوار گر گئی۔ یہ مجسمہ یسعیاہ نبی کے مکاشفے اور حضرت دانیال علیہ السلام کے خواب کی تصویر ہے۔

یسعیاہ نبی کے صحیفے میں ایک جگہ اسے ''عقاب'' کہا گیا تھا۔

''میں خدا ہوں اور مجھ سا کوئی نہیں جو ابتدا سے انتہا تک احوال اور قدیم وقتوں کی باتیں جو، اب تک پوری نہیں ہوئی بتاتا ہوں۔ اور جو کہتا ہوں میری مصلحت قائم رہے گی اور میں اپنی ساری مرضی پوری کروں گا جو ''عقاب'' کو پورب سے لاؤں گا۔ اس شخص کو جو میرے ارادوں کو پورا کرے گا۔''

(واضح ہو کہ بابل پر حملہ کرنے سے قبل خورس مشرق کی مہم میں مشغول تھا۔ اس مہم کے بعد وہ بابل آیا تھا)

حضرت دانیال علیہ السلام نے عالمِ خواب میں دو سینگوں والا مینڈھا دیکھا تھا۔ یہ مجسمہ اس خواب کی بھی ترجمانی کرتا ہے۔

اس مجسمے میں خورس کا جسم اس طرح دکھایا گیا ہے کہ اس کے دونوں طرف عقاب کی طرح پر نکلے ہوئے ہیں اور سر پر مینڈھے کی طرح دو سینگ ہیں۔ (دوسینگوں والا یعنی ... ذوالقرنین)

اوپر ایک کتبہ کندہ ہے جس کا بڑا حصہ ٹوٹ کر ضائع

...ہوگیا مگر جس قدر باقی ہے وہ یہ بتانے کے لیے کافی ... تمثیل کی شخصیت واضح ہوجائے۔ اس سے معلوم ہوگیا ... میڈیا اور فارس کی مملکتوں کو دوسینگوں سے تشبیہ دینے کا ... ایک مقبول اور عام تخیل تھا اور قیاس ہے کہ خورس کو ہی ... ذوالقرنین کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔

دنیا میں کسی اور بادشاہ کا مجسمہ اسی تخیل کے ساتھ نہیں ... یا گیا۔ اگر کوئی اور ذوالقرنین ہوتا تو ایک مجسمہ کہیں اور بھی ... تا۔

قرآن کہتا ہے ''ہم نے اس کو حکمرانی عطا کی اور اس ... لیے ہر طرح کا سازوسامان مہیا کردیا تھا۔''

توریت اور تاریخ دونوں اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں ... خورس نے ایران کی مختلف قبائلی حکومتوں کو اپنی بادشاہت ... شامل کیا بلکہ بابل ونینوا کی عظیم الشان حکومتوں پر بھی ... بض ہوا۔ خداوند تعالیٰ نے اس کو تمام سازوسامان مہیا کیے۔

قرآن کہتا ہے خورس نے تین قابلِ ذکر مہمات سر کیں۔ ... ریخ سے ثابت ہوچکا کہ وہ مغرب، مشرق اور شمال کی ... ف گیا اور ان علاقوں میں اس کی حکومت قائم ہوئی۔

خورس ہی اگر ذوالقرنین تھا تو وہ مومن بھی تھا اور عادل ... ی۔ قرآن نے اس کا ایک مقولہ نقل کیا ہے ''ذوالقرنین نے ... کہا ہم ناانصافی کرنے والے نہیں ہیں۔ جو سرکشی کرے گا، ... ضرور سزا دیں گے۔ پھر اسے اپنے پروردگار کی طرف لوٹنا ... وہ (بداعمالوں) کو سخت عذاب میں مبتلا کرے گا اور ... کام کرے گا تو اس کے بدلے میں اس کو بھلائی ملے گی۔''

قرآن کہتا ہے ذوالقرنین نے دوسری مہم مشرق کی ... سر کی اور وہ چلتے چلتے جب سورج نکلنے کی آخری حد پر ... تو اس کو وہاں خانہ بدوش قبائل سے واسطہ پڑا۔

تاریخ کہتی ہے کہ خورس کو دوسری مہم مشرق کی جانب ... آئی جبکہ مکران کے خانہ بدوش قبائل نے سرکشی کی جو کہ ... کے دارالحکومت سے اقصا کے مشرق میں پہاڑی علاقے ... آباد تھے۔

حیرت انگیز طور پر مطلع الشمس اور مغرب الشمس کی ... طلاحات قرآن کی طرح توریت نے بھی استعمال کی ہیں ... خورس سورج نکلنے اور ڈوبنے کی حد تک پہنچا۔

... یسعیاہ نبی کے صحیفے میں درج ہے ''میں نے اپنے ... یعقوب اور اپنے برگزیدہ اسرائیل کے لیے تجھے تیرا ... صاف صاف لے کر بلایا۔ میں نے تجھے مہربانی سے پکارا ... نہیں جانتا، میں ہی خداوند ہوں اور کوئی نہیں میرے سوا۔ میں نے تیری کمر باندھی تاکہ لوگ سورج کے نکلنے (مطلع الشمس) کی اطراف سے سورج غروب ہونے (مغرب الشمس) کی اطراف تک جانیں کہ میں ہی خداوند ہوں اور میرے سوا کوئی نہیں۔''

اور زکریا نبی کے صحیفے میں بنی اسرائیل کے متعلق کہا گیا۔

''رب الافواج فرماتا ہے، دیکھ میں اپنے لوگوں کو سورج کے نکلنے (مطلع الشمس) کے ملک سے ہے اور سورج کے غروب ہونے (مغرب الشمس) کے فلک سے چھڑالوں گا اور میں انہیں لاؤں گا اور وہ (بنی اسرائیل) یروشلم کے درمیان سکونت کریں گے۔''

مطلع الشمس اور مغرب الشمس کی اصطلاحات سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ ذوالقرنین ساری کائنات کا بلاشرکت غیرے حکمران بن گیا تھا۔ تاریخ میں ایسی بادشاہت کسی بھی بادشاہ کے لیے ثابت نہیں بلکہ اس سے مراد صرف اتنی ہے کہ ذوالقرنین اپنے مرکز سے اقصائے مشرق اور اقصائے مغرب تک پہنچا۔ مغرب میں وہ اس حد تک پہنچا جہاں خشکی کا سلسلہ ختم ہوکر سمندر شروع ہوجاتا ہے اور مشرق میں اس حد تک پہنچا کہ وہاں خانہ بدوش قبائل کے سوا کوئی شہری آبادی نہیں تھی۔ ان اصطلاحات سے دنیا کے دو کونے مراد نہیں ہیں بلکہ مشرق اور مغربی جہات مراد ہیں۔

خورس کے تاریخی حالات اور قرآن کے بیان کردہ اوصاف بتاتے ہیں کہ خورس ہی کا لقب ذوالقرنین تھا۔ وہ خورس جسے یونانی سائرس کہتے ہیں اور عرب کیخسرو۔ یہ شخصیت سکندر کی نہیں ہوسکتی جیسا کہ بعض لوگوں نے کہا۔ سکندر مقدونی کے بارے میں مورخین قطعی طور پر بتاتے ہیں کہ وہ مشرک اور بت پرست تھا۔ خود کو دیوتا کی اولاد کہتا تھا اور دوسروں سے اپنی پرستش کرواتا تھا۔

ذوالقرنین کی تین مہمات کا ذکر تاریخ میں تفصیل سے ملتا ہے۔ اس کی برعکس سکندر مقدونی کا مغرب کی سمت دور تک جانا ثابت نہیں ہوتا۔ وہ اپنے دارالخلافہ مقدونیہ کی مغربی جھیل سے آگے نہیں گیا۔

ذوالقرنین کے دیگر واقعات کی طرح اس سوال پر بھی پُراسراریت کی دھند چھائی ہوئی ہے کہ وہ نبی تھے یا محض بادشاہ؟

سلف صالحین اور متاخرین کی اکثریت اس جانب ہے کہ ذوالقرنین صالحین میں سے ہیں اور نیک نفس بادشاہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھے۔ وہ نبی یا رسول نہیں تھے۔

حضرت علیؓ کی روایت میں یہ قول صراحت سے ملتا ہے۔

”ذوالقرنین نہ نبی تھے نہ فرشتہ وہ ایک انسان تھے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کو محبوب رکھا پس اللہ تعالیٰ نے بھی ان کو محبوب رکھا۔

اسی روایت میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ تھے۔

حضرت علیؓ کے علاوہ حضرت عبداللہ بن عباس کا بھی یہی مسلک ہے کہ ذوالقرنین نبی نہیں تھے بلکہ ایک نیک اور صالح بادشاہ تھے چنانچہ عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں۔

”ذوالقرنین نیک اور صالح بادشاہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے اعمال کو پسند فرمایا اور اپنی کتاب (قرآن) میں اس کی تعریف فرمائی اور وہ فاتح کامیاب بادشاہ تھا۔

اسی طرح حضرت ابوہریرہؓ کا رجحان بھی اسی طرف ہے۔ وہ بھی ذوالقرنین کو صالحین میں سے مانتے تھے۔ البتہ ان اقوال کے ہوتے ہوئے بھی متاخرین میں ابوالکلام آزاد نے کسی تسایل کی بنا پر یہ لکھا ہے کہ ذوالقرنین نبی تھے۔

☆☆☆

خورس کی بیوی کاسندان کی ذہنی حالت کچھ دنوں سے ٹھیک نہیں تھی۔ اسے یہ وہم ہو گیا تھا کہ وہ دیوی بن چکی ہے۔ کچھ دنوں سے اس پر شدید دورے پڑ رہے تھے۔ اس دیوانگی میں اول فول بکتی رہتی تھی اور اب تو مار پیٹ بھی شروع کر دی تھی۔ اس نے غیر متعلق لوگوں کو کاسندان کے پاس جانے سے روک دیا تھا بلکہ اب تو وہ خود بھی اس کے پاس جانے سے گریز کر رہا تھا۔

کئی دن ہو گئے تھے کہ وہ اس کے پاس نہیں گیا تھا پھر ایک دن یہ بری خبر سننے کو ملی کہ کاسندان بے ہوش ہو کر گر پڑی ہے۔ خورس طبیبوں کو ہمراہ لے کر اس کے پاس پہنچا تو وہ بے سدھ پڑی تھی اور اس کی ناک سے خون جاری تھا۔ طبیب تین شب و روز اس کے سرہانے بیٹھے رہے لیکن اسے بچا نہ سکے۔

اس کی موت کے بعد خورس یوں خاموش رہنے لگا جیسے پتھر کا مجسمہ۔ وہ کیا گئی محبت کرنے والی ہر ہستی چلی گئی۔ اب اس کے لیے ہر چہرہ اجنبی ہو گیا تھا۔ سلطنت کے کاموں سے بھی کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی تھی۔ تنہا بیٹھا رہتا اور شاید ماضی کی یادیں کریدتا رہتا۔ دسترخوان پر بھی تنہا بیٹھتا۔ اس کا یہ رویہ دیکھ کر سب سہم گئے۔ محل کی رونق ویرانے میں تبدیل ہو گئی۔ بیوی کی قبر پر روزانہ حاضری دینا اس کا معمول بن گیا تھا لیکن یہاں بھی کوئی محافظ اس کے ساتھ نہ ہوتا۔

اس روز وہ دسترخوان پر بیٹھا تو اس کی نظر بے اختیار سامنے کی دیوار پر چلی گئی۔ دیوار پر کسی مصور کا تخیل دعوت نظارہ دے رہا تھا۔ پتھر کی سل پر کسی ماہر سنگ تراش نے اس کی تصویر اس طرح بنائی تھی کہ خورس اپنے دونوں بازو پھیلائے اس طرح کھڑا تھا جیسے عقاب اپنے پر پھیلاتا ہے۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ اس فنکار کو انعام ضرور دیتا لیکن اس فن پارے کو دیکھ کر وہ کسی اور ہی خیال میں گم ہو گیا۔

کچھ دیر بعد اس نے اپنی بادشاہت کے مہندسوں کو طلب کیا۔

”مجھے اپنے مقبرے کے لیے ایک عمارت درکار ہے۔ تم لوگ جگہ کا انتخاب کرو اور عمارت کا خاکہ تیار کر کے مجھے دکھاؤ۔ یاد رکھو، میری منظوری کے بغیر ہرگز کام شروع نہ کیا جائے۔ جیسے یہ تصویر کسی نے میری مرضی کے بغیر بنا دی۔“

”آپ مقبرے کی باتیں کر کے ہم غلاموں کو مایوس نہ فرمائیں۔“

”ہر ایک کو خدائے واحد کی طرف لوٹنا ہے اس میں مایوسی کی کیا بات ہے، کسی کو معلوم تھا کاسندان مر جائے گی۔“

مہندسوں نے خاکے تیار کرنے شروع کر دیے۔ کئی نقشے خورس کو دکھائے گئے لیکن وہ سب کو مسترد کرتا چلا گیا۔

”مجھے کسی محل کی نہیں، مقبرے کی ضرورت ہے جہاں ایک آدمی دفن ہو۔ تم نے تو ان نقشوں میں پورے قبرستان کی جگہ گھیر لی ہے اور یہ عمارت بنے گی کہاں، جگہ منتخب کی؟“

”مقدس آتش کدہ کے قریب۔“

”میں نہ تو عمارت کے نقشے سے مطمئن ہوں اور نہ جگہ کے انتخاب سے۔“

”پھر تو آپ ہی ہماری رہنمائی فرمائیں۔“

”میں کچھ اور غور کر لوں۔ پھر تمہاری یہ مشکل بھی آسان ہو جائے گی۔“

اس بحث کے چوتھے دن اس نے مہندسوں کو ساتھ لیا اور اپنے محل سے بیس پچیس میل دور لے گیا۔ یہ سنسان اور غیر آباد جگہ تھی۔ وہ وہاں جا کر رک گیا۔ مہندسوں کو یہ جگہ قطعی پسند نہیں آئی تھی لیکن وہ خورس کی رائے سے اختلاف کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔

”یہاں ایک مختصر سی عمارت بنواؤ۔ یہ چھ سات

ہاتھوں کی بلندی تک ہونی چاہیے۔ اندر جانے کے لیے آگے پیچھے دو دروازے یوں لگائے جائیں کہ جب پہلا دروازہ کھول کر کوئی اندر داخل ہو تو اس وقت تک دوسرا دروازہ نہ کھلے جب تک پہلا دروازہ بند نہ کر دیا جائے۔ عمارت سادہ ہو بالکل چرواہوں کے مکانوں کی طرح۔“

مہندسوں کو سخت مایوسی کا سامنا تھا۔ خورس اس عمارت کا جو نقشہ پیش کر رہا تھا، وہ ہرگز کسی شہنشاہ کے شایانِ شان نہیں تھا۔

وہ یہ کام مہندسوں کے سپرد کر کے مطمئن ہو گیا تھا۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ اب وہ کسی مہم پر نہیں نکلے گا اور باقی عمر اہورمزدہ کو یاد کرنے میں گزار دے گا۔ مقبرے کے کام کی نگرانی کرے گا اور صبح شام کاسندان کی قبر پر جایا کرے گا۔

وہ انہی خیالوں میں غرق تھا کہ فریادیوں کا ایک وفد اس سے ملنے آیا۔ اس نے بتایا کہ شمال سے رہزنوں اور لٹیروں نے حملے شروع کر دیے ہیں۔ ان کی گوشمالی ضروری ہے۔“

”میرا بیٹا کمبے سس مصر گیا ہوا ہے۔ دارا بابل میں ہے۔ میں یہاں اپنے بکھیڑوں میں گھرا ہوا ہوں۔ میں میڈیا میں گستاشپ کو چھوڑ آیا تھا۔ وہ ان کا قلع قمع کیوں نہیں کرتا؟“

”شاید لٹیرے اتنے منظم ہو گئے ہیں کہ اس کے بس کے نہیں رہے۔ اسی لیے تو ہم اتنی دور سے چل کر آپ کے پاس آئے ہیں۔“

خورس منہ ہی منہ میں بڑبڑا رہا تھا۔ ”یہ بدمعاش ہر طرف قتل و غارت گری میں مشغول ہیں۔ میں نے ان کے لیے سرحدوں پر فوجی دستے بٹھا دیے تھے، مگر انہوں نے ان فوجی دستوں کو بھی بے بس کر دیا۔

وفد کے ارکان نے پھر اس پر زور دینا شروع کر دیا ”آپ نے ہماری حفاظت کی ذمے داری قبول کی تھی۔“

”میں اپنے عہد سے ذرا نہیں پھرا۔ میں نے سیتھی فون کی غارت گری روکنے کے لیے پہاڑوں کے درمیان دیوار بنانے کا حکم دے دیا ہے۔ کام بھی شروع ہو چکا ہے۔“

”لیکن اس وقت تک تو خود ہمارا وجود ختم ہو چکا ہوگا۔ جب تک دیوار اٹھتی ہے اس وقت تک ہمارے حفاظت کا انتظام کیجیے۔“

یہ وفد کئی دن تک اس کا مہمان رہا۔ پھر اس نے اس وفد کو اس وعدے کے ساتھ روانہ کر دیا کہ مصر سے صلح کی بات چیت چل رہی ہے۔ کمبے سس کے آتے ہی وہ بھی شمال کی طرف آئے گا۔

جِنّ کے معنی اور تعریف

حضرت ابن دریدؒ (محمد بن حسن ازدی امام الشعراء واللغات، سن وفات 321ھ) فرماتے ہیں ”جنّات انسانوں سے ایک قطعی الگ مخلوق ہے، اسے رات نے چھپا لیا ہے۔ وہ اس پر چھا گئی ہے اور اس کو ڈھانپ دیا ہے۔ جب لفظ چھپانے کے معنی میں استعمال ہوا ہو تو اس کے معنی ہوتے ہیں ”ہر وہ شے جو آپ سے مخفی ہو وہ آپ سے چھپی ہوئی ہے۔“ عربی زبان میں جن کی لغوی معنی ہیں چھپی ہوئی چیز۔ چنانچہ ملک عرب میں ان بدوؤں کو (دیہاتیوں) جو صحرا میں رہائش رکھتے تھے ”جنّ“ کہا جاتا تھا کیونکہ وہ عام شہری عربوں سے الگ تھلگ چھپ کر رہتے تھے۔ قرآن پاک میں جو الفاظ ”جنّ، جان اور جنۃ“ استعمال ہوئے ہیں، وہ سب جنّات کے لیے ہیں۔

حضرت ابوعمر الزاہد (علامہ محمد بن عبدالواحد بغدادی۔ 345ھ) کے مطابق جن قوم اجناء کے گھٹیا درجے کے جنّات کو کہتے ہیں۔

حضرت جوہری (ابراہیم بن سعید ابواسحاق محدث عظیم بغدادی۔ 245ھ) فرماتے ہیں ”جانّ جنّات کا باپ (ابوالجن) ہے۔

حضرت علامہ ابن عقیل حنبلی فرماتے ہیں۔ شیاطین جنات کی وہ قسم ہے جو خدا کے نافرمان ہیں اور یہ ابلیس (ملعون.............) کی اولاد میں سے ہوتے ہیں۔

مرسلہ: سہیل انصاری، حیدر آباد

وفد کے رخصت ہوتے ہی خبر آئی کہ کمبے سس مصر سے بابل واپس آ گیا ہے۔ اس نے کمبے سس کو حکم دیا کہ وہ اس کی واپسی تک بابل میں رہے۔ دوسرے بیٹے کو ہمدان میں رہنے کا حکم دیا اور خود ایک معمولی سا لشکر لے کر روانہ ہو گیا۔ وہ یہ اندازہ نہ لگا سکا کہ سیتھی قوم کے کتنے لوگ اس کے مقابلے پر آنے والے ہیں۔

وہ دیکھ رہا تھا کہ اس کا محافظ کچھ بے چین ہے۔ خورس سے رہا نہ گیا اور اس کی گھبراہٹ کا سبب پوچھ ہی لیا۔

”تجھے کس بات کا ڈر ہے، کیوں گھبرا رہا ہے؟“

”جناب! اگر آپ مجھے جھوٹا نہ سمجھیں تو ایک حقیقت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں آپ کو بتاؤں؟"

"میں تجھے جھوٹا نہیں سمجھوں گا۔"

"جناب! محل کے صدر دروازے پر جو دونوں طرف دو محافظ فرشتوں کی مورتیاں لگی ہیں۔ میں نے انہیں بولتے ہوئے سنا ہے۔ بائیں طرف کا فرشتہ مجھ سے کہہ رہا تھا، اپنے آقا کو روک لے۔ اس سے کہہ اس مہم کو ملتوی کردے۔ کیا کوئی اس پر یقین کرے گا؟ کہیں مورتیاں بھی بولتی ہیں؟"

"تو نے سنا ہے تو ٹھیک سنا ہوگا۔ اس مہم پر جانے کے لیے خود میرا بھی دل نہیں چاہ رہا ہے لیکن میں مظلوموں کی دادرسی کے بغیر رہ بھی نہیں سکتا۔"

خورس کے گھوڑے بحیرۂ کیسپین کے مغربی دریائے آرس کو پار کر کے رک گئے۔ یہاں دارا بھی اپنی فوج کے ساتھ اس سے آ کر مل گیا۔ خورس نے دارا کو شمال مغربی محاذ سنبھالنے کی ہدایت کی اور خود سرمتی قبیلے کی طرف بڑھا۔

سرمتی بھی بڑے بڑے ڈھول پیٹتے، نیزے بلند کیے مقابلے پر آ گئے لیکن یہ مقابلہ نمائشی تھا۔ وہ کھلے میدان میں مقابلہ کر ہی نہیں سکتے تھے۔ گرد و غبار اُڑاتے فرار ہو گئے۔

جب ذرا گرد و غبار بیٹھا تو خورس نے تعاقب کے لیے دستے روانہ کیے اور پھر خود بھی اسی طرف روانہ ہو گیا۔ یہ لوگ صحرا میں داخل ہو گئے۔ یہاں کی ریت سرخ رنگ کی تھی۔ اس ریت کو جب ہوا ہلاتی تھی تو معلوم ہوتا تھا، خون کا دریا بہہ رہا ہے۔ تھوڑی دیر میں آگے جانے والا دستہ خبر لے آیا کہ یہ لوگ صحرا پار ایک جنگل میں روپوش ہیں اور ان کے ساتھ ایک اور قبیلہ ماساگتی بھی شامل ہو گیا ہے۔

یہاں بھی ان قبائل کا یہی طرزِ عمل رہا۔ اچانک کسی طرف سے حملہ آور ہوتے اور پھر غائب ہو جاتے۔ یہ پتا لگانا دشوار تھا کہ ان کے ساتھ کتنے لوگ ہیں۔ سپاہیوں کی جھنجلاہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ دشمن سامنے نہیں تھا اور جان کا خطرہ ہر وقت لگا ہوا تھا۔ خورس بھی یہ سوچ کر پریشان تھا کہ کہیں دشمن اسے کسی جنگی چال کے تحت تو اس صحرا میں نہیں لے آیا ہے۔

اس نے بہ مشکل صحرا پار کیا۔ اب وہ چھوٹی بڑی پہاڑیوں کے درمیان کھڑا تھا۔ اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اب وہ سرمتی قبیلے کے مرکز کے قریب پہنچ چکا ہے۔

اس کا اندازہ غلط نہیں تھا۔ اس نے خود سے بہت دور سرمتیوں کو جمع ہوتے ہوئے دیکھا۔ خورس نے اپنی فوج کو حکم دیا "بس بہت ہو چکا۔ انہیں چاروں طرف سے گھیر لو۔ یہ موقع ہی نہ دو کہ یہ حملہ کریں اور بھاگ جائیں۔ فرار کے تمام راستے بند کر دو۔"

خورس کا یہ حکم بے کار گیا۔ سرمتی لوگ گرد و غبار اُڑاتے ہوئے غائب ہو گئے۔ خورس نے ان کا پیچھا کیا لیکن گرد و غبار اسے راستہ نہیں دے رہا تھا۔ پھر چند خیموں نے ان کے قدم پکڑ لیے۔ خیموں کی تلاشی لی گئی تو ہر طرف شہریوں کی لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ یہ لاشیں یقیناً ان پُرامن لوگوں کی تھیں جنہیں یہ قبائل اغوا کر کے لائے تھے اور اب بھاگنے سے پہلے انہیں قتل کر دیا گیا تھا۔

اس وقت تک دشمن بہت آگے نکل گیا تھا۔ خورس نے اس کا پیچھا کیا اور تقریباً ایک گھنٹے بعد اس نے دونوں قبیلوں کے لوگوں کو گھوڑے دوڑاتے ہوئے دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ بھاگتے ہوئے سرمتی قبائل نے بھی دیکھ لیا کہ خورس ان کے تعاقب میں ہے۔

خورس ان کے بہت قریب پہنچ گیا تھا کہ کوئی راستہ نہ دیکھتے ہوئے بھاگتے ہوئے قبائل نے اچانک پلٹ کر حملہ کر دیا۔ خورس کو جلد ہی معلوم ہو گیا کہ اس کے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ یہ قبائل جان بوجھ کر اسے یہاں تک لائے تھے۔ بھاگنے والے تو بہت تھوڑے تھے۔ ان کی بڑی تعداد غاروں اور پہاڑوں میں چھپی ہوئی تھی جو چاروں طرف سے نکل آئی اور خورس کی فوج کو محاصرے میں لے لیا۔ اب شاہی فوج کے لیے پریشانی کا وقت آ گیا تھا۔ وہ لڑ بھی رہے تھے اور خورس کی حفاظت بھی کر رہے تھے جس کے گرد قبائلیوں کا محاصرہ تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ خورس نے چیخ چیخ کر ہدایات دیں کہ لڑتے بھی رہو اور پسپا ہونے کے انداز میں پیچھے بھی ہٹتے رہو تاکہ دشمن دھوکے میں آ کر اپنی صفیں توڑ بیٹھے۔

خورس کے فوجیوں کو پسپا ہوتے دیکھ کر قبائلیوں نے حسبِ عادت گرد و غبار اُڑانا شروع کر دیا۔ غبار اتنا اڑا کہ ایک دیوار حائل ہو گئی۔ خورس کے سپاہی یہ سمجھ رہے تھے کہ حسبِ سابق اس کا دشمن اس غبار ہی کی آڑ لے کر فرار ہو جائے گا لیکن اب دشمن نے حکمت عملی تبدیل کر لی تھی۔ اس غبار کا فائدہ اُٹھا کر انہوں نے اپنی ترتیب درست کی تھی۔ اس کا اندازہ اس وقت ہوا جب سنسناتے ہوئے اندھے تیر خورس کی طرف آ رہے تھے۔ خورس کے سپاہی زخمی ہو ہو کر گرنے لگے۔ خورس کی صفیں پھر منتشر ہونے لگیں اور پسپائی کے آثار ہونے لگے۔ خورس نے یہ سوچ کر کہ وہ سب کو

نظر آ رہا ہے اور اس کے سپاہیوں کا حوصلہ بڑھا رہا ہے۔

اس نے دو سینگوں والا تاج اپنے سر پر رکھ لیا۔ اب وہ سب کو نظر آ رہا تھا۔ اس تاج کو پہنتے ہوئے وہ یہ بھول گیا تھا کہ اس طرح صرف اس کے ساتھی نہیں بلکہ اس کا دشمن بھی اسے دور سے پہچان سکتا ہے۔ یکا یک ایک تیر کسی طرف سے آیا اور خورس کے سینے میں پیوست ہو گیا۔ وہ اپنے گھوڑے پر ایک طرف جھول گیا لیکن سنبھل گیا۔ اسی وقت دوسرا تیر آیا جو اس کی گردن کے پار ہو گیا۔ اس کے محافظ آگے بڑھے اور اسے گھوڑے سے گرنے نہیں دیا۔ نہایت احتیاط سے نیچے اُتارا۔ یہ اس کے لیے بھی ضروری تھا کہ گھوڑے کے بھی کئی تیر لگے تھے۔

اسے دوسرے گھوڑے پر منتقل کیا گیا۔ فوج میں موجود اطبا کو ساتھ لیا گیا۔ یہ گھوڑے میدانِ جنگ سے بھاگ کھڑے ہوئے۔

خورس کے سپاہیوں کو یہ معلوم ہی نہ ہو سکا کہ کتنا عظیم حادثہ پیش آ چکا ہے۔ وہ بدستور جنگ میں مشغول تھے۔ اب گرد و غبار چھٹ گیا تھا اور دو بدو جنگ ہو رہی تھی۔

زخمی خورس اپنے خیمے میں تھا۔ شاہی اطبا اس کے زخموں کا علاج کر رہے تھے۔ اتنی دیر میں چند عورتیں گھوڑوں پر سوار آئیں۔ وہ گھوڑوں سے اُتر کر خیمے کی طرف بڑھیں، محافظوں نے انہیں روکنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے کہا، خورس ان کا محسن ہے۔ وہ اسے ایک نظر دیکھنا چاہتی ہیں۔ محافظوں نے یہ سوچ کر کہ یہ عورتیں ہیں ان کی تلاشی لے کر انہیں جانے دیا البتہ حیران ضرور تھا کہ اس ویرانے میں یہ عورتیں کہاں سے آ گئیں؟

بادشاہ نیم غنودگی میں لیٹا ہوا تھا۔ ایک طبیب اس کے سرہانے بیٹھا تھا۔ ان عورتوں میں سے ایک عورت آگے بڑھی اور خورس کا سر اپنی آغوش میں لے کر بیٹھ گئی۔ خورس نے آنکھیں کھول کر دیکھا لیکن جنبش نہیں کر سکا۔

"خورس! کیا تو جانتا ہے، تیرا سر کس کی آغوش میں ہے؟" اس عورت نے کہا اور جواب نہ پا کر خود ہی بتانا شروع کیا "میرا نام تمیرس ہے۔ میں سامتی قبیلے کی سردار ہوں۔ میرے کارنامے سن سن کر تجھ سے محبت کرنے لگی تھی لیکن تو میرے قبیلے کا دشمن تھا اس لیے میرا دوست کیسے ہو سکتا تھا؟ تجھ سے جنگ کرنا مجھ پر لازم تھا۔ اب تو بے یار و مددگار پڑا ہے، دوستی کر سکتا ہے، نہ دشمنی۔ میں نے تجھے کبھی دیکھا نہیں تھا۔ تجھے دیکھنے چلی آئی ہوں۔ اگر تو زندہ رہ جائے تو اس کا گواہ رہنا کہ میں تجھ سے محبت کرتی ہوں لیکن تو میرے قبیلے کا دشمن ہے۔ تجھ سے پھر جنگ کرنی پڑی تو پھر کروں گی۔ تو اقلیموں کا بادشاہ ہے لیکن میرا قبیلہ تجھ سے کبھی ہار نہیں مانے گا۔ اس کا مجھے بھی افسوس رہے گا۔"

خورس نے ایک مرتبہ پھر آنکھیں کھول کر دیکھا۔ کچھ کہنے کے لیے لبوں کو جنبش بھی دی لیکن کچھ کہنے سے قاصر تھا۔ اس عورت نے اس کا سر اپنی آغوش سے الگ کیا اور دوسری عورتوں کے ساتھ باہر نکل گئی۔ ان کے پیچھے پیچھے طبیب بھی آیا مگر جتنی دیر میں وہ محافظوں کو بتاتا کہ یہ عورت کون تھی، وہ سب کی سب گھوڑوں پر سوار ہوئیں اور گرد و غبار اُڑاتی ہوئی دور چلی گئیں۔ یہ موقع ایسا نہیں تھا کہ محافظ ان عورتوں کا پیچھا کرتے۔

ماساگتی اور سرمتی قبائل اچانک غائب ہو گئے۔ اس مرتبہ وہ میگزوں لاشیں چھوڑ کر بھاگے تھے۔ یہ بھی عجیب بات تھی کہ اس مرتبہ دونوں قبائل اتنی بڑی فتح کے بعد بھی بھاگنے پر مجبور ہوئے تھے۔

خورس کی فوج بھی واپسی کی تیاریاں کرنے لگی۔ اس وقت اسے پتا چلا کہ ان کا آقا ان کے ساتھ نہیں ہے۔ اب بھی وہ یہ سمجھے تھے کہ خورس زخمی ہے۔ یہ تو انہیں لشکر گاہ کے ایک خیمے میں آ کر معلوم ہوا کہ خورس چل بسا۔

اس وقت یہ خبر بھی آئی کہ یاجوج ماجوج کی قوم کی روک کے لیے جس دیوار پر کام شروع ہوا تھا، وہ مکمل ہو گیا۔

لائق اطبا نے چند خاص مسالے لگا کر خورس کی لاش کو محفوظ کر دیا پھر ایک بند گاڑی میں اسے رکھ دیا گیا جسے گھوڑے کھینچ رہے تھے۔

یہ خبر ایسی نہیں تھی جو چھپ سکتی ہو۔ وہ دور دراز کے علاقے میں تھا لیکن بند گاڑی واپسی کے لیے جس راستے سے گزری لوگوں کو معلوم ہوتا چلا گیا۔ وہ اتنا ہر دلعزیز تھا کہ جس نے یہ خبر سنی، دکھ کے ساتھ سنی اور دوسروں تک پہنچائی۔ مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک یہ خبر پھیل گئی۔ اس کا بیٹا بابل سے اپنے علاقے میں پہنچ گیا جو پارساگرد کہلاتا تھا۔

محل کے سامنے کھے سیس اپنے سرداروں کے ساتھ کئی دن سے میت کے انتظار میں تھا۔ خورس کی میت گاڑی جونہی پارساگرد میں داخل ہوئی آہوں اور سسکیوں نے بتا دیا کہ گاڑی میں کون ہے۔ یہ وہ تھا جسے خدا نے اپنا چرواہا کہا تھا۔

گاڑی محل کے سامنے آ کر رک گئی۔ کھے سیس اور اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے سرداروں نے خورس کا استقبال کیا۔ پھر اسے عام دیدار کے لیے رکھ دیا گیا۔

کئی دن تک لوگوں کا تانتا بندھا رہا۔ پھر اسے اس مقام تک لے جایا گیا جہاں اس نے چلتے وقت اپنا مقبرہ تیار کرنے کا حکم دیا تھا اور اب وہ مقبرہ تیار ہو چکا تھا۔ ایک گاڑی میں اس کا جنگی سینہ پوش، جنگی پاجامہ، جواہر سے مرصع کمر بند، چمڑے کے موزے اور دوسرا سامان رکھا ہوا تھا۔ یہ سامان اب کوئی اور استعمال نہیں کرسکتا تھا، اس سامان کو بھی خورس کے ساتھ رکھنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس کی تلوار بھی اس کے پہلو میں رکھ دی گئی۔

کمبے سیس تدفین کے اس عمل کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ آئے ہوئے بابل کے لوگ اس کے ساتھ کھڑے تھے اور خورس کو نہایت سادگی سے دفن ہوتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ ان لوگوں میں وہ بھی تھے جنہوں نے فرعونِ مصر کی آخری رسومات کا نظارہ کیا تھا۔ وہ اس سادگی پر حیران ہو رہے تھے بلکہ انہیں خورس کی بے توقیری کا احساس ہو رہا تھا۔

انہوں نے کمبے سیس سے کہا ”دنیا کے بڑے بڑے بادشاہ جو خورس سے بھی کم حیثیت کے ہیں، نہایت شان وشوکت کے ساتھ دفن کیے جاتے رہے ہیں۔ ہمیشہ تاج اور جواہرات کے ساتھ سونے کے تابوت میں دفن کیا جاتا ہے۔ خورس کی عظمت بھی یہی ہے کہ اسے سونے کے تابوت میں دفن کیا جائے۔ کمبے سیس نے اس رائے سے اتفاق کیا۔ تدفین کے عمل کو فی الحال روک دیا گیا۔ خورس کی گاڑی اسی ویرانے میں کھڑی رہی۔ محافظ دستے اور مشعل بردار پہرا دیتے رہے۔ جب سونے کا تابوت تیار ہو کر آ گیا تو خورس کی لاش کو اس تابوت میں رکھ دیا گیا۔ سونے کا تاج بھی اسی تابوت میں رکھ دیا گیا۔ دستور کے مطابق کمبے سیس کو خورس کے مزار کا متولی مقرر کرنے کی رسم ادا کی گئی۔

کمبے سیس نے حکم دیا کہ یہاں ایک باغ لگایا جائے تاکہ جو لوگ خورس کے مقبرے پر آئیں انہیں پیٹ بھرنے کے لیے پھل ملیں اور دھوپ سے بچنے کے لیے سایہ میسر آئے۔ وہ جس طرح زندگی میں، لوگوں کو فیض پہنچاتا رہا، مرنے کے بعد بھی اس کا فیض جاری رہے۔

کمبے سیس کو خورس کا جانشین بھی مقرر کیا گیا جسے ساری دنیا نے تسلیم کیا۔

خورس (ذوالقرنین) نے اپنے لیے جو مقبرہ بنوایا تھا اور جس میں اسے دفن کیا گیا اور جس پر اس کا تجویز کردہ کتبہ لگا تھا ”میں ہخامنشی خاندان کا شہنشاہ کورش (خورس) ہوں، وہ ابھی موجود ہے۔ اس کا چبوترا استرہ فٹ بلند ہے۔ چھ زینے ایک مستطیل سنگی فرش تک رہنمائی کرتے ہیں جو 44 فٹ چوڑا اور 48 فٹ لمبا ہے۔ چبوترے کے چاروں طرف کبھی ایک نہر تھی اور خوبصورت باغ لہلہاتے تھے۔ ہر مہینے اس ممتاز ہیرو کے نام پر ایک گھوڑا قربان کیا جاتا تھا اور لوگ دور دور سے اس کی زیارت کو آتے تھے۔

اس مقبرے کے باہر اس نے وسیع و عریض سلطنت چھوڑی جو شمال میں بحرِ خزر سے بحرِ اسود تک تھی، مشرقی حد ترکستان باختر (بلخ) آراکوسیا (قندھار و سیستان) کے علاوہ گدروشیا (مکران و کرمان) تک پھیلی ہوئی تھی۔

اس کی موت کے بعد اس پُراسرار فاتح کی ہخامنشی سلطنت کا خاتمہ تقریباً ڈھائی سو سال بعد سکندر مقدونی کے ہاتھوں ہوا۔

سکندر مقدونی نے مردہ خورس کے ساتھ وہی سلوک کیا جو خورس اپنی زندگی میں دوسروں کے ساتھ کیا کرتا تھا۔ رحم دلی اور انصاف کا سلوک۔ سکندر کی فتوحات کے ہنگامے میں خورس کے مقبرے میں بھی لوٹ مار کی گئی۔ اس کے تابوت کا سونا اکھاڑ لیا گیا تھا اور مال و متاع لوٹ لیا گیا تھا۔ سکندر نے حکم دیا کہ نہ صرف لاش واپس رکھی جائے بلکہ مقبرے کے خزانے بھی واپس رکھے جائیں۔ اس نے عمارت کی بھی مرمت کرائی۔

وقت کی آندھی چلتی رہی...... پھر نہ تابوت رہا نہ تابوت والا۔ ماہرینِ آثارِ قدیمہ نے کھنڈرات سے ایک مقبرہ دریافت کیا۔ پہلے اسے مادرِ سلیمان کا مقبرہ قرار دیا گیا۔ پھر کچھ ایسی چیزیں ملیں جس سے ثابت ہو گیا کہ یہ ہخامنشی سلطنت کے بانی کا مقبرہ ہے۔

اس مرقد کے گرد آج بھی پُراسراریت پہرا دیتی ہے۔ ایک آدمی نے مختصر سی زندگی میں اتنی فتوحات کیسے کیں اتنا نام کیسے کمایا کہ جس کی گواہی قرآن نے بھی دی۔

مآخذات

قصص القرآن، عہد نامہ عتیق کا تاریخی سفر، توریت، کورش اعظم

لنکن کا بھوت

ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری

ایک وقت وہ تھا جب اسے پہننے کے لیے کپڑے میسر نہ تھے۔ پیٹ بھر کھانے کا وہ تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ گویا غربت نے اسے پروان چڑھایا تھا۔ گودوں میں کھلایا تھا۔ غربت کے اس جہنم سے نکلنے کے لیے اس نے جہدِ مسلسل سے کام لیا۔ پڑھائی پر توجہ دی۔ قانون کی ڈگری حاصل کی اور امریکا کی کرسئ صدارت تک جاپہنچا۔ مگر لوگ کہتے ہیں کہ اتنی ترقی صرف جہدِ مسلسل کا نتیجہ نہیں تھی۔ وہ مخفی علوم سے کام لیتا تھا۔ روحوں کی دنیا سے رابطے میں تھا۔

امریکا کے صدر کی بھٹکتی روح کا تذکرہ جو آج بھی وائٹ ہاؤس میں براجمان ہے

میں نے بیس سال کی عمر میں صحافت کا پیشہ اختیار کیا تھا۔ مجھے یہ کام اس لیے بھی پسند تھا کہ میرے والد بھی اسی والز اسٹریٹ جنرل سے منسلک تھے۔ اس پیشے میں آنے کے بعد سے میں مسلسل اس کوشش میں تھا کہ کسی طرح.... کوئی ایسی اسٹوری فائل کروں جو مجھے راتوں رات مشہور کر دے۔ قتل، خون ریزی، ڈاکے، سیاسی اور معاشرتی جرائم کی جانب ہر صحافی کی نظر ہوتی ہے مگر میں ان سے ہٹ کر کچھ کر دکھانا چاہتا تھا۔ کافی غور کرنے کے بعد بھی مجھے کوئی ایسا کلیو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نہیں مل رہا تھا، میں ہمہ وقت یہی کچھ سوچتا رہتا تھا۔ مگر....

آج مجھے ایک چھوٹی سی خبر مل گئی۔ یہ خبر میرے ہی اخبار میں چھپی تھی۔ ایک کالم کی بہت چھوٹی سی خبر۔ اس خبر کو پڑھ کر میں اچھل پڑا... یقیناً یہ خبر مجھے آسمانِ صحافت پر پہنچا سکتی تھی۔ خبر یوں تھی کہ صدارتی محل میں سابق صدر ابراہم لنکن کو ٹہلتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔ ان پر نظر پڑتے ہی خادمہ مس پیرسن بے ہوش ہو کر گر پڑیں۔

یہ خبر چھوٹی سی ضرور تھی مگر میں نے اسی وقت سوچ لیا کہ اسے اہم بناؤں گا۔ اہم خبر تبھی بنتی ہے جب اس میں مرچ مسالا ڈالا جائے۔ اسے چٹ پٹا بنایا جائے۔ اس کے لیے مجھے محنت کرنا تھی۔ میں نے سب سے پہلے اس خبر کو تراش کر ڈائری میں محفوظ کیا اور پھر اسے لے کر میں اپنے ایک دوست کے پاس پہنچا۔ وہ تاریخی حقائق جمع کرنے میں کافی دلچسپی لیتا تھا اس سے مجھے کافی مدد مل سکتی تھی۔ اس نے تمام باتیں سن کر کہا ''کیا تمہارے پاس وقت ہے؟''

''کیوں نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ مجھے پوری امید تھی کہ وہ میرے لیے مواد ضرور تلاش کر لے گا۔ اس لیے میں ایک دو گھنٹا تو یقیناً انتظار کر سکتا تھا۔ وہ اٹھ کر کتابوں کی الماری تک گیا اور کئی کتابیں لے کر واپس میرے پاس آ گیا۔ ان کتابوں میں سرِفہرست واشنگٹن ڈی سی سٹی گائیڈ اور ایک دوسری کتاب 'دی گھوسٹ آف وائٹ ہاؤس' تھی۔ میں نے سٹی گائیڈ اٹھا لی۔ دو تین صفحوں کے بعد ایک واقعہ درج تھا جسے کافی عرصہ بعد میں نے انٹرنیٹ پر موجود وی کی پیڈیا میں بھی دیکھا۔ دونوں میں واقعات ایک سے تھے۔ ایک جیسے تھے۔ واقعہ یوں ہے۔ خود ابراہم لنکن بیان کرتے ہیں۔ 14 اپریل 1865ء کو انہوں نے اپنی کیبنٹ کو بتایا ''میں نے رات.... خواب دیکھا کہ میں سیدھے بڑھ رہا ہوں۔ مشرقی کمرے سے کچھ آوازیں آ رہی ہیں۔ میں اس کمرے میں پہنچتا ہوں۔ وہاں کچھ لوگ ہیں جو سوگ کے کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ ایسا لگ رہا ہے کہ وہ سب کسی کی میت میں آئے ہیں۔ میں آگے بڑھ کر دیکھتا ہوں۔ وہ سب ایک تابوت کو گھیرے کھڑے ہیں۔ مُردے کا چہرہ مجھے نظر نہیں آ رہا ہے۔ میں نے پوچھا یہ کس کی میت ہے۔ جواب ملا' صدرِ امریکا کی۔ آج ہی کسی نے انہیں قتل کر دیا ہے۔''

یہ بات خود صدرِ امریکا کے حوالے سے تھی اس لیے میری دلچسپی بڑھ گئی کہ یہ وہی تاریخ ہے جس دن انہیں جون واکی بوتھ جو اپنے وقت کا بہت بڑا اسٹیج ایکٹر تھا' اس نے ابراہم لنکن کو گولی ماری تھی۔ ابراہم لنکن غلاموں کی تجارت کے خلاف تھے اور جون اس کا حامی۔ گویا قتل سے ایک رات پہلے ہی ابراہم لنکن کو معلوم ہو گیا تھا کہ امریکی صدر کو قتل کر دیا جائے گا۔ اپنی موت کے بارے میں وہ جان گئے تھے۔

میں نے تمام کتابیں سمیٹی اور واپس گھر آ گیا کہ آرام سے ان کتابوں کا مطالعہ کروں گا۔ ان تمام کتابوں سے اور کئی دیگر کتابوں کو پڑھنے کے بعد جو کہانی اُبھر کر سامنے آتی ہے وہ یوں ہے۔ ''ابراہم لنکن کا تعلق ایک اداکار گھرانے سے تھا۔ ایک ایسے گھرانے سے جو غربت کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا لنکن نے سول وار میں اہم رول ادا کیا تھا اسی وجہ سے انہیں امریکا کی صدارت ملی تھی۔ ان کے بہت سارے شوق تھے۔ مگر وہ سب سے زیادہ پُراسرار علوم میں دلچسپی لیتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ کمرا بند کر کے عملیات کی مشق کیا کرتے تھے۔ شاید اسی وجہ سے انہیں کچھ پراسرار قوت مل گئی تھی۔ یہ قوت کس قسم کی تھی اس بارے میں کوئی بھی صحیح طور پر بتا نہیں پاتا' سب سنی سنائی باتیں کرتے ہیں.. مگر ان کے بارے میں جتنی باتیں مشہور ہیں' وہ سب کی سب بہت دلچسپ اور پُراسرار ہیں۔ جان کینی ان کا باڈی گارڈ تھا۔ وہ کہتا ہے ''میں نے ایک نہیں کئی بار ان (صدر ابراہم لنکن) کو دیکھا۔ اپنا تجربہ وہ یوں بیان کرتا ہے۔ پہلا واقعہ کچھ یوں ہے ''اس دن میں بہت اداس تھا۔ وجہ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ ایک اجنبی سی فکر دامنِ گیر تھی۔ دل پر بھاری بوجھ سا تھا۔ عجیب سا خوف محسوس ہو رہا تھا۔ میں اپنے کمرے میں تھا۔ سامنے جو کھڑکی ہے اس کی سلاخیں تھامے کھڑا تھا۔ باہر چاندنی کھیت کر رہی تھی۔ آسمان اور دنوں سے زیادہ صاف تھا اور تارے آسمان پر جگمگا... کر رہے تھے۔ میری نظریں دور افق پر تھیں۔ میں کل کے پروگرام کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ تبھی مجھے احساس ہوا جیسے میرے پیچھے کوئی آ کر کھڑا ہوا ہے۔ میں نے یہی سمجھا کہ شاید کوئی مجھے بلانے آیا ہے اور مجھے خاموش دیکھ کر وہ کھڑا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوگیا ہے۔کون ہے، یہ دیکھنے کے لیے میں نے گردن ..... گھمائی تھی کہ مجھے سکتہ سا ہوگیا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں کھلی آنکھ سے دیکھنے کے بعد بھی یقین نہیں آتا۔ یہ بھی ایک ایسا ہی واقعہ تھا۔

ایسے حالات میں اچھے اچھوں کے حواس گم ہوجاتے ہیں۔ خوف کی سرد لہر میرے اندر بھی دوڑنے لگی تھی کیونکہ دروازے کے بیچوں بیچ مرحوم صدر کھڑے تھے۔ ان کی نظریں مجھ پر ٹکی تھیں۔ وہ بہ غور مجھے دیکھ رہے تھے لیکن عجیب بات یہ تھی کہ ان کی آنکھوں میں میرے لیے نفرت جیسی چمک تھی جیسے میں ہی ان کا قاتل ہوں۔ میرے ہاتھ پیروں میں جان نہ تھی۔ میں خاموش کھڑا تھا کہ باہر آہٹ ہوئی اور وہ کھڑے کھڑے عکس کی طرح غائب ہوگئے جیسے بجلی بند ہونے سے روشنی غائب ہوجاتی ہے۔'' اس نے اخبار کو دیے گئے بیان میں مزید کہا۔

''مرحوم صدر کے جاتے ہی مجھے اخباروں میں شائع ہونے والی خبریں یاد آنے لگیں۔ خبروں کے مطابق صدر محترم کی میت' امریکا کے چند بڑے شہروں میں لے جانے کے لیے ریل گاڑی کے ایک کھلے ڈبے میں رکھی گئی تھی تاکہ عام لوگ اپنے صدر کا آخری دیدار کرسکیں۔ ہر اسٹیشن پر پہلے سے خبر کردی جاتی۔ شہر کے اہم لوگ پھولوں کے بڑے بڑے گلدستے لے کر منتظر رہتے۔ جیسے ہی گاڑی رکتی، وہاں موجود شہر کے سرکردہ افراد پھولوں کے توڑے لے کر میت کے نزدیک آتے، آنر پیش کرتے اور پیچھے ہٹ کر دوسروں کو آگے آنے کا موقع دیتے۔

اس گاڑی کو ہر اسٹیشن پر صرف آٹھ منٹ رکنا تھا۔ وہ اپنے شیڈول سے چلتی رہی مگر اخبارات کا کہنا تھا کہ جس جس اسٹیشن سے وہ گاڑی گزری اس اس اسٹیشن کے لوگوں نے ایک اور منظر بھی دیکھا۔ یہ منظر دیکھنے والے ایک دو نہیں ہزاروں تھے۔ سب کا بیان یہی تھا کہ اس ٹرین کے گزرتے ہی ایک اور ٹرین آجاتی۔ اس ٹرین میں ایک ہی ڈبا ہوتا۔ اس ٹرین کا انجن بھی سیاہ تھا اور اکلوتا ڈبا بھی۔ وہ بھی ہر اسٹیشن پر صرف آٹھ منٹ ہی رکتی تھی۔ اس کے اکلوتے ڈبے میں بھی ایک کفن باکس تھا اور اس میں سے نظر آنے والی لاش بھی ابراہم لنکن کی تھی۔ ایک اور بات تقریباً سب نے نوٹ کی کہ اس سیاہ گاڑی کے آتے ہی اسٹیشن کی گھڑیاں آٹھ منٹ کے لیے رک جاتی تھیں۔ اس ٹرین میں کچھ سیاہ لبادہ پہنے لوگ بھی ہوتے جن کے ہاتھوں میں عجیب قسم کا ساز ہوتا۔ اس ساز کی آواز ایسی کراہیت آمیز تھی کہ لوگ سنتے ہی خوف سے سہم جاتے۔'' (انٹرنیٹ کی مندرجہ ذیل سائٹ پر بھی اس بھوت گاڑی کے بارے میں بہت سی معلومات ہیں، اس کے علاوہ کئی سائٹ پر اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ یہ ''گھوسٹ ٹرین'' اس بات کا اظہار ہے کہ لنکن عملیات میں کافی آگے جاچکا تھا۔ اس نے پُراسرار عملیات کے ذریعے بھٹکتی ارواح کو اپنا مطیع وفرماں بردار بنالیا تھا۔ وہ ٹرین انہی بھٹکتی روحوں کی تھی جو اس کی روح کو ساتھ لے جارہی تھیں)

www.unsolved-mysteries.com/paranormal/lincolns_phantom_ghost_train.html

اب جان کیری کو یقین آچکا تھا کہ وہ خبر مبالغہ نہیں حقیقت تھی۔ اس رات وہ کافی دیر تک سہما بیٹھا اسی بات پر غور کرتا رہا۔ اس کا خیال تھا اب وہ پھر نظر نہیں آئیں گے مگر اگلے ہی دن ابراہم لنکن پھر اسے نظر آگئے۔ وہ حد سے زیادہ خوف زدہ ہوگیا.... پھر تو یہ معمول بن گیا ہر کچھ دن بعد اسے ابراہم لنکن کی روح نظر آجاتی۔ یہ سلسلہ 1895ء تک چلا۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ ابراہم لنکن اسے جب بھی نظر آتے ان کی آنکھوں میں کوئی ایسی بات ہوتی ہے جسے دیکھ کر کینی کو محسوس ہوتا جیسے وہ اسے ہی اپنی موت کا ذمے دار سمجھ رہے ہیں۔ وہ باڈی گارڈ تھا ان کی حفاظت کرنا اس کی ذمے داری تھی پھر بھی اس کی موجودگی میں انہیں قتل کردیا گیا۔

کینی پاگل سا ہوگیا.... بالآخر ایک دن اس نے ابرہم لنکن سے کہا ''جناب اعلیٰ کیوں میرے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ میں پاگل ہو جاؤں گا۔ میرا پیچھا چھوڑ دیں۔ میں آپ کا قاتل نہیں ہوں۔ یہ حادثہ میرے سامنے ہوا ضرور ہے مگر میں چلتی ہوئی گولی کو کیسے روک سکتا تھا۔''

اس کی یہ بات کام کرگئی اور پھر ابراہم لنکن کی روح اسے نظر نہیں آئی۔ گویا انہوں نے اس کی حالت پر ترس

کھا کر اسے معاف کردیا تھا۔

کینی کے واقعے کو پڑھنے کے بعد میں نے مزید کی تلاش شروع کردی اور پرانے اخبارات میں مجھے ایک اور واقعہ نظر آگیا۔ یہ واقعہ بھی وائٹ ہاؤس کا تھا۔ پورے انہتر سال بعد 1934ء میں امریکی صدر فرینکلن روز ویلٹ نے یہ ارادہ کیا کہ وہ اپنے استعمال میں اسی بیڈروم کو لائے گا جس کمرے میں ابراہم لنکن آرام کیا کرتا تھا۔

اس مقصد کے لیے اس نے وائٹ ہاؤس کی ملازمہ مس میری ایبن کو حکم بھی دے دیا کہ وہ چند ملازموں کو اپنے ساتھ لے جائے اور اس کمرے کی صفائی ستھرائی کر دے۔ سجاوٹ کا کام کرا دے۔ میری ایبن اور دیگر ملازموں کو گئے ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ سب چیختے چلاتے ہوئے کمرے سے نکل بھاگے۔

وائٹ ہاؤس کے محافظ فوراً حرکت میں آگئے کہ ہوا کیا ہے۔ ان لوگوں سے پوچھا جانے لگا مگر کوئی بھی جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ سب کی گھگھی بندھی ہوئی تھی۔ میری نے صرف ہاتھ کے اشارے سے کمرے کی طرف اشارہ کیا تو محافظ ادھر دوڑ پڑے۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی ان میں سے کئی ایک خوف سے ٹھٹک گئے انہوں نے دیکھا تھا کہ سامنے والی کرسی پر ابراہم لنکن بیٹھے ہوئے ہیں انہوں نے سیاہ رنگ کا کوٹ پہن رکھا ہے اور وہ جھک کر اپنے جوتے کا تسمہ باندھ رہے ہیں۔

یہ منظر دیکھتے ہی محافظوں کی بھی حالت غیر ہوگئی۔ یہ لوگ گولیاں چلا سکتے تھے بڑے سے بڑے دشمن کے سامنے ڈٹ جاتے تھے مگر ایک روح سے کیسے مقابلہ کرتے؟ اس لیے ان میں سے بھی بہت سے خوف کے عالم میں واپس مڑ گئے۔ صرف ہاورڈ ایک ایسا محافظ تھا جو پستول سیدھا کرکے ادھر لپکا مگر وہاں تک پہنچ کر وہ بھی ٹھٹک گیا کیونکہ جوتے کا فیتہ باندھنے کے بعد ابراہم لنکن کا ہیولا غائب ہوچکا تھا۔ گویا ہوا میں تحلیل ہوگیا تھا۔

اس حادثے کے بعد روزویلٹ نے اس کمرے کو استعمال کرنے کا ارادہ ترک کردیا اور جب تک وہ صدر رہا اس نے اس کمرے کا قفل کھلنے نہیں دیا۔

فرینکلن روزویلٹ نے ایک بار اپنے بیان میں ایک

قرآن پاک میں ''جن'' کا لفظ 22 مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ 31 آیات مبارکہ میں 32 مرتبہ جن، جان وجنتہ استعمال ہوا جس کی تفصیل کچھ یوں ہے۔ قارئین بذات خود قرآن پاک میں ملاحظہ کرسکتے ہیں۔

1۔ سورۃ الانعام (سورۃ نمبر 6) آیات 100 , 128,112 اور 130

2۔ سورۃ الاعراف (سورۃ نمبر 7) آیات: 38 اور 179

3۔ سورۃ الحجر (سورۃ نمبر 15) آیات: 26,2 اور 27

4۔ سورۃ بنی اسرائیل (سورۃ نمبر 17) آیت: 88

5۔ سورۃ الکہف (سورۃ نمبر 18) آیت: 50

6۔ سورۃ الانبیاء (سورۃ نمبر 21) آیت: 82

7۔ سورۃ المومنون (سورۃ نمبر 23) آیات: 25,23 اور 29

8۔ سورۃ النمل (سورۃ نمبر 28) آیات: 17 اور 39

9۔ سورۃ السبا (سورۃ نمبر 34) آیات: 14,12 اور 41

10۔ سورۃ السجدۃ (سورۃ نمبر 41) آیت: 13

11۔ سورۃ الاحقاف (سورۃ نمبر 46) آیات: 18 اور 29

12۔ سورۃ الذریات (سورۃ نمبر 51) آیت: 56

13۔ سورۃ الرحمٰن (سورۃ نمبر 55) آیات 14,56,39,33 اور 115

14۔ سورۃ الجن (سورۃ نمبر 72) آیات: 1, 5, 26 اور 27

مرسلہ: نعمان خان عطاری، فیصل آباد

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

واقعے کا خاص ذکر کیا تھا جسے ریڈیو نے بھی نشر کیا تھا۔ وہ....

کہتا ہے کہ ایک روز میں اپنے کمرے میں بیٹھا ایک خاص مسئلے پر غور کر رہا تھا کہ سامنے والی دیوار پر ایک قدِ آدم تصویر لگی ہوئی تھی۔ اس تصویر کے پیچھے سے یکا یک دھواں کی لکیر باہر آتی نظر آئی پھر وہ لکیر آہستہ آہستہ ہیولے میں تبدیل ہوگئی۔ وہ ہو بہو ابراہم لنکن تھا۔ وہ کسی بگڑے رئیس کی طرح گردن اکڑائے چلتے ہوئے ایک صوفے کی طرف بڑھا پھر اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا اور مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ بھی ایسی تھی جیسے وہ میری آمد کو ناپسند نہیں کر رہا ہے۔ اس کے ہونٹوں پر کھیلتی مسکراہٹ ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ وہ سامنے والی الماری میں بند دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔"

روز ویلٹ نے ایک بار نہیں کئی بار لنکن کی روح کو دیکھا۔ کبھی گلیارے میں کبھی کسی کمرے میں۔ ریڈیو پر دیے گئے اپنے بیان میں روز ویلٹ نے بتایا تھا کہ اس نے جب بھی لنکن کی روح کو دیکھا وہ تہذیب یافتہ نظر آئی جیسے وہ زندگی میں سنجیدہ، متاثر کن اور بردبار نظر آتے تھے۔

حیران کن بات یہ ہے کہ متعدد بار لنکن کی روح کو دیکھنے کا اقرار کرنے والے روز ویلٹ 1945ء میں اپنے کمرے میں پُراسرار طور پر مردہ پائے گئے تھے۔ ان کی موت کا راز آج تک کھل نہیں پایا۔ اپنی تحریر کو مکمل کرنے کے لیے میں نے بہت سے لوگوں سے رابطہ کیا۔ کئی اہم شخصیت سے ملاقات مگر کوئی بھی اس راز سے پردہ اٹھا نہ سکا لنکن کی زندگی پر لکھی جانے والی کسی کتاب میں روز ویلٹ کی موت کی وجہ نہیں بتائی گئی ہے۔ اس لیے خیال کیا جاتا ہے کہ روز ویلٹ نے کچھ ایسا دیکھا جس کے خوف سے ان کی روح پرواز کر گئی۔

وائٹ ہاؤس میں عموماً اپریل کے مہینے میں اب بھی ابراہم لنکن کی روح کو دیکھا جاتا ہے۔ اسی مہینے میں اسے گولی کا نشانہ بنایا گیا تھا۔

The Diary of Gideon Welles; The History Channel Publishings, Chapter XXVI, April 14, 1865 میں ایسے کئی مضامین ہیں جن میں لنکن کی روح کے متعدد واقعات کا ذکر ہے۔ مگر میں صرف ایک واقعہ بیان کروں گا۔

ایک بار برطانیہ کا وزیر اعظم سر ونسٹن چرچل امریکا کے دورے پر پہنچا تو اسے وائٹ ہاؤس کے اسی کمرے میں ٹھہرایا گیا جس میں ابراہم لنکن آرام کرتا تھا۔ چرچل کوئی معمولی اعصاب والا نہیں تھا۔ اس نے تاریخ میں اپنے نقوش چھوڑے ہیں۔ مگر اس رات وہ اس کمرے میں سو نہیں سکا۔ ***Presidents and the Paranormal by Stephen Wagner*** کے مطابق اس رات چرچل آدھی رات کو چیختا ہوا اپنے کمرے سے باہر آ گیا۔ اس کی گھگی بندھی ہوئی تھی۔ اندر اس نے کیا دیکھا یہ بھی بتا نہیں پا رہا تھا۔ کافی دیر کے بعد اس نے بتایا کہ وہ بے خبر سو رہا تھا کہ اسے ایسا لگا جیسے کسی نے اس کے بازو کو ہلا کر اٹھا دیا ہو۔ تبھی اس کی نظر سامنے پڑی۔ بند دروازے کے قریب لنکن کھڑا تھا۔ اسے بیدار دیکھ کر وہ اس کی طرف بڑھا تھا کہ چرچل اچھل کر باہر آ گیا۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اگر چرچل کمرے میں ٹھہر جاتا تو کئی رازوں سے پردے اٹھ جاتے۔ یقیناً لنکن اسے کچھ بتانے کے لیے قریب آ رہا ہوگا ورنہ اسے نقصان پہنچانا ہوتا تو وہ اپنی جگہ سے ہلتا بھی نہیں۔

لنکن کی روح نے وائٹ ہاؤس کے کسی مکین کو آج تک نہیں ستایا مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اپریل کے مہینے میں نہایت خاموشی سے چرچ کے پادری کو بلایا جاتا ہے اور اس کی وجہ شاید یہی ہو کہ اس بھٹکتی روح سے وائٹ ہاؤس کے مکینوں کو محفوظ رکھا جائے۔ میرے اس آرٹیکل کو پڑھنے والے سوچ رہے ہوں گے کہ میں گپ مار رہا ہوں مگر نہیں، انٹرنیٹ کی سہولت ہر گھر میں ہے آپ خود بھی چیک کر کے دیکھیں کہ اتنے ڈھیر سارے مضامین آخر کیوں لکھے گئے؟ صدر کے بارے میں، اس کے بھوت کے بارے میں اتنی کہانیاں کیوں مشہور ہوئیں۔ جب تک سچائی نہ ہو کوئی بات پھیلتی نہیں ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس بار اپریل کے مہینے میں کس کس کو ابراہم لنکن کا بھوت نظر آتا ہے۔

(اس مضمون کی تیاری میں جارج الفارڈ کے مضمون اور بہت سی کتابوں، انٹرنیٹ کی کئی سائٹ سے مدد لی گئی ہے)

آسیبی قلعہ

ابن کبیر

بھارت کے صوبۂ راجستھان میں واقع اس قدیم قلعے میں روحوں کا بسیرا ہے۔ ایک نہیں کئی روحیں رہتی ہیں جو ایک دوسرے کی دشمن ہیں۔ جب وہ زندہ تھے تب بھی لڑتے تھے۔ اب مرنے کے بعد ان کی روحیں لڑ رہی ہیں اسی لیے حکومت ہند نے مرکزی دروازے پر انتباہ کا بورڈ لگا دیا ہے کہ شام ہوتے ہی ہر آدمی اس قلعے سے دور ہٹ جائے۔

دو روحوں کی رسہ کشی کا محور، ایک پراسرار قلعے کا احوال

ہم وحشت ناک سناٹے میں قید تھے، جہاں خوف کی تاریکی چھائی تھی! ہر گزرتے لمحے کے ساتھ ٹھنڈ میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا جو ہماری ہڈیوں میں اُتر رہی تھی۔ سرد کھنڈر میں پُراسرار سائے حرکت کر رہے تھے، اندھیرا ہیبت ناک معلوم ہوتا تھا اور یاسیت کی اِس کھائی میں زخمی شنکر کی سسکیاں ماحول کی ہولناکی بڑھا رہی تھیں۔

اور تب اچانک، مجھے قلعے کے تاریک ترین گوشے میں، کفن سے سفید لبادے میں ملبوس ایک پُراسرار ہیولا نظر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آیا۔

''کیا یہ رانا وتی کی روح ہے؟'' میری دھڑکن تیز ہوگئی۔ سچ تو یہ ہے کہ اُس تاریک سرد ترین رات بھی بھان گڑھ کی حقیقت جاننے کی مہم ایسے کی شکل اختیار کر گئی تھی! اور یہی واقعہ اِس پریشان کُن کہانی کا آغاز بن گیا تقریباً تین ہفتے قبل ایک سنہری صبح، لندن میں میری اور ندیم خان کی ملاقات ہوئی اور اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ آپ بھی سنیں۔

اس وقت میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ فقط اکیس دن بعد میں ایک چیستانی رات کی لپیٹ میں آنے والا ہوں جو برسوں میرے اعصاب پر سوار رہے گی۔

ندیم ''آرکیولوجیکل سروے آف انڈیا'' میں ملازم تھا اور چھٹیاں گزارنے لندن آیا ہوا تھا۔ اُسے تاریخی، خصوصاً پُراسرار مقامات میں خصوصی دلچسپی تھی اور یہی موضوع میری توجہ کا مرکز تھا۔

ہم پہلی بار ایک سیمینار میں ملے، جس کا موضوع ''لندن کے آسیبی مکانات'' تھا، ان مکانات کی بابت عجیب و غریب کہانیاں مشہور تھیں۔ اس سیمینار کا انعقاد ایک غیر سرکاری تنظیم ''گھوسٹ ہنٹنگ آرگنائزیشن، لندن'' نے کروایا تھا جو مافوق الفطرت اور غیر معمولی معاملات کی تحقیق کے سلسلے میں مشہور تھی۔ اُس کے ارکان مختلف آلات سے لیس پُراسرار اور آسیبی تصور کیے جانے والے مقامات کے دورے کرتے تھے۔

یہ خاصی منظم تنظیم تھی۔ اس کے رکن اپنی ویب سائٹ اور ٹی وی پروگرامز کے طفیل لندن کے نوجوانوں میں خاصے مشہور تھے۔ وہ خود کو ''گھوسٹ ہنٹرز'' یعنی بھوتوں کے شکاری کہا کرتے تھے۔ اُن کا ایک ہفتہ وار پروگرام Believe It or Not! (مانو یا نہ مانو!) میں اور میرے دوست بڑے تجسّس کے ساتھ باقاعدگی سے دیکھا کرتے تھے پروگرام میں وہ آسیبی مقامات کے دورے کرتے اور وہاں پیش آنے والے عجیب و غریب واقعات کے اسباب تلاش کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اُس دوران ان کے آلات میں ریکارڈ ہونے والی پُراسرار آوازیں، ویڈیو کیمرے میں محفوظ رہ جانے والی دھندلی تصویریں اور اُن کے میٹرز، جو ماحول میں آنے والی تبدیلیاں نوٹ کرتے تھے، پُراسراریت کو بڑھاتے اور ناظرین کو نامعلوم کے گہرے میں چھپی حقیقت میں جھانکنے کی تحریک دیتے۔

گو کہ سنجیدہ حلقوں نے کبھی اس کوششوں کو اہمیت نہیں دی اور سائنس دانوں کی جانب سے بھی اِس طرز کی کھوج کو غیر منطقی اور وقت کا ضیاع قرار دیا گیا، لیکن ناظرین کی دلچسپی میں کبھی کمی نہیں آئی۔ یہی وجہ ہے کہ گزشتہ چار برسوں کے دوران ''گھوسٹ ہنٹنگ آرگنائزیشن'' کی شہرت سرحدیں عبور کر گئی تھی۔ ایک جانب جہاں یورپ میں یہ پروگرام خاصا مقبول تھا، وہیں بھارت میں بھی اِسے بڑی دلچسپی سے دیکھا جاتا تھا۔

اگرچہ میں کبھی بھارت نہیں گیا لیکن یہ ملک میرے لیے خصوصی اہمیت کا حامل تھا۔

دراصل میرے والد فصیح الدین احمد کا تعلق یوپی کے ضلع غازی پور سے تھا۔ اُنہوں نے متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے زمیں دار گھرانے میں آنکھ کھولی۔ میری دادی یعنی اپنی والدہ کے انتقال کے بعد اُن کے چچا، اُنہیں اپنے ساتھ مشرقی پاکستان لے گئے، جہاں اُنہوں نے کسمپرسی کی حالت میں اپنی تعلیم جاری رکھی۔ 65ء میں ڈھاکا یونیورسٹی سے اکنامکس میں ماسٹرز کرنے کے بعد اُنہیں لندن آنے کا نادر موقع ملا اور پھر وہ یہیں کے ہو کر رہ گئے۔

ابتدائی مسائل کے بعد اُنہوں نے اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر خود کو منوالیا اور بطور اکنامسٹ حکومتی مشینری کا حصہ بن گئے۔ اسی عرصے میں ان کی میری والدہ، کلثوم زہرہ سے ملاقات ہوئی جن کے اجداد کا تعلق مصر سے تھا۔ کچھ ہی عرصے بعد یومیہ بنیادوں پر ہونے والی ملاقاتوں میں محبت در آئی۔ اُن کی شادی ہوگئی اور یوں میں نے جنم لیا۔

گو کہ مجھے ہندوستانی اور مصری خون اور تہذیب وراثت میں ملے لیکن میرے والدین نے خود کو کھلی طور پر برطانوی رنگ میں رنگ لیا تھا جس کی وجہ سے میں بھی مغربی ماحول میں پروان چڑھا۔

میں نے اپنے دادا اور دیگر رشتے داروں کو کبھی نہیں دیکھا لیکن اُن کا ذکر بہت سنا۔ کم سنی میں اپنی والدہ کے ساتھ ایک بار میں مصر ضرور گیا تھا لیکن اب میری یادداشت میں قاہرہ کی پُرہجوم سڑکوں، اہرامِ مصر اور ابوالہول کے علاوہ کچھ نہیں... کچھ بھی نہیں!

تاہم میں نے خود کو ہمیشہ اپنے والدین کی سرزمینوں کی جانب کھنچتا ہوا محسوس کیا۔ میں اکثر انٹرنیٹ کی دنیا میں داخل ہو کر دہلی کی گلیوں اور قاہرہ کے جس زدہ ماحول میں گم ہو جاتا

تھا۔ یہ شہر، یہ ریاستیں مجھے اپنی طرف بلاتی تھیں، اسی باعث ندیم سے ملاقات کے بعد میں نے ہندوستان جانے کے منصوبے کو عملی شکل دینے کے لیے بھرپور سنجیدگی کا مظاہرہ کیا۔

اور اِس کا بنیادی سبب بھان گڑھ کا وہ پُراسرار قلعہ تھا، جسے بھوتوں کا قلعہ کہا جاتا ہے!

☆☆☆

سیمینار کے بعد، جب صبح کی نرمی دوپہر میں تبدیل ہو چکی تھی، شرکاء ٹولیوں کی صورت محوِ گفتگو تھے۔ میں اپنے ایک دوست جان مکین کے ساتھ اس تقریب میں شریک ہوا تھا جو اس وقت چین سے تعلق رکھنے والے ایک شخص سے زور شور سے بحث کر رہا تھا اور یہ ثابت کرنے میں تُلا تھا کہ آسیبی مقامات پر پیش آنے والے بیشتر معاملات کی جو ماورائے عقل معلوم ہوتے ہیں، سائنسی توجیہہ پیش کی جاسکتی ہے۔

اس کے بلند آہنگ نے ندیم کو متوجہ کیا اور وہ ہاتھ میں کافی کا مگ لیے ہماری طرف چلا آیا اور گفتگو میں شریک ہوگیا۔

درمیانے قد اور سانولی رنگت والے اس شخص میں کچھ ایسا خاص تھا جس نے مجھے فوری متوجہ کر لیا۔ شاید یہ اُس کی چمکتی آنکھیں تھیں یا شاید اُس کا ہندوستان سے تعلق... جس نے اپنے والد کی سرزمین کے بارے میں جاننے کے میرے شوق کو مہمیز کیا۔

اس روز ہماری گفتگو لندن کے آسیبی مکانات سے ہوتی ہوئی بھارت پہنچ گئی اور کہانی کا اختتام تاریخی اہمیت کی حامل ریاست راجستھان میں ایستادہ ایک ایسے قلعے پر ہوا جسے ''بھوتوں کا قلعہ'' کہا جاتا ہے۔

ندیم نے ہمیں بتایا۔ ''بھان گڑھ کے کھنڈرات راجستھان کے ضلع الور میں واقع ہیں۔ راجستھان اپنے تاریخی مقامات کی وجہ سے معروف ہے اور بھان گڑھ اس کی شہرت میں اضافہ کرتا ہے۔ یہ خیال عام ہے کہ کھنڈر پر آسیب کا سایہ ہے، خصوصاً بھان گڑھ کے قلعے کے بارے میں تو کئی پُراسرار کہانیاں مشہور ہے جن کے پیشِ نظر اُسے بھوتوں کا قلعہ کہا جاتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ کوئی وہاں رات کے وقت ٹھہرنے کی جرأت نہیں کرتا۔''

''کیا تمھارا کبھی وہاں جانا ہوا؟'' میں نے تجسّس کے زیرِ اثر دریافت کیا۔

''ہاں، میں دہلی کی آرکیولوجیکل سروے ٹیم کے ساتھ بھان گڑھ گیا تھا...''

''تو کیا وہاں تمھارا کسی مافوق الفطرت قوت سے سامنا ہوا؟'' جان نے سوال داغا۔

''نہیں!'' اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ ''ہم نے دن ہی دن میں اپنا کام ختم کر لیا اور رات قلعے سے کچھ فاصلے پر بنے ایک ریسٹ ہاؤس میں گزاری۔ اگرچہ میں رات کو وہاں ٹھہرنا چاہتا تھا لیکن میرے دیگر ساتھی شدید خوف کا شکار تھے۔ وہ واقعی ڈرے ہوئے تھے، اُنہوں نے مجھے بھی کئی خوفناک کہانیاں سنائیں۔''

''کیا تم ہمیں مزید کچھ بتا سکتے ہو؟'' یہ سوال میری بڑھتی دلچسپی کا عکاس تھا۔

''کیوں نہیں! تباہی کا نشان بن جانے والا بھان گڑھ سارسکا ٹائیگر جنگلات کے کنارے واقع ہے۔'' ندیم کہتا رہا۔ ''جن کا سناٹا، کھنڈر کے بارے میں مشہور کہانیوں کی پُراسراریت میں اضافہ کرتا ہے۔ خیر، مافوق الفطرت واقعات کو ایک جانب رکھتے ہوئے بطور ماہر آثاریات جائزہ لیا جائے تو مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ وہ انتہائی خوبصورت مقام ہے۔''

ہماری گفتگو گھنٹوں جاری رہی جس کے اختتام پر ہم نے رابطہ نمبر اور ای میل ایڈریس کا تبادلہ کیا اور اپنے اپنے گھروں کو ہو لیے!

☆☆☆

اُس رات میں کمپیوٹر اسکرین کے سامنے بیٹھا، انٹرنیٹ کی دنیا میں بھان گڑھ کی حقیقت کھوجتا رہا۔ یوں مجھے کئی دلچسپ کہانیوں سے روبرو ہونے کا موقع ملا جنہوں نے میرے شوقِ تجسّس کو بڑھایا۔

پُرانے طرز کے، سرسبز اور خاموش پہاڑوں میں گھرے کھنڈر کی تصاویر دیکھتے ہوئے، جن کی بابت یہ خیال عام تھا کہ وہ اب بھوتوں کا مسکن ہیں، جب میں صبح کمپیوٹر اسکرین کے سامنے سے اُٹھا تو بھارت جانے کا منصوبہ ابتدائی مراحل میں تھا۔

اسی شام میں نے ندیم سے ٹیلی فونک رابطہ کیا اور ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ اُس نے خوشدلی سے ہامی بھر لی۔

دو گھنٹے بعد میں مقررہ مقام پر پہنچ گیا۔ میرا پُرجوش دوست جان بھی ساتھ تھا۔

اس روز جہاں ہم نے بھان گڑھ کے موضوع پر بحث

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی، وہیں ندیم نے یہ بتا کر ہمیں حیران کر دیا کہ ہندوستان میں بھی مختلف گروپس گھوسٹ ہنٹنگ کے میدان میں کود پڑے ہیں۔

''واقعی کیا تم سچ کہہ رہے ہو؟'' جان کے لہجے میں حیرت تھی۔

''بالکل دوست، ہندوستان اب تیزی سے ترقی کر رہا ہے۔ اب مغرب کی طرز پر وہاں روایتی تا نترک اور بھوت بھگانے والوں کی جگہ اُن نوجوانوں نے لے لی ہے جو مختلف آلات اور کیمرے لیے آسیبی مقامات کا دورہ کرتے ہیں۔''

''تو کیا آپ کے ٹی وی چینلوں سے بھی اِس قسم کے پروگرام نشر ہوتے ہیں، جیسے 'گھوسٹ ہنٹنگ آرگنائزیشن، لندن' کے تحت پیش کیے جاتے ہیں۔''

''ایک حد تک!'' ندیم نے کافی کا گھونٹ لیا۔ ''اس طرز کی چند تنظیمیں ہندوستان میں خصوصاً بڑے شہروں میں کام کر رہی ہیں۔ اس ضمن میں چند پروگرام بھی پیش کیے گئے، تاہم بیش تر معاملات میں اس قسم کے گروپ ٹی وی چینلوں کے ساتھ الحاق کر لیتے ہیں اور اُن کی رپورٹنگ ٹیم کے ساتھ مختلف مقامات کا دورہ کرتے ہیں۔''

''ہندوستان میں بھوتوں کا شکار کرنے والوں سے ملنا دلچسپ تجربہ ثابت ہوگا۔'' میں نے دل میں سوچا۔

☆☆☆

تین دن بعد ندیم بھارت لوٹ گیا اور میں اپنے والد کے آبائی وطن کا سفر کرنے کی تیاریوں میں جُٹ گیا۔

میرے والد کے لیے یہ خبر خوشگوار حیرت کا باعث بنی۔ اگرچہ انہیں اس بابت شدید اعتراض تھا کہ میں بھارت فقط بھوتوں کا قلعہ دیکھنے جا رہا ہوں، تاہم اُنہوں نے مجھ پر کوئی روک نہیں لگائی، بس یہ نصیحت کی کہ میں ایک پڑھے لکھے انسان کی حیثیت سے تاریخی مقامات کو ان کی اصل حیثیت میں دیکھوں اور ان سے جُڑی مافوق الفطرت کہانیوں کی جانب زیادہ توجہ نہ دوں۔

انھوں نے چند نصیحتیں بھی کیں اور دورانِ سفر میں چور اچکوں سے محفوظ رہنے کے حوالے سے احتیاط برتنے کی ہدایت کی۔

میری والدہ اِس ضمن میں خاصی پریشان تھیں کہ میں ہندوستانی ماحول سے نابلد ہوں لیکن میں نے اُنہیں یہ بتا کر مطمئن کر دیا کہ آرکیولوجیکل سروے آف انڈیا سے وابستہ میرا دوست ندیم خان میرے ساتھ ہوگا۔ پھر جان بھی میرے ساتھ جا رہا ہے۔

یہ سن کر ان کے چہرے پر کچھ اطمینان نظر آیا۔ دراصل جان انہیں بہت عزیز تھا اور وہ یقین رکھتی تھیں کہ جان مجھ سے زیادہ سمجھ دار ہے اور مشکل حالات میں میرا خیال رکھے گا۔

میں اپنی والدہ کی مادری زبان سے تو آشنا نہیں تھا لیکن اپنے والد کی زبان بڑی حد بول اور سمجھ لیتا تھا۔ سبب یہ تھا کہ ہم لندن کے ایک ایسے علاقے میں مقیم تھا جہاں برصغیر سے تعلق رکھنے والوں کی اکثریت ہے۔

چند روز تیاریوں میں گزرے۔ اس دوران میرا اور جان کا ندیم سے انٹرنیٹ پر رابطہ رہا۔ اس نے بتایا کہ وہ اس مہم کے لیے دہلی سے تعلق رکھنے والے نوجوانوں پر مشتمل ایک گھوسٹ ہنٹنگ ٹیم سے بھی بات کر چکا ہے جس کے ارکان جلد مجھ سے رابطہ کریں گے۔

دوسرے دن مجھے وویک امبانی کی ایک ای میل موصول ہوئی۔ وویک ایک پیشہ ور فوٹو گرافر تھا جو شوقیہ گھوسٹ ہنٹنگ کے میدان میں کود پڑا تھا۔ اُس نے لکھا تھا۔ ''مسٹر علی احمد، ندیم صاحب نے مجھے آپ کے ارادوں سے آگاہ کیا تھا۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ کے والد کا تعلق بھارت سے ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ سفر آپ کے لیے دلچسپ ثابت ہوگا۔ جہاں تک بھان گڑھ کا تعلق ہے، آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ میری ٹیم 'ینگ گھوسٹ ہنٹرز' ایک طویل عرصے سے راجستھان کے اس مشہور زمانہ قلعے کا رخ کرنے کا سوچ رہی تھی۔ آپ ساتھ ہوں گے تو خوب جمے گی۔''

اس نے مزید لکھا کہ وہ اس ضمن میں معلومات اکٹھی کر رہا ہے۔ ساتھ ہی مجھے گھوسٹ ہنٹنگ کے دوران استعمال ہونے والے آلات کے بارے میں شدبُد حاصل کرنے کا مشورہ دیا۔

میں ان آلات کے بارے میں تھوڑی بہت معلومات رکھتا تھا۔ چھوٹے ہینڈی کیمرے اور آواز ریکارڈ کرنے والے آلات تو وہی تھے جو عام طور پر استعمال ہوتے ہیں لیکن اس طرح کی کارروائی میں ''نائٹ ویژن'' اور ''انفراریڈ'' کیمرے استعمال کیے جاتے ہیں۔ یہ تاریکی میں واضح ریکارڈنگ کر سکتے ہیں۔ اِس کے علاوہ مقناطیسی میدان میں آنے والی تبدیلی کو بھی نوٹ کر سکتے ہیں۔

گھوسٹ ہنٹنگ کے دوران سب سے اہم ''ای ایم

ایف'' میٹر ہوتا ہے، جو ''الیکٹرومیگنیٹک فیلڈ'' میں آنے والی تبدیلیوں کی نشان دہی کرتا ہے۔ یہ حساس آلہ حرکت کرنے والے اجسام کی جو برقی مقناطیسی میدان میں تبدیلی کا باعث بنتے ہیں، موجودگی کے اشارہ دیتا ہے۔ یہ عام خیال ہے کہ اگر کسی جگہ مابعد الطبعیاتی یا غیر معمولی، غیر مرئی وجود موجود ہو اور وہ حرکت کرے تو میٹر کی ریڈنگ میں واضح تبدیلی آتی ہے۔ اس ضمن میں تھرمامیٹر بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ طبّی معائنے کے لیے استعمال ہونے والے روایتی تھرمامیٹر کے مقابلے میں جدید اور حساس ہوتا ہے اور درجہ حرارت میں پیدا ہونے والی معمولی سی تبدیلی کو بھی نوٹ کر لیتا ہے۔

میں اور جان دونوں اِن آلات کے بارے میں بنیادی معلومات رکھتے تھے جس کا سبب ہمارا پسندیدہ پروگرام Believe It or Not! تھا جس میں اِن آلات کو برتا جاتا ہے، تاہم مزید معلومات کے لیے ہم نے انٹرنیٹ سے استفادہ کیا۔

☆☆☆

ندیم کی ہدایت پر میں بھان گڑھ کے بارے میں خاصی تحقیق کر چکا تھا جس کے نتائج نے اِس قلعے کی پُراسراریت میں اضافہ کیا۔

ابتداً میرے سامنے اس علاقے کے بارے میں تاریخی حوالے آئے جن کے مطابق یہ تباہ حال شہر جے پور اور دہلی کے درمیان واقع ہے اور اپنے کھنڈرات کی وجہ سے مشہور ہے۔ اِس علاقے میں آبادکاری کی جڑیں قبل از تاریخ تک جاتی ہیں جب خانہ بدوشوں نے یہاں ڈیرے ڈالے، تاہم یہ صحیح معنوں میں کئی صدیوں بعد آباد ہوا۔

بھان گڑھ شہر کے پانچ داخلی دروازے ہیں۔ یہاں طرزِ تعمیر کے شان دار نمونے ملتے ہیں جن میں گوپی ناتھ، شیو اور منگلا دیوی کے مندر خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ کھنڈر میں پختہ سڑکیں، مکانات اور دکانوں سے مشابہہ آثار بھی ہیں۔ یہاں ایک قلعہ ہے اور یہی پُراسرار کہانیوں کا ماخذ و مرکز رہا ہے۔

اندازوں کے مطابق یہ قصبہ 1573 میں بھگونت داس کے دور میں باقاعدہ آباد ہوا جس کی انتظامی ذمّے داری اُس نے اپنے دوسرے بیٹے مادھو سنگھ کو سونپ دی۔ یہ نوجوان اکبر کے جنرل مان سنگھ کا چھوٹا بھائی تھا۔ اِس نوجوان نے اپنے باپ اور بھائی کے ساتھ کئی معرکوں میں حصہ لیا۔

اُس کے بعد اُس کے بیٹے چھتر سنگھ نے گدی سنبھالی جس کا انتقال 1630 میں ہوا۔ اورنگ زیب کی موت کے بعد جب مغل سلطنت کمزور پڑنے لگی، جے سنگھ دوئم نے 1720 میں بھان گڑھ پر حملہ کر دیا۔

اِس حملے نے بھان گڑھ کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ تاریخی حوالوں کے مطابق نئے حکمرانوں کی ناقص حکمتِ عملی نے یہاں کے باسیوں کو مایوسی کی اتھاہ گہرائی میں دھکیل دیا اور اُنہوں نے کوچ کر جانے ہی میں عافیت جانی۔ دھیرے دھیرے آبادی گھٹتی گئی پھر 1783 میں پڑنے والے سیاہ قحط نے اِسے ویران کر دیا، جس کے بعد یہاں انسانوں نے کبھی قیام نہیں کیا اور اب یہ شہر کھنڈر کی صورت باقی ہے۔

یہ جغرافیائی اعتبار سے بھی خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ کھدائی کی حالیہ مہمات کے دوران یہاں سے قدیم زمانے میں استعمال ہونے والے اوزار ملے ہیں۔ اس کے اطراف میں اونچے پہاڑ ہیں جن سے آبشاریں نکلتی ہیں۔ تاہم سب سے دلچسپ وہ سائن بورڈ ہے جو بھان گڑھ کے کھنڈر کے باہر نصب ہے اور آسیبی کہانیوں پر یقین رکھنے والوں کے خوف کو مہمیز کرتا ہے۔

دراصل آرکیولوجیکل سروے آف انڈیا (ASI) نے بھان گڑھ کے آثار کے نزدیک ایک بورڈ نصب کر رکھا ہے جس پر خصوصی ہدایت درج ہے کہ یہاں سورج غروب ہونے کے بعد ٹھہرنے اور سورج طلوع ہونے سے قبل آنے کی ممانعت ہے۔

بھان گڑھ کا رُخ کرنے والے کئی سیاح اور شوقیہ محقق اِس رائے کا اظہار کر چکے ہیں کہ وہاں کی فضا میں خوف، پُراسراریت اور صدیوں کی تھکن بھری ہے۔

☆☆☆

دہلی کے انٹرپورٹ پر اُترتے ہی میرا پہلا سامنا گرمی اور حبس سے ہوا۔

برطانیہ کے معتدل موسم سے نکل کر اس مرطوب خطے میں داخل ہونا ایک مشکل تجربہ تھا اور میرے والد اِس بابت مجھے مطلع کر چکے تھے۔

انٹرپورٹ پر وویک اور جوہی ہمیں لینے آئے۔ پچیس سالہ جوہی، وویک کی منگیتر تھی۔ وہ ایک اسکول ٹیچر تھی اور اپنے منگیتر کے شوق کا تعاقب کرتے ہوئے اِس میدان میں داخل ہو گئی تھی۔ وہ بھی بھان گڑھ جانے کی بابت خاصی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پُرجوش تھی۔

ائیر پورٹ کے باہر فضائی آلودگی اور ٹریفک کا شور ہمارا منتظر تھا۔ ابتدا میں تو مجھے اور جان کو خاصی پریشانی ہوئی لیکن جب ٹیکسی نے دہلی کی پُرہجوم تنگ سڑکوں پر گھومنا شروع کیا تو تجسس کے زیر اثر ہم سب بھلا بیٹھے اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُس دہلی کو دیکھنے لگے جو بالی وڈ کی فلموں میں نظر آنے والے رنگارنگ دہلی سے یکسر مختلف تھا۔

اس دوران وویک ہمیں بھارت کی راج دھانی اور آبادی کے لحاظ سے ریاست کے دوسرے بڑے شہر ''دہلی'' کے بارے میں بتاتا رہا۔ اس نے ہمیں مطلع کیا کہ آبادی کے لحاظ سے دہلی دنیا کا آٹھواں بڑا شہر ہے اور یہاں بسنے والوں کی تعداد سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ایک ارب ساٹھ کروڑ کے قریب ہے۔ ''یہ بنیادی طور پر دو حصوں میں منقسم ہے۔ پرانا دہلی قدیم روایات کا امین ہے، جہاں کا چاندنی چوک، جامع مسجد، چاوڑی بازار اور دریبہ کلاں بین الاقوامی شہرت کے حامل ہیں۔''

جب وہ یہ بتا رہا تھا تو میرے ذہن کے پردے پر بالی وڈ فلموں کے مناظر گھوم رہے تھے، جن کی شوٹنگ پُرانی دہلی کے گنجان علاقوں اور پُرہجوم گلیوں میں ہوئی تھی۔

اُس نے نئی دہلی کے بارے میں بھی مختصراً معلومات فراہم کی، جو منظم انداز میں آباد کیا گیا۔ اسی علاقے میں بڑے سرکاری دفاتر موجود ہیں اور یہیں وزیر اعظم ہاؤس، صدارتی محل، پارلیمنٹ اور سپریم کورٹ واقع ہیں۔ یہ معاشی حب بھی ہے اور کثیر المنزلہ عمارات سے گھرا ہوا علاقہ بھی ہے۔

''مقولہ مشہور ہے، یہاں بیٹھ کر ہندوستان پر حکومت کی جاتی ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ہماری بکنگ ہوٹل ''من کوٹ پاتری'' میں تھی، جو نئی دہلی کے علاقے چناما رکیٹ، قرول باغ میں واقع تھا۔ گو کہ یہ تین ستارہ ہوٹل تھا، لیکن بھارت کا رخ کرنے والے سیاحوں کے لیے اِسے بہترین تصور کیا جاتا تھا، اسی باعث میں نے اور جان نے اس ہوٹل کا چناؤ کیا۔ یہ ایئرپورٹ سے پچیس منٹ اور ریلوے اسٹیشن سے دس منٹ کی ڈرائیو پر تھا۔

ہوٹل پہنچنے کے بعد ہم چاروں نے گرما گرم چائے پی جس کا ذائقہ اُس چائے سے خاصا مختلف تھا جو میں اور جان کبھی کبھی لندن میں واقع ہندوستانی قہوہ خانوں میں پیا کرتے تھے۔

کچھ دیر بعد وویک اور جوہی شام میں ملنے کا وعدہ کر کے چلے گئے۔ ہم بری طرح تھک چکے تھے، اس لیے بستر پر جاتے ہی نیند کی آغوش میں چلے گئے۔

☆☆☆

''آپ انڈیا گیٹ دیکھنا چاہیں گے یا ہمایوں کا مقبرہ؟''

اِس سوال نے مجھے چونکا دیا۔ اس وقت میں اور جان ہوٹل کی لابی میں بیٹھے ایک چکن برگر پر ہاتھ صاف کر رہے تھے جس کے تیز مسالے عجیب ذائقہ دے رہے تھے۔

یہ سوال ایک ٹورسٹ گائیڈ نے داغا تھا جو ہوٹل کی لابی میں سیاحوں کی تلاش میں آیا تھا۔

''نہیں شکریہ!'' میں نے تہذیبی اطوار کے مطابق اس سے معذرت کر لی۔

''اوہ پھر آپ لال قلعہ یا پرانا قلعہ ضرور دیکھنا چاہیں گے؟'' اُس کے چہرے پر پیشہ ورانہ مسکراہٹ تھی۔

''ضرور میرے دوست۔'' جان نے کولڈ ڈرنک حلق میں اُتارتے ہوئے کہا۔ ''لیکن آج نہیں، شاید کچھ دن بعد!''

''کیوں نہیں۔'' ٹورسٹ گائیڈ کے چہرے پر مسکراہٹ قائم رہی۔ اس نے اپنا وزیٹنگ کارڈ ہمارے حوالے کیا اور یہ درخواست کی کہ جب کبھی ہمارا دہلی گھومنے کا ارادہ بنے، ہم اس سے رابطہ کر لیں۔

اسی اثناء میں وویک اور جوہی وہاں پہنچ گئے۔ ہم ان کے استقبال کے لیے کھڑے ہو گئے۔ مقامی افراد کو دوغیر ملکیوں سے یوں بے تکلفی سے باتیں کرتا دیکھ کر وہ خاصا مایوس ہوا اور چہرے پر ناراضی کا تاثر لیے لوٹ گیا۔

کچھ دیر ہم گپ شپ کرتے رہے۔ پھر ہوٹل سے باہر آ کر ٹیکسی میں سوار ہو گئے۔ ہماری منزل مہرولی کا علاقہ تھا۔ سفر کے دوران ہم قطب مینار کے نزدیک سے گزرے، جسے قطب الدین ایبک نے تیرہویں صدی کے اوائل میں تعمیر کروایا تھا۔ سرخ پتھروں سے تعمیر کردہ یہ مینار 72.5 فٹ بلند تھا اور قدیم طرزِ تعمیر کا شاندار نمونہ تھا۔

کچھ دیر بعد ہم دو کمروں کے فلیٹ میں موجود تھے، جسے ''پنگ گھوسٹ ہنٹرز'' کے ارکان اپنے دفتر کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ ٹیم کا ایک رکن، ناصر اسی فلیٹ میں مقیم تھا۔ یہ گروپ پانچ افراد وویک، جوہی،

فنکر، ناصر اور ڈیوڈ پر مشتمل تھا۔

وویک، جوہی اور شنکر مختلف آلات کے ہمراہ آسیبی مقامات کے دورے کرانے کی ذمے داری نبھاتے تھے، ناصر تمام تکنیکی معاملات کی دیکھ ریکھ کرتا تھا، جبکہ ڈیوڈ، ویڈیو اور آڈیو ریکارڈنگ کا تجربے کرنے اور سمی و بصری مواد کو ترتیب دینے کا کام کرتا تھا۔ ہم دونوں سے وہ سب گرم جوشی سے ملے۔ ہم اس شام آسیبی مقامات کے موضوع پر گفتگو کرتے رہے۔ اُنہوں نے اپنے تجربات بانٹے، جنہوں نے میرے اور جان کے تجسس کو مہمیز کیا۔ پھر وہ موضوع زیرِ بحث آیا، جو ہمیں یہاں کھینچ لایا تھا اور راجستھان کے ضلع الور کا رخ کرنے سے قبل، جہاں بھان گڑھ کے کھنڈر ہیں، اِس کے بارے میں تمام تر معلومات اکٹھی کرنا ازحد لازم تھا۔

وویک نے بتایا کہ ندیم نے اُسے کچھ معلومات فراہم کی ہے اور اس نے خود بھی اس بارے میں تھوڑی بہت تحقیق کی ہے۔

ہم نے تاریخی حوالوں پر بات کی۔ پھر وہ پُراسرار کہانیاں زیرِ بحث آئیں، جو اس شہر کی وجہِ شہرت تصور کی جاتی ہیں۔

''بے شک بھان گڑھ کے کھنڈر سے کئی خوف ناک داستانیں جڑی ہیں۔'' وویک نے کہا۔ اس عرصے میں جوہی ہمارے سامنے کافی کے مگ رکھ چکی تھی۔

وویک کہتا رہا۔ ''عام خیال ہے کہ اِس شہر پر بابا بالاناتھ کی بددعا گردش کرتی ہے۔''

''بابا بالاناتھ؟'' جان بڑبڑایا۔ ''دلچسپ!''

''ہاں!'' وویک نے کافی کا گھونٹ لیا۔ ''کہانی کچھ یوں ہے کہ یہ علاقہ بابا کی پُراسرار شکتیوں کی وجہ سے مشہور تھا۔ مادھو سنگھ نے قصبہ تعمیر کرنے سے قبل بابا بالاناتھ سے اجازت طلب کی تھی جس نے یہ کہتے ہوئے شہر کی تعمیر کی اجازت دی کہ جس روز قلعے کا سایہ بڑھتے بڑھتے مجھ تک، میری کٹیا تک پہنچا، یہ شہر ختم ہو جائے گا! اس بات کو خصوصی طور پر قلعے کی تعمیر کے دوران ذہن میں رکھا گیا۔ ماہرینِ تعمیرات سے ممنوعہ علاقے سے دُور رہنے اور طلوع اور غروبِ آفتاب کے دوران جنم لینے والے سایوں پر بھی گہری نظر رکھنے کی تاکید کی گئی۔''

''یہ ایک مشکل عمل رہا ہوگا۔'' میں نے کہا۔

''یعنی طور پر!'' وویک بولا۔ ''تاہم معلوم ہوتا ہے کہ بابا کا اُس علاقے میں خاصا اثر و رسوخ تھا، اس لیے شہر کے حکمراں نے اس کے حکم کی تعمیل کی، تاہم جب مادھو سنگھ کا پوتا برسرِ اقتدار آیا، اس وقت تک اس کے دادا کے زمانے کے لوگ مر کھپ گئے تھے۔ وہ اس معاملے سے یکسر لاعلم تھا۔ اس نے شہر کی توسیع کے لیے تعمیراتی عمل شروع کیا، جس کے باعث ایک روز شہر کی فصیلوں کا سایہ ممنوعہ علاقے تک پہنچ گیا اور بابا کے علاقے میں پھیل گیا۔ بس، بددعا نے اثر شروع کر دیا جس نے شہر اور شہر کے باسیوں کی خوشیاں نگل لیں چند روز میں سب ختم ہو گیا۔''

''اوہ!'' جان کے منہ سے نکلا۔

''کچھ لوگوں کا تو خیال ہے کہ یہ شہر ایک ہی رات میں مکمل طور پر تباہ ہو گیا۔'' ناصر نے بڑے ہی ڈرامائی انداز میں کہا۔

''اور کہنے والے کہتے ہیں کہ آج بھی ایک چھوٹی سی سمادھی میں بالاناتھ کا جسم دفن ہے۔'' وویک نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

اِس جملے کے ساتھ پُراسرار خاموشی ہماری محفل میں در آئی۔ کئی ساعتوں تک ہم چپ سادھے بیٹھے رہے۔

''کیا مہمانوں کو بھوکا مارنے کا ارادہ ہے؟'' جوہی نے اپنی دستی گھڑی دیکھتے ہوئے خاموشی توڑی۔ اس جملے سے سب کے چہرے پر وہ مسکراہٹ لوٹ آئی جو بھان گڑھ کی تاریخ میں گم ہو گئی تھی۔

ہم اپارٹمنٹ سے نکل کر سڑک پر آ گئے۔ ایک چینی ریسٹورنٹ میں ڈنر کرنے کے بعد ہم ساتوں بہت دیر تک دہلی کی سڑکوں پر گھومتے رہے۔

ہم نے نئی دہلی کے علاقے گریٹر کیلاش میں واقع ''پرنس پان چاٹ کارنر'' کا بھی رخ کیا۔ وویک کے بے حد اصرار پر ہم نے چند تیکھے آئٹم چکھے۔ اس دوران جوہی اور ناصر یہی کہتے رہے کہ ہمیں دہلی کے کھانوں کا اصل ذائقے چکھنے کے لیے چاندنی چوک جانا چاہیے۔ اُنہوں نے ہمیں صبح روایتی مغربی ناشتا کرنے کی بجائے حلوا پوری چکھنے کا بھی مشورہ دیا۔

☆☆☆

میں اور جان شاید دوپہر تک سوئے رہتے، اگر میرا فون چیخنے نہ لگتا۔

میں نے بہ مشکل آنکھیں کھولیں اور فون اُٹھایا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دوسرے طرف میرے والد تھے، جو ہماری خیریت دریافت کررہے تھے۔ اُن سے بات کرنے کے بعد میں نے جان کو بیدار کرنے کا فیصلہ کیا۔

کچھ دیر بعد ہم ہوٹل کی لابی میں تھے جہاں ٹورسٹ گائیڈ بھی ہونٹوں پر پیشہ ورانہ مسکراہٹ لیے موجود تھا لیکن وہ ہم سے دور ہی رہا۔ ہم نے اپنے نئے دوستوں کے مشورے پر حلوا پوری کا آرڈر دیا اور اسے تجسّس کے ساتھ اپنے شکم میں اُتارا۔

کچھ دیر بعد وویک کا فون آیا، جس نے ہمیں سفر کی تیاری کرنے کے لیے کہا۔ اُس نے بتایا کہ ہم آج رات الور جانے کے لیے ٹرین میں سوار ہوں گے، ناصر کچھ دیر بعد ہوٹل پہنچ جائے گا اور وہ اِس ضمن میں ہماری مدد کرے گا۔

چالیس منٹ بعد ناصر ہمارے سامنے کھڑا تھا۔ وہ ایک دلچسپ نوجوان تھا۔ اُس نے تیاری کرنے میں ہماری خاصی مدد کی۔ اس دوران ہم مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے رہے۔ وہ عمرانیات کے مضمون میں ماسٹرز کررہا تھا چوں کہ میں بھی اسی مضمون کا طالب علم تھا، اس لیے ہمارے درمیان خاصی ہم آہنگی ہوگئی۔ اس دوران دہلی اور ہندوستانی فلم انڈسٹری کا موضوع زیرِ بحث رہا اور ہم یہ بھول ہی گئے کہ ہم کس مقصد کے لیے یہاں آئے ہیں۔

☆☆☆

''دہلی سے الور کا فاصلہ 150 کلومیٹر ہے، ہم جنوب کی جانب سفر کریں گے۔ اگر ہم سڑک کے راستے جائیں، تو ہمیں وہاں پہنچے میں تین گھنٹے لگیں گے۔'' وویک نے ہمیں بتایا۔

شام ڈھل چکی تھی اندھیرا دبیز ہوتا جارہا تھا اور ہم پُرانا دہلی کے ریلوے اسٹیشن پر کھڑے تھے جہاں کا ہجوم مجھے پاگل کیے دے رہا تھا۔

''تو ہمیں سڑک ہی سے سفر طے کرنا چاہیے تھا، یہاں تو بہت رش ہے۔'' جان کے چہرے سے پریشانی عیاں تھی۔

''آپ پریشان نہ ہو۔'' شنکر مسکرایا۔ ''ٹرین کا سفر خاصا دلچسپ ثابت ہوگا۔ بیشتر ہندوستانی ٹرین ہی سے سفر کرتے ہیں، کیوں ڈیوڈ!''

''بالکل!'' کم گو ڈیوڈ نے کہا۔ ''ہم 'مندورا ایکسپریس' میں سوار ہوں گے، جو تقریباً نو بجے تک روانہ ہوگی اور پونے بارہ بجے تک یعنی اندازہ دو گھنٹے چالیس منٹ میں ہم الور پہنچ جائیں گے۔''

''یہ ٹرین ہفتے کے ساتویں دن دہلی سے الور کے لیے چلتی ہے۔''

''اور یہی ہماری سواری ہے دوستو!'' وویک مسکرایا۔

کچھ دیر بعد ٹرین کی سیٹی سنائی دی۔ ہم ساتوں اے سی کمپارٹمنٹ کی جانب بڑھے، جس کی بکنگ خصوصاً میرے اور جان کے لیے کروائی گئی تھی، کیوں کہ ابھی ہم یہاں کی گرمی کے عادی نہیں ہوئے تھے۔

ٹرین مقررہ وقت سے دو منٹ تاخیر سے روانہ ہوئی۔ سفر میری اور جان کی توقعات کے برعکس خاصا آرام دہ ثابت ہوا۔ اس دوران میں نے وویک سے درخواست کی کہ وہ ہمیں وہ آلات دکھائے جو اس مہم کے دوران ہم استعمال کرنے والے تھے۔

کچھ دیر بعد ''ای ایم ایف'' میٹر اور جدید ڈیجیٹل تھرمامیٹر ہمارے ہاتھوں میں تھے، جو ان آلات سے خاصے مشابہ تھے جو برطانیہ میں گھوسٹ ہنٹنگ کے دوران استعمال کیے جاتے ہیں۔

ڈیوڈ نے بتایا کہ پہلے وہ چینی ساختہ آلات استعمال کرتے تھے جو نسبتاً مہنگے تھے لیکن اب ہندوستان میں بھی مختلف کمپنیاں اس طرز کے آلات بنانے لگی ہیں۔

اِن آلات کو ہاتھ میں لینے کے بعد میرے تجسّس میں اضافہ ہوگیا اور میں نے گفتگو کا رُخ پھر بھان گڑھ کی جانب موڑ دیا۔

''تو دوستو، کیا وہاں واقعی بھوتوں سے سامنا ہونے کا امکان ہے؟'' میرے اس جملے پر کمپارٹمنٹ میں خاموشی چھا گئی۔

''ہم مافوق الفطرت قوتوں کے بارے میں اِس طرح گفتگو نہیں کرتے۔'' وویک نے دھیرے سے کہا۔ ''ہم آسیبی مقامات کے دورے کے دوران انہیں بڑے احترام سے پکارتے ہیں تاکہ وہ ہمیں نقصان نہ پہنچائیں۔ اور یہی اُن سے رابطہ کرنے کا طریقہ ہے۔''

''جہاں تک بھان گڑھ کا تعلق ہے'' ناصر نے بات آگے بڑھائی۔ ''کھنڈر کے بارے میں مشہور ہے کہ وہاں کوئی رات کو نہیں ٹھہر سکتا اور اس سے جڑی کہانیاں برسوں پُرانی ہیں۔ ہم نے اس قسم کی سرگرمیوں میں ملوث چند افراد سے رابطہ بھی کیا، لیکن اُن میں سے کوئی شخص، کبھی اِس قلعے میں

رات کو نہیں ٹھہرا۔ شاید کسی تانترک نے رات کو وہاں تپسیا کی ہو لیکن کسی گھوسٹ ہنٹر نے کبھی وہاں کا رُخ نہیں کیا۔''

''کیا اِس کا سبب خوف ہے؟'' جان نے سوال کیا۔

''کہہ سکتے ہیں!'' وویک کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔ ''دراصل گھوسٹ ہنٹنگ کے میدان میں سرگرم بیشتر تنظیمیں شہری علاقوں میں مصروف ہیں اور اس طرز کے علاقوں کا رُخ کم ہی کیا جاتا ہے۔ ہمارا دوست ندیم بھی کوشش کے باوجود کسی ایسے شخص سے رابطہ کرنے میں ناکام رہا، جس نے یہاں رات گزاری ہو۔''

کچھ دیر خاموشی چھائی رہی، جسے جان نے توڑا ''میں نے انٹرنیٹ پر ایک کہانی پڑھی تھی، شاید وہ حقیقی ہو۔ کیا آپ سننا چاہیں گے؟''

''ضرور!'' جوہی بولی۔

''اِس کہانی کے مطابق...'' جان کی آواز کمپارٹمنٹ میں گونج رہی تھی۔ ''تقسیم کے بعد حکومتِ ہند نے اس مقام سے جڑی کہانیوں کے خاتمے کے لیے ملٹری کی ایک ٹیم تیار کی تھی جسے سورج طلوع ہونے کے بعد اس علاقے کا جائزہ لینا تھا تاکہ یہ معما حل ہوسکے، تاہم خوف کی وجہ سے یہ مہم ملتوی کر دی گئی، کیوں کہ کوئی شخص وہاں داخل ہونے کی ہمت نہیں کرسکا، بلکہ اُنہوں نے ایک کلومیٹر دور لگے کیمپ میں بھی طلوعِ آفتاب کے بعد ٹھہرنے سے اجتناب برتا۔ یعنی جنگجو بھی یہاں ٹھہرنے کے خیال سے کانپ جاتے ہیں۔''

''میں نے بھی یہ کہانی پڑھی تھی۔'' ناصر نے کہا۔ ''کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ کہانی گھڑی ہوئی ہے، جس کا مقصد لوگوں کو یہ باور کروانا ہے کہ یہاں فوج بھی ٹھہرنے کی ہمت نہیں کرسکتی۔''

''کیا پتا، یہ سچ ہو۔'' شنکر نے بڑے گہرے لہجے میں کہا۔ ''دراصل رانا وتی کی کہانی کے بغیر بھان گڑھ کی داستان ادھوری ہے۔''

''رانا وتی...'' میں نے نام دُہرایا اور پُراسراریت کی لہر مجھ سے ٹکرائی۔

''ہاں، یہ کہانی اہم ہے۔'' جوہی نے گہرا سانس لیا۔ اب بھان گڑھ سے پیوست سب سے پُراسرار داستان ہماری سماعتوں سے ٹکرا رہی تھی۔

''یہ راجکماری رانا وتی کی کتھا ہے۔ کہتے ہیں، وہ راجستھان کی سب سے خوبصورت عورت تھی، ساتھ ہی علیمت میں بھی اپنی مثال آپ تھی۔ اُسے حاصل کرنے کی خواہش نے دیگر ریاستوں کے حکمرانوں کو دیوانہ بنا رکھا تھا۔ جس روز اُس دوشیزہ نے اٹھارویں سالگرہ منائی، اُس کے لیے دیگر ریاستوں کے راجاؤں کے رشتوں کا تانتا بندھ گیا لیکن اُس کا معیار بہت بُلند تھا۔ اس کے حصول کے لیے سویمبر رچا گیا، اِس کٹھن امتحان میں تمام راجا ناکام رہے اور دلبرداشتہ ہوکر اپنی ریاستوں کو لوٹ گئے۔ اِسی علاقے میں ایک تانترک بھی بستا تھا جو کالے علم کا ماہر تھا۔ وہ مذہبی کتابوں کا عالم بھی تھا۔ اُس کا نام سنگھیا تھا۔ وہ رانا وتی سے شدید محبت کرتا تھا، تاہم اُسے اندازہ تھا کہ یہ رشتہ کبھی نہیں ہوسکتا۔'' جوہی کچھ دیر کے لیے رکی پھر بولی۔ جب اُسے سویمبر کی خبر ملی، تو اس نے بھی شرکت کا فیصلہ کیا۔ کہانیوں کے مطابق وہ اس میں کام یاب رہا، تاہم رانا وتی نے اس سے شادی کرنے سے انکار کردیا اور اس کی تذلیل کی جس نے تانترک کو غصے سے بھر دیا۔ اب وہ راجکماری کو اپنے قابو میں کرنے کے طریقے کھوجنے لگا۔ پھر اُسے ایک طریقہ سُوجھا۔ رانی ایک خاص قسم کا تازہ تیل استعمال کرتی تھی جو شہر میں فقط ایک تیلی کے پاس دستیاب تھا۔ اس نے اِس تیل پر جادو کر دیا، جسے روز کی طرح راجکماری کی ملازمہ نے علی الصبح خرید لیا۔ تانترک کو یقین تھا کہ اِس تیل کو اپنے بدن پر ملتے ہی راجکماری دیوانہ وار اس کی طرف دوڑتی ہوئی آجائے۔''

''یہاں کہانی کے دو پہلو ہیں۔'' جوہی سانس لینے کے لیے رکی۔ ''...ایک کے مطابق تیلی نے راجکماری کو تانترک کی سازش سے مطلع کر دیا تھا، جب کہ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ راجکماری خود بھی کالے علم کی ماہر تھی۔ اُس نے تیل کو دیکھتے ہی یہ اندازہ لگالیا کہ اس پر جادو کیا گیا ہے۔ اس نے تیل زمین پر بہا دیا۔ جوں ہی تیل زمین پر پھیلا، اس نے ایک کالے ناگ کا روپ دھار لیا، جس نے تانترک پر حملہ کر دیا۔ موت سے قبل تانترک نے قلعہ میں رہنے والوں کو شراپ دیا، بددعا دی، مکمل تباہی کی بددعا! اور کچھ ہی عرصے بعد اِس بددعا نے اثر دکھانا شروع کر دیا۔ عجیب وغریب، پراسرار واقعات رونما ہونے لگے۔ ٹھیک ایک برس بعد عجب گڑھ کے راجا نے بھان گڑھ پر حملہ دیا، رانا وتی کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا، وہ راتوں رات شہر سے نکل گئی، جس کے بعد یہ شہر آسیب کے زیرِ اثر آگیا اور آج بھی یہ تباہ حال شہر انسانوں کے قیام کے لیے ممنوعہ علاقہ ہے۔'' جوہی خاموش ہوگئی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

باہر تاریکی کا راج تھا، کمپارٹمنٹ میں سناٹا چھایا تھا اور پٹری پر دوڑتی ٹرین الور کی جانب بڑھ رہی تھی۔

☆☆☆

جب ہم کمپارٹمنٹ سے باہر آئے، آدھی رات بیت چکی تھی۔ اسٹیشن پر خاموشی چھائی تھی جو عجیب معلوم ہوتی تھی، گو کہ وہاں لوگ تھے، لیکن سب سناٹے کے زیرِ اثر نظر آتے تھے۔

کچھ دیر بعد ندیم ہمارے سامنے کھڑا تھا جس کی آنکھوں میں نیند تھی، تاہم اس کی خوش مزاجی قائم تھی۔

''کیسے ہو دوستو! راجستھان کی تیسرے بڑے ضلع، اور ضلع کے سب سے بڑے شہر الور میں خوش آمدید!''

ہم باری باری اس سے ملے۔ وہ اپنے دوست وجے کے ساتھ وہاں آیا تھا جس کی ویگن کچھ دیر بعد اُس ہوٹل کی جانب بڑھ رہی تھی جہاں ہمیں قیام کرنا تھا۔

دوران سفر ندیم الور کے جغرافیہ اور محلِ وقوع کے بارے میں معلومات فراہم کرتا رہا۔ اس نے بتایا کہ سولہ لاکھ نفوس پر مشتمل شہر الور، راجستھان کے دارالحکومت، جے پور سے 150 کلومیٹر کے فاصلے پر آباد ہے۔ یہ انتہائی مرطوب شہر ہے، یہاں زیادہ سے زیادہ درجہ حرارت 50 سینٹی گریڈ ریکارڈ کیا گیا ہے، تاہم صحرائی جغرافیے کی وجہ سے یہاں رات کے وقت خاصی خنکی ہوتی ہیں۔ یہاں دیکھنے کے لائق کئی مقامات ہیں، خصوصاً خوبصورت ارضی مناظر اور قدیم طرزِ تعمیر کے نمونے... جو سیاحوں کو اپنے جانب متوجہ کرتے ہیں۔ اِن مقامات میں ''اراولی ہلز''، ''سلیسر جھیل'' اور ''سارسکا کا محل'' نمایاں ہیں۔ ''نمرانا'' نامی تاریخی قصبہ بھی خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔

''یوں تو کئی مقامات ہیں، لیکن میں جانتا ہوں کہ آپ یہاں بھان گڑھ کے کھنڈر دیکھنے آئے ہیں۔'' وہ مسکرایا۔

''بالکل یہ کہنا چاہیے کہ ہم بھان گڑھ کے بھوتوں کا شکار کرنے آئے ہیں۔'' جان نے شوخ لہجے میں کہا۔

''لیکن ہمیں احتیاط برتنی ہوگی، ورنہ ہم خود بھان گڑھ کے آسیب کا شکار ہو جائیں گے۔'' شکر بولا۔

اتنی دیر میں ہم اپنی منزل، یعنی ''اراولی ہوٹل'' پہنچ چکے تھے، گو کہ یہ دو ستارہ ہوٹل تھا، تاہم شہر کے عین وسط میں واقع تھا اور کئی اہم مقامات کے انتہائی قریب تھا۔ ریلوے اسٹیشن سے آدھے کلومیٹر کے فاصلے پر واقع اِس ہوٹل کو میں نے توقع کے برعکس خاصا آرام دہ پایا۔ رات خاصی بیت چکی تھی۔ ندیم کے رخصت ہونے کے بعد ہم بستر میں گھس گئے، جہاں نیند ہماری منتظر تھی۔

اُس وقت میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ٹھیک چوبیس گھنٹے بعد ہماری یہ مہم ایسے کی شکل اختیار کر جائے گی!

☆☆☆

ہوٹل کی لابی میں ناشتا کرتے ہوئے ہمارے درمیان بھان گڑھ کا موضوع زیرِ بحث تھا۔

جوہی نے یہ بتا کر ہمیں خدشات کی دنیا میں دھکیل دیا کہ کل رات اُس نے ایک بے رنگ خواب دیکھا تھا جس میں ہم سب ایک تباہ حال قلعے میں بھٹک رہے تھے۔

اُس موقعے پر ناصر نے کہا کہ وہ صبح سے عجیب بے چینی محسوس کر رہا ہے۔ صورتحال اُس وقت بگڑ گئی، جب جان بھی اسی قسم کی باتیں کرنے لگا۔ اس موقع پر وویک نے تینوں کو توہم پرستی سے دور رہنے کا مشورہ دیا۔

''شاید یہ سفر کی تھکان ہو!'' اُس نے کہا اور سب کو مطلع کیا کہ بھان گڑھ یہاں سے 84 کلومیٹر دُور ہے، وہاں تک پہنچنے کے لیے ندیم نے ویگن کا انتظام کیا ہے، ہم سات بجے روانہ ہوں گے۔

''یہی بہتر ہے، اگر ہم بس میں جائیں، تو ہمیں کھنڈر سے بارہ کلومیٹر دور اترنا پڑے گا۔'' ناصر نے کہا۔

''اور ہم ٹھہریں گے کہاں؟'' ڈیوڈ نے سوال کیا۔

''بھان گڑھ کے کھنڈر سے ایک کلومیٹر کے فاصلے پر ایک ریسٹ ہاؤس ہے، جو آرکیولوجیکل سروے آف انڈیا کے زیرِ انتظام ہے، ندیم نے وہیں قیام کا بندوبست کیا ہے۔''

''تو ہمارے پاس خاصا وقت ہے۔'' جوہی نے کہا۔

''کیوں نہ شہر کا ایک چکر لگا لیا جائے؟''

اس مشورے نے سب کو متحرک کر دیا۔ کچھ دیر بعد ہم الور کی سڑکوں پر تھے، ہم اس خوب صورت شہر میں گھومتے رہے جو دلکش ارضی مناظر سے دمک رہا تھا۔ میرے اور جان کے مقابلے میں دیگر افراد اس سفر سے زیادہ لطف اندوز ہوئے۔ اس مرطوب خطے کی گرمی ہمیں واقعی پریشان کر رہی تھی۔

ہم جلد لوٹ آئے۔ دراصل ہمیں ساری رات جاگنا تھا، اس لیے یہ ضروری تھا کہ دوپہر میں کچھ آرام کر لیا جائے۔ لنچ کرنے کے بعد ہم پھر اپنے کمروں میں پہنچ چکے تھے۔

قیلولے سے قبل میں نے لیب ٹاپ پر اپنی ای میل چیک کی۔ اُس پر میرے والد کا پیغام تھا جو میری خیریت دریافت کر رہے تھے۔ میں نے جوابی میل میں ان سے اپنی والدہ کی خیریت پوچھی، چٹ پٹے کھانوں اور ہندوستان کی گرمی کا ذکر کیا اور اُنہیں بے فکر رہنے کا مشورہ دیا۔

مکھیوں کی بھنبھناہٹ سے مشابہ آوازوں نے ساڑھے پانچ بجے میری آنکھ کھول دی۔

جان آنکھوں میں نیند اور پریشانی لیے موبائل فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ وہ خاصا گھبرایا ہوا تھا۔

بات ختم کرنے کے بعد اُس نے بتایا کہ اُس کی گرل فرینڈ، ایلی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے اور اسے اسپتال میں داخل کروا دیا گیا ہے۔

''سب خیریت تو ہے؟''

''ہاں...'' اس نے دھیرے سے کہا۔ ''اس کی ٹانگ میں چوٹ آئی ہے، تاہم معاملہ زیادہ سیریس نہیں۔'' وہ خود کو مطمئن ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

کچھ دیر بعد ہم ہوٹل کی لابی میں تھے جہاں وویک اپنی ٹیم کے ساتھ موجود تھا۔ ہمارے سامنے چائے کے کپ رکھے تھے جن سے دھواں اُٹھ رہا تھا۔ سورج آہستہ آہستہ مغرب میں گم ہو رہا تھا اور اندھیرا چھانے کو تھا۔

کچھ دیر بعد ندیم بھی اپنے دوست، وجے راز کے ہمراہ وہاں پہنچ گیا۔ ٹھیک بیس منٹ بعد ہم ہوٹل سے نکل کر اُس کی ویگن میں سوار ہو گئے۔ اگرچہ میں توہم پرست نہیں ہوں لیکن اُس لمحے نہ جانے کیوں، خاصی بے چینی محسوس کر رہا تھا۔

جب ہم نے الور کی حدود پار کیں، سورج مکمل طور پر غروب ہو چکا تھا۔

☆☆☆

دوران سفر ندیم ہمیں بھان گڑھ کی بابت آثار یاتی نقطۂ نظر سے معلومات فراہم کرتا رہا۔ اس کے بقول یہ شہر اندازاً سترہویں صدی کی دوسری دہائی کے اوائل میں آباد کیا گیا تھا۔ اس سے وابستہ داستانوں کے مطابق آبادکاری کے کچھ ہی عرصے بعد اِسے خالی کر دیا گیا، کیوں کہ اِس پر بددعا کا اثر تھا۔

''اِس کی طرزِ تعمیر سے قدیم رنگ جھلکتا ہے۔ بھان گڑھ کے قلعے کو قرون وسطیٰ سے جوڑا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس پر مغلوں نے حملہ کیا تھا جس کے بعد اِسے دوبارہ آباد کرنے کی کوششوں کا آغاز ہوا۔ بھان گڑھ کے کھنڈر کے نزدیک اور بھی چند تاریخی مقامات ہیں جن میں اہم ترین عجب گڑھ کے آثار ہیں۔ یہ بھان گڑھ اور پرتاپ گڑھ کے درمیانی حصے میں ملتے ہیں۔ عجب گڑھ کا قلعہ عجب سنگھ نے تعمیر کروایا تھا اور یہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے، آثار خاصی اچھی حالت میں ہیں۔ اسی طرح پرتاپ گڑھ کا قلعہ بھی انتہائی دل کش اور دیکھنے لائق ہے۔''

کچھ دیر بعد موضوع گھوم پھر کر دوبارہ بھان گڑھ پر پہنچ گیا۔ اِس قلعے کے جغرافیے کی بابت میرے پوچھنے پر ندیم نے بتایا کہ بھان گڑھ کے گرد ایک خستہ حال فصیل ہے۔ مکانات کے علاوہ اِس حصار میں مندر، باغ، حوض کے آثار اور برگد کے درخت دکھائی دیتے ہیں اور پہاڑ کی چوٹی پر الگ تھلگ نظر آنے والی ایک چھتری ہے، جو سیاحوں کی توجہ کا مرکز ہے۔ اِس چھتری کی عجیب و غریب انداز میں تعمیر بیک وقت پُراسرار اور ڈراؤنی معلوم ہوتی ہے۔

''داستانوں کے مطابق اِسی چھتری تلے وہ تانترک بیٹھا کرتا تھا، جس کی بددعا اس شہر پر غالب آ گئی۔'' اتنا بتا کر وہ خاموش ہو گیا۔

اب وویک نے کہانی کا سرا پکڑا اور بتایا کہ راناوتی کی داستان کے حوالے سے مافوق الفطرت قوتوں پر یقین رکھنے والوں کے درمیان تھوڑا اختلاف ضرور پایا جاتا ہے، تاہم اکثریت اِس امر پر متفق ہے کہ تانترک اور راناوتی دونوں ہی کالے علم کے ماہر تھے۔

''دراصل یہ کالے جادو کی جنگ تھی!'' اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ تانترک نے تیل کے بجائے عطر پر جادو کیا تھا، تاہم ایک بات پر کوئی اختلاف نہیں کہ اُس نے اپنی موت سے قبل شہر کو بددعا دی تھی، اس نے کہا تھا، میرا وجود موت کے شکنجے میں کس جائے گا لیکن موت تمہارا بھی تعاقب کرے گی۔ تم اب مزید اِس جگہ نہیں رہ سکو گے۔ اُگتا سورج اِس شہر کے لیے تباہی کا پیغام لائے گا!! راجکماری کو اِس بددعا کے اثرات کا علم تھا۔ راتوں رات بھان گڑھ کا خزانہ منتقل کر دیا گیا اور سورج طلوع ہونے سے قبل راجکماری، اُس کے وزرائے خاص اور اہلِ خانہ نے خاموشی سے شہر چھوڑ دیا، جس کے بعد اس پر تاریکی اور یاسیت طاری ہو گئی۔''

ویگن میں خاموشی چھا گئی جس کا دورانیہ طویل تھا۔ سچ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کہوں تو میں ایک ناقابل بیان اذیت کی گرفت میں تھا، جو ہر گزرتے لمحے کے ساتھ بڑھتی جارہی تھی۔

سناٹا بہت دیر قائم رہتا، اگر ندیم نہ بولتا ''اِس بارے میں عقلیت پسندانہ رائے بھی پائی جاتی ہے، جس کے مطابق یہ آثار، یہ کھنڈر بہت خوب صورت ہیں۔ اس لیے سیاح یہاں کا رُخ کرتے ہیں۔ یہاں کئی مندر ہیں جن میں بینسٹر کا تعلق ہنومان جی سے ہے، جن کا کام لوگوں کو بداثرات سے محفوظ رکھنا ہے، ایسے میں یہاں بدروحوں کا کیا کام؟'' اُس کے چہرے پر خوشگوار مسکراہٹ کھیل رہی تھی جس نے ماحول کے تناؤ کو کم کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔

ویگن خاموش ریگستان سے گزرنے والی پختہ سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ بھان گڑھ نزدیک آتا جارہا تھا۔

☆☆☆

''بابو، آج رات قلعے کی اَور مت جاؤ!''

یہ اُس پُراسرار شخص کے الفاظ تھے جو غالباً ریسٹ ہاؤس کا چوکیدار تھا۔

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا، اس کے زرد چہرے پر انجانے خدشات کا سایہ تھا۔

ہم کچھ ہی لمحات قبل دو گھنٹے کا سفر طے کر کے اس ریسٹ ہاؤس تک پہنچے تھے جہاں ندیم نے ہمارے قیام و طعام کا انتظام کیا تھا۔

یہ ریسٹ ہاؤس بھان گڑھ کے قلعے سے ایک کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ چوں کہ میں ویگن کی پیچھے والی نشست پر بیٹھا تھا، اس لیے سب سے آخر میں اترا۔ اتنی دیر میں باقی افراد ریسٹ ہاؤس کے اندرونی حصے کا رُخ کر چکے تھے اور تب ایک ڈری ہوئی، باریک آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

''بابو، آج رات قلعے کی اَور مت جاؤ!''

چادر میں لپٹا وہ شخص خاصا بدحال معلوم ہوتا تھا، چوں کہ وہ دروازے کے عین سامنے کھڑا تھا، اس لیے میں اُسے چوکیدار ہی سمجھا، لیکن جب میں مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گیا، تب اچانک مجھے اپنے عقب میں، پر پھڑپھڑانے کی بالکل غیر متوقع آواز سنائی دی اور ہوا کا تیز جھونکا میری کمر سے ٹکرایا۔

میں فوراً مڑا اور خوف کی سرد لہر میرے بدن میں داخل ہوگئی۔ وہاں کوئی نہیں تھا، کوئی بھی نہیں!

''علی، کیا ہوا؟'' اچانک جان کے الفاظ میرے کانوں سے ٹکرائے۔ وہ مجھے ڈھونڈتا ہوا باہر آ گیا تھا۔

''وہ ...'' میں نے اُس جانب اشارہ کیا جہاں وہ پُراسرار شخص کھڑا تھا، تاہم اب وہاں سناٹے اور ویرانی کا راج تھا۔

جان نے ایک نظر اُس طرف ڈالی پھر آگے بڑھ کر میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ایک شخص نے میرے ہاتھ سے سامان لے لیا۔ وہ ریسٹ ہاؤس کا منیجر تھا۔

''وہ... یہاں وہ چوکیدار...'' میں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

''چوکیدار؟'' منیجر کے لہجے میں حیرت تھی۔ ''وہ تو آج چھٹی پر ہے سر!''

''اوہ!'' میرے منہ سے نکلا۔

''چلو علی، وہ کوئی مقامی ہوگا۔'' جان نے بات سنبھالتے ہوئے کہا۔ میں ان دونوں کا تعاقب کرتے ہوئے ریسٹ ہاؤس کے اندرونی حصے میں چلا گیا جہاں ہمارے باقی ساتھی موجود تھے۔ وہ ایک بڑی سی میز کے گرد بیٹھے تھے، جس پر وہیٹر کی وردی میں ملبوس ایک شخص برتن رکھ رہا تھا۔ میں واش روم کی جانب چلا گیا، جہاں میں نے چہرے پر ٹھنڈے پانی کے چھپاکے مارے۔ دھیرے دھیرے بکھرے ہوئے حواس لوٹ آئے۔ کچھ دیر بعد میں بھی ٹیبل کے گرد بیٹھا گرم چائے کی چسکیاں لیتا ہوا اس عجیب واقعے کو بھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔

منیجر بڑی خوش اسلوبی سے میزبانی کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ چائے پینے کے بعد ہم ہال کی طرف چلے گئے جہاں آرام دہ صوفے پر ہم کچھ دیر ستانے کے لیے بیٹھ گئے۔ ہال میں ٹی وی بھی تھا، جس پر ایک فلمی پروگرام چل رہا تھا۔ ناصر، ڈیوڈ اور شنکر بڑی دلچسپی سے وہ پروگرام دیکھ رہے تھے، جب کہ ندیم اور جان کسی سنجیدہ موضوع پر، میرے دائیں جانب بچھے صوفے پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ہال کی کھڑکی سے آدھا، گھٹتا ہوا زرد چاند جھانک رہا تھا اور تب مجھے اپنے صوفے کے پیچھے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔

میں مڑا، جو ہی بالکل میری پشت پر کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر دوستانہ مسکراہٹ تھی۔ وہ ساتھ والے صوفے پر بیٹھ گئی۔

مجھے ایسا لگا جیسے وہ میرے خوف سے واقف ہے دور کرنے کے لیے وہ ہلکے پھلکے موضوعات پر گفتگو کرنے لگی۔

اس نے میرا خاندان اور لندن میں میری مصروفیات کے بارے میں دریافت کیا۔ یوں کچھ لمحات بعد میں خود کو نارمل محسوس کرنے لگا۔

منیجر نے آکر اعلان کیا کہ میز پر کھانا چن دیا گیا ہے۔

اب ایک بار پھر ہم ڈائننگ ٹیبل کے گرد بیٹھے تھے۔ ہمارے سامنے سوپ کے پیالے تھے جن سے دھواں اُٹھ رہا تھا۔ کھانا سادہ لیکن خوش ذائقہ تھا۔ دراصل ندیم اور وویک نے خصوصی طور پر ہدایت کی تھی کہ کھانا زیادہ رومنی نہ ہو، کیوں کہ ہمیں ساری رات جاگنا تھا۔

ڈنر کے بعد ہم ریسٹ ہاؤس کے لان میں چلے گئے جہاں کی تازہ گھاس پر شبنم کے قطرے چمک رہے تھے۔ ہم نے چاند کی پھیکی روشنی میں سامنے پھیلے پہاڑوں کو دیکھا جن کے دامن میں بھان گڑھ کے کھنڈر تھے۔ ہوا میں خنکی تھی جو سکون بخش معلوم ہوتی تھی۔

ایسے میں وویک کی آواز گونجی۔ ''ہم پندرہ منٹ میں یہاں سے روانہ ہوجائیں گے۔''

نہ جانے کیوں، پر مجھے یوں لگا جیسے اِس جملے نے سب کو بے چینی میں مبتلا کر دیا ہو۔

ندیم کے دوست وجے نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ ''بھئی، شاید آپ مجھے تو ہم پرست کہیں لیکن میں اس مہم میں آپ کے ساتھ نہیں جارہا۔''

''تمھیں چلنا چاہیے وجے!'' ندیم نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ ''یقین کرو، وہاں کوئی بھوت نہیں ہے۔''

''کاش ایسا ہی ہو۔'' وجے نے دھیرے سے کہا۔ ''میری دعا ہے کہ آپ کا سفر خوشگوار گزرے۔''

کچھ دیر بعد ہم ویگن میں سوار ہو رہے تھے۔ اس اثناء میں وویک کی ٹیم کے ارکان اپنے آلات چیک کر چکے تھے۔

چائے تیار کرنے کا سامان، گیس کا چھوٹا چولھا، بسکٹ اور پانی کی بوتلیں گاڑی میں رکھی جا چکی تھیں۔ ندیم نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی۔ وجے اور منیجر نے اپنی پریشانی چھپاتے ہوئے ہمیں رخصت کیا۔

ریسٹ ہاؤس سے باہر نکلتے ہوئے میں نے اُس درخت کی طرف دیکھا، جہاں میرا اُس پُراسرار شخص سے سامنا ہوا تھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا!

میں نے ایک نظر گاڑی میں بیٹھے اپنے ساتھیوں پر ڈالی۔ وویک اگلی نشست پر بیٹھا تھا۔ ویگن کے پچھلے حصے میں جو ہی اپنے لاکٹ سے اُلجھتی ہوئی باہر کی ویرانی کو تک رہی تھی۔ شنکر نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ ڈیوڈ آلات چیک کرنے میں لگا تھا۔ جان خاموش تھا جب کہ ناصر کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ مجھے یوں لگا، جیسے وہ دعائیں پڑھ رہا ہو۔

یقینی طور پر اُس وقت ہر شخص مضطرب تھا، متذبذب تھا۔

اور ایسے میں ویگن کی کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے میری نظر اُس قدیم خستہ حال فصیل پر پڑی جس نے ایک راز اپنے اندر چھپا رکھا تھا۔

☆☆☆

ایک پھڑپھڑاتا سفید ہیولا، سناٹے کو چیرتا ہوا ظاہر ہوا اور فضا میں گم ہوگیا!!

ناصر کی منہ سے تکلیف دہ چیخ برآمد ہوئی اور ہماری سانس رک گئی۔

ہم کچھ ہی دیر قبل ویگن سے اترے تھے جو تباہ حال شہر کی فصیل کے مرکزی دروازے کے سامنے آکر ٹھہر گئی تھی۔

دروازے کے بالکل ساتھ آرکیولوجیکل سروے آف انڈیا کا سائن بورڈ نصب تھا جس پر سیاحوں سے اس علاقے میں طلوع آفتاب سے قبل اور غروب آفتاب کے بعد داخل نہ ہونے کی سخت ہدایات درج تھیں جسے نظر انداز کرنا ہم پر لازم تھا، کیوں کہ ہمارا ارادہ اِن ہی ممنوعہ اوقات میں اِس پُراسرار قلعے میں داخل ہونے کا تھا۔

گو کہ داخل ہوتے وقت ندیم نے اس سائن بورڈ پر چھپتی کسی تھی، تاہم جُوں ہی ہم نے تباہ شدہ شہر کی حدود میں قدم رکھا، ایک خوف کا احساس ہم سے ٹکرایا۔

کھنڈر کے اندرونی حصے میں، ہماری توقع کے برعکس خاصی ٹھنڈ تھی۔

میرے، جان اور ندیم کے ہاتھ میں ٹارچیں تھیں، جب کہ ڈیوڈ اور ناصر نے ہینڈی کیمرے تھام رکھے تھے۔ ایک کیمرا وویک کے پاس تھا، جب کہ جو ہی کے ایک ہاتھ میں ای ایم ایف میٹر اور دوسرے میں تھرمامیٹر تھا۔ شنکر نے وائس ریکارڈر تھام رکھا تھا۔

ٹھنڈ کے بعد جس شے سے ہمارا سامنا ہوا وہ زرد چاند کی گھٹتی روشنی تھی، جو فصیل کے اندرونی حصے میں تقریباً غائب ہوگئی تھی۔

''چاند کی روشنی یہاں نہیں پہنچ رہی ہے۔'' ناصر کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لہجے میں اضطراب تھا۔

ہم آگے بڑھے۔ ہمارے قدموں کی چاپ سناٹے میں گونج اٹھی۔ ہم اپنے گردٹیلوں پر ایستادہ دھندلے آثار دیکھ رہے تھے جن میں چند مندر تھے، چند ہوتے تھے۔ کچھ قدم آگے بڑھنے کے بعد ہم ایک ایسے حصے کے قریب پہنچے جو حوض سے مشابہہ تھا۔ یہاں ٹارچ سے پھوٹنے والی روشنی کی مدد سے ہم اُس قلعے کو بھی دیکھ سکتے تھے جو پُراسرار کہانیوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔

حوض کے قریب پہنچ کر ہم کچھ دیر وہاں رکے رہے۔ اُس موقعے پر وویک نے اپنی ٹیم کو آلات استعمال کرنے سے متعلق چند مشورے دیے۔

''علاقہ خاصا وسیع تھا۔ ہم پورے علاقے میں گھوم تو سکتے ہیں، تاہم ہماری توجہ کا اصل مرکز قلعہ ہے۔ ہم فقط ایک گھنٹا کھنڈر کے کچھ حصوں کا جائزہ لینے میں صَرف کریں گے، پھر ہم قلعے کا رُخ کریں گے۔''

اب ہم سب ایک مندر کی طرف بڑھ رہے تھے جہاں تاریکی کا راج تھا، تاہم وہاں ہمیں کسی مافوق الفطرت قوت کی موجودگی کا احساس نہیں ہوا۔ ہمارے آلات بھی خاموش رہے۔

پھر ہم نے ایک تباہ حال مکان کے آثار کا جائزہ لیا جس میں صدیوں پُرانی فضا مقید تھی۔ اِس مکان سے باہر آتے ہوئے جوہی، جو سب سے آگے تھی، ٹھٹک گئی۔

اُس نے آنکھوں میں حیرت لیے مڑ کر دیکھا۔ ''تم میں سے کسی نے مجھے پکارا؟''

''نہیں، کیوں کیا ہوا؟'' وویک نے جو ٹھیک اس کے پیچھے تھا، گھبرائے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔ ''سب ٹھیک تو ہے؟''

''اوہ ہاں، بس مجھے وہم ہوا تھا۔'' اُس نے جھینپتے ہوئے کہا اور آگے بڑھ گئی۔ اس مختصر سے واقعے نے مجھے چوکنا کر دیا، یوں محسوس ہونے لگا جیسے کوئی سانحہ پیش آنے کو ہے۔

اب ہم مندروں کی قطار کے آخری حصے میں بنے سمادھی کی جانب بڑھ رہے تھے جو الگ تھلگ بڑا ہی عجیب معلوم ہوتا تھا اور جب ہم اس کی سیڑھیوں کی جانب بڑھ رہے تھے، ٹھیک اُن منجمد لمحات میں ایک پھڑ پھڑاتا، سفید شور مچاتا چھوٹا سا ہیولا سمادھی کی اندرونی حصے سے برآمد ہوا اور ناصر پر جھپٹا۔ ناصر کی چیخ بلند ہوئی اور وہ زمین پر گر گیا۔

ہم سب سناٹے میں آ گئے۔ مختصر ترین لمحات میں ہیولا بلند ہوتا ہوا تاریکی میں گم ہو گیا۔

وہ پُراسرار پل صدیوں کی مانند تھے۔ ہم کسی طلسم کے زیرِ اثر تھے۔

ناصر اب کھڑا ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ وویک نے اُس کی مدد کی۔ ہم نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا، سب کی آنکھوں میں سوال تھا، پر جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔

''شاید کوئی کبوتر تھا۔'' یہ ندیم کے الفاظ تھے جو اُس نے ہماری ڈھارس باندھنے کے لیے کہے لیکن وہ اعتماد سے خالی تھے۔

''اب ہمیں قلعے کی جانب چلنا چاہیے۔'' وویک نے کہا۔ بے چینی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔

ہم سب دھیرے دھیرے اُس پُراسرار عمارت کی جانب بڑھنے لگے جس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہاں بھوتوں کا بسیرا ہے۔ ناصر پر چُپ طاری تھی۔ وویک اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

''علی...'' جان نے مجھے مخاطب کیا۔ ''میرے قریب ہی رہنا۔''

''ہوں!'' میں نے دھیرے سے کہا۔

قلعے کا مرکزی دروازہ پار کرتے ہی جوہی یک دم رک گئی۔ اُس کی نظریں ای ایم ایف میٹر پر ٹکی تھیں جس کی سوئیاں تیزی سے آگے پیچھے حرکت کر رہی تھیں اور میٹر پر نصب سرخ بتی جل گئی تھی۔

''یہاں کوئی ہے۔'' اُس نے دھیرے سے کہا۔

''درجہ حرارت تیزی سے گر رہا ہے۔'' شنکر نے ہاتھ میں تھامے ڈیجیٹل تھرمامیٹر کو گھورتے ہوئے کہا۔

''ہم یہاں نقصان پہنچانے کے ارادے سے نہیں آئے ہیں۔'' وویک نے با آواز بلند کہا۔ ''کیا آپ خود کو ظاہر کر سکتے ہیں۔''

میں اِس قسم کے جملوں کے استعمال سے بہ خوبی واقف تھا۔ گھوسٹ ہنٹر عام طور پر آسیبی مقامات پر یہ جملے کہتے ہیں۔ ماضی میں جب کبھی میں یہ جملے سنتا، مجھے ہنسی آتی کہ بھلا کیا ہوائی مخلوق سے اِس طرز پر مخاطب ہوا جا سکتا ہے؟ لیکن جب آپ خود مشکل میں ہوتے ہیں، پیچیدہ صورتِ حال کا شکار ہوتے ہیں، تب آپ کو سمجھ میں آتا ہے کہ مافوق الفطرت قوتوں کو، اگر وہ موجود ہیں، یہ احساس دلانا کس قدر اہم ہوتا ہے کہ ہم اُنہیں نقصان پہنچانے کی ارادے سے نہیں آئے ہیں۔

وویک نے جملے دُہرا کر چند ساعت انتظار کیا۔ اِس اثنا میں جوہی نے بتایا کہ میٹر کی سوئیوں کی حرکت میں ٹھہراؤ آ گیا ہے۔

''لیکن درجہ حرارت مسلسل گر رہا ہے۔'' شنکر کے لہجے میں انوز اضطراب تھا جس نے یک دم ہمیں احساس دلایا کہ ہم سردی سے ٹھٹھر رہے ہیں۔

''آگے بڑھتے ہیں۔'' وویک نے کہا اور ہم آہستگی سے اُس مرکزی ہال کی جانب بڑھنے لگے جو وحشت سے بھرا ہوا تھا۔

''یہاں سے راناوتی کے کمرے کی طرف جانے والا راستہ ہے۔'' ندیم نے کہا۔ وہ پہلے بھی، دن کی روشنی میں یہاں آ چکا تھا اور قلعے کے جغرافیہ سے واقف تھا۔

ہوا کے جھونکے قلعے کے کھلے حصوں سے اندر داخل ہو رہے تھے اور ان سے پیدا ہونے والی سرسراہٹ خوف کو مہمیز کر رہی تھی۔ پُراسرار سرگرشیوں کو جنم دے رہی تھی۔

ہم سیڑھی کی جانب بڑھ رہے تھے۔

''احتیاط سے، سیڑھیاں خستہ بھی ہو سکتی ہیں۔'' جوہی نے کہا۔ اس کی نظریں میٹر پر ٹکی تھیں۔

ہم دھیرے دھیرے، دھڑکتے دل کے ساتھ قدمچے پھلانگتے رہے اور جونہی سیڑھیاں ختم ہوئیں ہم نے خود کو ایک لمبے، پُرپیچ راہ داری میں پایا۔

اُس لمحے میں نے پہلی بار ندیم کے چہرے پر پریشانی کے آثار دیکھے۔

''یہاں سے ہمیں... وہ تذبذب کا شکار تھا۔ ''شاید ہمیں دائیں جانب جانا ہوگا۔''

''کیا تمہیں یقین ہے؟'' ناصر نے، جو کافی دیر سے چُپ تھا، اس سے سوال کیا۔

''اوہ... نہیں... کچھ گڑبڑ ہے۔ یہ راہ داریاں...''

وہ خاموش ہو گیا اور سامنے کی دیوار کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ ہم نے بھی چونک کر اس جانب دیکھا۔ وہاں کچھ حرکت نظر آ رہی تھی۔

ہم نے ٹارچ کی تیز روشنی اس طرف پھینکی اور یک دم وہاں سے باریک، ہلکی ہلکی چیخیں بُلند ہوئیں... حرکت تیز ہو گئی۔ چھوٹے چھوٹے اجسام اُڑتے ہوئے ہمارے طرف آ رہے تھے۔

''چمگادڑ...'' ڈیوڈ چلّایا۔ ہم سب جُھک گئے۔ شور مچاتا، ناراض غول ہمارے سروں پر سے گزر گیا۔

خوف کے زیرِ اثر ہم چند ساعت یونہی بیٹھے رہے۔ تب شنکر کی آواز سنائی دی۔ ''عجیب..... بے حد عجیب...'' اس کی نظریں تھرمامیٹر پر ٹکی تھیں۔

''کیا ہوا؟'' وویک نے سوال کیا۔

''درجہ حرارت بڑھ رہا ہے، مگر کیوں...؟'' اُس کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔

ڈیوڈ نے آگے بڑھ کر میٹر کو دیکھا۔ واقعی میٹر کی ریڈنگ درجہ حرارت کے تبدیل ہونے کا اشارہ کر رہی تھی۔

تب اچانک جوہی کے ہاتھ میں موجود میٹر پر، سوئیوں نے خفیف سی حرکت کی۔ سرخ بتی جلی اور بجھ گئی۔

''کوئی میرے... نزدیک ہے... گزرا ہے۔'' اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ ''ک... کوئی... ہے!''

سراسیمگی پھیل گئی۔

''ہم نقصان پہنچانے کے ارادے سے نہیں آئے ہیں۔'' شنکر نے با آواز بلند کہا۔ چند ساعت سناٹا چھایا رہا۔

''ہوا کا جھونکا تھا شاید...'' جوہی تذبذب کا شکار تھی۔

اب اُس کا میٹر بالکل خاموش تھا۔

''خود کو سنبھالو۔'' وویک نے دھیرے سے کہا۔

اب ہم آگے بڑھ رہے تھے۔ تاریک راہ داری کا پیچیدہ حصہ کشادہ ہوتا جا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد ہم ایک بڑے ہال میں تھے جس کی دیواروں پر عجیب و غریب نقش و نگار بنے تھے، جن پر نظر پڑتے ہی ندیم تحیر کے زیرِ اثر آ گیا، تاہم اِس احساس کو چھپانے کی کوشش کرنے لگا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ان کی موجودگی کی توقع نہیں کر رہا تھا۔

ہم ہال کی کھڑکیوں کے نزدیک سے گزرے جہاں سے خاموش پہاڑ اندر جھانک رہے تھے۔ مجھے تاریک پہاڑوں پر سائے حرکت کرتے نظر آئے جنہیں میں نے التباسِ خیال کرتے ہوئے نظر انداز کر دیا۔

''اف...'' اچانک شنکر کے منہ سے نکلا۔ وہ زمین پر بیٹھ گیا۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام رکھا تھا۔

''کیا ہوا؟'' وویک اُس کی جانب بڑھا۔

''مجھے... مجھے... چکر آ رہے ہیں۔'' اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

ہم سب شنکر کے گرد جمع ہو گئے۔

''میرا سر... او بھگوان... یہ قلعہ... وہ...'' اُس کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آنکھوں سے اذیت جھلک رہی تھی۔

''خود کو سنبھالو!'' ڈیوڈ آگے بڑھا۔

''ن... ناگ...'' یک دم شنکر چیخا اور ہم سکتے میں آ گئے، خوف کی سرد لہر ریڑھ کی ہڈی میں اُتر گئی۔

ہم نے اس کی کپکپاتی انگلی کا تعاقب کیا۔ وہاں تاریکی تھی۔ ندیم نے ہال کے اس گوشے میں ٹارچ کی روشنی پھینکی، وہاں کچھ نہیں تھا!

''اُٹھو... چلو ہمت کرو!'' وویک نے اسے سہارا دیا۔

ڈیوڈ نے بیگ سے پانی کی بوتل نکالی۔ شنکر نے چند گھونٹ حلق میں اُتارے اور سانس بحال کرنے کی کوشش کی۔

تب، اُن الجھے ہوئے لمحات میں یک دم مجھے احساس ہوا کہ جان ہمارے ساتھ نہیں ہے۔ میں نے ہال میں چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ وہ ہم سے خاصا دور، ایک کھڑکی کے پاس کھڑا تھا، بالکل خاموش!

''جان...'' میں نے اُسے پکارا، لیکن وہ بت بنا کھڑا رہا۔

''جان...'' میں نے اس بار چیختے ہوئے کہا۔ جواب ندارد!

باقیوں نے بھی چونک کر اس جانب دیکھا۔

مجھے اپنے وجود میں سنسناہٹ محسوس ہوئی۔ ''جان خطرے میں ہے!'' میرے دل میں سرگوشی گونجی اور میں تیزی سے اُس کی جانب بڑھنے لگا۔ وویک نے میرا ساتھ دیا۔ اس اثناء میں شنکر کھڑا ہو چکا تھا۔

میں نے جان کو کاندھے سے پکڑ کر جھنجوڑا اور تب وہ چونکا جیسے نیند سے جاگا ہو۔

''کیا ہوا؟'' میری آواز میں فکر مندی بھی تھی اور خوف بھی!

''وہ... اُدھر...'' اس نے کھڑکی سے باہر، پہاڑ کی طرف اشارہ کیا۔ ہم سب نے اُس جانب دیکھا اور سکتے میں آ گئے۔

سامنے پہاڑ پر، عین ہماری آنکھوں کے سامنے وہ پُراسرار چھتری تھی جس کی بابت مشہور تھا کہ اس شہر کی تباہی کا سبب بننے والا تانترک اُس کے نیچے بیٹھا کرتا تھا۔

''وہاں کوئی ہے... کوئی...'' جان نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

''میرا وجود موت کے شکنجے میں کس جائے گا، لیکن موت تمہارا بھی تعاقب کرے گی'' میرے ذہن میں تانترک کی بددعا گونج رہی تھی۔ یوں لگتا تھا، جیسے وہ وہیں ہو، ہ چھتری تلے، چہرے پر زہریلی مسکراہٹ لیے۔

☆☆☆

خاموشی کے ایک طویل وقفے کے بعد جس کے دو خوف قوی ہوتا جا رہا تھا، وویک نے خود کو بولنے کے لیے تیار کر

''دوستو، ہم ایک آسیبی مقام پر ہیں، ہمیں اپنے حو پر قابو رکھنا ہوگا۔ میں جانتا ہوں، ہم مشکل حالات سے رہے ہیں، لیکن یہ پہلا موقع نہیں ہے۔ ہم سب ماضی میں اس کا تجربہ کر چکے ہیں۔ اب تک جو کچھ پیش آیا، وہ ڈرا ہے، لیکن اس سے کچھ ثابت نہیں ہوتا۔ ہمیں اپنے طریقہ پر عمل کرتے ہوئے آگے بڑھنا ہوگا۔''

سب خاموشی سے اسے تکتے رہے۔ پھر جوہی آ بڑھی اور اس کے ساتھ جا کھڑی ہوئی۔

''ہاں، ہمیں آگے بڑھنا ہوگا، ہمیں رانا وتی کی خو گاہ میں داخل ہونا ہے، چلو!''

سب کھڑے ہو گئے۔ گو کہ خوف ہمارے تعاقب تھا لیکن آگے بڑھنا لازم تھا، یہی خوف سے نجات کا ا طریقہ تھا۔

ہم ایک خستہ حال محراب سے گزر کر ایک بڑ کمرے میں داخل ہوئے جو صدیوں قبل راجکماری استعمال میں تھا۔

ہم دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہے تھے۔ اور اچانک جوہی کے ہاتھ میں تھامے میٹر کی سوئیاں حرکت کر لگیں۔

''درجہ حرارت گر رہا ہے...'' ناصر چلّایا۔

وویک پہلی بار ٹھٹکا۔ اُس کی نظریں کیمر اسکرین پر ٹکی تھیں۔ ''کوئی سامنے سے... سامنے سے ہے...'' اس کے منہ سے نکلا۔

پہلی بار مجھے اُس کی آواز لڑکھڑاتی محسوس ہوئی۔

''چھن چھن...''

کہیں قریب ہی گھنگھرو چھنکے اور ہم اچھل پڑ۔ چہرے سفید پڑ گئے، یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے ہمارے سے خون نچوڑ لیا ہو۔

ہم وحشت کے زیر اثر تھے جو ہر گزرتے لمحے ساتھ قوی ہوتی جا رہی تھی۔

''ک... کون ہے...'' ندیم کی آواز سناٹے

گہرائی اور دہشت میں اضافہ ہو گیا۔

''کون ہے؟'' وویک نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

''ہم نقصان پہنچانے کے ارادے سے نہیں آئے ہیں، کیا آپ سامنے آ سکتے ہیں۔''

''ایسا مت کرو...'' جان کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔ ''ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔''

''ہم ایسا نہیں کر سکتے...'' جوہی نے دھیرے سے کہا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب بے بسی تھی۔ ''ہم قلعے کے مرکز میں پہنچ گئے ہیں۔''

''چھن...''

وحشت عود کر آئی اور قائم رہی۔ سردی نے ہمیں گھیر رکھا تھا اور آسمان سے راکھ کے ذرات اُتر رہے تھے۔

تب اچانک مکھیوں کی بھنبھناہٹ سے مشابہ آوازوں نے ہال کو لپیٹ میں لے لیا۔ ہم سراسیمگی کا شکار، آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اپنے اردگرد دیکھ رہے تھے جہاں کوئی نہیں تھا، تاہم کریہہ آوازیں مسلسل سنائی دے رہی تھیں۔

مجھے اپنا وجود سکڑتے ہوئے محسوس ہوا۔ اور تب، نہ جانے کیوں مجھے لگا جیسے میرا موبائل فون بج رہا ہو، جیسے کوئی مجھے انتہائی اہم پیغام دینا چاہتا ہو، جس کا تعلق ہم سب کی زندگیوں سے..... لیکن ایسا نہیں تھا، موبائل فون خاموش تھا۔

اور تب ہوا کا تیز جھونکا ہماری پشت سے ٹکرایا اور ہم ٹھٹک گئے۔

عین ان لمحات میں، جو صدیوں سے بھاری تھے، نہ جانے کیوں، بالکل غیر متوقع طور پر منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتے شنکر نے کمرے کے تاریک ترین حصے کی جانب دوڑ لگا دی۔ بالکل اچانک... معلوم ہوتا ہے جیسے وہ اپنے حواس کھو بیٹھا ہے۔

''موت کا شکنجہ کس رہا ہے...'' اُس کی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ نے مجھ پر کپکپی طاری کر دی۔ یوں لگا، جیسے میرے اعصاب چیخ رہے ہوں، تاہم وہ وقت یہ سوچنے کا نہیں تھا۔ شنکر ہیجان کے زیر اثر تھا۔ میں اُس کے تعاقب میں دوڑ پڑا۔ ناصر نے بھی میری تقلید کی۔

یہ لمحوں کا معاملہ تھا۔ میں شنکر کا تعاقب کر رہا تھا جو نہ جانے کیا کیا بک رہا تھا اور مجھے اپنے پیچھے دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

اور تب میں نے شنکر کو بڑے ہی پُراسرار اور وحشت ناک ڈھب پر غائب ہوتے دیکھا۔ یوں لگا جیسے اُسے زمین نے نگل لیا ہو۔

ایک چیخ بلند ہوئی اور تاریکی میں منجمد ہو گئی۔

خوف کی سرد لہر مجھ سے ٹکرائی، تاہم لمحے کے ہزارویں حصے میں فکر مندی نے اُس کی جگہ لے لی۔ میں بھی تیزی سے اُس جانب بڑھا، جہاں شنکر غائب ہوا تھا۔

''رک جاؤ علی!''

اِس آواز نے میرے قدم روک لیے۔ یہ جوہی کی آواز تھی۔ مجھے یوں لگا، جیسے میں صدیوں سے اِس آواز سے واقف ہوں، جیسے یہ برسوں سے اس قلعے میں گونج رہی ہو۔

میں جھٹکے سے ٹھہر گیا، بالکل اس مقام پر جہاں شنکر غائب ہوا تھا۔

اتنی دیر میں باقی افراد بھی وہاں پہنچ گئے تھے۔ جان اور ندیم نے ٹارچ کی روشنی اس جانب پھینکی۔

اور تب مجھے احساس ہوا کہ سانحہ میرے انتہائی نزدیک سے گزرا ہے۔ جہاں میں کھڑا ہوا تھا، وہاں سے بس دو قدم آگے، ایک گڑھا تھا۔ لمحے کے ہزارویں حصے میں، میری سمجھ میں آ گیا کہ شنکر یوں اچانک کیسے غائب ہو گیا تھا۔

گڑھے سے سسکیاں بلند ہو رہی تھیں۔ وویک اور ڈیوڈ تیزی سے آگے بڑھے۔

''تم ٹھیک تو ہو شنکر؟'' ڈیوڈ کے لہجے میں پریشانی تھی۔

شنکر کو یقینی طور پر گہری چوٹ آئی تھی۔

''شنکر جواب دو!'' وویک چلّایا۔ جواب میں صرف کراہنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

''ہمیں اُسے نکالنے کے لیے گڑھے میں اُترنا ہوگا۔'' جان نے کہا۔

''ہاں... مگر... یہ گڑھا یہاں کیسے...'' ندیم تذبذب کا شکار تھا۔ ''یہ پہلے نہیں... تھا... یہاں!''

''یہ ہم بعد میں سوچیں گے۔'' جان نے کہا اور ناصر اور ڈیوڈ کے سہارے اس سات فٹ کے تاریک گڑھے میں اُتر گیا، جہاں سے گھٹی گھٹی چیخیں بلند ہو رہی تھیں۔

ہم وحشت ناک سناٹے میں قید تھے۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ ٹھنڈ میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا... کھنڈر میں پُراسرار سائے حرکت میں تھے... اور یاسیت کی اِس کھائی میں زخمی شنکر کی سسکیاں ماحول کی ہولناکی بڑھا رہی تھیں۔

تبھی، مجھے قلعے کی تاریک ترین گوشے میں، کفن ایسے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سفید لبادے میں ایک پُراسرار ہیولہ نظر آیا۔

''کیا یہ راناوتی کی آتما ہے؟'' میری دھڑکن تیز ہوگئی۔ اور مجھے یقین ہوگیا کہ ہم المیے کا شکار ہوگئے۔ میرے لیے مزید اپنے پیروں پر کھڑے رہنا ممکن نہیں تھا۔ مجھے کاندھوں پر عجیب سا بوجھ محسوس ہو رہا تھا، اعصاب چٹخ رہے تھے، میں گر رہا تھا۔

''علی... علی... خود کو سنبھالو... علی...'' جوہی کے اِن الفاظ کے ساتھ میں غنودگی کے دریا میں اتر گیا۔

''بابو... آج رات... قلعے کی اَور... مت جانا... موت... تمہارا بھی... تعاقب کرے گی... رانا... وتی...''

☆☆☆

میں کئی ساعتوں تک یہ سمجھنے سے قاصر رہا کہ میں کہاں ہوں۔

میں غالباً لیٹا ہوا تھا اور تحیر زدہ سا چھت کو تک رہا تھا جو آنکھوں کے اوپر تنی ہوئی تھی۔ دھیرے دھیرے حواس بحال ہوتے گئے اور مجھے احساس ہوا کہ میں بستر پر دراز ہوں۔ میں نے کمزوری کے باوجود گردن موڑ کر کمرے کا جائزہ لیا۔

یہ ریسٹ ہاؤس کا کمرا تھا۔ ساتھ والے بیڈ پر شنکر لیٹا ہوا تھا جس کی آنکھیں بند تھیں۔ اُس کے ہاتھ اور ماتھے پر پٹی بندھی تھی۔ میں نے پیش آنے والے واقعات کی بابت غور کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔

میری نظر گھڑی پر پڑی جس کی سوئیاں پانچ کے ہندسے کی جانب اشارہ کر رہی تھیں، تاہم میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ یہ صبح کا وقت ہے یا شام کا!

میں نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن میرا سر چکرا گیا۔ اور پھر ایک ایک منظر اپنی جزئیات کے ساتھ میرے آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔ مجھے سب یاد آگیا، بھان گڑھ کا قلعہ، گھنگھروں کی جھنکار، راناوتی کی خواب گاہ.....

میں نے پھر کھڑے ہونے کی کوشش کی لیکن لڑکھڑا گیا۔ میرا سر بھاری ہو رہا تھا۔ تبھی کمرے کا دروازہ کھلا اور جان اندر داخل ہوا، اس کے ساتھ سفید کوٹ میں ملبوس کوئی شخص تھا۔

یہ وہ آخری منظر تھا، جو آنکھیں بند کرنے سے قبل میں نے دیکھا!

☆☆☆

''انسانی ذہن بہت چالاک ہے، وہ ہمارے ساتھ کھیل کھیلتا ہے جو بہت خوفناک ہوتے ہیں!''

کرن درشن میری آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔

وہ گھوسٹ ہنٹنگ کے میدان کا ایک جانا مانا ماہر تھا اور بین الاقوامی شہرت یافتہ تھا، ساویڈی سلوا کا شاگرد رہ چکا تھا۔

میں خاموش بیٹھا رہا۔ ساتھ والی کرسیوں پر وویک اور جان بیٹھے تھے۔ ہم چوبیس گھنٹے قبل ہی الور سے دہلی پہنچے تھے۔ اس پُراسرار، وحشت ناک رات کی کہانی میرے ذہن میں اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ محفوظ تھی۔

میرے بے ہوش ہونے کے بعد رونما ہونے والے واقعات سے مجھے جان نے آگاہ کیا۔ اس نے بتایا کہ شنکر کو اس جہنمی گڑھے سے باہر نکالنے کے بعد جب اس نے مجھے بھی بے ہوش پایا تو اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ وویک نے حالات کی نزاکت کا اندازہ لگاتے ہوئے اس خطرناک مہم کو ختم کرنے کا اعلان کر دیا اور وہاں موجود ہر شخص مجھے اور زخمی شنکر کو قلعے سے باہر لانے کے جتن کرنے لگا۔

''وہ لمحات صدیوں سے بھاری تھے۔'' اس نے دھیرے سے کہا۔ ''آج بھی مکھیوں کی بھنبھناہٹ میرے شعور میں محفوظ ہے۔''

اس نے بتایا کہ ''جب ہم قلعے سے باہر آرہے تھے، تو ہمیں داخلی حصے میں ایک کھٹکا سنائی دیا پھر بھی ہم نے چلتے رہنے میں عافیت جانی اور مڑنے کی غلطی نہیں کی۔

گاڑی تک پہنچنے کے بعد ہم تیزی سے ریسٹ ہاؤس کی جانب روانہ ہوگئے جہاں تمہیں اور شنکر کو ابتدائی طبی امداد دی گئی پھر جان اور وویک قریب ترین آبادی میں ڈاکٹر کی تلاش میں چلے گئے جس نے مجھے اور شنکر کو مختلف انجکشن دیے.....''

صبح تک ہمارے حواس بحال ہوگئے تھے۔ ندیم نے فی الفور وہاں سے روانہ ہونے کا مشورہ دیا جس پر عمل کرتے ہوئے دوپہر تک ہم الور پہنچ چکے تھے۔ اس عرصے میں، میں اور شنکر ادویہ کے زیرِ اثر رہے۔ وویک اور ندیم نے یہی مناسب جانا کہ ہم جلد از جلد دہلی لوٹ جائیں۔ واپسی میں ٹرین کے بجائے کرائے کی گاڑی میں یہ سفر طے کیا گیا۔

مجھے سفر کی تفصیلات یاد ہیں۔ اُس وقت تک میں اپنے اضطراب پر قابو پا چکا تھا۔ دہلی پہنچنے کے بعد ''ینگ گھوسٹ ہنٹرز'' کی ٹیم نے فوری طور پر کرن درشن سے رابطہ کیا۔

وویک اور جوہی اپنے آلات اور آڈیو، ویڈیو ریکارڈنگز

کے ساتھ کرن کی ٹیم سے ملے جہاں سمعی و بصری مواد کا باریکی بینی سے جائزہ لیا گیا۔ کرن درشن نے ہماری ٹیم کے ارکان سے فرداً فرداً ملاقات کی۔ اس نے مجھ سے بھی ایک سیشن میں مختلف سوالات کیے جس کے بعد اس نے اپنی حتمی رائے دینے کے لیے ہمیں اپنے دفتر مدعو کیا۔

اور اب میں، جان اور وویک اُس کے سامنے بیٹھے تھے۔ ڈیوڈ، ناصر اور جوہی پیشہ ورانہ معاملات میں اُلجھے ہوئے ہونے کے سبب نہیں آسکے تھے جب کہ شنکر کو ڈاکٹر نے آرام کرنے کا مشورہ دیا تھا۔

''ذہن ہمارے ساتھ کھیل کھیلتا ہے، جو بہت خوفناک ہوتے ہیں...'' کرن کی آواز کمرے میں گونج رہی تھی اور ہم تینوں ہمہ تن گوش تھے۔

''ہمیں وہی دکھتا ہے، جو ہم دیکھنا چاہتے ہیں۔ اگر ہم مافوق الفطرت قوتوں پر یقین رکھتے ہیں، یہ ہمارے کانوں میں سرگرشیاں کرتا ہے، ہمیں غیر مرئی قوتوں کی موجودگی کا احساس دلاتا ہے۔ یہ ہمیں ہیجان کی دنیا میں دھکیل دیتا ہے، جہاں واہمے ہمیں گھیر لیتے ہیں اور ہم فریبِ نظر کا شکار ہو جاتے ہیں۔'' یہاں پہنچ کر وہ ٹھہر گیا اور ہمارے چہروں پر نظر ڈالی۔

''میں ہر فرد سے تنہائی میں ملاقات کر چکا ہوں، ماسوائے مسٹر ندیم کے جو یہاں نہیں ہیں بلکہ الور میں اپنی ذمے داریاں نبھا رہے ہیں۔ خیر، تو آپ افراد نے مجھے جو کہانیاں سنائیں، وہ تھوڑے بہت فرق کے ساتھ، تقریباً یکساں ہیں۔ آپ سب نے بھان گڑھ کے قلعے میں کسی مافوق الفطرت قوت کی موجودگی کا ذکر کیا اور کہا کہ اس نے کسی نہ کسی صورت خود کو آپ پر ظاہر بھی کیا لیکن دلچسپ امر یہ ہے کہ...''

وہ پھر ٹھہر گیا، چند ساعت ہماری بے چینی سے لطف اندوز ہوتا رہا، پھر بات آگے بڑھائی۔ ''آپ سب کے تجربات میں تھوڑا فرق ہے، جو نفسیاتی تجزیے میں خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔ کسی نے پُراسرار آوازوں کا ذکر کیا، کسی نے ہیولے دیکھنے کی بات کی، کسی نے بوجھل پن اور غنودگی کا تجربہ بیان کیا، تاہم..... آپ میں سے چند نے بے چینی اور اضطراب کے ساتھ اپنے تجربات کا ذکر کیا، جب کہ چند نے اُن کی بابت بڑے ہی سرسری انداز میں بات کی۔''

''مسٹر ڈیوڈ اور مسٹر وویک نے جو کچھ بتایا اُس میں کچھ نیا نہیں۔ عام طور پر آسیبی مقامات پر اس طرح کے تجربات ہوتے ہیں۔ دوسری جانب مسٹر ناصر ہیں جنہوں نے سر چکرانے کی شکایت کی... مسٹر جان ہیں جنہوں نے کسی طلسم کی موجودگی کی بات کی... اور مسٹر شنکر اور مسٹر علی ہیں جنہوں نے پُراسرار قوتوں کی موجودگی کی بابت حتمی انداز میں ذکر کیا۔ تو ہم ایک ہی مقام پر، ایک ہی وقت میں، ایک ہی مقصد کے ساتھ آسیبی قلعے کا رخ کرنے والوں کے مختلف تجربات کی بابت کیا کہیں گے؟'' وہ پھر خاموش ہوگیا۔

''میں، اپنے تجربے کی بنیاد پر یہ کہوں گا کہ آپ کے دماغ نے آپ کے ساتھ ایک کھیل کھیلا جس میں آپ اُلجھ گئے۔'' اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ ''آپ نے اس آسیبی قلعے کے بارے میں اپنے لاشعور کو خاصی معلومات فراہم کر دی تھی، جو پلٹ کر شعور کی جانب آئی اور قلعے کے خوفناک ماحول میں جہاں قدیم فضا مقید تھی، خود کو ظاہر کر دیا۔ جس کا شعور زیادہ بھر گیا وہ اُبل گیا...''

''کیا آپ کہنا چاہ رہے ہیں کہ ہم واہموں کی لپیٹ میں آگئے تھے؟'' جان نے سوال کیا۔

''ممکن ہے۔ سمعی اور بصری واہمے... اجتماعی واہمے... جنہوں نے پُراسرار واقعات کو جنم دیا۔''

''لیکن جو کچھ ہمارے ساتھ بیتا، اسے فقط فریبِ نظر نہیں کہا جا سکتا۔'' میں نے کہا۔ ''وہ ٹھوس اور حقیقی تھے۔''

''بے شک، انسانی ذہن تصورات کو ٹھوس اور حقیقی شکل دے دیتا ہے۔ ایسا ہوتا ہے۔ ماہرین نفسیات یہ ثابت کر چکے ہیں۔ اور مسٹر وویک...'' وہ وویک کی طرف مڑا۔ ''یہ بات شاید آپ کے لیے مایوس کن ہو لیکن حقیقت ہے کہ آپ کی ویڈیو اور آڈیو ریکارڈنگ میں مجھے کوئی غیر معمولی کارروائی یا سرگرمی نظر نہیں آئی۔ آپ کے میٹرز پر کسی قسم کے اثرات نہیں پائے گئے۔''

''یہ ناممکن ہے، میں نے خود کیمرے کی اسکرین میں ایک ہیولا دیکھا تھا۔'' وویک نے احتجاج کیا۔

''تو اب وہ کہاں ہے؟'' کرن نے سوال کیا۔ ''میں تمام ویڈیو بذاتِ خود چیک کر چکا ہوں۔ آپ نے پُراسرار آوازوں کا ذکر کیا، لیکن آڈیو ریکارڈر پر فقط آپ لوگ کی گفتگو ہے، اُس میں آپ کی آوازوں کے سوا اور کچھ نہیں، کچھ بھی نہیں...''

''بھان گڑھ کا قلعہ آسیبی ہے، مجھے اس پر یقین ہے۔'' جان نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''شاید ایسا ہی ہو، لیکن آپ کے آلات اور آپ کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کہانیاں ثبوت پیش کرنے میں ناکام ہیں۔ مسٹر شنکر اور مسٹر علی فریب نظر کا شکار ہو گئے، ایک گڑھے میں جا گرا، ایک بے ہوش ہو گیا، بس!'' کرن نے پیشہ ورانہ انداز میں کہا۔ ''اور مسٹر ناصر کا سر چکرا تو نارمل ہے، بالکل نارمل... مسٹر جان آپ نے چھتری تلے کوئی وجود دیکھا؟ سوال یہ ہے کہ اس قدر اندھیرے میں کوئی انسان کس طرح کچھ دیکھ سکتا ہے؟ یہ ناممکن ہے۔''

''میرے خیال میں مسٹر کرن، آپ جیسے ماہر کو خود وہاں کا دورہ کرنا چاہیے۔'' وویک نے گہرا سانس سینے میں اُتارتے ہوئے کہا۔

''ضرور، میں بہت جلد وہاں جاؤں گا۔'' کرن مسکرایا۔

☆☆☆

میں اور جان فقط دو دن دہلی میں ٹھہرے۔ اس دوران وویک اور جوہی نے ہمیں پورا شہر گھمایا۔ ہم کئی تاریخی مقامات پر گئے، کئی قسم کے چٹ پٹے کھانے چکھے۔ لندن روانہ ہونے سے قبل ہم نے ٹیم کے باقی ارکان سے بھی ملاقات کی۔ ناصر اور ڈیوڈ خاصی بہتر حالت میں تھے، تاہم شنکر تا حال ڈرا ہوا تھا لیکن اس نے خود کو سنبھالے رکھا۔ اس عرصے میں ہم نے بذریعہ فون اور ای میل ندیم سے بھی رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن ہر کوشش ناکام گئی۔ ہم نے آرکیولوجیکل سروے آف انڈیا کے الور آفس سے بھی رابطہ کیا لیکن یہ بھی لاحاصل رہا۔

ہوائی جہاز میں سوار ہونے تک میں بھان گڑھ کو بھول چکا تھا۔ لندن پہنچنے کے بعد بھی میں نے اور جان نے کسی سے اس بابت گفتگو نہیں کی۔ اُس کی گرل فرینڈ ایلی کی طبیعت اب خاصی بہتر تھی۔ ایکسیڈنٹ زیادہ خطرناک نہیں تھا اور اب وہ چلنے پھرنے لگی تھی۔

اپنے والد سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے دہلی کا تو تفصیلی ذکر کیا لیکن بھان گڑھ کی اُس رات کے ذکر سے اجتناب برتا۔

زندگی دھیرے دھیرے لوٹ رہی تھی۔ اس دوران بھی میں نے ندیم سے رابطہ کرنے کی کوشش کی، لیکن ناکامی میرا مقدر بنی۔

چند روز بعد مجھے وویک کی ای میل موصول ہوئی۔ اُس نے مجھے مطلع کیا کہ اُس نے تمام آڈیو، ویڈیو ریکارڈنگز کا باریکی بینی سے جائزہ لیا ہے جس کے دوران یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ ندیم کی آواز، کسی کی آواز کے ساتھ، عجیب انداز میں گڈمڈ ہو گئی ہے۔

''شاید یہ کوئی تکنیکی خرابی ہو...'' اُس نے لکھا۔ ''لیکن حیرت انگیز طور پر فقط ندیم کی آواز کے ساتھ یہ مسئلہ ہوا ہے، باقی ریکارڈنگ میں کوئی خرابی نہیں۔''

اس نے یہ بھی بتایا کہ مسٹر کرن ورشن بھی اپنی ٹیم کے ساتھ بھان گڑھ جانے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔

بہر حال اِس اطلاع نے مجھے مایوس کر دیا کہ وہ بھی کوشش کے باوجود ندیم خان سے رابطہ نہیں کر سکا۔

پھر ایک صبح، سوا چار بجے، جب نیند نے مجھے جکڑ رکھا تھا، میرا موبائل چیخنے لگا۔ اور کال ریسو کرنے کے بعد میری نیند اُڑ گئی۔

دوسری طرف وویک تھا۔

''ہیلو علی... ہیلو... وویک بول رہا ہوں... شاید میں نے تمہیں جگا دیا... سوری یار!''

''اوہ نہیں... خیریت...؟''

''ہاں بس، وہ ایک خبر تھی... مجھے لگا کہ تمہیں بتانا ضروری ہے... وہ...'' وویک جھجک رہا تھا۔

''کیا ہوا؟'' میں گھبراہٹ کا شکار ہو گیا۔

''وہ... میں نے تمہیں بتایا تھا ناں کہ کرن ورشن بھان گڑھ جانے کی تیاری کر رہا ہے... وہ اُس کی موت واقع ہو گئی ہے...''

''کیا؟''

''ہاں... آج صبح وہ اپنے فلیٹ میں مردہ پایا گیا۔ وہ آج ہی بھان گڑھ کے لیے روانہ ہونے کو تھا... لیکن... ڈاکٹرز کہہ رہے ہیں کہ اُس کی موت حرکت قلب بند ہونے سے ہوئی... تم سن رہے ہو ناں؟''

''اوہ... ہاں... میں سن رہا ہوں... مگر...''

''سوری یار، میں نے تمہیں پریشان کر دیا... خیر اُس کی موت کی اطلاع میں نے تمہیں یوں دی کہ تم اُس سے مل چکے ہو... خیر... اپنا خیال رکھنا...''

''اوہ... ہاں... شکریہ...''

فون بند کرنے کے بعد میں کھڑکی کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ رات ابھی ختم نہیں ہوئی تھی اور باہر کُہر اچھایا تھا، جس سے جھانکتا بھان گڑھ کا آسیب ایک غیر یقینی کہانی بیان کر رہا تھا...

حیات بعد الموت

احسان قریشی

ایک اذان سے انسان کی زندگی شروع ہوتی ہے اور نماز پر ختم۔ اس اذان اور نماز کے درمیان کا جو وقفہ ہوتا ہے اسے ہم زندگی کہتے ہیں۔ اس زندگی کے لیے انسان کیا کیا جتن نہیں کرتا۔ وہ یہ تک بھول جاتا ہے کہ اس زندگی کے بعد جو زندگی ملے گی وہ اس سے زیادہ طویل ہوگی۔ اسے آسان یا دشوار بنانے کی کوشش ہمیں اسی زندگی میں کرنا ہے، یہی کچھ مذہب بھی کہتا ہے۔ وہ زندگی کیسی ہوگی؟

موت کے بعد دوبارہ زندہ ہو جانے والوں کے عجیب تاثرات

سلیم صاحب کے یہاں تقریباً ہر رات نشست ہوا کرتی اور ہم چار پانچ دوست ہر رات عزیر بھائی کو ان کے گھر تک پہنچانے کے لیے جایا کرتے۔

ایسی ہی ایک رات اپنے گھر کی طرف جاتے ہوئے انہوں نے ایک عجیب واقعہ سنایا۔ یہ واقعہ میں ان ہی کے انداز میں تحریر کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

یہ بات بہت پہلے کی ہے۔

میرے ایک مہربان ہوا کرتے تھے۔ انتہائی شریف اور نیک انسان۔ میں نے آج تک ان سے کوئی غلط بات نہیں سنی، اتنے سادہ دل لوگ آج کل کہاں پائے جاتے ہیں۔

ان کا نام تھا عزیر ہاشمی مرحوم۔ آپ مشہور ادیب، شاعر اور نقاد جناب سلیم احمد مرحوم کے بہنوئی تھے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"میاں، ہم چار پانچ دوست چاندنی کا لطف اُٹھانے کے لیے کلفٹن کے ساحل پر پہنچ گئے (واضح ہو کہ یہ اب سے پچیس تیس سال پہلے کا کلفٹن ہے)

پورا سمندر چاندنی میں سفید چادر کی طرح ہمارے سامنے بچھا ہوا تھا۔ ہم بھی ایک طرف بیٹھ گئے۔ اپنے ساتھ کھانے پینے کی چیزیں بھی لے گئے تھے۔

ہم نے چادر یا دری بچھائی اور بیٹھ کر باتیں شروع کردیں۔ اتفاق سے اس رات ہماری گفتگو انہونے واقعات یا پیرانارمل پر ہو رہی تھی۔

ہم نے اچانک سمندر کی طرف سے کچھ سفید ہیولوں کو اُڑ کر ساحل کی طرف آتے دیکھا۔ ہمارا خیال تھا کہ یہ سفید بگلے ہیں جو بہت بڑی تعداد میں پرواز کرتے ہوئے ساحل کی طرف آرہے ہیں۔ ہم بہت حیرت اور دلچسپی سے اس منظر کو دیکھنے لگے۔

وہ سفید ہیولے قریب آگئے۔ بالکل ہمارے سروں کے اوپر۔ وہ انسان تھے۔ سفید لبادے میں جو ہوا سے پھڑ پھڑا رہے تھے۔ ان بھوں نے اپنے ہاتھ آگے کی طرف پھیلا رکھے تھے۔ وہ اسی طرح پرواز کرتے ہوئے ہمارے سروں پر سے گزر گئے۔

عزیر صاحب نے یہ واقعہ برسوں پہلے سنایا تھا۔ اب پچھلے دنوں ایک کتاب آئی "Life after death"

یہ کتاب ایسے لوگوں کے بارے میں ہے جو موت سے زندگی کی طرف واپس آئے ہیں۔ جیسے عارضی طور پر کسی کا دل بند ہوگیا ہو، یا سرجری کے بعد یا سکتے کی صورت میں موت آئی ہے۔

بہرحال اسی قسم کے حادثوں سے دوچار ہونے کے بعد جو لوگ موت سے زندگی کی طرف واپس آئے ہیں، ان کے انٹرویوز اس کتاب میں شامل ہیں۔

یہ لوگ پوری دنیا کے ہیں۔ بنگلہ دیش، جاپان، امریکا، افریقا، غرضیکہ ہر ملک کے لوگ اس کتاب میں شامل ہیں۔

جب ان سے یہ دریافت کیا گیا کہ موت کے منہ میں جانے کے بعد آپ نے کیا محسوس کیا، یہ سفر آپ کو کیسا لگا تو انہوں نے اپنے حیرت انگیز تجربات اور مشاہدے بتائے۔

کسی نے بتایا کہ اسے ایسا لگا جیسے وہ طویل اندھیری سرنگ سے گزر رہا ہو، کسی نے بتایا کہ وہ بہت بڑے میدان میں تھا اور بھیانک آوازیں آرہی تھیں۔

لیکن ستر فی صد کا مشترکہ بیان یہ تھا کہ انہوں نے ایسے انسانوں کو دیکھا جو سفید لبادوں میں تھے اور دونوں بازو آگے کی طرف پھیلائے خلا میں پرواز کررہے تھے۔

آخر یہ کون لوگ تھے؟

یہ ایک الگ بحث ہے لیکن دوزخ اور جنت کا تصور تقریباً ہر مذہب اور ہر معاشرے میں پایا جاتا ہے۔

سکتہ یا موت کی کیفیت سے گزر کر آنے والوں میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے اپنی آنکھوں سے جہنم یا جنت کو دیکھا ہے یا انہیں اس کی جھلکیاں دکھائی گئی ہیں۔

ان لوگوں کا تعلق بھی مختلف علاقوں سے ہے۔ آیئے ان میں سے چند لوگوں کے تاثرات جانتے ہیں۔

تمارا لارڈ کھا، ایک نوجوان لڑکی ہے۔ زندگی نے اس کے ساتھ کبھی اچھا سلوک نہیں کیا۔ جب وہ بچی تھی تو اس وقت اپنے والدین کے درمیان ہونے والے جھگڑے کو دیکھا کرتی تھی۔

اسے ایسا لگتا جیسے ماں باپ دونوں ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ تمارا نے ان ہی حالات میں پرورش پائی۔ جوان ہوئی تو اس کو ایک شخص برباد کرکے چلا گیا۔

ماں باپ کے درمیان علیحدگی ہوچکی تھی۔ وہ ماں کے گھر سے بھی نکل گئی کیونکہ ماں نے دوسری شادی کرلی تھی جو اس کے اپنے باپ سے بھی زیادہ بے رحم شخص تھا۔

غرضیکہ اس نے انہی حالات میں اپنی زندگی گزاری تھی۔ ایک وقت ایسا آیا کہ تمارا کے پاس اپنی موت کے سوا اور کوئی آپشن نہیں رہا۔ اور موت خودکشی کی صورت میں آسکتی تھی۔ خودکشی کے لیے اس نے اپنے گھر ہی کو ترجیح دی۔ اندر سے دروازہ بند کیا، بستر پر لیٹی اور پستول اپنی کنپٹی پر رکھ لیا۔

اسی وقت اس نے کسی کی آواز سنی، کوئی اس سے کہہ رہا تھا "نہیں، اس طرح نہیں۔ پستول کی نال اپنے سینے پر رکھ کر اس طرح گولی چلاؤ۔"

اس نے ایسا ہی کیا گرچہ اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ آواز کس کی ہوسکتی تھی پھر بھی اس نے ایسا ہی کیا اور مرگئی۔

گولی کی آواز دوسرے کمرے میں بھی سنی گئی۔ لوگ اس کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر آئے۔ تمارا بستر پر لہولہان پڑی ہوئی تھی۔ اسے فوری طور پر اسپتال پہنچا دیا گیا۔

ڈاکٹروں نے اسے بچانے کی سرتوڑ کوششیں کیں۔ وہ کوما کی حالت میں پڑی تھی۔ کئی بار ایسا لگا جیسے اس کی حرکت قلب بند ہے۔ مگر ڈاکٹر مایوس نہ تھے سعی مسلسل میں لگے رہے اور کئی دنوں کے بعد اسے ہوش آہی گیا اور وہ خطرے

سے نکل آئی۔

ہوش میں آنے کے کئی دنوں بعد تک وہ بے پناہ خوف زدہ رہا کرتی تھی۔ جیسے وہ کوئی بہت بھیانک منظر دیکھ کر واپس آئی ہو۔

کئی مہینوں تک اس کا یہی حال رہا تھا۔ بہرحال اس نے ایک ٹی وی شو میں پاٹ رابرٹسن کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا "خدا کے لیے اس پروگرام کے ذریعے لوگوں تک یہ پیغام پہنچا دیں کہ موت کے بعد کی زندگی بالکل سچ ہے۔ ہمیں یا تو جنت میں بھیج دیا جاتا ہے یا جہنم میں اور کچھ دیر کے لیے مجھے بھی جہنم میں بھیج دیا گیا تھا۔"

جہنم کی کیفیت کا ذکر کرتے ہوئے تمارا کے پورے بدن پر کپکپی طاری ہوگئی تھی۔ میرے خدا، وہ کتنی بھیانک جگہ ہے، چاروں طرف آگ، چیختی ہوئی کھوپڑیاں، آگ کی تپش سے پگھلتے ہوئے جسم، ہر طرف چیخنے اور کراہنے کی آوازیں۔

اور میں بھی اسی آگ میں پھینک دی گئی تھی۔ میں نے رو رو کر خدا سے اپنے اس گناہ کی معافی مانگی اور شاید اسی لیے مجھے اس آگ سے باہر نکال لیا گیا اور آج میں یہاں آپ کے سامنے ہوں۔

اس انٹرویو کو دیکھ کر یہ احساس نہیں ہوتا کہ تمارا غلط بیانی کررہی ہے۔ انٹرویو دیتے وقت بھی اس کی حالت دگرگوں ہورہی تھی۔ خوف کے بے پناہ احساس نے اسے جکڑ رکھا تھا۔

اب اس کو کیا کہا جائے گا؟

اس سے زیادہ حیرت ناک کہانی کارٹن سلیووکی ہے۔ کارٹن آٹھ سال کا بچہ تھا۔ بچپن ہی سے اس کے دل میں سوراخ تھا لیکن ڈاکٹروں کا یہ کہنا تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ سوراخ بند ہوجائے گا۔

لیکن ایسا نہیں ہوا۔ جب اس کی عمر آٹھ سال کی ہوئی تو اس کی حالت نازک ہوگئی۔ اسے اسی وقت اسپتال پہنچا دیا گیا اور ڈاکٹرز نے فیصلہ کیا کہ اسی وقت اس کے دل کی سرجری ہونی چاہیے۔

کارٹن کو آپریشن تھیٹر میں پہنچا دیا گیا۔

اس کے ماں باپ سکتے کے عالم میں کھڑے رہ گئے۔ کارٹن ان کی اکلوتی اولاد تھا۔ انہیں اس سے بے پناہ محبت تھی۔ کارٹن کا باپ اپنی بیوی کو سہارا دے کر اسپتال کے لان میں لے آیا۔

اس نے دھیان بٹانے کے لیے اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کردیں لیکن کارٹن کی ماں کی حالت غیر ہی ہوتی جارہی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کارٹن کے باپ نے کارٹن کے ابتدائی دنوں کی باتیں شروع کر دیں۔ جب پہلی بار اسے اسکول میں لے گئے تھے اور کارٹن روتے ہوئے اپنی ماں سے چمٹ گیا تھا۔

کارٹن کی ماں کو یہ سب اسی طرح یاد تھا جیسے کل ہی کی بات ہو۔

کارٹن کی ایک معصومانہ حرکت کو یاد کر کے وہ ہنس دی تھی۔ اِدھر دونوں میاں بیوی کے درمیان اسی قسم کی باتیں ہو رہی تھیں اور دوسری طرف کارٹن زندگی اور موت کی کشمکش میں تھا۔

ڈاکٹرز اس کی زندگی بچانے کی پوری کوششیں کر چکے تھے لیکن کارٹن زندگی کی بازی ہار گیا۔ وہ مر گیا تھا۔ اس کے ماں باپ باہر بیٹھے ہوئے اس کی سلامتی کی دعائیں مانگ رہے تھے لیکن وہ زندہ نہیں رہ سکا تھا۔

آپریشن تھیٹر میں موجود ڈاکٹرز بھی اس کی موت پر اداس ہو گئے تھے۔ وہ ایک پیارا بچہ تھا۔ لیکن اس پیارے بچے کے دل کی دھڑکنیں رک چکی تھیں۔

پھر کچھ ہوا، کوئی اَن ہونی سی بات!

اس کی دھڑکنیں بحال ہونے لگی تھیں جیسے وہ زندگی کی طرف واپس آ رہا ہو۔ ڈاکٹرز پھر اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

کچھ دیر کے بعد اسے ہوش بھی آ گیا۔ وہ موت کے منہ میں جا کر واپس آ گیا تھا۔

اس نے مکمل ہوش میں آنے کے بعد جو کچھ بتایا، وہ بہت حیرت انگیز تھا۔

''میں اپنے جسم سے نکل کر آپریشن روم سے باہر چلا گیا تھا۔ میں نے مما اور پاپا کو لان میں بیٹھ کر باتیں کرتے ہوئے دیکھا تھا۔'' پھر اس نے وہ باتیں بتا دیں جو اُن دونوں کے درمیان واقع ہوئی تھیں۔

اس کے بعد اس نے بتایا ''کوئی مجھے اُٹھا کر جنت میں لے گیا تھا۔ وہ بہت خوبصورت جگہ ہے۔ اتنی خوبصورت کہ میں بتا نہیں سکتا۔ وہاں میری ملاقات دادا سے ہوئی۔'' (اس کے دادا کے انتقال کو دو برس ہو چکے تھے)۔

دادا بہت پیار سے ملے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ جنت میں بہت خوش ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ تمہاری ماں نے ایک بچہ ضائع کروا کے اچھا نہیں کیا۔ ورنہ آج دو بھائی ہوتے۔

کارٹن کے والدین یہ سن کر حیران رہ گئے تھے کیونکہ یہ کارٹن کی پیدائش سے پہلے کی بات تھی اور کسی نے بھی کارٹن کو اس بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔

کارٹن نے اور بھی ایسی کئی باتیں بتائیں جو حیران کر دینے والی تھیں۔ بعد میں اس کا باقاعدہ انٹرویو لیا گیا۔ یہ انٹرویو فاکس نیوز کی انٹرنیٹ سائٹ پر موجود ہے۔

ان واقعات سے یہ احساس ہوتا ہے کہ جنت اور دوزخ صرف تصوراتی مقامات نہیں ہیں بلکہ ان کی حقیقت بھی ہے۔

جینیفر بیریز۔ عمر 16 سال۔ بچپن ہی سے خودسر اور ضدی۔ بارہ برس کی عمر سے اس نے منشیات کا استعمال شروع کر دیا تھا۔

دیکھنے میں بہت بھولی بھالی اور خوبصورت۔ لیکن خراب دوستوں کی صحبت میں پڑ کر وہ خود بھی خراب ہو گئی اور نشے کی عادی ہوتی چلی گئی۔ والدین کی نصیحتیں بھی اسے راہِ راست پر نہ لا سکیں۔

پھر نشے ہی کی حالت میں اس کے ساتھ ایک حادثہ ہو گیا۔ اس حادثے نے اسے موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ جائے حادثہ پر موجود لوگ اسے اُٹھا کر فوری طور پر اسپتال لے گئے۔

اس کو آپریشن تھیٹر میں لے جایا گیا لیکن وہ جانبر نہ ہو سکی۔ وہ مر چکی تھی لیکن اس پر موت کی یہ کیفیت زیادہ دیر تک برقرار نہیں رہی۔

وہ آہستہ آہستہ ہوش میں آتی چلی گئی۔ بلآخر وہ مکمل تندرست ہو گئی لیکن اس نے اپنی اس کیفیت کے بارے میں جو بتایا، وہ بہت حیرت انگیز اور بہت ہولناک تھا۔

اپنی موت کے بعد اسے جہنم میں پہنچا دیا گیا تھا جہاں اس نے ہر طرف آگ ہی آگ دیکھی۔ اس کا بیان ہے کہ ہزاروں لاکھوں لوگ تھے جنہیں سزائیں دی جا رہی تھیں۔

وہ بے پناہ خوف زدہ تھی۔ جہنم کی آگ اسے جھلسائے جا رہی تھی۔ اس نے خدا کو پکار پکار کر معافی مانگنی شروع کر دی پھر کسی مہربان ہاتھ نے اسے جہنم کی اس آگ سے باہر نکال لیا تھا۔

جینیفر سے بھی انٹرویو لیا گیا تھا۔

انٹرویو کے وقت بھی وہ بے انتہا خوف زدہ تھی اور بار بار رو رو کر کہہ رہی تھی کہ وہ اب کبھی نشے کی چیزوں کو ہاتھ نہیں لگائے گی کیونکہ وہ جہنم کو اپنی آنکھوں سے دیکھ آئی ہے۔

سب سے زیادہ حیرت انگیز واقعہ برما کے تھیٹ پلان پالوکا ہے۔ یہ ایک بدھسٹ ہے، اپنے عقائد پر سختی کے ساتھ قائم رہنے والا۔

اس کے ساتھ بھی ایک حادثہ پیش آیا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ حادثہ دریا میں مچھلیوں کے شکار کے دوران پیش آیا تھا۔ وہ اپنی کشتی میں اکیلا ہی تھا۔ عام طور پر اس کے ساتھ کوئی اور بھی ہوا کرتا تھا لیکن اس دن وہ اکیلا ہی تھا۔

کنارے سے بہت دور آنے کے بعد اس نے جال ڈالا اور اسی وقت اس کی کشتی ڈگمگانے لگی۔ لگتا تھا کوئی چیز اس سے آکر ٹکرا رہی ہو۔

اس نے دیکھا کہ دو خونخوار قسم کے مگرمچھوں نے اس کی کشتی پر حملہ کر دیا تھا۔ اس نے خود کو اور کشتی کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہوسکا۔ اس کی کشتی اُلٹ گئی تھی۔

اس نے تیر کر کنارے کی طرف جانے کی کوشش کی لیکن مگرمچھوں نے اس پر حملہ کر دیا اور تقریباً ادھیڑ کر رکھ دیا۔

لیکن نہ جانے کون سی گھڑی تھی کہ اس طرف کچھ سیاح آنکلے جن کے پاس بندوقیں تھیں۔ انہوں نے مگرمچھوں پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔

مگرمچھ تھیٹ پلان کو مردہ حالت میں چھوڑ کر فرار ہوگئے۔ تھیٹ پلان کو بہت ہی مخدوش حالت میں اسپتال لایا گیا تھا۔

وہ ادھیڑ دیا گیا تھا۔ اس کا ایک بازو علیحدہ ہو چکا تھا۔ کافی دیر بعد بالآخر ڈاکٹرز نے اس کی موت کی تصدیق کردی، وہ مر چکا تھا۔

اس کے ساتھ بھی وہی ہوا جو اس قسم کے تجربات سے گزرنے والوں کے ساتھ ہوا کرتا ہے یعنی وہ آہستہ آہستہ اسی آپریشن تھیٹر میں زندگی کی طرف واپس آنے لگا۔

بالآخر کئی ہفتوں کی کوششوں کے بعد وہ مکمل طور پر صحتمند ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے تجربات اور مشاہدے میں جہنم کو شامل کیا ہے۔

اس کا کہنا ہے کہ اسے جہنم میں پہنچا دیا گیا تھا جہاں اس نے لوگوں کو بھیانک آگ میں جلتے اور تڑپتے ہوئے دیکھا۔ اس کے تجربات میں جو بات شامل ہے، وہ بہت بھیانک اور دوسری داستانوں سے مختلف ہے۔ اس نے بتایا کہ اس نے جہنم میں کچھ ایسے چہروں کو دیکھا جو اس کے لیے بہت قابلِ احترام رہے تھے۔

اس نے جہنم کے داروغہ سے جب سوال کیا کہ کیا یہ لوگ ہیں اس نے نام لے کر پوچھا تو اس فرشتے نے جواب دیا کہ یہ وہی ہیں، تم جن کی پوجا کرتے آئے ہو، اب خود ان کا انجام اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔ جب خود ان کا یہ حال ہو رہا ہے تو خود سوچ لو، تمہارا کیا حشر ہونے والا ہے؟

تھیٹ پولان کا یہ کہنا ہے کہ وہ جہنم کے خوف سے با... زندہ ہو رہا تھا اور بار بار مر رہا تھا۔ بالآخر اسے دنیا کی طر... واپس بھیج دیا گیا۔

شاید ایک اور موقع دینے کے لیے۔ یا ابھی اس... موت کا اصل وقت نہیں آیا تھا۔

جہنم کے برعکس کچھ لوگوں نے جنت کا بھی مشاہدہ... ہے۔ ان کے تجربات بھی اسی قسم کے ہوتے ہیں۔ وہ... حادثے کے نتیجے میں مرتے ہیں اور ان کی موت کا اعلا... کر دیا جاتا ہے، اس کے بعد وہ زندگی کی طرف وا... آجاتے ہیں۔

اور واپسی کے بعد اپنے تجربات اور مشاہدات بتا... ہیں۔

جنت اور جہنم کی سیر کرنے والوں میں ہر طبقے اور مذہب کے لوگ شامل ہیں۔ Life after Death نامی کتاب میں ہر مذہب کے لوگوں کے انٹرو... لیے گئے ہیں۔

جنت کی سیر کرنے والے عام طور پر وہ حضرات تھے... انسان کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرتے رہے یا جنہوں... صاف ستھری زندگی گزاری۔

یہ زیادہ تر ایسے لوگ تھے جو کسی حادثے یا خودکشی... نتیجے میں مرے تھے یعنی غیر طبعی موت مرنے والے۔ لیک... کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو طبعی موت مرے لیکن انہیں دنیا... طرف واپس بھیج دیا گیا۔ کیا اس قسم کے واقعات ہما... یاددہانی کے لیے ہوتے ہیں؟ یا کوئی اور بات ہوتی ہے؟

ہمارے یہاں بھی اس قسم کے بہت سے واقعات... میں آتے رہے ہیں کہ فلاں شخص کو سکتہ ہوگیا تھا، لوگوں... اسے مردہ سمجھ لیا لیکن پھر وہ زندہ ہوگیا۔

ایسا ہوتا تو ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا وہ اس قسم... تجربات سے دوچار ہوتے ہیں، بہرحال زندگی سے مو... تک کا یہ سفر بہت حیرت انگیز ہے۔

ہمارا تو ایمان ہی جنت اور دوزخ پر ہے۔ اگر اور... نے ان مقامات کو دیکھا ہے تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہ... ہے۔

کیونکہ مسلمانوں سے زیادہ جنت اور دوزخ کے مفہ... سے کون واقف ہوگا؟

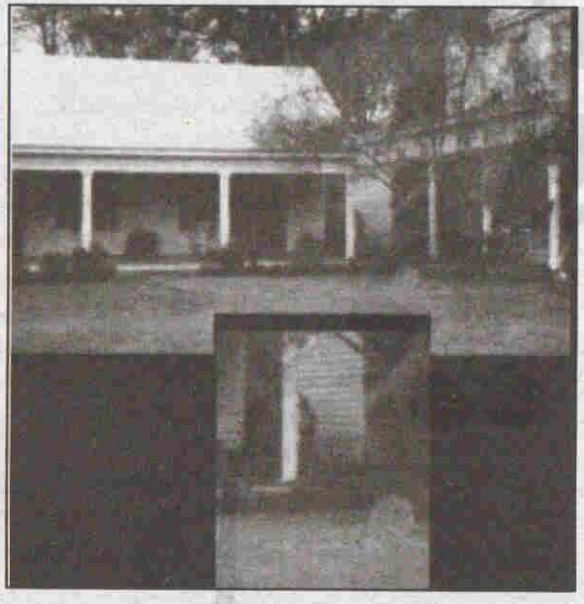

پراسرار عمارتیں

نزہت قادری

جسم خاکی کو موت آجاتی ہے مگر روح نہیں مرتی۔ بھٹکتی رہتی ہے۔ اعمال کی سزا بھگتنے والی ارواح کا مسکن کھنڈر اور کہنہ اشجار ہوتے ہیں۔ دنیا کے تقریباً ہر ملک میں ایسے مشہور مقام بکثرت ہیں جہاں ارواح کا بسیرا ہے۔ ایسے ہی چند مشہور مکانوں کا تذکرہ جہاں ٹھہرنا، رات گزارنا خطرناک سمجھا جاتا ہے۔

کیا واقعی ان مکانوں میں آسیب رہتے ہیں؟

اس عمارت کا نام The Myrtles Plantyation تھا۔ یہ عمارت 1796ء میں جنرل ڈیوڈ براڈفورڈ نے تعمیر کروائی تھی۔ اسی عمارت میں دو بہت خوبصورت بچّے تھے۔ ایک بھائی اور اس سے چھوٹی بہن۔ اس مکان میں ایک عدد تند خو غلام بھی تھا۔

اس غلام کو ان بچّوں کے والدین نے بچّوں کی نگرانی اور دیکھ بھال کے لیے مقرر کیا تھا۔ مگر بچّوں کی شرارتیں اسے بہت بُری لگتی تھیں۔

ایک شام جب دونوں بچّے معمول کے مطابق شور کر رہے تھے تو اس نے ان بچّوں کو لان کے ایک گوشے میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لے جا کر گلا گھونٹ کر مار دیا تھا۔

یہ اتفاق تھا کہ اس کی یہ حرکت دیکھ لی گئی اور اسے گرفتار کر کے اسی مکان میں اسے سزائے موت دے دی گئی۔

وہ دن ہے اور آج کا دن، اس مکان میں اس غلام اور دونوں بچوں کے بھوت دکھائی دیا کرتے ہیں۔ دیکھنے والے یہ بتاتے ہیں کہ اس غلام کا بھوت ایک کونے میں منہ چھپائے بیٹھا رہتا ہے جبکہ دونوں بچے ایک دوسرے کے آگے پیچھے دوڑتے اور ایک دوسرے کو پکارتے دکھائی دیتے ہیں۔

یہ اور بات ہے کہ ان کی آوازیں سنائی نہیں دیتیں لیکن وہ دونوں پوری طرح دکھائی دیتے ہیں۔

وہ عمارت آج کل ریسٹ ہاؤس کے طور پر استعمال کی جاتی ہے لیکن اس عمارت میں رُکنے والے مہمانوں کو اس قسم کے اور بھی کئی بھوت دکھائی دیا کرتے ہیں۔

اس عمارت کی تاریخ پر ریسرچ کرنے والے ٹرائے ٹیلر کی تحقیق کے مطابق وہ ایک خونی عمارت ہے۔ اس میں کم از کم بارہ تیرہ افراد کا خون ہو چکا ہے اور ان سبھوں کے بھوت اس عمارت میں اکٹھے ہو گئے ہیں۔

ان میں سے کچھ ایک دن دکھائی دیتے ہیں تو کچھ دوسرے دن اور کبھی کبھی جب یہ سب ایک ساتھ ہو جاتے ہیں تو یہ عمارت بھوتوں کا اکھاڑہ دکھائی دینے لگتی ہے۔

اس عمارت میں ایک اور قتل ولیم ڈریو کا ہوا تھا۔ ولیم ڈریو ایک اٹارنی تھا جو اپنی بیوی کے ساتھ اس عمارت میں رہا کرتا تھا۔

ان کے کمرے اوپری منزل پر تھے جبکہ نچلی منزل لائبریری اور مہمانوں کے لیے مختص تھی۔ ولیم ڈریو 1860ء سے 1871ء تک اسی عمارت میں رہا تھا۔

اس کا قتل 1871ء میں ہوا تھا۔ ایک رات وہ اپنی لائبریری میں بیٹھا تھا جبکہ اس کی بیوی اوپری منزل پر تھی۔ اسی دوران میں قاتل اس کی لائبریری میں داخل ہو گئے اور انہوں نے اس پر تلواروں کے کئی وار کیے فرار ہو گئے۔

ولیم ڈریو اپنی بیوی کے پاس جانے کے لیے خون میں لت پت سیڑھیوں کی طرف دوڑا لیکن وہ اوپر تک نہیں پہنچ سکا تھا۔ سترہویں سیڑھی پر اس کی موت واقع ہو گئی تھی۔

اس کا بھوت آج بھی اسی سترہویں سیڑھی پر بیٹھا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اس قسم کے اور بھی کئی واقعات نے اس عمارت کو دنیا کی آسیب زدہ ترین عمارت بنا دیا ہے۔

سیاحوں کے لیے وہ عمارت کھول دی گئی ہے۔ سیاح بھوتوں کو دیکھنے کے شوق میں جایا کرتے ہیں۔ بہت سوں کو کامیابی ہوتی ہے اور بہت سے ناکام واپس آ جاتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ جس کی موت غیر فطری انداز سے ہو، یعنی قتل اور حادثہ وغیرہ، تو اس موت کے لمحات فضاؤں میں منجمد ہو کر رہ جاتے ہیں۔

ان کے اثرات فضا میں ارتعاش پیدا کر دیتے ہیں کیونکہ پورا Set-up اسی ایک واقعے کی وجہ سے تبدیل ہو چکا ہوتا ہے، بھوت اسی لیے دکھائی دیتے ہیں کہ فضا میں وہ ارتعاش موجود ہے۔

اور جو کچھ بھی دکھائی دیتا ہے، وہ بھوت نہیں ہوتا بلکہ وہ ارتعاش ہوتا ہے یعنی جو واقعہ بھی رونما ہوتا ہے اس کا عکس محفوظ رہ جاتا ہے اور کسی بھی سبب وہ عکس بار بار Repeat ہوتا ہے۔

یا یہ سمجھ لیا جائے کہ اس غیر فطری واقعے کا عکس بے قابو ہو جاتا ہے۔ بہر حال سبب جو بھی ہو، اس دنیا میں یہ سب کچھ ہوتا رہتا ہے۔

اب ایک اور عمارت کا حال سن لیں۔

یہ دنیا کی ایک انتہائی مشہور ترین ہے۔ یہ ایک ایسا تاریخی ورثہ ہے جس کو صدیوں سے اس کی اصل شکل و صورت میں محفوظ رکھا جاتا رہا ہے۔

اس عمارت کو دنیا کا مشہور ترین تاریخی ورثہ قرار دیا جا چکا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ دنیا کی سب سے زیادہ آسیب زدہ عمارت ہے۔ اس عمارت کا نام ہے ٹاور آف لندن۔

اس عمارت کو لندن کی شان کہتے ہیں۔ دنیا بھر سے لاکھوں سیاح اسے دیکھنے جایا کرتے ہیں اور اس کی خوبصورتی و عظمت انہیں مبہوت کر کے رکھ دیتی ہے۔

اس ہزار سالہ پرانی عمارت میں حیرت انگیز واقعات کا سلسلہ انیسویں صدی میں شروع ہوا اور آج تک جاری ہے۔

ہو سکتا ہے کہ یہ سب کچھ پہلے بھی ہوتا رہا ہو لیکن میڈیا نہ ہونے کی وجہ سے ان واقعات کو شہرت نہ مل سکی ہو بہر حال ان واقعات کی شہرت 1957ء سے شروع ہوئی۔

ولیم نامی ایک گارڈ نے ایک رات اسی عمارت کی چھت پر کسی عورت کو ٹہلتے ہوئے دیکھ لیا۔

اس نے سوچا کہ وہ عورت کسی بُرے ارادے سے

عمارت میں چھپی رہ گئی ہے، یہ سوچ کر ولیم اس عورت کو چیک کرنے دوڑتا ہوا چھت پر پہنچ گیا۔

وہ عورت چھت پر موجود تھی۔ اس نے اوپر سے نیچے تک ایک سفید لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔ ولیم کی آہٹ سن کر اس نے وہ سفید لبادہ ایک طرف اُتار کر پھینک دیا۔

ولیم اسے دیکھ کر بُری طرح چیختے ہوئے واپس بھاگا کیونکہ اس عورت کی صرف گردن تھی سر نہیں تھا اور اس کٹی ہوئی گردن سے تازہ تازہ خون نکل رہا تھا۔

ولیم کے اس بیان پر یقین کر لیا گیا تھا کیونکہ وہ ایک مستعد اور فرض شناس شخص تھا۔ اس نے اپنی ڈیوٹی کے دوران کبھی شراب نوشی نہیں کی تھی اسی لیے اس نے جو کچھ دیکھا، وہ نشے کی حالت میں نہیں دیکھا تھا۔

اب تحقیقات شروع ہوئیں تو پتا چلا کہ اس عمارت میں اسی تاریخ یعنی 12 فروری کو ایک عورت کی گردن اُتار دی گئی تھی اور یہ واقعہ 1554ء کا تھا۔

یعنی چار ساڑھے چار سو سال بعد اس عورت کا بھوت ٹاور آف لندن میں بھٹکتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔

اس عمارت کے حوالے سے ایک اور تاریخی واقعہ بھی ہے۔

1536ء میں برطانیہ کے بادشاہ ہنری ہشتم نے خود اپنی بیوی ایلین کے خلاف ایک فیصلہ کیا۔ بادشاہ کو اگرچہ اپنی بیوی سے بہت محبت تھی لیکن ایلین کی حرکتوں نے حکومت کو بدنام کرنا شروع کر دیا تھا۔

وہ ایک عیاش طبع عورت تھی۔ اس کا کام نوجوان سپاہیوں کو اپنے جال میں پھانس کر بعد میں انہیں مروا دینا تھا۔ کئی نوجوان اس کی اس خود غرضی کی نذر ہو چکے تھے۔

بالآخر بادشاہ ہنری ہشتم نے اپنی اور حکومت کی ساکھ کو بچانے کے لیے اس کی موت کے پروانے پر دستخط کر دیے۔ اسی عمارت میں اس کی گردن اُتاری گئی تھی۔

اس کے بعد سے اب تک کئی بار مرتبہ ایلین کو اس عمارت میں اپنا سر اپنے ہاتھوں پر لیے آتے جاتے ہوئے دیکھا جا چکا ہے۔

اسی طرح کا ایک اور واقعہ کاؤنٹس آف سیلسبری کا ہے۔ اس عورت نے بھی اپنی مجرمانہ سرگرمیوں کی انتہا کر دی تھی۔ اسی بنا پر اسے بھی موت کی سزا سنا دی گئی۔

ایک عجیب واقعہ اس سے وابستہ ہے کہ جب جلاد ننگی تلوار لیے اس کے پاس آیا تو وہ چیخ مار کر بھاگی۔ جلاد نے اس کا تعاقب کرنا شروع کر دیا۔ وہ چیختی چلاتی ہوئی پورے محل میں دوڑ لگاتی رہی۔

بالآخر ایک مقام پر جلاد نے اسے پکڑ کر اس کا کام تمام کر دیا اور آج بھی یہ واقعہ ہر سال اسی تاریخ کو دُہرایا جاتا ہے جس تاریخ کو اسے مارا گیا تھا۔

وہی منظر دیکھنے میں آتا ہے کہ ایک عورت چیختی ہوئی دوڑتی جا رہی ہے اور ایک شخص ننگی تلوار لیے اس کے تعاقب میں ہے۔

کوئن میری

کوئن میری ایک خوبصورت بحری جہاز ہے۔ اس جہاز نے 1967ء میں اپنی زندگی پوری کر لی تھی۔ اسے ریٹائر کر دیا گیا تھا۔

اب اسے توڑے جانے کا انتظام کیا جا رہا تھا کہ ایڑک پارٹی نے اسے خرید کر ہوٹل میں تبدیل کر دیا۔ اب کوئن میری لانگ بیچ کیلی فورنیا کے ساحل پر کھڑا ہوا ہے۔

ہوٹل میں تبدیل کرنے کے بعد اس میں کئی تبدیلیاں بھی

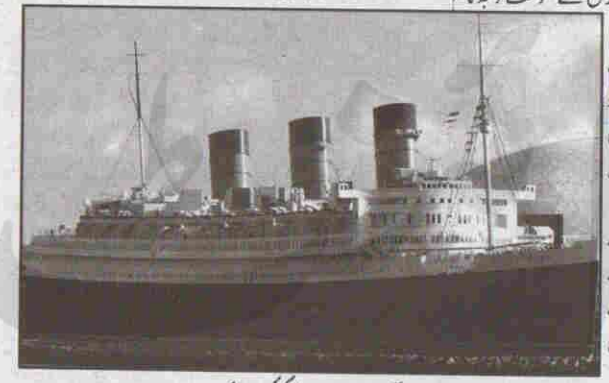

آسیب زدہ جہاز کوئن میری

کی گئی ہیں۔ اس کے کمروں کو جدید تقاضوں کے مطابق تبدیل کر کے رہائشی کمرے بنا دیا گیا ہے۔ مسافر یہاں کئی کئی دنوں تک رکنے کے لیے جاتے ہیں کیونکہ وہ ایک طرف

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تو ایک جدید ہوٹل کا لطف لے رہے ہوتے ہیں، دوسری طرف وہ خود کو بحری جہاز میں تصور کرتے ہیں۔

براؤن کئی دنوں سے اسی جہاز نما ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ وہ ایک بزنس مین تھا۔ کئی شہروں میں اس کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔

اس نے کمرے کی کھڑکی سے باہر دیکھا۔ دوسری طرف سوئمنگ پول تھا۔ یہ پول جہاز کا تھا۔ جیسے رینوویٹ کر کے اب ہوٹل کے سوئمنگ پول میں بدل دیا گیا تھا۔ اس وقت وہاں خوب روشنی ہو رہی تھی۔ پول کا صاف پانی اسے واضح طور پر دکھائی دے رہا تھا۔

براؤن نے دو بچوں کو دیکھا جو پول کے پانی میں اُترنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کے انداز یہ بتا رہے تھے کہ انہیں تیرنا نہیں آتا۔

براؤن کو اندازہ تھا کہ اس پول کا پانی اچھا خاصا گہرا ہے کیونکہ وہ خود بھی دن میں تیراکی کر چکا تھا۔ اس نے بچوں کو منع کیا کہ وہ پانی میں نہ اُتریں۔

لیکن یا تو فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے بچوں نے اس کی آواز نہیں سنی تھی یا پھر انہوں نے براؤن کی بات پر دھیان نہیں دیا تھا۔

براؤن کا اضطراب بڑھتا جا رہا تھا۔ ان بچوں کو کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

اس نے جلدی سے اپنا سگار بجھایا اور تقریباً دوڑتے ہوئے کمرے سے نکل کر ڈائننگ ہال میں پہنچا۔ وہاں سے نکل کر ایک طویل چکر کاٹ کر پول پر پہنچ گیا۔ لیکن اب وہاں کوئی نہیں تھا۔

براؤن کے ذہن میں سب سے پہلا خیال یہی آیا تھا کہ شاید دونوں بچے ڈوب گئے۔ اس نے پول کے پانی میں جھانک کر دیکھا، کچھ بھی نہیں تھا۔

پول کا پانی اتنا صاف و شفاف تھا کہ تہ تک صاف دکھائی دے رہی تھی لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ دونوں بچے شاید اس کے وہاں تک آتے آتے والدین کے پاس واپس چلے گئے ہوں گے۔

براؤن بھی واپس آ گیا۔

سگار کی خواہش ابھی تک برقرار تھی۔ وہ پہلا سگار افراتفری میں بجھا کر پول کی طرف نکل آیا تھا۔ اس نے تمباکو نوشی کے کمرے میں داخل ہو کر دوسرا سگار جلا لیا۔

غیر ارادی طور پر اس کی نگاہ باہر کی طرف گئی اور اس بار، اس نے جو کچھ دیکھا وہ انتہائی وحشت ناک تھا۔ ان دونوں بچوں کی لاشیں پول میں تیر رہی تھیں۔

اس نے جلدی سے سگار بجھایا اور دوبارہ ڈائننگ ہال میں آ گیا۔ اس نے سوچا کہ وہ چیخ کر سب کو بتا دے، پھر اس نے اپنے آپ کو روک لیا۔ اس طرح پورے ہوٹل میں افراتفری برپا ہو جاتی۔

وہ کسی کو بتائے بغیر دوڑتا ہوا پول کی طرف آ گیا لیکن اب پول پھر پہلے کی طرح صاف و شفاف تھا۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا حالانکہ ابھی کچھ دیر پہلے اس نے خود اپنی آنکھوں سے دونوں بچوں کی لاشیں دیکھی تھیں لیکن وہ لاشیں نہ جانے کہاں چلی گئی تھیں۔

اتفاق سے اسی وقت ہوٹل کا ایک آدمی اس طرف آ نکلا۔ اس نے براؤن کو حیران اور پریشان دیکھ کر دریافت کیا ''خیر تو ہے جناب، کیا آپ کسی کو تلاش کر رہے ہیں؟''

''مسٹر! اس پول میں دو بچے ڈوب کر مر گئے ہیں۔ میں نے خود ان کی لاشیں دیکھی ہیں۔'' براؤن نے بتایا۔

''آپ یہ بتائیں، کیا آپ نے پہلے ان بچوں کو زندہ بھی دیکھا تھا؟''

''کیوں نہیں، پہلی بار وہ دونوں زندہ تھے۔'' براؤن نے بتایا ''وہ اسی پول کے پاس کھیل رہے تھے۔''

''کوئی بات نہیں جناب! اب آپ اس واقعے کا کسی سے تذکرہ نہ کریں۔''

''وہ کیوں؟''

''اس لیے کہ کل آپ پھر دونوں بچوں کو زندہ دیکھ سکتے ہیں اور ان کی لاشیں بھی دیکھ سکتے ہیں۔'' اس آدمی نے بتایا۔

''میں تمہاری بات نہیں سمجھ سکا۔''

''جناب، برسوں سے یہاں یہی ہوتا آیا ہے۔'' اس آدمی نے بتایا ''صرف وہ دونوں بچے ہی نہیں بلکہ اور بھی بہت سے لوگ دکھائی دیتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اب آپ کی سمجھ میں آ گیا ہوگا۔''

براؤن کی سمجھ میں سب کچھ آ گیا تھا۔ اسی لیے وہ دوسرے ہی دن کوئن میری کو خیر باد کہہ چکا تھا۔

ایک رات کو اسی ہوٹل یا جہاز کے تہ خانے سے چیخنے چلّانے کی آوازیں آنے لگیں۔ کوئی زور زور سے مدد مدد پکار رہا تھا۔

جو لوگ نہیں جانتے تھے وہ دوڑتے ہوئے پہنچ گئے۔ وہ

جہاز کا انجن روم تھا جسے اب ہوٹل والوں نے بند کر رکھا تھا۔

وہ سترہ سالہ ایک نوجوان تھا جس کی موت اسی انجن روم میں آگ لگنے کی وجہ سے ہوئی تھی۔ وہ مدد کے لیے پکارتا رہا تھا لیکن کوئی اس بے چارے کی مدد نہیں کر پایا تھا اور اس کی روح آج تک اسی انجن روم میں مدد کے لیے پکارتی رہتی ہے۔

ایک بار ٹام نام کے ایک سنگر کو اسی ہوٹل میں جہاز کے عرشے پر ایک لڑکی مل گئی، اسی رات اس جہاز میں فینسی ڈریس شو تھا۔ ٹام کو اس تقریب میں سنگر کی حیثیت سے بلایا گیا تھا۔

تقریب میں لوگ طرح طرح کے لباس پہن کر آئے ہوئے تھے۔ رومن عہد سے لے کر آج تک کے لباس موجود تھے جبکہ وہ خوبصورت سی لڑکی قدیم یورپی لباس میں تھی۔

جیسا فلموں میں دکھایا جاتا ہے، اوپر سے نیچے تک سفید چوغہ سر پر اسکارف، جس کی وجہ سے وہ لڑکی بہت خوبصورت دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے چہرے پر بلا کی معصومیت اور کشش تھی۔

ٹام پہلی نگاہ میں اس کا دیوانہ ہو گیا تھا۔

وہ لڑکی عرشے پر چپ چاپ کھڑی سمندر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ٹام خود ہی اس کے پاس پہنچ گیا تھا۔ اس نے اپنا تعارف کرایا ''مس! میرا نام ٹام ہے، ٹام ہاکنر۔ میں ایک سنگر ہوں، شاید آپ نے کچھ دیر پہلے میرا گانا بھی سنا ہوگا۔''

لڑکی کے ہونٹوں پر ایک دلفریب سی مسکراہٹ نمودار ہو گئی ''میں مارتھا ہوں۔'' لڑکی نے اپنا تعارف کروایا ''میں ایک کسان کی بیٹی ہوں۔''

''اچھی بات ہے۔'' ٹام نے کہا ''اگر تم کسان کی بیٹی ہو تو شاید پہلی بار تمہارا اس ہوٹل میں آنا ہوا ہوگا۔''

''یہ ہوٹل نہیں جہاز ہے۔'' لڑکی نے اس کی تصحیح کی۔

''پہلے یہ جہاز تھا لیکن اب اسے ہوٹل بنا دیا گیا ہے۔'' ٹام نے کہا۔

''نہیں، میں کسی ہوٹل کو نہیں جانتی۔ میں تو صرف اس جہاز کو جانتی ہوں اور میں یہاں برسوں سے رہتی آئی ہوں اسی لیے مجھے معلوم ہے کہ یہ ایک جہاز ہے۔''

''چلو، تم ٹھیک کہتی ہو۔'' ٹام نے ایک گہری سانس لی ''لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ تم یہاں برسوں سے کس طرح رہتی آئی ہو۔''

''یہ بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی۔'' لڑکی پھر مسکرا دی۔

''چلو چھوڑو۔ آؤ ہال میں چلتے ہیں۔ وہاں رقص ہو رہا ہوگا۔'' ٹام نے پیشکش کی۔

''نہیں، مجھے ہال میں نہیں جانا، یہیں رہنا ہے۔'' لڑکی نے کہا ''مجھے کسی کا انتظار ہے۔''

''کس کا انتظار ہے تمہیں؟''

''ہے کوئی۔'' لڑکی نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا ''وہ آئے گا، اسی سمندر کی طرف سے آئے گا۔ اسی لیے میں یہاں رہوں گی۔''

ٹام کو اس کی باتیں کچھ عجیب سی لگ رہی تھیں۔ اسی وقت اندر ہال میں ٹام کے نام کی اناؤنسمنٹ ہونے لگی۔ وہ پھر ملنے کا وعدہ لے کر ہال میں آ گیا۔ اسے اپنی پرفارمنس دینی تھی۔

پرفارمنس دینے کے بعد وہ پھر عرشے پر آ گیا۔ اس بار ہوٹل کے اسٹاف کا ایک فرد ول گیا تھا۔ اس نے ٹام کو عرشے پر کھڑا دیکھ کر پوچھا ''خیر تو ہے مسٹر ٹام، کسی کا انتظار ہے کیا؟''

''ہاں بھائی!'' ٹام مسکرا کر بولا ''ایک لڑکی ہے۔ کچھ دیر پہلے اسی جگہ پر تھی، بہت خوبصورت۔''

''کیا اس نے سفید لباس پہن رکھا تھا؟''

''ہاں۔'' ٹام نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا ''تمہیں کیسے معلوم؟''

''کیا اس نے تم سے یہ کہا تھا کہ وہ سمندر کی طرف سے آنے والے کسی شخص کا انتظار کر رہی ہے؟''

''ہاں، اس نے کہا تو تھا۔'' ٹام نے اُلجھتے ہوئے بتایا ''لیکن تم کیسے جانتے ہو؟''

''اس لیے کہ یہ ڈراما برسوں سے ہو رہا ہے۔'' اس شخص نے بتایا ''وہ ایک بھٹکتی ہوئی روح ہے صاحب! گزشتہ بیس برسوں میں نہ جانے کتنے لوگ اسے اسی طرح دیکھ چکے ہیں۔''

کوئن میری میں اس قسم کے نہ جانے کتنے واقعات پیش آیا کرتے ہیں۔ نہ جانے کتنی روحیں بھٹکتی پھر رہی ہیں اور ابھی تک سائنس ان سپرنیچرل باتوں کے جواب نہیں دے پائی ہے کہ آخر ایسا کیوں ہوا کرتا ہے؟

ایسٹرن اسٹیٹ جیل

یہ جیل فلاڈیلفیا پنسلوانیا میں واقع ہے۔ اس مہیب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آسیبوں کا مسکن ایسٹرن اسٹیٹ جیل

عمارت کی تعمیر 1829ء میں مکمل ہوئی تھی۔ گوتھک طرز کی اس عمارت کو دیکھتے ہی ایک عجیب سے خوف کا احساس ہونے لگتا ہے۔

نہ جانے اس عمارت میں کیسے کیسے لوگوں کو رکھا گیا ہوگا۔ خونی، مجرم، درندہ صفت لوگ۔ ان کے بھیانک اثرات آج بھی اس عمارت کے در و دیوار میں محفوظ ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ اس عمارت میں صرف تین سو قیدیوں کی گنجائش تھی لیکن دو ہزار کے قریب قیدی ٹھونس دیے گئے تھے جو آپس میں دنگا فساد کیا کرتے اور کئی نے اپنے ساتھیوں کا خون بھی کر دیا تھا۔

اس عمارت میں بھوتوں کی موجودگی کی داستان 1929ء سے مشہور ہوئی۔ جب ال کیپون نام کے ایک مجرم کو اس عمارت میں قید کیا گیا۔

اس کا جرم معمولی نوعیت کا تھا اسی لیے اسے صرف چھ مہینوں کی سزا سنائی گئی تھی لیکن یہ چھ مہینے اس کے لیے عذاب بن کر رہ گئے تھے۔

پہلی ہی رات اس کی کوٹھری میں ایک ہیولا آ کر کھڑا ہوگیا۔ ال کیپون اس وقت لیٹا ہوا تھا۔ اس ہیولے نے ال کیپون کی کمر پر ایک زوردار لات رسید کر دی۔

ال کیپون نے اس ٹھوکر کی چوٹ کو محسوس کیا تھا۔ وہ غصے میں گالیاں دیتے ہوئے اس ہیولے کی طرف جھپٹا لیکن وہ ہیولا دیوار میں گھس کر غائب ہوگیا تھا جیسے اسے دیوار نے نگل لیا ہو۔

ال کیپون انتہائی خوف زدہ ہوگیا اور سکتے کے عالم میں یہ سب دیکھتا رہ گیا۔ اس کے خوف کا یہ عالم تھا کہ اس نے زور زور سے چلّانا شروع کر دیا۔

جب پہرے دار آئے تو اس نے پہرے داروں کو یہ کہانی سنا دی۔ کسی نے اس کی بات کا یقین نہیں کیا تھا۔

دوسرے دن ال کیپون کے ساتھ پھر یہی ہوا۔ اس بار اس ہیولے نے نہ صرف اسے زوردار لات رسید کی تھی بلکہ اپنی کھڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بولا تھا ”میں تیرے پیچھے پڑ گیا ہوں، تجھے کہیں چین نہیں لینے دوں گا۔“

بے پناہ خوف نے ال کیپون کی حالت غیر کر دی۔ اس نے اس ہیولے کی آواز کو پہچان لیا تھا۔ یہ اس کے ایک جاننے والے کی آواز تھی۔ اس کا نام کلارک تھا۔

تیسری بار کلارک کے ہیولے نے اسے اس وقت ٹھوکر ماری جب وہ بے خبر سو رہا تھا۔ اس ٹھوکر نے اسے بوکھلا کر اُٹھا دیا۔ کلارک کا ہیولا اس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ ہنس رہا تھا اور اس کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

”خدا کے لیے میرا پیچھا چھوڑ دو۔“ ال کیپون نے اس کے آگے ہاتھ جوڑ لیے۔

کلارک کا ہیولا ہنستے ہوئے دیوار میں گھس کر غائب ہوگیا۔ اس کے بعد اس ہیولے نے دن اور رات میں کئی کئی بار ال کیپون پر حملے شروع کر دیے۔

ال کیپون نفسیاتی مریض ہو کر رہ گیا تھا۔ اس کا کھانا پینا ختم ہوگیا تھا۔ وہ ہر وقت کلارک کے حملے کے خوف سے پریشان رہتا۔

اس کی حالت دن بہ دن خراب ہوتی جا رہی تھی۔ بلآخر اس نے وارڈن کے پاس جا کر اس سے مدد مانگ لی۔

”خدا کے لیے اس کلارک کی روح سے میری جان چھڑوا دیں۔ وہ مجھے ڈرا ڈرا کر مار دے گا۔“

”لیکن کیوں...... کلارک کی روح تمہارے پیچھے کیوں پڑی ہوئی ہے؟“

”اس لیے کہ میں نے ہی کلارک کا خون کیا تھا۔“ ال کیپون نے اپنے جرم کا اعتراف کر لیا۔

یہ بہت زبردست انکشاف تھا۔

کلارک کا قتل پولیس والوں کے لیے ایک معمّا بن کر رہ گیا تھا اور اب اچانک کلارک کا قاتل خود اپنے قاتل ہونے کا اعتراف کر رہا تھا۔

جب کڑیاں ملائی گئیں تو ال کیپون کا بیان درست ثابت ہوا۔ جیل کی اس عمارت میں کسی بھوت کے دکھائی دینے کا یہ پہلا واقعہ تھا، اس کے بعد تو یہ سلسلہ شروع ہی ہوگیا۔

ایسا لگتا تھا جیسے اس عمارت میں بھوتوں نے اپنا ٹھکانا ہی بنا لیا ہو۔ آئے دن کوئی نہ کوئی واردات ہونے لگی تھی۔

کچھ عرصے کے لیے اس عمارت کو بند کر دیا گیا تھا لیکن سیاحوں کے لیے اب دوبارہ کھول دیا گیا ہے۔ یہ عمارت بھوتوں کو دیکھنے کے شوقین اور بھوتوں کے شکاریوں کے لیے بہت دلچسپی رکھتی ہے۔

ویورلے ھل زسینی ٹوریم

کنی ٹکی میں اس عمارت کی تعمیر 1910ء میں ہوئی تھی۔ اسی زمانے میں یہ لکڑی کی بڑی سی عمارت تھی۔ بعد میں اس کو پختہ تعمیر کر دیا گیا تھا۔

اسی زمانے میں ٹی بی ایک خطرناک بیماری تھی۔ لاکھوں افراد اس کا شکار ہو کر مر چکے تھے۔ اس لیے سینی ٹوریم بنایا گیا تھا۔ اس کے باوجود کہا جاتا ہے کہ اس عمارت میں 63 ہزار افراد کی اموات ہو چکی تھیں۔

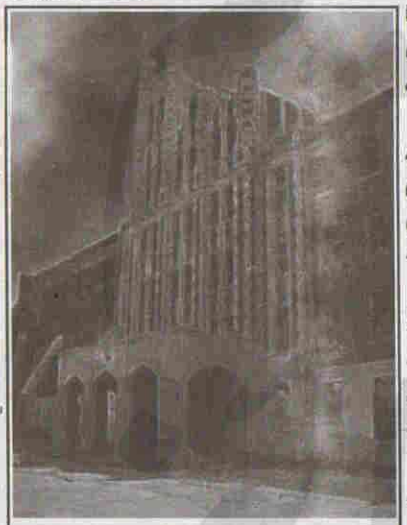

آسیب زدہ سینی ٹوریم

یہ بہت بڑی تعداد ہے اور لطف یہ ہے کہ اسی سینی ٹوریم میں اتنی ہی تعداد میں بھوت دکھائی دیا کرتے ہیں، یعنی ہزاروں کی تعداد میں۔

اسی قسم کے واقعات اور مقامات پر تحقیق کرنے والے کیتھاچج راڈ ٹیلر نے اس عمارت کے بارے میں بہت تفصیل سے لکھا ہے۔

اس کی ریسرچ سیکڑوں افراد کے انٹرویوز پر مشتمل ہے اور ان سبھوں نے اس عمارت میں ہزاروں سایوں اور بھوتوں کو چلتے پھرتے ہوئے دیکھا ہے۔

آج کل یہ عمارت ویران پڑی ہوئی ہے۔ لوگ اس کی طرف سے گزرتے ہوئے کترایا کرتے ہیں۔ ☠☠☠

وھیلے ھاؤس، کیلی فورنیا

کہا جاتا ہے کہ یہ مکان پورے امریکا میں سب سے زیادہ آسیب زدہ ہے۔ اس کی تعمیر 1857ء میں ہوئی تھی۔ اسے تھامس وہیلے نے بنوایا تھا۔

بنوانے کے بعد ہی اس مکان میں پُراسرار واقعات شروع ہوگئے۔ سب سے پہلے خود تھامس وہیل کی بیٹی ایک پُراسرار حادثے کا شکار ہو کر مر گئی۔ اس کے بعد اس کے کئی ملازمین مختلف اسباب کی بنا پر مرتے رہے۔ کوئی سیڑھیوں سے گر کر مر گیا، کسی کا خون ہوگیا، کسی کے ساتھ کچھ اور ہوا۔

ان واقعات کے رونما ہونے کے بعد تھامس وہیلے نے وہ مکان چھوڑ دیا۔ اس نے وہ مکان کم داموں کسی اور کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا۔

لیکن نئے مالک مکان کے ساتھ بھی یہی سب کچھ ہوا۔ اور وہ مکان آسیب زدہ مشہور ہوتا چلا گیا۔ سب سے پہلے اس مکان میں تھامس کی بیٹی کی روح بھی بھٹکتی ہوئی دیکھی گئی۔

مکان خالی پڑا تھا۔ اس کے لان میں گھاس اور خود رو پودے نمودار ہوگئے تھے۔ اس کے برابر والے ایک پڑوسی نے سترہ اٹھارہ برس کی ایک لڑکی کو اس اُجاڑ لان میں ٹہلتے ہوئے اور کچھ گاتے ہوئے دیکھ لیا۔

پڑوسی کا بیان ہے کہ نہ جانے کیوں اس لڑکی کو دیکھنے کے بعد میں خوف زدہ ہوگیا تھا۔ حالانکہ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ کون ہے؟ بہ ظاہر وہ ایک خوبصورت لڑکی تھی جس طرح عام لڑکیاں ہوا کرتی ہیں۔ اس کی کوئی بات آج کی لڑکیوں سے مختلف نہیں تھی۔

سوائے اس کے کہ اس کے جسم پر جو لباس تھا، وہ آج کے زمانے کا نہیں تھا۔ اس کے باوجود میں نے اس پر زیادہ دھیان نہیں دیا۔

لیکن مجھے خوف اس وقت محسوس ہوا جب وہ لڑکی لان سے ہوتی ہوئی بند دروازے کے پاس پہنچی اور دروازہ کھولے بغیر غائب ہوگئی۔

پڑوسی کا یہ کہنا ہے، وہ لڑکی دروازہ کھول کر اندر نہیں گئی تھی بلکہ وہ اچانک ہی غائب ہوگئی تھی۔ اس دن کے بعد بھی وہ لڑکی اس شخص کو کئی بار دکھائی دی۔

بات صرف اس لڑکی پر ہی ختم نہیں ہوئی تھی بلکہ اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مکان میں بہت سے خاکے اور ہیولے بھٹکتے ہوئے دکھائی دیتے رہے۔ بند مکان سے پیانو بجنے اور گانا گانے کی آوازیں آتی رہیں۔

اور لوگوں نے جان لیا کہ یہ ایک آسیب زدہ مکان ہے۔ وہ مکان ابھی تک اسی طرح غیر آباد پڑا ہوا ہے اور لوگ اس طرف سے گزرتے ہوئے بھی کترایا کرتے ہیں۔

اسی زمانے میں یانکی نام کا ایک چور ہوا کرتا تھا۔ اس نے اور بھی کئی جرائم کیے تھے۔ تھامس کے زمانے میں یانکی نے کسی جگہ واردات کی۔ لوگوں نے اس کا تعاقب شروع کردیا۔ وہ پناہ لینے کے لیے اس مکان میں داخل ہوگیا۔

لوگ اتنے بپھرے ہوئے تھے کہ وہ اس مکان میں گھس کر یانکی کو کھینچتے ہوئے باہر لے آئے اور تشدد کرکے اسے ہلاک کردیا۔

اس کے بعد وہاں یانکی کا بھوت بھی بھٹکتا ہوا دکھائی دیا کرتا ہے۔

☠☠☠

ریان ہام ہال

(نارک فوک، انگلینڈ)

یہ بھی ایک قدیم عمارت ہے اور اس عمارت کے حوالے سے کئی خوفناک داستانیں وابستہ ہیں۔ اس عمارت کو براؤن لیڈی کی روح کی وجہ سے شہرت حاصل ہے۔

براؤن لیڈی اس کا نام نہیں تھا۔ نام تو کچھ اور تھا لیکن اسے براؤن رنگ پسند تھا اس لیے لوگ اسے براؤن لیڈی کہا کرتے تھے۔

براؤن لیڈی ایک دل پھینک قسم کی عورت تھی۔ اس نے نہ جانے کتنوں کو بے وقوف بنا رکھا تھا۔ آخر ایک دن جب لوگوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا تو براؤن لیڈی کو اس کے کرتوتوں کی سزا سنادی گئی۔

براؤن لیڈی کو اس مکان سے گرفتار کرکے موت کی سزا دی گئی تھی۔ اس کے بعد سے براؤن لیڈی کی روح اس مکان میں بھٹکتی دکھائی دیتی ہے۔

اس روح یا بھوت کے ساتھ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ دوبار اس کی تصویریں بھی اُتاری گئی ہیں۔ ان تصویروں کا ریکارڈ بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

اس قسم کے واقعات صرف یورپ اور امریکا ہی تک محدود نہیں ہیں بلکہ ایسے واقعات دنیا کے ہر حصے میں رونما ہوتے ہیں۔ ایسے آسیب زدہ مکانات دنیا کے ہر شہر، ہر قصبے میں پائے جاتے ہیں۔

خود ہمارے ملک میں بھی ایسے مکانات کی کمی نہیں ہے۔ وہ مکانات جنہیں آسیب زدہ سمجھا جاتا ہے۔ جیسے پاکستان کے علاقے کالا باغ میں ایک ایسا مقام ہے جہاں ایک موٹی عورت، رات کے وقت چہل قدمی کرتے ہوئے دکھائی دیتی ہے۔

دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ اس کا چہرہ انتہائی بھیانک ہے اور وہ اکیلے انسان پر حملہ بھی کردیتی ہے۔ حملہ کرتے وقت وہ ایسی آوازیں نکالتی ہے کہ جن کو سن کر ہی دہشت طاری ہوجاتی ہے۔

زخمی ہونے والوں کا بیان ہے کہ وہ عورت کسی بھیڑیے کی طرح غرایا کرتی ہے۔ کئی عامل اسے زیر کرنے کی کوشش میں خود بھی زخمی ہوچکے ہیں۔

اسی طرح کراچی کا ایک علاقہ ہے، پی ای سی ایچ ایس، اس کے بلاک 6 میں کبھی کبھی ایسی پُراسراری روشنی رات کے وقت دکھائی دیتی ہے۔ اس روشنی کے نظر آنے کے کچھ دیر بعد ایک ایسی لڑکی دکھائی دیتی ہے جس کے جسم پر زرد رنگ کا لباس ہوتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اسی جگہ بہت پہلے ایک لڑکی کو اغوا کرکے لایا گیا تھا۔

پہلے تو اس کے ساتھ بدسلوکی کی گئی پھر اس کا گلا گھونٹ کر ماردیا گیا اور اس کی بے چین روح آج تک بھٹک رہی ہے شاید انصاف کے لیے۔

لاہور کے قریب واہگہ کے پاس دیال نام کے ایک گاؤں کے ایک مکان کا واقعہ بہت مشہور ہے۔ اس مکان میں یکے بعد دیگرے پانچ آدمیوں کو پُراسرار انداز سے ہلاک کردیا گیا تھا۔

واہگہ پولیس کا کہنا ہے کہ وہ مکان آسیب زدہ ہے۔ اس میں مرنے والے صغرا بی بی، سعد، منظور، شاہین اور بینا تھے۔

اب وہ مکان بند کردیا گیا ہے۔

یعنی ایسے واقعات کہیں بھی اور کسی بھی جگہ ہوسکتے ہیں اور ہوتے رہتے ہیں۔

کیا ہماری حیرت کے لیے یہ کافی نہیں؟

☠

فلمی الف لیلہ

علی سفیان آفاقی کی یادداشتیں

یہ اجنبی سی منزلیں اور رفتگاں کی یاد
تنہائیوں کا زہر ہے اور ہم ہیں دوستو!
آنکھوں میں اڑ رہی ہے لٹی محفلوں کی دھول
عبرت سرائے دہر ہے اور ہم ہیں دوستو!

قسط 204

خوف اور ڈر انسان کو خوف زدہ اور پریشان تو کرتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی بیک وقت انہیں تفریح بھی فراہم کرتا ہے۔ مثال کے طور پر بچوں ہی کو دیکھ لیجیے۔ بچے ڈراؤنی کہانیاں سن کر اور ڈراؤنی فلمیں دیکھ کر ڈرتے بھی ہیں لیکن ان سے لطف اندوز بھی ہوتے ہیں۔ راتوں کو وہ خواب میں ڈرتے ہیں۔ اندھیرے کمروں میں جاتے ہوئے خوف کھاتے ہیں لیکن اس کے باوجود ڈراؤنی کہانیاں سننے اور ڈراؤنی فلمیں دیکھنے کے شوقین بھی ہوتے ہیں۔ دراصل یہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

انسان کی جبلت میں شامل ہے۔ چھوٹا ہو یا بڑا، سبھی اس کے تابع ہیں۔

جب ہالی وڈ اور پھر ہندوستان میں فلمی صنعت کا قیام عمل میں آیا تو دیگر موضوعات کے علاوہ ڈراؤنی فلمیں بھی بنائی گئیں اور بے حد پسند کی گئیں۔ بعض لوگ پُراسرار فلموں کو ڈراؤنی فلموں کے ساتھ ... کرتے ہیں جو کہ صحیح نہیں ہے۔ مثال کے طور پر کمال امروہوی کی فلم ایک پُراسرار فلم تھی۔ فلم دیکھنے والوں کو بعض حصے دیکھ کر جسم میں جھرجھری بھی محسوس ہوتی تھی لیکن اس کو ڈراؤنی فلم کہنا درست نہیں ہے۔ البتہ محل میں اور ایسی ہی دوسری فلموں میں پس منظر موسیقی کی مدد سے خوف کی فضا پیدا کردی گئی تھی لیکن کچھ فلمیں ایسی بھی تھیں جنہیں ہم خالص ڈراؤنی فلمیں کہہ سکتے ہیں۔

فلم ''محل'' 1949ء میں نمائش کے لیے پیش کی گئی تھی۔ اس میں اشوک کمار اور مدھو بالا نے مرکزی کردار ادا کیے تھے۔ فلم کا اسکرین پلے اور ہدایت کاری بھی بہت اچھی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس فلم کو بہت پسند کیا گیا تھا اور اس کو ڈراؤنی فلم قرار دیا گیا تھا۔

ایک فلم بی آر چوپڑا نے ''افسانہ'' کے نام سے بنائی تھی۔ یہ بھی محل کے انداز کی فلم تھی اور اس میں بھی ہیرو کا کردار اشوک کمار نے ادا کیا تھا لیکن یہ فلم بہت زیادہ مقبولیت نہ حاصل کرسکی۔ اس فلم کو ہندو عقیدے ''آواگون'' کے تحت بنایا گیا تھا جس کے تحت دنیا سے جانے والا انسان دوبارہ اسی صورت شکل کے ساتھ دنیا میں آتا ہے۔ یہ ایک معیاری فلم تھی لیکن موسیقی کمزور ہونے کی وجہ سے زیادہ پسند نہیں کی گئی۔

مستقبل قریب میں ہندوستان (ہالی ووڈ) میں جو دوسری معروف ڈراؤنی فلمیں بنائی گئیں۔ ان میں یہ فلمیں قابلِ ذکر ہیں۔

پُرانا مندر، ویرانہ، دو گز زمین کے نیچے، دشت، پُرانی حویلی، بند دروازہ اور جانی دشمن۔ یہ فلم 1979ء میں ریلیز ہوئی تھی اور بہت کامیاب رہی تھی۔ انڈیا میں فلم انڈسٹری کے قیام کے بعد تاریخی، رومانی اور میوزیکل فلمیں بنائی گئیں۔ جادو کی فلمیں بھی بنائی جاتی رہیں لیکن انہیں ڈراؤنی فلم نہیں کہا جاسکتا۔ اس اعتبار سے ہندوستان کی پہلی ڈراؤنی فلم ''محل'' کو قرار دیا جاتا ہے جس کے بارے میں پہلے بھی لکھا جاچکا ہے۔ اس کی کہانی اور پیشکش کی خوبی یہ تھی کہ کافی دیر تک فلم کے ہیرو اور فلم بین اس کو ایک پُراسرار فلم ہی کہتے رہے جب تک کہ یہ راز ہدایت کار نے بیک وقت ہیرو اور فلم دیکھنے والوں پر خود ظاہر نہیں کیا۔

''محل'' 1949ء میں نمائش کے لیے پیش کی گئی تھی۔ فلم ''گمنام'' بھی ایک پراسرار جادوئی فلم تھی۔ 1962ء میں ہمینت کمار کی فلم ''بیس سال بعد'' ریلیز ہوئی تھی، یہ بھی ایک سپرہٹ فلم تھی۔ اس فلم کی کامیابی کے بعد ہندوستان میں ڈراؤنی فلموں کا دور شروع ہوگیا جن میں معیاری اور قابل ذکر فلموں کی تعداد بہت کم ہے۔ گمنام اور بیس سال بعد ایسی فلمیں تھیں جن میں ماورائی قوتوں کا تذکرہ تھا لیکن یہ ڈراؤنی فلمیں کہلائیں۔

1970ء کی دہائی میں ایک ڈراؤنی فلم ''دو گز زمین کے نیچے'' ریلیز ہوئی۔ یہ فلم رمزے برادرز نے بنائی تھی اور کامیاب بھی ہوئی تھی جس کے بعد کئی اور ڈراؤنی فلمیں بنائی گئیں۔ ان تمام فلموں کی کہانیاں بیان کرنا بہت تفصیل طلب کام ہے جس کے لیے ایک علیحدہ دفتر درکار ہے۔ 1976ء میں راجکمار کوہلی کی فلم ''ناگن'' کی نمائش ہوئی، یہ فلم خیالی اور فرضی داستان پر مشتمل تھی جس میں خوف کا عنصر بھی شامل تھا۔ اس فلم کی کامیابی سے متاثر ہوکر راجکمار کوہلی نے فلم ''جانی دشمن'' بنائی جو صحیح معنوں میں ایک ڈراؤنی فلم تھی بلکہ اس کو ہندوستانی فلمی صنعت کی سب سے زیادہ ڈراؤنی فلم کہا جاتا ہے۔ اس سے زیادہ ڈراؤنی فلم بالی ووڈ میں نہیں بنائی گئی حالانکہ گزشتہ دس بارہ سالوں میں بالی ووڈ میں کئی ڈراؤنی فلمیں بنائی گئی ہیں۔ ایک فلم ''ہوا'' تھی جس میں جو نے مرکزی کردار ادا کیا تھا۔ اس فلم میں جو دو بچیوں کے ساتھ ایک سنسان مقام پر کسی مرد کے بغیر رہتی ہے۔ اس گھر میں کسی آسیب یا بدروح کا سایہ ہے۔ یہ بدروح جو پر عاشق ہوجاتی ہے اور اس کو ہر طرح تنگ کرتی ہے۔ اس فلم کی کہانی میں جنس کا عنصر بھی شامل تھا اور ایسے مناظر بھی پیش کیے گئے تھے جو ڈر کے علاوہ جذباتی ہیجان بھی پیدا کرتے تھے مثلاً ایک منظر میں جب جو غسل کے لیے غسل خانے میں جاتی ہے تو دروازہ خود بہ خود مقفل ہوجاتا ہے۔ اس کے بعد ایک اَن دیکھی طاقت اور جو کے درمیان کشمکش دکھائی گئی ہے لیکن بالآخر جو اس سے ہار مان لیتی ہے۔ ایک اور منظر میں جب رات کو جو اپنے بیڈ روم میں تنہا سو رہی ہے تو یہ آسیبی قوت اس کو اپنی گرفت میں کرلیتی ہے۔ یہ ایک ایکس فلم جیسا منظر تھا۔ حیرت ہے کہ سنسر بورڈ نے اس کو پاس کیسے کردیا؟

ان تمام حالات کے باوجود جو گھر کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوتی اور نہ ہی خوف زدہ ہوتی ہے۔ آخر کار ایک عامل آکر

آسیب پر قابو پانے کی کوشش کرتا ہے جو ایسی خوفناک طوفانی ہوا چلا دیتی ہے کہ گھر کا سارا سامان تیز ہوا کے ساتھ گھر سے باہر چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ جو کی دونوں بچیاں بھی روکنے کی کوشش کے باوجود ہوا کے ساتھ اڑ کر باہر غائب ہوجاتی ہیں۔ جو بڑی مشکل سے دروازے کو پکڑ کر خود کو ہوا کے ساتھ اڑنے سے روک لیتی ہے۔ آخر میں عامل بچیوں کو دوبارہ حاصل کرلیتا ہے اور بدروح جل کر راکھ ہوجاتی ہے۔ یہ فلم واقعی ایک ڈراؤنی فلم تھی جس میں ہدایت کار نے جنس کی چاشنی بھی شامل کردی تھی۔ جو نے اس فلم میں بہت اچھی اداکاری کی تھی۔

بالی ووڈ میں چند اور کامیاب ڈراؤنی فلمیں بھی بنائی گئی تھیں جن میں دروازہ (1978) جادو ٹونا (1977) اور ''گہرائی'' شامل ہیں۔ گہرائی ہالی ووڈ کی مشہور ڈراؤنی فلم Exoscist سے متاثر ہوکر بنائی گئی تھی جس میں ایک کم عمر بچی آسیبی طاقتوں کے شکنجے میں پھنس جاتی ہے۔ ہالی ووڈ میں اس فلم کے خلاف کافی شور مچایا گیا تھا مگر یہ بہت کامیاب فلم تھی۔ اس کے ہندوستانی ایڈیشن گہرائی میں کمسن لڑکی کا مرکزی کردار پدمنی کولھاپوری نے کیا تھا۔ ایک اور ڈراؤنی فلم ''ریڈ روز'' میں راجیش کھنہ نے ایک نفسیاتی مریض کا کردار کیا تھا۔

ڈراؤنی فلمیں جو بالی ووڈ میں بنائی گئیں، ان میں گیسٹ ہاؤس، دروازہ، اور کون؟ اور ثبوت قابل ذکر ہیں۔

ڈراؤنی فلموں پر لاگت کم آتی تھی اور ہٹ ہونے کی صورت میں یہ بہت زیادہ منافع بخش ہوتی تھیں اس لیے ہندوستان میں کئی فلم سازوں نے ڈراؤنی فلمیں بنانے کی طرف توجہ مبذول کرادی۔ لیکن جب زیادہ تر فلم سازوں نے ایسی فلمیں بنانی شروع کیں تو ان کا معیار گر گیا۔ 1980ء کی دہائی میں پُرانا مندر، سامری، ویرانہ، تہ خانہ، ڈاک بنگلا، شیطانی علاقہ اور بند دروازہ بنائی گئیں۔ یہ کم لاگت کی فلمیں بھی کامیاب ہوئیں۔ ان فلموں کی کامیابی کا ایک سبب یہ تھا کہ ان میں سیکس اور آسیب کے مناظر زیادہ تھے جو عام فلم بینوں کو پسند آتے تھے۔ اس دور کی ڈراؤنی فلموں میں جن اداکاروں نے مقبولیت حاصل کی ان میں دیپک پراشر، ارونا ایرانی، دلیپ دھون، راکیش روشن، جاوید خان وغیرہ نے زیادہ مقبولیت حاصل کی۔

ہالی ووڈ میں ڈراؤنی فلموں کا آغاز 1931ء میں ہوا تھا جب دو انتہائی ڈراؤنی فلمیں بنائی گئی تھیں۔ ان میں سے ایک کا نام ''ڈریکولا'' اور دوسری کا نام ''فرینکنسٹائن'' تھا۔ ان دونوں کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی تھی۔ حالانکہ کمزور دل لوگوں نے یہ فلمیں نہیں دیکھیں۔

ماہر نفسیات کا کہنا ہے کہ خوف ایک قدرتی انسانی جذبہ ہے جو ہر انسان کے اندر موجود ہوتا ہے۔ بعض لوگ کم ڈرتے ہیں اور بعض بہت زیادہ۔ ایسے لوگ بھی ہیں جو ڈرتے تو ہیں لیکن اپنے ڈر کا اظہار نہیں کرتے اور بظاہر خود کو نڈر اور بے خوف ظاہر کرتے رہتے ہیں۔ ڈراؤنی فلمیں انسانی جذبوں، چھپی ہوئی آرزوؤں اور ماورائی طاقتوں کے اشتراک پر مشتمل ہوتی ہیں۔ ان میں حقیقت سے زیادہ خیالی اور داستانی عنصر نمایاں ہوتا ہے۔ کچھ لوگ تھرلرز فلموں کو بھی ڈراؤنی فلموں کے ساتھ شامل کرلیتے ہیں حالانکہ ''تھرل'' خوف سے بالکل علیحدہ چیز ہے۔

جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے ''ڈراؤنی'' فلموں کی اصطلاح 1931ء میں مذکورہ بالا دو فلموں کی ریلیز کے بعد عام ہوگئی تھی۔ ان فلموں میں ہدایت کار اور مصنف خوابوں، انسانی ذہن کے گوشوں میں پوشیدہ جذبوں اور انجانے واقعات پیش کرتے ہیں۔ انسان کے اندر ڈر کا جو عنصر موجود ہے اس سے بھی فائدہ اُٹھایا جاتا ہے۔ ان فلموں میں نیکی اور بدی کا موازنہ پیش کیا جاتا ہے۔ انسان کا ہمیشہ سے یقین رہا ہے کہ دنیا میں کچھ ایسی طاقتیں بھی ہیں جو نظر نہیں آتیں اور جنہیں ماورائے حقیقت قرار دیا جاتا ہے۔ ان فلموں میں بھوت، آسیب، چڑیلیں، بلائیں اور بدروحیں دکھائی جاتی ہیں۔ شیطان نما انسان جو شیطانی قوتوں کے مالک ہوتے ہیں۔ آدم خور، ویران گھر، پوشیدہ طور پر قتل کرنے والے افراد، خوفناک جانور وغیرہ ان فلموں میں پیش کیے جاتے ہیں۔ اب یہ فلم بنانے والے پر منحصر ہے کہ وہ ان تمام چیزوں کے اشتراک سے اچھی فلم بناتا ہے یا بھونڈی۔ ڈراؤنی فلم بنانا بھی ایک فن ہے۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے۔ اگر ڈراؤنی فلم میں فن کاری کا عنصر موجود ہو تو یہ دیکھنے والے کو زیادہ متاثر کرتی ہے۔

ہالی ووڈ میں آغاز میں جو فلمیں بنائی گئیں ان میں بیشتر فلموں کی کہانیاں مشہور اور مقبول ناولوں سے اخذ کی گئی تھیں مثلاً ڈریکولا، فرینکنسٹائن، ڈاکٹر جیکل اور مسٹر ہائیڈ۔ یہ تمام فلمیں مشہور ناولوں سے اخذ کی گئی تھیں۔ ان میں بعض بے انتہا ڈراؤنی تھیں یہاں تک کہ بہادر سے بہادر لوگ بھی کئی روز تک ان فلموں کے خوف کے اثر سے باہر نہیں نکل سکتے تھے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گویا یہ ادب اور خوف کا مجموعہ تھیں۔ اسی لیے انہیں بہت زیادہ پسند کیا گیا اور آج بھی یہ فراموش نہیں کی جا سکی ہیں۔

بولتی فلموں سے پہلے بھی مختصر ڈراؤنی فلمیں بنائی جاتی تھیں لیکن کیونکہ ان میں مکالمے اور پس منظر موسیقی کی مدد نہیں لی جا سکتی تھی جس کی وجہ سے زیادہ موثر نہیں تھیں۔

1896ء میں فرانس میں ''شیطان کا گھر'' کے نام سے ایک فرانسیسی فلم بنائی گئی تھی جس کو یورپ کی پہلی ڈراؤنی فلم قرار دیا جاتا ہے۔ فرانس میں **1998**ء میں ''ناپاک روحوں کا غار'' کے نام سے بھی ایک فلم بنائی گئی تھی۔ جاپان میں **1998**ء میں دو ڈراؤنی فلمیں بنائی گئی تھیں۔ دوسری فلم کا نام ''غار کی نحوست'' تھا۔

1910ء میں ''فرینکنسٹائن'' نامی فلم ہالی ووڈ میں بنائی گئی تھی۔ اس فلم کا پرنٹ نایاب تھا لیکن **1933**ء میں اس کو تلاش کر کے دوبارہ بنایا گیا تھا۔ معروف ناول نگار وکٹر ہیوگو کے ناول پر مشتمل ''نوٹرے ڈیم آف پیرس'' بھی خاصی ڈراؤنی فلم تھی۔ اس کے بعد **1906**ء میں ''ہنچ بیک'' کے نام سے اسی موضوع کو فلمایا گیا۔ اسی سلسلے کی دو اور فلمیں ''لو آف ہنچ بیک'' اور ''پیرس کا نوٹرے ڈیم'' بھی ہیں۔ یاد ہوگا کہ پاکستان میں رنگیلا نے بھی اپنے دور عروج میں ''کبڑا عاشق'' کے نام سے یہی موضوع فلمایا تھا اور اس میں کبڑے عاشق کا کردار بذاتِ خود کیا تھا۔ یہ فلم رنگیلا کے زوال کا سبب بن گئی تھی کیونکہ فلم بین رنگیلا کو صرف مزاحیہ کرداروں میں دیکھنا پسند کرتے تھے۔ ہالی ووڈ میں بھی ''ہنچ بیک آف نوٹرے ڈیم'' کے نام سے ایک فلم بنائی گئی تھی جس میں کبڑے عاشق کا کردار انتھونی کوئن نے ادا کیا تھا۔

ڈراؤنی فلمیں بنتی رہیں مگر صحیح معنوں میں بڑے پیمانے پر معیاری اور انتہائی کامیاب ڈراؤنی فلمیں بنانے کا سہرا ہالی ووڈ کے فلم ساز ادارے یونیورسل پکچرز کے سر ہے۔ انہوں نے ''ڈریکولا'' کے نام سے ایک بہت موثر اور ڈراؤنی فلم بنائی تھی۔ کاؤنٹ آف ڈریکولا کی کہانی ہنگری کے ایک ڈیوک کے بارے میں ہے جو مرنے کے بعد بھی اپنے تابوت میں رات کو زندہ ہو جاتا تھا۔ وہ مختلف روپ بدل سکتا تھا۔ خصوصاً چمگادڑ بن کر وہ زیادہ خوف پھیلاتا تھا۔ وہ ایک بدروح بن چکا تھا جس کی دنیا میں موجودگی کا انحصار تازہ انسانی خون پر تھا۔ وہ رات کو اپنے تابوت سے باہر نکل کر چمگادڑ بن کر اپنے شکار کی تلاش میں گھومتا پھرتا تھا اور انسانی نرخرے پر منہ رکھ کر زندہ انسانوں کا خون پی جاتا تھا۔ خون پیتے وقت اس کے دو خوفناک دانت بھی نمودار ہو جاتے تھے۔ اس فلم کو ڈراؤنی فلموں میں نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ فلم سازوں نے اس فلم میں سیکس کا عنصر بھی شامل کر دیا تھا لیکن یہ حقیقت ہے کہ یہ فلم مضبوط دل لوگ ہی دیکھ سکتے تھے۔ اس کا ناول فلم کے مقابلے میں زیادہ ڈراؤنا تھا جس سے یہ کہانی اخذ کی گئی تھی۔ اس لحاظ سے ہدایت کار اور مصنف ناول کے ساتھ انصاف نہیں کر سکے۔

ڈراؤنی فلموں کا ایک اور سلسلہ وہ تھا جس میں مرکزی کردار آنکھوں سے اوجھل ہو کر نظر ہی نہیں آتا تھا۔ ایسی فلموں میں مزاح کا عنصر بھی شامل ہوتا تھا اور اس کو خالص ڈراؤنی فلم کہنا درست نہ ہوگا لیکن اس میں خوف کا عنصر بھی موجود تھا۔

''مونسٹر'' کے نام سے بھی ایک فلم بنائی گئی تھی جس کو کافی کامیابی حاصل ہوئی۔ جب ڈراؤنی فلموں کی تعداد میں اضافہ ہوا تو کئی اداکار ایسی ہی فلموں کے لیے وقف ہو گئے تھے اور یہی فلمیں ان کی پہچان بن گئی تھیں۔ بعض فلمیں مثلاً ڈریکولا، ڈاکٹر جیکل اینڈ مسٹر ہائیڈ اور فرینکنسٹائن بار بار بنائی گئیں اور کامیاب بھی ہوئیں۔

ایک فلم جو وارنر برادرز نے بنائی تھی، اس کا نام ''ویکس میوزیم (مومی عجائب گھر) تھا۔ یہ فلم بھی بہت کامیاب ہوئی تھی۔ یونیورسل کمپنی نے **1940**ء میں ''دی ولف مین'' نام کی فلم بنائی تھی۔ یہ بھی ایک کامیاب فلم تھی۔ ''کیٹ پیوپل'' اور ''باڈی نیچر'' بھی اسی سلسلے کی کامیاب فلمیں تھیں۔

1950ء کی دہائی میں ہدایت کار ہچکاک نے فلم ''سائیکو'' بنائی جسے انتہائی خوفناک فلم قرار دیا جاتا ہے۔ یہ فلم آرٹ کا بھی لاجواب نمونہ تھی۔ اب ٹیکنالوجی کافی ترقی کر چکی تھی اس لیے ڈراؤنی فلموں میں نئے نئے تجربات کیے گئے جو فلم بینوں کو بہت پسند آئے۔ باڈی اسنیچر کا حملہ، دی کنگ فرام این ادر ورلڈ اور ''ٹھنگر'' اس نوعیت کی کامیاب ترین فلمیں ہیں۔

1957ء میں ''دی انکریڈیبل شرنکنگ مین'' (سکڑتا ہوا آدمی) بنائی گئی۔ اس کی بنیاد بھی ایک ناول پر تھی۔ اس فلم میں ایٹمی جنگ کے بعد کی زندگی کا خیالی نقشہ پیش کیا گیا تھا۔ یہ ایک انتہائی ڈراؤنی فلم تھی جسے دیکھ کر ایٹمی جنگ سے نفرت اور انسان کے مستقبل کے بارے میں خطرات پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ ایک موثر اور اس اعتبار سے حقیقت سے قریب فلم تھی کہ دنیا جاپان میں ایٹمی جنگ کی ہولناک تباہ کاریاں دیکھ چکی

ہے، اب جبکہ پہلے سے بدرجہا زیادہ خطرناک ایٹم بم بنائے جا رہے ہیں، ایٹمی جنگ کے نتیجے میں تباہی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

1950-69ء میں ہالی ووڈ کی مشہور فلم ساز کمپنیوں نے متعدد ڈراؤنی فلمیں بنائیں جن میں دی کرس آف فرینکنسٹائن، ڈریکولا، دی ممی شامل ہیں۔ اداکار کرسٹوفر لی نے ڈراؤنی فلموں میں کام کر کے بہت شہرت حاصل کی۔ یہ وہی اداکار ہیں جنہیں پاکستان میں بنائی جانے والی قائداعظم کے بارے میں فلم ''جناح'' میں قائداعظم کا کردار دیا گیا تھا۔ ''ہاؤس آف ہارر'' (خوف کا گھر) بھی اسی زمانے میں بنائی جانے والی ڈراؤنی فلم ہے۔

اس کے بعد ہالی ووڈ میں ایک نئی طرز کی ڈراؤنی فلموں کا دور آیا۔ دی اینٹ (چیونٹیاں) انتہائی ڈراؤنی فلم تھی جس میں دکھایا گیا تھا کہ کیمیائی طریقوں سے چیونٹی اگر بڑی ہو کر ہاتھی کے برابر ہو جائے تو کتنی تباہی پھیلائے گی اور انسان کے لیے کس قدر خوف کی علامت بن جائے گی۔ اس سلسلے کی کئی اور فلمیں بھی بنائی گئی تھیں جن میں مختلف چھوٹی مخلوق سائز میں بڑی ہو جانے کے بعد انسانوں کے لیے کس قدر خوفناک ہو جاتی ہے۔ اسی سلسلے میں ایک فلم ''دی کانکررز'' (فاتح کیڑا) بھی تھی۔ اسی نوعیت کی ایک فلم ''دیم'' بھی تھی۔ اس فلم میں ایک کمسن بچی ایک کیڑے کو اتنا بڑا اور خوفناک ہوتا دیکھتی ہے کہ خوف سے اپنی قوت گویائی کھو دیتی ہے اور جب بھی خطرہ محسوس کرتی ہے تو اس کی زبان سے صرف ایک ہی لفظ نکلتا ہے ''دیم'' یعنی ''وہ۔''

ایک فلم ''دی نائٹ آف دی لیونگ ڈیڈ'' (زندہ لاشوں کی رات) بہت خوفناک فلم تھی جس نے کم لاگت ہونے کے باوجود بہت زیادہ منافع کمایا تھا۔ اسی سال میں فلم ''بلڈ فیسٹ'' (خون کی دعوت) اور ''ٹو تھاؤزینڈ مونیکاز'' بھی شامل ہیں۔ آخرالذکر فلم ایک بھوتوں کے قصبے کی کہانی تھی جہاں آدم خور رہتے تھے۔ یہ انتہائی ڈراؤنی فلم تھی۔

1970ء کی ڈراؤنی فلموں میں ''ایکزارسسٹ'' نے دنیا بھر میں ہلچل مچا دی تھی۔ اس فلم میں یہ دکھایا گیا ہے کہ ایک کمسن بچی کے جسم میں اگر بدروح داخل ہو جائے تو کیا ہوتا ہے۔ اس فلم کو دیکھ کر بہادر لوگوں کے رونگٹے بھی کھڑے ہو جاتے تھے۔ اس کے بعد اس نوعیت کی متعدد ڈراؤنی فلمیں بنائی گئیں۔

ایک فلم ''دی سینٹی نیل'' بھی تھی۔ اس فلم میں دکھایا گیا ہے کہ ایک فیشن ماڈل ایک نئے گھر میں رہائش اختیار کرتی ہے تو اس کو کیسے خوفناک واقعات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس فلم کی کاسٹ میں ایوا گارڈنر جیسی سپر اسٹار بھی شامل تھیں۔ جنہوں نے فیشن ماڈل کا مرکزی کردار ادا کیا تھا۔

1975ء میں ''دی جاز'' اور ''ا، اپ فرام دی ڈیتھس بڑے بجٹ کی فلمیں تھیں جنہوں نے دنیا بھر میں بہت زیادہ بزنس کیا۔

1990ء میں جو قابلِ ذکر ڈراؤنی فلمیں بنائی گئیں ان میں ''چائلڈز پلے، فرائی ڈے **13**، ہالوین، اے نائٹ آن ایلم اسٹریٹ اور سائلنس آف دی لیمبس بہت کامیاب فلمیں تھیں۔ کنیڈی سین بھی ایک خوفناک فلم تھی۔ ''انٹرویو ود ویمپائر'' بھی ایک مقبول فلم تھی جس میں چڑیلوں کی دنیا دکھائی گئی تھی۔ ''برین ڈی) 'مردہ دماغ) اور ڈیڈ الائیو (زندہ مردے) بھی کامیاب فلمیں تھیں۔ **1990**ء کی دہائی میں بہت سی ڈراؤنی فلمیں بنائی گئی تھیں۔

جیسے جیسے سائنسی ایجادات اور فلمی تکنیک میں بہتری پیدا ہوتی رہی، ڈراؤنی فلموں کا معیار بھی بلند ہو گیا۔ اب سائنس فکشن فلموں کے ذریعے فلم بینوں کو ڈرانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ فرانس کی فلم ''برادر ہڈ آف ولف'' (بھیڑیا کا بھائی) کافی کامیاب فلم تھی۔ دی ادرز (دوسرے) **2001**ء میں بنائی جانے والی ایسی فلم تھی جس میں نفسیات کی مدد لے کر فلم بینوں کو خوف زدہ کیا گیا تھا۔ ان ہی سالوں میں ''دی گرج'' (دشمن) ریٹرن آف دی لیونگ ڈیڈ'' (زندہ مردوں کی واپسی) شان آف دی ڈیڈ، سروائیول آف دی ڈیڈ، ڈائری آف دی ڈیڈ، لینڈ آف دی ڈیڈ (مردوں کی سرزمین) ہاؤس آف دی لیفٹ، ہل ہیو آئیز (پہاڑ کی آنکھیں) دی کلکٹر، دی ٹارچرڈ، سا (دیکھا تھا) اور ہوسٹل بھی معیاری ڈراؤنی فلمیں تھیں۔ ڈان آف دی ڈیڈ، بلیک کرسمس، ولف مین، ہاؤس آف ویکس کا بھی ڈراؤنی فلموں میں ہوتا ہے۔

گزشتہ کچھ عرصے سے ہالی ووڈ میں ڈراؤنی فلموں کا انداز تبدیل ہو گیا ہے۔ اب سائنس فکشن ٹائپ کی فلمیں بنائی جا رہی ہیں جن میں عجیب و غریب ہیبت ناک شکلوں کے جانور اور انوکھی مخلوق کے ذریعے خوف پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ بدقسمتی سے ہماری فلمی صنعت کو کبھی بھی ایسے آلات اور جدید سہولتیں فراہم نہیں کی گئیں جن کی مدد سے ہم اسپیشل ایفیکٹس کے ذریعے اس قسم کی فلمیں بنا سکیں۔ اس کے برعکس انڈیا میں نہ صرف روپے کی ریل پیل ہے بلکہ وہ جدید

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ترین ٹیکنالوجی بھی حاصل کر چکے ہیں جس کی وجہ سے ان کی ایکشن فلمیں اب ہالی وڈ کی ہم پلہ ہوگئی ہیں۔

☆☆☆

پاکستان میں اب ''سپر اسٹارز'' کا دور ختم ہوگیا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ جب فلمیں ہی نہ بنیں گی اور فلمی صنعت بھی بھوتوں کی بستی بن جائے گی تو پھر سپر اسٹارز کہاں سے آئیں گے؟ نئی نسل کے اداکاروں میں اب لے دے کر شان ہی رہ گئے ہیں۔ آپ انہیں اسٹار کہیں، سپر اسٹار کہیں جو بھی ہیں وہ اکیلی ذات ہیں۔ ان کے ہم عصر بھی ایک ایک کر کے رخصت ہوگئے۔ سچ تو یہ ہے کہ شاہد کے بعد کوئی اداکار ہماری فلمی صنعت ہیں ایسا نہیں آیا جس میں ''سپر اسٹار'' بننے کی صلاحیت ہو۔ شاہد اگر ''غیر نصابی'' سرگرمیوں پر زیادہ توجہ نہ دیتے اور اداکاری کو سنجیدگی سے اہمیت دیتے تو وہ اپنے دور میں ہی سپر اسٹار بن جاتے۔ ان کی فلم ''آنسو'' جب ریلیز ہوئی تھی تو ایک معتبر فلمی نقاد نے لکھا تھا کہ شاہد ایک ایسا اداکار ہے جس میں بڑا اداکار بننے کی تمام خوبیاں موجود ہیں۔

ایک اور نے لکھا ''شاہد نے پہلی ہی فلم میں اپنا قد اونچا کر کے ندیم کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا ہے۔''

شاہد کیوں سپر اسٹار نہ بنے، اس کی مختلف وجوہات ہیں جن سے سبھی واقف ہیں۔ دراصل ہمارے بعض اداکاروں نے تو جان بوجھ کر خودکشی کی ہے۔ اس سلسلے میں ایک لطیفہ یاد آ گیا۔

چھ سکھوں نے خودکشی کرنے کا فیصلہ کیا۔ ان سب کے دکھ مختلف تھے۔ کوئی روزگار کے ہاتھوں پریشان تھا تو کسی کا گھر والی نے جینا محال کر دیا تھا۔ کسی کو محبت میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا غرضیکہ سبھی زندگی سے اُکتائے ہوئے تھے۔

سب نے مل کر سوچا کہ خودکشی کرنے کا آسان اور کم سے کم تکلیف دہ طریقہ کیا ہوگا۔ فیصلہ ہوا کہ ریل کے نیچے لیٹ جائیں گے اور آسانی سے مر جائیں گے۔ اس نیک مقصد کے ساتھ وہ سب ریلوے اسٹیشن پہنچے۔ رات کا وقت تھا۔ چھوٹا سا ریلوے اسٹیشن تھا۔ مسافر بھی نہ تھے۔ یہ سب کے سب ریل کی پٹری پر جا کر لیٹ گئے۔ کافی دیر تک لیٹے رہے۔ (نوٹ: یہ داستان کئی سال پُرانی ہے۔ آج کی نہیں جبکہ سیکڑوں ٹرینیں منسوخ ہو جاتی ہیں اور بیس بیس گھنٹے لیٹ منزل پر پہنچتی ہیں)

یہ لوگ کافی دیر تک ٹرین کے انتظار میں لیٹے ایک دوسرے کو اپنے اپنے دکھ سناتے رہے۔ یکایک ریل کی پٹری میں لرزش پیدا ہوئی اور پھر گڑگڑاہٹ کی آواز آئی اور ساتھ ہی اعلان ہوا کہ ریل گاڑی نمبر ایک پلیٹ فارم پر آ رہی ہے۔

ٹرین آ گئی اور گزر گئی۔ معلوم ہوا کہ پانچ سکھ مسافر ٹرین سے کٹ کر مر گئے ہیں مگر ایک سردار جی پلیٹ فارم پر زندہ سلامت موجود ہیں۔ پولیس آئی اور تفتیش ہوئی۔ واحد زندہ مسافر سے پوچھا گیا کہ یہ پانچ سکھ کیسے مر گئے؟ یہ اتفاق تھا یا انہوں نے جان بوجھ کر خودکشی کی ہے؟''

سردار جی بولے ''تھانے دار صاحب، یہ سب لوگ خودکشی کرنے ہی آئے تھے مگر ٹرین کی آواز سن کر ان کا ارادہ بدل گیا تھا اس لیے یہ وہیں ریل کی پٹری پر لیٹے رہے۔''

''وہ کیوں لیٹے رہے اور تم کیسے زندہ رہ گئے؟''

''اجی ریلوے نے اعلان کیا تھا کہ ٹرین پلیٹ فارم پر آ رہی ہے۔ ان پانچوں نے سوچا کہ بس اب کوئی خطرہ نہیں ہے اس لیے وہیں لیٹے رہ گئے۔''

''کیا تمہارا خودکشی کرنے کا ارادہ نہیں تھا؟'' تھانے دار نے پوچھا۔

''اجی، میرا تو پکّا ارادہ تھا اس لیے جب اعلان ہوا کہ ریل گاڑی پلیٹ فارم نمبر ایک پر آ رہی ہے تو میں جھٹ سے اُٹھ کر پلیٹ فارم پر آ گیا مگر انجن ڈرائیور نے دھوکا دے دیا اور ٹرین پلیٹ فارم کے بجائے پٹری پر چڑھا دی۔''

ہمارے فلم ایکٹروں کے ساتھ بھی ایسا ہی حادثہ ہوا انہوں نے خودکشی کرنے کے ارادے سے اوٹ پٹانگ فلموں میں پیسے کی خاطر کام کرنا شروع کر دیا۔ اس طرح فلم بین ان سے اور ان کی فلموں سے بیزار ہو گئے اور وہ سب غائب ہو گئے حالانکہ انہوں نے فلم انڈسٹری کو مضبوط بنانے کے لیے ہی ہر قسم کی فضول فلم میں کام کیا تھا۔

شان نے خودکشی کا مصمم ارادہ کر لیا تھا جب وہ سلطان راہی مرحوم جیسے کرداروں میں آنے لگے لیکن درمیان میں انہوں نے چند اچھی فلموں میں بھی کام کر لیا اس لیے خودکشی کے ارادے کے باوجود بچ گئے۔

لیکن ایک زمانہ ایسا بھی تھا جب ہماری فلمی صنعت سپر اسٹارز سے جگمگا رہی تھی۔ سپر اسٹار وہ کہلاتا ہے جس کا نام اشتہار میں دیکھ کر فلم بین ضرور فلم دیکھنے کے لیے جاتے ہیں چاہے اس فلم کی رپورٹ بُری ہی کیوں نہ ہو۔ اگر فلم پسند آ جائے تو بہت زیادہ چلتی ہے اگر اچھی نہیں ہوتی تو کم از کم ایک بار پر ستار فلم ضرور دیکھتے ہیں۔ ایسے مقبول ہیرو ایک زمانے

میں پاکستان کی فلمی صنعت کو بھی میسر تھے۔ ایسے ہیرو دیر تک اسکرین پر حکمرانی کرتے تھے۔ اس زمانے میں پنجابی اور اردو فلموں کے ہیرو (اور دوسری کاسٹ بھی) عموماً الگ ہوا کرتی تھی لیکن سدھیر جیسے پنجابی فلموں کے ہیرو نے اردو کی کامیاب فلموں میں بھی بہت اچھی اداکاری کی۔ ان کے سوا یہ سعادت کسی اور پنجابی فلم کے ہیرو کو حاصل نہ ہو سکی۔

سلطان راہی پنجابی فلموں کے بے تاج حکمراں تھے۔ لیکن کسی نامور ہدایت کار نے انہیں اردو فلم کے لیے منتخب نہیں کیا حالانکہ یہ ہمیشہ ان کی خواہش رہی۔ جن چند اردو فلموں میں انہوں نے کام کیا وہ کامیاب نہ ہو سکیں اور نہ ہی ان کے کام کو سراہا گیا۔

اکمل بھی پنجابی فلموں کے بہت ہر دلعزیز ہیرو تھے۔ انہوں نے آغاز تو ایک اردو فلم میں مختصر کردار ادا کر کے کیا تھا لیکن شہرت انہیں پہلی پنجابی فلم ''جبرو'' سے ملی جس میں انہوں نے ڈاکو کا مرکزی کردار ادا کیا تھا۔ انہیں پنجابی فلموں کا دلیپ کمار کہا جاتا تھا جو اس زمانے میں بہت بڑا اعزاز تھا۔ انہوں نے خود بھی کبھی اردو فلموں میں کام کرنے کی خواہش ظاہر نہیں کی۔

کیفی کی چند پنجابی فلمیں بہت کامیاب ہوئی تھیں تو انہوں نے دلیپ کمار کو بھی چیلنج دے دیا تھا کہ میرے ساتھ کام کرو تو پتا چل جائے گا کہ بڑا اداکار کون ہے؟ یوسف خاں کا آغاز اردو فلموں سے ہوا تھا اور انہوں نے کئی کامیاب اردو فلموں میں کام کیا تھا مگر پھر وہ پنجابی فلموں کے ہو کر رہ گئے اور بہت نام کمایا۔

آیئے، جائزہ لیتے ہیں کہ پاکستانی فلمی صنعت کی مختصر زندگی میں کتنے سپر اسٹار آئے اور گئے اور یہ کون تھے؟

پاکستان کا پہلا سپر اسٹار ہونے کا فخر سنتوش کمار کو حاصل ہے۔ وہ بہت خوبرو، تعلیم یافتہ اور اچھے اداکار تھے۔ اسی لیے انہوں نے درپن، حبیب، اعجاز، یوسف خان، کمال وغیرہ کے ہوتے ہوئے بھی سپر اسٹار کا مقام حاصل کیا اور کافی عرصے تک قائم رکھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کی بیگم صبیحہ خانم کو پاکستان فلم انڈسٹری کی فرسٹ لیڈی ہونے کا اعزاز حاصل تھا جو کہ ان کے بعد کسی اور اداکارہ کے حصے میں نہیں آیا۔

سنتوش کمار جامہ زیب شخصیت کے مالک تھے۔ ہلکے پھلکے مزاحیہ کردار بہت خوبی سے کرتے تھے۔ رومانی مناظر بھی اچھے فلم بند کراتے تھے لیکن ڈرامائی کرداروں میں انہیں وہ کمال حاصل نہ تھا لیکن پھر بھی سچویشن کو نبھانا جانتے تھے۔ وہ رواں اور بے تکلف انداز میں مکالمے بولتے تھے۔ ان کی بول چال اور سگریٹ پینے کا مخصوص انداز تھا۔ ان کے خوبصورت چہرے پر سب سے زیادہ دلکش ان کی آنکھیں تھیں جنہیں وہ رومانی مناظر میں بہت کامیابی سے استعمال کرتے تھے۔ انہوں نے بہت سی سپر ہٹ فلموں میں اداکاری کی۔ انتظار، وعدہ، گھونگھٹ، سات لاکھ، دامن، موسیقار، حمیدہ، نائلہ، انجمن ان میں سے چند ہیں۔ انہوں نے چن وے اور مکھڑا، ناجی میں پنجابی ہیرو کا کردار بھی بخوبی نبھایا۔ پاکستان کی فلمی صنعت کی ترقی میں ان کا نمایاں ہاتھ ہے۔ انہوں نے فلم سازی اور ہدایت کاری بھی کی اور کامیاب رہے۔

ان ہی کے ہم عصر سدھیر زیادہ تر پنجابی فلموں میں کام کرتے تھے۔ ایکشن فلموں میں وہ بے حد پسند کیے جاتے تھے اس لیے جنگجو ہیرو کہلاتے تھے۔ ان کی اردو فلم ''باغی'' چین میں بھی ڈب کر کے ریلیز کی گئی تھی۔ پنجابی فلموں کے وہ سب سے بڑے سپر اسٹار تھے لیکن اردو فلموں میں بھی انہوں نے اپنی اداکاری کا لوہا منوایا تھا۔ کیکے والی، ماہی منڈا، ڈاجی، دلا بھٹی ان کی بے حد کامیاب پنجابی فلمیں تھیں اور انارکلی، آنکھ کا نشہ، جان بہار، ان داتا وغیرہ کامیاب اردو فلمیں تھیں۔ وہ دودھاری تلوار تھے۔ بہت غصہ ور اور غیرت مند تھے لیکن بہت اچھے انسان بھی تھے۔ ایک زمانے میں وہ اور سنتوش کمار پاکستانی فلموں کی سپر اسٹارز کی جوڑی کہلاتے تھے۔

ان دونوں کے عہد زوال میں اردو فلموں میں محمد علی، وحید مراد اور ندیم باری باری وار د ہوئے اور تینوں نے سپر اسٹارز کی حیثیت حاصل کی۔

محمد علی نے آغاز تو دنی کے کرداروں سے کیا تھا لیکن بعد میں بے حد کامیاب اور مقبول ہیرو بن گئے۔ وہ ہر طرح کے کرداروں کے ساتھ انصاف کرتے تھے۔ مکالموں کی ادائیگی اور چہرے کے تاثرات سے بہت زیادہ کام لیتے تھے۔ ڈرامائی مناظر میں وہ دیکھنے والوں پر سکتہ طاری کر دیتے تھے۔ رومانی، ایکشن اور ہلکے پھلکے کردار بھی بڑی خوبی سے نبھاتے تھے۔ وہ ایک قد آور، توانا، نہایت خوبصورت شخصیت کے مالک تھے۔ انہوں نے ہر طرح کے کردار بہت کامیابی سے ادا کیے اور ناموری حاصل کی۔ وہ ہر عمر کے فلم بینوں کے محبوب ہیرو تھے۔ ایک مرتبہ جب وہ شدید بیمار ہوئے تو گھر بیٹھی بزرگ خواتین نے بھی ان کی صحت یابی کے لیے دعائیں کیں۔ وہ نوجوانوں، درمیانی عمر اور بڑی عمر ہر طبقے کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مقبول اداکار تھے۔ بہت اچھے انسان بھی تھے۔ ہر قسم کے کرداروں کے ساتھ پورا پورا انصاف کرتے اور اپنے کرداروں میں جان ڈال دیتے تھے۔ کنیز، آگ کا دریا، وحشی، انسان اور آدمی، میرے ہم سفر، حیدر علی، صاعقہ، انصاف اور قانون، آگ، لوری ان کی چند کامیاب ترین فلمیں ہیں۔ انہوں نے جوانی میں بھی بڑی عمر کے کردار بہت خوبصورتی سے ادا کیے تھے۔ سنتوش صاحب کی طرح وہ بھی کیریکٹر ایکٹر کی حیثیت سے بھی مقبول اور کامیاب رہے۔

محمد علی اور وحید مراد تقریباً ایک ساتھ ہی 1963ء میں فلمی صنعت میں آئے تھے اور دونوں نے مختلف انداز کی اداکاری کے باعث سپر اسٹار بننے کا اعزاز حاصل کیا۔ وحید مراد گلیمر اور سادگی کا مجموعہ تھے۔ رومانی مناظر میں بے حد کامیاب تھے۔ وہ نوجوان نسل میں خصوصاً بے حد مقبول تھے۔ بے ساختہ اداکاری کے ساتھ ساتھ ڈانس کو پاکستانی فلموں میں متعارف اور مقبول کرانے میں بھی ان کا نمایاں ہاتھ رہا ہے۔ ان کی اداکاری تصنع سے پاک تھی مگر ان کے رقص میں بے حد دلکشی تھی۔ اگر انہیں پاکستان کا پہلا ڈانسنگ ہیرو کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ خوش لباس، خوش گفتار تھے۔ نوجوانوں میں چاکلیٹ ہیرو کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ان کے دیوانے تھے۔ نوجوان لڑکے ان کے بالوں، لباس اور چال ڈھال کی نقل کرنے کو سعادت خیال کرتے تھے۔ انہوں نے فلمی زندگی میں بے انتہا عروج دیکھا اور زوال سے بھی آشنا ہوئے۔ ان کی کامیاب فلموں میں ارمان، کنیز، ہیرا اور پتھر، عندلیب، دیور بھابی، دل میرا دھڑکن تیری، انجمن، عید مبارک، احسان اور تم سلامت رہو وغیرہ شامل ہیں۔ انہوں نے فلم سازی اور ہدایت کاری بھی کی، ان کے پرستار آج بھی ان کی یاد مناتے ہیں۔

ندیم نے مشرقی پاکستان کی فلم ''چکوری'' سے اردو فلموں میں اداکاری کا آغاز کیا اور راتوں رات سپر اسٹار بن گئے۔ پے در پے کامیابیوں نے قدم چومے۔ ہر قسم کے کرداروں میں کامیاب رہے اور عظیم ترین ہیرو کہلائے۔ چھوٹے صاحب، بازی، آئینہ، دہلیز، ہم دونوں، امبر، اناڑی، تلاش، پہچان، بندش، لازوال، دامن اور چنگاری، بہن بھائی ان کی چند کامیاب فلمیں ہیں۔

ندیم ایک نہایت خوشگوار طبیعت کے مالک اور اصولوں کے تحت زندگی گزارنے والے اداکار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک اپنے ہم عصروں کے رخصت ہوجانے کے باوجود کام کررہے ہیں اور ویسے ہی اسمارٹ اور چاق وچوبند ہیں جیسے ابتدا میں تھے۔

اکمل اداکار اجمل کے چھوٹے بھائی تھے۔ میک اپ مین سے ترقی کرکے اداکار اور پھر پنجابی فلموں کے مقبول سپر اسٹار بن گئے۔ ان کی شخصیت اور اداکاری کے انداز میں بہت جاذبیت تھی۔ ہر قسم کے کرداروں میں کامیاب تھے لیکن ایکشن ہیرو کے طور پر بے حد مقبول تھے۔ جوانی ہی میں وفات پاگئے اور پنجابی فلموں میں ایک خلا چھوڑ گئے جو سلطان راہی نے بعد میں پر کیا۔ ملنگی، روٹی، سورما، پیدا گیر، سوکن، جبرو ان کی چند کامیاب فلمیں ہیں۔ وہ مزاحیہ کردار بھی بہت مہارت سے نبھاتے تھے۔

پشتو فلم کے سپر اسٹار بدر منیر نے ایک معمولی اسٹوڈیو بوائے کی حیثیت سے فلمی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ چند اردو فلموں میں بھی اچھی اداکاری کی لیکن اصل شہرت انہیں پشتو فلموں میں مرکزی کردار ادا کرکے ملی۔ وہ برسہا برس پشتو فلموں پر حکمرانی کرتے رہے۔ مردانہ وجاہت کا نمونہ تھے۔ یوسف خاں شیر بانو، باغی، آدم خان درخانے، اوربل، خانہ بدوش وغیرہ ان کی کامیاب ترین فلمیں ہیں۔ انہوں نے اردو فلموں میں بھی معاون کردار بہت خوبی سے نبھائے۔ ان کی شخصیت اور اداکاری کا انداز منفرد تھا۔ پشتو فلموں کی مقبولیت میں ان کا نمایاں ہاتھ رہا ہے۔

سلطان راہی بڑی کوششوں کے بعد معمولی کردار حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ پنجابی فلم ''بشیرا'' نے انہیں راتوں رات اسٹار اور پھر آنے والی فلموں نے سپر اسٹار بنادیا۔ ایک زمانہ تھا جب وہ ہر پنجابی فلم کی ضرورت سمجھے جاتے تھے۔ 56 سال کی عمر میں بھی وہ روزِ اوّل کی طرح مقبول تھے۔ ان کے پرستار ان کے دیوانے تھے۔ بہت فیاض، نیک دل اور خدا ترس مذہبی انسان تھے۔ فلاحی اور دینی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ انہوں نے تقریباً ہر ہیروئن کے ساتھ ہیرو کا کردار ادا کیا۔ انہیں سدا بہار ہیرو کہا جاتا تھا۔ ان کی کامیاب فلموں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ فلموں کی تعداد کے اعتبار سے بھی ان کا نام گنیز بک آف ریکارڈز میں شامل ہونے کا مستحق ہے۔ مولا جٹ، شیر خان، بشیرا، چن وریام، شریف بدمعاش، سالا صاحب، قانون ان کی چند ناقابلِ فراموش فلمیں ہیں۔ وہ پنجابی فلم سازوں کی امداد کے لیے شب و روز کام کرتے تھے۔ پانچوں وقت کے

نمازی اور انتہائی دین دار اور مذہبی انسان تھے۔ اسلام آباد سے لاہور آتے ہوئے سڑک پر کار رکی تو کسی نے گولی کا نشانہ بنادیا۔ لاہور میں ان کے جنازے میں بلا مبالغہ لاکھوں افراد شامل تھے۔ وہ اپنی انسانی خوبیوں کے باعث ہر طبقے میں مقبول تھے۔ ان کے پُراسرار قتل کا راز آج تک سربستہ ہے۔ پاکستان کی پنجابی فلموں کی تاریخ میں ان کا نام ہمیشہ درخشاں رہے گا۔ وہ درحقیقت پنجابی فلموں کے سلطان تھے۔

☆☆☆

ہندوستان کی فلمی صنعت میں مختلف شعبوں میں مسلمانوں نے گراں قدر خدمات سرانجام دی ہیں۔ اداکاری، ہدایت کاری، فلم سازی، موسیقی، گلوکاری، نغمہ نگاری ہر شعبے میں آپ کو مسلمان نمایاں نظر آئیں گے جنہوں نے تاریخ ساز کارنامے سرانجام دیے اور ہر شعبے میں معراج کمال کو پہنچ گئے۔ یہ اور بات ہے کہ اب تعصب کا زہر اس میں بھی سرایت کرچکا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کے تذکرے کم سے کم ہوگئے ہیں اور انہیں قریب قریب بھلادیا گیا لیکن حقائق کو تو نہیں جھٹلایا جاسکتا۔ دلیپ کمار کی جگہ امیتابھ بچن کو ہندوستان کا عظیم ترین اداکار کا ڈھنڈورا پیٹنے سے دلیپ کمار کا قد چھوٹا اور امیتابھ کا قد لمبا نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح خواجہ احمد عباس، محبوب خاں کی ہدایت کاری اور نئی راہیں متعارف کرانے کی تاریخ کو تو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ بہرحال، یہ ایک علیٰحدہ داستان ہے۔

آج ایک ایسے شاعر کا تذکرہ کرنا مقصود ہے جس نے ادب میں بھی مقام حاصل کیا اور فلمی نغمہ نگار کی حیثیت سے بھی بہت ممتاز اور نمایاں ہیں۔ شکیل بدایونی کے نغمات قیامِ پاکستان سے پہلے سے ہندوستانی فلموں کی سجاوٹ ہیں۔ انہوں نے ہر قسم کی فلموں میں سچویشنز کے مطابق بہت اچھے نغمات لکھے جنہیں بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔

شکیل بدایونی نے زیادہ تر نغمات موسیقارِ اعظم نوشاد کے لیے لکھے ہیں۔ ان دونوں کا نام ایک دوسرے کے ساتھ لازم وملزوم ہوچکا ہے۔ نوشاد صاحب تو اب اس دنیا میں نہیں ہیں لیکن ان کا اور نوشاد کا نام فلمی موسیقی میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔

شکیل بدایونی بھی ایک مشاعرے میں کلام سناتے ہوئے فلم والوں کی نظروں میں آئے تھے۔ اس سے پہلے انہوں نے برصغیر کے اردو شعرا کے صفِ اوّل میں مقام حاصل کرلیا تھا۔ ان کے زمانے میں جوش ملیح آبادی، فیض، سردار جعفری، جگر مراد آبادی، فراق گورکھپوری، حفیظ جالندھری، مجاز جیسے نامور شعرا موجود تھے۔ انہوں نے ان سب سے فیض حاصل کیا لیکن حقیقت میں وہ جدید ترقی پسند شاعری کے کبھی حامی نہیں رہے۔ انہوں نے اپنے لیے جدید اور قدیم شاعری کے امتزاج سے ایک نئی راہ تلاش کی لیکن ان کی فلمی شاعری میں بھی تغزل اور کلاسیکی اردو شاعری کا انداز موجود رہا ہے۔ اپنے اسی انداز سے انہوں نے بہت جلد مقبولیت اور شہرت حاصل کرلی۔

آل انڈیا مشاعروں میں شریک ہوکر وہ پہلے ہی مشہور ہوچکے تھے۔ بمبئی کے ایک مشاعرے میں فلمی صنعت کے خوش ذوق حضرات بھی موجود تھے۔ فلم ساز وہدایت کار اے آر کاردار کو شاعری سے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے۔ بمبئی کے مشاعرے میں انہوں نے شکیل بدایونی کا کلام سنا تو بہت متاثر ہوئے۔ مشاعرہ ختم ہونے کے بعد انہوں نے شکیل بدایونی سے ملاقات کرکے انہیں فلمی نغمات لکھنے کی دعوت دی جو انہوں نے تھوڑے سے پس وپیش کے بعد منظور کرلی۔ ان دنوں شکیل بدایونی حکومتِ ہند کے محکمۂ سپلائی میں ملازم تھے جہاں دفتری پابندیوں سے وہ عاجز تھے۔ جب نغمات لکھنے کی پیشکش ہوئی تو انہوں نے صرف ایک شرط رکھی کہ ان کے فلمی گیتوں میں شاعری کے عنصر کو نظر انداز نہیں کیا جائے گا۔ انہوں نے فوری طور پر سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور 1946ء میں مستقل طور پر بمبئی میں آباد ہوگئے۔

بمبئی میں انہیں کافی جدوجہد کرنی پڑی کیونکہ مقابلہ سخت تھا۔ لیکن جب ان کی ملاقات موسیقار نوشاد سے ہوئی تو یہ ان کی زندگی میں ایک اہم موڑ ثابت ہوا، دونوں کے تعلقات مزاج کی یکسانیت کی وجہ سے بہت جلد دوستی میں تبدیل ہوگئے اور یہ دوستی ہمیشہ قائم رہی۔ دونوں نے مخلصانہ انداز میں دوستی نبھائی اور ایک دوسرے کے ساتھ فلمی موسیقی میں کام بھی کیا۔

نوشاد اس وقت ایک نامور موسیقار تھے۔ ان کے لیے شکیل نے پہلا نغمہ فلم ''درد'' کے لیے لکھا جو اے آر کاردار کی فلم تھی۔ اس فلم میں منور سلطانہ ہیروئن اور نصرت کاردار ہیرو تھے جو کاردار صاحب کے بھانجے بھی تھے۔ یہ فلم تو بہت کامیاب ہوئی لیکن نصرت کاردار کامیابی حاصل نہ کرسکے اور بہت جلد پاکستان واپس لوٹ آئے۔ یہاں وہ ہیرو تو نہ بن سکے لیکن معاون کردار ادا کرتے رہے۔

فلم ''درد'' کے لیے شکیل بدایونی کا لکھا ہوا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پہلا نغمہ یہ تھا۔

ہم درد کا افسانہ دنیا کو سنا دیں گے
ہر دل میں محبت کی اک آگ لگا دیں گے

سادہ لیکن دل میں اتر جانے والے بول اور نوشاد کی دلکش طرزوں کی وجہ سے اس فلم کے تمام گانے ہٹ ہو گئے۔ اس طرح شکیل بدایونی نے ہندوستان کی فلمی صنعت میں ایک دھماکے سے اپنے نئے کردار کا آغاز کیا اور پھر کبھی پلٹ کر نہیں دیکھا۔ نوشاد کی مقبولیت کے ساتھ ساتھ شکیل بدایونی کی مانگ اور مقبولیت میں بھی اضافہ ہونے لگا لیکن انہوں نے زیادہ تر نوشاد صاحب کے ساتھ ہی کام کرنے کو ترجیح دی۔ شکیل بدایونی سے پہلے بھی بہت نامور اور ممتاز شعرا فلمی دنیا سے وابستہ تھے۔ شکیل نے اپنے منفرد انداز سے اپنے لیے ایک علیحدہ مقام بنا لیا۔ ان کی فلمی شاعری کی نمایاں خوبی یہ تھی کہ وہ بہت سادہ اور عام فہم بول لکھتے تھے جو ہر ایک کی زبان پر آسانی سے چڑھ جاتے تھے۔ مثال کے طور پر ''مغل اعظم'' جیسی عظیم فلم میں جب انارکلی شہزادہ سلیم کی محبت میں وارفتگی کے عالم میں ناچتی اور گاتی ہے تو اس سچویشن کے لیے شکیل بدایونی نے بے حد سادہ شاعری لکھی تھی۔

جب پیار کیا تو ڈرنا کیا
پیار کیا کوئی چوری نہیں
گھٹ گھٹ کر آہیں بھرنا کیا
جب پیار کیا تو ڈرنا کیا

ان کے لکھے ہوئے اور نوشاد کے بنائے ہوئے بیشتر گانے محمد رفیع کی آواز میں صدا بند کیے گئے تھے۔ ان کی شاعری میں جگر مراد آبادی کا تغزل اور والہانہ پن نمایاں ہے۔

یہ زندگی کے میلے
دنیا میں کم نہ ہوں گے
افسوس ہم نہ ہوں گے

یہ نغمہ بھی شکیل بدایونی کا لکھا ہوا ہے۔ زندگی کے فلسفے کو انہوں نے کس قدر سادہ اور دل نشیں انداز میں پیش کیا۔ اس زمانے میں لوگ انہیں آرزو لکھنوی کے انداز کا فلمی نغمہ نگار کہا کرتے تھے۔

شکیل بدایونی کی خوش قسمتی یہ ہے کہ ہندوستان کی عظیم اور تاریخی فلموں میں ان ہی کے نغمات شامل تھے۔ مدراس کے فلم سازوں نے بھی ان کی خدمات حاصل کیں اور بہت اچھی موسیقی وجود میں آئی۔

اس زمانے میں ساحر لدھیانوی، کیفی اعظمی، سردار جعفری، مجروح سلطان پوری جیسے شاعر بھی فلمی دنیا میں اپنی شاعری کا جادو جگا رہے تھے۔ ان کے ہوتے ہوئے شکیل بدایونی نے جو شہرت اور مقبولیت حاصل کی وہ ان کی شاعرانہ عظمت کا ثبوت ہے۔ فلمی گیت لکھنا محض شاعری نہیں ہے۔ فلمی گیتوں کی فلمی سچویشن کے مطابق دھن بنائی جاتی ہے اور ان دھنوں پر نغمات لکھے جاتے ہیں۔ یہ ایک مخصوص کام ہے یہی وجہ ہے کہ بہت سے نامور شعرا نے فلمی نغمات لکھنے سے پرہیز کیا۔ لیکن شکیل بدایونی ان شاعروں میں ہیں جنہوں نے فلمی سچویشن کے ساتھ مکمل انصاف کیا لیکن شعری معیار کو بھی نقصان نہیں پہنچایا۔ انہوں نے بیشتر گانے غزل کے انداز میں لکھے ہیں جن میں روایت پسندی اور کلاسیکی انداز نمایاں ہے۔ فلموں کے ساتھ ساتھ ادب میں بھی انہوں نے اپنا معیار قائم رکھا۔ ان کے لکھے ہوئے نغمات کی تعداد زیادہ ہے۔ جن فلموں میں انہوں نے ناقابلِ فراموش نغمات لکھے ان میں بابل، میلہ، دلاری، اڑن کھٹولہ، دیدار، آن، امر، کوہ نور، چودھویں کا چاند، لیڈر، مدر انڈیا، بیجو باورا، دل لگی، داداں، گنگا جمنا، رام اور شیام، بالکی، انداز، دو بدن، سوہنی مہینوال، شباب اور مغل اعظم جیسی فلمیں شامل ہیں۔ 1961ء میں انہیں فلم ''چودھویں کا چاند'' کے نغمات لکھنے پر بہترین نغمہ نگار کا فلم فیئر ایوارڈ بھی دیا گیا تھا۔ ان فلموں کے نغمات آج تک ناقابلِ فراموش ہیں۔

شکیل بدایونی یوپی کے تاریخی شہر بدایوں میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد جمیل احمد قادری خود بھی شاعر تھے۔ شکیل بدایونی 1916ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا نام شکیل احمد رکھا گیا تھا۔ تاریخی نام غفار احمد تھا لیکن انہوں نے شکیل کے نام سے شہرت پائی۔

شکیل کے والد بمبئی میں سنی مسجد کے پیش امام اور شہرت یافتہ عالم اور واعظ تھے۔ اس زمانے کے رواج کی طرح انہیں اردو، فارسی اور عربی کی تعلیم دی گئی۔ ان کی ابتدائی تعلیم بمبئی ہی میں ہوئی تھی۔ ان کی شادی ان کے چچا منشی حضور احمد کی صاحب زادی سے ہوئی تھی۔ ان کا مزاج ابتدا ہی سے شاعری کی طرف مائل تھا۔

اعلیٰ تعلیم کے لیے 1936ء میں انہوں نے علی گڑھ یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ علی گڑھ کے ماحول نے انہیں مختلف لوگوں سے متعارف کرایا۔ جگر مراد آبادی سے ملاقات بھی اسی زمانے میں ہوئی تھی اور انہوں نے جگر مراد آبادی کی صحبتوں

سے بہت فیض حاصل کیا۔ 1942ء میں بی اے کرنے کے بعد وہ دہلی آ گئے اور حکومت ہند کے محکمہ سپلائی میں ملازمت اختیار کی جو کہ سراسر ان کے مزاج کے خلاف تھی لیکن دہلی کے قیام کے دوران میں انہیں سائل، امن جیسے بزرگوں سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ انہوں نے زیادہ تر محبوب خان اور اے آر کاردار کے ساتھ کام کیا اور یادگار نغمات تحریر کیے۔

فلموں کے ساتھ ساتھ وہ مشاعروں کے بھی ایک مقبول شاعر تھے جن کے بغیر کوئی مشاعرہ مکمل نہیں سمجھا جاتا تھا۔

اب وہ دنیا میں نہیں ہیں، مگر اپنے نغمات کی وجہ سے ہمیشہ یاد رکھیں جائیں گے۔

☆☆☆

فیض احمد فیض انقلابی اور رومانی شعر کی حیثیت سے تو عالمگیر شہرت کے حامل ہیں لیکن فلمی صنعت کے لیے بھی انہوں نے اپنا کلام گانے کی اجازت دی۔

گلوں میں رنگ بھرے باد نو بہار چلے
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا

لیکن یہ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ انہوں نے ایک انڈین فلم کے لیے بھی اپنی ایک غزل دی تھی۔

دونوں جہاں تیری محبت میں ہار کے
وہ جا رہا ہے کوئی شبِ غم گزار کے

وہ غزل ہے جو انہوں نے اداکارہ نرگس کی والدہ جدن بھائی کی درخواست پر انہیں ان کی فلم ''رومیو جولیٹ'' کے لیے دے دی تھی۔

فلمی صنعت سے فیض صاحب کا جو واسطہ اور تعلق رہا اور اس کا اسباب کیا تھے یہ آپ خود فیض صاحب کی زبانی سنیے۔ یہ واقعات انہوں نے ایک فلم میگزین کے ایڈیٹر کو انٹرویو دیتے ہوئے بتائے تھے۔ یہ ایک پرانی داستان ہے جو ایک بار پھر یاد آ گئی۔

فیض صاحب نے کہا ''تقسیم ہند سے پہلے میں فلموں کی طرف راغب ہو گیا تھا۔ اس وقت ترقی پسند تحریک اپنے بال و پر نکال رہی تھی اور اردو کے بیشتر ادبا اور شعرا فلمی دنیا میں قسمت آزمائی کر رہے تھے۔ منٹو، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، راما نند ساگر، خواجہ احمد عباس، جوش ملیح آبادی، ضیاء سرحدی، اوپندر ناتھ اشک، مجروح اور مجاز سے میری دوستی تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ جوش ملیح آبادی کے علاوہ ہم قریب قریب ایک دوسرے کے ہم خیال تھے۔

ہماری رگوں میں گرم خون رواں تھا اور ہم میں سے ہر شخص ایک انقلاب کے تصور ہی میں کھویا ہوا رہتا تھا جس میں سرمایہ داری اور جاگیرداری کے لیے کوئی گنجائش نہ ہو۔

میں یہاں اپنے عزیز ترین دوست سجاد ظہیر اور مخدوم محی الدین کا بھی نام لوں گا جو اب مرحوم ہو چکے ہیں۔ انہیں فلمی دنیا سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن ان کے بغیر اپنی محفلوں کو ہم سونی تصور کرتے تھے۔ ہمارے ایک اور دوست پطرس بخاری کے چھوٹے بھائی زیڈ اے بخاری تھے، وہ بمبئی ریڈیو کے اسٹیشن ڈائریکٹر تھے۔

جب ہندوستان تقسیم ہوا تو بمبئی میں، میں نے ایک نوعمر لڑکی کو دیکھا لیکن ہمارے تصور میں بھی نہ تھا کہ یہی بچی اپنے زمانے کی کامیاب ترین اداکارہ بنے گی اور بے پناہ عزت و شہرت پائے گی۔ انہی محفلوں میں میری ملاقات زینت امان کے والد امان اللہ خان سے بھی ہوئی۔ امان اللہ خاں سے میری چند ہی ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ ان ملاقاتوں نے کبھی دوستی کی حدوں کو نہیں چھوا لیکن اپنی مردانہ وجاہت اور رکھ رکھاؤ کی وجہ سے اس شخص کا چہرہ آج بھی یاد ہے۔

جدن بائی نے اپنی فلم ''رومیو جولیٹ'' کی ابتدا کی تھی تو اس نے میری غزل

دونوں جہاں تیری محبت میں ہار کے
وہ جا رہا ہے کوئی شبِ غم گزار کے

مانگی۔ میں نے وہ غزل دے دی جو اس فلم میں شامل ہوئی اور خاصی مقبول بھی ہوئی۔ یہ میری پہلی تخلیق تھی جو فلم کے پردے پر گائی گئی۔

قیام پاکستان کے بعد میری بیشتر شاعری کو فلم والوں نے استعمال کیا۔ مجھے فلمی گیت لکھنے کی آفر بھی ملی لیکن میں اپنی شاعری کو اس سطح پر لانے کے لیے تیار نہ ہوا جس سطح پر ادبی شاعری اپنی شناخت کھو دیتی ہے۔

کم و بیش پندرہ بیس سال پہلے مشرقی پاکستان ..... (بنگلہ دیش) کے ماہی گیروں کی زندگی پر ایک فلم ''جاگو ہوا سویرا'' بنی تھی۔ اس فلم کا اسکرپٹ میں نے لکھا تھا۔ وہ مکمل طور پر ایک تجرباتی فلم تھی لیکن جیسا کہ ایسی فلموں کا حشر ہوتا ہے، وہ دنیا بھر میں دکھائی گئی۔ اسے کئی ملکوں میں پاکستانی فلموں کی نمائندگی کرنے کا اعزاز حاصل ہوا لیکن وہ اپنے ملک پاکستان میں بُری طرح ناکام ہوئی۔

میں نے صحافتی اور سیاسی زندگی کو بھی گلے لگایا ہے شاید

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اسی لیے فلمی دنیا کے لیے میں اتنا وقت نہ نکال سکا جتنا کہ اس میدان میں درکار ہوتا ہے۔ لیکن میں آج بھی خود کو فلمی دنیا سے پوری طرح علیحدہ نہیں کر پایا ہوں اور اب بھی ایک فلم ''سکھ کی پیاس'' لکھ رہا ہوں، دیکھیے کب مکمل ہوتی ہے۔

میں ستیہ جیت رائے کی ہدایت کاری سے متاثر ہوں اور میری رائے میں یہ واحد ہندوستانی ہدایت کار ہے جسے نہ صرف حقیقت کو فلمانے کی سمجھ ہے بلکہ تمام تر غلاظتوں کے ساتھ اسے قبول کرنے کی صلاحیت بھی ہے۔ میں نے فلم سیتم شیوم سندرم بھی دیکھی ہے لیکن مجھے اس فلم میں آوارہ اور شری چار سوہیں والا راج کپور کہیں نظر نہیں آیا جس کی میں دل سے عزت کرتا ہوں۔ سیکس کو سلیقے سے پیش نہ کرنے کی وجہ سے یہ چوتھے درجے کی فلم بن کر رہ گئی ہے۔

فلم سازی کے میدان میں ہندوستان بلاشبہ پاکستان سے بہت آگے ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رقبے کے اعتبار سے پاکستان، ہندوستان سے بہت چھوٹا ہے اور اسی لیے پاکستانی فلم ساز محدود وسائل اور محدود سرمائے کو بروئے کار لاتے ہوئے ایک اچھی فلم بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ جب سے پاکستان میں ہندوستانی فلموں کی نمائش ممنوع قرار دی گئی ہے، پاکستانی فلم انڈسٹری نے خاطر خواہ ترقی کر لی ہے۔ اس عرصے میں متعدد اچھی فلمیں بنی ہیں جنہیں ہندوستانی فلموں کے مقابلے میں رکھا جا سکتا ہے مثلاً امراؤ جان ادا، غلام، سسرال، شہید اور احساس نامی فلموں نے پاکستانی فلموں کو سربلند کیا ہے۔ ان فلموں کی کامیابی کی بدولت ایران اور عرب ممالک میں پاکستانی فلموں کی مانگ بڑھی اور ہندوستانی فلموں کی طرح ہماری فلمیں بھی گھر سے باہر کی دنیا میں دیکھی جا رہی ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ غیر ممالک میں جہاں امراؤ جان ادا جیسی فلمیں بنائی گئی ہیں۔ ہماری فلم انڈسٹری کا افسوس ناک پہلو یہ بھی ہے کہ ہمارے فلم ساز ہندوستانی فلموں کی چربہ سازی پر بھی توجہ دیتے ہیں۔ ایسے فلم سازوں نے ہماری فلم انڈسٹری کو اس حد تک بدنام کر دیا ہے کہ حکومت کو دخل دینا پڑا اور سنسر پالیسی کو سخت کرنا پڑا۔ جس قلم پر ہندوستانی فلم کے چربے ہونے کا شک ہوتا ہے سنسر اسے پاس ہی نہیں کرتا۔ اس طرح سے پاکستانی عوام کو چربہ فلموں سے نجات مل گئی ہے۔

اِن دنوں پاکستان میں بھی ''گرم ہوا'' جیسی فلمیں بن رہی ہیں۔ ہدایت کار سیف الدین سیف نے حال ہی میں ''کرتار سنگھ'' نامی فلم بنائی تھی جو ہر اعتبار سے ہندوستانی فلموں کے مقابلے میں پیش کی جا سکتی ہے۔ اسی طرح تجرباتی فلموں کے دروازے کھلتے گئے۔ ان فلموں کی کامیابی کو دیکھتے ہوئے میں کہہ سکتا ہوں کہ پاکستانی عوام بھی نئے پن کو قبول کرنے لگے ہیں۔ ہر چند کہ میں فلم اور ٹیلی وژن کے لیے زیادہ وقت نہیں نکال پاتا ہوں لیکن میری بیٹی منزہ آرٹ فلموں سے گہری دلچسپی رکھتی ہے۔ وہ ٹیلی وژن ڈائریکٹر ہے اور اس نے حوصلہ مند ہدایت کار جاوید جبار کی فلم ''مسافر'' میں ایک اہم رول بھی کیا ہے۔ یہ فلم ہندوستان میں بھی دکھائی گئی تھی۔

آخر میں اتنا ضرور کہوں گا کہ جس وقت پاکستان میں ہندوستانی فلموں پر پابندی لگائی گئی تھی تو میں نے اس کی حمایت کی تھی کیونکہ اس وقت یہ اقدام ضروری تھا لیکن اب جبکہ پاکستان اپنے محدود وسائل کے باوجود ہندوستان کے مقابلے میں فلمیں بنا رہا ہے تو یہ پابندیاں ہٹ جائیں تو بہتر ہے۔ دونوں طرف سے کشادہ دلی کے ساتھ تبادلہ ہونا چاہیے اور میں یوں بھی آرٹ پر ایک ملک کی اجارہ داری کا قائل نہیں ہوں۔ آرٹ اگر جاندار ہے تو وہ تمام سرحدیں توڑ کر خوشبو کی طرح پوری دنیا میں پھیل جاتا ہے۔ کوئی بھی ملک آج تک اس کو پابہ زنجیر نہیں کر سکا ہے۔''

فیض صاحب کی یہ تحریر لگ بھگ چالیس سال پہلے کی ہے۔ اس وقت پاکستانی فلمیں واقعی ہندوستانی فلموں کا مقابلہ کر سکتی تھیں لیکن بدقسمتی سے انڈین حکومت نے کشادہ دلی سے فلموں کا تبادلہ کرنے پر آمادگی ظاہر نہیں کی۔ ان کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ پاکستان ان کی فلموں کے لیے ایک نئی مارکیٹ بن جائے، لیکن معیاری پاکستانی فلمیں ہندوستان میں نہ دکھائی جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ پابندی برقرار رہی اور آج میں بھی قائم ہے لیکن کرپٹ نظام کے تحت ان پابندیوں کے باوجود پاکستان میں ہندوستانی فلمیں بے دریغ درآمد کی جا رہی ہیں اور ان کی نمائش جاری ہے۔

دوسری افسوس ناک بات یہ ہے کہ فیض صاحب نے جس زمانے کی بات کی ہے وہ اب تبدیل ہو چکا ہے۔ جاہل اور فن سے بے بہرہ دولت مندوں کی بدولت پاکستان کی فلم انڈسٹری تقریباً ختم ہو چکی ہے اور آج پھر وہی حالات ہیں کہ پاکستانی فلم انڈسٹری کو از سرِ نو زندہ اور مضبوط کرنے کے لیے ہندوستانی فلموں پر مکمل پابندی عائد کرنا ضروری ہے۔ پہلی مرتبہ بھی اس کا بہت اچھا نتیجہ برآمد ہوا تھا۔ اب پھر وہی حالات ہیں اور پاکستان میں فلم انڈسٹری کو بحال کرنے کے لیے ہندوستانی

فلموں کی مکمل بندش ضروری ہے ورنہ یہاں فلم انڈسٹری دوبارہ جنم نہیں لے سکے گی۔

فیض صاحب کو کسی نے یہ اطلاع بھی درست نہیں دی تھی کہ پاکستان میں سنسر کی سختی کی وجہ سے ہندوستانی فلموں کو سنسر نہیں کیا جاتا۔ کاش کہ ایسا ہوا ہوتا اور ہماری حکومت اس اصول پر سختی سے عمل کرتی تو پاکستان میں چربہ سازی کی لعنت ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتی مگر بدعنوانی اور رشوت سے یہ فلمیں بھی سنسر پاس کرتا رہا۔ اگر کسی فلم پر اس الزام میں پابندی لگائی بھی گئی تو بہت جلد اُٹھا لی گئی۔ پاکستان میں چربہ سازی کی وجہ سے کبھی کسی ایک فلم کو بھی سنسر نہ کر کے اس کی نمائش نہیں روکی گئی جس کی وجہ سے یہ لعنت ہماری انڈسٹری کے لیے بدنامی اور نقصان کا سبب بن گئی۔

آج پھر وہی حالات ہیں جو آغاز میں تھے۔ آج پھر کسی اوردار اور ذمے دار حکومت کی ضرورت ہے جو پاکستانی فلم انڈسٹری کو تحفظ دے کر اپنے قدموں پر کھڑا کر سکے لیکن صورتِ حال اس کے برعکس ہے۔ آج ہمارے نجی ٹیلی وژن چینلز بلا روک ٹوک ہندوستانی فلمیں اور پروگرام دکھاتے ہیں اور ری ڈیز کے ذریعے پاکستان میں ہندوستانی فلم گھر گھر دیکھی جاتی ہے جس نے ہمارے کلچر، ہماری روایات اور زبان سے نئی نسل کو بے گانہ کر دیا ہے۔ جو حکومت اپنی نظریاتی سرحدوں کی حفاظت نہ کر سکے اور ہندوستانی فلموں کے ذریعے وہاں کے کلچر، زبان اور رسم و رواج کو کھلے عام دکھا کر نا پختہ ذہنوں کو متاثر کرنے کی اجازت ہو۔ اس کو نظریۂ پاکستان کی اہمیت کا اندازہ ہی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندی زبان اور بے ہودہ اور گھٹیا کلچر ہمارے ملک میں عام ہوتا جا رہا ہے۔ نئی نسل کو یہ بھی علم نہیں ہے کہ قائداعظم نے سخت جدوجہد کے بعد پاکستان کیوں حاصل کیا تھا، آج کی نسل وہی زبان بول رہی ہے جو ہندوستانی فلموں میں بولی جاتی ہے اور ان ہی نظریات سے متاثر ہو رہی ہے جن کے خلاف قیامِ پاکستان کی جدوجہد کی گئی تھی۔

ملت پہ تری آ کے بُرا وقت پڑا ہے

☆☆☆

تقسیمِ ہند کے بارے میں اردو، انگریزی اور دیگر زبانوں میں بہت سی کتابیں، افسانے، ڈرامے اور فلمی کہانیاں لکھی گئی ہیں۔ حال ہی میں ایک ہندوستانی مصنف یشپال کی کتاب نظر سے گزری۔ دراصل یہ کتاب اردو میں لکھی گئی ہے اس کا عنوان ''جھوٹا سچ'' ہے۔ جو کتاب میری نظروں سے گزری اس کا عنوان This is not that dawn ہے۔ غالباً یہ نام فیض صاحب کی اس نظم کے مصرعے سے لیا گیا ہے جس میں انہوں نے لکھا تھا۔

یہ داغ داغ اُجالا یہ شب گزیدہ سحر
انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

اس ناول کو ساؤتھ ایشین اسٹڈیز کے میگزین نے تقسیمِ ہند کے بارے میں سب سے زیادہ اہم کتاب قرار دیا ہے اور اس کو ایک شاہکار بھی قرار دیا ہے۔ دوسرے نقادوں نے بھی اس کو بہت سراہا ہے۔

آیئے پہلے تو مصنف یشپال کے بارے میں کچھ جان لیں۔ وہ کوئی متعصب یا غیر جانبدار ہندو نہیں ہیں۔ وہ آزادی کے ہمیشہ سے خواہاں رہے ہیں اور اس کے لیے انہوں نے انگریزی حکومت کے دور میں بہت جیلیں کاٹیں اور سختیاں سہی ہیں۔ یشپال بھگت سنگھ کے ساتھی تھے اور ان کے ساتھ مل کر انگریزی حکومت کا تختہ الٹنے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ 1931ء میں انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ اس زمانے میں لاہور باغیوں کا گڑھ سمجھا جاتا تھا۔ انہیں لکھنؤ کی جیل میں قید رکھا گیا تھا۔ 1938ء میں انہیں لکھنؤ جیل سے رہا کیا گیا تو پنجاب میں ان کے داخلے پر پابندی عائد تھی۔ اس زمانے میں انہوں نے تین چار بار لاہور کے خفیہ دورے کیے تھے اور 1947ء سے پہلے بھی لاہور آ چکے تھے۔

یہ کتاب لکھنے کا خیال انہیں 1955ء میں آیا تھا جب وہ روس جاتے ہوئے کچھ عرصے کے لیے لاہور میں ٹھہرے تھے۔ انہوں نے جب 1955ء کا لاہور دیکھا تو انہیں تقسیم سے پہلے والا لاہور نظر نہیں آیا۔ پرانے لوگوں کو پرانی چیزوں کی روایتی یادیں ہمیشہ ستاتی رہتی ہیں۔ یشپال جی کے ساتھ کچھ ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔ انہوں نے جس لاہور کو اپنی جوانی میں دیکھا تھا اور جس کو وہ بہت عزیز رکھتے تھے، وہ انہیں کہیں نظر نہ آیا۔ اس بات نے ان کے اندر پرانے لاہور کی یادیں تازہ کرنے کی تحریک پیدا کی جس کے نتیجے میں یہ تصنیف وجود میں آئی۔ پرانے لاہور کو جن لوگوں نے دیکھا ہے اس کو وہ کبھی نہیں بھلا سکتے۔ لاہور ایک جادوگر شہر ہے۔ یہ ایک ایسا طلسمی شہر ہے جس میں کچھ عرصہ رہنے کے بعد انسان اس کے سحر میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ پھر اس کا دل لندن، روم یا نیویارک میں بھی نہیں لگتا۔

آج ہم جو لاہور دیکھ رہے ہیں، یہ ایک جدید اور بدلا ہوا شہر ہے جس کے کچھ حصے تو پہچانے بھی نہیں جاتے لیکن پھر بھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قدیم لاہور میں پُرانا ماحول اور روایات نظر آجاتی ہیں جو رفتہ رفتہ تبدیل ہوتی جارہی ہیں کیونکہ کسی حکومتی ادارے نے اس قدیم ثقافتی شہر کی پرانی یادگاروں اور علاقوں کو زندہ رکھنے اور سجانے سنوارنے کی کوشش نہیں کی جیسا کہ دنیا کے دوسرے قدیمی تاریخی شہروں میں کیا گیا ہے۔ ان لوگوں نے اپنی تہذیب وثقافت اور روایتی ماحول کو اسی حالت میں برقرار رکھا ہے اور شہر کے ان حصوں میں جاکر آپ صدہا سال پرانے دور میں پہنچ جاتے ہیں۔ بدقسمتی سے ہمارے حکمرانوں کو، نہ ہمارے بیوروکریٹس کو اور نہ کسی اور تنظیم یا ادارے کو اس بات کا خیال نہیں آیا جس کی وجہ سے شہروں کے چہرے تیزی سے تبدیل ہورہے ہیں۔ پُرانے شہر رفتہ رفتہ معدوم ہوتے جارہے ہیں۔

یشپال کے اس ناول کی خوبی یہی ہے کہ آپ کو پُرانے لاہور کا زمانہ یاد دلا دیتا ہے۔

ناول کا آغاز 1942ء میں ''ہندوستان چھوڑ دو'' کی اس تحریک کے فوراً بعد سے ہوتا ہے، یہ تحریک انگریزی حکومت کے خلاف چلائی گئی تھی اور اس میں شریک لوگوں خصوصاً نوجوانوں نے اس مقصد کے حصول کے لیے بہت کوششیں کیں۔ جیلیں کاٹیں اور پھانسی کے تختوں پر چڑھے۔ افسوس کہ آج ہم صرف لوٹنے والوں کو دیکھ رہے ہیں۔ وہ لوگ یا ان کی باقیات اور ان کے اصولوں کے علمبردار کہیں نظر نہیں آتے۔ محسن بھوپالی نے شاید ہمارے لیے صحیح کہا تھا کہ

منزل انہیں ملی جو شریکِ سفر نہ تھے۔

ناول کا اختتام نئی دہلی میں 1957ء میں ہوتا ہے جہاں ان دنوں الیکشن ہونے والے تھے۔

ناول کے پہلے حصے کا عنوان ہے ''وطن اور دیش'' اس عنوان کے تحت انہوں نے یہ فلسفہ بیان کیا ہے، تقسیم ہند نے اس تصور کو تبدیل کردیا ہے اور انسانوں کا ملک دو قوموں میں بٹ گیا ہے جن کے اپنے وطن کا تصور الگ الگ ہے۔ اس کی وجہ ایک دوسرے پر بے اعتباری ہے۔

ناول کا پہلا حصہ پُرانے لاہور کی رسومات، ماحول اور دیگر تفصیلات سے مزّین ہے۔ مثلاً لاہور کے تانگے والے، لاہور کی بولیاں، لاہور کے میلے ٹھیلے، پنجابی ٹپے، گلی گلی سامان فروخت کرنے والوں کی صدائیں اور دیگر تفصیلات کا تذکرہ ہے۔

ناول کا آغاز ایک ''سیاپا'' سے ہوتا ہے جس میں ہندو اور مسلمان دونوں کی خواتین شامل ہیں۔ ناول میں انارکلی بازار، مال روڈ، گوالمنڈی، نیلا گنبد، نسبت روڈ، ماڈل ٹاؤن، شاہ عالمی دروازہ، بھاٹی گیٹ اور لاہور کے دوسرے تاریخی دروازوں کا تفصیلی تذکرہ ہے۔ یہ دراصل کہانی اور حقائق کا مجموعہ ہے جس میں پڑھنے والوں کو ایک انوکھا لطف محسوس ہوتا ہے۔

یشپال نے اس ناول میں تقسیم کا ذمّے دار صرف انگریزی حکومت کو نہیں ٹھہرایا ہے، ان کا نظریہ ہے کہ پنجاب میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین دولت کی غلط تقسیم اور ایک مذہب والوں کا دوسروں کو ''ناپاک اور ملیچھ'' سمجھنا بھی اس کا سبب ہے۔ پھر مذہب کے نام پر تقسیم کے موقعے پر جو خون ریزی کی گئی اس کی بھی انہوں نے مذمت کی ہے۔

انہوں نے ناول میں معمولی تفصیلات اور جزئیات کو بھی بہت اہمیت دی ہے۔ گلیوں میں...مردوں کی گپ شپ، عورتوں کی باتیں اور لڑائی جھگڑے، بہت حقیقی انداز میں بیان کیے گئے ہیں، پرانے لاہور کی بھولا پانڈے گلی اور ہندوؤں کی گلی برادری کا آج کوئی نام نہیں جانتا لیکن یشپال نے اس کی نقشہ کشی بہت تفصیل سے کی ہے۔ مسلمانوں کی تیتر والی گلی جو بھاٹی دروازے کے عقب میں واقع تھی اس کی تفصیل بھی انہوں نے بہت دلچسپ انداز میں بیان کی ہے جس سے پڑھنے والوں کے سامنے اس عہد کی تصویر آجاتی ہے۔

ناول میں سیاسی تبدیلیوں اور اُتار چڑھاؤ کا بھی تذکرہ موجود ہے۔ خضر حکومت کے بعد پنجاب میں جو سیاسی تبدیلیاں رونما ہوئیں اور جوڑ توڑ ہوئے۔ جو بلآخر قیام پاکستان کی صورت میں نتیجہ خیز ثابت ہوئے، ان پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ ریڈکلف ایوارڈ میں جو دھاندلیاں کی گئیں اور ان کے نتیجے میں پنجاب میں جو خون خرابا ہوا اس کو بھی ناول میں فراموش نہیں کیا گیا۔

یشپال ترقی پسند ہونے کی وجہ سے خاندانی رواج اور شادی کی رسومات کے بھی مخالف ہیں۔ ہندو ہو یا مسلمان خواتین کو علیحدہ اور کمزور سمجھنے کو غلط تصور کرتے ہیں۔ ناول کے زنانہ ہندو کردار تارا، کنک، شیلو اور ارمیلا ہندوؤں کی مختلف ذاتوں اور طبقات سے تعلق رکھتے ہیں۔ فسادات میں وہ اپنے گھر اور سرزمین سے بے گھر ہوگئیں تو ان کے ساتھ ہندوستان میں اچھا سلوک نہیں کیا گیا۔ سیاسی اور مذہبی مقاصد کی خاطر انہیں ظلم اور بدسلوکی کا نشانہ بنایا گیا اور انہیں غلط مفادات کے لیے استعمال کیا گیا لیکن بلآخر انہوں نے اپنی زندگی کی راہیں تلاش کرلیں۔

ناول کا دوسرا حصہ تقسیم کے بعد کے ہندوستان سے تعلق رکھتا ہے جہاں ''بنتی'' کے ساتھ اس لیے بہت بُرا سلوک کیا جاتا ہے کیونکہ وہ پاکستان میں رہ گئی تھی اور اغوا شدہ عورتوں کے قافلے کے ساتھ واپسی ہوئی تھی۔ دیکھا جائے تو پاکستان میں بھی اغوا شدہ خواتین کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا گیا۔ ہم نے اسی موضوع پر فلم ''سزا'' بھی بنائی تھی جس میں ایک ایسی ہی لڑکی کی کہانی بیان کی گئی تھی جو شادی شدہ تھی لیکن فسادات میں اس کا شوہر شہید کردیا گیا۔ وہ ماں بننے والی تھی، جب پاکستان آئی تو کمسن بچہ اس کی گود میں تھا لیکن اس کے خودغرض مفاد پرست ماموں نے مجبوراً بھانجی کو تو قبول کرلیا لیکن بچے کو اس سے جدا کرکے ایک غریب عورت کو اس کی پرورش کی ذمّے داری سونپ دی اور بھانجی سے یہ بہانہ بنایا اگر بچہ اس کے ساتھ رہا تو اس کی دوسری شادی نہیں ہوسکے گی۔ بھانجی کسی قیمت پر بھی بچے کو چھوڑنے اور کسی کو دھوکا دے کر شادی کرنے کے حق میں نہیں تھی۔ ماموں اور ممانی نے اس کو اتنا مجبور کیا کہ وہ بے بس ہوگئی۔ اس کی دوسری شادی کردی گئی لیکن اس کے شوہر کو یہ بھی نہیں بتایا گیا کہ یہ تقسیم کے وقت ہندوستان میں رہ گئی تھی اور اس کا ایک بچہ بھی ہے۔ یہ کہانی مختلف مراحل سے گزر کر ایسے موڑ پر پہنچی جہاں گمشدہ بیٹا اور ماں کی ملاقات ہوگئی۔ بہرحال یہ ایک علیحدہ کہانی ہے لیکن یشپال نے ہندوستان کے حوالے سے جو واقعات لکھے ہیں، وہ بھی درست ہیں۔

یشپال کے ناول کے اس حصے سے ہمیں دلچسپی ہے جس میں انہوں نے پُرانے لاہور کی جھلکیاں پیش کی ہیں۔ 1949ء میں جب ہم پاکستان آئے تھے اس وقت بھی لاہور بہت حد تک پرانا لاہور ہی تھا۔ سمن آباد، گلبرگ جیسی بستیوں کی تعمیر کے علاوہ لاہور شہر میں نئی تعمیرات شروع نہیں ہوئی تھیں اور کئی سال تک لاہور بدستور ویسا ہی رہا سوائے ان تبدیلیوں کے جو غیر مسلموں کے جانے سے یہاں کے ماحول میں پیدا ہوئی تھیں۔ عرصہ دراز تک مال روڈ کی کوئی پرانی عمارت مسمار کرکے نئی بلڈنگ تعمیر نہیں کی گئی۔ شہر کی تمام سڑکیں، گلیاں، عمارتیں ویسی کی ویسی تھیں۔ ٹیمپل روڈ، ایمپریس روڈ، فیروزپور روڈ، غرضیکہ لاہور کے کسی بھی علاقے میں ذرا سی بھی تبدیلی دیکھنے میں نہیں آئی۔ نہر والی سڑک کا ماحول اور وہاں آس پاس کے دراز قد درخت اسی طرح تھے جیسے کہ قیام پاکستان سے پہلے تھے۔ پھر رفتہ رفتہ لاہور کے بیرونی علاقوں میں تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔ مال روڈ کا حلیہ بدل گیا۔ نہر کے خوبصورت ترتیب کے ساتھ لگے ہوئے درخت کاٹ دیے گئے۔ لاہور شہر کی ہر سڑک اب تبدیل ہوچکی ہے۔ لاہور ایک جدید شہر بن چکا ہے۔ مال روڈ کے گھاس کے سبز تختے، پھول اور سایہ دار درخت غائب ہوچکے ہیں۔ یہ دھوئیں اور شوروغل سے بھرپور ایک ایسی سڑک بن چکی ہے جہاں کی بہت سی یادگار عمارتیں اور مناظر بھی بدل چکے ہیں۔ ہم نے 1949ء کا جو لاہور دیکھا تھا اب اس کو یاد کرکے افسردہ ہوجاتے ہیں۔ تو پھر پُرانے لاہوریوں کے دلوں پر کیا گزرتی ہوگی، اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔

یشپال جی نے لاہور کی پُرانی یادوں کا جو تذکرہ کیا ہے، وہ ادھوری ہوں گی اگر ان میں اضافہ نہ کیا جائے۔ لاہور کے پُرانے اور بزرگ رہائشی آج بھی پرانے دور اور پُرانے شہر کو یاد کرکے خیالوں میں کھوجاتے ہیں اور اس دور کے قصے سنانے لگتے ہیں جب لاہور میلوں ٹھیلوں اور ثقافتی سرگرمیوں کے حوالے سے ایک زندہ دل شہر کی حیثیت سے سارے برصغیر میں مشہور تھا۔

لاہور والوں کو آج کل ایک صدمہ دریائے راوی میں پانی کم ہوجانے کا بھی ہے جس کی وجہ سے یہ عظیم دریا اب مختلف حصوں میں پانی کے علاوہ ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پانی سے بھرپور تھا اور لاہور والوں کے لیے ایک بہت اچھی اور فرحت بخش سیرگاہ تھا۔ بہت پُرانے زمانے سے یہ روایت چلی آرہی ہے کہ دنیا کے بڑے بڑے شہر عموماً دریا کے کنارے آباد کیے جاتے تھے۔ یا تو دریا ان شہروں کے درمیان سے گزرتا تھا یا شہر کے ساتھ ساتھ بہتا تھا۔ قدیم زمانے میں دریا کی موجودگی کے باعث پانی کی فراہمی، مچھلیوں اور دیگر آبی غذا کی بہتات اور سیروتفریح کے علاوہ دریا دفاعی حیثیت سے بھی بہت بڑا کردار ادا کرتے تھے۔ خصوصاً جب دریا طغیانی پر ہوتے تھے تو بڑے بڑے فاتح بادشاہوں کی فوجیں انہیں عبور کرنے کی جرأت نہیں کرتی تھیں۔

اپنے عہد کے سب سے جابر فاتح چنگیز خان اور اس کی افواج جب جلال الدین خوارزم کا پیچھا کرتے ہوئے ہندوستان پہنچیں تو دریائے جمنا طغیانی پر تھا لیکن جلال الدین خوارزمی نے ایڑ لگائی اور گھوڑے سمیت طوفانی دریا میں کود پڑا۔ اسی طرح سکندر اعظم کی فتح مند فوج نے دریائے جہلم کو عبور کرنے سے انکار کردیا تھا اور واپس جانے کا مطالبہ کردیا تھا جو سکندر جیسے عالمی فاتح کو بھی ماننا پڑا۔

بڑے دریا اس زمانے میں ٹرانسپورٹ کے فرائض بھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سرانجام دیا کرتے تھے۔ اسی طرح دریائے راوی بھی لاہور والوں کے لیے دل بستگی کے علاوہ فوائد کا حامل بھی تھا جس کے کنارے بہت گھنے جنگلات تھے۔ پچاس سال قبل دریائے راوی ہر وقت پانی سے لبالب رہتا تھا۔ کامران کی بارہ دری جانے کے لیے بھی کشتیاں ہی استعمال کی جاتی تھیں۔ اب عقبی راستے سے کامران کی بارہ دری جاتے ہیں کیونکہ دریا میں کشتی رانی ممکن نہیں رہی۔ لاہور والے اپنے راوی کی اس بے بسی پر آنسو بہاتے ہیں۔ دریائے راوی کسی زمانے میں شاہی قلعے کے ساتھ بہتا تھا۔ پھر دریا نے راستہ بدل لیا تو یہ قلعہ نما باقی ماندہ دریا بڈھا راوی کہلانے لگا۔ اب بڈھے راوی کا بھی نام ونشان نہیں ہے۔ اس کی موت واقع ہوچکی ہے۔

دریائے راوی اب اپنے حسن اور پانی سے محروم ہوچکا ہے۔ لاہور والے اب نہ تو اس کے کنارے پکنک کرسکتے ہیں نہ کشتی رانی کا لطف اُٹھا سکتے ہیں، مچھلی کا شکار کرنے والے بھی مایوس ہوچکے ہیں۔ دریائے راوی اب ایک اُجڑا ہوا دریا ہے۔ اللہ کرے یہ ایک بار پھر پُرانا راوی بن جائے اور لاہور والوں کی تفریح اور دلچسپی کا سامان فراہم کرنے لگے، آمین۔

لاہور میں راوی کے کنارے ہی نہیں، دوسرے مقامات پر بھی میلے ٹھیلے سجا کرتے تھے، جشن منائے جاتے تھے۔ اندرونِ لاہور میں میلے ایک روایت تھے جن میں خوب رونق ہوتی تھی۔ لوگ خیمے لگاتے، پکوان پکاتے، لوک گیت گاتے، بولیوں کا مقابلہ ہوتا اور شہر میں زندگی جگمگا اُٹھتی۔ لاہور کے پُرانے بزرگ لاہور کی قدیم ثقافتی روایات کے ختم ہونے پر ماتم کناں ہیں اور کہتے ہیں کہ کہاں گئیں وہ میلوں کی رونقیں، نوجوانوں کے زندگی سے بھرپور قہقہے، چمکتے دمکتے صحت مند چہرے، نوجوانوں کے بھنگڑے اور لڑکیوں کے گیت۔

شہر میں مختلف مقامات پر ہیر وارث شاہ کی محفلیں سجتی تھیں۔ ان بزرگوں کا خیال ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد مہاجرین نے اس جگہ کی آبادی میں بے انتہا اضافہ کردیا۔ اب لاہور کی آبادی ایک کروڑ کے لگ بھگ ہے اور یہ بہت دور دور تک پھیل گیا ہے۔ اس وسیع جنگل کے درمیان میں پرانے لاہور نے ایک چھوٹے سے جزیرے کی حیثیت اختیار کرلی ہے اور اس کی ثقافت گم ہوکر رہ گئی ہے۔ جو لوگ پرانے لاہور سے نئی آبادیوں میں منتقل ہوچکے ہیں، ان میں بڑی عمر کے لوگ اپنی یادیں تازہ کرنے کے لیے کچھ وقت کے بعد پرانے لاہور کا پھیرا ضرور لگاتے ہیں اور پرانی یادیں تازہ کرتے ہیں۔ ان مقامات پر گھومتے پھرتے ہوئے پُرانی یادوں کا ہجوم انہیں گھیر لیتا ہے۔ بعض چیزوں کو یاد کرکے وہ مسکراتے ہیں، کچھ یادیں انہیں افسردہ کردیتی ہیں۔

وہ کہتے ہیں کہ پہلے کے لوگوں کے دل صاف تھے اور وہ صحیح معنوں میں ایک دوسرے سے پیار کرتے تھے۔ لڑائی جھگڑے بھی ہوتے تھے مگر بہت جلد دل پھر ایک ہوجاتے تھے۔ ان میں منافقت بالکل نہیں تھی۔ وہ مخلص اور ایک دوسرے کے برے وقتوں میں کام آنے والے لوگ تھے۔ وہ دل کھول کر قہقہے لگاتے تھے جن میں بھرپور زندگی ہوتی تھی۔ میلوں میں وہ جب رقص کرتے تو ایک والہانہ انداز میں ہوتا۔

ایک بزرگ نے کہا کہ بھاٹی دروازے میں اس کی پنساری کی دکان تھی۔ اسے پنجابی شعر وشاعری کا شوق تھا۔ وہ بڑے مشاعروں میں تو کبھی نہیں گیا مگر حضوری باغ مشاعروں میں وہ اپنا کلام سناتا تھا اور دوسروں کا سنتا تھا۔ وہاں ہیر وارث شاہ سنانے کے لیے بھی لوگ آتے تھے۔ جب وہ گاتے تو ایک سماں بندھ جاتا تھا۔ وہ آہ بھر کر کہتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے لاہور کو کسی کی نظر لگ گئی۔ 1970ء کے بعد لاہور بدلنا شروع ہوا اور اب تو اتنا بدل گیا ہے کہ پہچانا بھی نہیں جاتا۔ پنجاب کے ہر شہر کے لوگوں کی خواہش رہی ہے کہ وہ لاہور میں آکر رہے۔ اس لیے بھی لاہور کی آبادی میں اضافہ ہوگیا اور ان لوگوں کی وجہ سے لاہور کی روایات بگڑ گئیں۔ اب تو ہر شخص کو اپنی پڑی ہے، کسی کو کسی کا ہوش نہیں ہے۔

ایک زمانے میں ہفتے کے سات دنوں میں لاہور میں آٹھ میلے ہوتے تھے جیسا کہ اس کہاوت میں کہا گیا ہے۔

ست دن تے اٹھ میلے
کم کراں میں کیہڑے ویلے

یعنی ہفتے میں دن تو سات ہوتے ہیں لیکن ہر ہفتے آٹھ میلے ہوتے ہیں، میں کام کروں تو کس وقت؟ یہ حقیقت ہے کہ کچھ سال قبل کوئی ہفتہ ایسا نہ تھا جب لاہور میں کوئی میلہ نہ لگایا گیا ہو۔ یا کوئی تہوار ہوتا تھا یا پھر میلہ۔ یہ میلے بڑے پیمانے پر بھی ہوتے تھے اور شہر کے مختلف علاقوں میں بھی کوئی نہ کوئی میلہ یا عرس ضرور ہوتا تھا۔ ہر محلے سے ڈھول پیٹنے کی آوازیں آتی تھیں۔ داتا دربار پر چادریں چڑھائی جاتی تھیں تو یہ بھی ایک تقریب کی شکل ہوجاتی تھی۔ مختلف علاقوں کے لوگ جب چادریں لے کر ڈھول بجاتے ہوئے سڑکوں سے گزر کر داتا دربار تک جاتے تو سڑکوں پر چہل پہل ہوجاتی تھی۔ لیکن اب وہ روایت بھی باقی نہیں رہی۔ اب بہت سے میلے یا تو ختم

ہوگئے ہیں یا پھر ان کے نام بدل جاتے ہیں۔ دراصل اب لوگوں کو فراغت نہیں ہوتی۔ ہر کوئی اپنی مشکل میں گرفتار ہے اوپر سے مہنگائی، لوڈشیڈنگ، گیس شیڈنگ نے لوگوں کی پریشانیوں میں اضافہ کردیا ہے۔ بم دھماکے، دہشت گردی اور چوری ڈکیتی نے بھی سکون غارت کردیا ہے۔ عام لوگ اپنے مسائل میں ایسے پھنسے ہیں کہ تفریح اور میلوں وغیرہ کا ہوش ہی نہیں رہا۔ جب ہر وقت روشنی غائب رہے تو لوگ کیا خوشی منائیں۔

لاہور کے دو بڑے میلے بہت مشہور تھے۔ ایک چھڑیوں کا میلہ اور دوسرا قدموں کا میلہ۔ یہ دونوں میلے باری باری لاہور کے ہر دروازے کے باہر لگتے تھے۔ قدموں کا میلہ کھانے پینے کی چیزوں کا میلہ تھا۔ چھڑیوں کے میلے، کے پیچھے صدیوں پرانی روایت تھی۔ موسم کی تبدیلی کے ساتھ ہی عورت، مرد، جوان، بچے، بوڑھے غرضیکہ خاندان کا ہر فرد اور فقیر، سادھو وغیرہ لاہور کے دروازوں پر ڈیرے لگا لیتے تھے۔ مرد رنگ برنگی پگڑیاں باندھتے تھے۔ عورتیں رنگین لباس اور چاندی کے زیورات پہن کر اور لمبے لمبے گھونگٹ ڈال کر اس میلے میں شریک ہوتی تھیں۔ چھڑیوں کا میلہ خاندان کے ہر فرد کا محبوب میلہ تھا جو بارہ دروازوں کے سامنے بارہ روز تک منایا جاتا تھا۔ اس میلے کا آغاز مستی دروازے سے ہوتا تھا۔ مسلمان عورتوں کا عقیدہ تھا کہ چھڑیوں کے میلے میں چراغ جلانے سے عورتوں کے سہاگ قائم رہتے ہیں اور جو کنواریاں چراغ جلاتی ہیں وہ سہاگنیں ہوکر مرتی ہیں۔

چھڑیوں کے میلے میں عموماً مزدور اور نچلے طبقے کے لوگ شریک ہوتے تھے مثلاً دھوبی، درزی، راج مزدور اور دوسرے کاریگر۔ یہ غریب لوگ ہوتے تھے جو دکانیں لگائی جاتی تھیں ان میں عام استعمال کی چیزیں سستے داموں فروخت ہوتی تھیں۔ یہ میلہ 1966ء تک لگتا رہا پھر ختم ہوگیا۔ اس کی وجہ تھی کہ دکانوں کی بھرمار اور تجاوزات کی وجہ سے دکانیں لگانے کی جگہ ہی باقی نہیں رہی تھی۔ اس کے علاوہ بے انتہا ٹریفک کی وجہ سے بھی میلے کا انعقاد ممکن نہیں رہا تھا۔ لیکن جب میلہ لگا کرتا تھا تو شہر کے زندہ دل دو دو تین تین کی ٹولیوں میں گلی کوچوں میں گھومتے۔ ان کے ہاتھ میں سارنگیاں بھی ہوتی تھیں، یہ مختلف قسم کے گانے گا کر ہر عمر کے لوگوں کا دل لبھاتے تھے۔ یہ دعائیہ نغمے اور لوریاں بھی گاتے تھے۔ لوگ انہیں آٹا دال، چاول، گڑ اور نقدی نذرانے میں دیا کرتی تھیں۔ عورتیں رنگین دھاگوں کی جھالریں بنا کر گھروں میں اور باہر لٹکا دیا کرتی تھیں۔ چھڑیوں کا میلہ جمعرات سے شروع ہوتا تھا اور جمعرات ہی کو ختم ہوتا تھا۔

لاہور کا سب سے مشہور میلہ، میلہ چراغاں ہے جو آج کل بھی شالیمار باغ کے باہر لگتا ہے۔ پہلے یہ باغ کے اندر لگا کرتا تھا۔ دور دور سے لوگ آکر خیمے لگاتے تھے۔ دیہاتیوں کی ٹولیاں، جگتوں اور بولیوں سے رونق لگا دیا کرتے تھے۔

لاہور میں بزرگوں کے عرسوں کے موقعے پر بھی میلے لگتے تھے جو آج بھی لگتے ہیں۔ شادمان میں حضرت شاہ جمال کا عرس بہت زور شور سے منایا جاتا ہے۔ عرس کے میلوں میں دکانیں لگائی جاتی ہیں۔ قوالیاں اور نعتیں گائی جاتی ہیں، سائیں لوگ والہانہ ڈھول کی آواز پر دیوانہ وار رقص کرتے ہیں۔ کچھ بڑے میلوں میں سرکس بھی لگتا ہے اور دوسرے تماشے دکھانے والے بھی اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

چونا منڈی میں بھی ایک میلہ لگتا تھا۔ کشمیری دروازے کی گھاٹی پر اور کوچہ ٹوپیاں میں بھی میلے لگتے تھے۔ لیکن حالات بدل گئے تو لوگوں کے پاس نہ تو وقت رہا نہ فرصت۔ نہ ہی حالات پرسکون اور بے فکری کے ہیں۔ لوگوں کو روزی کمانے، بچوں کو پڑھانے یا نوکریاں کرانے اور دوسرے مسائل کی وجہ سے فرصت ہی رہی ہے نہ ذہنی سکون ہے کہ تفریحات کے لیے وقت نکال سکیں۔

☆☆☆

یہ تو ایک ہندوستانی مصنف کی پُرانے لاہور کی یادیں ہیں۔ اب ایک پُرانے لاہوری کی زبانی بھی پُرانے لاہور کی تصویر دیکھیے۔

بزرگ نے ایک آہ بھرتے ہوئے کہا "آہ، یہ کیسا لاہور ہے، کون سا لاہور ہے۔ مجھے تو یقین ہی نہیں آتا کہ یہ وہی لاہور ہے جہاں میں نے آنکھیں کھولیں، جہاں میرا بچپن اور لڑکپن گزرا تھا۔ جہاں میں نے جوانی کے رنگین اور بے پروا دن گزارے تھے۔ اب تو ہر روز کوئی نہ کوئی فکر لگی رہتی ہے۔ بڑے سے لے کر چھوٹے تک سبھی کی بے فکری جانے کہاں چلی گئی ہے۔ اب تو لاہور سیمنٹ کی اونچی اونچی دیواروں کا ایک جنگل ہے جہاں غلاظت، بدبو، پیٹرول کی بو اور گندے ماحول کی وجہ سے سانس لینا بھی دوبھر ہے۔

ایک زمانہ تھا جب لاہور میں ہر طرف سبزہ اور بڑے بڑے خوبصورت درخت تھے۔ ہر طرف سے سبزے، پھولوں اور درختوں کی خوشبو آتی تھی۔ اندرون لاہور میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بانسوں والی سڑک اور کلیاں والی سڑک ہوتی تھیں۔ روڈ کا نام کوئی نہیں جانتا تھا۔ کوچہ، گلی اور سڑک ہی کو لوگ جانتے تھے۔ پُرانے شہر میں پتلی پتلی بَل کھاتی گلیاں تھیں جن میں نئے آنے والے بھٹک جاتے تھے اور ان بھول بھلیاں میں گم ہوجاتے تھے۔

پُرانے شہر میں اونچے اونچے مکانات ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے لیکن ان میں دم نہیں گھٹتا تھا۔ جب ہوا چلتی تھی تو یہ گلیاں تازہ ہوا سے بھر جایا کرتی تھیں۔ گھروں کے سامنے خوبصورت لکڑی کے جھروکے اور بالکونیاں ہوتی تھیں۔ ان پر خوبصورت نقش ونگار بنے ہوتے تھے۔ کسی پر جانوروں کی تصویریں تو کسی پر پھول بنے نظر آتے تھے۔ مکانوں کے بڑے دروازے بہت خوبصورت لکڑی سے سجائے جاتے تھے۔ انہیں دیکھ کر دل خوش ہوجاتا تھا۔ مختصر یہ کہ پرانا شہر آرٹ سے محبت کرنے والوں کے لیے جنت تھا۔ یہ ہمارا قیمتی قومی ورثہ تھا جسے باہر کے ملکوں کے سیاح بھی دیکھنے آتے تھے اور حیران رہ جاتے تھے۔

بازار اور دکانیں ایک مخصوص حصے میں ہوا کرتی تھیں، یہ نہیں کہ ہر جگہ بازار اور شاپنگ سینٹروں کی وجہ سے انسان کو سانس لینا ہی مشکل ہوجائے۔ لیکن باقی تمام علاقے دکانوں اور کاروباری شور وغل سے محفوظ تھے۔ مَیل روڈ، لارنس روڈ، کوئنز روڈ، مزنگ روڈ، چیمبر لین روڈ، پنج محل روڈ، وارث روڈ، جیل روڈ اور ڈیوس روڈ بہت پرسکون رہائشی علاقے تھے۔ ان علاقوں میں بڑے بڑے کشادہ گھر تھے۔ گھروں میں خوبصورت لان اور باغ تھے جن کی وجہ سے یہ علاقے خوشبو سے مہکتے رہتے تھے۔ موتیا، چنبیلی، رات کی رانی کے پودے اور درخت قریب قریب ہر گھر میں تھے، جن کی وجہ سے نہ صرف گھر بلکہ سڑکیں اور سارا علاقہ خوشبو سے مہکتا رہتا تھا۔ ان میں سے بعض گھروں کے نام بہت دلکش ہوتے تھے جیسے پنکھے والوں کی کوٹھی، بلیوں والی کوٹھی۔

میو گارڈنز، جی او آر، ماڈل ٹاؤن، 1960ء سے پہلے تک بے حد صاف ستھری، خوبصورت اور خوشنما علاقے تھے جہاں جا کر دل خوش ہوجاتا تھا اور دماغ تروتازہ ہوجاتا تھا۔

ان علاقوں میں خاندان کے لوگ بے خوف وخطر ٹہلا کرتے تھے۔ بچے سائیکلوں پر چکر لگاتے تو ماحول میں اور زیادہ خوبصورتی پیدا ہوجاتی تھی۔ کسی کو کسی قسم کا خوف وخطر نہ تھا۔ نہ چوروں کا ڈر نہ لوٹنے والوں کا خوف، علاقے کے رہائشی ایک دوسرے کو بہت اچھی طرح جانتے تھے۔ ان کے درمیان میں رشتے داروں سے زیادہ میل جول اور محبت تھی۔

شام کی چائے گھر والے برآمدے یا لان میں بیٹھ کر پیا کرتے تھے۔ چائے کی مجلسوں میں آس پاس کے گھروں والے بھی اکٹھے ہوکر گپ شپ کیا کرتے تھے۔ ایک ایسا گروپ احمد حسن خاں کا تھا جو عمران خان کے دادا تھے۔ مشہور مصور عبدالرحمن چغتائی اور ان کے بھائی پیر تاج دین، نواب ممدوٹ تقریباً ہر روز ہمارے گھر میں اکٹھے ہوتے تھے۔

پیر تاج دین ہمارے گھر کے نزدیک ہی رہتے تھے لیکن جب ہمارے گھر آتے تھے تو گھوڑے والی بگھی میں سوار ہوکر آتے تھے۔ وہ کبھی پیدل نہیں آتے تھے۔ یہ اس زمانے کی وضع داریاں تھیں۔ ہر شخص اپنی وضع داری نبھاتا تھا۔ نواب ممدوٹ ہمیشہ کالی گاڑی میں سوار ہوکر ہمارے گھر آتے تھے جس پر پاکستان کا جھنڈا لہراتا رہتا تھا لیکن ان کے ساتھ کوئی ملازم یا گارڈ نہیں ہوتا تھا۔ وہ بے تکلف انداز میں خود ہی کار چلاتے ہوئے آجاتے تھے۔

احمد حسن خان کے پاس ہر وقت ایک تھیلا ہوتا تھا جس میں برفی ہوا کرتی تھی۔ یہ برفی وہ بچوں میں تقسیم کرنے کے لیے اپنے پاس رکھتے تھے۔ اسی وجہ سے وہ بچوں میں بہت مقبول تھے اور برفی والے خان صاحب کہلاتے تھے۔ اکثر اندرون شہر کے پرانے دوست بھی ہم لوگوں سے ملنے کے لیے آجاتے تھے۔ پاکستان کے قومی ترانے اور شاہنامۂ اسلام کے مصنف اور مشہور شاعر حفیظ جالندھری بھی ہمارے گھر آیا کرتے تھے۔ وہ بہت مزے دار باتیں کرتے تھے۔ شعر بھی سناتے تھے اور ساتھ ساتھ چٹکلے بھی چھوڑتے رہتے تھے۔

شہر اتنا خاموش اور پُرسکون تھا کہ چڑیا گھر کا شیر جب دہاڑتا تھا تو اس کی آواز دور دور تک سنائی دیتی تھی۔ گرجا گھروں کی گھنٹیوں کی آوازیں بھی بہت دور تک سنائی دیتی تھیں۔ شیر کی دہاڑ سے کمزور دل کے لوگ ڈر جایا کرتے تھے لیکن گرجا گھروں کی گھنٹیوں کی آواز فضاؤں میں دور دور تک موسیقی بکھیر دیا کرتی تھی۔ ایک گرجا گھر کی گھنٹی تو اس طرح بار بار بجائی جاتی تھی کہ واقعی موسیقی کا سماں طاری ہوجاتا تھا اور یہ آواز کانوں کو بہت بھلی لگتی تھی۔

اس زمانے میں دکانیں صبح سویرے کھل جایا کرتی تھیں جہاں شام تک گاہک اپنی ضرورت کا سامان لینے کے لیے آتے تھے۔ بعض دنوں میں دو مانگنے والے خوش آواز فقیر

گانے گاتے ہوئے سڑکوں سے گزرتے تھے اور ہر بنگلے پر رک کر خیرات مانگا کرتے تھے۔ وہ گانے کے ساتھ سارنگی بھی بجاتے تھے۔ ان کے گانے بجانے کی آواز علاقے کے رہائشیوں کو بہت اچھی لگتی تھی اور وہ انہیں خیرات ضرور دیتے تھے۔ خیرات سمجھ کر نہیں بلکہ ان کی موسیقی کا معاوضہ سمجھ کر۔

اداکارہ سلونی (باری ملک کی بیگم)

انارکلی بازار سارے ہندوستان میں مشہور تھا۔ اس بازار میں اس دنیا کی ہر چیز مل جاتی تھی اور قیمت بھی زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ انارکلی بازار کی رونق خواتین کے دم سے تھی۔ وہ رنگین ساڑیوں اور شلوار قمیص میں ملبوس رنگارنگ پھولوں کی طرح لگتی تھیں۔ کالے برقعے والی عورتیں بھی اپنے روشن چہروں کے ساتھ خریداری کرتی ہوئی ماحول میں دلکشی پیدا کردیتی تھیں۔ رنگین لباس میں ملبوس خواتین کی وجہ سے انارکلی کی رونق میں اضافہ ہوجاتا تھا۔ چاٹ کی دکانیں خواتین کے لیے بہت پُرکشش ہوتی تھیں اور ان دکانوں پر ہر وقت خواتین کا ہجوم نظر آتا تھا۔ شاید ہی کوئی خاتون ایسی ہو جو خریداری کے لیے انارکلی آئے اور چاٹ یا دہی بھلے نہ کھائے۔

مال روڈ ایک جدید فیشن ایبل علاقہ تھا۔ یہاں بڑی بڑی بارونق دکانیں تھیں جہاں قیمتی اشیا فروخت ہوتی تھیں۔ گولڈ اسمتھ، رینکن، پٹ مین جیسے ناموں کی دکانوں کی وجہ سے بہت رعب پڑتا تھا۔ کتابوں کی دکانیں بھی پُرہجوم رہتی تھیں۔ ان میں فیروز سنز، بک سینٹر، امپیریل بک ڈپو اور آرٹ پریس زیادہ مقبول تھیں۔ یہاں غیر ملکی انگریزی کتابیں اور میگزینز بھی دستیاب ہوجاتے تھے۔ اس زمانے میں لوگوں کو پڑھنے کا شوق بھی تھا۔ بوڑھے، جوان، مرد وعورت، طالب علم بھی ان دکانوں پر کتابیں اور میگزین دیکھتے نظر آتے تھے۔

انارکلی کے شروع میں بائبل سوسائٹی اسٹور تھا۔ یہاں بائبل کی کتابوں کے علاوہ دوسرے موضوعات کی کتابیں بھی فروخت ہوتی تھیں۔ نیلا گنبد کے شروع میں ہز ماسٹرز وائس کی دکان تھی جس کے باہر ایک تصویر میں کتا گراموفون کے سامنے بیٹھا میوزک سنتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ موسیقی کے رسیا اس دکان پر آتے اور اپنی پسند کے ریکارڈ چن کر لے جاتے تھے۔

اس زمانے میں لاہور میں پبلک ٹرانسپورٹ بہت زیادہ آرام دہ اور سستی تھی۔ ڈبل ڈیکر اورمنی بسیں اور سنگل بسیں ہر وقت سڑکوں پر چلتی نظر آتی تھیں جن کا کرایہ بہت کم تھا۔

بسوں کے علاوہ تانگوں کی سواری کا رواج تھا۔ سجے ہوئے تانگوں پر سجیلے لباس پہنے کوچوان، رنگین پگڑیاں باندھے لوگوں کو متوجہ کرانے کے لیے آوازیں لگاتے رہتے۔ اس زمانے میں آپ اکیلے بھی تانگے میں سفر کرسکتے تھے مگر چار مسافر بھی کم کرائے پر تانگوں میں بڑے آرام سے سفر کرتے تھے اور اکثر تانگے کے سفر ہی میں اچھے واقف کار اور دوست بن جاتے تھے۔ کیا صحت مند اور اچھا ماحول تھا جو زمانے کے ساتھ نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

میونسپل کمیٹی کے خاکروب ہر وقت سڑکوں پر موجود رہتے تھے تاکہ گھوڑوں کی لید اور دوسری گندگی کو صاف کرتے رہیں تاکہ سڑک پر گندگی نظر نہ آئے۔

مال روڈ کا ایک حصہ دکانوں کے لیے وقف تھا۔ مال روڈ اور اس کے کشادہ فٹ پاتھ لوگوں کے لیے بہترین تفریح گاہ تھے۔ مال روڈ خود اس زمانے میں خوبصورتی کا نمونہ تھا۔ سڑک کے ایک جانب سبزے کے چوڑے لان تھے جن میں پھلواری باقاعدگی سے لگائی جاتی تھی۔ خوبصورت سرسبز گھنے درختوں کا سایہ، ان گھاس کے تختوں پر بیٹھ کر لوگ سامنے کے مناظر دیکھتے اور ان سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ فٹ پاتھ پر لاہور کے معززین اور مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے افراد باقاعدگی سے ٹہلا کرتے تھے۔ فٹ پاتھ پر ہی بات چیت ہوجاتی تھی ورنہ مال روڈ کے ریستورانوں میں محفل جماتے تھے۔ مال روڈ کی عمارتیں خوبصورتی کے لحاظ سے دیکھنے کے قابل تھیں جن کی وجہ سے مال روڈ کے وقار اور خوبصورتی میں کئی گنا اضافہ ہوجاتا تھا۔

اس زمانے کا لاہور سبزہ زاروں، پھولوں، درختوں اور خوبصورت عمارتوں کا پرسکون شہر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سارے ہندوستان میں کہا جاتا تھا کہ جس نے لاہور نہیں دیکھا سمجھو کہ وہ پیدا ہی نہیں ہوا۔ اب تو لاہور نہ جانے کہاں چلا گیا ہے۔ تاریخ کے اوراق میں گم ہوگیا ہے مگر لاہور کے پُرانے شہریوں کی یادوں میں آج بھی آباد ہے..... آہ لاہور۔

☆☆☆

اس بار ملک باری کی پنجابی فلم ''یکے والی'' کے بارے میں نئی نسل کو آگاہ کرنا مقصود ہے۔ قدرت کی ستم ظریفی یہ ہے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کہ اس فلم کے پروڈیوسر وہی ملک باری تھے جن کی بھارت سے درآمد ہونے والی فلم ''جال'' کے خلاف پوری پاکستانی فلمی صنعت نے پرزور احتجاج کیا تھا جس کے نتیجے میں تقریباً تمام اہم اور ممتاز فلم ساز، ہدایت کار، اداکار اور موسیقار وغیرہ جیلوں میں بند کیے گئے تھے۔ اس احتجاج کے بعد بھارتی فلموں پر مکمل پابندی تو نہیں لگائی گئی مگر کچھ شرائط کے ساتھ چند بھارتی فلموں کی درآمد جاری رہی مگر جب فلم تقسیم کاروں اور سنیما والوں نے اس اصول کو بھی بالائے طاق رکھ کر کامیاب ترین بھارتی فلمیں دھڑا دھڑ منگوانی شروع کردیں تو پاکستانی فلمی صنعت نے ایک بار پھر بہت پُرزور احتجاج کیا۔ لاہور سے اسلام آباد تک مارچ کیا گیا۔ اس قدر ہنگامہ برپا کیا گیا کہ اس وقت کے صدر ایوب خان نے اس مسئلے کا نوٹس لے کر وزیر قانون خورشید صاحب کو اس بارے میں ایک قانون بنانے کا حکم دیا جس کے تحت نہ صرف بھارتی فلموں کی درآمد مکمل طور پر ممنوع قرار دی گئی بلکہ درآمد شدہ پُرانی بھارتی فلموں کی نمائش پر بھی پابندی عائد کردی گئی۔ پاکستان کی تاریخ میں صرف صدر ایوب خان ایسے صدر تھے جنہوں نے ملکی و قومی صنعت کے تحفظ اور ترقی کے لیے کوئی ٹھوس قدم اُٹھایا تھا۔ یہ قانون آج بھی موجود ہے۔ اس کی تفصیلات بیان کرنے کا یہ مناسب وقت نہیں ہے لیکن آج اس قانون کی کھلے عام خلاف ورزی کی جارہی ہے۔ وہی تقسیم کار اور سنیما اونرز جنہوں نے پابندی کے بعد پاکستان میں فلمیں، فلم اسٹوڈیوز اور سنیما گھر بنانے شروع کردیے تھے، آج وہی نت نئی تاویلوں کے ذریعے بھارتی فلمیں درآمد کررہے ہیں اور ان کی حمایت میں شور مچا رہے ہیں۔

مقصد صرف یہ بیان کرنا تھا کہ یہ تقسیم کار اور سنیما اونرز جو بھارتی فلموں پر پابندی کے مخالف تھے انہوں نے اس کے بعد فلم سازی شروع کردی۔ نگار خانے بنائے اور پاکستان کی فلمی صنعت کی ترقی میں نمایاں حصہ لیا۔ بھارتی فلموں کی درآمد سے جو آمدنی ہوتی تھی فلم سازی کے ذریعے اس سے کہیں زیادہ آمدنی ہونے لگی، یہ لوگ کروڑ پتی اور ارب پتی بن گئے لیکن جائز طریقے سے۔ آج پھر وہی حالات درپیش ہیں۔ حکومت کی پالیسی اور ان لوگوں کی ملی بھگت سے پاکستان میں اَن پڑھوں، بدمعاشوں اور اسمگلروں نے بے ہودہ اور بے مقصد پنجابی فلمیں بنائیں اور قومی زبان کی فلموں کا خاتمہ کردیا۔ اب یہ کہتے ہیں کہ یہاں تو فلمیں ہی نہیں بنائی جارہی ہیں تو سنیما گھر کیسے چلائیں؟

اب فلم ''یکے والی'' کی داستان سنیے۔ بھارتی فلموں کی بندش کے بعد جن بڑے بڑے نامور تقسیم کاروں نے فلم سازی کی طرف توجہ دی۔ اسٹوڈیوز کرائے پر حاصل کیے اور پھر شاندار نگار خانے تعمیر کیے۔

باری ملک کی مختصر کہانی یہ ہے کہ ایک زمانے میں وہ ''مقدر کے سکندر'' کہلاتے تھے اور مٹی کو بھی ہاتھ لگاتے ہیں تو وہ سونا بن جاتی ہے۔ باری صاحب 5 ستمبر 1923ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ ککے زئی برادری سے ان کا تعلق ہے۔ ان کے والد ایک نیک اور پرہیزگار انسان تھے۔ لنڈے بازار میں ان کے پُرانے کپڑوں کا کاروبار تھا۔

باری ملک بی اے پاس کرنے کے بعد معاش کے لیے ریلوے کے محکمے میں تیس روپے ماہوار پر ملازم ہوگئے۔ ایک انٹرویو کے لیے دہلی گئے اور وہاں سے بمبئی چلے گئے۔ وجہ یہ تھی کہ وہ بے حد خوبصورت نوجوان تھے اور دوست احباب انہیں فلمی اداکار بننے کا مشورہ دے رہے تھے۔ دوسرے بمبئی میں فلم ساز و ہدایت کار نذیر صاحب موجود تھے جن کی باری صاحب سے رشتہ داری بھی تھی۔

نذیر صاحب کو باری ملک اتنے پسند آئے کہ انہوں نے انہیں اپنی صاحب زادی کے لیے منتخب کرلیا اور اداکار بنانے کے بجائے انہیں فلم تقسیم کار بنا دیا، وہ اس طرح کہ پاکستان آنے والی نذیر صاحب کی تمام فلمیں انہی کے ذریعے نمائش کے لیے پیش کی جانے لگیں۔ اسی طرح باری صاحب بیٹھے بٹھائے ایک بہت کامیاب تقسیم کار بن گئے۔ بعد میں مختلف وجوہ کی بنا پر ان کی شادی نذیر صاحب کی صاحب زادی سے نہ ہوسکی۔

نذیر صاحب نے ملک باری کو شریک بنا کر ایک فلم ''ہیر رانجھا'' بنانے کا منصوبہ بنایا جو مکمل نہ ہوسکا لیکن ان دونوں کے اشتراک سے پہلی فلم قیام پاکستان کے بعد ریلیز ہوئی جس کا نام ''بھیگی پلکیں'' تھا۔ یہ فلم کامیاب نہ ہوسکی لیکن دوسری فلم ''شہری بابو'' سپرہٹ ثابت ہوئی۔ نذیر صاحب اور ملک باری کا اشتراک ختم ہوگیا تو باری صاحب نے بطور فلم ساز پہلی پنجابی فلم ''ماہی منڈا'' بنائی جس میں مرکزی کردار مسرت نذیر اور سدھیر نے ادا کیے تھے۔ اس فلم پر سنسر نے کئی اعتراضات کیے، لیکن بالآخر یہ فلم نمائش کے لیے پیش کی گئی اور بہت کامیاب ہوئی۔ اس فلم کی کامیابی نے ملک باری کے حوصلے بڑھا دیے۔ انہوں نے دوسری پنجابی فلم ''یکے والی'' کے نام سے شروع کی۔ اس فلم میں بھی مسرت نذیر اور

رنگیلا اور صائقہ

سدھیر مرکزی کردار تھے۔ دوسرے اداکاروں میں اجمل، الیاس کاشمیری، غلام محمد، نذر، ظریف، رنگیلا (یہ ابھی ہیروئن نہیں بنی تھیں) شامل تھے۔ فلم کی کہانی شیخ اقبال نے اور مکالمے اور گانے احمد راہی نے لکھے تھے۔ جی اے چشتی اس کے موسیقار تھے۔ یہ فلم اس وقت ملک اسٹوڈیو زمین بنائی گئی تھی جو مال روڈ پر تھا۔ یہ تقسیم سے پہلے پنچولی اسٹوڈیو تھا جو ملکہ پکھراج کو الاٹ ہوا تھا۔ بعد میں اس کا نام جادو اس اسٹوڈیو ہوگیا تھا۔

''یکے والی'' کے ہدایت کار ایم جے رانا تھے اور انہوں نے ہی اس کا بہت اچھا منظر نامہ لکھا تھا۔ پرویز اس کے عکاس تھے۔ ''یکے والی'' کی کہانی خصوصاً مسرت نذیر کے کردار پر بہت اعتراضات کیے گئے تھے لیکن یہ فلم نمائش کے روز ہی سپرہٹ قرار دی گئی۔ اس زمانے میں باری ملک نے اس فلم سے 3540 لاکھ روپے کمائے تھے جو آج کل کے کروڑوں کے برابر ہے۔ اس فلم نے صحیح معنوں میں باری ملک کے دن پھیر دیے اور وہ دولت میں کھیلنے لگے۔ اس فلم کی مقبولیت کا عالم تھا کہ یہ جتنی بار نمائش کے لیے پیش کی گئی، فلم بین اسے دیکھنے کے لیے ٹوٹ پڑے۔ ''یکے والی'' ملک باری کے لیے الہ دین کا چراغ ثابت ہوئی تھی۔ ملک باری آج بھی بقید حیات ہیں۔ ان کی دوسری بیگم اداکارہ سلونی انتقال کرچکی ہیں۔

''یکے والی'' کی کہانی کا خلاصہ ذیل میں پیش کیا جارہا ہے۔

فلم کی کہانی میں ایک نیا پن تھا۔ فلم کی ہیروئن مسرت نذیر (لالی) ایک نابینا غریب دیہاتی کی بیٹی ہے جس کا نام دارا ہے۔ دارا گھر میں رسی کے گولے بنانے کے سوا اور کوئی کام نہیں کرسکتا تھا۔ یہ کردار اس وقت کے نامور کیریکٹر ایکٹر اسلم نے کیا تھا۔ دارا دنیا کو دکھانے کے لیے اندھا بنا ہوا ہے لیکن دراصل اندھا نہیں ہے۔ دن بھر جھونپڑی میں بیٹھ کر رسیاں بنانے والا یہ اندھا دراصل ایک ڈاکو تھا جو رات کے وقت ڈاکے ڈالتا تھا۔ اس حقیقت سے اس کے بچے بھی ناواقف تھے۔ مسرت نذیر کے علاوہ اس کی ایک چھوٹی بیٹی اور بیٹا بھی تھا۔

مسرت نذیر اور بہار

لالی (مسرت نذیر) باپ کی معذوری کے باعث روزی کمانے کے لیے تانگہ چلایا کرتی تھی اور یکے والی مشہور ہوگئی تھی۔ اس کو کوچوانی سکھانے کے لیے ایک ''یکہ اور گھوڑا'' خریدا گیا تھا۔ فلم مکمل ہونے کے بعد بھی باری صاحب کبھی کبھی اس کو استعمال کیا کرتے تھے۔

لالی صبح سویرے یکہ لے کر ریلوے اسٹیشن جاتی تھی جہاں شہر سے آنے والے مسافر اس کی آمدنی کا ذریعہ تھے۔ ایک روز ایک شہری بابو ریلوے اسٹیشن پر اُترا۔ اس کو باؤ اسلم کہا جاتا تھا۔ یہ کردار لالہ سدھیر نے ادا کیا تھا۔ اس کا دوست بھی تھا۔ یہ کردار نذر نے ادا کیا تھا۔ وہ بہرہ تھا، مگر جب کوئی اونچی آواز میں اس کے سامنے بولتا تو وہ ناراض ہوکر کہتا ''میں کوئی بہرہ تو نہیں ہوں، آہستہ بولو۔''

حسب معمول فلم میں ایک ولن بھی تھا۔ یہ کردار الیاس کاشمیری نے ادا کیا تھا۔ وہ بھی کوچوان تھا اور شما کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ الیاس کاشمیری نے یہ کردار بہت خوبصورتی سے ادا کیا تھا۔ فلم سازی شروع ہونے سے پہلے وہ کئی دن تک کوچوانوں کی صحبت میں بیٹھ کر ان کی عادات و اطوار سیکھتے رہے۔ انہوں نے ایک طرح دار کوچوان سے دوستی کرلی اور فلم میں اسی کے کردار کو پیش کیا۔ یہ کوچوان پانچ روپے روزانہ لے کر انہیں کوچوانی بھی سکھاتا تھا۔

فلم میں ایک اہم کردار ''مامے'' کا تھا جو ظریف نے ادا کیا تھا۔ ماما گاؤں کا منصف تھا جو اپنی پیڑھی ساتھ لیے ہوئے گھومتا تھا۔ جہاں دو عورتیں جھگڑتی نظر آتیں، ماما وہیں اپنی پیڑھی بچھا کر عدالت لگا لیتا تھا۔ وہ عجیب و غریب دلچسپ فیصلے کیا کرتا تھا اور فلم کا ایک مقبول کردار تھا۔ اس کے فیصلے مضحکہ خیز ہوتے تھے۔ مثلاً دو عورتیں ایک بھٹی لگانے کے لیے جھگڑ رہی ہیں۔ ماما فیصلے میں ایک عورت سے کہتا ہے کہ تو بھٹی بناتی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جا اور دوسری سے کہتا ہے کہ تو بھٹی گراتی رہ۔

نیلو نے ایک نوخیز دوشیزہ کا کردار ادا کیا تھا جو مسرت نذیر کو مردانہ لباس میں دیکھ کر اس سے محبت کرنے لگتی ہے۔

باؤ اسلم گاؤں میں اپنی زمینیں دیکھنے کے لیے آیا تھا۔ لالی اس کو اس کی حویلی پہنچا دیتی ہے۔ کوچوان شالالی کے باپ کے پاس رشتہ بھیجتا ہے جس کو وہ ٹھکرا دیتا ہے۔ اسی طرح وہ دشمن بن جاتا ہے۔ ادھر لالی اور باؤ اسلم ایک دوسرے کو پسند کرنے لگتے ہیں کیونکہ لالی کے تانگے میں ہی باؤ اسلم گاؤں میں گھومتا ہے، لالی کی ایک سہیلی (زینت) اسلم کے دوست کی محبت میں گرفتار ہو جاتی ہے۔

شہری بابو اور لالی کی محبت کی وجہ سے شا اسلم کا دشمن ہو جاتا ہے۔ اور دوستوں کے ساتھ حملہ کر کے اسے زخمی کر دیتا ہے۔ لالی کے چھوٹے بھائی نکو کو دوست طعنہ دیتے ہیں کہ تمہاری بہن شہری بابو کے عشق میں گرفتار ہو گئی ہے تو وہ ان سے لڑ پڑتا ہے۔ اس کے ہاتھوں ایک لڑکا زخمی ہو جاتا ہے تو نکو ڈر کر گاؤں سے بھاگ جاتا ہے۔

ایک رات دارا ڈاکو کے روپ میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ ڈاکا ڈالنے جاتا ہے جہاں گاؤں والے ڈاکوؤں کا مقابلہ کرتے ہیں۔ دارا زخمی ہو کر بھاگتا ہے اور شا کو چوان کے گھر میں پناہ لیتا ہے جو اس کا راز جان لیتا ہے اور اپنی زبان بند رکھنے کے لیے اس سے لالی کا رشتہ طلب کرتا ہے۔ لالی ان دونوں کی باتیں سن لیتی ہے۔ ان ہی دنوں اسلم کے اصرار پر اس کا باپ شہر سے لالی کا رشتہ لینے گاؤں آتا ہے۔ برات آتی ہے تو ناراض ہو کر شا لالی کے باپ دارا کی حقیقت بتا کر اسے گرفتار کرا دیتا ہے۔ رنگ میں بھنگ پڑ جاتی ہے اور اسلم کا باپ یہ کہہ کر برات واپس لے جاتا ہے کہ ایک غریب کی بیٹی کو تو میں بہو بنا سکتا ہوں، مگر ایک ڈاکو کی بیٹی میری بہو نہیں بن سکتی۔ برات واپس لوٹ جاتی ہے۔

لالی کو بے آسرا پا کر شا اس سے دست درازی کرتا ہے۔ وہ اپنی عزت بچانے کے لیے شہر بھاگ جاتی ہے۔ وہ یکے میں اپنی چھوٹی بہن شادو کو بھی شہر لے جاتی ہے۔

شہر میں وہ ایک بستی میں مکان کرائے پر لے کر رہتی ہے۔ یہیں مینو (نیلو) لڑکا سمجھ کر اس کی محبت میں گرفتار ہو جاتی ہے۔

ایک دن لالی کا چالان ہو جاتا ہے اور پولیس اس کو عدالت میں پیش کرتی ہے۔ شا جو مستقل اس کا پیچھا کر رہا ہے، عدالت سے درخواست کرتا ہے کہ میری درخواست پر کوچوان کی پگڑی اتروائیں۔ اس درخواست پر عدالت حیران ہوتی ہے مگر جب لالی کو پگڑی اتارنے کا حکم دیتی ہے اور وہ مجبوراً تعمیل کرتی ہے تو اس کی زلفیں بکھر جاتی ہیں اور اس کے عورت ہونے کا راز ظاہر ہو جاتا ہے۔

عدالت میں شا کے کہنے پر وکیل دلیل دیتا ہے کہ ایک عورت کو شہر میں تانگہ چلانے کا لائسنس نہیں مل سکتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ لائسنس کے بغیر تانگہ چلا کر جرم کر رہی ہے۔

لالی عدالت سے سوال کرتی ہے کہ جناب والا، اگر ایک عورت کو جسم فروشی کا لائسنس مل سکتا ہے تو تانگہ چلانے کا لائسنس کیوں نہیں مل سکتا؟ یہ کیسا قانون ہے جو عورت کو رزق حلال کمانے کی اجازت نہیں دیتا۔

عدالت لاجواب ہو کر اسے رہا کر دیتی ہے۔ عدالت کے باہر شا اپنے ساتھیوں کے ہمراہ اس کو اغوا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کا بھائی نکو عین وقت پر پہنچ کر بدمعاشوں سے مقابلہ کرتا ہے اور ایک بلند عمارت سے گر کر مر جاتا ہے۔ شا کو پولیس گرفتار کر لیتی ہے۔ اس طرح اسلم اور لالی کا دوبارہ ملاپ ہو جاتا ہے۔ اسلم کا باپ بھی رضامند ہو جاتا ہے اور دونوں کی شادی ہو جاتی ہے۔

اس کہانی کا بنیادی خیال سعادت حسن منٹو کے افسانے "لائسنس" سے لیا گیا تھا۔ جسے بہت خوبی سے فلم میں استعمال کیا گیا۔

یہ فلم 22 جنوری 1957ء میں ریلیز کی گئی تھی۔

"یکے والی" ہر اعتبار سے ایک دلچسپ اور اچھی فلم تھی۔ کہانی اور اسکرین پلے میں دلکشی اور تسلسل تھا۔ اداکاری کا معیار بہت اچھا تھا۔ مسرت نذیر ساری فلم پر چھائی ہوئی تھیں۔ ان کے اندھے باپ کا دُہرا کردار اجمل صاحب نے بہت خوبی سے نبھایا تھا۔ نیلو کا کردار بہت دلچسپ تھا۔ وہ مسرت نذیر کو ایک لڑکا سمجھ کر اس سے جب اظہارِ محبت کرتی ہیں تو مسرت کا ردِعمل بہت دلچسپ اور خوبصورت تھا۔ نذر کے علاوہ ظریف نے بھی ایک بہت انوکھا اور دلچسپ کردار کیا تھا۔ فلم کے نغمات اور ہدایت کاری بھی بہت اچھی تھی۔ تمام مناظر انتہائی نظر فریب تھے اور عمدگی سے فلمائے گئے تھے۔

یکے والی پنجابی فلموں میں ایک انوکھا اور خوبصورت تجربہ تھا جسے فلم بینوں نے بہت سراہا تھا اور فلم ساز نے اپنی تجوریاں بھر لی تھیں۔ ملک باری جو ایک زمانے میں تقسیم کار کی حیثیت سے پاکستان میں بھارتی فلموں کی درآمد کے حق میں تھے اُن پر پابندی عائد ہونے کے بعد ہی فلم ساز، اسٹوڈیو اونر اور دولت مند بن گئے تھے۔ ایک زمانے میں وہ آغا جی اے گل کے ہمسر سمجھے جاتے تھے اگرچہ یہ تاثر درست نہ تھا۔

جاری ہے

پراسرار پرچم

درفش کاویانی۔ دو الفاظ کا مجموعہ یا مرکب ہے۔ درفش اور کاویانی۔ درفش فارسی زبان کا مذکر لفظ ہے جو کئی معنوں میں مستعمل ہے۔ 1) موچی کا سوا جس سے چمڑے میں دھاگا پرویا اور چمڑا گانٹھا جاتا ہے۔ 2) روشنی۔ چمک دمک۔ بجلی۔ روشنی چمکنے والی شے۔ 3) رومال جو لڑائی کے وقت سر پر باندھ لیتے ہیں۔ 4) جھنڈا۔ پرچم۔ نشان۔ جو جنگوں میں کھڑا کیا جاتا ہے نیز وہ ریشمی سہ گوشہ طلائی کام کیا ہوا کپڑا جو عموماً جھنڈے کے سرے پر لگایا جاتا ہے چونکہ درفش کا معنی لرزیدن (ہلنا۔ جھولنا) آتا ہے اور یہ سہ گوشہ طلائی ریشمی کپڑا ہوا کے جھونکوں سے اُڑتا اور لہراتا رہتا ہے، لہٰذا درفش کے نام سے موسوم ہو کر رائج ہو گیا۔ کاوہ یا گاوہ، اصفہان کے ایک مشہور لوہار کا نام ہے جس نے اپنی چمڑے کی دھونکنی سے جھنڈا بنایا تھا۔ گاؤ زور یعنی شہ زور۔ طاقت ور۔ فارسی میں گاؤ۔ نر گائے (بیل) کے لیے مستعمل ہے جبکہ اردو میں مادہ (گائے) کے واسطے مخصوص ہے۔ گاؤ زور۔ وہ شخص جو کشتی کے داؤ پیچ میں مشاق نہ ہو مگر کمال کی طاقت رکھتا ہو۔ اسی سے

محو حیرت ہوں

قارئین:

اس دنیا میں پراسرار شخصیتوں، مقامات کی تعداد کا شمار نہیں۔ ہر ملک و شہر میں کسی نہ کسی پراسرار شخصیت، مقام کا تذکرہ ضرور سننے میں آجائے گا مگر یہاں صرف ان پراسرار مقامات، شخصیتوں کا ذکر ہے جن کے بارے میں ایک دنیا قیاس آرائی میں مصروف ہے، جن مقامات، شخصیت پر پردہ ہنوز برقرار ہے۔ حقیقت کیا ہے، اس بارے میں کسی کو کچھ پتا نہیں۔

اسرار کے پردے میں چھپے مقامات و افراد کا تذکرہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ترکیب گاؤزوری بنی ہے یعنی گائے کی سی طاقت دکھانا۔

درفش کاوہ یا گاوہ۔ درفش کاویاں۔ درفش کاویانی۔ اس میں یاں اور یانی صرف نسبت ہے یعنی وہ جھنڈا مع پھریرہ جو کاوہ یا گاوہ آہن گر (لوہار) سے نسبت رکھتا ہے۔ ضحاک بادشاہ کے عہد میں اصفہان (ایران) کے لوہار کاوہ کا بنایا ہوا انقلابی جھنڈا جس کی وجہ سے فریدوں نے ضحاک پر فتح حاصل کی تھی، اس اجمال کی تفصیل کے لیے ہمیں کئی صدیاں پیچھے جانا ہوگا۔ آج سے تقریباً اڑھائی ہزار برس پہلے (کم وبیش چھٹی صدی قبل از مسیح) کا ذکر ہے، ایران میں جمشید بادشاہ کی حکومت تھی، وہی جمشید بادشاہ جس سے شراب کی ایجاد اور جام جم یا جام جہاں نما منسوب ہے۔ ضحاک بن علوان نے جمشید کو قتل کردیا اور خود بادشاہ بن گیا۔ ضحاک پسر علوان فطری طور پر انتہائی ظالم، سفاک، بے رحم اور عیاش تھا چنانچہ عیاشی، بدکرداری اور رنگ رلیوں کے سبب اس کے جسم میں کوئی ایسا خراب وفاسد مادہ پیدا ہوگیا کہ دونوں کندھوں پر رسولی کی مانند گوشت کے دو لوتھڑے سے ابھر آئے جو آئے دن بڑھنے اور بدنما لگنے لگے۔ اس پر ضحاک نے ان دونوں لوتھڑوں کو کٹواڈالا مگر نتیجے میں وہ سخت درد کے عذاب سے دوچار ہوگیا۔ شاہی طبیبوں، حکیموں اور جراحوں کی تمام تر کوششوں کے باوجود درد کا درماں نہ ہوسکا۔ کرب میں مبتلا بادشاہ سبھی کے لیے آزار اور مصیبت کا باعث بن گیا۔

.... بلآخر بڑے سوچ بچار کے بعد باہم مشورے سے ایک ایسا مرہم تجویز کیا گیا جس میں چربی کی جگہ کم از کم دو آدمیوں کا بھیجا (مغز) ڈالا جاتا تھا جب تک یہ مرہم لگا رہتا درد میں کمی رہتی، تسکین رہتی لیکن مرہم خشک ہونے پر پھر وہی تکلیف شروع ہوجاتی۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ ضحاک نے خواب دیکھا تھا کہ اس سرطانی مرض کا یہی اک چارہ ہے سو اس مرہم کے لیے ضحاک نے پہلے تو قیدیوں اور مجرموں کے دماغ نکلوانے شروع کیے۔ کچھ عرصہ گزرا تو قیدیوں اور مجرموں کے بعد عام لوگوں کی باری آئی۔ ضحاک ہر محلّے سے دو یا چار آدمی منگواتا اور انہیں مروا کر مرہم کے لیے مغز نکلواتا۔ اس کا یہ لاعلاج موذی روگ اور شدید درد خود اس کے لیے اور ساتھ ہی خلق خدا پر بھی مہلک عذاب بن گیا۔ انسانی قتل کا شیطانی سلسلہ جاری رہا۔ آخرکار اصفہان کا، کاوہ نامی لوہار اس اندھے ظلم کے خلاف اُٹھ کھڑا ہوا جس کے اپنے چار بچے اس شاہی درندگی کی بھینٹ چڑھ چکے تھے۔ کاوہ لوہار نے اپنی دکان کو تالا لگایا اور جس چمڑے کو اہرن (آہنی چوکور ٹکڑا جس پر ہتھوڑے سے لوہا کوٹتے ہیں) کے نیچے بچھا کرتا تھا، اسی چمڑے کو پھریرہ بنا کر ایک لکڑی پر لٹکا دیا اور ڈھول بجاتا ضحاک کے ظلم کا راگ گاتا اصفہان کے گلی کوچوں میں گھومنے، چکر لگانے لگا۔ ظلم وجبر سے تنگ آئے ہوئے ستم زدہ لوگ اس کے ہمراہ اور ہمنوا ہوتے گئے۔ رفتہ رفتہ سارا اصفہان اس کے ساتھ ہوگیا۔ اس جذبے اور یقین کے تحت کہ یہ درفش کاویانی خدائی جھنڈا ہے جو جہاد کی علامت بن گیا ہے۔ اتفاق واتحاد کا جذبہ رنگ لایا۔ پہلے اصفہان کے حاکم کو تہ تیغ کرکے شہر پر قبضہ کیا گیا پھر مختلف شہروں میں موجود ضحاک کے لشکروں کو پے درپے مسلسل شکستیں دی گئیں۔ اصفہان سے نکل کر دیگر کئی قلعوں اور شہروں پر بھی فتح حاصل کی گئی۔ چمڑے کا پھریرہ مقدس نشان اور فتح کی علامت قرار پایا۔ چمڑے پر قیمتی چمک دار اور چنیدہ زر و جواہر ٹانک کر اسے باقاعدہ درفش کاویانی کا نام دیا گیا۔ جب کاوہ حدا ضحاک کی فوج کا صفایا کرتا ملک رے (عراق) پہنچا تو سب کو جمع کرکے آخری جنگ سے متعلق صلاح ومشورہ کیا گیا۔ اس دوران سب نے متفقہ طور پر ضحاک پسر علوان بادشاہ کے مقابل کاوہ لوہار کی حکمرانی کا فیصلہ کیا لیکن کاوہ نے صاف انکار کردیا کہ مجھے اس شاہی منصب کا بالکل بھی حق نہیں بلکہ فریدوں پسر جمشید اس سلطنت کا صحیح وارث ہے۔ فریدوں کی تلاش ہوئی تو خوش قسمتی سے وہ ملک رے (عراق) میں مل گیا۔ باقاعدہ رسم کے بعد فریدوں پسر جمشید کی بادشاہت کا اعلان کیا گیا۔ یوں فریدوں بادشاہ کی قیادت میں آخری اور فیصلہ کن جنگ لڑی گئی اور درندہ صفت غاصب ضحاک پسر علوان قتل ہوکر اپنے بد انجام تک پہنچا۔ کاوہ لوہار نے بیس برس تک بادشاہ فریدوں پسر جمشید کا ساتھ دیا۔ چین، روم اور ترکستان کے علاقے زیرنگیں ہوئے۔ تمام جنگوں اور فتوحات میں درفش کاویانی لشکر کا علم بنا رہا، تمام تر جنگی کامیابیاں اور عسکری کامرانیاں اسی جھنڈے کی برکت سمجھی گئیں۔ جو کچھ مالِ غنیمت آتا اس کا ایک حصہ درفش کاویانی پر چڑھا دیا جاتا۔ جب کاوہ لوہار اس فانی دنیا سے چل بسا تو فریدوں بادشاہ نے جھنڈا اپنے قبضے میں کرلیا۔ اپنا عروج اس چمڑی پھریرے کی برکت گردان کر نہایت بیش قیمت جواہرات سے اسے اور بھی مزین، مرصع کردیا بلکہ مزید آگے بڑھ کر اس زر و جواہر بھرے چمڑے کے جھنڈے پر ریشم بھی مڑھ دیا اور اسے باضابطہ آئینی اور شاہی پرچم قرار دیا۔ وقت نے اس شاہی پرچم کو بڑی شان وشوکت عطا کی۔ درفش کاویانی کی اس قدر دھاک بیٹھ گئی کہ کسی بھی جنگ میں مخالف بادشاہ کثیر فوج رکھنے کے باوجود جب یہ دیکھتا اور سنتا کہ مقابل میں درفش کاویانی لہرا رہا ہے تو وہ نفسیاتی طور پر مرعوب ہوکر ہار مان لیتا۔ یہ جھنڈا ایران کے آخری ساسانی بادشاہ یزدگرد کے زمانے تک فتح ونصرت کی علامت بنا رہا اور اس قدر بیش قیمت ہوگیا کہ جوہریان زمانہ اس کی قیمت آنکنے سے عاجز آگئے۔ جھنڈے کا چمڑا قیمتی جواہرات تلے دب کر بوسیدہ اور پوشیدہ ہوگیا۔ تقریباً گیارہ صدیوں تک کاوہ لوہار کا درفش کاویانی پوری آن بان کے ساتھ قائم رہا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد مبارک میں لشکر اسلام نے ایران فتح کیا اور درفش کاویانی مدینہ میں خلیفہ دوم کے روبہ رو پیش کیا گیا تو آپؓ نے درفش کاویانی کے تمام جواہرات مجاہدین میں بانٹ دیے، چمڑے کو جلا کر خاکستر کردیا اور فرمایا ”دیکھو، سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی بھی چیز یہ طاقت نہیں رکھتی کہ انسان کی مدد وحمایت کرسکے، لہٰذا جو شخص کاوہ لوہار کے جھنڈے پر ایمان ویقین رکھے، اسے لوہار کے لوہے سے ہی قتل کردیا جائے۔“ یوں درفش کاویانی کے عروج وزوال کی تکون (ابتدا، انتہا اور خاتمہ) مکمل ہوگئی۔ ایران کے لازوال شاعر اور فارسی کے خدائے سخن فردوسی نے شاہ نامہ تخلیق کیا تو اپنے منظوم شاہ پارے میں اس نے درفش کاویانی کے حوالے سے خوب خوب داستان آرائی کی۔

مرسلہ: محمد ایاز راہی، مانسہرہ، ہزارہ

وہ کون تھی

وہ قبرستان ایک وسیع آبادی کے درمیان کچھ یوں واقع ہے کہ اس کی ایک جانب بڑی سڑک اور بقیہ اطراف میں احاطے کے ساتھ ساتھ مکانات پھیلے ہوئے ہیں۔ ان دنوں میرے اوقات کار کچھ ایسے تھے کہ واپسی رات کے بارہ، ایک بجے سے پہلے نہیں ہوتی تھی۔ قبرستان کے گرد چکر کاٹ کر گھر پہنچنے میں خاصا وقت ضائع ہوتا جسے بچانے کے لیے میں قبروں کے درمیان بنے ہوئے ٹیڑھے میڑھے راستے سے ہوتا ہوا گھر تک پہنچ جاتا تھا۔

دن میں شاید وہ شارٹ کٹ بہت مصروف رہتا ہو لیکن رات گئے وہاں بھیانک سناٹے کا راج ہوتا تھا۔ میں اکیلا ہوتا تو وہاں سے بے خوف وخطر گزر جاتا تھا لیکن اکثر وہاں ایک اجنبی بھی نظر آتا تھا۔ کبھی وہ مجھ سے چند قدم آگے اور کبھی پیچھے ہوتا تھا...... اس سے کبھی تعارف کی نوبت یوں نہیں آئی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

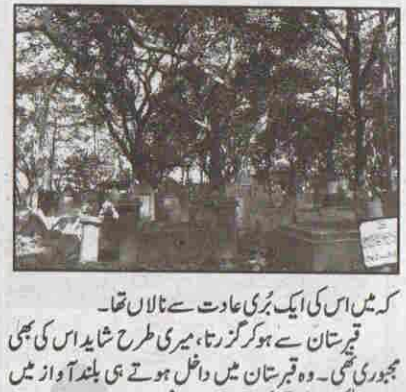

کہ میں اس کی ایک بُری عادت سے نالاں تھا۔

قبرستان سے ہو کر گزرتا، میری طرح شاید اس کی بھی مجبوری تھی۔ وہ قبرستان میں داخل ہوتے ہی بلند آواز میں السلام علیکم یا اہلِ قبور کہتا پھر اپنے لاشعوری خوف پر قابو پانے کے لیے قدرے بلند آواز میں خود کلامی کرتے ہوئے وہ راستہ طے کرتا تھا۔ چاندنی راتوں میں اس کا وہ معمول قابلِ معافی تھا لیکن اندھیری راتوں میں اس کی بے معنی بڑبڑاہٹوں سے مجھے آسیبی خوف محسوس ہوتا تھا۔

ایک روز میں قبرستان میں داخل ہو رہا تھا کہ کچھ دور سے اس کا بے ہنگم ہیولا آتا ہوا نظر آیا۔ میں فوری خیال کے تحت جلدی سے احاطے میں داخل ہوا اور ایک شکستہ قبر کی بوسیدہ لوح کے پیچھے دبک کر بیٹھ گیا۔ چند لمحوں بعد اس نے اندر آتے ہی اہلِ قبور کو اپنا سلام پیش کیا تو میں نے لوح کے پیچھے سے اپنا ہاتھ لہرا کر اونچی اور بھاری آواز میں وعلیکم السلام کہا۔ رات کی سیاہی اور قبرستان کے سناٹے میں میری آواز نے اس بے چارے کے اوسان خطا کر دیے۔ اس نے زور سے ایک خوف زدہ چیخ ماری اور گھگیاتا ہوا وہاں سے بگٹٹ بھاگا۔ پل بھر میں وہ واپس نکل گیا۔ اس کی ابتر حالت پر مجھے شرمندگی ہوئی۔ میں نے باہر نکل کر ہر طرف نظریں دوڑائیں لیکن کہیں اس کا سایہ تک نظر نہ آیا۔ نہ جانے وہ بدحواسی میں کدھر نکل گیا تھا۔

اس واقعے کو کافی دن گزر گئے لیکن وہ مجھے نظر نہیں آیا۔ شاید اس نے اپنا راستہ بدل لیا تھا۔

وہ نئے چاند کی پہلی جمعرات تھی۔ ہر طرف اندھیرے کا راج تھا۔ قبرستان میں صرف جھینگروں اور مینڈکوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اس رات حبس اور گرمی سے میرا دم گھٹا جا رہا تھا۔ میں تیزی سے قبروں کے درمیان سے گزرتا چلا جا رہا تھا کہ اچانک ایک قبر کے پاس سفید لباس میں ملبوس ایک خاتون بیٹھی نظر آئی جس کے لمبے لمبے بال اس کی پشت پر بکھرے ہوئے تھے۔

مجھے حیرت ہوئی کہ اندھیری رات کے اس سمے میں وہ بے چاری نہ جانے اپنے کس پیارے کے غم میں وہاں بیٹھی ہوئی تھی۔ ہمدردی کے جذبے سے مغلوب ہو کر میں نے اپنی راہ چھوڑ کر اس کا رُخ کیا۔ میرے قدموں کی چاپ سن کر اس نے اپنا سر گھمایا اور اس کی بڑی بڑی سرخ آنکھیں میرے چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔

وہ اوسط عمر کی ایک صحت مند عورت تھی۔ میں نے نرمی سے کہا ”بہن! یہاں کیا کر رہی ہو..... اندھیری رات میں یہ ویران جگہ تمہارے لیے محفوظ نہیں ہے۔“

”گرمی تھی..... بہت گرمی تھی!“ اس کی سرسراتی ہوئی آواز سے بے پروائی مترشح تھی۔ ”ذرا سی دیر کے لیے باہر آ گئی تھی..... تمہیں اعتراض ہے تو میں چلی جاتی ہوں۔“

بات پوری ہوتے ہی اس کا ہیولا ہوا کے دوش پر لہرایا اور کسی ماورائی سائے کی طرح قریبی قبر میں معدوم ہو گیا۔

خوف و دہشت سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے، دل کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا، بدن کے سارے مساموں کے دہانے کھل گئے، زبان خشک ہو کر یوں تالو سے چپک گئی کہ میری اضطراری چیخ سینے میں ہی گھٹ کر رہ گئی اور میں تیورا کر کسی کٹے ہوئے شہتیر کی طرح وہیں ڈھیر ہو گیا۔

اگلی صبح کے ملگجے اُجالے میں گورکن اور اس کے ساتھیوں نے مجھے وہاں سے اُٹھا کر بے ہوشی سے نجات دلائی۔ کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ مجھے نظر آنے والی کون تھی؟

ہوش میں آتے ہی میرے ذہن میں پہلا خیال یہ آیا کہ میں نے ایک بے ضرر شخص کو قبرستان میں دہشت زدہ کر کے جس جرم کا ارتکاب کیا تھا، مجھے اس کی کڑی سزا دی گئی تھی۔

اب میں بھول کر بھی اس قبرستان میں قدم نہیں رکھتا۔

تحریر: نثار جمال
مرسلہ: کراچی۔

آسیب زدہ گھر

یہ اصطلاح ہمارے یہاں بھی بہت عام ہے۔ نہ جانے کتنی روایات، کتنی کہانیاں، کتنے گھروں، گلیوں اور علاقوں سے وابستہ ہیں۔

خبردار، اس طرف سے مت گزرنا۔ وہ جگہ آسیب زدہ ہے یا فلاں مکان آسیب زدہ ہے۔ اور اسی قسم کے ہر آسیب

زدہ مکان کے حوالے سے المیہ داستانیں بھی وابستہ ہوتی ہیں یعنی اس جگہ فلاں لڑکی کا خون ہوا تھا یا کسی کی عزت برباد کر دی گئی تھی۔

یا اسی قسم کی باتیں، مثال کے طور پر اپنے کراچی کے علاقے کارساز پر نظر آنے والی پُراسرار لڑکی جس کو دیکھنے کا جنون اس تاریخ کی رات کو نوجوانوں کو کارساز کی طرف لے جاتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ گزشتہ کچھ برسوں سے یہ داستان فراموش سی ہو گئی ہے۔

یہ بات اپنی جگہ بالکل درست ہے کہ اس قسم کے مکانات دیکھنے سے ایک خاص قسم کا ہولناک تاثر پیدا کرتا ہے۔ محسوس ہونے لگتا ہے جیسے ان حویلیوں یا مکانات کے کمروں اور دالانوں میں روحیں بھٹکتی پھر رہی ہیں۔

برطانیہ کے ایک مکان کو اس حوالے سے بہت شہرت حاصل ہے۔

وکٹورین طرز کا یہ پُراسرار مکان 1863ء میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اس مکان کو ہنری بل نے بنوایا تھا اور اس مکان کے حوالے سے کئی پُراسرار روایات موجود ہیں۔

یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس مکان میں بھیانک قسم کے واقعات پیش آ چکے ہیں۔ اسی لیے اس میں ابھی تک انوکھے اور حیرت انگیز واقعات ہوا کرتے ہیں۔

1930ء میں اس مکان پر ریسرچ کا سلسلہ شروع ہوا اور یہ جاننے کی کوشش کی گئی کہ جو کچھ بھی دیکھا یا سنا جا رہا ہے، اس میں کہاں تک صداقت ہے۔

بہرحال اس مکان کو آج برطانیہ کا سب سے زیادہ ہانٹیڈ (آسیب زدہ) مکان قرار دیا جا چکا ہے۔

اس مکان کی پُراسرار شہرت 1929ء سے اس وقت شروع ہوئی جب اسمتھ اور اس کے خاندان نے اس مکان میں رہائش اختیار کی۔

جب وہ اس مکان میں رہائش کے لیے گئے تو ان لوگوں نے انہیں خبردار کر دیا تھا جو وہاں رہائش اختیار کر چکے تھے۔

لیکن اسمتھ اور اس کے خاندان نے ان باتوں کی پروا نہیں کی۔

اس کے بعد افواہوں اور کہانیوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ برطانیہ کے اخبارات نے خبریں شائع کیں کہ اس خاندان کو اس مکان میں کیا کیا دشواریاں پیش آئیں۔ ان کی نگاہوں کے سامنے کیا، کیا ہوتا رہا۔

حیرت انگیز آوازیں، ایک راہبہ، ایک گھوڑا گاڑی جس کے کوچوان کا سر کٹا ہوا تھا اور عجیب انداز کے گھوڑے۔ یہ سب اس مکان میں بھٹکتے پھر رہے تھے۔

اس کے گھر والے ان واقعات اور حادثات سے بہت زیادہ خوف زدہ تھے لیکن اسمتھ پر کوئی خاص اثر نہیں پڑ رہا تھا۔ اس نے اپنے طور پر مکان کے بھوتوں سے مقابلہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ایک مضبوط اعصاب کا آدمی تھا۔ ایک رات وہ اپنے پاس ہاکی اسٹک لے کر سو گیا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ بھوتوں کو مار بھگائے گا۔

رات کے وقت خود اس کے کمرے میں قدموں کی آوازیں گونجنے لگیں۔ اس نے ایک جگہ حملہ کر دیا جہاں سے وہ آوازیں بلند ہو رہی تھیں لیکن اس کی چھڑی فضا میں تیر کر رہ گئی جبکہ آوازوں کا وہ سلسلہ جاری رہا۔

اس زمانے میں برطانیہ میں بھوتوں اور روحوں کے حوالے سے ایک سوسائٹی بنائی گئی تھی جس کا نام تھا ”نیشنل لیبارٹری آف فزیکل ریسرچ۔“

یہ سوسائٹی جس شخص نے بنائی تھی، اس کا نام ہیری پرائس تھا۔ اس شخص کو پورے لندن میں بھوتوں کا سب سے بڑا شکاری سمجھا جاتا تھا۔

ہیری کے علم میں جب اس مکان سے وابستہ کہانیاں آئیں تو اس نے اپنی خدمات اسمتھ فیملی کو پیش کر دیں اور خود کچھ دنوں کے لیے اس مکان میں منتقل ہو گیا۔

اس نے وہاں بہت سی چیزیں دیکھیں اور سنیں۔ جیسے قدموں کی آوازیں، پُراسرار سرگوشیاں، ایک عورت کی چیخ، دیوار پر خود بہ خود کسی تحریر کا نمودار ہونا اور خود ہی غائب ہو جانا۔ سامان کا گرنا، فرنیچرز کا اپنی جگہ سے دوسری جگہ چلے جانا، وغیرہ وغیرہ۔

ہیری بھی اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود اصل راز تک نہیں پہنچ سکا۔

کئی دنوں کی ناکامی کے بعد وہ واپس چلا گیا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اسمتھ اور اس کا خاندان بھی زیادہ دنوں تک اس مکان میں قیام نہیں کر پایا اور نو مہینوں کے بعد ہی انہوں نے وہ مکان خالی کر دیا۔

لیکن بھوتوں کے شکاری ہنری کی دلچسپی اس مکان کے ساتھ برقرار رہی تھی۔ وہ بعد میں بھی اس مکان پر ریسرچ کرتا رہا تھا۔

اسمتھ اور اس کے خاندان کے جانے کے بعد فوئسٹر اور اس کا خاندان اس مکان میں منتقل ہوا تو وہ پُراسرار سرگرمیاں پھر سے شروع ہو گئیں۔

فوئسٹر کی بیوی میرین ان سرگرمیوں کی وجہ سے خاص طور پر بہت پریشان تھی یا سب سے زیادہ خوفزدہ تھی۔

اس مکان کی دیواروں پر اکثر اس کو مخاطب کر کے کچھ نہ کچھ لکھ دیا جاتا تھا۔ ان پُراسرار تحریروں نے اسے ذہنی طور پر مفلوج کر کے رکھ دیا تھا۔

فوئسٹر اور اس کے خاندان کے جانے کے بعد پرائس نے ایک سال کے لیے خود وہ مکان کرائے پر حاصل کر لیا۔ اس کا ارادہ ایک سال تک وہاں رہ کر مکمل ریسرچ کرنا تھا۔

اس نے اپنے کام کی ابتدا ایک اشتہار سے کی۔ اس نے یہ اشتہار The Time نامی مشہور اخبار میں دیا تھا۔

اشتہار کچھ یوں تھا۔ ''ایک مشہور آسیب زدہ گھر میں ایک سال تک رہنے کے لیے ایسے رضا کاروں کی ضرورت ہے جو بہادر، سمجھ دار اور حوصلہ مند ہوں۔''

اس کے پاس دو سو سے زیادہ درخواستیں آئی تھیں جن میں سے اس نے چالیس افراد کا انتخاب کر لیا تھا۔

اس ایک سال کے دوران بہت کچھ ہوا۔ بہت سے رضا کار خوفزدہ ہو کر واپس چلے گئے لیکن کچھ بلند حوصلہ لوگ اسی مکان میں مقیم رہے۔

ان ہی میں ایک پروفیسر ڈاکٹر ی ایم بھی تھا جس کا تعلق بی بی سی سے تھا۔ اس کا یہ کہنا ہے کہ اس مکان کے ایک کمرے میں ایک خاص قسم کی پُراسرار سی ٹھنڈک تھی۔ اس کمرے میں جاتے ہی درجہ حرارت دس ڈگری کم ہو جاتا تھا۔

وہ لوگ ہر قسم کی ضروری چیزیں سرہانے رکھ کر سویا کرتے تھے جو اس قسم کی مہمات میں کام آتی ہیں۔ مقدس پانی، کتابیں، موم بتیاں، کافور اور اسی قسم کی کئی اور چیزیں۔

ایک اور رضا کار کیمبرج یونیورسٹی سے تعلق رکھنے والا چارلس تھا۔ اس نے بتایا ''ہم ہر رات ایک ہی کمرے میں پوری طرح چوکنا ہو کر سویا کرتے تھے۔ ہم نے گرچہ اپنے آپ کو ذہنی طور پر تیار کر رکھا تھا۔ اس کے باوجود خوف کے سائے ہمارے تعاقب میں رہا کرتے تھے۔

ہم دیواروں پر پنسل کے نشانات دیکھا کرتے اور اسی نشانات کے پاس ہم وقت اور تاریخ لکھ دیا کرتے تھے تاکہ ریکارڈ میں رہے۔

لیکن دوسری رات وہ نشانات غائب ہو جاتے اور کچھ فاصلے پر دوسرے نشانات نظر آنے لگتے۔ اس کا یہ کہنا ہے کہ ایک بار اس نے ان نشانات کو حرکت کرتے ہوئے بھی دیکھا ہے یعنی کوئی نادیدہ ہاتھ ایسے نشانات پوری دیوار پر بنائے چلا جا رہا تھا۔

ایک بار اسی گھر میں اس نن یا راہبہ کی روح بھی سامنے آ گئی جو پہلے والوں کو دکھائی دیا کرتی تھی لیکن اس بار اس نے آ کر اپنے بارے میں بتایا بھی تھا۔

اس نے کہا کہ اس کا نام میری لیری ہے اور اسے 1667ء میں اسی مکان میں قتل کر دیا گیا تھا۔ اس نے اپنے قاتل کا نام بھی بتایا تھا۔

اس نن نے یہ بھی بتایا کہ 27 مارچ 1938ء کو اس مکان میں روحیں آگ لگا دیں گی۔

یہ ایک خوف زدہ کرنے والی خبر تھی لیکن پرائس اور اس کے ساتھی اسی مکان میں موجود اپنا ریسرچ ورک کرتے رہے۔

اس مکان میں آگ لگنے کا یہ واقعہ اس رات کو نہیں ہوا، جس رات کو بتایا گیا تھا بلکہ یہ واقعہ 27 فروری 1939ء کی رات یعنی تقریباً ایک سال کے بعد پیش آیا تھا۔

یہ آگ جلتے ہوئے لیمپ کے گر جانے سے لگی تھی۔ یہ ایسی آگ تھی جس نے پورے مکان کو جلا دیا تھا۔ بے شمار افراد مکان کے سامنے جمع ہو گئے۔ آگ بجھانے کی کوششیں ہونے لگیں۔

موقع پر موجود ایک پولیس والے نے بعد میں بتایا کہ اس نے اپنی آنکھوں سے ایسے لوگوں کو دیکھا جو اس آگ میں چل رہے تھے اور ان پر آگ کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔

اس آگ والے حادثے کے بعد اس مکان کے قریب ایک چرچ میں عجیب واقعات ہونے لگے۔ شور شرابا، ایک بھٹکتی ہوئی راہبہ کا بے تابی سے دروازے پر دستکیں دینا۔

تحقیق کرنے والے اس جلے ہوئے مکان اور اس چرچ کے اردگرد اپنے کام کو جاری رکھے ہوئے تھے۔ انہوں نے آوازیں ریکارڈ کرنے کے لیے ٹیپ ریکارڈر لگا رکھے تھے۔ 1960ء میں ٹیپ ریکارڈر خود بخود کئی ٹکڑوں میں تقسیم

ہو گیا۔ لیکن 1979ء میں ایک فلم ڈائریکٹر وہاں گونجتی اور پھیلتی ہوئی آوازوں کو ریکارڈ کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

یہ آوازیں سرگوشیوں کی تھیں۔ کسی وزنی دروازے کے کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں تھیں۔ یہ سارے واقعات ملحقہ چرچ میں پیش آ رہے تھے۔

سوال یہ تھا کہ کیا اس مکان میں آگ لگ جانے کے بعد وہ ساری روحیں چرچ میں منتقل ہو گئی تھیں یا کوئی اور بات تھی۔

بھوتوں کے شکاری پرائس کا انتقال 1948ء میں ہوا تھا۔

مرسلہ: احمد بشیر، جہلم

عظیم اسرار

یہ دنیا بہت عجب ہے۔ ناسمجھ میں آنے والی، بہت پُراسرار۔ یہاں حیرت انگیز قسم کے ایسے واقعات رونما ہوتے ہیں جن کی کوئی تشریح نہیں کی جا سکتی۔

کچھ کردار بھی ایسے ہوتے ہیں جو اپنی زندگی میں بھی پُراسرار رہتے ہیں اور اپنی موت کے بعد بھی اپنے اردگرد اسرار کی ایک دھند بکھیر جاتے ہیں۔ تاریخ کے دریچے سے چند ایسے ہی کردار پُراسرار نمبر کے لیے پیش ہیں۔

چنگیز خان بھی تاریخ کا ایک ایسا ہی کردار ہے۔ مغربی چائنا سے اُٹھنے والا وہ تیز و تند طوفان جس نے آدھی دنیا کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔

اس انسان کا انتقال اٹھارہ اگست 1227ء کو ہوا۔ وہ جس انداز کا انسان تھا، اس نے اپنی تدفین کا حکم بھی ایسا ہی دیا تھا۔ اس نے کہا کہ میری قبر کا سراغ بھی نہیں ملنا چاہیے، میں نہیں چاہتا کہ آنے والے دنوں میں دو کوڑی کے دشمن میری قبر کو روندتے پھریں اور ایسا ہی ہوا۔ چنگیز خان کی قبر آج تک دریافت نہیں ہو سکی ہے۔

اس سلسلے میں کئی روایات ہیں۔ ایک روایت کے مطابق چنگیز خان کو دفن کرنے کے بعد اس کی قبر کے چاروں طرف اتنے بڑے بڑے پتھر رکھ دیے گئے کہ وہ ایک چھوٹی پہاڑی بن کر رہ گئی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس پہاڑی پر درخت اور پودے اُگ آئے۔ اس طرح وہ قبر ہمیشہ کے لیے نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔

دوسری روایت یہ ہے کہ پتھر نہیں لگائے گئے تھے بلکہ درخت اور پودے لگا دیے گئے تھے جنہوں نے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جنگل کی صورت اختیار کر لی اور وہ قبر ان جنگلوں میں گم ہو کر رہ گئی۔

کوششیں جاری ہیں۔ ماہرین اس کی قبر کو تلاش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی ہے۔

اس کی قبر کی تلاش کی ناکامی کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ صدیوں سے منگولوں میں یہ روایت چلی آ رہی ہے کہ جو بھی چنگیز خان کی قبر کو دریافت کرے گا، اس پر تباہی اور بربادی نازل ہو جائے گی۔

تاریخ کے عظیم اسرار میں ایران کے حکمران Cambyses ii کی عظیم الشان فوج کا واقعہ بھی ہے۔

یہ شخص سائرس اعظم کا جانشین تھا۔ اس کا عہد حکومت 522 سے B.C530 بتایا جاتا ہے۔ اس کی خواہش تھی کہ پوری دنیا کو فتح کر لے۔

اس قسم کا جنون بہت سے بادشاہوں اور فاتحین کو رہا ہے۔ اس جنون کے لیے وہ اپنی پوری فوج میدان جنگ میں جھونک دیتے ہیں اور انجام سوائے بربادی کے اور کچھ نہیں ہوتا۔

یہ زمانہ تھا مصر کے آخری فرعون Psammetichus iii کا۔ جس کی سلطنت کی زرخیزی اور دولت کی کہانیاں دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔

فرایعین نے اپنی سلطنت کو جادو نگری بنا کر رکھ دیا تھا۔ اس زمانے کے حساب سے وہ سب کچھ ان کے پاس تھا جس کی خواہش کی جا سکتی ہے۔

یہ داستانیں سفر کرتی ہوئی ایران تک پہنچ چکی تھیں اور ایران کے بادشاہ نے مصر پر حملہ کرنے کے لیے ایک فوج ترتیب دی۔

چونکہ یہ پورا سفر صحرا کا تھا اس لیے غیر معمولی انتظامات کیے گئے تھے۔ ہزار ہا گھوڑے، اونٹ، نہ جانے کتنے اونٹوں پر صرف پانی کے ذخیرے تھے۔ اس کے علاوہ رتھ، خیمے اور نہ جانے کیا کیا۔ پچاس ہزار کی ایسی فوج تھی جس نے کبھی شکست کا سامنا نہیں کیا تھا لیکن وہ پوری فوج صحرا میں کہیں غائب ہو گئی۔

کہاں غائب ہوئی، کس طرح غائب ہوئی؟ اس کا آج تک سراغ نہیں مل سکا ہے۔ جدید ماہرین بھی تلاش کر کر کے تھک چکے ہیں لیکن کوئی سراغ نہیں، کوئی نشان نہیں۔

نہ زرہ بکتر، نہ تلواریں، نہ نیزے۔ نہ سونے کے ظروف اور نہ ہی دیگر چیزیں۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ آج کے حساب سے کم از کم اربوں کا خزانہ صحرا میں کہیں دفن ہو گیا ہے لیکن کہاں.....؟ یہ کوئی نہیں جانتا اور شاید کسی کو معلوم بھی نہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوسکے گا۔ مرسلہ : شاہینہ قیصر، لاہور

گمشدہ کالونی

گم شدگی بہت پُرانی اصطلاح ہے۔ وہ لوگ یا کوئی خاص چیز جب اچانک نگاہوں سے اوجھل ہوجائے تو یہی کہا جاتا ہے کہ گم ہوگئی۔

افراد کے ساتھ یہ سب کچھ ہوتا رہتا ہے لیکن جب پوری ایک کالونی ہی غائب ہوجائے تو اس کو کیا کہیں گے؟ یہ واقعہ ہے 1587ء اور 1590ء کے درمیان کا۔

یہ وہ دور ہے جب برطانیہ، امریکا میں اپنے قدم مضبوط کررہا تھا اور اپنی کالونیاں بنا رہا تھا۔ اس وقت انگریزوں اور اسپین والوں کے درمیان جنگ بھی چھڑی ہوئی تھی۔

1584ء میں برطانیہ کی ملکہ نے سر والٹر ریلے کو امریکا میں کالونی بنانے کی باقاعدہ اجازت دی۔ یہ بہت بڑی بات تھی۔

اب لوگوں کے انتخاب کا مرحلہ آیا۔ یعنی کن لوگوں کو امریکا میں لے جاکر آباد کیا جائے؟ وہ یقینی طور پر مضبوط اعصاب رکھنے والے لوگ ہوں گے۔

خاصی تلاش کے بعد سر ریلے کو ایک سو ستر ایسے افراد مل گئے جو اس کے معیار پر پورا اُترتے تھے۔ یہ ایسے جفاکش لوگ تھے جو ہر قسم کے ماحول میں خود کو ڈھال سکتے تھے۔

ان لوگوں نے امریکا پہنچ کر ورجینیا کے مقام پر اپنی کالونی آباد کرلی۔

اس زمانے میں جس قسم کے مکانات بنائے جاسکتے تھے، ویسے مکانات بنائے گئے اور زندگی شروع ہوگئی۔ کالونی کے مکینوں کے لیے سب سے بڑی پرابلم خوراک کا حصول تھا۔

سر والٹر ریلے نے برطانیہ میں پیغام بھیجا کہ انہیں خوراک کی شدید قلت کا سامنا ہے۔ تین سال بعد 1590ء کو سر رچرڈ کو ایک قافلے کے ساتھ خوراک کی بڑی مقدار کے ساتھ ورجینیا روانہ کیا گیا لیکن وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔

مکانات اپنی جگہ موجود تھے۔ دکانیں اپنی جگہ تھیں لیکن افراد غائب ہوچکے تھے۔ کہاں گئے، کس طرح گئے؟ کیا وہ اپنی مرضی سے گئے یا انہیں لے جایا گیا؟ آج تک ان سوالوں کے جواب نہیں مل سکے ہیں۔

مرسلہ: نوید اکبر، بہاولپور

کالی بلی

صدیوں سے یہ واہمہ سفر کرتا ہوا چلا آرہا ہے کہ کالی بلیاں منحوس اور خطرناک ہوا کرتی ہیں۔

آپ نے فلموں میں بھی دیکھا ہوگا کہ جب کسی منظر کو ڈراؤنا بنانا ہو تو کسی کالی بلی کو دکھا دیتے ہیں۔ پُراسرار کہانیوں میں بھی کالی بلیوں کا تذکرہ ہوتا ہے۔

ہمارے یہاں بھی یہی ہے۔ کالی بلی اگر راستہ کاٹ جائے تو ہم اپنا سفر ملتوی کردیتے ہیں۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ "جن" کالی بلیوں کے روپ میں سامنے آتے ہیں۔

اسی لیے کالی بلیوں کو خوف سے دیکھا جاتا ہے۔ مائیں اپنے بچوں کو کالی بلیوں سے بچنے کے لیے وظیفے سکھاتی ہیں یا تعویذ باندھ دیتی ہیں۔

دنیا کے تقریباً ہر ملک اور ہر تہذیب میں کالے رنگ کی بلیوں کی داستانیں مشہور ہیں۔

اور یہ سلسلہ آج کا نہیں، بہت قدیم ہے۔ 1589ء میں ایک کتاب شائع ہوئی، جس کا نام تھا Baware of black Cat (کالی بلیوں سے بچیں)۔

اس کتاب کے مطابق کالی بلیاں چڑیل ہوا کرتی ہیں۔ اگر آپ ایک کالی بلی کو مار دیں تو وہ مزید نو بار جنم لیتی ہیں۔

بہت سے علاقوں میں جادوگر اپنے جادو کی طاقت بڑھانے کے لیے کالی بلی کو مار کر اس کا مغز اپنے کھانوں میں شامل کرلیتے ہیں۔

بہت سے نام نہاد قسم کے ہپناٹسٹ یہ مشورہ دیتے ہیں کہ اگر نگاہوں کی طاقت بڑھانی ہے تو کالی بلی کی آنکھوں میں جھانکا کریں۔

کالی بلیوں کے ساتھ مختلف توہمات وابستہ ہیں۔ مثال کے طور پر جہاں ایک طرف انہیں خطرناک اور منحوس سمجھا جاتا ہے تو دوسری طرف یہ خوش قسمتی کی علامت بھی ہوتی ہے۔

بہت سے علاقوں میں مچھیروں کی بیویاں کالی بلیوں کو اپنے گھروں میں پالتی ہیں۔ یہ ان کا عقیدہ ہے کہ اس طرح ان کے شوہر سمندر کے سفر سے خیریت کے ساتھ واپس آجائیں گے۔

ان کے برعکس جواریوں کے لیے ان کا وجود انتہائی نقصان دہ ہے۔ اگر کوئی جواری کاسینو کی طرف جارہا ہو اور کالی بلی راستہ کاٹ جائے تو وہ اپنا ارادہ بدل دیتا ہے کیونکہ ان کے خیال میں انہیں نقصان ہوجاتا ہے۔

بحری قزاقوں کے یہاں بھی کالی بلیوں کے حوالے سے روایات موجود ہیں۔ قزاق اگر کھڑا ہے اور کوئی کالی بلی اس

پراسراریت نمبر 2

کی سمت آرہی ہے تو یہ اس کی تباہی ہے اور اگر مخالف سمت جارہی ہے تو یہ اس کی خوش نصیبی ہے۔ اگر کوئی کالی بلی جہاز میں داخل ہوجائے تو ایک کہرام برپا ہوجاتا ہے کیونکہ ان کے خیال میں اس جہاز کا ڈوبنا یقینی ہے۔

لیکن اب یورپ کے کئی ملکوں اور امریکا میں کالی بلیوں کا مقدر جاگ اُٹھا ہے۔ ایک سروے کے مطابق سب سے زیادہ جس رنگ کی بلیاں پالی جارہی ہیں وہ یہی کالی بلیاں ہیں۔

مرسلہ: فائزہ افتخار، کوئٹہ

مونس کے تیرانداز

دنیا میں سب کچھ ممکن ہے

معجزے کہیں بھی ہوسکتے ہیں اور حیران کرکے چلے جاتے ہیں اور برسوں وہ کہانیاں دُہرائی جاتی ہیں۔ یہ معجزے انسانی عقیدے کی بنیاد پر بھی سامنے آتے ہیں۔

بہت ممکن ہے کہ ان میں واہموں کا بھی دخل ہو یا ہوسکتا ہے کہ واقعی وہی سب کچھ ہوا ہو جو آنکھوں نے دیکھا ہے۔

انسانی تاریخ ایسے واہموں یا معجزوں سے بھری ہوئی ہے۔ مثال کے طور پر 1965ء کی جنگ کی داستانیں۔ وہ جنگ جو ہندوستان اور پاکستان کے درمیان لڑی گئی تھی۔

اس جنگ کے حوالے سے بے شمار کہانیاں، واقعات اور حوالے ہیں۔ یہ وہ جنگ تھی جس میں پاکستان نے اپنے سے کہیں زیادہ طاقت ور ملک کے چھکے چھڑا دیے تھے۔

اس جنگ میں پاکستانی افواج کی شاندار کارکردگی اپنی جگہ لیکن اس کے ساتھ ساتھ بے شمار روایات بھی سامنے آئی تھیں۔

مثال کے طور پر پاکستانی افواج کے شانہ بہ شانہ ہرے لباس والوں نے بھی اس جنگ میں حصہ لیا تھا۔ بہت سے لوگوں کا یہ بیان ہے کہ انہوں نے سفید لباس والوں کو دیکھا تھا۔ یہ نورانی چہرہ لوگ دشمن کے گولے بارود اور بموں کو ناکارہ بنا رہے تھے۔ یہ کون لوگ تھے، ان کے بارے میں مختلف آرا تھیں۔

کسی کا خیال تھا کہ آسمانوں سے فرشتے مدد کے لیے اتر آئے تھے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ ہمارے پاکیزہ آباؤاجداد کی پاکیزہ روحیں تھیں اور کچھ لوگ یہ کہتے تھے کہ ولیوں کی بہت بڑی جماعت ہماری مدد کو آگئی تھی۔

اس سے بحث نہیں ہے کہ وہ کون تھے؟ لیکن یہ بہت مستحکم کہانیاں اور روایات تھیں۔ درجنوں فوجی جوانوں نے ان ہستیوں کو اپنی آنکھوں سے اور خود سے بہت قریب دیکھا تھا۔

ان کا کہنا ہے کہ جس محاذ پر ہمارا پلہ کچھ ہلکا ہونے لگتا تھا۔ یہ ہستیاں ہماری مدد کو پہنچ جاتی تھیں اور ان کی مدد سے اس محاذ کا نقشہ بدل جاتا تھا۔

اب ان روایات کو کیا نام دیا جائے۔ کیا کہا جائے، یہ کون لوگ تھے؟

اس قسم کی روایات صرف ہمارے یہاں نہیں بلکہ یورپ میں بھی سنی اور بیان کی جاتی ہیں۔ ان میں سب سے مشہور تیرانداز دستے کی کہانیاں ہیں۔

گم شدگی کے بڑے واقعات میں 1972ء میں ہونے والی نایاب ترین تصویروں کی گمشدگی بھی کم حیرت انگیز نہیں ہے۔ یہ واقعہ فرانس کے شہر Bagnols کے ٹاؤن ہال میں پیش آیا تھا۔

فرانس فنون لطیفہ سے جنون کی حد تک محبت کرنے والوں کا ملک سمجھا جاتا ہے۔ خاص طور پر اگر نایاب پینٹنگز ہوں تو ان کی حفاظت کی جاتی ہے۔ انہیں بہت ہی محفوظ مقامات پر رکھا جاتا ہے۔

غائب ہونے والی تصویریں ٹاؤن ہال میں رکھی ہوئی تھیں اور اندازے کے مطابق ان کی قیمت ملین ڈالرز ہوسکتی ہے لیکن وہ تصویریں تمام تر حفاظتی اقدامات کے باوجود غائب ہوگئیں۔

اور وہ بھی ایک دو نہیں بلکہ درجنوں نایاب تصویریں۔ یہ تصویریں باکمال اور مشہور مصوروں کی بنائی ہوئی تھیں۔

فرانس کی تقریباً ساری ایجنسیز ان تصویروں کا سراغ لگانے میں ناکام ہوگئیں۔ ہال کے دروازے بند، کھڑکیاں بند پھر اتنی تصویریں کہاں چلی گئیں؟ انہیں کون لے گیا؟ آج تک ان کا سراغ نہیں مل سکا ہے۔ ان تصاویر میں Pillere Bonard کی Cows in a Pasture` کمپوزیشن اور ویو آف دی پورٹ آف مارسیلز جیسی بیش قیمت تصاویر بھی تھیں۔

سارے سراغ رساں ادارے اب تھک ہار کر خاموش ہوچکے ہیں۔

مرسلہ: نایاب حیدر، لاہور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یہ زمانہ ہے 1914ء، جب پہلی جنگ عظیم کے شعلے پوری دنیا میں بھڑک اُٹھے تھے۔ جرمنوں کی بے پناہ اور طوفانی یلغار کے آگے کوئی نہیں ٹھہر سکتا تھا۔

اتحادی افواج کے قدم اکھڑتے جارہے تھے۔ یہ واقعہ ہے 23 اگست 1914ء کا۔ برطانوی اور فرانسیسی دستے پوری بے جگری کے ساتھ Mons نامی ایک قصبے کے پاس جرمنوں سے جنگ کرنے میں مصروف تھے۔

لیکن جرمن فوجی آندھی اور طوفان کی طرح بڑھ رہی تھیں۔ انہوں نے اتحادیوں کے قدم اکھاڑ دیے تھے۔ اتحادیوں کو پسپائی کا سامنا تھا اور یہ بہت خطرناک صورتِ حال تھی۔

لیکن صورتِ حال حیرت انگیز طور پر بدل گئی۔ اتحادی افواج نے جرمنوں کو اسی محاذ پر شکست دے دی اور یہ معجزہ دیکھتے دیکھتے ہی رونما ہوگیا۔

طرح طرح کی قیاس آرائیاں ہونے لگیں کہ آخر ایسی کیا بات تھی جس نے جرمنوں کو پسپائی پر مجبور کردیا تھا۔

اس راز کا انکشاف آرتھر میک نام کے ایک شخص نے لندن ایوننگ نیوز کے ایک شمارے میں کیا۔ اس کی یہ کہانی یا روایت شائع ہوئی اور ہر طرف ایک ہنگامہ سا برپا ہوگیا۔

اس نے اپنی کتاب The Bowmen میں انکشاف کیا کہ جرمنوں کے پسپا ہونے کی وجہ یہ تھی کہ اتحادی فوجیوں کی مدد کے لیے نہ جانے کس طرف سے بے شمار تیرانداز آگئے تھے۔

یہ تیرانداز گرچہ ہیولوں کی شکل میں تھے۔ لیکن ان کے برسائے ہوئے تیروں نے جرمنوں کی صفوں میں تباہی مچادی تھی۔

یہ تیرانداز فوجیوں سے چند قدم آگے تھے۔ اس نے اپنی کتاب میں دعویٰ کیا ہے کہ اس معجزے یا واقعے کے درجنوں شاہد ہیں۔ انہوں نے خود اپنی آنکھوں سے ان حیرت انگیز تیراندازوں کو دیکھا ہے۔

اس کتاب کے شائع ہونے کے بعد معمول کے مطابق مخالفت اور تائید میں ہنگامے کھڑے ہوگئے۔ بہت سوں کا یہ خیال تھا کہ آرتھر نے صرف ایک کہانی بیان کی ہے جس کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں ہے جبکہ اس کے برعکس بہت سوں کا یہ خیال تھا کہ آرتھر نے کہانی بیان نہیں کی۔ بلکہ یہ واقعہ اسی طرح پیش آیا تھا۔

ہوتا یہی ہے۔ جب اس قسم کی کوئی بھی بات سامنے آتی ہے تو بہت سے لوگ اسے ماننے سے انکار کردیتے ہیں اور بہت سے اس پر یقین کرلیتے ہیں۔

ہم اسے نفسیاتی کرشمہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ مشاہدہ کیا گیا ہے کہ جنگ کے میدان میں نروس زدہ فوجیوں کو عجیب عجیب آوازیں سنائی دینے لگتی ہیں۔ وہ حیرت انگیز مخلوق کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ یہ ذہنی دباؤ اور خوف کی زیادتی کے سبب بھی ہوسکتا ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ ایسے حالات میں عام لوگوں کو بھی اسی قسم کے تجربات پیش آیا کرتے ہیں۔ ہوسکتا تھا کہ آرتھر کی اس کتاب کو کچھ دنوں کے بعد جلا دیا جاتا۔ یہ کہہ کر اس کی اہمیت ختم ہوجاتی کہ بڑھا جھی دیتے ہیں کچھ فریب داستاں کے لیے۔ لیکن ایک فوجی کے حلفیہ بیان نے ایک بار پھر لوگوں کو اس طرف توجہ دینے پر مجبور کردیا۔

اس نے اپنا یہ حلفیہ بیان ایک سال کے بعد داخل کرایا تھا۔ اس کا تعلق پہلی چیشائر رجمنٹ سے تھا۔ اس نے بتایا کہ اس نے خود اپنی آنکھوں سے فرشتہ نما تیراندازوں کو دیکھا جو کمال مہارت سے اور بڑی تیزی کے ساتھ دشمنوں کی طرف تیر پھینک رہے تھے۔

یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ آرتھر کی کتاب سے بہت پہلے یعنی محاذِ جنگ سے ہی بریگیڈیئر جنرل جان چارٹرز نے اپنی بیوی کو ایک خط لکھا تھا۔ اس خط میں اس نے یہ لکھا ”بظاہر تو ہم پوری بے جگری کے ساتھ جنگ کررہے ہیں لیکن تم یقین کرو کہ غیبی فرشتے ہماری مدد کررہے ہیں۔ یہ فرشتے سفید لباسوں میں اور سفید گھوڑوں پر سوار ہوکر آتے ہیں اور دشمنوں پر تیروں کی بوچھاڑ کردیتے ہیں۔“

یہ سب تو ہورہا تھا لیکن اُٹھنے والا سب سے اہم سوال یہ تھا کہ جن پر تیروں کی بوچھار ہورہی تھی۔ کیا انہوں نے بھی ایسی ہستیوں کو دیکھا تھا؟

یہ سارے بیانات تو اتحادیوں کے تھے۔ جرمنوں نے ابھی تک ایسی کوئی بات نہیں بتائی تھی لیکن یہ خاموشی بھی 1930ء میں ختم ہوگئی۔ جنفر یڈرچ ہرزانورتھ نامی ایک جرمن فوجی جو ملٹری انٹیلی جینس کا افسر تھا اس نے ایک اخبار کو انٹرویو دیتے ہوئے بتایا کہ Mons کے محاذ پر اس نے اتحادیوں کی طرف سے ایسے لوگوں کو دیکھا جو سفید لباسوں میں تھے اور ہم پر تیروں کی بوچھار کررہے تھے۔

اس نے یہ بھی بتایا کہ اس کے کچھ ساتھیوں نے اپنے کیمرے سے ان کی تصویریں بھی اُتار لی تھیں۔ اس کے بیان کے بعد ایک بار پھر ہلچل مچ گئی۔

مرسلہ: نزہت بخیار، اسلام آباد

بھٹکتا ہوا جہاز

اچانک ان لوگوں نے پُرانے زمانے کے لکڑی کے ایک بڑے سے جہاز کو ساحل کی طرف آتے ہوئے دیکھا۔

وہ اسے پُرانے طرز کا جہاز ہی سمجھ رہے تھے جو کسی وجہ سے ساحل کی طرف بڑھا چلا آرہا تھا۔ سب اسے حیرت سے دیکھنے لگے تھے۔

جیسے جیسے وہ جہاز قریب آتا جارہا تھا، ویسے ویسے اس میں موجود لوگوں کے ہیولے واضح ہوتے جارہے تھے۔ وہ سب سولہویں صدی کے لباس میں تھے۔

ویسی ہی ٹوپیاں، ویسا ہی لباس، ساحل پر موجود لوگ جیسے کوئی ایسی فلم دیکھ رہے تھے جس میں سولہویں صدی کے قزاقوں کو دکھایا گیا ہو۔

جہاز ساحل کے قریب آتا جارہا تھا۔ اب ایسا محسوس ہونے لگا تھا جیسے وہ جہاز ساحل کی ریت تک چلا آئے گا۔

پھر اچانک ساحل کے پاس آکر وہ جہاز اس طرح غائب ہوگیا جیسے اس کا کوئی وجود ہی نہ رہا ہو۔

دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ گرچہ وہ جہاز بہت بڑا تھا لیکن بہت شکستہ حالت میں تھا۔ اس کے بادبان پھٹے ہوئے تھے اور اس کے عرشے پر موجود لوگ اپنی حرکات سے بہت پریشان دکھائی دے رہے تھے۔

بعد کی تحقیق کے مطابق سترہویں صدی میں ایک جہاز اسی مقام پر ڈوبا تھا۔ وہ جہاز، اس کے کپتان کی نااہلی اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے ڈوبا تھا۔ اسی لیے وہ جہاز کبھی کبھی اسی ساحل کے پاس بھٹکتا ہوا دکھائی دے جاتا ہے۔

اس ڈوبنے والے جہاز کا نام فلائنگ ڈچ مین تھا۔

اس جہاز کو دیکھنے والوں میں پرنس آف ویلز بھی شامل تھا۔ اس نے بھی بیان دیا کہ اس نے اپنی آنکھوں سے اس ہوائی جہاز کو سمندر میں بھٹکتے ہوئے دیکھا ہے۔ اتنی اہم شخصیت کو کون جھٹلا سکتا ہے۔

یہ جہاز 26 جنوری 1923ء کو پھر اسی طرح دیکھا گیا تھا۔ ملاح آسٹریلیا سے انگلینڈ کے راستے پر تھے۔ انہوں نے رات بارہ بجے کے قریب کچھ اجنبی سے روشنیاں دیکھیں۔ یہ روشنیاں کسی جہاز سے باہر آرہی تھیں اور یہ ایسے لیمپ کی روشنیاں تھیں جس قسم کے لیمپ دو تین سو سال پہلے استعمال کیے جاتے تھے۔

جہاز کا کپتان اس وقت عرشے ہی پر موجود تھا۔ اس کے ساتھ چار اور بھی ملاح تھے۔ ان سب نے ایک بھٹکتے ہوئے جہاز کو اپنے جہاز کی طرف آتے ہوئے دیکھا تھا۔

ان کا بیان تھا کہ وہ جہاز اتنی رفتار سے آرہا تھا کہ انہیں اندیشہ ہونے لگا کہ کہیں ان کے جہاز سے ٹکرا نہ جائے۔ لیکن قریب آتے آتے وہ جہاز اچانک غائب ہوگیا اور اسی وقت کپتان کے پاس کھڑا ہوا ایک شخص پکار اُٹھا ”میرے خدا! یہ تو بھوتوں والا جہاز ہے۔“

مرسلہ: رحمن نیر: ٹورنٹو، اونٹاریو، کینیڈا

آنحضرت ﷺ پر جادو

صلح حدیبیہ کے بعد جب نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ واپس تشریف لائے تو محرم 7ھ میں خیبر سے یہودیوں کا ایک وفد مدینہ آیا اور ایک مشہور جادوگر لبید بن اعصم سے ملا جو انصار کے قبیلہ بنی زریق سے تعلق رکھتا تھا۔ ان لوگوں نے اس سے کہا کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمارے ساتھ جو کچھ کیا ہے وہ تمہیں معلوم ہے۔ ہم نے ان پر بہت جادو کرنے کی کوشش کی مگر کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ اب ہم تمہارے پاس آئے ہیں، کیونکہ تم ہم سے بڑے جادوگر ہو۔ لو، یہ تین اشرفیاں حاضر ہیں، انہیں قبول کرو اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایک زور کا جادو کردو۔ اس زمانے میں حضورؐ کے ہاں ایک یہودی لڑکا خدمت گار تھا۔ اس سے ساز باز کرکے ان لوگوں نے حضور کی کنگھی کا ایک ٹکڑا حاصل کرلیا جس میں آپؐ کے موئے مبارک تھے۔ انہی بالوں اور کنگھی کے دندانوں پر جادو کیا گیا۔ بعض روایات میں یہ ہے کہ لبید بن اعصم نے خود جادو کیا تھا اور بعض میں یہ ہے کہ اس کی بہنیں اس سے زیادہ جادوگرنیاں تھیں، ان سے اس نے جادو کروایا تھا۔ بہرحال ان دونوں صورتوں میں سے جو صورت بھی ہو، اس جادوگر کو ایک نر کھجور کے خوشے کے غلاف میں رکھ کر لبید نے بنی زریق کے کنویں ذوان یا ذی اروان نامی کی تہ میں ایک پتھر کے نیچے دبا دیا۔ اس جادو کا اثر نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ہوتے ہوتے پورا ایک سال لگا، دوسری ششماہی میں کچھ تغیر مزاج محسوس ہونا شروع ہوا، آخری چالیس دن سخت اور آخری تین دن زیادہ سخت گزرے۔ مگر اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کا زیادہ سے زیادہ جو اثر حضورؐ پر ہوا وہ بس یہ تھا کہ آپ گھلتے چلے جا رہے تھے، کسی کام کے متعلق خیال فرماتے کہ وہ کرلیا ہے مگر نہیں کیا ہوتا تھا، اپنی ازواج کے متعلق خیال فرماتے کہ آپ ان کے پاس گئے ہیں مگر نہیں گئے ہوتے تھے اور بعض اوقات آپ کو اپنی نظر پر بھی شبہ ہوتا تھا کہ کسی چیز کو دیکھا ہے مگر نہیں دیکھا ہوتا تھا۔ یہ تمام اثرات آپؐ کی ذات تک محدود رہے حتیٰ کہ دوسرے لوگوں کو یہ معلوم تک نہ ہوسکا کہ آپؐ پر کیا گزری ہے۔ رہی آپؐ کے نبی ہونے کی حیثیت تو اس میں آپؐ کے فرائض کے اندر کوئی خلل واقع نہ ہونے پایا، کسی روایت میں یہ نہیں ہے کہ اس زمانے میں آپ قرآن کی کوئی آیت بھول گئے ہوں یا کوئی آیت آپؐ نے غلط پڑھ ڈالی ہو یا اپنی صحبتوں میں اور اپنے وعظوں اور خطبوں میں آپؐ کی تعلیمات کے اندر کوئی فرق واقع ہوگیا ہو یا کوئی ایسا کلام آپؐ نے وحی کی حیثیت سے پیش کردیا ہو جو فی الواقع آپؐ پر نازل نہ ہوا ہو، یا نماز آپؐ سے چھوٹ گئی ہو اور اس کے متعلق بھی کبھی آپؐ نے سمجھ لیا ہو کہ پڑھ لی ہے مگر نہ پڑھی ہو۔ ایسی کوئی بات معاذ اللہ پیش آجاتی تو دھوم مچ جاتی، اور پورا ملک عرب اس سے واقف ہوجاتا کہ جس نبی کو کوئی طاقت چت نہ کرسکی تھی، اسے ایک جادوگر کے جادو نے چت کردیا۔ لیکن آپؐ کی حیثیت نبوت اس سے بالکل غیر متاثر رہی اور صرف اپنی ذاتی زندگی میں آپؐ اپنی جگہ اسے محسوس کرکے پریشان ہوتے رہے۔ آخر کار ایک روز آپؐ حضرت عائشہ کے ہاں تھے کہ آپؐ نے بار بار اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی۔ اسی حالت میں نیند آگئی یا غنودگی طاری ہوئی اور پھر بیدار ہوکر آپؐ نے حضرت عائشہؓ سے کہا کہ میں نے جو بات اپنے رب سے پوچھی تھی وہ اس نے مجھے بتادی ہے۔ حضرت عائشہؓ نے عرض کیا وہ کیا بات ہے؟ آپؐ نے فرمایا دو آدمی (یعنی فرشتے دو آدمیوں کی صورت میں) میرے پاس آئے، ایک سرہانے کی طرف تھا اور دوسرا پائنتی کی طرف۔ ایک نے پوچھا انہیں کیا ہوا؟ دوسرے نے جواب دیا ان پر جادو ہوا ہے۔ اس نے پوچھا کس نے کیا ہے؟ جواب دیا لبید بن اعصم نے، پوچھا کہ کس چیز میں کیا ہے؟ جواب دیا کنگھی اور بالوں میں ایک نر کھجور کے خوشے کے غلاف کے اندر، پوچھا وہ کہاں ہے؟ جواب دیا بنی زریق کے کنویں ذی اروان (یا ذروان) کہ تہ کے پتھر کے نیچے ہے۔ پوچھا اب اس کے لیے کیا، کیا جائے؟ جواب دیا کہ کنویں کا پانی سونت دیا جائے اور پھر پتھر کے نیچے سے اس کو نکالا جائے۔ اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؓ، حضرت عمارؓ بن یاسر اور حضرت زبیرؓ کو بھیجا۔ ان کے ساتھ جبیر بن ایاس الزرقی اور قیس بن محصن الزرقی (یعنی بنی زریق کے یہ دو اصحاب) بھی شامل ہوگئے۔ بعد میں حضور خود بھی چند اصحاب کے ساتھ وہاں پہنچ گئے۔ پانی نکالا گیا اور وہ غلاف برآمد کرلیا گیا۔ اس میں کنگھی اور بالوں کے ساتھ ایک تانت کے اندر گیارہ گرہیں پڑی ہوئی تھیں اور موم کا ایک پتلا تھا جس میں سوئیاں چبھوئی ہوئی تھیں۔ جبریل علیہ السلام نے آکر بتایا کہ آپؐ معوذتین پڑھیں۔ چنانچہ آپؐ ایک ایک آیت پڑھتے جاتے اور اس کے ساتھ ایک ایک گرہ کھولی جاتی اور پتلے میں سے ایک ایک سوئی نکالی جاتی رہی۔ خاتمہ تک پہنچتے ہی ساری گرہیں کھل گئیں۔ ساری سوئیاں نکل گئیں اور آپؐ جادو کے اثر سے نکل کر بالکل ایسے ہوگئے جیسے کوئی شخص بندھا ہوا تھا، پھر کھل گیا۔ اس کے بعد آپؐ نے لبید کو بلا کر باز پرس کی۔ اس نے اپنے قصور کا اعتراف کرلیا اور آپؐ نے اس کو چھوڑ دیا کیونکہ اپنی ذات کے لیے آپ نے کبھی کسی سے انتقام نہیں لیا۔ یہی نہیں بلکہ آپ نے اس معاملے کا چرچہ کرنے سے یہ بھی کہہ کر انکار کردیا کہ مجھے اللہ نے شفا دی ہے۔ اب میں نہیں چاہتا کہ کسی کے خلاف لوگوں کو بھڑکاؤں۔

مولانا مودودی فرماتے ہیں (تفسیر۔ تفہیم القرآن جلد ششم۔ صفحہ نمبر 557) یہ سوال اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ بکثرت صحیح احادیث میں یہ ذکر آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر رات کو سوتے وقت اور خاص طور پر بیماری کی حالت میں معوذتین، یا بعض روایات کے مطابق معوذات (یعنی قل ہواللہ اور معوذتین) تین مرتبہ پڑھ کر اپنے دونوں ہاتھوں میں پھونکتے اور سر سے لے کر پاؤں تک پورے جسم پر جہاں جہاں تک بھی آپ کے ہاتھ پہنچ سکتے، انہیں پھیرتے تھے۔ آخری بیماری میں جب آپ کے لیے خود ایسا کرنا ممکن نہ رہا تو حضرت عائشہؓ نے یہ سورتیں (بطور خود یا حضورؐ کے حکم سے) پڑھیں اور آپؐ کے دستِ مبارک کی برکت کے خیال سے آپؐ ہی کے ہاتھ لے کر آپؐ کے جسم پر پھیرے۔ اس مضمون کی روایات صحیح سندوں کے ساتھ بخاری، مسلم، نسائی، ابن ماجہ، ابوداؤد اور موطا امام مالک میں خود حضرت عائشہؓ سے مروی ہے۔

مرسلہ: ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری، بھکر

سیر پاکستان کے حوالے سے ایک پراسرار مقام کا تذکرہ

گورکھ ہل

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

اپنے سندھ کا ایک ایسا خطہ جسے پراسراریت کا مرقع کہتے ہیں۔ جہاں اسرار کی پرچھائیاں بڑی گہری ہیں۔ جہاں خوف میں لوگ جکڑے ہوئے ہیں اور اندھیری راتوں میں ہلکے سے کھٹکے پر بھی چونک جاتے ہیں کہ کہیں ''مم'' تو نہیں آگیا۔ مم نامی اس عجیب مخلوق کے دیکھے جانے کے اتنے شواہد ملے ہیں کہ انہیں ایک مضمون میں سمیٹنا مشکل ہے۔ کیا واقعی وہاں مم آباد ہیں؟

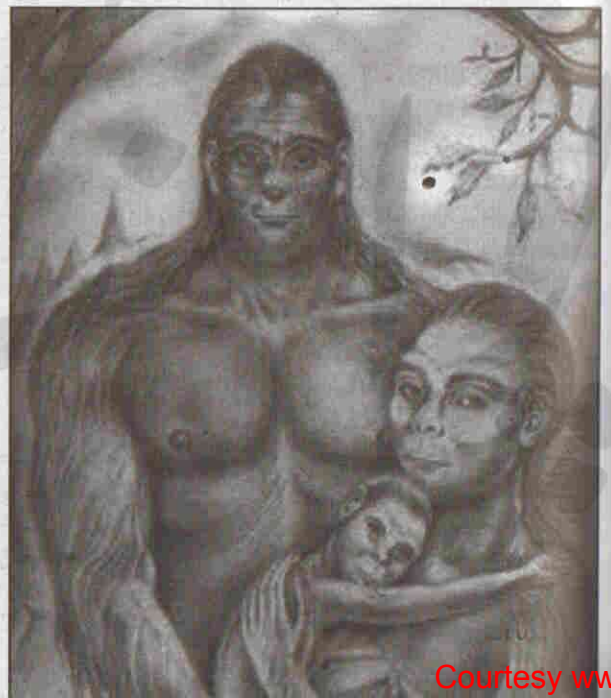

کراچی سے ساڑھے چار سو کلومیٹر شمال مغرب میں پہاڑی سلسلہ کوہ کھیر تھر ہے جو دو ہزار پانچ سو سے زائد کلومیٹر پر محیط ہے۔ ایڈونچر پسند اور شکار کے رسیاؤں کے لیے تو یہ مقام مشہور ہے ہی مگر اسراریت پسندوں کے لیے بھی یہ علاقہ کشش کا حامل ہے۔

کوہ کھیر تھر کے دو مشہور پہاڑی مقام ''ڈیلائی'' اور ''گورکھ ہل'' زیادہ مشہور ہیں۔ مگر اس میں گورکھ ہل کو فوقیت حاصل ہے، اس کی بہت سی وجوہات ہیں جس میں قابلِ ذکر اس کی تاریخی حیثیت ہے۔ قدامت اور پُراسراریت ہے لیکن گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ گورکھ ہل کو اب ایک پُرفضا مقام کی حیثیت حاصل ہوچکی ہے اور آب وہوا کے لحاظ سے اسے سندھ کا مری بھی کہا جاتا ہے۔

سطح سمندر سے 5688 فٹ بلند ہونے کا باعث یہاں کا درجہ حرارت 17 ڈگری سینٹی گریڈ اور جنوری میں منفی 5 ڈگری سینٹی گریڈ ہوتا ہے۔

ضلع دادو سے مغرب میں صرف سو کلومیٹر اور سیہون شریف سے ایک سو چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ اور دادو سے جوہی روڈ کے ذریعے یہاں تک جایا جاسکتا ہے۔

گورکھ ہل میں میٹھے پانی کے چشمے، آبشاریں اور قدرتی مناظر وافر نظر آتے ہیں، اس کی آب وہوا بھی کسی پُرفضا پہاڑی مقام سے کم نہیں ہے۔

گورکھ ہل کا نام گورکھ ہل کیوں پڑا؟ اس بارے میں کئی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کہانیاں مشہور ہیں۔ کچھ لوگوں کے مطابق یہ نام ''سری گورکھ ناتھ جی'' کے نام سے اس مشہور پہاڑی مقام کو موسوم کیا جاتا ہے، جو ایک زبردست یوگی تھا۔ سنسکرت میں معنی ''گورکھ'' کے بھی یوگی طاقت رکھنے والے کے ہیں اور سری گورکھ ناتھ جی پُراسرار قوتوں کا مالک بھی تھا مگر بعض لوگ کہتے ہیں لفظ گورکھ ہل درحقیقت بلوچی زبان سے نکلا ہے، ایک خیال کے مطابق گورکھ کا مطلب ''بھیڑیا'' سے بھی لیا گیا ہے جو فارسی سے نکلا ہے۔ پُرانے لوگوں کے مطابق سری گورکھ ناتھ کے پاس نندو نامی ایک ملازم ہوا کرتا تھا جو سورج غروب ہوتے ہی انسان سے بھیڑیئے کا روپ دھار لیا کرتا تھا جسے رات ہوتے ہی دور کسی بنجر ویران پہاڑی کھوہ میں بند کر دیا جاتا تھا اور صبح سورج طلوع ہوتے ہی جب وہ انسان کی شکل اختیار کر لیتا تو اسے دوبارہ باہر نکالا جاتا تھا۔

آخر الذکر روایت کو اگر پیش نظر رکھا جائے تو دل نہ چاہتے ہوئے بھی یہ بات تسلیم کرنے کے لیے آمادہ ہوتا ہے کہ فارسی کے لفظ گورکھ کا مفہوم بھی ''بھیڑیا'' ہے اور سری گورکھ ناتھ کا غلام نندو بھی انسان نما بھیڑیا تھا۔ اس حوالے سے ایک یہ بات بھی ذہن میں آتی ہے کہ اس مقام کو ''بھیڑیا'' کے نام سے کیوں موسوم کیا گیا؟

ایک اسرار پسند صحافی خان بخش بگٹی کو کھیر تھر نیشنل پارک کے بوڑھے چوکیدار علی بخش نے بتایا تھا کہ برسوں پہلے جب ویران، خشک، بنجر علاقے میں لوز دہ ہوائیں چلا کرتی تھیں تو یہاں ایسے انسانوں کی نسل آباد تھی جو انسان نما جانور کہلاتی تھی یعنی جو آدھے انسان اور آدھے جانور تھے جسے بعد میں ''مم'' کہا گیا۔ اسی طرح ڈائنوسارز اسکیلٹن پارک اینڈ میوزیم'' کے ایک پُرانے رکھوالے صوبو خان سولنگی کے مطابق سری گورکھ ناتھ جی کا مذکورہ غلام یا ملازم نندو اسی نسل سے تعلق رکھتا تھا۔

ویرانوں میں آتے جاتے لوگوں کو ایسے انسانوں کی جھلک نظر آتی تھی جو بن مانس سے مشابہ تھے یعنی ان کا قد وقامت تو عام انسانوں جیسا ہی ہوتا تھا مگر پورا جسم سیاہ بالوں سے ڈھکا ہوا تھا، چوڑے اور جھکے جھکے شانوں والے اس بھاری جسامت کے انسان کا نام ''مم'' پڑ گیا۔

بستی کے لوگوں میں اس حوالے سے زبردست خوف پایا جانے لگا مگر بات صرف اتنی نہیں تھی، بستی کے لوگ پُراسرار طور پر غائب ہونے لگے، مگر حیرت کی بات تو یہ تھی کہ پُراسرار طور پر گم ہونے والے لوگوں میں جوان مرد اور عورتیں ہوتی تھیں، کوئی بوڑھا یا بچہ نہیں ہوتا تھا۔

جنگل کی آگ کی طرح تشویش کی یہ لہر پوری گورکھ بستی میں پھیل گئی کہ ''مم'' اپنی نسل بڑھانے کے لیے جوان مردوں اور عورتوں کو اُٹھا کر لے جاتی ہے، مگر ان کے نزدیک سوچنے کے لائق تو سوال یہ تھا کہ کیا مم میں نر بھی پایا جاتا تھا۔ یقیناً ایسا تھا، یوں گورکھ بستی کے لوگوں نے ''مم'' کے نر کا نام ''ممو'' رکھا۔

نہ جانے کتنے زمانوں کے زمانے بیتے، یہاں پر کسی کو آباد ہوتے نہیں دیکھا گیا، مگر تب تک گورکھ ہل کا علاقہ ایک آسیب بن کر رہ گیا۔ گھوڑوں، گدھوں اور خچروں میں سفر کرنے والوں کو اس ویران پہاڑی علاقے سے گزرتے ہوئے بھی خوف محسوس ہوتا تھا پھر گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ جب دریاؤں نے اپنے راستے ''زاویوں'' کی صورت میں بدلے اور سندھو دریا کی سفید پٹی کا دھارا بدلا اور وہ اس کے قریب سے بہنے لگا تو یہاں رفتہ رفتہ روئیدگی کے آثار نمودار ہونے لگے۔ یہاں الپائن Alpine، فلورا Flora اور فونا Fauna کے پودے پائے جانے لگے لیکن باوصف اس کے یہاں کے ہیبت ناک ویرانے میں کوئی فرق نہ آیا۔ یہاں سے بھولے بھٹکے گزرنے والوں کو بالخصوص رات میں جب تاریک آسمان پر طباق چاند روشن ہوتا اور اس کی چٹکی ہوئی پُراسرار چاندنی، گورکھ ہل کی سنگلاخ پہاڑی پر طلسم بکھیرتی محسوس ہوتی تو انہیں جھکے جھکے چوڑے اور بالوں بھرے شانوں والے بیولے متحرک دکھائی دے جاتے تھے۔

یہ 1975ء کی ایک خنک شام کا ذکر ہے، گورکھ ہل سے قریب تر چھوٹے دیہاتی نما شہر ''جوہی'' سے دس کلومیٹر کے فاصلے پر ایک چینی سونفوں پر مشتمل گوٹھ حق نواز کے کچی گھر میں شادی کی تقریب تھی، نومبر کا مہینا تھا، سردی کی آمد آمد تھی۔ دلہن مائی صورت کو رخصت کیا جا رہا تھا، گنتی کے مہمان تھے اور مہمان بھی کیا تھے، سب اپنے ہی گھر اور ایک خاندان کے لوگ تھے۔ سادے چاولوں کی دعوت تھی، پھر دلہن کو دولہا کے ساتھ ایک چھپر اگی بیل گاڑی میں سوار کرا کے رخصت کر دیا گیا۔

برات دادو کے ہی ایک نواحی گوٹھ سے آئی تھی اور اب دلہن کو لے کر یہ لوگ واپس اپنے گوٹھ کی طرف لوٹ رہے تھے۔ یہ دولہا، دلہن سمیت کل نو افراد تھے۔ ان میں دولہا فقیر محمد کے ماں باپ، بہن اور چھوٹا بھائی رشتے کا چچا خاوند بخش اور ماموں لاکھو خان شامل تھے اس کی بیوی حیاتاں بھی تھی۔ عورتیں گدھوں پر سوار تھیں۔ مرد پیدل تھے۔ ایک آدھ بوڑھا بیل گاڑی کے پچھواڑے چوبی تختے پر لٹکا بیٹھا تھا۔

یہ مختصر قافلہ روانہ ہو گیا۔ راستے میں گورکھ ہل کا بنجر پہاڑی علاقہ ان کے راستے میں حائل تھا۔ یہ لوگ رات اُترنے سے پہلے پہلے اس آسیبی سنگلاخ ویرانے کو پار کرنے کا ارادہ کیے ہوئے تھے مگر رخصت ہوتے وقت انہیں پہلے ہی شام نے آلیا تھا، پھر راستے میں بیل گاڑی کے بے ڈھنگے چوبی پہیے کی کوئی کل (کلی) تڑخ گئی، اسے بناتے بناتے رات سر پر آ گئی۔

یوں ٹھٹھرتی ہوئی تاریک رات میں یہ مختصر قافلہ گورکھ ہل کی ویران ہیبت ناکیوں کے درمیان سے گزرنے لگا تو سب کو جیسے یکلخت سانپ سونگھ گیا۔ گیت گنگنانے بند ہو گئے۔ اب صرف بیل گاڑی کے بدنما چوبی پہیوں کی ''چک..... چوں..... چک چوں'' سناٹے میں گونج رہی تھی، بیل گاڑی کے چوبی تختے کے نیچے چھوٹی سی لالٹین جھول رہی تھی۔ دو محافظ کتے بیلوں کے دائیں بائیں ساتھ ساتھ السائے ہوئے سے چل رہے تھے کہ دفعتاً ایک سنگلاخ درے سے گزرتے وقت کتے اور بیل چلتے چلتے رک گئے۔ کتوں نے اپنی چھاتیاں پہلے پتھریلی زمین سے لگا دیں پھر تھوتھنی طباق چاند کی طرف کر کے عجیب اور منحوس آوازیں نکال کر رونے لگے۔ بیل بے چینی کے عالم میں ہولے ہولے ڈکرانے لگے دفعتاً گدھوں پر براجمان عورتیں ایک ساتھ چیخ پڑیں۔ مرد اس طرف متوجہ ہوئے، ایک عورت نے خوف سے گھٹی گھٹی آواز میں ایک پتھریلی دیوار کی سنگلاخ تاریک اور چوڑی دراڑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ اس نے وہاں ایک عجیب وغریب تخلوق کی جھلک دیکھی تھی۔ دولہا بھی بیل گاڑی سے اُتر کر فکرمند اور تشویش زدہ سا ان کے قریب پہنچ گیا تھا۔

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ اچانک رات کے پہر اور دم بہ خود سناٹے میں دلہن مائی صورت کی دہشت زدہ چیخ ابھری۔ دولہا سمیت باقی مرد بیل گاڑی کی طرف دوڑے تو ہکا بکا رہ گئے۔ اندر سے دلہن غائب تھی۔ سیدھے سادے غریب سے لوگ تھے، مگر مم کے متعلق مشہور داستانوں سے ناواقف بھی نہیں تھے۔ جان گئے کہ نرمموں کے ٹولے نے بڑی مکاری سے پہلے ان کی توجہ دوسری طرف مبذول کروائی اور پیچھے سے ہاتھ صاف کر گئے۔

یہ خاندان روتا دھوتا اپنے گوٹھ پہنچا۔ سب لوگ اسی وقت لالٹینیں، کلہاڑیاں اور ڈنڈے اُٹھائے ان کے ساتھ دلہن کی تلاش میں ہو لیے، مگر دلہن بے چاری کا کوئی اتا پتا تک نہ ملا۔

مم سے متعلق اریب قریب کی بستیوں سے ایسی اور بھی داستانیں مشہور ہوئیں، مگر حقیقت یہی تھی کہ کوئی یہ بات پورے وثوق سے نہیں کہہ سکا کہ گورکھ ہل سے گزرتے ہوئے غائب ہونے والوں کو کون اُٹھا کر لے جاتا تھا؟ اور بعد میں ان کا کیا حشر ہوتا، حیرت وتشویش کی بات تو یہ تھی کہ اس طرح اچانک گم ہونے والوں کا کوئی سراغ بھی نہیں ملتا تھا۔

☆☆☆

ریٹائرڈ کنزرویٹو آفیسر سندھ فیض محمد بگھیو ایک غیر رسمی نشست میں بتاتے ہیں۔

''میں ان دنوں ٹھٹھہ میں کوٹ عالم کے مقام پر فاریسٹ آفیسر ہوا کرتا تھا۔ یہ میری جاب کی پہلی تعیناتی تھی، وہاں ابھی مجھے چند ماہ ہی ہوئے تھے کہ میرا تبادلہ ڈسٹرکٹ آؤٹ کر دیا گیا اور یوں میں ''جھانگارا'' نامی ایک چھوٹے سے قصبے میں آ گیا۔ جھانگارا ضلع دادو میں کوہ کھیر تھر کے دامن میں واقع تھا اور گورکھ ہل کے بالکل قریب تھا۔ یہ اس وقت پورا علاقہ گھنے جنگلات پر مشتمل ہوتا تھا۔ یہاں مجھے غیر قانونی شکار کھیلنے والوں کی اطلاع ملی تھی۔ اس سے پہلے کہ آفیسر اور مقامی لوگوں کی ملی بھگت سے یہاں نہ صرف غیر قانونی شکار کھیلا جاتا رہا تھا بلکہ کٹائی بھی ہوا کرتی تھی۔

جھانگارا کا چارج سنبھالتے ہی میں نے غیر قانونی شکار اور جنگل کی کٹائی پر عائد پابندی کا سختی سے اعادہ کیا۔

میرے عملے میں گنتی سائیں رکھیو اور فاریسٹ چوکیدار دادن تھا۔ ایک باورچی اور ملازم بھی تھا جو مالی کے فرائض بھی انجام دیا کرتا تھا۔

جس ڈاک بنگلے پر میں رہائش پذیر تھا، وہ گورکھ ہل کے پہلو میں ہی ایک چھوٹی پہاڑی کی سطح مرتفع پر بنا ہوا تھا۔ میرے کمرے کی کھڑکی سے گورکھ ہل کی چوٹی صاف نظر آتی تھی۔ صبح جب میں اپنے کمرے کی کھڑکی سے پردہ سرکاتا تو یکلخت مجھے یوں لگتا تھا جیسے کسی لینڈ اسکیپ منظر کی پینٹنگ میری آنکھوں کے سامنے آ گئی ہو، گورکھ ہل کی پتھریلی ڈھلانوں پہ لئی اور آسریں کے جھنڈ اور خودرو جھاڑیاں مل کر بڑا عجیب اور اداس سا منظر پیش کرتی تھیں۔ رات میں تو یہ منظر بہت زیادہ پُراسرار نظر آتا تھا، بالخصوص جب آسمان پر پورا چاند روشن ہوتا اور اس کی طلسم بکھیرتی ہوئی ٹھنڈی چاندنی گورکھ ہل کو کسی خوابیدہ دیو ہیکل عفریت کی طرح ظاہر کرتی تھی۔

ایسی ہی ایک اکتوبر کی رات تھی، میں اپنے کمرے میں سونے کی تیاری کر رہا تھا کہ اچانک ہوا کے تیز جھونکے سے کھڑکی کا ایک پٹ کھل گیا۔ میں ایسے ماحول کا عادی تھا۔ کھڑکی کا پٹ بند کرنے کے لیے میں اپنے بستر سے اُٹھا، قریب پہنچا تو دیکھا ''کلی'' ٹوٹی ہوئی تھی۔ کھڑکی کا پٹ بند کرنا ضروری تھا ورنہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہمالیہ میں جس جانور کو یتی، امریکا اور کینیڈا میں بگ فٹ اور چین میں وائلڈ مین کے نام سے پکارا جاتا ہے، روس میں اسی عفریت کو ایلما کا نام دیا جاتا ہے۔

یتی، بگ فٹ اور وائلڈ مین کی طرح ایلما بھی دو ٹانگوں پر چلنے والا جانور ہے، جس کے جسم پر گھنے بال ہوتے ہیں اور جو رہائش کے لیے عموماً پہاڑی علاقوں کا انتخاب کرتا ہے۔ ایلما کے بارے میں سنائی جانے والی کہانیوں سے پتا چلتا ہے کہ ایلما اپنی عادات واطوار میں انسانوں سے بہت مشابہت رکھتا ہے۔

ایلما کے دکھائی دینے کا سب سے مشہور واقعہ اگست 1957ء میں ایک سائنس دان الیگزینڈر پرانن کے ساتھ پیش آیا۔ پرانن ایک ہائیڈرولوجسٹ تھا جو کوہ پامیر کے آبی ذرائع کا جائزہ لینے کی ایک مہم پر روس پہنچا ہوا تھا۔ اس نے ایلما کو کب اور کیسے دیکھا، اس کے اپنے الفاظ میں سنیے۔

"12 اگست کو دوپہر کے وقت، میں دریائے بالیاندیکا تک کی وادی میں ایک ندی کے کنارے کنارے جا رہا تھا کہ مجھے ایک عجیب چیز دکھائی دی۔ مجھ سے تقریباً 500 میٹر کے فاصلے پر ایک انسان نما ہیولا چلا جا رہا تھا۔ شاید میں اسے کوئی آدمی ہی سمجھتا لیکن اس کی کمر میں بڑا واضح خم دکھائی دے رہا تھا اور اتنی جھکی ہوئی کمر والا کوئی آدمی ایسے ہموار قدموں سے نہیں چل سکتا۔

ساری رات اندر آنے والی ہواؤں کی سمع خراش شائیں شائیں سے مجھے نیند نہیں آتی۔ ابھی میں کھڑکی بند کرنے کے جتن پر غور کر ہی رہا تھا کہ دفعتاً میری نگاہ باہر چاندنی میں نہائے گورکھ ہل کی ڈھلان پر پڑی جدھر لٹی اور آسریں کے ٹنڈ منڈ پیڑ پھیلے ہوئے تھے، اچانک مجھے اس طرف ایک جھرا سا دھبا متحرک دکھائی دیا۔ مدھم روشنی کے باعث پہلے تو میں یہی سمجھا کہ کوئی آسریں چوڑے تنے والا پیڑ ہل رہا ہو مگر بہت غور سے دیکھنے کی کوشش کی تو یکلخت میرا دھڑکتا دل جیسے رک گیا۔ وہ کوئی بھاری بھرکم انسان نما مخلوق تھی مگر نہیں، وہ انسان نہیں کوئی غیر انسانی ہی مخلوق نظر آتی تھی۔ جھکے جھکے چوڑے شانے، بھاری چہرہ، لمبے لمبے جھولتے ہوئے ہاتھ۔ میں اپنی جگہ سن ہو گیا تھا۔ اگر وادی سندھ میں "مم" سے متعلق میں نے داستانیں نہ سن رکھی ہوتیں تو میں اسے گوریلا یا بن مانس ہی سمجھتا مگر ظاہر ہے، گوریلا یا بن مانس یہاں نہیں ہو سکتا تھا۔

اس زمانے میں اگر موبی والے سیل فون ہوتے تو میں کچھ نہ کچھ اس کی ویڈیو بنانے کی کوشش کرتا تاہم "مم" کو قریب سے دیکھنے کی جستجو میں، میں ڈاک بنگلے سے باہر نکل آیا مگر پھر وہ مجھے نظر نہ آئی۔

اگلے روز صبح میں اپنے منشی سائیں رکھیو کے ساتھ اس مقام پر پہنچا تو مجھے وہاں بڑے بڑے پاؤں (بگ فٹ) دکھائی دیے۔

☆☆☆

"مم" کا تذکرہ نہ صرف سندھ کی ویران بنجر وادیوں کے حوالے سے بلکہ بلوچستان کے گنجان اور سنگلاخ پہاڑیوں میں بھی ملتا ہے۔ اس کا ذکر داستانوں اور لوک کتھاؤں میں بھی پایا جاتا ہے۔ ایک سچی داستان کے مطابق گورکھ ہل میں ایک باگڑی قبیلہ آباد تھا، یہ بنجارے تھے، ایک باگڑی لڑکی سورٹھ پر ایک میر محمد نامی نوجوان عاشق ہو گیا تھا۔ میر محمد قریب کے ایک گوٹھ میں رہتا تھا، ماں باپ کا اکلوتا تھا، نہ جانے کس طرح اس کی سورٹھ پر نگاہ پڑ گئی اور وہ سوجان سے اس پر فریفتہ ہو گیا مگر ظاہر ہے دونوں کے بیچ زمین آسمان کی طبقاتی تفاوت تھی، حالانکہ سورٹھ بھی اسے چاہنے لگی تھی۔ وہ تھی بھی بہت خوبصورت اور من موہنی سی۔ میر محمد کی ماں نہیں تھی، اس نے اپنے باپ سے اس لڑکی کا رشتہ لینے کی خواہش کا اظہار کر ڈالا۔ باپ بھلا کیسے یہ منظور کر سکتا تھا کہ ایک بھیل قبیلے کی لڑکی کو اپنی بہو بنا لیتا۔ اس نے نہ صرف صاف انکار کر دیا بلکہ بیٹے کے بھی خوب لتے لے ڈالے۔

میر محمد باپ کے روئیے اور انکار سے اس قدر دلبرداشتہ ہوا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر گورکھ ہل کی پہاڑیوں کو اپنا مسکن بنا لیا۔ باپ کو اس کی کوئی پروا نہ تھی کہ اس کا بیٹا کس حال میں اور کہاں ہے؟ وہ یہی سمجھتا رہا کہ عشق کا بھوت ہے، کچھ دن دربدر کی ٹھوکریں کھائے گا تو خود ہی سر سے اُتر جائے گا اور بیٹا واپس گھر آ جائے گا۔

سورٹھ کو جب یہ پتا چلا کہ اس کا محبوب دیوانہ ہمیشہ کے لیے اپنا گھر چھوڑ کے یہاں آن بسا ہے تو بے چین ہو گئی۔ وہ فوراً اس سے جا کر ملی۔ اسے سمجھایا مگر اس کا دیوانہ محبوب نہ مانا۔ اب سورٹھ چوری چھپے اس سے روزانہ ملنے آتی، اس کے لیے کھانے پینے کی چیزیں بھی لایا کرتی تھی۔

ایک روز سورٹھ اس پہاڑی کھوہ میں آئی جدھر اس کا بن

اس کے علاوہ اس کا قد بھی عام آدمیوں سے کچھ زیادہ تھا۔ اس کے بدن پر سرخی مائل سرمئی رنگ کے بال تھے۔ میں کھڑا اسے دیکھتا رہا حتیٰ کہ وہ میری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔"

تین دن کے بعد پرانن نے اس ہیولے کو ایک دفعہ پھر دیکھا۔

ایلما کی کہانیاں پامیر اور قاف سے لے کر چین تک مشہور ہیں۔ ان کی تاریخ کم از کم ایک صدی پیچھے تک جاتی ہے۔ ایک بیان کے مطابق اس مخلوق کے نر کا قد اوسط آدمی سے کچھ کم ہوتا ہے، بدن پر سرخی مائل یا بھورے رنگ کے بال ہوتے ہیں۔ اس کے بازو اتنے لمبے ہوتے ہیں کہ گھٹنوں سے بھی نیچے لٹک آتے ہیں۔ اس کی چھاتی تنگ اور کمر جھکی ہوئی ہوتی ہے۔ اس کی آنکھیں دھنسی ہوئی، ماتھا باہر کو نکلا ہوا اور بھنویں اوپر کو چڑھی ہوئی ہوتی ہیں۔ اس کا نچلا جبڑا پھیلا ہوا ہوتا ہے اور اس کی ٹھوڑی نہیں ہوتی۔ ناک چھوٹی اور نتھنے پھیلے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس کی پیشانی، بازوؤں اور گھٹنوں کی جلد رگڑی ہوئی ہوتی ہے۔ اس کی ٹانگیں گھٹنوں پر خمیدہ اور اس کے پیر انسانی پیروں سے ملتے جلتے ہیں۔ پیروں کی انگلیاں پھیلی ہوئی اور پیر کا انگوٹھا انسانی انگوٹھے سے چھوٹا ہوتا ہے۔ ہاتھوں کی انگلیاں لمبی ہوتی ہیں اور بالکل انسانی انگلیوں جیسی ہوتی ہیں۔

مرسلہ: آصف جاوید سید، مظفر گڑھ

باس عاشق رہتا تھا۔ وہ بہت اداس اور رنجور تھی۔ میر محمد کے پوچھنے پر اس نے آبدیدہ چہرے کے ساتھ بتایا کہ ان کا قبیلہ اب یہاں سے کسی دوسری جگہ کوچ کرنے والا ہے تو میر محمد بے چین سا ہو گیا۔

"میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گا سورٹھ! میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔" اس نے بے قراری سے کہا۔ غم ہجر کے باعث میر محمد کا چہرہ ست کے رہ گیا تھا۔ سورٹھ سسکتے ہوئے بولی۔

"میرو! میرے محبوب! ہمیں اب جدائی کا یہ زہریلا گھونٹ پینا ہی پڑے گا، تقدیر نے فقط ہمارا اتنا ہی ساتھ لکھا تھا۔"

"مگر سورٹھ! ہم اس ساتھ کو طویل تو کر سکتے ہیں ناں..... تم مت جاؤ، اِدھر ہی رک جاؤ، میرے پاس۔ دیکھو، میں تمہاری خاطر ہی تو اپنے گھر کا آرام وسکون تیاگ کر یہاں بے آب وگیاہ سنگلاخ پہاڑیوں میں آن بسا ہوں اور اب تم مجھے چھوڑ کے ہمیشہ کے لیے جا رہی ہو۔"

"مجھے تسلیم ہے میرے محبوب!" سورٹھ اپنی بھیگی پلکوں کو انتہائی کرب کے احساس تلے بند کر کے دل کی عمیق گہرائیوں سے بولی "لیکن کیا اگر میں اپنے قبیلے کو چھوڑ دوں، ان کے ساتھ ہجرت نہ کروں تو تم ساری عمر میرے ساتھ اِدھر ہی گزار دو گے؟ جبکہ تمہارے لوگ مجھے قبول نہیں کریں گے، نہ ہی شہر میں ہمیں بسنے دیں گے۔"

"ہاں ہاں ..... سورٹھ! میں ساری عمر تمہارے ساتھ اِدھر ہی سنگلاخ پہاڑیوں میں گزار دوں گا۔"

سورٹھ خوش ہو گئی اور اس سے وعدہ کیا کہ وہ آج رات ہمیشہ کے لیے اس کے پاس آ جائے گی۔

سورٹھ نے بازوؤں کی کہنیوں تک ہاتھی دانت کے کنگن پہنے ہوئے تھے، میر محمد کو جانے کیا سوجھی کہ سورٹھ سے ایک کنگن لینے کا تقاضا کر ڈالا۔ سورٹھ نے مسکرا کے اپنے بازو سے ایک کنگن اُتار کے اسے دے دیا اور واپس اپنے پڑاؤ پر چلی آئی۔

جب رات ڈھلنے لگی، اگلی صبح اس کے قبیلے نے کوچ کرنا تھا۔ اس رات سورٹھ خاموشی سے تھوڑا بہت ضروری سامان سمیٹے ایک چھوٹی سی بچی بنا کر نکل گئی۔

وہ جب میر محمد کی مڑھی (کٹیا) پر پہنچی تو میر محمد وہاں نہیں تھا۔ اس نے اسے آوازیں بھی دیں لیکن وہ نہ ملا۔ سورٹھ یہی سمجھی کہ شاید میر محمد آنے والے وقت سے گھبرا کے واپس اپنے لوگوں میں اپنے گھر جا چکا ہے۔ سورٹھ کو بہت دکھ ہوا۔ ابھی وقت اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ رات کی اس بھیدوں بھری تاریکی میں واپس اپنے قبیلے میں لوٹ آئی۔

پو پھٹتے ہی ان کا قبیلہ روانہ ہو گیا۔

کئی سال بیت گئے۔ بنجاروں کا ایک ایسا ہی قبیلہ وہاں آ کر آباد ہوا۔ یہ وہی قبیلہ تھا جن کے ساتھ سورٹھ رہتی تھی۔ اس کی اب شادی ہو چکی تھی اور وہ دو بچوں کی ماں بھی بن چکی تھی۔ گورکھ ہل کے سنگلاخ ویرانوں میں دوبارہ پڑاؤ ڈالا گیا تو سورٹھ کو اپنا محبوب یاد آ گیا۔ اس کے دل میں بے اختیار ہوک سی اُٹھی۔

ایک روز سورٹھ کے دل میں جانے کیا آئی کہ اس نے اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گوٹھ کا رُخ کیا جہاں میر محمد اپنے باپ کی ساتھ رہتا تھا۔ سورٹھ نے نہ میر محمد کا گھر دیکھا تھا اور نہ ہی کبھی وہ اس کے باپ سے ملی تھی مگر وہ کس گوٹھ سے تعلق رکھتا تھا اور اس کا باپ کیا کرتا تھا، یہ اسے میر محمد نے البتہ ضرور بتا رکھا تھا۔

میر محمد کا باپ علاقے میں جانا پہچانا تھا۔ اس لیے سورٹھ کو اس کا پتا چلانے میں چنداں دشواری کا سامنا نہ ہوا، اسے پورا یقین تھا کہ میر محمد اب بھی اس گھر میں ہوگا۔ وہ مٹی کے کھلونے بیچنے والی کے روپ میں اس کے گھر جا پہنچی تو وہاں ایک عمر رسیدہ عورت تھی۔ سورٹھ کو میر محمد نے بتایا تھا کہ اس کی ماں کا انتقال ہو چکا تھا اور یہ اس کی سوتیلی ماں تھی، سورٹھ نے کسی طرح باتوں باتوں میں اس عورت سے اس کے بچوں وغیرہ کے بارے میں پوچھا تو سورٹھ پر ایک دردانگیز اور بڑا کرب ناک انکشاف ہوا۔

سوتیلی ماں سے کوئی اولاد نہ ہوئی تھی جبکہ میر محمد کے بارے میں اس نے بتایا کہ وہ کسی بنجارن کے عشق میں گورکھ ہل کے سنگلاخ ویرانوں میں جا بسا تھا، باپ بھی ضدی تھا اسے لینے نہ گیا مگر آخر کب تک...... باپ کی محبت نے بیٹے کی محبت میں جوش مارا اور اسے تلاش کرنے کے لیے گورکھ ہل جا پہنچا، کچھ لوگ بھی گوٹھ کے ہمراہ تھے۔ مگر میر محمد کا کچھ پتا نہ چلا البتہ تلاش بسیار کے بعد انہیں میر محمد کا وہ پہاڑی ٹھکانا ضرور مل گیا، وہاں کچھ ایسی نشانیاں تھیں جس سے پتا چلتا تھا کہ کوئی وہاں رہتا تھا۔ اس تلاش میں اتفاق سے میر محمد کے باپ خدا بخش کے ہمراہ ایک کھوجی بھی تھا جسے عرف عام میں پیرے تلاش کرنے والا کہا جاتا ہے۔ اس نے کھوہ کا بہ غور معائنہ کیا تو پتا چلا میر محمد کو کوئی ''مم'' اُٹھا کر لے گئی ہے کیونکہ وہاں پیرے تلاش کرنے والے کو زمین پر بڑے بڑے پاؤں کے نشانات ملے تھے، بس پھر کیا تھا، ڈنڈوں، کلہاڑیوں کے ساتھ اس ''مم'' کی تلاش شروع کر دی گئی مگر میر محمد کا کہیں پتا نہ چلا۔ لوگوں کا یہی خیال تھا کہ اتنا عرصہ بیت چکا ہے اور چونکہ میر محمد کو کسی ''مادہ'' مم نے ہی اُٹھایا تھا اس لیے اب میر محمد بھی مم بن چکا ہوگا مگر خدا بخش ایسی لغو باتوں کو تسلیم نہیں کرتا تھا مگر بہر حال میر محمد کا پھر کچھ پتا نہ چلا۔''

یہ سب سننے کے بعد بے اختیار سورٹھ کی شدت غم سے آنکھیں بھر آئیں۔ وہ سمجھ گئی کہ اس رات اس کا محبوب اسے دھوکا دے کر کہیں نہیں گیا تھا بلکہ اسے اس رات بد قسمتی سے ایک مم اُٹھا کر لے گئی تھی۔

سورٹھ واپس اپنے گورکھ ہل والے پڑاؤ پر پہنچی تو وہاں بھی کسی ''مم'' کے متعلق ہی چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں کہ رات کو ان کے قبیلے کا ایک آدمی دھنول نے اپنی مڑھی کے باہر ایک بھاری بھرکم بن مانس جیسا آدمی حرکت کرتے دیکھا ہے، نہ صرف یہ بلکہ اس کے قدموں کے نشان بھی ملے ہیں، وغیرہ۔

ایک رات اس مم نے پھر پڑاؤ کا رُخ کیا۔ کسی کی اس پر نگاہ پڑ گئی۔ اس نے شور مچا دیا۔ سارا قبیلہ جاگ پڑا۔ مم کی شامت آ گئی۔ لوگوں نے کلہاڑیوں اور ڈنڈوں سے اسے مار ڈالا۔

سب لوگ لالٹین، سلگتی ہوئی جھاڑیوں کی مشعلیں لیے مم کی لاش کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ سورٹھ بھی ان میں شامل تھی۔ معاً اس نے مم کے بالوں بھرے ایک ہاتھ میں کوئی چمکتی شے کی جھلک دیکھی، وہ بے اختیار آگے بڑھی اور اس شے کو چھوا تو وہ ایک ہاتھی دانت کا بنا ہوا کنگن تھا، سورٹھ جیسے سانس تک لینا بھول گئی۔ اس کنگن کو وہ اچھی طرح پہچان گئی تھی، یہ اس کا وہی کنگن تھا جو میر محمد سے آخری ملاقات میں اس نے اپنے بازو سے اُتار کر دیا تھا۔

لوگوں نے دیکھا، سورٹھ پاگلوں کی طرح مم کی لاش سے لپٹی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

☆☆☆

ایسی داستانیں گورکھ ہل سے متعلق بھری پڑی ہیں۔ میر محمد اور سورٹھ کی یہ پُراسرار رومانوی داستان کوئی فرضی کہانی نہیں تھی۔

''مم'' کو دیکھنے، اسے تلاش کرنے کے ایڈونچر پسند شائقین جنہیں سر پھرا کہا جانے لگا تھا، کم نہیں تھے، آج بھی جب گورکھ ہل کے علاقے میں شکاری مہمات کے لیے جو لوگ جاتے ہیں، وہ مم کا تذکرہ ضرور کرتے ہیں۔

زمانے بیت گئے، گورکھ ہل اپنی بھرپور پُراسراریت کے باعث آج بھی تنا کھڑا ہوا ہے اور ایڈونچر پسندوں کو پکارتا ہے، اپنی پُراسراریت کے پردے کو چاک کرنے کی تحریک دیتا ہے۔

اب تو اس کے پہلو سے پکی سڑک بھی گزرنے لگی ہے۔ ایک ریلوے لائن بھی اس کے پہلو میں بل کھاتی جاتی ہے۔ کبھی آپ ٹرین میں یہاں سے گزریں تو گورکھ ہل کا نظارہ کرنے کے لیے کھڑکی کے پاس بیٹھیے گا۔ رات ہو چاہے دن، جب ٹرین گورکھ ہل کے ساتھ ساتھ اس کی سنگت میں گزرتی ہے تو یہ منظر دیکھنے کے لائق ہوتا ہے۔

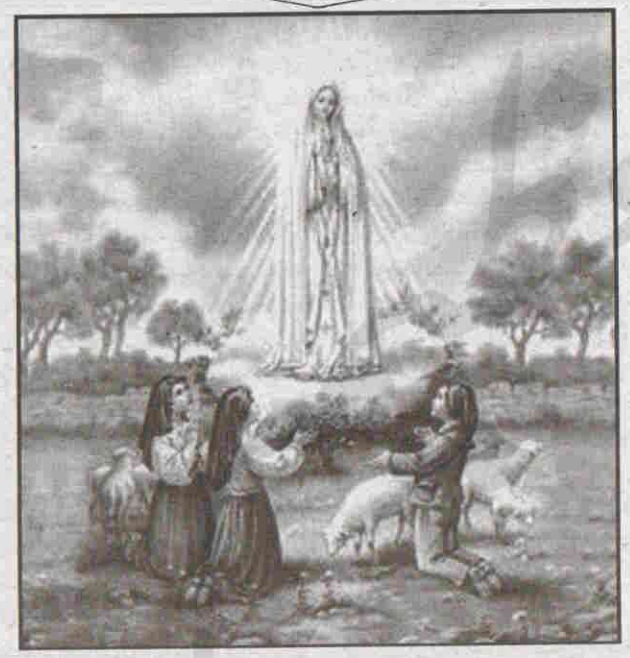

سورج کا رقص

ذوالفقار ارشد گیلانی

یورپ کے اس دور افتادہ گاؤں کے چرواہوں کو وہ کون بی بی نظر آئی تھی ، ایک ایسے علاقے میں جہاں دور دور تک کسی مسلم مملک کا وجود نہیں وہاں نظر آنے والی ہستی نے خود کو جنت سے آئی فاطمہ کیوں کہا ؟ کیا وہ واقعی فاطمہ بنتِ رسول اللہ تھیں یا عیسائیوں نے اس واقعہ پر پردہ ڈالنے کے لیے حضرت مریم کا نام استعمال کیا ہے ۔

ایک سمجھ میں نہ آنے والا واقعہ پرتگال سے

اللہ تعالیٰ نے غیب کا علم کسی کو عطا نہیں کیا لیکن ...وں، کرامتوں اور پیش گوئیوں کی صلاحیت کے ذریعے ...ندوں کو یہ قدرت ضرور دی کہ وہ ان سے انسانیت کی ... اصلاح کریں، وجود الٰہی پر اعتقاد و اعتماد کو غیر متزلزل ...یں اور دنیا کو پیش آمدہ واقعات سے استعاراتی یا تشبیہاتی ...یں آگاہ رکھیں تا کہ ایسے فیصلے کیے جا سکیں جو کرۂ ارض ...قبل کو محفوظ و مامون بنانے کے علاوہ آنے والے ...وں کو خوش گوار اور ماحول کو سازگار رکھ سکیں۔

معجزے نبیوں کو ودیعت کیے گئے تا کہ وہ انہیں بھٹکی ہوئی مخلوق کو راہِ راست پر لانے کے لیے خالق حقیقی کی دعوت یا انتباہ کے طور پر استعمال کر سکیں۔ موسیٰؑ کو ید بیضا اور عصا سمیت کئی معجزے عطا ہوئے تا کہ فرعون، مصریوں اور بنی اسرائیل کو ان کے اصل رب کی جانب راغب کیا جا سکے۔ موسیٰؑ نے اسی عصا سے اپنی قوم کو فرعون کے ظلم و ستم اور عذاب سے بچانے کے لیے بحیرۂ قلزم کے پانیوں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ یونسؑ چالیس روز بعد ایک معجزے کے طور پر ہی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شکم ماہی سے دریا کے کنارے اُگل دیے گئے۔ عیسیٰؑ کو احیائے موتی کا معجزہ عطا ہوا جبکہ ادریسؑ کو آسمانوں پر اُٹھالیا گیا اور یہ بھی ایک معجزہ ہی تھا کہ الیاسؑ کو آتشیں بگولے نے محض ایک چھوٹے سے دریا کے پار کھڑے سیکڑوں افراد کی نگاہوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اوجھل کردیا۔

مکہ کے کافروں نے ضد کی نبی ہونے کا ثبوت دیں تو سرکارالانبیاء حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شق القمر کا معجزہ دکھادیا۔ تاریخ انسانی کا سب سے بڑا معجزہ، معراج نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صورت ہمارے سامنے ہے۔ مباہلہ بھی ایک معجزہ ہی تھا کہ نصاریٰ کے بڑے بڑے عالم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو چیلنج دے کر آئے کہ آؤ ہم سے علمی بحث کرو۔ جھوٹ اور سچ کا فیصلہ یہیں ہوجائے گا لیکن جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے ساتھ فاطمہؓ، علیؓ، حسنؓ اور حسینؓ کو لے کر میدان میں پہنچے تو نصاریٰ چیخ اُٹھے۔ بلاشبہ یہ سب سچے ہیں۔ اگر یہ کہہ دیں پہاڑ ہٹ جا تو وہ بھی اپنی جگہ سے ہٹ جائے گا۔ معجزہ ہی تو تھا کہ بغیر مقابلہ کے وہ سب شکست کھا گئے۔ جنین جذع اور تکثیر طعام کا شمار بھی معجزات نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں کیا جاتا ہے۔ حلیمہ سعدیہ کمزور اونٹنی کی وجہ سے آخر میں مکہ پہنچیں لیکن احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو لے کر لوٹیں تو اس شیر خوار کے طفیل کوئی دوسری اونٹنی اس کی گرد کو بھی نہ چھوسکی۔ محدثین و مفسرین اس امر پر متفق ہیں کہ رحمتہ اللعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پوری زندگی ہی ایک معجزہ تھی اور یہ وہ اعزاز ہے جو آپ کے سوا کسی اور نبی کو نصیب نہیں ہوا۔

کرامتیں، اولیائے کرام سے منسوب ہیں۔ رومن بادشاہ سیزر کی بیٹی شہزادی ملائکہ، خواب میں پہلے سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت عیسیٰؑ کی زیارت کرتی ہے اور پھر عالم خواب میں ہی حضرت فاطمتہ الزہرہ اور حضرت مریم، شہزادی کو مشرف بہ اسلام کراتی ہیں۔ یہی شہزادی حضرت علی نقیؓ کی کرامت کے طفیل نہ صرف جنگی قیدی بن کر بغداد پہنچتی ہے بلکہ نرجس کی حیثیت سے آپ کی بہو یعنی حضرت حسن عسکریؓ کی زوجہ محترمہ بنتی ہے۔

غوث اللعالمین سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ بغداد میں اپنے مدرسے کے منبر پر کھڑے ہوکر فرماتے ہیں کہ میرا قدم تمام اولیا کی گردن پر ہے اور عالم ارواح اور عالم وجود میں تمام اولیائے کرام اپنی گردنیں خم کرکے اظہار اطاعت کرتے ہیں۔ شیخ فریدالدین عطار فریاد کرتے ہیں کہ میرا مرشد ڈوب رہا ہے اور سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ وضو کرتے ہوئے ہاتھ کے پانی کا چھینٹا مارتے جو سیکڑوں میل دور موجود شیخ ستار (وہ واحد ولی جس نے گردن نہیں جھکائی تھی) کے منہ پر پڑتا ہے اور ان کی تمام روحانی قوتیں لوٹ آتی ہیں۔ داتا گنج بخش کو دودھ دینے سے انکار کردیا جاتا ہے تو لاہور کی تمام بھینسوں کا دودھ خشک ہوجاتا ہے لیکن پھر آپ کی دعا سے ہی یہی بھینسیں اتنا دودھ دیتی ہیں کہ گوالوں کے لیے سنبھالنا مشکل ہوجاتا ہے۔

جے پال، خواجہ معین الدین اجمیریؒ کو زیر کرنے کے لیے ہوا میں معلق ہوجاتا ہے تو خواجہ غریب نوازؒ کی کھڑاویں کچھ اتنی شدت کے ساتھ اس کے سر پر برستی ہیں کہ نہ صرف زمین پر گر پڑتا ہے بلکہ اسلام قبول کرکے خلافت کے منصب پر بھی فائز ہوجاتا ہے۔ لعل شہباز قلندرؒ اپنی جوؤں سے مگرمچھ پیدا کردیتے ہیں جو آج بھی منگھو پیر، کراچی کے تالاب میں موجود ہیں۔ علاؤالدین صابر پیاؒ کلیر شریف والے اپنا جنازہ خود پڑھاتے ہیں تو بری امامؒ عبادت میں خلل ڈالنے والے جن کو پتھر کی چٹان میں تبدیل کردیتے ہیں جو آج بھی لوئی دندی میں دیکھی جاسکتی ہے۔ علاؤالدین خلجی، آندھی و طوفان کی طرح دہلی کی جانب بڑھتا ہے لیکن خواجہ نظام الدین اولیاء مسکراتے ہوئے فرمادیتے ہیں "ہنوز دلی دوراست" اور علاؤالدین خلجی جسے دلی میں داخل ہونے سے دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی، محض چند کوس کے فاصلے پر اس دارفانی سے کوچ کرجاتا ہے۔ حکومت پاکستان گندم ختم ہوجانے کا سرکاری اعلان کرتی ہے تو گولڑے کے پیر کہتے ہیں کہ جتنی گندم چاہیے، گولڑہ سے لے جائے کیونکہ ہماری گندم امریکا سے نہیں، مدینہ سے آتی ہے جو کبھی ختم نہیں ہوسکتی۔

اور پیش گوئیوں کی صلاحیت، اللہ تعالیٰ، صاحبانِ علم اور صاحبانِ نظر کو دیتا ہے۔ پیغمبروں اور اولیائے کرام کے علاوہ بعض ایسے افراد بھی اس دنیا میں ہوگزرے ہیں جنہوں نے آنے والے دنوں میں پیش آمدہ واقعات کے بارے میں دنیا کو آگاہ کیا اور ان کی یہ پیش گوئیاں حرف بہ حرف سچ ثابت ہوئیں۔ دوسروں کی بات چھوڑیں، صرف ناسٹراڈیمس کو لے لیں۔ 1503ء سے 1566ء تک حیات اس فرانسیسی پیش گو نے مجموعی طور پر 6338 پیش گوئیاں کیں۔ ماضی میں اس کی پیش گوئیوں کے سچ ہونے کے تناسب کو دیکھتے ہوئے یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ آنے والے دنوں میں بھی وہ سب کچھ ہوگا جس کی نشاندہی ناسٹراڈیمس نے پانچ سو سال پہلے کردی تھی۔

1559ء میں فرانس کے بادشاہ ہنری دوم کی موت، ستمبر 1666ء کی لندن کی آتش زدگی، 1789ء کے انقلاب فرانس، نپولین کے برسرِاقتدار آنے، لوئی پاسچر کے کارنامے، ہٹلر کے عروج و زوال، چارلس ڈی گال کی حکومت، ایٹم بم کی ایجاد و استعمال اور تباہی، امریکی صدر جان ایف کینیڈی کا قتل، 1986ء میں امریکی خلائی شٹل چیلنجر کا پھٹنا 1997ء میں لیڈی ڈیانا کی موت اور نائن الیون سمیت ناسٹراڈیمس کی درجنوں پیش گوئیاں درست ثابت ہوچکی ہیں۔ ناسٹراڈیمس کی پیش گوئیوں میں 21 دسمبر 2012ء کے علاوہ 25 نومبر 2015ء کے ایک تباہ کن زلزلے کے اشارے بھی موجود ہیں۔

ان معجزوں، کرامتوں اور پیش گوئیوں کو روحانیت تو تسلیم کرتی ہے لیکن سائنس انہیں پُراسرار واقعات قرار دیتی ہے تاہم اس سے انکار نہیں کرتی کہ تاریخ ایسے اَن گنت واقعات سے بھری پڑی ہے۔ ماضی بعید کے واقعات تو ایک طرف، جدید دور میں بھی کوئی ایسا دن نہیں گزرتا جب دنیا کے کسی نہ کسی حصے میں کوئی پُراسرار واقعہ رونما نہ ہوتا ہو۔ سائنس یا عقل بے شک ان پُراسرار واقعات کی وجوہات تلاش نہ کرپاتی ہو لیکن ان کے وجود سے منکر نہیں۔ ایسا ہی ایک واقعہ پرتگال کے ایک چھوٹے سے قصبے سے منسوب ہے جس کی بہ ظاہر کوئی عقلی یا سائنسی توجیہہ پیش نہیں کی جاسکتی لیکن تاریخ اس پُراسرار واقعے سے منکر قطعی نہیں کیونکہ اس کے نہ صرف ناقابلِ تردید شواہد موجود ہیں بلکہ وہ تمام پیش گوئیاں بھی پوری ہوئیں جو اس پُراسرار واقعے سے منسوب کی گئیں۔

یہ پُراسرار لیکن مذہبی واقعہ پرتگال کے جس گاؤں میں پیش آیا اس کا نام فاطمہ ہے۔ سات ہزار 756 نفوس کی آبادی کا یہ گاؤں یا قصبہ سینٹر و ریجن کی کوریم میونسپلٹی کے سب ریجن میڈیو ٹیجو میں واقع ہے۔ جغرافیائی طور پر فاطمہ نامی گاؤں وسطی پرتگال میں ایریا کے مضافات میں ضلع سینٹریم کا حصہ ہے۔ یہ پورٹو کے جنوب میں 187 کلومیٹر (116 میل) اور پرتگال کے دارالحکومت لزبن کے شمال میں 123 کلومیٹر (76 میل) کے فاصلے پر ہے۔

فاطمہ سٹی کی وجۂ شہرت آور لیڈی آف روزری (ہماری تسبیح والی خاتون) کا وہ گرجا گھر ہے جو 1917ء میں پیش آنے والے اس پُراسرار واقعے کی یادگار کے طور پر تعمیر کیا گیا ہے جب تین چرواہے بچوں کو ورجن آف دی روزری، آور لیڈی آف فاطمہ (تسبیح والی خاتون، ہماری محترمہ فاطمہ) کا دیدار ہوا۔ جب بچوں نے نظر آنے والی خاتون سے اس کی شناخت دریافت کی تو جواب ملا کہ "میں لیڈی آف دی روزری ہوں اور میں جنت سے آئی ہوں۔"

وہ خاتون مسلسل چھ ماہ تک ایک مخصوص تاریخ پر بچوں کو نظر آتی اور ان سے باتیں کرتی رہی۔ خاتون نے ان ملاقاتوں میں بچوں کو بعض راز بھی بتائے اور کچھ پیش گوئیاں کیں جو بعد میں حرف بہ حرف پوری ہوئیں اور عیسائیوں کے کئی اعلیٰ ترین مذہبی پیش واؤں نے ان کی تصدیق کی۔ (ایسا کہا جاتا ہے کہ بہت سی باتیں، پیش گوئیاں چرچ نے چھپالی ہیں)

عیسائی اور بالخصوص رومن کیتھولک، بچوں کو نظر آنے والی اس خاتون کو کنواری مریم قرار دیتے ہیں لیکن ایک ایرانی تحقیق کے مطابق بچوں کو دکھائی دینے اور ان سے باتیں کرنے والی خاتون حضرت فاطمتہ الزہرہ تھیں۔

عیسائیوں کی جانب سے جو دلائل پیش کیے جاتے ہیں ان کے مطابق یہ واقعہ عیسائی سرزمین پر پیش آیا اور خاتون نے جو پیش گوئیاں بھی کیں ان کا تعلق صرف عیسائی مذہب سے تھا اس لیے وہ مقدس مریم کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ یہ امر بھی ملحوظِ خاطر رہے کہ خود عیسائیوں کی زبانی، خاتون نے خود کو لیڈی آف دی فاطمہ کہا تھا۔ اس لیے عیسائی بھی بے حد فخر سے اس خاتون کو "آور لیڈی آف فاطمہ" کہتے ہیں۔ اب یہ عیسائیوں کو علم ہوگا کہ وہ فاطمہ اور مریم کو کب سے اور کیونکر ایک ہی ہستی سمجھنے لگے ہیں۔

تاریخ میں تو یہ درج نہیں کہ 1917ء میں اس پُراسرار واقعے کے بعد گاؤں کا نام فاطمہ رکھا گیا یا یہ کوئی قدیم نام ہے لیکن یہ طے ہے کہ اس واقعے سے پہلے عیسائی ثقافت میں فاطمہ نام کی کوئی شہادت دستیاب نہیں۔ قدیم عیسائیوں میں کسی خاتون کا ایسا نام نظر سے نہیں گزرا۔ اس لیے اغلب امکان ہے کہ عیسائیت میں "فاطمہ" کا نام اسی واقعے سے متعارف ہوا ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ اگر بچوں کو مقدس مریم کا دیدار ہوا تھا تو پھر گاؤں کا نام "مریم" کیوں نہیں رکھا گیا۔ اسے "فاطمہ" کے نام سے پکارے جانے کا مطلب ہی یہ ہے کہ بچوں کو مریم نہیں بلکہ فاطمتہ الزہرہ کا دیدار ہوا تھا اور مریم سے منسوب پیش گوئیاں درحقیقت خاتونِ جنت نے کی تھیں کیونکہ انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ "میں جنت سے آئی ہوں۔" (جناب فاطمتہ الزاہرہ کا لقب خاتونِ جنت ہے)

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دلائل اپنی جگہ لیکن اس اسرار سے کبھی پردہ نہیں اُٹھ سکے گا کہ پرتگال کے اس چھوٹے سے گاؤں کے تین بچوں کو نظر آنے والی خاتون مریم تھیں یا فاطمۃ الزہرہ البتہ یہ سچ ہے کہ یہ پراسرار واقعہ رونما ہوا جس کے درجنوں نہیں بلکہ ہزاروں گواہ تھے۔

رومن کیتھولک کہتے ہیں کہ ''آور لیڈی آف فاطمہ'' ایک خطاب ہے جو مقدس کنواری مریم کو اس وقت دیا گیا جب وہ فاطمہ گاؤں کے تین چرواہے بچوں کے سامنے نمودار ہوئیں۔ یہ واقعہ مسلسل چھ ماہ تک ہر تیرہ تاریخ کو رونما ہوتا رہا۔ پہلی مرتبہ وہ مقدس ہستی بچوں کو 13 مئی 1917ء اور آخری مرتبہ 13 اکتوبر 1917ء کو دکھائی دی تھی۔ ان تین بچوں کے نام لوسیا سنٹوس اور اس کے دو کزن جے سنٹا اور فرانسسکو مارٹو تھے۔ عیسائی مصنفین کا کہنا ہے کہ تین بچوں کے سامنے مقدس مریم کے نمودار ہونے کے واقعے کو ہی ''آور لیڈی آف روزری'' کا خطاب دیا گیا ہے جبکہ عیسائیت میں یہ اصطلاح 1208ء میں اسی قسم کے ایک واقعے کے لیے بھی استعمال کی گئی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس پُراسرار واقعے کے راوی تینوں بچوں نے خاتون کو ''لیڈی آف دی روزری'' کہہ کر ہی مخاطب کیا تھا۔ اب عیسائی اس اصطلاح کو ''آور لیڈی آف دی روزری آف فاطمہ'' کے طور پر بھی استعمال کرتے ہیں۔

فاطمہ سٹی میں ہونے والے واقعات نے اپنی پیش گوئیوں کی وجہ سے بے حد شہرت حاصل کی جن میں ممکنہ جنگِ عظیم اور سوویت یونین کی تشکیل کی پیش گوئیاں بھی شامل تھیں۔ فاطمہ سٹی میں رونما ہونے والے واقعات کو کیتھولک چرچ نے نہ صرف تسلیم کیا بلکہ سرکاری طور پر اسے ''قابلِ اعتماد'' بھی قرار دیا۔

یہ پُراسرار واقعہ کوواڈا آئرا (آئرمین کوو) نامی جگہ پیش آیا۔ یہ فاطمہ نامی گاؤں سے ملحق اس زمین کا نام ہے جو لوسیا (لیوسیا) سنٹوس کے خاندان کی ملکیت تھی۔ لوسیا، ان تین بچوں میں سے ایک تھی جنہوں نے رومن کیتھولک چرچ کے مطابق مقدس مریم کو دیکھا، کئی ملاقاتیں کیں اور متعدد پیغامات وصول کیے۔ یہ تینوں بچے اپنے مویشی چرانے اکثر زمین کے اس ٹکڑے پر جایا کرتے تھے۔ یہ 13 مئی 1917ء کی دوپہر کا وقت تھا جب وہ مقدس ہستی پہلی مرتبہ ان بچوں کے سامنے نمودار ہوئی۔ ایک اور جگہ تحریر ہے کہ ہماری مقدس فاطمہ یعنی آور لیڈی آف فاطمہ 13 مئی 1917ء کو دوپہر کے لگ بھگ ان بچوں کو دکھائی دی۔

بچوں کے مطابق وہ حسبِ معمول اپنے مویشی چرا رہے تھے کہ اچانک بجلی چمکنے لگی اور بادل گرجنے لگے۔ تینوں بچے یعنی لوسیا سنٹوس، جے سنٹا اور فرانسسکو ماریو یہ سمجھے کہ بارش ہونے والی ہے چنانچہ انہوں نے گھر کی جانب دوڑ لگا دی لیکن ان کی نظر اچانک ہی سامنے شاہ بلوط کے ایک درخت پر پڑی۔ وہاں انہوں نے نہایت پرنور نورانی خاتون کو دیکھا جس نے اپنے ہاتھوں میں ایک روزری یعنی تسبیح تھام رکھی تھی۔ آور لیڈی فاطمہ نے خوف زدہ بچوں کو مخاطب کیا اور کہا کہ ''مجھ سے ڈرو مت، میں جنت سے آئی ہوں۔''

لوسیا کے مطابق اس خاتون کے چہرے پر اتنا نور تھا کہ وہ سورج سے زیادہ روشن محسوس ہو رہا تھا۔ ماحول اور فضا کے دھندلکے میں اس کا وجود کسی ایسی شفاف شے کی مانند تھا جس سے آر پار دیکھا جا سکتا تھا۔ وہ کرسٹل کی طرح چمک دار تھی، ہیرے سے بھی زیادہ تابناک تھی۔ ایک ایسا ہیرا جسے پانی میں ڈال دیا گیا ہو اور سورج کی شعاعیں اس پانی سے چھن چھن کر گزر رہی ہوں۔ لوسیا کے بہ قول یہ سب 13 مئی 1917ء کی دوپہر کے وقت پیش آیا۔ کچھ خوف اور جھجک کے مارے ہم اس خاتون سے زیادہ تو کچھ نہ کہہ سکے لیکن اس کے سراپا کی تفصیلات نہ بھولنے والی تھیں۔ اس ملاقات میں اس نورانی خاتون نے محض اپنا تعارف کرایا اور بچوں سے کہا کہ وہ اس سے نہ ڈریں، وہ انہیں نقصان پہنچانے نہیں آئی۔

بچے گھر لوٹ آئے۔ وہ اتنے سحر زدہ یا خوف زدہ تھے کہ انہوں نے اپنے کسی بزرگ سے اس واقعے کا تذکرہ تک نہ کیا لیکن اگلے روز وہ دوبارہ مویشی چرانے پہنچ گئے کیونکہ ان کے فرائض میں شامل تھا اور اگر وہ اس سے انکار کرتے تو اس کی وجہ بھی بتانی پڑتی اور فی الوقت ان میں سے کوئی اس کے لیے تیار نہ تھا۔ بچے صبح سویرے ہی کوواڈا آئرا پہنچ گئے۔ ان کی نگاہیں مسلسل شاہ بلوط کے اسی درخت پر تھیں جہاں ایک روز پہلے آور لیڈی آف روزری آف فاطمہ انہیں اپنا دیدار کرایا تھا۔ صبح سے دوپہر تک کا وقت تو کسی طرح کٹ گیا لیکن دیدار کے مقررہ وقت پر بچے بے قرار، بے چین اور قدرے خوف زدہ ہونے لگے۔ وہ وہاں اس خاتون کے دیدار کے مشتاق تو تھے لیکن اندر کوئی ان جانا خوف بھی تھا۔ اسی کیفیت میں مقررہ وقت آیا اور گزر گیا لیکن جنت سے آنے والی خاتون نے انہیں اپنے دیدار سے محروم رکھا اور تینوں بچے شام کو مایوس اور ناکام و نامراد گھروں

لوٹ گئے۔

دن گزرتے رہے۔ بچوں کا خوف کم اور اشتیاق زیادہ ہوتا گیا لیکن آور لیڈی آف فاطمہ نے دوبارہ بچوں کو شرف ملاقات نہیں بخشا حتیٰ کہ جون کی تیرہ تاریخ آ گئی۔ اس روز تین اسی وقت یعنی دوپہر کے وقت (وقت ظہر) ایک ماہ پہلے کی طرح بجلی کڑکی، بادل گرجے اور وہ نورانی چہرے والی خاتون اسی شاہ بلوط کے درخت کے نیچے نمودار ہوگئی۔ اب بچوں کو سمجھ آ گئی کہ خاتون کی آمد کا وقت مخصوص ہے چنانچہ انہیں اگلا دیدار 13 جولائی کو ہوا۔ ان دو ملاقاتوں میں آور لیڈی آف فاطمہ نے بچوں سے بہت سی باتیں کیں۔

ان ملاقاتوں میں آور لیڈی آف فاطمہ نے بچوں سے کہا کہ وہ گناہوں سے بچے رہیں، توبہ کریں اور کفارہ ادا کریں۔ ایسے کام کریں جن سے غلطیوں کی تلافی ہوتی ہو اور شیطانی قوتیں ان سے دور رہیں۔ خاتون نے بچوں کو بتایا کہ اللہ تعالیٰ نیک کاموں کی جزا اور بُرے کاموں کی سزا دیتا ہے۔ اس لیے کوشش کریں کہ اپنے معمولات سے اللہ کو خوش رکھیں۔ اللہ اپنے نیک اور پسندیدہ لوگوں کو آزمائشوں میں ڈالتا ہے اور جب کوئی اس کی آزمائش یا امتحان میں پورا اُترتا ہے تو پھر وہ اسے انعام بھی دیتا ہے۔ اس میں سے کچھ انعام دنیا میں ہی مل جاتا ہے جبکہ انعام کا باقی حصہ آخرت میں ملتا ہے۔ نورانی چہرے والی خاتون نے بتایا کہ یہ زندگی عارضی ہے جس کے بعد ہر شخص کو مر جانا ہے لیکن اللہ تعالیٰ اپنی تمام مخلوق کو ایک بار پھر زندہ کرے گا اور وہی زندگی ابدی ہوگی لیکن انسان نے اپنی عارضی زندگی میں جو گناہ و ثواب کیے ہوں گے۔ ان کا باقاعدہ حساب ہوگا اور ابدی زندگی میں جو سزا اور جزا دی جائے گی، ان کی بنیاد یہی گناہ و ثواب ہوں گے۔ جو اچھے کام کریں گے، وہ بہتر زندگی گزاریں گے اور جو بُرے کام کریں گے، ان کی ابدی زندگی نہایت بدتر اور اذیتوں سے بھرپور ہوگی۔

خاتون کی باتیں چونکہ نہایت ثقیل اور مشکل تھیں اس لیے بچوں کی سمجھ میں کچھ آیا اور کچھ نہیں آیا لیکن انہوں نے اپنے طور پر خود کو سزائیں دینے کا عمل شروع کر دیا۔ وہ اپنی کمر کے گرد نہایت کس کر رسیاں باندھنے لگے تاکہ انہیں وقت درد اور تکلیف کا احساس ہوتا رہے۔ اپنے گناہوں کو دور کرنے کے لیے انہوں نے اپنے تئیں ایک اور طریقہ تلاش کر لیا۔ وہ مہینے پرتگال کے موسم کے حساب سے انتہائی گرم تھے لیکن تینوں بچوں نے خود کو سزا دینے اور گناہوں سے بچے رہنے کے لیے پانی پینا چھوڑ دیا۔ ہاں جب کبھی پیاس بے تحاشا تنگ کرتی تو وہ خاردار جھاڑیوں والے ایک پودے کے پتے چبا لیتے جن سے نکلنے والا معمولی سا رس انہیں کچھ دیر کے لیے پانی سے بے نیاز کر دیتا۔ اس کے علاوہ بھی وہ بعض ایسے کام کرتے جنہیں عیسائیت کے مطابق زہد و تقویٰ میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ (عیسائیت میں خود کو ایذا پہنچا کر گناہوں کا کفارہ ادا کیا جاتا ہے)

لوسیا کے مطابق نورانی چہرے والی خاتون نے انہیں ہر روز تسبیح پڑھنے یعنی روزری کی ہدایت کی تھی اور کہا تھا کہ تسبیح صرف انسان کے اپنے دل و دماغ کو ہی سکون نہیں دیتی بلکہ بیشتر اوقات یہ دنیا کے امن میں بھی کلیدی کردار ادا کرتی ہے۔ لوسیا کا کہنا ہے کہ ان دنوں جنگِ عظیم اوّل جاری تھی اور پرتگال کے بہت سے لوگ اس جنگ میں شریک تھے اس لیے امکان ہے کہ آور لیڈی آف فاطمہ نے اسی جنگ کی گونج کا ذکر کرتے ہوئے نصیحت کی تھی کہ اگر امن چاہتے ہو تو اللہ کی عبادت کرو۔

لوسیا سے جب پوچھا گیا کہ آور لیڈی آف فاطمہ نے مزید کیا کہا تھا تو اس کا کہنا تھا کہ نورانی چہرے والی خاتون ویسے تو عبادات اور انسان کے اعمال کے حوالے سے گفتگو کرتی لیکن اپنی ان ملاقاتوں میں انہوں نے تین راز بھی بتائے تھے۔ یہ پیش گوئیاں تھیں لیکن اب انہیں سرکاری طور پر ''فاطمہ کے تین راز'' کہا جاتا ہے اور چرچ نے ان رازوں کے افشا کرنے پر پابندی لگا دی۔

بچے چونکہ من کے سچے لیکن زبان کے کچے ہوتے ہیں اس لیے وہ ان تین ماہ کے دوران گزرنے والی کیفیات کو راز نہ رکھ سکے۔ انہوں اپنے والدین کو شریکِ راز کیا کہ ہم سے ملنے ایک بی بی آتی ہیں پھر مگر وہ بھی ان باتوں کو خود تک محدود نہ رکھ سکے۔ پہلے ان کے رشتے داروں کو خبر ہوئی۔ پھر گاؤں والوں کو اور اس کے بعد دور و نزدیک کے علاقوں میں یہ خبر پہنچ گئی کہ آور لیڈی آف فاطمہ ایک مخصوص دن، تین بچوں کو شرف ملاقات بخشتی ہے۔ بچوں اور ان کے والدین کی زبانی لوگوں کو یہ علم بھی ہو گیا کہ خاتون ہر ماہ کی 13 تاریخ کو نمودار ہوتی ہے چنانچہ 13 اگست قریب آتے ہی ہزاروں لوگ یہ معجزہ دیکھنے کے لیے دور و نزدیک سے اس میدان میں پہنچ گئے جو اب فاطمہ سٹی کہلاتا ہے۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ بھی اس خاتون کا دیدار کریں، اس کی باتیں سنیں اور اپنا ایمان تازہ کریں۔

لیکن اس دن کچھ اور ہی ہو گیا۔ یہ خبریں سننے والوں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں صوبائی ایڈمنسٹریٹر آرئز سنٹوس بھی شامل تھا۔ اس کا نام سنٹوس ضرور تھا لیکن لوسیا سنٹوس سے اس کی کوئی رشتے داری نہ تھی۔ بنیادی طور پر وہ پادری ازم کا کٹر مخالف اور یہودیوں کی خفیہ تنظیم فری میسن کا رکن تھا۔ اس نے جب ہزاروں لوگوں کو فاطمہ سٹی آتے دیکھا تو اس کا ماتھا ٹھنکا اور اس نے آور لیڈی آف فاطمہ کے معجزے کو صریحاً سستی شہرت حاصل کرنے کا ذریعہ اور سیاسی بگاڑ کا سبب قرار دے دیا۔ آرئز سنٹوس کے نزدیک اس واقعے کا پرچار مذہبی منافرت پھیلانے کے سوا کچھ نہ تھا چنانچہ وہ اسے روکنے کے لیے سرگرم ہوگیا۔

13 اگست 1917ء کی صبح جب تینوں بچے مویشی چرانے کے لیے اپنے گھر سے نکلے تو ایڈمنسٹریٹر آرئز سنٹوس ان کے تعاقب میں تھا۔ اس سے پہلے کہ بچے اپنی زمین یعنی کووا ڈا آئرا پہنچتے، آرئز نے انہیں پکڑ کر جیل میں بند کردیا چنانچہ تینوں بچوں نے وہ تمام دن جیل میں گزارا۔ بچوں کے والدین، رشتہ داروں، گاؤں والوں حتیٰ کہ باہر سے آئے ہوئے ہزاروں افراد نے آرئز سنٹوس سے بچوں کو رہا کرنے کی درخواست کی کیونکہ وہ بے قصور اور بے گناہ تھے لیکن صوبائی ایڈمنسٹریٹر نے کسی کی کوئی بات نہ سنی اور بچوں کو تمام دن جیل میں بند رکھا۔

جہاں بچوں کو رکھا گیا تھا، وہ باقاعدہ جیل تھی جہاں دوسرے سیکڑوں قیدی بھی موجود تھے۔ ان قیدیوں نے بعد میں بتایا کہ بچوں نے وہ تمام دن جیل میں نہایت بے چینی اور بے قراری کے عالم میں گزارا۔ قیدی ان معصوم بچوں کو تسلیاں ... اور دلاسے دیتے رہے۔ انہیں ہر ممکن طریقے سے بہلانے اور خوش رکھنے کی کوششیں کرتے رہے لیکن یوں محسوس ہورہا تھا کہ بچوں کو کسی پل سکون اور کسی کروٹ چین نہیں مل پارہا تھا۔ بچے کچھ دیر تو قیدیوں کی باتیں سنتے رہے لیکن بعد میں وہ ایک کونے میں بیٹھ گئے اور عبادت کرنے لگے۔ قیدیوں کے مطابق وہ تسبیح کا ورد کررہے تھے۔

دوسری جانب صوبائی ایڈمنسٹریٹر بھی بچوں کو محض جیل میں ڈال کر ہی مطمئن نہیں ہوگیا تھا بلکہ وہ اصل واقعے کی تہ تک پہنچنے کے جتن بھی کررہا تھا۔ اس نے بچوں سے باقاعدہ تفتیش کی اور ان سے وہ راز اگلوانے کی ناکام کوشش کی جو آور لیڈی آف فاطمہ نے انہیں بتائے تھے۔ اس نے پہلے اجتماعی طور پر تینوں بچوں کو بلایا اور ان سے سوال جواب کیے لیکن جب اسے کام کی کوئی بات پتا نہ چل سکی تو اس نے الگ الگ بچوں کو ڈرایا، دھمکایا۔ اس نے ہر بچے کو دھمکی دی کہ اگر وہ اسے اصل بات نہیں بتائے گا تو وہ تیل کی اُبلتی کڑاہی میں ڈال کر اسے بھون ڈالے گا۔ اُبلتے تیل کی کڑاہی میں ڈالے جانے کی دھمکی کسی بھی انسان کو دہلا دینے کے لیے کافی ہے لیکن بچے بڑوں سے زیادہ بہادر نکلے اور انہوں نے کچھ بتانے سے انکار کردیا کیونکہ بہ قول ان کے انہوں نے کوئی جرم نہیں کیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر وہ کوئی بات نہیں بتانا چاہتے تو یہ کوئی جرم نہیں البتہ کسی کا راز افشا کرنا بہرحال جرم ہے اور وہ اس جرم کے مرتکب نہیں ہوسکتے۔

شواہد کے مطابق جج سنخا اور فرانسسکو نے تو صوبائی ایڈمنسٹریٹر کو ایک بھی لفظ بتانے سے انکار کردیا تھا لیکن لوسیا نے رازوں کے متعلق ہر بات نہایت مختصر انداز میں اس کے گوش گزار کردی تھی۔ لوسیا نے آرئز کو پیشکش کی کہ اگر خاتون نے اجازت دی تو وہ اسے یعنی آرئز کو تمام راز نہایت تفصیل کے ساتھ بتائے گی۔ آرئز کے سوال پر لوسیا نے وعدہ کیا کہ وہ اس بارے میں خود خاتون سے بات کرے گی اور اجازت طلب کرے گی۔ کہا جاتا ہے کہ آرئز نے اسی یقین دہانی پر تینوں بچوں کو آزاد کردیا۔

بچے رات کو گھر واپس پہنچ گئے لیکن 13 اگست گزر چکی تھی اس لیے انہیں یقین تھا کہ کم از کم اس ماہ وہ اپنی پسندیدہ خاتون کا دیدار نہیں کرسکیں گے۔ انہیں اس پر بے حد ملال بھی تھا لیکن تمام دن گزرنے کے باوجود کچھ نہ ہوا۔ وہ مایوسی سے گھر لوٹ آئے۔ اس سے اگلے روز یعنی 15 اگست کو جشن فرائض یعنی Feast of Assumption کا تہوار تھا جو فاطمہ سٹی سے ملحق بستی ویلن ہوز میں منایا جاتا تھا۔ تینوں بچے اس تہوار اور جشن کو منانے پہنچے اور وہیں انہیں آور لیڈی آف فاطمہ یا مقدس مریم کا دیدار ہوگیا۔ اس طرح نورانی چہرے والی خاتون نے اپنے معمولات میں کوئی فرق نہ آنے دیا۔

لوسیا کے مطابق 13 جولائی 1917ء کو اپنے دیدار کے دوران مقدس بی بی نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ وہ 13 اکتوبر 1917ء کو اپنے آخری دیدار کے موقع پر ایک معجزہ دکھائیں گی اور انہیں یقین تھا کہ ایسا ہی ہوگا چنانچہ انہوں نے 13 ستمبر 1917ء کو ہونے والی ملاقات میں کچھ اور باتیں کیں۔ یہ بھی کچھ راز تھے جنہیں وقتِ مقررہ پر ہی عام کیا جانا تھا لیکن بچوں کو بڑی بے تابی سے 13 اکتوبر 1917ء کا انتظار تھا۔

انہوں نے بے شک ایک ایک دن گن گن کر گزارا لیکن

آخر 13 اکتوبر 1917ء کا دن بھی آ گیا اور اس دن جو کچھ ہوا اسے ''سورج کا معجزہ'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

اس روز 70 ہزار افراد فاطمہ سٹی پہنچے جن میں اخباری رپورٹرز اور فوٹو گرافرز بھی شامل تھے۔ شدید اور مسلسل بارش کے باوجود تمام افراد مستقل مزاجی سے کووا ڈا آئرا کا محاصرہ کیے ہوئے تھے۔ وہ حیران تھے کہ اس موسلا دھار بارش میں وہ معجزہ کیسے رونما ہوگا جس کے لیے انہوں نے طویل سفر طے کیا ہے لیکن پھر ان ستر ہزار افراد نے بارش کو اچانک تھمتے دیکھا۔ چند ثانیوں میں ہی آسمان بھی صاف ہوگیا لیکن ایک باریک سی بدلی نے چمکتے سورج کو دامن میں چھپالیا لیکن بادلوں کا یہ ٹکڑا اتنا چھدرا تھا کہ اس کے پار سورج کا بھرپور نظارہ ہورہا تھا۔

عینی شاہدین نے بتایا کہ بادلوں کا یہ باریک سا پردہ شاید اس لیے تھا کہ سورج کو براہِ راست دیکھنے سے آنکھیں متاثر نہ ہوں اور ہوا بھی یہی کہ لوگ یک ٹک بغیر پلکیں جھپکائے سورج کو دیکھ رہے تھے لیکن اس آگ کے گولے سے نکلنے والی شعاعیں حیرت انگیز طور پر ٹھنڈی اور یخ بستہ کرنوں کی طرح ان کی پتلیوں سے ٹکرا رہی تھیں۔

لوسیا اس وقت کسی اور ہی کیفیت سے دوچار تھی۔ یوں محسوس ہورہا تھا کہ جیسے اس کے اندر کوئی اور روح حلول کرگئی ہو۔ وہ اپنے آپ میں نہیں تھی۔ وہ ایک عالمِ خواب میں بول رہی تھی۔ اس نے خود بیتی یا پُراسراریت کی اسی کیفیت سے دوچار ہوکر ہجوم سے کہا کہ سورج کو دیکھو اور دیکھتے رہو۔

لوگوں نے لوسیا کے کہنے پر عمل کیا اور جاگتی آنکھوں سے سورج کو رنگ بدلتے اور کسی پہیے کی طرح باقاعدہ گھومتے دیکھا۔

لیکن یہ بھی ایک عجیب بات تھی کہ ہجوم میں موجود ہر فرد نے یکساں منظر نہیں دیکھا چنانچہ لوگوں نے سورج کے جھومنے کے حوالے سے مختلف اور متضاد بیانات دیے تاہم اکثریت نے تصدیق کی کہ انہوں نے سورج کو جھومتے دیکھا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ میلوں دور رہائش پذیر افراد نے بھی سورج کے جھومنے کی شہادت دی۔

لوسیا کا کہنا تھا کہ جب لوگ سورج کا نظارہ کررہے تھے، وہ اپنے کزنز فرانسسکو اور جے سنخا کے ہمراہ مقدس خاندان کے حسین و جمیل افراد کا دیدار کررہی تھی۔ بہ قول لوسیا کے انہوں نے اس دوران میں یسوع مسیح کے ساتھ رنج والم کی شہزادی کو دیکھا۔ وہ بے حد دلکش اور خوبصورت تھی۔

انہیں لیڈی آف ماؤنٹ کیمل بھی نظر آئی۔ دس سالہ لوسیا، نو سالہ فرانسسکو اور سات سالہ جے سنخا کا کہنا تھا کہ انہیں سینٹ جوزف بھی دکھائی دیے جو مسیح کے ہمراہ لوگوں کو دعا دے رہے تھے۔

پرتگال کے بااثر ترین اخبار ''اوسیکولو'' جو پالیسی کے اعتبار سے حکومت کا حامی اور پادری ازم کا مسلمہ مخالف تھا، کے کالم نویس ایولینو ڈی المیڈا نے اس واقعے کے بارے میں تحریر کیا کہ ''ہجوم کی متحیر آنکھیں بائبل میں بتائی جانے والی نشانیوں کا مشاہدہ کررہے تھے بلکہ یوں محسوس ہورہا تھا کہ بائبل کا زمانہ لوٹ آیا ہے۔ لوگ ننگے سر، بے تابی کے ساتھ آسمان پر نظریں جمائے ہوئے تھے جہاں سورج کپکپا رہا تھا، ڈگمگا رہا تھا اور کائناتی اصولوں کے برعکس ناقابلِ یقین انداز میں حرکت کررہا تھا۔ لوگوں کی روایتی رائے یہ تھی کہ سورج رقص کررہا ہے۔

پرتگال کے ممتاز ماہر چشم ڈاکٹر ڈومینگو پنٹو کوئیلو نے ایک اور ممتاز اخبار ''اورڈیم'' کے لیے اپنے مضمون میں لکھا ''ایک مرحلے پر سورج ایک گنگار (سرخ) شعلے میں گھر گیا۔ وہ مکمل طور پر سرخ ہوگیا لیکن اگلے ہی لمحے پہلے اس کی رنگت پیلی ہوئی اور پھر وہ گہرا جامنی ہوگیا۔ یوں محسوس ہورہا تھا کہ سورج تیزی سے حرکت کررہا ہے، گھوم رہا ہے۔ حیران آنکھوں کو محسوس ہورہا تھا کہ اپنی گردش کی وجہ سے سورج، آسمان سے علیحدہ ہوکر زمین کی جانب بڑھ رہا ہے جبکہ اس کی تمازت بھی زیادہ تھی۔''

لزبن کے روزنامہ ''اوڈیا'' کی 17 اکتوبر 1917ء کی اشاعت کے لیے خصوصی رپورٹر نے تحریر کیا کہ ''نقرئی سورج جامنی رنگ کے باریک ریشمی کپڑے میں لپٹا ہوا تھا۔ یہ جامنی رنگت والا کپڑا حرکت میں تھا اور چھدرے بادلوں میں باقاعدہ گھوم رہا تھا۔ اس کی روشنی نہایت دلکش نیلی رنگت کی تھی جیسے کسی کیتھڈرل کے اسٹینڈ گلاسز کی کھڑکیوں سے اندر آرہی ہو..... اور ان لوگوں کو نہلا رہی ہو جو ہاتھ پھیلائے گھٹنوں کے بل بیٹھے عبادت میں مصروف ہوں۔ جب یہ معجزہ ہورہا تھا تو لوگ رو رہے تھے۔ ننگے سر عبادت کررہے تھے، دعائیں مانگ رہے تھے اور شکر ادا کررہے تھے کہ انہوں نے یہ معجزہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے جس کے وہ منتظر تھے۔ ان میں اتنا جوش و خروش تھا کہ سیکنڈز بھی گھنٹوں میں گزرتے محسوس ہورہے تھے۔

یہ بھی ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ فاطمہ سٹی میں کھڑے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ستر ہزار لوگوں کی اکثریت ایک جانب تو اس معجزے کا بہ چشم خود مشاہدہ کر رہی تھی لیکن دوسری جانب سائنس دان اس مخصوص وقت میں سورج کی کسی غیر معمولی حرکت کی شہادت دینے کو تیار نہ تھے۔ کسی لیبارٹری نے سورج کے اس طرح رنگ بدلنے اور جھومنے کو ریکارڈ نہ کیا، نہ دیکھا۔ ال بورٹیا نامی گاؤں میں سورج کے رقص کا مشاہدہ کرنے والے شاعر افانسو لوپز ویئرا اور اسکول ٹیچر ڈیلفینا لوپس نے اپنی طالبات کے ہمراہ فاطمہ سٹی میں موجود لوگوں کے موقف کی تصدیق کی کیونکہ یہ معجزہ خود انہوں نے بھی دیکھا تھا لیکن جب سائنس دانوں اور ماہرین فلکیات سے پوچھا گیا کہ دوسرے علاقوں کے باشندوں یا کسی لیبارٹری نے سورج کا جھومنا کیوں نہیں دیکھا یا اسے ریکارڈ کیوں نہیں کیا تو ان کا جواب تھا کہ ایسے مظاہر قدرت محض چالیس میل (اور بعض کے مطابق چالیس کلومیٹر) کے دائرے میں نظر آتے ہیں۔

اسکول ٹیچر ڈیلفینا اوساس کی تمام طالبات نے بھی سورج کے باقاعدہ جھومنے کی تصدیق نہیں کی کیونکہ ان میں سے بعض نے سورج کو صرف رنگ بدلتے دیکھا جبکہ کچھ ایسے بھی تھے جنہیں سوائے سورج کے کچھ دکھائی ہی نہیں دیا۔

لوگ عام طور پر معجزوں اور پیش گوئیوں یا کرامتوں سے انکار نہیں کرتے کیونکہ یہ براہِ راست ان کے مذہبی اعتقادات سے وابستہ ہوتے ہیں۔ کچھ ایسی ہی صورتِ حال فاطمہ سٹی میں سورج کے جھومنے کے معجزے میں بھی درپیش ہے کیونکہ یہ کیتھولک عقیدے کی بقا کا سوال ہے۔ اس معاملے کی نزاکت کی بنیادی وجہ تو ''مقدس مریم'' کا دیدار ہے لیکن چونکہ کئی پوپ اس ''متبرک ومقدس'' واقعے کی گواہی دے چکے ہیں اس لیے کم از کم کیتھولکس اس کی سچائی سے ایک قدم پیچھے ہٹنے کو بھی تیار نہیں۔

1917ء سے آج تک کسی سائنسی ذریعے نے سورج کی اس غیر معمولی حرکت یا تبدیلی کی تصدیق نہیں کی۔ گو درجنوں عینی شاہدین نے اپنے اپنے تجربات بیان کیے لیکن سائنس کی ایک شہادت کی بھی تائید کرتی نظر نہیں آتی۔

سائنس دانوں کی اکثریت قرار دیتی ہے کہ یہ ایک اجتماعی فریب نظر تھا۔ ان کا قیاس ہے کہ ہجوم چونکہ ایک مخصوص مذہبی جوش وجذبے میں مبتلا تھا اور کسی متوقع معجزے کا منتظر تھا اس لیے انہوں نے جو بھی دیکھا، اپنے مذہبی جذبے کے زیرِ اثر دیکھا اور اپنے طور پر رائے قائم کر لی کہ سورج جھوم رہا ہے۔

ایک اور قیاس یہ ہے کہ اگر تادیر سورج کو دیکھا جائے تو انسانی آنکھ دھوکا کھا جاتی ہے کہ سورج اپنی شکل تبدیل کر رہا ہے۔ اس کی رنگت بدل رہی ہے یا وہ حرکت میں ہے۔ اس معاملے میں بھی ایسا ہی ہوا ہوگا۔ ہجوم چونکہ پلکیں جھپکائے بغیر سورج کو گھور رہا تھا اس لیے امکان ہے کہ انہوں نے اپنے طور پر یہ طے کر لیا ہو کہ سورج اپنی رنگت یا شکل تبدیل کر رہا ہے۔

اسٹی ٹیوٹ آف فزکس، کیتھولک یونی ورسٹی آف لیون کے پروفیسر آگسٹ می سین کا کہنا ہے کہ سورج کی جانب مسلسل دیکھنا ضیا نمائی کا باعث بنتا ہے یعنی آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ سورج کی رنگت تبدیل ہوتی محسوس ہوتی ہے اور بعض اوقات یہ عمل عارضی اندھے پن کا سبب بھی بن جاتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ہجوم کو جو کچھ نظر آیا وہ تادیر سورج کو دیکھتے رہنے کے باعث تھا۔

پروفیسر می سین قرار دیتے ہیں کہ سورج کے رنگ بدلے نظر آنے کی ایک وجہ آنکھوں کے قرنیے کے خلیوں کے سمٹنے سکڑنے یا پھیلنے کا عمل بھی ہو سکتا ہے۔ می سین کا مشاہدہ ہے کہ سورج کے رنگت تبدیل کرنے کے اکثر واقعات ایسی ہی جگہوں پر ہوئے ہیں جہاں زائرین جمع ہوں یا کوئی مذہبی تقریب ہو رہی ہو اور اس اجتماع کے شرکا کو ترغیب دی جائے کہ وہ مسلسل سورج کا مشاہدہ کرتے رہیں۔

سائنسی طور پر اس واقعے کی واضح تردید کے باوجود یہ امر بہ طور خاص پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ فاطمہ سٹی میں کسی معجزے کے منتظر ہجوم میں سے کسی ایک شخص نے بھی تب تک سورج کی طرف نہیں دیکھا جب تک کہ لوسیا نے انہیں ایسا کرنے کو نہیں کہا یا جب تک کہ وہ بولی نہیں۔ ورنہ اس سے پہلے ستر ہزار کا مجمع صرف اسی شاہ بلوط کے درخت کو دیکھ رہا تھا جہاں بچوں کے بیان کے مطابق مقدس خاتون کو نمودار ہونا تھا۔ اس لیے یہ کہنا جملۂ معترضہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا کہ فاطمہ سٹی میں جمع ہونے والا ہجوم شروع سے ہی سورج پر نظریں ٹکائے ہوئے تھا اور وہ سورج کے کسی معجزے کا منتظر تھا۔ ان کے تو وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ لوسیا اچانک ہی انہیں سورج کی جانب دیکھنے کی ہدایت دے گی۔ عینی شاہدین کا کہنا ہے کہ انہوں نے سورج کے رقص کے دوران فضا گرد آلود دیکھی تھی جبکہ شاہ بلوط کے اس پودے، جہاں مقدس خاتون نمودار ہوئی تھی، کے چاروں جانب پھولوں کی پتیاں نچھاور ہوتے بھی دیکھی تھیں۔

سورج کے اس رقص کے علاوہ 13 اکتوبر 1917ء

فاطمہ سٹی میں جو سب سے اہم پیش گوئی سامنے آئی وہ دوسری جنگِ عظیم کے بارے میں تھی۔ اس واقعے کے اکیس سال بعد 25 جنوری 1938ء کو شمالی ہمیس فیئر رات کے وقت ایسی تیز روشنی نمودار ہوئی جیسے صبح ہو گئی ہو لیکن یہ روشنی جھماکوں کی طرح تھی اور اس کی چمک جنوب سے شمال میں افریقا، برمودا اور کیلی فورنیا تک دیکھی گئی۔

ماہرین کے مطابق رات کے وقت دکھائی دینے والی یہ تیز ترین چمک تھی جب پیرس کے رہنے والوں نے یہ سمجھا کہ ان کے شہر میں چاروں جانب آگ لگ گئی ہے۔ انہوں نے صرف اسی پر بس نہیں کیا بلکہ وہ اتنے خوف زدہ تھے کہ پیرس شہر کے تمام فائر ٹینڈروں کو طلب کر لیا گیا لیکن وہ آگ نہیں محض چمک تھی۔

ان بی بی کا دیدار کرنے والوں میں سے اس وقت صرف لوسیا ہی زندہ تھی۔ اس نے ہمیس فیئر کی چمک کو پیش گوئی مکمل ہونے کا اشارہ قرار دیا۔ اس نے اس امر سے نہ صرف اپنے اعلیٰ افسران کو آگاہ کیا بلکہ اگلے روز بشپ کو خطوط بھی تحریر کیے۔ اس کے محض ایک ماہ بعد ہٹلر نے آسٹریا پر قبضہ کر لیا اور آٹھ ماہ بعد وہ چیکوسلواکیہ میں داخل ہو رہا تھا۔

ان بی بی کی پیش گوئی کے مطابق دوسری جنگِ عظیم کا آغاز ہو گیا تھا۔

لوسیا سنٹوس نے مقدس ان بی بی کے دیدار اور اس سے ہونے والی گفتگو کے حوالے سے کئی یادداشتیں تحریر کیں جن میں ان تین رازوں کا تذکرہ بھی تھا جن کے بارے میں بچوں کو آگاہ کیا گیا تھا۔

لوسیا کے مطابق پہلا راز ''جہنم کا منظر'' تھا..... اس بارے میں لوسیا لکھتی ہے۔

''ہماری خاتون نے ہمیں آگ کا ایک بہت بڑا سمندر دکھایا جو زمین کے نیچے یعنی پاتال میں محسوس ہوتا تھا۔ اس آگ میں شیطان اور بدروحیں، انسانی اشکال اور اجسام میں موجود تھیں۔ وہ دہکتے ہوئے انگاروں کی مانند تھیں۔ آگ کی تپش کے باعث ان کی رنگت تانبے جیسی ہو چکی تھی جبکہ ان میں سے کئی ایک سیاہ پڑ چکی تھیں۔ انہیں ہر تھوڑی دیر بعد اس آگ سے اُٹھایا جاتا۔ وہ چند ثانیوں کے لیے آگ سے اُٹھنے والے دھوئیں میں معلق رہتے لیکن پھر انہیں دوبارہ آگ میں پھینک دیا جاتا۔ وہ جب اُٹھا کر ایک مرتبہ پھر آگ میں پھینکے جاتے تو آگ مزید بھڑک اُٹھتی اور اس کی لپٹیں انہیں گھیر لیتیں۔ وہ چیختے چلاتے اور درد سے بلبلاتے لیکن کوئی اُن دیکھی قوت انہیں بار بار آگ میں غوطے دیتی، اُٹھاتی اور دوبارہ شعلوں میں پھینک دیتی۔ یہ عمل مسلسل جاری تھا۔ ہم اس منظر سے خوف زدہ ہو گئے اور ہم نے باقاعدہ کپکپانا اور لرزنا شروع کر دیا۔

ان میں سے بعض شیطانوں کی شکلیں نہایت خوفناک اور دل دہلا دینے والی تھیں۔ ان کی چیخیں بھی بے حد دردناک تھیں۔ کچھ شیطانوں کو بھیانک لیکن ہمارے لیے اجنبی جانوروں کی شکلوں میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ یہ سب سیاہ تھے لیکن حیرت انگیز طور پر اتنے شفاف تھے کہ ان کے آر پار دیکھا جا سکتا تھا۔ یہ چند لمحوں کا منظر تھا لیکن اس تھوڑی سی دیر میں بھی ہمارے چہروں کی رنگت زرد ہو گئی تھی۔ جسم کے تمام مسام پسینا اُگل رہے تھے اور ہم پر باقاعدہ کپکپاہٹ طاری تھی۔''

لیکن بہ قول لوسیا کے، ہماری مقدس خاتون نے اپنے پہلے ہی دیدار میں ہمیں بتا دیا تھا کہ ''میں جنت سے آئی ہوں اور تم لوگوں کو بھی اپنے ساتھ جنت میں ہی لے جاؤں گی۔ اگر انہوں نے ہم سے یہ وعدہ نہ کیا ہوتا تو شاید ہم جہنم کے اس منظر کو دیکھنے کے بعد ایک پل کے لیے بھی زندہ نہ رہتے۔

لوسیا نے ان کے دوسرے راز کا ذکر بھی اپنی تیسری یادداشت میں ہی کیا ہے۔ اس راز میں ان بی بی کی جانب سے وہ ہدایات بھی شامل ہیں جن پر عمل کر کے انسان خود کو جہنم سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔

بی بی نے کہا تھا.....

''تم لوگ جہنم دیکھ چکے ہو جہاں گناہ گاروں کی روحوں کو لے جایا جاتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو اس جہنم سے بچانے کے لیے کچھ ہدایات دے رکھی ہیں اور قوانین وضع کر رکھے ہیں۔ اللہ چاہتا ہے کہ میرے پاک باز دل کے ذریعے لوگوں کو جہنم کی آگ سے محفوظ رکھے۔ اگر میں تم سے یہ کہہ رہی ہوں کہ ایسا ہو سکتا ہے تو یقین رکھو کہ بہت سی روحیں محفوظ ہو جائیں گی اور دنیا میں امن وآشتی کا دور دورہ ہوگا۔ موجودہ جنگ ختم ہونے والی ہے لیکن اگر لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ترک نہ کی تو پاپائے اعظم پیوس یازدہم اس وقت کا پاپائے روم کے دور میں ایک اور عذاب نازل ہوگا جب تم رات کے وقت ایک تیز اور چندھیا دینے والی چمک دیکھو، جس کے بارے میں کوئی نہیں بتا پائے گا کہ یہ چمک کیسی اور کس چیز کی ہے تو یہ اس بات کی سب سے بڑی نشانی ہوگی کہ اللہ تعالیٰ دنیا کو اس کے جرائم اور گناہوں کی سزا دینے والا ہے۔ یہ سزا جنگ، قحط اور چرچ یا ہولی فادر کی جانب سے کسی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بھی عذاب یا ایذا رسائی کی صورت میں ہوسکتی ہے۔(یادرہے کہ چرچ یا ہولی فادر قدرت اور خدا کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے)

اگر تم لوگ اس عذاب یا جنگ سے محفوظ رہنا چاہتے ہو تو رشیا سے کہا جائے کہ وہ میرے معصوم اور پاک دل کا احترام کرے اور ہر مہینے کے ابتدائی سنیچر کو اجتماعات کیے جائیں۔اگر میری درخواست پر توجہ دی گئی تو رشیا قائم رہے گا۔اس کی تشکیل نو ہوجائے گی اور ہر طرف امن کا دور دورہ ہوگا لیکن اگر ایسا نہ ہوا تو وہ اپنی بددعاؤں اور بدشگونیوں کو پوری دنیا پر پھیلادے گی جس کا نتیجہ جنگوں اور چرچ کے عذاب کے سوا کچھ نہ ہوگا۔

اچھے، نیک اور پارسا لوگ شہید کردیے جائیں گے، ہولی فادر کو بھی زیادہ نقصان پہنچنے کا احتمال ہے جبکہ کئی اقوام کو صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کردیا جائے گا ---- بلآخر میرے معصوم اور پاک دل کو فتح نصیب ہوگی۔ہولی فادر، رشیا سے میری تقدیس کے لیے کہیں گے اور وہ اس پر عمل بھی کرے گا جس کے صلے میں کچھ عرصے کے لیے دنیا کو امن کا تحفہ ملے گا۔

1925ء میں لوسیا کو ان بی بی کا ایک اور دیدار ہوا۔وہ ان دنوں اسپین میں پونٹی ویڈرا، گلیشیا کے ڈوروتھین چرچ میں متعین تھی۔اس مرتبہ لوسیا نے بتایا کہ ان بی بی نے اسے فرسٹ سیٹرڈے ڈی ووشنز کا پیغام دینے کی ہدایت کی ہے۔

1928ء میں لوسیا کا تبادلہ گلیشیا کے ایک اور چرچ (کانونٹ) میں کردیا گیا جو ٹوئی یا ٹوئے نامی شہر میں واقع تھا۔1929ء میں لوسیا نے بتایا کہ مریم ایک بار پھر اس کے سامنے نمودار ہوئی اور رشیا کی جانب سے اپنی تقدیس کی درخواست دُہرائی ہے۔لوسیا نے اس بارے میں بھی اپنے اعلیٰ افسران کو آگاہ کیا۔

شواہد بتاتے ہیں کہ لوسیا جب تک زندہ رہی، وقتاً فوقتاً اسے مقدس مریم (آور لیڈی آف فاطمہ) کا دیدار ہوتا رہا۔ 1931ء میں ریانشو، گلیشیا میں بھی اسے دیدار ہوا لیکن اس بار لوسیا نے دعویٰ کیا کہ اس نے عیسیٰؑ کو دیکھا ہے جنہوں نے اسے دو دعائیں سکھائیں اور ایک پیغام دیا جسے چرچ کے مذہبی پیشواؤں کے حوالے کیا جانا تھا۔

وہ آخر وقت تک پرتگال میں ہی مقیم رہی حتیٰ کہ 13 جنوری 2005ء کو 97 سال کی عمر میں اس کا انتقال ہوگیا۔اس کے مرنے کے بعد ویٹی کن اور خصوصی طور پر کارڈینل جوزف ریٹزنگر (جو اس وقت بھی دی کانگریگیشن فار دی ڈاکٹرائن آف فیتھ کا سربراہ تھا) کے احکامات پر لوسیا کا سیل (کمرا) سربمہر کردیا گیا۔اغلب امکان ہے کہ اس کی وجوہات یہ تھیں کہ سسٹر لوسیا کو مستقل پیش گوئیاں موصول ہوتی رہتی تھیں اور اب وہ ان کی تصدیق و تردید کے لیے دستیاب نہیں تھی۔(یا اس نے کوئی تحریر چھوڑی نہ ہو جس سے کوئی ابہام پیدا ہوجائے)

لوسیا کے دونوں کزن جو کنواری مریم کے ابتدائی دیدار میں اس کے ہمراہ تھے، کم سنی میں ہی 1918ء سے 1920ء کے دوران گریٹ اسپینش فلو ایپی ڈیمک کی نذر ہوگئے تھے۔فرانسسکو 1908ء میں پیدا ہوا اور 1919ء میں انتقال کر گیا جبکہ 1910ء میں پیدا ہونے والی جے سنٹا مارٹو 1920ء میں اس دنیا سے رخصت ہوگئی۔13 مئی 1989ء کو فاطمہ سٹی میں ہونے والی ایک عوامی تقریب میں پوپ جان پال دوم نے فرانسسکو اور جے سنٹا کو سرکاری طور پر واجب التعظیم قرار دیا۔13 مئی 2000ء کو پوپ جان پال نے ایک بار پھر فاطمہ سٹی کا دورہ کیا اور دونوں کو ''بلیسڈ'' کا لقب عطا کیا جو سینٹ سے ایک درجہ کم خطاب ہے جو عیسائی مذہب میں نہایت اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔جے سنٹا، عیسائی مذہب کی وہ کم عمر ترین بچی ہے جسے روحانی خوشی سے نہال کرنے والا خطاب دیا گیا۔

پہلے 1936ء اور پھر 1941ء میں لوسیا نے دعویٰ کیا کہ ان بی بی نے 13 جون 1917ء کو اپنے دوسرے دیدار میں ہی ان بچوں کی موت کی پیش گوئی کردی تھی۔لوسیا کے دعووں کے علاوہ دونوں بچوں کی ماں اولمپیا مارٹو اور کئی دیگر افراد نے اس امر کی تصدیق کی کہ دونوں بچوں نے ان سے کوئی بات خفیہ نہیں رکھی تھی۔انہوں نے اپنی ماں کے ساتھ ساتھ کئی زائرین کو اپنی موت کے بارے میں قبل از وقت آگاہ کردیا تھا۔جے سنٹا کی ماں کا کہنا تھا کہ بی بی سے ملاقات کے بعد جے سنٹا نے اسے جو پہلی بات بتائی تھی وہ اس کی اپنی موت کے بارے میں ہی تھی۔

لوسیا کے 1941ء کے بیان کے مطابق اس نے بی بی سے دریافت کیا تھا کہ کیا وہ تینوں مرنے کے بعد جنت میں جائیں گے۔بی بی نے جواب دیا ''ہاں۔''فرانسسکو اور جے سنٹا کو تو میں جلد لے جاؤں گی لیکن تمہارے آنے میں ابھی کچھ دیر ہے کیونکہ تم فی الحال زمین پر رہو اور زندہ رہ کر امن کے پیغام کی ترویج کرو۔تم دنیا میں رہ کر میرے معصوم اور

...ک دل کے لیے لوگوں میں احترام اور محبت پیدا ...رو۔''

1935ء اور پھر 1951ء میں دونوں بچوں کی قبریں ...دی گئیں لیکن دونوں مرتبہ یہ دیکھنے میں آیا کہ جے سنٹا کا ...تک خراب نہیں ہوا تھا تاہم فرانسسکو کے جسمانی اعضا ...علیحدہ ہوچکے تھے۔

سسٹر لوسیا کے مطابق بی بی نے وعدہ کیا تھا کہ رشیا کی ...یل کی ساتھ ہی وہ یعنی رشیا مذہب کی طرف راغب ...ہوجائے گا اور امن کے ایک نئے عہد کا آغاز ہوگا۔یہ ان تین ...روں میں شاید سب سے اہم راز تھا جو ان بی بی نے ان ...وں کو بتایا تھا کیونکہ اس وقت تک روس (سوویت یونین) ...تشکیل عمل میں نہیں آئی تھی۔

سسٹر لوسیا کی پیش گوئیوں کی روشنی میں 7 جولائی 1952ء کو پوپ پوئیس دوازدہم نے ساکرو ورجینٹ کے نام ...ایک حواریانہ خط تحریر کیا جس میں رشیا کے وجود کو کنواری ...کے معجزے سے تعبیر کیا گیا۔

پوپ پوئیس دوازدہم نے لکھا کہ ''محض چند سال پہلے ہم ...پوری انسانیت کو خداوند کی ماں، کنواری مریم کے معصوم ...سے تشکیل دینے کے کام کا آغاز کیا ہے چنانچہ آج ہم ...وصی طور پر رشیا کے عوام کو اس معصوم اور پاکیزہ دل سے ...کرنے کے عزم کا اظہار کرتے ہیں اور یقین دلاتے ہیں ...ہماری تمام نیک خواہشات اور دعائیں ان کے ساتھ ...یں......''

1952ء میں ہی پوپ نے ایک مرتبہ پھر رشیا کے عوام اور اسٹالن حکومت کو یاددہانی کرائی کہ کنواری مریم ہمیشہ فاتح ...ی ہے۔پوپ نے لکھا کہ ''جہنم کے دروازے کبھی کھلے نہیں ...ے کیونکہ مقدس مریم انسانوں کو ان سے تحفظ کا یقین دلاتی ...۔وہ ایک اچھی ماں ہے، سب کی ماں ہے اور ایسا کبھی ...یں سنا گیا کہ کسی نے اس سے مدد اور تحفظ مانگا ہو اور اسے ...ا ہو۔اس یقین کے ساتھ پوپ، تمام رشیا کے عوام کو ...واری مریم کے معصوم اور پاکیزہ دل سے منسوب کرنے ...اعلان کرتے ہیں۔وہ اپنی الہامی قوتوں سے ہر قسم کے کفر ...غالب آئے گی اور انسانی غلطیوں کا ازالہ کرے گی۔''

کیتھولکس کے ہاں فاطمہ سٹی کے معجزے اور ان بی بی ...ی پذیرائی کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جاسکتا ہے ...پوپ پوئیس دوازدہم اور پوپ جان پال دوم دونوں ہی ...ور لیڈی آف فاطمہ سے خصوصی عقیدت رکھتے تھے۔پوپ بینی ڈکٹ شانزدہم نے پاریلی کے چرچ سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا اور اسے 13 مئی 1917ء کو سسٹین چرچ میں آرچ بشپ کے عہدے پر ترقی دی گئی۔یہ وہی دن تھا جب پاکیزہ بی بی پہلی بار تین بچوں کے سامنے فاطمہ سٹی میں نمودار ہوئی۔پوپ پوئیس دوازدہم کے انتقال کے بعد ان کو 13 اکتوبر 1958ء کے دن سینٹ پیٹرز کے تہ خانے میں دفن کیا گیا۔یہ بھی آور لیڈی آف فاطمہ کے جشن کا دن تھا۔

پوپ جان پال دوم، آور لیڈی آف فاطمہ کے بہت بڑے عقیدت مند تھے۔ان کا کہنا تھا کہ ان کی دوبارہ زندگی درحقیقت آور لیڈی آف فاطمہ کا عطیہ ہے۔پوپ جان پال دوم پر 13 مئی 1981ء کو قاتلانہ حملہ ہوا جس میں وہ بال بال بچے۔

1984ء میں پوپ جان پال نے روس کا حوالہ دیے بغیر پوری دنیا کو کنواری مریم سے ناتا جوڑنے کا پیغام دیا۔ بعض ذرائع کا خیال ہے کہ سسٹر لوسیا نے اس پیغام کو بھی پاک بی بی کی درخواست کو پذیرائی بخشنے کی کوشش قرار دیا تھا لیکن اسپین کی بلیو آرمی کے میگزین ''سول ڈی فاطمہ'' نے اپنے ستمبر 1985ء کے شمارے میں لکھا کہ سسٹر لوسیا کا کہنا ہے کہ اس پیغام سے کنواری مریم کی کسی خواہش کی تکمیل نہیں ہوتی کیونکہ اس میں رشیا کا تذکرہ نہیں۔سسٹر لوسیا کے مطابق اسی وجہ سے متعدد بشپ حضرات نے اس پیغام کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔

2001ء میں آرچ بشپ ٹارکیسیو برٹن نے ایک بیان جاری کیا کہ اس کی سسٹر لوسیا سے ملاقات ہوئی ہے۔برٹن کے اس دعوے کے مطابق لوسیا نے اسے بتایا کہ میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ 1984ء میں کنواری مریم کی خواہشوں کی تکمیل ہوچکی ہے اور انہوں نے جنت میں اس کی تصدیق بھی کردی ہے لیکن سسٹر لوسیا اس بیان کی وضاحت، تائید یا تردید کے کسی عام اعلان کے بغیر ہی 13 فروری 2005ء کو خود اس دنیا سے سدھار گئی۔

کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ لوسیا اور فاطمہ سٹی کے ایڈووکیٹس، معتقد اور رفقائے خاص جن میں ایبے جارج ڈی نینٹس، پال کارمر اور نکولس گرنر شامل ہیں، اس امر پر متفق ہیں کہ کسی پوپ یا دنیا بھر کے تمام بشپس کی جانب سے رشیا کو کنواری مریم کی خواہش کے مطابق اس کے پاکیزہ اور معصوم دل کے ساتھ منسلک کرنے کی کوئی کوشش کبھی کامیاب نہیں ہوئی۔یہ بیان ستمبر 1985ء کے سسٹر لوسیا کے اس انٹرویو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے عین مطابق ہے جس میں اس نے کہا تھا کہ ان بی بی کی کوئی خواہش پوری نہیں کی گئی۔

ان متضاد بیانات کے باوجود 29 اگست 1989ء اور 3 جولائی 1990ء کے خطوط میں سسٹر لوسیا نے تصدیق کی کہ ان بی بی کی خواہشات کی تکمیل ہوگئی ہے۔ 1990ء کا خط فادر رابرٹ جے فاکس کے ایک سوال کے جواب میں لکھا گیا جس میں اس نے کہا......

''میں آپ کے سوال کے جواب کی طرف آتی ہوں۔ ''25 مارچ 1984ء کو پوپ جان پال دوم نے اپنی اور دنیا بھر کے بشپس کی جانب سے جو پیغام دیا وہ ہماری معزز خاتون کی اس خواہش کے عین مطابق تھا جو انہوں نے ٹوئے میں 13 جون 1929ء کو کی تھی۔'' لوسیا نے اس امر پر زور دیا کہ جو میں نے کنواری مریم کی زبانی سنا تھا، وہ ہوگیا ہے۔ فادر رابرٹ جے فاکس نے بھی تصدیق کی کہ لوسیا نے یہی لکھا تھا کیونکہ یہ بات میں نے کسی اور کی زبان سے نہیں سنی بلکہ یہ میں ہی ہوں جس نے اس کے تمام خطوط کھولے اور ان کے جوابات بھی دیے تھے۔

فاطمہ سٹی میں ان بی بی نے مجموعی طور پر جو تین پیش گوئیاں کیں ان میں سے تیسری پیش گوئی درحقیقت ایک راز تھا جو پوپ اور عیسائیوں کے دیگر مذہبی پیشواؤں کی موت کے بارے میں تھا۔ اس راز کو بشپ آف لیریا نے بیان کیا ہے۔

بشپ لکھتا ہے کہ پہلے دو حصوں کی تشریح کی جا چکی ہے جبکہ تیسرے کا معاملہ یہ ہے کہ ''ہماری خاتون'' کی بائیں جانب ذرا سا اوپر ہم نے ایک فرشتہ دیکھا جس نے بائیں ہاتھ میں ایک چمکتی تلوار تھام رکھی تھی۔ یہ آگ اگل رہی تھی اور اس کے شعلوں سے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے پوری دنیا کو آگ لگ گئی ہو لیکن جونہی ہماری خاتون نے ایک طمطراق کے ساتھ اپنے دائیں ہاتھ سے فرشتے کی طرف اشارہ کیا تو وہ بھی دائیں ہاتھ سے زمین کی جانب اشارہ کرنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے حلق سے کراہیں خارج ہونے لگیں۔ رحم، رحم...... اور پھر ہم نے خدا کی روشنی دیکھی۔ اس کے جلوے کا مشاہدہ کیا۔ وہ کچھ ایسے ہی تھا جیسے لوگ آئینے کے سامنے سے گزرتے ہوں۔ اپنا عکس دیکھتے ہوں۔ وہ ایک بشپ تھا۔ سفید لباس میں۔ ہم نے یہی خیال کیا کہ وہی ہمارا مقدس باپ ہے۔ دیگر تمام بشپ، پادری، فادر اور مذہبی خواتین وحضرات ایک بلند پہاڑ پر جارہے تھے جس کی ڈھلوانیں بے حد مسطح تھیں۔ اس پہاڑ کی چوٹی پر بہت بڑی صلیب نصب کی گئی تھی جسے درختوں کے غیر تراشیدہ تنوں کی مدد سے بنایا گیا تھا۔

لیکن وہاں پہنچنے سے پہلے مقدس باپ کا گزر ایک بڑے شہر سے ہوا جو نصف کھنڈر میں تبدیل ہو چکا تھا جبکہ باقی نصف رنج والم سے دوچار جیسے لرز رہا تھا۔ مقدس باپ نے راستے میں ملنے والی تمام ارواح کی بخشش کے لیے دعا کی اور بالآخر پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ گیا۔ وہ بڑی سی صلیب کے نیچے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ سپاہیوں کے ایک گروہ نے اس پر تیر برسائے اور گولیاں چلائیں اور اسی طرح انہوں نے باقی تمام بشپس، مذہبی رہنماؤں، پیش واؤں، پادریوں اور عورتوں، مردوں کو مار ڈالا۔ صلیب کے دونوں تختوں کے نیچے دو فرشتے اپنے ہاتھوں میں بلوریں پیالے لیے کھڑے تھے۔ انہوں نے پیالوں میں شہیدوں کا خون بھرا اور ان مرنے والوں کی طرف اچھال دیا جو اب جنت کے سفر پر گامزن تھے۔

سسٹر لوسیا نے اعلان کیا تھا کہ تیسرے راز کو 1960ء کے بعد مشتہر کردیا جائے گا لیکن ویٹی کن نے 26 جون 2000ء تک اس کی اشاعت روکے رکھی۔ کینن بارتھس اور کارڈینل اوٹاویانی سمیت بعض ذرائع کا کہنا ہے کہ سسٹر لوسیا نے اس راز کو لازمی طور پر 1960ء میں شائع کرنے پر زور دیا تھا کیونکہ اس کا کہنا تھا کہ یہ اس وقت بہتر انداز میں سمجھا جاسکے گا اور یہ بھی کہ ان بی بی کنواری مریم کی خواہش بھی یہی تھی۔

لیکن جب 1960ء آیا تو ویٹی کن نے تیسرا راز اشاعت کرنے کے بجائے سرکاری پریس ریلیز جاری کیا جس میں کہا گیا تھا کہ امکان ہے کہ اس راز کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے راز ہی رکھا جائے گا۔ راز سربمہر کردیا گیا ہے اور یہ ایسے ہی رہے گا۔

اس سرکاری اعلان کے بعد مختلف خدشات، شبہات اور آرا کا اظہار کیا جانے لگا۔ نیویارک ٹائمز نے لکھا کہ اس راز کو سربمہر رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ اس سے دنیا بھر میں ایٹمی کشیدگی میں اضافہ ہوسکتا ہے جبکہ اس سے رومن کیتھولک چرچ میں بعض اختلافات کا اندیشہ بھی ہے جس سے پاپائی نظام میں دراڑیں پڑسکتی ہیں۔ (یہ سطر خصوصی طور پر توجہ طلب ہے)

بعض ذرائع دعویٰ کرتے ہیں کہ 2000ء میں ویٹی کن نے ہاتھ سے تحریر کردہ چار صفحات پر مشتمل جو راز مشتہر کیا ہے وہ اصل راز نہیں یا کم از کم اس کا مکمل مسودہ نہیں۔ اس

تیسرے راز کے بارے میں شکوک وشبہات کی بنیادی وجہ کارڈینلز برٹن، ریٹزنگر اور سوڈانو کا یہ دعویٰ ہے کہ مقدس مریم کا بتایا ہوا راز محض ایک صفحے کا تھا اور اس میں جزیرہ پٹ موس میں یوحنا کو ہونے والے الہام اور ایک بہت بڑے الحاد یا ارتداد کی نشاندہی کی گئی تھی۔

کچھ ذرائع یہ بھی کہتے ہیں کہ تیسرا راز درحقیقت دو حصوں پر مشتمل تھا۔ ان میں سے چار صفحات پر مشتمل محض ایک حصہ شائع کیا گیا ہے جبکہ دوسرا حصہ جو ایک صفحے پر تھا اور جس میں کنواری مریم کے اصل الفاظ درج تھے، چھپالیا گیا ہے۔

ان تمام تر الزامات کے باوجود ویٹی کن اپنے موقف پر قائم ہے کہ جون 2000ء میں تیسرے راز کا مکمل متن جاری کردیا گیا تھا۔ دسمبر 2001ء کے ویٹی کن پریس ریلیز، جو لااوز ویٹر رومانو میں بھی شائع ہوا، کے مطابق سسٹر لوسیا نے ایک انٹرویو میں آرچ بشپ ٹارکی سیو برٹن کو بتایا کہ راز مکمل طور پر مشتہر اور جاری کردیا گیا ہے...... اور اب کوئی راز باقی نہیں رہا۔

برٹن نے کارڈینل ریٹزنگر کے اشتراک سے ''دی میسج آف فاطمہ'' نامی ایک دستاویز مرتب کی۔ جون 2000ء میں ویٹی کن کی جانب سے شائع ہونے والی اس دستاویز میں اس تیسرے راز کی اسکین شدہ کاپی بھی شامل ہے۔

11 سے 14 مئی 2010ء کے دوران جے سنٹا اور فرانسسکو مارٹو کو خطاب دیے جانے کی دسویں سالگرہ کے موقعے پر پوپ بینی ڈکٹ شانز دہم نے رپورٹرز کے ساتھ فاطمہ سٹی میں گفتگو کے دوران مختصراً بتایا کہ تیسرے راز کی اشاعت کو 1981ء میں سینٹ پیٹرز اسکوائر میں پوپ جان پال پر ناکام قاتلانہ حملے کی وجہ سے موخر نہیں کیا گیا تھا۔ فاطمہ کا تیسرا راز کہتا ہے کہ بینی ڈکٹ شانز دہم مستقل شہرت کے حامل ہوں گے اور یہ بھی کہ بینی ڈکٹ شانز دہم کی اہمیت میں اضافہ بعض مذہبی اداروں کی جانب سے جنسی زیادتیوں کے معاملات میں چرچ کے کردار کے حوالے سے بھی ہوگا۔

فاطمہ سٹی کے معجزے سے متعدد عبادات بھی منسلک ہیں جو اب رومن کیتھولک عقیدے کا حصہ بن چکی ہیں۔ لوسیا نے بعد میں بتایا کہ مریم کے دیدار سے ایک سال پہلے یعنی 1916ء میں اس نے اپنے کزنز کے ہمراہ کئی مواقع پر ایک فرشتہ بھی دیکھا تھا جو خود کو ''اینجل آف پرتگال'' اور ''اینجل آف پیس'' کے نام سے مخاطب کررہا تھا۔ اس فرشتے نے انہیں زمین کی جانب سر جھکانا اور یہ کہنا سکھایا کہ ''او گاڈ میں تم پر ایمان لاتا ہوں، یقین رکھتا ہوں، تمہاری تعریف کرتا ہوں، تم سے امید رکھتا ہوں اور تم سے ہی پیار کرتا ہوں۔ میں تم سے ان کے لیے معافی چاہتا ہوں جو تم پر یقین نہیں رکھتے، تمہاری تعریف نہیں کرتے، تم سے امید نہیں رکھتے اور تم سے پیار نہیں کرتے۔''

لوسیا نے بعد میں عبادت کے ان جملوں کو باقاعدہ موسیقی کے ساتھ گنگنانا شروع کردیا۔ اس کے ان گانوں کی ریکارڈنگز بھی موجود ہیں۔ یہ بھی بتایا گیا کہ مقدس ان بی بی کے دیدار کے بعد وہ فرشتہ کسی وقت دوبارہ واپس آیا اور انہیں ایک عبادت سکھائی جسے ''اینجل پرئیر'' کا نام دیا گیا ہے۔

لوسیا کا کہنا ہے کہ (چرچ لیٹر کے مطابق) ہماری خاتون نے توبہ اور کفارے پر زور دیا اور یہ دعا کرنے کو کہا کہ مسیح دنیا کے گناہ گاروں پر رحم کریں۔ لوسیا نے بتایا کہ کنواری مریم کے الفاظ یہ تھے ''جب تم کوئی قربانی کرو تو کہو، او خداوند! یہ تمہاری محبت اور گناہ گاروں کی بخشش کے لیے ہے، یہ ان لوگوں کے لیے رحم کی درخواست ہے جنہوں نے معصوم اور پاکیزہ مریم کا دل دکھا کر گناہ کیا۔''

ان بی بی کے پہلے دیدار کے موقعے پر لوسیا نے لکھا کہ بچے نہایت پرجوش تھے کیونکہ جو کچھ انہوں نے دیکھا وہ ناقابلِ یقین تھا چنانچہ وہ بغیر کسی کے کچھ کہے ہی پکار اُٹھے ''موسٹ ہولی ٹرینیٹی، میں تمہاری تعریف کرتا ہوں، او گاڈ! او میرے خداوند میں تم سے پیار کرتا ہوں، اپنی روح کی گہرائی سے......''

لوسیا کا کہنا تھا کہ اس نے ان بی بی کو کہتے سنا کہ گلوریا پارٹی پرئیر کے بعد روزری میں ان الفاظ کا اضافہ کرلیں ''او میرے خداوند...... ہمیں معاف کردے، ہمیں جہنم کی آگ سے محفوظ رکھ۔ تمام روحوں کی جنت تک رہنمائی کر، خاص طور پر ان کی، جو تمہاری امداد کے زیادہ مستحق ہیں۔''

بعض متضاد اور کسی حد تک ضعیف روایات کے مطابق گناہ گاروں کو راہِ راست پر لانے کی دعا رومن کیتھولک چرچ کی لازمی عبادات کا حصہ نہیں کیونکہ اکثر ان سے وہ لوگ مراد لیے جاتے ہیں جن کا عیسائیت سے کوئی تعلق نہیں یا وہ عیسائی مذہب کے پیروکار نہیں ہوتے۔ پوپ لیویز دہم کے مطابق ان گناہ گاروں سے وہ لوگ مراد ہیں جو کیتھولک چرچ سے تو وابستہ ہیں لیکن اپنے عقیدے سے دور ہوگئے ہیں یا گناہوں کی دلدل میں گر گئے ہیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لوسیا لکھتی ہے کہ اس نے اور اس کے کزنز نے جن گناہ گاروں کی طرف اشارہ کیا ہے وہ نان کیتھولک نہیں بلکہ ایسے لوگ ہیں جو چرچ کے عقیدے سے دور ہو گئے ہیں یا کسی ایسی سرگرمی میں ملوث ہو گئے ہیں جو گناہ کے زمرے میں آتی ہے۔ خاص طور پر ہماری مراد ان لوگوں سے ہے جو جسمانی گناہوں کے مرتکب ہوتے ہیں۔ ناانصافی کرتے ہیں، غریبوں پر رحم نہیں کرتے، بیواؤں، یتیموں یا مستحقین کی مدد نہیں کرتے۔ بہ قول لوسیا کے یہ عمل گناہوں سے زیادہ ہولناک ہے۔

فاطمہ سٹی کے معجزات کے حوالے سے مذہبی معاملات کے ساتھ ساتھ اس کے سیاسی محرکات کا مختصر جائزہ بھی بے محل نہ ہوگا کیونکہ اکثر عیسائی اسے ایک سیاسی چال قرار دیتے ہیں جو دنیا کے تیزی سے بدلتے ہوئے حالات کی روشنی میں اپنائی گئی۔ ان کا کہنا ہے کہ انقلاب فرانس کے بعد سے کیتھولک چرچ اور دنیا کے درمیان رسہ کشی میں اضافہ ہوا ہے۔ خاص طور پر پوپ پیوس نہم نے چرچ کو لبرل ازم اور سوشل ازم کے خلاف دُہری جنگ میں ملوث کردیا ہے۔

اس نظریے نے دنیا کو دو واضح حصوں میں تقسیم کردیا ہے۔ ایک وہ حصہ ہے جو معجزے کا دفاع کرتا ہے جبکہ دوسرا حصہ اس کے وجود سے منکر ہے۔ فاطمہ سٹی میں جو کچھ ہوا اسے بی بی کے اپنے الفاظ کی صورت دنیا تک پہنچایا نہیں گیا۔ فاطمہ سٹی کے راز بھی اس واقعے کی اکلوتی راوی لوسیا کے توسط سے سامنے آئے اور وہ بھی تب جب ان بی بی نے اسے ایسا کرنے کی اجازت دی چرچ کے سنسر کے بعد۔ ان رازوں میں بھی سوویت رشیا کی لادینیت، مذہبی رجحانات کے علاوہ کمیونزم کی مخالفت ہی کی گئی۔ یہ لوسیا کے اپنے تحفظات تھے یا ان بی بی کے۔ یہ صرف لوسیا جانتی ہے اور وہ اب اس دنیا میں نہیں رہی اور اگر ہوتی بھی تو کیا وہ بی بی دوبارہ نمودار ہو کر اس کی تصدیق کرسکتی تھی؟ بالفرض اگر سوویت یونین میں سوشل ازم یا کمیونزم آ بھی رہا تھا تو اس سے ان بی بی کو کیا فائدہ یا نقصان ہوسکتا تھا چنانچہ اس صورتِ حال میں اس سارے معاملے کو اگر مذہب کے پرچار کی کوشش بھی سمجھا جائے تو کچھ غلط نہ ہوگا۔

آور لیڈی آف فاطمہ نے دنیا کے دو حصوں میں تقسیم ہو جانے کی نشاندہی کی چنانچہ روم اور کنواری مریم یکجا ہو کر سوویت یونین کو بنانے اور بگاڑنے کی کوششوں میں مصروف رہے۔

اس کے بعد وہ بی بی، اسپین میں نظر آتی ہے۔ ازکوئی اوگا کی رومانا اولازبیل کا کہنا ہے کہ انہوں نے اپنے ہاتھوں میں تلوار تھام رکھی تھی۔ رامونا کا اصرار تھا کہ ان کے ہاتھوں پر تلوار کے نشان بھی تھے۔ اس روپ سے ماہرین نے بہت سے اندازے قائم کیے۔ کیا یہ انگرسٹ اور کارلسٹ سرکلو میں لڑائی اور اختلاف کی پیش گوئی تھی یا اذن تھا۔ ازوئی اوگا میں ہونے والے واقعے کو اخبارات میں بے حد شہرت ملی کیونکہ 1931ء میں ہی یہ بی بی اسپین کے سولہ دیگر مقامات پر بھی دکھائی دی۔

یہاں بھی فاطمہ سٹی والی کہانی ہی تھی۔ اس کی بھی سرکاری تصدیق وتوثیق اور پذیرائی کی گئی۔ اس کے خلاف یا تحقیقات میں ایک جملہ کہنے کے بجائے چرچ نے اس کی بے حد حوصلہ افزائی کی۔

دی بلیو آرمی آف آور لیڈی، کیتھولکس اور نان کیتھولکس پر مشتمل ہے جنہیں یقین ہے کہ خود کو روزانہ کی عبادت (بہ طور خاص روزری) کے لیے وقف کردینے سے دنیا میں امن قائم کرنے میں مدد ملے گی اور اس سے وہ کیمونزم کی ''غلطیوں'' کا خاتمہ کرسکیں گے۔ 1952ء میں ''دی مریکل آف آور لیڈی آف فاطمہ'' نامی ایک فیچر فلم ریلیز ہوئی۔ نقادوں نے اسے آڑے ہاتھوں لیا اور کہا کہ فلم میں پرتگیزی حکومت کے سوشلسٹ اور بائیں بازو کے دیگر عوامل کی بھرپور حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔

سیاسی اور ذاتی آرا کے برعکس چرچ کا موقف یہ ہے کہ ذاتی تجربات کو کیتھولک چرچ کے ایمان وایقان کا حصہ نہیں بنایا جاتا اور نہ ہی اس کے ارکان اس امر کے پابند ہوتے ہیں کہ ذاتی تجربات پر یقین کریں تاہم اگر کوئی ذاتی تجربہ یا معاملہ چرچ کی کسوٹی پر پورا اترتا ہے تو اس کے بارے میں فیصلہ تمام دستیاب شواہد اور شہادتوں کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ چرچ کا کہنا ہے کہ باقاعدہ تحقیق کے بعد فاطمہ سٹی کے واقعات کو سند توثیق جاری کی گئی اور اکتوبر 1930ء میں ''لیریا فاطمہ'' کے بشپ نے اسے ''قابل اعتبار'' قرار دیا۔

چرچ پر یہ بھی لازم نہیں کہ وہ ماورائے انسانی کرامتوں، معجزوں یا الہامی واقعات کی تصدیق کرے یا سند توثیق جاری کرے۔ کارل راہنر جیسے نظریاتی محقق اس امر پر معترض ہیں کہ پوپ اپنے کس اختیار کے تحت ایسے واقعات کے درست ہونے کا سرٹیفکیٹ دیتے ہیں۔ وہ فاطمہ سٹی یا لورڈس جیسے مقامات پر پوپ کی جانب سے مافوق الفطرت

واقعات کی تصدیق پر معترض ہے۔

لیکن اس کے باوجود پوپ پیوس دوازدہم، پوپ پال ششم اور پوپ جان پال دوم کے علاوہ پوپ بینی ڈکٹ شانزدہم نے غیر معمولی انداز اور مضبوط بنیادوں پر فاطمہ سٹی کے واقعات کی تائید وتوثیق کی۔ یہ سب مقامی بشپ کی اس تصدیق کے بعد ہوا کہ تینوں بچوں نے جو کچھ دیکھا وہ قابلِ یقین اور قابل اعتبار ہے اور مقدس مریم کے دیدار کو مشتہر کرنے کی اجازت ہے۔ پرتگیزی بشپس نے بھی اس مافوق الفطرت واقعے کے درست ہونے کی تائید کی۔ ویٹی کن نے ان شواہد کی بنیاد پر نہ صرف اس واقعے کی سچائی تسلیم کرلی بلکہ لوگوں کو اس امر کی اجازت بھی دے دی کہ وہ فاطمہ سٹی میں باقاعدہ طور پر جشن کا اہتمام بھی کرسکتے ہیں۔

1939ء میں اگنیو پاسیلی جو ان بی بی کے پہلے دیدار والے دن یعنی 13 مئی 1917ء کو بشپ تھا، پیوس دوازدہم کی حیثیت سے پوپ منتخب ہوا اور پاپائے اعظم کہلوایا۔ ایک سال بعد دوسری جنگِ عظیم کا آغاز ہوگیا اور لوسیا نے پوپ پیوس دوازدہم سے کہا کہ وہ دنیا کو بچائے اور روس کو کنواری مریم کا پیغام پہنچائے۔ 2 دسمبر 1940ء کو لوسیا نے اپنی درخواست کا اعادہ کیا کیونکہ 1929ء کے آغاز میں ان بی بی نے اپنے ایک اور دیدار میں سابقہ خواہش دہرائی تھی۔ انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ روس کو اس کی غلطیوں سے نکال لے جائے گی۔

13 مئی 1942ء کو فاطمہ سٹی میں ان بی بی کے دیدار کی پچیسویں سالگرہ منائی گئی جبکہ اسی دن پوپ پیوس دوازدہم کے پوپ منتخب ہونے کی سلور جوبلی بھی تھی۔ اس روز ویٹی کن نے خصوصی پیغام جاری کیا اور فاطمہ سٹی کے راز مشتہر کیے۔ 31 اکتوبر 1942ء کو پوپ پیوس دوازدہم نے اپنے ریڈیو خطاب میں پرتگال کے عوام کو فاطمہ سٹی کی پیش گوئیوں سے آگاہ کیا اور روس کے ذکر سمیت کنواری مریم کی ان خواہشات کے بارے میں بتایا جو وہ انسانیت کے لیے اپنے دل میں رکھتی تھی۔ پوپ نے فاطمہ سٹی کے واقعات کو سچ قرار دیا اور عوام کو بھی انہیں تسلیم کرنے کی ترغیب دی۔

8 دسمبر 1942ء کو پونٹف نے سینٹ پیٹرز بے شیلیا روم کی تقریب میں سرکاری اور حلفیہ طور پر فاطمہ سٹی کے واقعات کو احترام وتقدیس کا مقام دینے کا اعلان کیا۔ 13 مئی 1946ء کو پوپ پیوس دوازدہم کے ذاتی نمائندے کارڈینل مسالہ نے اسے آور لیڈی آف فاطمہ کا تاج پہنایا جبکہ پوپ نے فاطمہ سٹی سے متعلق اپنا دوسرا پیغام جاری کیا۔

''وفادار ار قابل اعتبار کنواری نے کبھی کسی کا اعتماد مجروح نہیں کیا چنانچہ اس کی سچائی کو تسلیم کیا جائے۔ وہ پرتگال کو خوشیوں کا گہوارہ بنادے گی اور لوگوں کو روحانی وجسمانی خوشی اور تسکین عطا فرمائے گی...... اور چرچ اور پھر پوری دنیا کے لیے رشد وہدایت کے سرچشمے وہیں سے پھوٹیں گے......''

یکم مئی 1948ء کو آس پیشیا کو آڈیم میں پوپ پیوس دوازدہم نے اپیل کی کہ ہر کیتھولک خاندان اور عبادت گاہ مقدس کنواری کے پیغام کو اپنی عبادت کا حصہ بنائے۔

''ہماری خواہش ہے کہ جہاں کہیں موقع ملے۔ اس محترم ومقدس واقعے کو ہر کیتھولک خاندان اور عبادت گاہ اپنی عبادتوں میں شامل رکھیں۔''

18 مئی 1950ء کو پوپ نے ایک مرتبہ پھر لوگوں کو بالخصوص پرتگال کے عوام کو فاطمہ سٹی کے حوالے سے ایک پیغام بھیجا ''ہماری خواہش ہے کہ پرتگال کبھی فاطمہ سٹی کے الہامی پیغام کو فراموش نہ کرے۔ جو سنے اسے اپنی یادداشت میں محفوظ رکھے۔ فاطمہ کو اپنے دلوں میں زندہ رکھیں اور اپنے معمولات میں شامل کریں تاکہ آپ پر زیادہ سے زیادہ رحم کیا جائے۔''

اس کے علاوہ بھی پوپ پیوس نے درجنوں مواقع پر فاطمہ سٹی کے واقعات کا حوالہ دیا اور لوگوں کو ہدایت کی کہ وہ اس کی روشنی میں اپنی زندگیوں کو استوار کریں۔

سیکنڈ ویٹی کن کونسل کے اختتام پر پوپ پال ششم نے کنواری مریم کے حوالے سے پوپ پیوس دوازدہم کے پیغامات کا اعادہ کیا اور غیر معمولی انداز میں ان بی بی کے پہلے دیدار کی پچاسویں سالگرہ پر بہ طور زائر فاطمہ سٹی جانے کا اعلان کیا۔ پوپ نے 13 مئی 1967ء کو سسٹر لوسیا کے ہمراہ اس گرجا میں عبادت کی جو اس واقعے کی یادگار کے طور پر تعمیر کیا گیا تھا۔ اس تاریخی واقعے نے عیسائی دنیا میں فاطمہ سٹی کی سرکاری حمایت میں مزید اضافہ کردیا۔

13 مئی 1981ء کو جب آور لیڈی آف فاطمہ کے دیدار کا جشن منایا جارہا تھا، پوپ جان پال دوم پر ناکام قاتلانہ حملہ ہوا چنانچہ پوپ نے اسے بھی کنواری مریم کا معجزہ قرار دیا کہ محض اس کے التفات کی وجہ سے قاتل اپنے مقاصد حاصل نہیں کرسکا۔ پوپ جان پال دوم نے پوپ پال ششم کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اپنی زندگی بچ جانے کو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کنواری مریم کا معجزہ ہی بتایا۔ اس سے اگلے روز پوپ نے اپنے پیش رو پوپ پیوس دوازدہم کی تقلید میں کنواری مریم کے دیدار کے تقدس پر زور دیا۔

12 اور 13 مئی کو پوپ بینی ڈکٹ شانزدہم نے لیڈی آف فاطمہ کی یادگار کا دورہ کیا اور فاطمہ سٹی کے واقعات کی پرزور تائید کی۔ پہلے روز پوپ نے دیدار فاطمہ کی یادگار پہنچنے پر ایک طلائی پھول، آور لیڈی آف فاطمہ، کی نذر کیا۔ پوپ نے اپنے پیش رو جان پال دوم کے بارے میں کہا کہ کسی نادیدہ ہاتھ نے ان کی زندگی بچائی تھی۔ اس نادیدہ ہاتھ سے پوپ بینی ڈکٹ کی مراد ان بی بی کے سوا اور کوئی نہ تھا۔

دوسرے دن پوپ بینی ڈکٹ نے پانچ لاکھ سے زائد افراد کے مجمع کے سامنے فاطمہ سٹی کی پیش گوئیوں کا حوالہ دیا اور انہیں دل کی گہرائیوں سے سچ اور عیسائی عقیدے کے عین مطابق قرار دیا۔ پوپ کے الفاظ تھے کہ یہ ''فائنل گلوری آف دی موسٹ ہولی ٹرینٹیٹی'' ہے۔

1996ء میں جان ہیفٹ (بلیو آرمی آف آور لیڈی آف فاطمہ کا شریک بانی) نے فاطمہ سٹی کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا اور اپنی کتاب ''میڈ دی وٹ نیس'' کے لیے دو سو سے زائد افراد کے انٹرویوز کیے جنہوں نے فاطمہ سٹی کا معجزہ رونما ہوتے دیکھا اور اس کے بارے میں شہادتیں دیں۔

فاطمہ سٹی عیسائی دنیا میں کس اہمیت کا حامل ہے، اس کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ 13 اکتوبر 1917ء کو ان بی بی کے آخری دیدار کے لیے 70 ہزار افراد اس چھوٹے سے گاؤں میں جمع ہوئے۔ بے شک انہیں سورج کے رقص کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیا لیکن فاطمہ سٹی جلد ہی عیسائیوں کے متبرک مقامات پر شامل ہوگیا چنانچہ 1917ء کے بعد اگلے دس سال کے دوران بیس لاکھ سے زائد افراد نے اس مقام کا دورہ کیا۔ عبادات کیں اور دعائیں مانگیں۔

مقامی لوگوں نے دیدار مریم کی جگہ پر ایک چھوٹا سا چیپل ''کیپلینا'' تعمیر کردیا۔ اس کی تعمیر میں کیتھولک چرچ کے حکام نے کوئی رکاوٹ ڈالی نہ اس کی حوصلہ افزائی کی۔ جنوری 1924ء میں یہاں پہلی مرتبہ مقدس عوامی اجتماع منعقد ہوا۔ اسی سال بیمار افراد کے لیے ایک ہوسٹل کی تعمیر شروع ہوئی۔ 1927ء میں عبادت گاہ کے پہلے ریکٹر کا تقرر عمل میں آیا اور پہاڑی گزرگاہ پر بعض صلیبیں نصب کی گئیں۔ فاطمہ سٹی کے موجودہ بے شیلیا کا سنگِ بنیاد اس سے اگلے سال رکھا گیا۔

1930ء میں دونوں چرچوں نے مریم بی بی کے دیدار کو سرکاری طور پر تسلیم کرلیا اور اسے قابلِ اعتماد قرار دیتے ہوئے فاطمہ سٹی کی زیارت کی باضابطہ اجازت دے دی گئی۔ 1935ء میں ان بی بی کا دیدار کرنے والے دونوں بچے جے سنٹا اور فرانسسکو کی قبریں بے شیلیا منتقل کردی گئیں۔ 1946ء میں وہاں آور لیڈی آف فاطمہ مجسمہ نصب کردیا گیا جس سے فاطمہ کی خبر گزرگاہ آباد ہوگئی۔

فاطمہ سٹی کی اپنی آبادی تو اب بھی آٹھ ہزار نفوس سے بھی کم ہے لیکن زائرین کی آمد چونکہ سارا سال جاری رہتی ہے اس لیے گاؤں کی معیشت کا دارومدار اب اسی پر ہے۔ اب یہاں کئی اضافی چیپل، اسپتال، ہوٹل اور دیگر سہولتیں تیار ہو چکی ہیں۔ مرکزی اجتماعات کی تعداد چھ ہے جو 13 مئی، 13 اکتوبر تک ہر ماہ کی اسی تاریخ کو منعقد ہوتے ہیں جب بی بی بچوں کو نظر آئی تھیں۔ بڑے اجتماعات 13 مئی، 13 اکتوبر کو ہوتے ہیں جب زائرین کی تعداد دس لاکھ بھی تجاوز کرجاتی ہے۔ گاؤں میں آور لیڈی آف فاطمہ کا مجسمہ نصب کیا گیا ہے، اس پر رات کے وقت چراغاں کیا جاتا ہے اور یہ کئی میل کے فاصلے سے دکھائی دیتا ہے۔

13 مئی 1928ء کو فاطمہ سٹی میں ایک عظیم الشان بے شیلیا کی تعمیر کا آغاز کیا گیا۔ اس کے مرکزی ٹاور کی بلندی 213 فٹ (65 میٹر) ہے جبکہ اس کے ساتھ اسپتال اور دیگر فلاحی عمارتیں ہیں۔ جے سنٹا، فرانسسکو مارٹو اور لوسیا سنٹوس کی قبریں بھی اسی چرچ کے احاطے میں منتقل کی جاچکی ہیں۔ 2000ء کی دہائی میں فاطمہ سٹی میں ''دی ایگریجا ڈاسنٹی ٹرینٹیڈ'' تعمیر کیا گیا جس کا شمار دنیا کے بڑے چرچز میں کیا جاتا ہے۔

رومن کیتھولک اس وقت فاطمہ سٹی اور آور لیڈی آف فاطمہ کے کسٹوڈین ہیں۔ مسلمانوں میں سے سوائے ایک محققین کے، کسی اور نے دعویٰ نہیں کیا کہ فاطمہ میں نظر آنے والی خاتون، مریم نہیں بلکہ فاطمہ تھیں۔ ان محققین نے بارے میں ایک دستاویزی فلم بھی ریلیز کی ہے جس انہوں نے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ تینوں بچے حضرت فاطمۃ الزہرہ دکھائی دی تھیں.....

لیکن اس کے باوجود یہ راز..... ہمیشہ راز ہی رہے شاہ بلوط پر فاطمہ نظر آئی تھیں یا مریم.....!

آج کل کمرشل میجک کا دور ہے۔ اس دور میں دنیا کے بہت سے ممالک میں ایسے جادوگر ہیں جو اپنی روزی حاصل کرنے کے لیے جادو یا وا ہے illusion کے مناظر دکھا کر لوگوں کو حیرت زدہ کردیتے ہیں جسے میجک ٹریک کہتے ہیں۔

اس قسم کے شعبدے کا مقصد صرف حیرت زدہ کرنا ہوتا ہے۔

یہ جادوگر آپ کو ٹی وی شوز میں اور اسٹیج وغیرہ پر اپنے کارنامے کرتے ہوئے دکھائی دے جاتے ہیں۔

ایسے جادوگروں کی باقاعدہ تربیت ہوتی ہے اور تربیت کے بعد انہیں سوسائٹی کا ممبر بنایا جاتا ہے۔

ایسے جادوگروں کی ایک عالمی سوسائٹی بھی ہے جس کا ممبر ہونا جادوگروں کے لیے بہت بڑا اعزاز ہے۔

ممبر بناتے وقت ان جادوگروں سے باقاعدہ حلف لیا جاتا ہے۔ اس حلف کا مفہوم کچھ یوں ہوتا ہے ''میں نے اپنے استادوں سے جادو کی جو تربیت حاصل کی ہے۔ اس کا راز سوائے پروفیشنل جادوگروں کے کسی اور کو نہیں بتاؤں گا اور ہمیشہ اپنے اس عہد پر قائم رہوں گا۔''

ہم یہاں کالے یا پیلے جادو کی بات نہیں کررہے، بلکہ اس مضمون میں جادوگری کے اس شعبے کا جائزہ لیا گیا ہے جو تماشائیوں کے سامنے ہوتا ہے یا جس کا تماشا دکھایا جاتا ہے۔ اسے عرف عام میں شعبدہ بازی کہا جاتا ہے۔

اس قسم کے جادو کو آپ Effects کا ہنر بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس effects کی کئی اقسام ہوتی ہیں، مثلاً

1۔ پروڈکشن۔ اس میں جادوگر کے پاس بظاہر کچھ نہیں ہوتا لیکن وہ چیزیں پیدا کرکے دکھادیتا ہے، جیسے خالی ہیٹ میں سے خرگوش کا نکل آنا۔

ہوا میں ہاتھ گھمایا اور تاش کے بے شمار پتے اس کے ہاتھ میں آگئے۔ خالی ٹوکری دکھائی پھر اس میں سے بے شمار سکے نکلنے شروع ہوگئے یا اسی قسم کی کوئی بھی حرکت۔ اسے ہم پروڈکشن کا کمال کہہ سکتے ہیں۔

2۔ غائب کرنا۔ پروڈکشن میں سامنے کچھ بھی نہیں ہوتا لیکن اس عمل میں چیز پہلے سے سامنے موجود ہوتی ہیں اور جادوگر انہیں غائب کرکے دکھادیتا ہے۔

3۔ تبدیل کرنا۔ اس عمل میں ایک صورت کو دوسری صورت میں تبدیل کردیتے ہیں۔ جیسے رومال سفید ہے لیکن اسے کسی اور رنگ میں بدل دیا۔ تاش کے پتوں کو ہوا میں اُچھالا اور پھول گرنے لگے۔ یا اسی قسم کی کوئی اور چیز۔ Transformation کا عمل کہلاتا ہے۔ اس قسم کے شعبدے دکھانے کے لیے جادوگر کو بہت بااعتماد اور پھرتیلا ہونا چاہیے۔

کمرشل جادو

محمد امجد اوسلو

اس وقت پوری دنیا میں سب سے زیادہ کمرشل جادو دکھایا جارہا ہے۔ اسے لوگ دلچسپی سے دیکھتے ہیں، لطف لیتے ہیں اور پسند کرتے ہیں۔ آپ بھی یقینا ایسے کسی جادوگر سے یقینا واقف ہوں گے۔ مغرب میں ہڈنی، ڈیوڈ کوپرفیلڈ، بھارت میں پی سی سرکار، نیل منی بالدار، بنگلہ دیش میں روکن اور ہمارے پاکستان میں.....؟ جی ہاں ہمارے ہاں بھی ان جیسے کئی بڑے جادوگر ہیں جو اپنی مثال آپ ہیں۔

دنیا بھر میں سب سے زیادہ حظ پہنچانے والا جادو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

4_Re-storation ۔اس عمل میں کسی بھی چیز کو جلا کر یا تباہ کر کے اسے دوبارہ پروڈیوس کر دیا جاتا ہے۔ جیسے نوٹ جلا کر دوبارہ پیدا کرنا۔ اخبار کی دھجیاں بکھیر کر پھر سے اخبار بنا دینا، وغیرہ۔

5_Talepartation ۔مقام کی تبدیلی۔

یہ عمل بھی بظاہر بہت مشکل اور حیران کرنے والا دکھائی دیتا ہے لیکن پروفیشنل جادوگر اس قسم کے کارنامے کرتے ہی رہتے ہیں۔

اس عمل میں کسی چیز کو ایک جگہ سے کھسکا کر دوسری جگہ پہنچا دیتے ہیں۔ جیسے کوئی فرنیچر جادوگر کے اشارے پر ایک کونے سے دوسرے کونے میں پہنچ جائے۔

6_Escapvng ۔فرار۔ آپ نے اس قسم کے تماشے ٹی وی پر ضرور دیکھے ہوں گے۔ اس میں جادوگر کسی جگہ سے فرار یا غائب ہو جاتا ہے۔ جیسے اسے زنجیروں اور رسیوں سے جکڑ کر کسی صندوق میں بند کر دیا جائے اور وہ ایک خاص وقت میں وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

ہم اب یہ دیکھیں گے کہ جادوگر حضرات اپنے شو کے لیے کن کن ذرائع سے کام لیتے ہیں اور آج کے دور میں جادو کی اقسام کیا ہیں۔

1_Stage illusion ۔یہ کاریگری اسٹیج پر کی جاتی ہے اور تماشا دکھانے کے لیے اسٹیج پر بہت سی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ جیسے لوہے کی سلاخیں، صندوق، آئینے، پنجرے اور اسی قسم کی بے شمار چیزیں جن کے ذریعے جادوگر اپنا کمال دکھاتا رہتا ہے۔

2_ پلیٹ فارم میجک۔ اس کا دائرہ ذرا کم ہوتا ہے۔ یہ عام طور پر آپ نے اسکولوں وغیرہ میں دیکھا ہوگا۔ اس میں جادوگر کو ایک میز کی ضرورت ہوتی ہے اور چند ایسی چیزیں ہوتی ہیں جن سے وہ ناظرین کو محظوظ کرتا رہتا ہے۔

جیسے ہیٹ، چھڑی، گل دان، تاش کے پتے، پانی کی بوتل، اخبار وغیرہ۔ جادوگر ان ہی چیزوں کو اُلٹ پھیر کر کے آپ کو حیران کرتا رہتا ہے۔

3_ مائکرو میجک۔ یہ تماشا اسٹیج یا اسکولوں کے شوز سے مختلف ہوتا ہے۔ یہ کسی مختصر سی تقریب میں ناظرین کو خوش یا محظوظ کرنے کے لیے دکھایا جاتا ہے۔

اس قسم کی ٹرکس کو آپ ایمرجنسی میجک کہہ سکتے ہیں۔ اس میں جادوگر ان چیزوں سے کام لیتا ہے جو اس کی جیبوں میں ہوتی ہیں۔

اس کی سب سے خاص بات یہ ہوتی ہے کہ دیکھنے والوں اور جادوگر کے درمیان فاصلہ نہیں ہوتا بلکہ جادوگر دیکھنے والوں کے بالکل قریب ہی ہوتا ہے۔

4_ escaPology ۔اس کا بیان آ چکا ہے۔ یہ کسی جگہ سے مقررہ وقت پر فرار ہونے کی تکنیک ہوتی ہے۔ یہ ایک خطرناک کھیل ہے۔ کئی جادوگر وقت پر فرار نہ ہونے کی وجہ سے اپنی جانوں سے ہاتھ بھی دھو بیٹھے ہیں۔

خاص طور پر اس وقت اور زیادہ خطرناک ہو جاتا ہے جب اس کھیل میں بارودی مواد بھی شامل ہو گیا ہو۔

5_Mentalism یہ بہت دلچسپ کھیل ہوا کرتا ہے لیکن اس کے لیے بہت زیادہ خود اعتمادی اور ذہانت کی ضرورت ہوتی ہے۔

یہ کھیل دوسروں کے ذہنوں کو چیلنج کرنے کا کھیل ہوتا ہے اور حیران کر دیا کرتا ہے۔ اس کی چھوٹی سی مثال یہ ہے کہ آپ کوئی نمبر سوچتے ہیں اور جادوگر وہ نمبر بتا دیتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے اس میں آپ کے ذہن کو پڑھنے کی صلاحیت ہے۔

6_ چلڈرن میجک یعنی بچوں کے لیے کھیل۔

اس کھیل کا مقصد بچوں کو خوش کرنا ہے۔ اس کے لیے جادوگر کے پاس سات آٹھ چیزیں ہوتی ہیں جن کی مدد سے وہ بچوں کے دل بہلاتا رہتا ہے۔

جادوگر ایسی باتیں کر سکتا ہے جو بچوں کو ہنسا سکیں۔ نقلیں اُتارنے کا فن بھی اس کے کام آتا ہے۔

7_ تھیٹریکل میجک۔

اس کھیل میں گفتگو کا انداز وہی ہوتا ہے جو تھیٹر کا ہوتا ہے۔ یہ کوئی خاموش پرفارمنس نہیں ہوتی، بلکہ اس میں جادوگر کو متاثر کرنے کی صلاحیت کا بھرپور مظاہرہ کرنا ہوتا ہے۔

اسے اپنے لہجے اور اپنی آواز پر کنٹرول حاصل ہوتا ہے۔ اسے اپنے چہرے کے تاثرات تبدیل کرنے کا ہنر بھی آتا ہو۔ اگر وہ بدروحوں پر ناراض ہو رہا ہے تو اس کی حرکات، سکنات اور آواز سے اس کی ناراضی کا اظہار ہونا چاہیے۔

8_ آن لائن میجک ٹرکس۔

اسے آپ نظروں کا دھوکا یا اُلجھاؤ کہہ سکتے ہیں۔ اس کا رواج کمپیوٹر کے آنے کے بعد ہوا ہے۔

جادو کا یہ پروگرام پوری دنیا میں نہایت دلچسپی سے دیکھا جاتا ہے اور عام طور پر اس قسم کے کارنامے دکھانے والے Entertainer کہلاتے ہیں۔ ■■■

بدروح

الف۔کاف

یورپ کے اِس کونے سے اُس کونے تک ایک خوف کا سایہ ہے، ایک بدروح کی دہشت ہے۔ لوگ اندھیری راتوں میں اس قبرستان کے گیٹ پر کھڑی دوشیزہ کو دیکھ کر نظریں چُرالیتے ہیں۔ جب اس نے یہ دیکھا کہ لوگ اس کے قریب نہیں آتے تو وہ نزدیکی تاج گھر تک جا پہنچی کیونکہ اسے اپنے قاتل کے چہرے سے نقاب اُٹھانا تھا، اسے سزا دلوانی تھی۔

یورپ بھر میں اس بھٹکتی روح کا چرچا ہے، عجیب سا خوف ہے

ہُو کا عالم تھا۔ رات سناٹے کی لپیٹ میں تھی اور سنسان، پتھریلی سڑک پر میری گاڑی دھند کو چیرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی میری خوبصورت بیوی ہیلن نیند کی وادی میں گم تھی سردی کی وجہ سے اُس نے کمبل اوڑھ رکھا تھا۔ اُن لمحات میں کُہرے سے جھانکتی اسٹریٹ لائٹس کی روشنی عجیب معلوم ہوتی تھی، جیسے کسی راز کو چھپانے کی کوشش کر رہی ہو۔ میں ریزوریشن قبرستان' سے چند قدموں کے فاصلے پر تھا اور تب میں نے وہ منظر دیکھا جس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نے میری دنیا اتھل پتھل کر دی اور ماضی اپنا مکروہ چہرہ لیے میرے سامنے آن کھڑا ہوا...

ویران قبرستان کی دیوار کے ساتھ، ٹھٹھرتے موسم میں، کہرے کے درمیان سفید لباس میں ملبوس ایک لڑکی ننگے پاؤں چہل قدمی کر رہی تھی۔ میری دھڑکن تیز ہوگئی۔ خود سے سوال کیا، کیا یہ وہی ہے؟

اُس کا سر جُھکا ہوا تھا اور وہ بہت ہی مضمحل دکھائی دیتی تھی۔ جب کار بالکل اُس کے برابر سے گزری، میرے بدترین اندیشوں نے حقیقت کا روپ اختیار کر لیا۔ اُس نے پُرانے طرز کے کپڑے پہن رکھے تھے جو کئی برس قبل ڈانس پارٹیوں میں پہنے جاتے تھے۔

ہاں وہ 'میری' ہی تھی، ریزورریکشن میری، ایک بدروح! سرد لہر ریڑھ کی ہڈی سے ہوتی ہوئی میرے سر تک پہنچ گئی، ذہن ماؤف ہوگیا۔ ٹھیک اُس لمحے جب وہ میری نظروں کے سامنے تھی، کسی نے میرے کان میں سرگوشی کی، ایک نام لیا... اور میں لرز گیا۔ اچانک... سڑک پر ایک چنگھاڑتا ہوا ٹرک نمودار ہوا، ہیڈ لائٹس کی روشنی سے میری آنکھیں چندھیا گئیں... ٹرک تیزی سے میری گاڑی کی جانب بڑھ رہا تھا اور عین میرے سر پر پہنچ کر یک دم غائب ہوگیا، یوں لگا جیسے وہ ہوا میں تحلیل ہوگیا ہو۔ میں نے بہ مشکل گاڑی کو سنبھالا۔ اور تب مجھے رنج و الم میں ڈوبی ایک چیخ سنائی دی، میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھنے لگا، خوف سے میرا جسم کھل رہا تھا کیوں کہ اب نہ تو وہاں کوئی ٹرک تھا، نہ ہی کوئی لڑکی، فقط سناٹا تھا! مجھے جولیان سے بات کرنی ہوگی!

یہ سڈنی جان کی آخری تحریر تھی، جو اُس نے اب سے سات برس قبل 28 فروری 89ء کی صبح اپنی ڈائری میں لکھی تھی اور اپنے قریبی دوست جولیان سے ملاقات کا ارادہ ظاہر کیا تھا لیکن ایسا ہو نہیں سکا، کیوں کہ ٹھیک ایک دن بعد، یکم مارچ کو وہ حرکت قلب بند ہوجانے سے انتقال کر گیا۔

اِس تحریر میں ریزورریکشن قبرستان کے نزدیک پُراسرار میری کو دیکھنے کا تو ذکر تھا لیکن یہ اُس سانحے کے اثرات کی بابت کچھ نہیں بتاتی تھی۔

مارک نے ڈائری کے اوراق پر نظر ڈالی جو 28 فروری کو پیش آنے والے واقعے کے گواہ تھے۔

اُس کے سامنے ہیلن بیٹھی تھی، سڈنی کی بیوی! وہی عورت جس کا سڈنی نے اپنی آخری تحریر میں ذکر کیا تھا۔ اُس کی اداس آنکھوں میں اپنے مرحوم شوہر کے لیے محبت تھی۔

''کیا آپ مجھے مزید کچھ بتا سکتی ہیں میڈم؟'' مارک نے سوال کیا۔

چند ساعت اذیت ناک خاموشی چھائی رہی۔ پھر اُس کے لب وا ہوئے۔ ''وہ انتہائی سرد رات تھی، بس اِس کے سوا مجھے کچھ یاد نہیں۔ ہم کئی برس تک الینوئس کے دیہی علاقے میں مقیم رہے، سڈنی کی موت سے ایک ہفتہ قبل ہی ہم جسٹس لوٹے تھے۔ جہاں تک اِس تحریر کا تعلق ہے...'' اُس نے ڈائری کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''سڈنی کی موت کے بعد اُس کا دوست جولیان جو کسی زمانے میں اس کا پارٹنر بھی تھا، تمام کتابیں لے گیا۔ اُن ہی میں یہ ڈائری تھی۔ اُس نے میری اجازت سے ریزورریکشن قبرستان کے بارے میں مشہور پُراسرار کہانیوں پر مضمون لکھتے ہوئے ڈائری کی اِس 'انٹری' کو استعمال کیا۔''

مارک خاموشی سے اس بیوہ کو دیکھتا رہا۔ جولیان پاک کا سات برس قبل شائع ہونے والا مضمون ہی اُس کی یہاں آمد کا سبب بنا تھا۔ اِس ضمن میں اُس نے پہلے جولیان سے ملاقات کی اور اب ہیلن کے سامنے بیٹھا تھا، تاہم دونوں ہی اِس راز سے پردہ اٹھانے میں ناکام رہے کہ آخر سڈنی، جولیان کو کیا بتانا چاہتا تھا؟

''کیا آپ کو لگتا ہے کہ اِس واقعے سے آپ کے شوہر کی موت کا کوئی تعلق ہے؟''

''میں کچھ کہہ نہیں سکتی...'' وہ متذبذب نظر آئی۔ ''میں توہم پرست نہیں، سڈنی بھی ان باتوں پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ وہ کھیتی باڑی سے جُڑا ایک عام انسان تھا۔ سچ کہوں، تو میں 'میری' کی کہانی سے بھی واقف نہیں تھی۔ لیکن شاید... پر آپ اِس پر چھائی کا پیچھا کیوں کر رہے ہیں؟''

مارک نے گہرا سانس لیا۔ اب وہ ماضی کا بوجھ اٹھائی اُس عورت کو کیا بتاتا کہ وہ خود پُراسرار کہانی کی لپیٹ میں آ گیا ہے جو ایک کے بعد ایک سانحے کو جنم دے رہی ہے۔

مارک جانتا تھا، سڈنی کا سامنا ''ریزورریکشن میری'' سے ہوا تھا، جو اس علاقے کی مشہور آسیبی داستان ہے۔ اس کہانی کی شہرت کا سبب امریکی ریاست، الینوئس کے ایک خاموش قصبے، جسٹس میں واقع ریزورریکشن قبرستان کے آس پاس پیش آنے والے عجیب وغریب واقعات اور وہ اداس لڑکی ہے جسے سیکڑوں افراد دیکھنے کا دعویٰ کر چکے ہیں، تاہم معاملہ فقط اُس بدروح سے روبرو ہونے تک محدود نہیں رہا تھا، اِس کہانی کا تعاقب کرنے والے چند افراد اپنی جان

سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔

پانچ روز قبل مارک کی ''میری'' نامی اس حسین مگر اداس سی لڑکی سے بڑے ہی عجیب ڈھنگ سے ملاقات ہوئی تھی جس کے بعد اس کی زندگی نہ سمجھ میں آنے والے واقعات کی لپیٹ میں آ گئی۔

اُس کے پاس کئی سوالات تھے اور جوں جوں وہ آگے بڑھ رہا تھا، سوالات پیچیدہ ہوتے جا رہے تھے۔

☆☆☆

اِس کہانی کا آغاز ہفتے کی رات کو ہوا جس نے زندگی کی منطقی ترتیب کو توڑ ڈالا۔

نیویارک میں آنکھ کھولنے والا مارک ایک کمپیوٹر انجینئر تھا۔ اُس کا تعلق امریکا کی ''ورکنگ کلاس'' سے تھا۔ اُس نے نیویارک کے دوسرے درجے کی درس گاہوں سے تعلیم حاصل کی جس کے دو اسباب تھے۔ ایک تو یہ کہ اُس کے ماں باپ اعلیٰ اداروں کے اخراجات پورے نہیں کر سکتے تھے اور دوسرا سبب مارک کی متنوع پسند طبیعت تھی۔ وہ کبھی سنجیدگی سے پڑھائی کی جانب توجہ نہیں دے سکا، امتحانات بہ مشکل پاس کیے جس کی وجہ سے اچھی درس گاہ میں داخلہ ملنے کا امکان معدوم ہوگیا۔ عملی زندگی میں قدم رکھنے کے بعد اُسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ تلافی کے لیے اُس نے ایک درمیانے درجے کی سوفٹ ویئر کمپنی، چیس کمیونیکیشن میں ملازمت حاصل کرنے کے بعد اپنی صلاحیتوں کو بہتر بنانے کے لیے دن رات ایک کر دیے۔

یہی ملازمت اس کی ''جسٹس'' آمد کا سبب تھی جہاں اُس کی کمپنی ایک کارخانہ لگانے کا ارادہ رکھتی تھی۔ اُسے منصوبے کے تکنیکی پہلوؤں کا جائزہ لینے کے لیے بھیجا گیا تھا۔

آٹھ کلومیٹر کے رقبے پر پھیلا یہ چھوٹا سا ٹاؤن انتہائی حسین تھا۔ اُس کی آبادی بارہ ہزار کے قریب تھی۔ اُس کے نزدیک سے ''اسٹیون سن ایکسپریس وے'' نامی شاہراہ گزرتی تھی جس کے ایک ''انٹرلنک'' کو قصبے میں داخل ہونے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ منظم طرز پر آباد کیے جانے والے اس ٹاؤن کی مرکزی سڑک ''آرچرڈ ایونیو'' کہلاتی تھی اور اسی پر ریزورریکشن قبرستان واقع تھا۔

مارک کی بکنگ ''ڈے ان'' نامی ہوٹل میں تھی۔ کمپنی کا ذیلی دفتر چند فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔ یہ دفتر پانچ کمروں پر مشتمل تھا جہاں کل دس ملازمین تھے، مارک گیارہواں تھا۔ وہیں اُس کی ملاقات رونی، سارہ اور مارکیز سے ہوئی۔

اُن تینوں کا تعلق ہارڈ ویئر سیکشن سے تھا۔ سوفٹ ویئر سیکشن کی ذمے داری پلسکن اور ڈونلڈ کے پاس تھی۔

ایک ادھیڑ عمر شخص کوزی منیجر کی حیثیت سے انتظامی معاملات دیکھتا تھا۔ وہ ہمہ وقت مصروف رہنے والا آدمی تھا۔ اگر بائیں ہاتھ سے دستخط کر رہا ہوتا تو اُس کے دائیں ہاتھ میں موبائل فون ہوتا۔ جب مارک سے اُس کی ملاقات ہوئی، اُس وقت بھی وہ کچھ لکھ رہا تھا اور فون اُس کے کان سے لگا تھا۔ اِس ادارے سے ایک ڈرائیور اور دو لوڈر بھی وابستہ تھے جن سے پہلے دن مارک کی ملاقات نہیں ہوسکی۔ اُس وقت وہ نہیں جانتا تھا کہ تبدیلی کا طوفان اُس کی زیست کے دروازے پر دستک دے رہا ہے۔

دو ہفتے قبل وہ ''جسٹس'' پہنچا تھا۔ اور اپنا سامان ہوٹل میں رکھنے کے بعد سیدھا دفتر کی جانب چلا آیا جہاں اُس کا پہلا سامنا 65 سالہ ایلکس ہیسلے سے ہوا جو سیکورٹی انچارج تھا اور اِس کے بیلٹ سے ''ریوالور کیس'' بندھا ہوا تھا۔

وہ ملاقات زیادہ خوش گوار نہیں رہی۔ ترش لہجے میں بات کرنے والے اُس بیزار شخص نے بہ مشکل مارک کو اندر داخل ہونے دیا۔ اُس کے گال پر برسوں پُرانے زخم کا سیاہ نشان تھا جس پر وہ دورانِ گفتگو انگلی پھیرتا رہتا۔ بعد کے دنوں میں بھی مارک کے لیے اپنی آنکھوں میں ناپسندیدگی قائم رکھی۔

بخوں کہ مارک ایک خوش مزاج نوجوان تھا اس لیے جلد ہی دفتری ساتھیوں سے گھل مل گیا۔ اُس روز مارک نے مسٹر کوزی کے ساتھ اُس سائٹ کا دورہ کیا جہاں کارخانہ لگانے کا منصوبہ ترتیب دیا جا رہا تھا۔ کوزی کی سیاہ رنگ کی شیورلیٹ خاصی آرام دہ تھی، تاہم اُس کے ڈیش بورڈ میں رکھے ریوالور کو دیکھ کر وہ تھوڑا بے چین ہوگیا۔

''گھبرانے کی بات نہیں ہے۔'' کوزی نے ڈیش بورڈ سے لائسنس بک نکال کر اُسے بند کرتے ہوئے کہا۔ ''میں اپنی حفاظت کے لیے اسے ہمیشہ ساتھ رکھتا ہوں۔''

''کبھی اسے استعمال کرنے کی نوبت تو نہیں آئی۔'' مارک نے مسکراتے ہوئے سوال کیا۔

''ابھی تک تو نہیں!'' کوزی نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ قصبہ خاصا پُرسکون ہے، میں یہیں پیدا ہوا، تاہم ملازمت کے سلسلے میں میری زندگی کا بڑا حصہ ریاست کے نسبتاً غیر آباد اور ویران علاقوں میں گزرا جہاں حالات کسی بھی وقت بگڑ سکتے ہیں۔ گو کہ گزشتہ آٹھ برس سے میں اپنے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آبائی قصبے ہی میں مقیم ہوں، تاہم پُرانی عادات آسانی سے پیچھا نہیں چھوڑتی۔"

سائٹ سے لوٹنے کے بعد وہ باقی ساتھیوں سے گپ شپ کرتا رہا۔ سارہ اور رونی نے اسے شہر کے بارے میں معلومات فراہم کی۔

"اگرچہ یہ نیویارک نہیں ہے، لیکن یہاں بھی تفریح کے اچھے مقامات ہیں، سنیما ہیں، ڈانس کلب ہیں جہاں تم اچھا وقت گزار سکتے ہو۔" مارکیز نے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

"اور ہاں، اگر تم چاہو تو آج رات ہمارے ساتھ ڈنر کر سکتے ہو۔ ہم اکثر ساتھ ڈنر کرتے ہیں جس کے بعد ہم دریا کے کنارے چہل قدمی کے لیے نکل جاتے ہیں۔" سارہ کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

"لیکن چہل قدمی کے دوران میں اُن کے ساتھ نہیں ہوتا۔" مارکیز نے کہا چہرے پر شرارت ناچ رہی تھی۔

"وہ کیوں؟" مارک نے خوش دلی سے سوال کیا۔

"وہ دراصل..." اُس نے کن انکھیوں سے سارہ کو دیکھتے ہوئے کہا، جس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا، رونی خود کو بڑی معصومیت سے لاتعلق ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"بھئی، رات میں خاصی ٹھنڈ ہوتی ہے، کہیں زکام نہ ہو جائے بس اِسی خوف سے میں دریا کے کنارے چہل قدمی سے اجتناب برتتا ہوں۔" مارکیز مسکرا رہا تھا۔

اصل میں رونی اور سارہ ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے اور مارکیز کباب میں ہڈی نہیں بننا چاہتا تھا، اس لیے وہ ڈنر کے بعد ان سے الگ ہو جاتا۔ وہ باقاعدگی سے ڈانس کلب جایا کرتا تھا۔ مارک کو بھی وہی "ولووبروک بال..." (ڈانس روم) لے کر گیا، جہاں ایک سرد رات اُس کی ایک پُراسرار ہستی سے ملاقات ہوئی، جس نے مارک اور مارکیز، دونوں ہی کی زندگیوں کو یکسر بدل دیا۔

☆☆☆

دو ہی روز میں مارک اپنے دفتری ساتھیوں میں یوں گھل مل گیا جیسے وہ برسوں سے اُنہیں جانتا ہو۔ اُس نے سارہ، رونی اور مارکیز کے ساتھ ڈنر بھی کیا اور دریا کے کنارے، چاند کی روشنی میں چہل قدمی بھی کی۔ اُسے پہلی بار بڑے شہروں کی گہما گہمی کے نقصانات کا اندازہ ہوا۔

اِس دوران کمپنی کے ڈرائیور اور لوڈر سے بھی ملاقات ہوئی۔ کوزی سے بھی میٹنگز ہوئیں جس میں کارخانہ لگانے کے حوالے سے تکنیکی معاملات کا باریک بینی سے جائزہ لیا گیا۔

اس نے سوفٹ ویئر سیکشن سے وابستہ پلسکن اور ڈونلڈ کی دعوت پر ایک دن اُن کے ساتھ لنچ کیا۔ وہ دونوں متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے خوش مزاج نوجوان تھے۔ کمپنی کی طرف سے اُسے ایک پُرانے ماڈل کی جیپ فراہم کر دی گئی، جو اُس تین ماہ کے پراجیکٹ کے دوران اُس کے زیرِ استعمال رہتی۔

اِس دوران اُس نے اپنے دفتری ساتھیوں سے دنیا جہان کی باتیں کیں۔ مارک نے اُنہیں نیویارک کے تجربات اور وہاں کی تیز رفتار زندگی کی بابت بتایا۔ انہوں نے اپنے آبائی وطن کی کہانیاں سنائی۔ ایک دوسرے کے خاندان کے بارے میں معلومات حاصل کی۔ الغرض چند ہی روز میں مارک اُس ٹیم کا حصہ بن گیا تھا لیکن اب بھی ایک شخص کی نظروں میں اُس کے لیے ناپسندیدگی قائم تھی۔

☆☆☆

"بہت ہو گیا نوجوان، اب ذرا ڈانس فلور پر پاؤں تھرتھرانے کے بارے میں بھی سوچو!" ایک روز مارکیز نے اُس کا بازو دباتے ہوئے کہا۔

"ارادے نیک ہیں!" جواباً مارک مسکرایا۔

اور پھر ایک روز انہوں نے بال روم کا رُخ کیا۔ بارہ ہزار کی آبادی والے اِس شہر کے مرکزی ڈانس کلب سے اُسے زیادہ امید نہیں تھی، تاہم تجربہ خوشگوار رہا۔ وہاں نئے لوگوں سے بھی ملاقات ہوئی۔ اس رات وہ ڈانس فلور پر موسیقی کی لے پر کافی دیر تک ناچتا رہا۔

اِس تجربے کو دہرانے کے لیے وہ دونوں، دو روز بعد دوبارہ "ولووبروک بال روم" کی جانب نکل گئے۔

یہ 12 فروری کی ٹھٹھرتی ہوئی رات تھی اور مارک کا جسٹس ٹاؤن میں نواں دن تھا۔ وہ یہاں کے سرد، خاموش ماحول اور سادہ، مگر خوش ذائقہ کھانوں کا عادی ہو گیا تھا، یوں لگنے لگا تھا کہ وہ یہاں بہ آسانی کئی برس رہ سکتا ہے، تاہم تقدیر کو یہ منظور نہیں تھا۔

اس رات ڈانس فلور پر ناچتے گاتے ہوئے، بیئر حلق میں اُتارتے ہوئے اور مارکیز سے اِدھر اُدھر کی گفتگو کرتے ہوئے، اُس کی نظریں بال روم کے ایک کونے میں خاموش بیٹھی، سفید لباس میں ملبوس لڑکی پر ٹکی رہیں۔ مارکیز نے اُس کی آنکھیں پڑھ لیں۔

"آگے بڑھو دوست!" اس نے مارک کی حوصلہ افزائی کی۔

"تم اسے جانتے ہوں؟" اس نے سوال کیا۔

"نہیں، پر یہ جانتا ہوں کہ انتہائی خوب صورت ہے!" اس نے قہقہہ لگایا۔

چند منٹوں بعد وہ اس میز کے سامنے کھڑا تھا جہاں نیلی آنکھوں اور گھنگریالے بالوں والی وہ دل کش لڑکی ماحول سے لاتعلق بیٹھی تھی۔

"ہیلو!" مارک نے مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ یوں چونکی، جیسے نیند سے جاگی ہو اور آنکھوں میں حیرت لیے مارک کو تکنے لگی۔ مارک کے لیے ردِعمل پریشان کن تھا لیکن جلد ہی لڑکی کی آنکھوں سے جھلکتے تناؤ نے دم توڑ دیا۔

"ہائے، میرا نام مارک ہے!" اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

"میری!" اُس نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ ہاں، اُس کا ہاتھ سرد تھا، توقع سے زیادہ... لیکن مارک کو اُس وقت اِس کا چنداں احساس نہیں ہوا۔

کچھ دیر بعد وہ ڈانس فلور پر رقص کر رہے تھے۔

مارکیز آنکھوں میں شرارت لیے اُنہیں دیکھتا رہا۔ جب مارک اپنے اور میری کے لیے بیئر لینے آیا، تب مارکیز نے سوال کیا کہ وہ ڈانس روم کے شور سے نکل کر کسی پُرسکون مقام کا رُخ کیوں نہیں کرتا؟

"کون سی پُرسکون جگہ؟"

"دریا کنارے اور کہاں!" مارکیز نے آنکھ ماری۔

کچھ دیر بعد میری اور مارک ڈانس روم سے باہر، سرد فضا میں سانس لے رہے تھے۔

"کیا میں آپ کو لفٹ دے سکتا ہوں؟" مارک نے سوال کیا۔

"ہاں، ضرور!" اُس کی آواز میں اداسی مگر بھرپور ٹھہراؤ تھا۔

"تم کہاں جاؤ گی؟" اس نے سوال کیا۔

"تم شہر میں نئے ہو، اگر میں ایڈریس بتا بھی دوں تو کیا تم مجھے وہاں پہنچا دو گے؟" میری کی آنکھوں میں شریر مسکراہٹ تھی۔ اور یہ پہلا موقع تھا، جب اُس کی اداس کیفیت میں کچھ تبدیلی واقع ہوئی۔

"اگر تم راہنمائی کرتی رہیں تو کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔" وہ اس جواباً مسکرایا۔

وہ دونوں جیپ میں سوار ہو گئے جو آرچرا ایونیو کی جانب بڑھنے لگی۔ اِس دوران مارک اُسے اپنی بابت بتاتا رہا۔ میری خاموشی سے سُنتی رہی۔

رات کے گیارہ بج رہے تھے اور سڑکیں سنسان تھیں۔ سڑک کے دائیں جانب دریا بہہ رہا تھا جس کی روانی چاندنی رات میں بیک وقت پُرسکون اور پراسرار معلوم ہوتی تھی۔ مارک نے میری سے اُس کے بارے میں پوچھنے کی کوشش کی، لیکن وہ مسکراہٹ کے ساتھ اُسے ٹال گئی۔

اب وہ قبرستان کی جانب بڑھ رہے تھے، جن سے وابستہ پُراسرار کہانیوں سے مارک یکسر لاعلم تھا، اس لیے جب میری نے قبرستان کے نزدیک گاڑی روکنے کی درخواست کی، وہ زیادہ حیران نہیں ہوا۔

"ہم پھر کب مل سکتے ہیں؟" اُس نے دروازہ کھول کر نیچے اُترتی اس حسین لڑکی سے سوال کیا جس کے چہرے پر ایک بار پھر اداسی غالب آگئی تھی۔

"جلد..." اُس نے دھیرے سے کہا۔

دونوں کے درمیان خاموشی دَر آئی۔ وہ اپنی جھیل سی آنکھوں سے اسے تکتی رہی۔ مارک بھی اُس کی پُرکشش شخصیت کے زیرِ اثر خاموشی سے اُس کی نیلی آنکھوں میں جھانکتا رہا۔

"کیا صورتحال بوس و کنار کے لیے سازگار ہے؟" وہ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا۔

اور تب میری کے لب وا ہوئے۔ "تم مجھ سے جُڑے ہوئے ہو، مجھے تمہارا ہی انتظار تھا۔" اس جملے کی ادائیگی نے اس کے چہرے کو یکسر بدل دیا، اب اس پر پُراسرار سکون پھیلا تھا۔

"کیا مطلب!" وہ چونکا وہ یقینی طور پر اس جملے کی توقع نہیں کر رہا تھا۔

"ہم جلد ملیں گے۔" میری یہ کہہ کر گاڑی سے دور ہٹ گئی اور دیوار کے ساتھ مخالف سمت میں چلنے لگی۔ مارک گاڑی کے عقبی آئینے میں اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا پھر اُس نے گاڑی آگے بڑھا دی، تاہم چند ساعت بعد، جب اس نے میری کی ایک اور جھلک ذہن میں محفوظ کرنے کی خواہش کے تحت عقبی آئینے پر نظر ڈالی، وہ ٹھٹکا گیا۔

تاریکی میں ڈوبی سڑک ویران تھی۔

بریک چرچرائے۔ اس نے گاڑی روک دی مڑ کر دیکھا، میری وہاں نہیں تھی۔ وہ گاڑی سے اُتر گیا، چاروں طرف نظریں دوڑائیں لیکن تلاش ناکام گئی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ٹھیک اس لمحے اسے احساس ہوا کہ وہ قبرستان کے مرکزی دروازے کے سامنے کھڑا ہے جہاں سے چاند کی روشنی میں قبروں کے کتبے جھانک رہے ہیں۔

☆☆☆

اندھیرے نے اُسے گھیر رکھا تھا اور وہ بے حس و حرکت زمین پر پڑا تھا۔ اس نے کھڑے ہونے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا اور تب اس کے چہرے پر کسی غیر مرئی وجود کا ٹھنڈا، بدبودار سانس ٹکرایا۔

اُسے لگا، جیسے کوئی سینے پر سوار، اس کی گردن دبانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اور تب اسے سرگوشی سنائی دی۔ ''تم مجھ سے بچھڑے ہوئے ہو، مجھے تمہارا ہی انتظار تھا!''

اچانک اس تاریک دنیا میں بائیں جانب سے چُبھتی ہوئی روشنی داخل ہوئی۔ ایک کریہہ آواز گونجی۔ مارک نے گردن موڑ کر اس جانب دیکھا، ایک ٹرک کی خوفناک ہیڈ لائٹس اس کی جانب بڑھ رہی تھیں۔ ہارن اور بریک چرچرانے کی وحشت ناک آوازیں نزدیک آتی جا رہی تھی اور پھر ٹرک موت کی صورت اس کے سر پر آن پہنچا۔

مارک کی آنکھ کھل گئی۔ اس کا پورا بدن پسینے سے شرابور تھا۔ اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی، وہ ہوٹل کے کمرے میں تھا۔ کھڑکی سے خفیف سی روشنی کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ اس نے کھڑے ہونے کی کوشش کی لیکن تاکہ کمزوری کے باعث ناکام رہا۔

اُس نے ایک ڈراؤنا خواب دیکھا تھا جس نے اعصاب جھنجھوڑ دیے تھے۔ یہ اس کی پچیس سالہ زندگی میں پہلا موقع تھا جب ایک برے خواب نے اُسے خوف کی کھائی میں دھکیل دیا ہو۔ چند ساعتوں بعد اُس کے حواس بحال ہوئے۔ وہ کھڑا ہو گیا۔

اس نے کھڑکی سے پردہ ہٹا دیا۔ کمرے میں روشنی بھر گئی۔ دن بیدار ہو چکا تھا۔ اُس نے سڑک پر رواں دواں زندگی پر نظر ڈالی اور خوف کو گھٹتا ہوا محسوس کیا۔ شاور لینے کے بعد وہ خود کو بہتر محسوس کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ ہوٹل کے ہال میں بیٹھا ناشتا کر رہا تھا۔ اس وقت تک خوف کا اثر زائل ہو چکا تھا۔

آدھے گھنٹے بعد وہ دفتر پہنچ گیا۔ گاڑی پارک کرنے کے بعد جب وہ داخلی حصے کی جانب بڑھ رہا تھا، اُسے کسی کی بڑبڑاہٹ سنائی دی۔ یہ ایلکس ہیسلے تھا جس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

اُس کے سامنے کمپنی کا ڈرائیور بائیں ہاتھ میں اسکرڈرائیور لیے ٹرک کا بونٹ کھولے کھڑا تھا، جس کی مسکراہٹ ایلکس کے غصے میں اضافہ کر رہی تھی۔ وہ مزید کچھ کہتا لیکن مارک کو اپنی طرف آتا ہوا دیکھ کر مڑا اور اپنے کیبن کی جانب چلا گیا۔ وہ خاصا ناراض تھا اور بائیں ہاتھ کا انگوٹھا تیزی سے زخم کے نشان پر پھیر رہا تھا۔

''کیا ہوا؟'' مارک نے بحرین سے تعلق رکھنے والے بوعزیزی سے دریافت کیا۔

''کچھ نہیں، انکل تھوڑے ناراض ہیں شاید۔'' نوجوان مسکرایا۔

''معلوم ہوتا ہے کہ غصے کے تیز ہیں۔'' مارک نے کہا۔

''ہاں!'' بوعزیزی نے ایلکس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا جو اب اپنے کیبن کا دروازہ کھول کر کے اندر داخل ہو رہا تھا۔

''دراصل... وہ مجھے ٹرک ڈرائیونگ پر لیکچر دے رہے تھے۔''

''اچھا!'' مارک نے حیرت کا اظہار کیا۔ ''لیکن مسٹر ایلکس کا ڈرائیونگ سے کیا تعلق؟''

''کبھی یہ خود بھی ڈرائیور تھے، تاہم پھر یک دم انہوں نے اس کام سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور شکاگو چلے گئے۔ ابھی دو تین برس قبل ہی لوٹے ہیں۔ بس بونٹ کھلا دیکھ کر بڑے میاں کو پُرانے سبق یاد آ گئے۔'' اُس نے شوخ لہجے میں کہا۔ ''تھوڑے کھسکے ہوئے ہیں، یہیں نزدیک ہی دریا کے کنارے اُن کا کاٹیج ہے۔ وہیں اپنے آخری دن گزار رہے ہیں۔''

بوعزیزی سے بات کرنے کے بعد جب مارک دفتر میں داخل ہوا، اُس نے فضا میں تیرتی پریشانی کو پا لیا۔

''خیریت تو ہے دوستو؟'' اُس نے ہال میں موجود ساتھیوں سے سوال کیا۔

''اوہ ہاں، خیریت تو ہے مگر...'' رونی نے کہا۔ ''دراصل مارکیز کل رات سے غائب ہے۔''

''کیا؟'' مارک چلایا۔

''ہاں۔'' سارہ بولی۔ ''وہ کل رات گھر نہیں لوٹا تھا۔ اُس کے ڈیڈ کا فون آیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ شاید وہ رات کسی دوست کے ہاں ٹھہر گیا ہو اور آج سیدھا دفتر آ گیا ہو لیکن وہ یہاں نہیں آیا۔''

''اُس کا فون بھی بند ہے۔'' ڈونلڈ نے کہا۔

''کل رات تو وہ میرے ساتھ تھا، بال روم میں!'' مارک کے لہجے میں حیرت تھی۔ ''تقریباً گیارہ بجے میں نے اُسے الوداع کہا تھا، ہمیں بال روم سے معلومات حاصل کرنی چاہیے۔''

''میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔'' کوزی نے کہا۔ اس نے باقی لوگوں کو بے فکر رہنے کی نصیحت کی اور باہر کی جانب چل دیا۔

''میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں مسٹر کوزی۔'' مارک نے کہا۔

''اوہ... ٹھیک ہے۔ چلیں۔'' اُس کے بائیں ہاتھ کی انگلی میں چابی کا گچھا تھا جسے وہ اضطرابی انداز میں ہلا رہا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ نیند میں ڈوبے بال روم کے منیجر کے سامنے کھڑے تھے۔

''دیکھیں مسٹر کوزی، بال روم کل رات ایک بجے بند ہوا۔ اس وقت صرف چار افراد موجود تھے، اور مارکیز ان میں نہیں تھا۔ مطلب ہے کہ وہ پہلے ہی جا چکا تھا۔''

''ہو سکتا ہے کہ آپ کو پہچاننے میں غلطی ہوئی ہو۔'' کوزی نے کہا۔

''نہیں، میں مارکیز کو اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ وہ اس وقت بال روم میں موجود نہیں تھا۔ اور آپ...'' اس مارک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''... آپ غالباً کل رات پہلی بار کلب آئے تھے۔ میری یادداشت بہت اچھی ہے۔ مارکیز آخری گھنٹوں میں وہاں نہیں تھا۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ گیارہ ساڑھے گیارہ بجے وہاں سے نکل گیا تھا۔''

''اوہ... ہمیں دیگر اہل کاروں سے بات کرنی چاہیے، شاید انہوں نے اسے دیکھا ہو۔'' مارک نے تجویز پیش کی۔

انہوں نے فرداً فرداً تمام اہل کاروں سے بات کی۔ ان میں سے بیشتر نے کم و بیش وہی سب کہا جو منیجر نے انہیں بتایا تھا، تاہم سیکورٹی گارڈ کی کہانی نے مارک کو تحیر کی دنیا میں دھکیل دیا۔

''اوہ ہاں مارکیز... ہاں ہاں مجھے یاد ہے، وہ اور آپ ساتھ آئے تھے شاید۔'' اس نے ذہن پر زور ڈالتے ہوئے کہا۔ ''جہاں تک مجھے یاد ہے، وہ... ہاں، وہ ایک لڑکی کے ساتھ باہر نکلا تھا، اندازاً گیارہ سوا گیارہ بجے۔''

''لڑکی... کیا تم اسے پہچانتے ہو؟'' کوزی نے سوال کیا۔

''اوہ نہیں... وہ کوئی نئی لڑکی تھی، میں نے پہلی بار اسے دیکھا... وہ تھکی ہوئی اور بیزار معلوم ہوتی تھی... اس نے سفید رنگ کا لباس پہن رکھا تھا، اس کی آنکھیں غالباً نیلی تھیں، اور بال...''

''میری!'' مارک کے منہ سے نکلا اور کوزی نے چونک کر اُسے دیکھا۔

دونوں ہی حیرت کے شدید احساس کے زیرِ اثر تھے۔

☆☆☆

''اس نے جو حلیہ بتایا وہ... وہ بالکل میری کا ہے جس سے کل رات میری ملاقات ہوئی تھی... پر مارکیز... کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔ اوخدایا!'' مارک اپنا سر تھامے بیٹھا تھا۔ اُس کے ساتھی آنکھوں میں پریشانی اور استعجاب لیے اُسے تک رہے تھے۔

وہ اور کوزی چند منٹ قبل ہی دفتر لوٹے تھے۔ واپسی کے سفر میں جب مارک نے کوزی کو کل رات ایک انجان لڑکی سے ہونے والی ملاقات کی رُوداد سنائی تو وہ خاموش ہو گیا۔ اور اس وقت بھی وہ زبان پر تالا ڈالے بیٹھا تھا۔

''ممکن ہے کہ وہ دونوں الگ الگ لڑکیاں ہوں، انتہائی حد تک مشابہ!'' سارہ نے اپنا خیال پیش کیا۔

''نہیں، اتنی مشابہت، بھلا یہ کس طرح ممکن ہے؟'' مارک کے منہ سے سسکی نکلی۔

''کیا اس لڑکی کا مارکیز کی گمشدگی سے کوئی تعلق ہو سکتا ہے؟''

رونی سے سوال کیا۔

''ہمیں پولیس میں رپورٹ کرنی چاہیے۔'' ڈونلڈ بولا۔

''وہ میری تھی، ریزوریکشن میری!'' یہ کوزی کی سرد آواز تھی جس نے انہیں چونکا دیا۔

وہ کسی گہری سوچ میں گم کئی ساعت خاموش رہا جیسے کچھ بھولا ہوا یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔

''ریزوریکشن میری...'' پلکسن بڑبڑایا۔ ''اوہ... میں نے اپنے ڈیڈ سے اس بارے میں سنا تھا، ہاں یہ شاید کسی لڑکی کی بدروح...''

''ہاں تم نے ٹھیک سنا۔'' کوزی نے بلند لیکن لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں کہا۔ آنکھوں میں اداسی اور غیر یقینی تھی۔

''کیا آپ اس بارے میں کچھ جانتے ہیں؟'' سارہ نے سوال کیا۔

''تھوڑا بہت!'' وہ متذبذب معلوم ہوتا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اُس نے گہرا سانس سینے میں اُتارا۔ اب کمرے میں کوزی کی آواز گونج رہی تھی اور وہ ایک ایسی کہانی بیان کر رہا تھا جسے اس قصبے کے باسی تقریباً بھلا بیٹھے تھے۔

اُس نے بتایا کہ اس کہانی کا تعلق ''ولوو بروک بال روم'' ہی سے ہے، جو ماضی میں ''اوہنری بال روم'' کہلاتا تھا۔ یہ وہی مقام ہے، جہاں مارکیز کو آخری بار دیکھا گیا۔ بیسویں صدی کی چوتھی اور پانچویں دہائی میں اس کلب سے ریزوریکشن قبرستان جانے والی سڑک ''آرچر ایونیو'' پر سفر کرنے والے کئی افراد نے ایک پُراسرار لڑکی کو لفٹ دینے کی رپورٹس دیں۔ عینی شاہدین کے مطابق اس لڑکی کی آنکھیں نیلی اور بال گھنگریالے تھے اور اس نے سفید رنگ کا لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ اس کے پیروں میں رقص کے دوران پہنے جانے والے مخصوص جوتے ہوتے تھے جن کا استعمال اب متروک ہوگیا ہے۔ لڑکی قبرستان کی بالکل قریب گاڑی روکنے کی درخواست کرتی اور دروازے کی جانب بڑھتی ہوئی غائب ہوجاتی۔

کوزی نے اپنے گرد بیٹھے نوجوان پر نظر ڈالی، جن کے چہروں پر حیرت سجی تھی۔ اُس نے بات آگے بڑھائی:

''کسی زمانے میں اس کہانی کا بہت چرچہ تھا۔ پیشہ ورانہ طور پر بھوتوں اور بدروحوں پر تحقیق کرنے والے کئی افراد نے اس قصبے کا رخ کیا۔ ان ہی میں سے رچرڈ کرو بھی تھا جس سے میری کی کئی برس قبل یونیورسٹی میں ملاقات ہوئی تھی۔ اس نے اپنی ریسرچ کے بعد جو رپورٹ شائع کی، اس میں دعویٰ کیا کہ اُس پراسرار لڑکی کے نظر آنے کے تین درجن سے زاید واقعات پیش آچکے ہیں۔ اس رپورٹ کی تیاری کے لیے اس نے مختلف افراد کے انٹرویوز بھی کیے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ میری کو دیکھنے کے واقعات کی اصل تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے مگر بیشتر معاملات میں لوگوں نے اس بدروح کے بارے میں بات نہ کرنے ہی میں عافیت جانی اور خاموشی اختیار کرلی جس کا بنیادی سبب ایک نوجوان محقق جیمز ڈکنز کی پُراسرار موت تھی جو شکاگو کوسٹی سے آیا تھا اور کئی سرد راتوں میں قبرستان کے اردگرد منڈلاتا ہوا دیکھا گیا تھا۔ اور ایک دن... ٹاؤن پولیس کو دریا میں تیرتی اس کی لاش ملی۔ پوسٹ مارٹم کے بعد پتا چلا، اس کی موت ڈوبنے سے ہوئی تھی تاہم قاتل کبھی گرفتار نہیں ہوا۔''

وہ سب تجسس اور حیرت کے زیرِ اثر ایک دوسرے کو تکتے رہے۔

''ہمیں پولیس کو مطلع کرنا ہوگا۔'' بلآخر سارہ نے کہا۔

☆☆☆

پولیس نے رپورٹ درج کرنے کے فوراً بعد کارروائی شروع کردی۔ اس کیس کی ذمے داری سارجنٹ وارن کے پاس تھی، جو ایک تجربہ کار شخص تھا۔ اس نے پہلے مارکیز کے گھر کا رُخ کیا۔ اس کے والدین اور قریبی دوستوں کے بیانات لیے اور پھر اس کی ڈائریاں اور ای میلز چیک کیں۔

اس روز دفتر میں ہر شخص پر اداسی طاری رہی، کسی کا کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ رات کے وقت مارک نے سارہ اور رونی کے ساتھ ڈنر کیا۔ سب چپ، بے دلی سے لقمے چبا رہے تھے۔

ڈنر کے بعد رونی نے آرچر ایونیو پر گشت کرنے کی تجویز پیش کی جس میں موہوم سی امید تھی کہ شاید معجزاتی طور پر اُن کا مارکیز سے سامنا ہوجائے۔ وہ ایک گھنٹے تک بال روم کے قریبی علاقے میں گشت کرتے رہے لیکن کوئی سراغ نہیں ملا۔ اس دوران وہ قبرستان کے قریب سے بھی گزرے جہاں پہنچتے ہی مارک کو یکبارگی پژمردگی کا احساس ہوا لیکن اس نے اپنی پریشانی چھپائے رکھی۔

''وہ یہیں اُتری تھی۔'' اس نے خود سے کہا۔ ''وہ ضرور یہیں ہوگی۔''

اسی اثناء میں رونی کو کوزی کی کال موصول ہوئی، جس نے انہیں فوری اُس کے گھر پہنچنے کے لیے کہا۔

کچھ دیر بعد گاڑی کوزی کے گھر کی جانب دوڑ رہی تھی جو دریا کے کنارے تھا۔

اس دوران سارہ نے مارک سے اس لڑکی کی بابت دریافت کیا جس سے گزشتہ رات ملاقات ہوئی تھی۔

''کیا تم نے اُس میں کوئی عجیب بات نوٹ کی تھی؟''

''ہاں!'' مارک نے دھیرے سے کہا۔ ''وہ خاصی مضمحل معلوم ہوتی تھی، اس کا رویہ بھی عجیب تھا۔ بے شک وہ بلا کی پُرکشش تھی، تاہم یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ شدید غم میں مبتلا ہو۔''

کچھ دیر بعد وہ کوزی کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے جس کی کھڑکی سے چاند اندر جھانک رہا تھا۔ کوزی کھڑکی کے پاس ہی کھڑا دریا کو گھور رہا تھا۔

''گھر آنے کے بعد میں نے پُرانے اخبارات چیک کیے جو میں اپنے شوق کی خاطر محفوظ کرلیا کرتا تھا۔'' اس نے دھیرے سے کہا۔ ''اسی دوران جیمز ڈکنز کے بارے میں

شائع ہونے والی اخباری رپورٹس پڑھنے کا موقع ملا، تب مجھے یاد آیا کہ اب سے چالیس برس قبل ایک پولیس اہل کار بل گرام اس کیس پر کام کر رہا تھا جس نے اس قتل کو سیریل کلنگ کی وارداتوں سے جوڑا تھا۔ بعد میں اس بارے میں کئی خبریں شائع ہوئیں۔ ان دنوں ریزوریکشن میری کو دیکھے جانے کی خبریں زوروں پر تھیں لیکن کچھ عرصے بعد بالکل خاموشی چھا گئی اور یہ کیس بند کردیا گیا۔'' وہ چند ساعت خاموش رہا پھر اُس کی آواز گونجی۔ ''اہم بات یہ ہے کہ سارجنٹ بل گرام ابھی زندہ ہے۔''

اُس نے مڑ کر تینوں کی طرف دیکھا جو ہمہ تن گوش تھے۔

''وہ یقینی طور پر اب اسی برس کا ہوگیا ہوگا۔ ہمیں اس سے ملاقات کرنی ہوگی۔ شاید وہ کچھ معلومات فراہم کرسکے۔''

''بالکل یہ ضروری ہے۔'' مارک نے کہا۔

''میں تمہیں ریزوریکشن میری کے بارے میں بھی مزید کچھ بتانا چاہتا ہوں۔ دراصل اس ٹاؤن کے لوگ اس کہانی کو تقریباً بھول چکے ہیں، میرے ذہن سے بھی یہ قصہ محو ہوگیا تھا لیکن آج مارکیز کی گمشدگی کے بعد میں خود کو پھر اسی مقام پر کھڑا محسوس کررہا ہوں، تجسس سے بھرا ہوا بس مسئلہ یہ ہے کہ اب اس میں پریشانی کا بھی اضافہ ہوگیا ہے۔''

کوزی نے انہیں بتایا کہ آرچر ایونیو کے اردگرد نظر آنے والی بدروح کو کئی برس بعد ''میری'' کا نام دیا گیا۔ اس حوالے سے کئی روایات ملتی ہیں جس میں ایک زیادہ مقبول ہے جس کے مطابق ایک خوبصورت لڑکی نے اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ اوہنری کے بال روم میں رات کا بڑا حصہ ناچتے گاتے گزارا۔ پھر کسی بات پر اُن کا جھگڑا ہوگیا اور وہ ناراض ہوکر بال روم سے نکل آئی۔ اگرچہ رات سرد تھی لیکن اپنے بیزار کن محبوب کے ساتھ وقت ضائع کرنے کی بجائے اُس نے اِس بات کو ترجیح دی کہ وہ ٹھٹھرتی ہوئی اپنے گھر تک جائے۔

اُس نے بال روم سے نکل کر آرچر روڈ پر چلنا شروع کردیا۔ وہ زیادہ دور نہیں گئی تھی کہ دھند میں لپٹی اُس رات ایک گاڑی بے قابو ہوگئی اور لڑکی پر چڑھ گئی۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اس کا ڈرائیور موقع سے فرار ہوگیا۔ اُس کے والدین کو اسی رات لاش مل گئی۔ انہوں نے اپنی پیاری بیٹی کو سفید لباس اور جوتوں ہی میں ریزوریکشن قبرستان میں دفنا دیا۔

ابن عباس کی یہ روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نظر بد کے لیے حضرت حسنؓ اور حضرت امام حسینؓ پر یہ دعا پڑھتے تھے۔

اعیذ کما بکلمات اللہ التامتہ من کل شیطان وھامتہ ومن کل عین لامتہ

(میں تم کو اللہ کے بے عیب کلمات کی پناہ میں دیتا ہوں ہر شیطان اور موذی سے اور ہر نظر بد سے) (بخاری، مسند احمد، ترمذی و ابن ماجہ)

مرسلہ: نعمان خان عطاری، فیصل آباد

''پولیس اُس کے قاتل کو گرفتار نہیں کرسکی اور چند روز بعد اس سڑک پر ایک پُراسرار لڑکی کو دیکھنے کے واقعات رونما ہونے لگا۔'' کوزی یہاں تک کہہ کر خاموش ہوگیا۔

کمرے میں سناٹا چھایا تھا اور چاند کھڑکی سے جھانک رہا تھا۔

☆☆☆

دوسرے روز سارجنٹ وارن ایک حیران کن اطلاع کے ساتھ ان سے ملا۔

اس نے بتایا کہ مارکیز کی ذاتی ڈائری کی آخری انٹری میں ایک گھنگریالے بالوں والی ایسی خوب رو لڑکی سے ملاقات کا ذکر ملتا ہے جس سے اس کا سامنا غالباً تین روز قبل دریا کے کنارے ہوا تھا اور اس نے اپنی تحریر میں اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ وہ اُس سے دوبارہ ملنا چاہتا ہے۔

سارجنٹ نے انہیں بتایا کہ یہ تحریر 12 فروری کی شام لکھی گئی تھی اور اُسی تاریخ کو وہ پُراسرار طور پر غائب ہوگیا۔

''شاید یہ وہی لڑکی ہو مسٹر مارک، جس سے آپ کی ملاقات ہوئی تھی۔'' وارن نے کہا۔ ''میرے خیال میں ہمیں مارکیز تک پہنچنے کے لیے اس لڑکی کو تلاش کرنا ہوگا۔ کیا آپ اس کا اسکیچ بنوا سکتے ہیں۔''

''اوہ ہاں...'' مارک نے کہا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے میری کا چہرہ گھوم رہا تھا۔

''گڈ، آپ نے اُسے آرچر روڈ پر قبرستان کے قریب اتارا تھا۔ میں فوراً ایک ٹیم روانہ کرتا ہوں جو اردگرد کے علاقوں میں پوچھ گچھ کرے گی۔''

آدھے گھنٹے بعد مارک ایک آرٹسٹ کے سامنے بیٹھا میری کا اسکیچ بنوا رہا تھا اور اس دوران اس کے کانوں میں اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی سرد آواز گونج رہی تھی۔ ”تم مجھ سے بجڑے ہوئے ہو۔“

اس روز بھی دفتر میں اداسی طاری رہی۔ ہر شخص پریشان تھا۔

کوزی نے اُنہیں بتایا کیا کہ اس کا بل گرام سے رابطہ ہوگیا ہے اور اس نے آج شام ملاقات کے لیے وقت لیا ہے۔

”ہم دفتر سے سیدھے وہیں جائیں گے تیار رہنا۔“ اُس نے مارک، سارہ اور رونی کو مطلع کیا۔

☆☆☆

”وہ وحشت ناک دن تھے!“

80 سالہ بل نے کافی کا گھونٹ لیا اور کھڑکی کے باہر پھیلی تاریکی پر نظریں ٹکا دیں۔

اس وقت کوزی کی سربراہی میں وہ تینوں اس سابق پولیس اہل کار سے ملنے آئے تھے جو بیماریوں میں گھرا موت کی جانب بڑھ رہا تھا۔

”جیمز کا کیس میری زندگی کا مشکل ترین مرحلہ تھا۔“ بل نے گہرا سانس لیا۔ ”میں نے ہر ممکن کوشش کی لیکن قاتل تک نہیں پہنچ سکا، تاہم اس دوران میرا سامنا حیران کُن واقعات سے ہوا۔“

وہ چاروں خاموش رہے۔ بل کہتا رہا ”میرے اور اُس زمانے کے چند اعلیٰ افسران کے علاوہ کوئی نہیں جانتا کہ اُن دِنوں، اس خاموش اور پُرسکون ٹاؤن میں ایک نہیں بلکہ تین قتل ہوئے تھے۔“

”کیا؟“ کوزی کے منہ سے نکلا۔

”ہاں۔“ بل نے کافی کا گھونٹ لیا۔ ”جیمز کی لاش ملنے کے بعد ہم نے تیراک دریا میں اتارے، تاکہ آلۂ قتل تلاش کرسکیں، اور کیا تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ ہمیں کیا ملا؟ ایک اور لاش!“

”اوہ!“ اُن کے منہ سے نکلا۔

”ہماری تحقیقات نے صورتِ حال کو مزید اُلجھا دیا۔ مقتول کا تعلق شگاگو سے تھا جو چند روز قبل سپر ہائی وے پر سفر کرتے ہوئے لاپتا ہوگیا تھا۔ آخری اطلاعات کے مطابق اِس کی منزل یہ ٹاؤن نہیں تھا، وہ کہیں اور جا رہا تھا لیکن اپنی منزل تک نہیں پہنچ سکا۔ اس کی گمشدگی کے دو روز بعد اس کی لاش دریا سے ملی، تاہم ہم اس کی گاڑی کا سراغ نہیں لگا سکے۔“

”کیا شہریوں کو اس بارے میں مطلع نہیں کیا گیا تھا؟“ کوزی نے سوال کیا۔

”نہیں۔“ بل نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اس وقت کے میئر نے یہ فیصلہ کیا کہ اس اطلاع سے عوام میں سراسیمگی پھیل جائے گی۔ سو ہم نے چپ رہنے میں عافیت جانی اور قاتل کی تلاش جاری رکھی، تاہم صورتِ حال اس وقت بگڑ گئی جب ایک رات گشت کے دوران پولیس کو ریزوریکشن قبرستان کے نزدیک ایک ادھیڑ عمر شخص کی لاش ملی جسے چاقو کے وار سے ہلاک کیا گیا تھا۔“

کمرے میں خاموشی طاری تھی اور باہر تاریکی دبیز ہوتی جا رہی تھی۔

بل نے کافی ختم کرنے کے بعد کپ میز پر رکھ دیا اور ایک بار پھر ماضی میں کھو گیا۔ ”مجھے یقین تھا کہ یہ کوئی سیریل کلر ہے۔ میں نے اس ضمن میں خاصی تحقیق کی، لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔“

”کیا ان واقعات کی کڑیاں میری کی روح سے جوڑی جاتی ہیں؟“ سارہ نے سوال کیا۔

”میری بریگوی...“ بل نے دھیرے سے کہا۔ ”میں بھوتوں پر یقین نہیں رکھتا تھا اس لیے پُراسرار حالات میں قتل ہونے والے ان تین افراد کے کیس پر کام کرتے ہوئے میں نے مافوق الفطرت کہانیوں کو درخورِ اعتناء نہیں جانا، تاہم میری...“

وہ چند ساعت خاموش رہا جیسے کسی تلخ یاد کے روبرو ہونے کی اذیت کو زائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر سرد آہ بھری اور آنکھوں میں غیر یقینی لیے بل نے اُنہیں بتایا میری بریگوی ایک پولش لڑکی تھی۔ رپورٹس کے مطابق 1934 میں اس کی گاڑی کو ایک حادثہ پیش آیا۔ گاڑی ریلوے ٹریک سے گزرتی ہوئی ٹرین سے ٹکرا گئی اور وہ لڑکی گاڑی کی ونڈ اسکرین توڑتی ہوئی باہر جا گری۔

”یہ واقعہ ویکر ڈرائیو کے علاقے میں پیش آیا۔ یہ کہانی اُس داستان سے مختلف ہے جس کا تعلق آرچر ایونیو کے علاقے سے ہے۔ یہ عام خیال ہے کہ میری بریگری ایک حقیقی کردار ہے کیوں کہ ریزوریکشن قبرستان میں ایک قبر پر میری بریگوی کی تختی بھی لگی ہے۔“

بل نے مزید بتایا کہ اس حوالے سے ایک اور روایت بھی ملتی ہے جس کے مطابق ریزوریکشن قبرستان کے اردگرد دِکھائی دینے والی بدروح دراصل پولینڈ سے تعلق رکھنے والی

بارہ سالہ انا نورکس ہے جو حضرت مریم سے عقیدت کی وجہ سے اپنے نام کے ساتھ ”میری“ لگایا کرتی تھی۔ اسے رقص کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ اپنی سالگرہ والے دن اُس نے اپنے والد سے ضد کی کہ وہ اسے اوہنری کے علاقے میں واقع بال روم میں لے جائیں۔ واپسی میں اُن کی گاڑی کو حادثہ پیش آ گیا جس میں لڑکی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی۔

”اِس روایت پر یقین کرنے والوں کے مطابق دراصل انا نورکس ہی وہ بھوت ہے جسے قبرستان میں ٹہلنے والی میری تصور کیا جاتا ہے، تاہم جن لوگوں نے میری نامی پراسرار لڑکی کے ساتھ رقص کرنے کا دعویٰ کیا ہے کہ اُن کا کہنا ہے کہ اس کی عمر بارہ سال سے زیادہ تھی اور وہ اٹھارہ سے بیس کے درمیان تھی۔ بہرحال، یہ طے ہے کہ اِس کہانی کا تعلق ایسی لڑکی سے ہے جو حادثہ میں ہلاک ہوگئی اور ’میری‘ کے نام سے مشہور ہوگئی۔ واضح رہے کہ 1983ء سے قبل کبھی اس علاقے میں کسی بدروح کو دیکھنے کی اطلاع نہیں آئی۔“ اتنا کہنے کے بعد بل خاموش ہوگیا۔ تھکن اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے ایک سگریٹ سلگایا۔

چند ساعت سب خاموش رہے، پھر کوزی کی آواز گونجی۔

”مسٹر بل، آپ نے کہا کہ آپ بھوتوں پر یقین نہیں رکھتے، لیکن برائے مہربانی میرے سوال کا جواب دیجیے، کیوں کہ یہ زندگی اور موت کا معاملہ ہے۔ آپ کافی عرصے تک اس کیس پر کام کرتے رہے اور پھر اچانک اسے بند کر دیا گیا، کیوں؟ اس کا کیا سبب رہا؟ اور پھر... کیا کبھی آپ کا کسی پُراسرار مخلوق سے سامنا ہوا؟“

اس سوال نے بل کے چہرے کا رنگ بدل دیا۔ وہ خاصا مضطرب نظر آ رہا تھا۔ اس نے کھڑکی کے باہر سڑک پر پھیلی تاریکی پر نظریں گاڑے رکھیں۔ پھر اس نے گہرا سانس لیا۔

”یہ ایک راز ہے، جو گزشتہ چالیس برس سے میرے سینے میں دفن ہے۔ ہاں، میں نے اس شہر کی سڑکیں کھنگالیں، خصوصاً رات کی تاریکی میں، تاکہ اس راز سے پردہ اُٹھا سکوں۔ اور ایک رات... ہاں ایک اداس، ڈری ہوئی لڑکی سے میری ملاقات ہوئی۔ جیسا کہ میں نے کہا، میں بھوتوں پر یقین نہیں رکھتا تھا، میں سمجھتا تھا کہ یہ کسی سیریل کلر کی کارستانی ہے، سو میں نے تجسس کے زیرِ اثر اُس لڑکی کو قبرستان کے نزدیک اُتارنے کے بعد بڑی خاموشی سے اُس کا تعاقب کیا اور دبے پاؤں قبرستان میں داخل ہوگیا...“ وہ چھت کو گھور رہا تھا، آنکھوں میں خوف تھا، وحشت تھی۔

”پھر کیا ہوا؟“ مارک نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے سوال کیا۔

”وہاں کوئی نہیں تھا، کوئی بھی نہیں۔“ بل نے چھت کو گھورتے ہوئے جواب دیا، اس کی آواز لرز رہی تھی۔ ”لیکن... دوسرے ہی روز، جب میں اُس پُراسرار لڑکی کی تلاش میں گھر سے نکلنے کو تھا، مجھے خبر ملی کہ میری بیٹی... میری بیٹی کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے۔ شراب کے نشے میں دھت ایک ڈرائیور نے اس کی سائیکل کو ٹکر ماری تھی، جس سے وہ شدید زخمی ہوگئی۔ میں اپنی بیٹی سے بہت محبت کرتا تھا، اس واقعے نے مجھے جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ صحت یاب ہونے تک میں اس کیس سے لاتعلق رہا، اور...“ وہ ایک لمحے کے لیے ٹھہرا۔ صاف محسوس ہوتا تھا کہ وہ کچھ چھپا رہا ہے۔

”...جب میں لوٹا، مجھے پتا چلا کہ میئر کی جانب سے اس کیس کو بند کرنے کے براہِ راست احکامات جاری کیے گئے ہیں۔“

”لیکن کیوں؟“ کوزی نے سوال کیا۔

”کوئی نہیں جانتا۔ احکامات جاری کرنے کے ٹھیک دو گھنٹے بعد اُنھوں نے خودکشی کرلی تھی!“ اُس نے ڈرامائی لہجے میں کہا۔

”اوہ!“

☆☆☆

مارکیز کے بارے میں تاحال کوئی اطلاع نہیں ملی تھی اور اس سانحے نے اس زندہ دل نوجوان سے جڑے ہر فرد کو پریشانی میں مبتلا کر دیا تھا۔ دفتری سرگرمیاں معطل ہوگئی تھیں۔

مارک خود کو اس کا ذمّے دار سمجھتا تھا۔ نہ جانے اسے کیوں ایسا لگ رہا تھا کہ حقیقتاً مصیبت اس کے تعاقب میں تھی جو مارکیز سے چمٹ گئی۔ اس نے اس معمے کو حل کرنے کے لیے تحقیق کرنے کا فیصلہ کیا اور ٹاؤن لائبریری کا رُخ کیا جہاں وہ کئی گھنٹوں تک پُرانے اخبارات کھنگالتا رہا۔ وہیں اس کا سامنا ریزوریکشن قبرستان کے مرکزی دروازے کی سلاخوں کے ساتھ پیش آنے والے عجیب و غریب واقعے سے ہوا جس میں اس بدروح کی انگلیوں کے نشانات ملے تھے۔

اپنی نوعیت کا یہ انوکھا اور ڈراؤنا واقعہ بیس برس قبل پیش آیا تھا۔ اس وقت میری کے نظر آنے کے واقعات کافی گھٹ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چکے تھے اور برسوں بعد ہی اس قسم کی کوئی خبر سامنے آئی تھی لیکن اگست 1976ء کی ایک رات کچھ بے حد عجیب رونما ہوا۔

دراصل صبح ریزورریکشن قبرستان کے مرکزی دروازے کی سلاخوں پر نہ صرف جلنے کے پُراسرار نشانات ملے بلکہ دیکھنے والوں نے یہ بھی دیکھا کہ وہ عجیب ڈھنگ سے مُڑی ہوئی تھیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا، جیسے ان پر بہت زیادہ طاقت استعمال کی گئی ہو۔ اگرچہ قبرستان کی انتظامیہ نے دعویٰ کیا کہ ایک ٹرک رات کے اندھیرے میں دروازے سے ٹکرا گیا تھا اور یہ نشانات اسی حادثے کی دین ہیں لیکن لوگوں نے اس بیان پر یقین نہیں کیا۔ ان سلاخوں کی تصاویر بھی اُتاری گئیں۔ قبرستان انتظامیہ نے سلاخوں کی درستی کی خاصی کوشش کی جو ناکام گئی اور بالآخر انہیں بدلوانا پڑا۔

اس واقعے کے بعد میری کی کہانی دوبارہ گردش میں آ گئی۔ قبرستان کے گرد بسنے والوں کو یقین تھا کہ میری کی روح اپنے قاتل کی تلاش میں ہے اور گزشتہ رات سلاخیں تھام کر آہ و بکا کر رہی تھی۔ قبرستان کے قریب بسنے والے چند افراد نے یہ دعویٰ بھی کیا کہ انہوں نے اُس رات درد بھری چیخیں سنی تھیں۔

76ء میں پیش آنے والے اس واقعے سے تین برس قبل 73ء میں یہ خبر گردش کرنے لگی تھیں کہ میری کا بھوت یہ ٹاؤن چھوڑ چکا ہے اور اب وہ شگاگو کے نائٹ کلبس میں نظر آنے لگا ہے، تاہم اس واقعے کے بعد ایک بار پھر ٹاؤن کے باسی عدم تحفظ کا شکار ہو گئے۔

دو برس خاموشی چھائی رہی، پھر 78ء میں ایک اور عجیب واقعہ پیش آیا جب آرچر ایونیو پر دوڑتی گاڑی کے ڈرائیور کو یک دم سڑک کے درمیان ایک لڑکی کھڑی نظر آئی۔ اس نے بریک دبا دیا اور بہ مشکل حادثے کو ٹالا، لیکن اس وقت اسے حیرت ہوئی، جب گاڑی رکنے کے بعد اُس نے دیکھا کہ سڑک پر کوئی بھی نہیں تھا۔

مارک کی نظر سے جنوری 79ء کے اخبار میں شائع ہونے والے مشہور کالم نگار بلی گیسٹ کی تحریر بھی گزری جس میں اس نے ایک ٹیکسی ڈرائیور ریلف کی کہانی کا تجزیہ کیا جس کی ٹیکسی میں ایک سرد رات ایک لڑکی آ کر رروڈ پر واقع ایک چھوٹے سے شاپنگ سینٹر سے سوار ہوئی تھی جس کے بال بھورے تھے۔ ڈرائیور کے بہ قول چند کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ اچانک اُچھل پڑی اور کہنے لگی، بس یہاں

"ٹیکسی روک دو، بس یہاں! ڈرائیور نے گھبرا کر بریک پر پاؤں رکھ دیا اور چاروں طرف دیکھا لیکن اسے وہاں کوئی مکان نظر نہیں آیا۔ اُس نے لڑکی سے دریافت کیا کہ اُس کا مکان کہاں ہے؟

اس سوال کے جواب میں اس نے ہاتھ اُٹھا کر بائیں جانب اشارہ کیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا، وہاں اندھیرے کے سوا کچھ نہیں تھا اور جب وہ واپس لڑکی کی جانب مڑا، اُس کے بدن میں کرنٹ دوڑ گیا۔ لڑکی غائب ہو چکی تھی، حالاں کہ دروازہ بند تھا۔

کالم نگار نے یہ خیال پیش کیا کہ وہ ڈرائیور سچ بول رہا تھا اور یہ لڑکی میری ہی تھی۔

اخبارات کھنگالنے کے دوران مارک کا رونی اور سارہ سے بھی رابطہ رہا۔

وہ لائبریری میں بیٹھا رہا، یہاں تک کہ شام اُتر آئی۔

یک دم اسے احساس ہوا کہ وہ لائبریری میں بالکل تنہا ہے۔ اس نے چونک کر لائبریرین کی کرسی کی جانب دیکھا، جو خالی تھی۔ شاید وہ اُٹھ کر کہیں چلا گیا تھا۔ وہ دوبارہ اخبارات میں گم ہو گیا۔

اس اثناء اچانک ہوا کا تیز جھونکا اس کی پشت سے ٹکرایا۔ اس نے نظر اُٹھا کر دیکھا، کھڑکی کا پٹ کھلا ہوا تھا۔ وہ اُسے بند کرنے کے لیے آگے بڑھا، تاہم کھڑکی کے پاس پہنچ کر ٹھٹک گیا۔

کھڑکی کے نیچے، سفید لباس میں ملبوس، نیلی آنکھوں والی، گھنگریالے بالوں والی ایک لڑکی کھڑی تھی جس کے ماتھے سے خون بہہ رہا تھا۔

وہ میری تھی!

"میری!" مارک نے اُسے پکارا۔ جواب ندارد! لڑکی کے اداس چہرے پر کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ "میری!" اس نے پھر پکارا۔

اچانک اسے لگنے لگا جیسے دنیا گھوم رہی ہے۔ اُس کا سر چکرا رہا تھا۔ وہ بے انتہا کمزوری محسوس کر رہا تھا۔

"میری..." اس نے پھر اُسے پکارا، اور تب اس لڑکی نے نظر اُٹھا کر اسے دیکھا اور مارک کو لگا جیسے اس کی دھڑکن رک گئی ہو۔

"سر آپ ٹھیک تو ہیں ناں؟" اُسے عقب سے آواز سنائی دی اور وہ چونک اُٹھا۔

وہاں لائبریرین کھڑا حیرت سے اُسے تک رہا تھا۔ اُس

نے پلٹ کر سڑک کی جانب دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا!

☆☆☆

"میئر نے کرپشن کے الزامات کی وجہ سے خودکشی کی تھی۔" کوزی نے کہا۔

صبح کا وقت تھا۔ وہ سب دفتر میں بیٹھے تھے۔ مارکیز کو لاپتا ہوئے چار روز گزر گئے تھے۔

"تو پھر ان احکامات کا کیا معاملہ تھا؟" سارہ نے سوال کیا۔

"کچھ کہہ نہیں سکتے، شاید ذہنی دباؤ میں یہ احکامات جاری کیے گئے تھے۔ غالباً میئر کی موت کا میری کی کہانی سے کوئی تعلق نہیں۔ میں اس ضمن میں میئر کی بیٹی، نکول سے بھی بات کر چکا ہوں۔"

ابھی یہ گفتگو جاری تھی کہ کوزی کا فون تھرتھرانے لگا۔ دوسری طرف سارجنٹ وارن تھا جس نے انہیں مطلع کیا کہ مارکیز کی تلاش کے معاملے میں تھوڑی بہت پیش رفت ہوئی ہے۔

دراصل جس رات مارکیز گم ہوا تھا، ایک بس ڈرائیور نے دریا کے کنارے ایک سفید رنگ کی مزدا کھڑی دیکھی تھی۔ یہ مارکیز ہی کی گاڑی تھی۔

سارجنٹ نے مزید بتایا کہ بس ڈرائیور کے بیان کے مطابق نوجوان اس وقت تنہا تھا اور گاڑی سے ٹیک لگائے، دریا کی طرف منہ کیے کھڑا تھا۔

"ہم اُسے جلد تلاش کر لیں گے۔" یہ سارجنٹ کے آخری الفاظ تھے۔

کوزی نے فون بند کرنے کے بعد سارجنٹ سے ہونے والے گفتگو سے انہیں آگاہ کیا۔

"میرے ذہن میں ایک سوال ہے؟" رونی نے کہا۔ "اگر ہم یہ مان لیں کہ میری کی بدروح واقعی بھٹک رہی ہے، تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس سے ملنے والوں کے ساتھ کیا واقعہ بیتتا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ اب تک جو کہانیاں ہمارے سامنے آئیں، ان میں اس بدروح نے کسی شخص کو نقصان نہیں پہنچایا، ایسے میں مارکیز کی گمشدگی عجیب معلوم ہوتی ہے۔"

"تمہارا کیا کہنا ہے مارک؟ تمہاری بھی تو اس سے ملاقات ہوئی تھی۔" سارہ نے سوال کیا۔

مارک یوں چونکا، جیسے نیند سے جاگا ہو۔ "اوہ... میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ میرا مطلب ہے کہ اس ملاقات کے بعد کچھ عجیب ضرور رونما ہوا، تاہم... میں یقین سے نہیں کہہ سکتا..."

ٹھیک ان لمحات میں کوزی کے بائیں ہاتھ میں موجود فون پھر تھرتھرانے لگا۔ فون کان سے لگاتے ہی اس کے اوسان خطا ہو گئے۔

"میرے... میرے گھر میں آگ... لگ گئی ہے۔" اُس نے اٹکتے ہوئے کہا۔ "مجھے جانا ہوگا۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔

رونی، سارہ اور مارک نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا، وہ تذبذب کا شکار تھے۔ اُن کے درمیان خاموشی اور خوف رینگ رہا تھا۔

"ہمیں کسی ایسے شخص سے ملاقات کرنی ہوگی جس نے میری کو دیکھا ہو۔ شاید وہ ہماری کچھ مدد کر سکے۔" بالآخر مارک نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔

"میں کوزی کے گھر کی طرف جاتا ہوں۔ اُسے یقینی طور پر مدد کی ضرورت ہوگی۔" رونی بھی کھڑا ہو گیا۔ "سارہ تم مارک کے ساتھ رہو۔"

آدھے گھنٹے بعد وہ ٹاؤن لائبریری میں بیٹھے اخبارات کھنگال رہے تھے۔ انہوں نے تلاش کا آغاز 96ء سے کیا۔ پھر گزشتہ برسوں کے اخبارات کا ماہ بہ ماہ جائزہ لیتے رہے۔ سات برس کے اخبارات میں کوئی خبر نہیں ملی، لیکن پھر 89ء کے اخبارات میں انہیں دو تحریریں نظر آئیں۔ ایک تحریر ڈاکٹر والس نامی ماہر نفسیات کی تھی جس نے ریزورریکشن میری کے موضوع پر خاصی تحقیق کی تھی۔

اُس نے یہ خیال پیش کیا کہ یہ کہانی دراصل Hitch.hiker، یعنی مختلف شاہراہوں پر لفٹ لے کر سفر کرنے والے سیاحوں سے جُڑی داستانوں کی کڑی ہے۔ ان افراد کے بارے میں امریکا میں کئی کہانیاں مشہور ہیں۔ کوئی انہیں مافیا کا حصہ تصور کرتا ہے، کوئی لٹیرا، کوئی دیوانہ، تاہم حقیقتاً اُن میں سے بیشتر سیاحت کے شوقین ہپی ٹائپ نوجوان ہوتے ہیں۔

اِن کہانیوں کی جڑیں ڈیڑھ سو برس پُرانی ہیں، تاہم ان کے عروج کا دور وہی ہے، جب ہپی ازم امریکی نوجوانوں میں تیزی سے مقبولیت حاصل کر رہا تھا۔ والس نے یہ خیال پیش کیا کہ میری کی کہانی بھی Hitch.hiker کی داستانوں کی بگڑی ہوئی شکل ہے، کیوں کہ بیشتر واقعات میں لفٹ مانگنے والی لڑکی ٹیکسی یا گاڑی سے اچانک غائب ہو جاتی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے۔ غالباً یہ داستان اب شکاگو کے کلچر کا حصہ بن گئی ہے۔ اس ضمن میں اس نے امریکا کی دیہی علاقوں میں مشہور مزید کہانیوں کو بہ طور مثال پیش کیا۔

یہ تحریر اہم ضرور تھی، لیکن اس وقت مارک اور سارہ کے لیے بے معنی تھی، انہوں نے اخبارات کا جائزہ لینے کا عمل جاری رکھا اور چند ساعت بعد اُن کے سامنے جولیان پامک کا ایک طویل مضمون تھا۔

جولیان ایک انجینئر تھا جو شوقیہ پُراسرار معاملات و واقعات کی تحقیق کیا کرتا تھا۔ اس مضمون میں اس نے ریزوریکشن میری کی کہانی پر بحث کی۔ مضمون میں عینی شاہدین کے بیانات کے علاوہ چند ایسے واقعات بھی تھے جن سے اب تک مارک لاعلم تھا۔ مثلاً اس نے اپنے مضمون میں لکھا کہ اس بدروح کو دیکھنے والے کئی افراد کو چھوٹے بڑے نقصانات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس ضمن میں چند مثالیں بھی دیں۔ ساتھ ہی اس نے یہ تھیوری پیش کی کہ ریزوریکشن میری ایک ایسی رقص کی دلدادہ لڑکی کی کہانی ہے جس کے ساتھ غالباً اجتماعی زیادتی کی گئی تھی جس کے بعد اُسے قتل کردیا گیا اور اُس کی لاش کو خاموشی سے قبرستان میں دفنا دیا گیا۔

اُس کی دوسری تھیوری یہ تھی کہ یہ ایک ایسی لڑکی کی روح ہے، جو ایک شرابی ڈرائیور کی کار یا ٹرک کا نشانہ بنی تھی۔ گاڑی کی خوفناک ٹکر نے اُسے دریا کی جانب اُچھال دیا جو اس کی قبر بن گیا اور اُس کے اہلِ خانہ اس کی لاش ڈھونڈنے میں ناکام رہے۔

جولیان کا خیال تھا کہ یہ واقعہ 1950ء سے 1955ء کے درمیان پیش آیا تھا۔ اس نے اس ضمن میں ایک پیشہ ور رقاصہ، میری گیٹس کا ذکر بھی کیا جو اُن ہی برسوں میں لاپتا ہوئی، جس کی بابت پولیس نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ اُسے قتل کردیا گیا ہے لیکن اس کی لاش کبھی نہیں ملی۔

حیرت انگیز طور پر جولیان اُن پُراسرار ہلاکتوں کے واقعے سے واقف تھا جو چالیس سال قبل پیش آئے تھے۔ اُس نے یہ معلومات خفیہ ذرائع سے حاصل کی تھیں۔ اُس نے اس بات پر زور دیا کہ تینوں اموات کا تعلق کسی نہ کسی شکل میں ریزوریکشن میری ہی سے تھا۔ اس نے میئر کی خودکشی کو بھی مشکوک قرار دیا اور یہ اشارہ کیا کہ قتل کے پُراسرار واقعات میری گیٹس کی گمشدگی کے بعد پیش آنا شروع ہوئے۔

اس طویل مضمون میں اور بھی کئی تفصیلات تھیں، تاہم اس میں سب سے اہم ایک ڈائری کا اقتباس تھا۔ یہ تحریر سڈنی نامی ایک شخص کی تھی جو اُس نے فروری 89ء میں لکھی تھی۔ اُس نے ریزوریکشن قبرستان کے نزدیک میری کو دیکھنے کا دعویٰ کیا تھا۔

''میں نے وہ منظر دیکھا، جس نے میری دنیا اتھل پتھل کردی... قبرستان کی دیوار کے ساتھ، کہرے کے درمیان ایک لڑکی ننگے پاؤں چہل قدمی کر رہی تھی۔ میرے دل نے خود سے سوال کیا، کیا یہ وہی ہے؟ جب کار بالکل اس کے برابر سے گزری، میرے بدترین اندیشوں نے حقیقت کا روپ دھارلیا... ہاں وہ 'میری' ہی تھی، ایک بدروح! سرد لہر ریڑھ کی ہڈی سے ہوتی ہوئی میرے سر تک پہنچ گئی، ذہن ماؤف ہوگیا۔ ٹھیک اُس لمحے کسی نے میرے کان میں سرگوشی کی، ایک نام لیا... اور میں لرز گیا۔ اچانک... سڑک پر ایک چنگھاڑتا ہوا ٹرک نمودار ہوا، ہیڈلائٹس کی روشنی سے میری آنکھیں چندھیا گئیں... ٹرک تیزی سے میری گاڑی کی جانب بڑھ رہا تھا اور عین میرے سر پر پہنچ کر یک دم غائب ہوگیا، یوں لگا جیسے وہ ہوا میں تحلیل ہوگیا ہو۔ میں نے بہ مشکل گاڑی کو سنبھالا۔ اور تب مجھے رنج والم میں ڈوبی ایک چیخ سنائی دی، میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھے گا، خوف سے میرا جسم کھل رہا تھا، اب نہ وہاں کوئی ٹرک تھا اور نہ کوئی لڑکی، فقط سنّاٹا تھا! مجھے جولیان سے بات کرنی ہی ہوگی!'' سارہ نے با آواز بلند وہ اقتباس پڑھا۔

اس مضمون نے مارک کو سوچنے کے نئے پہلو دیے۔

''ہمیں جولیان سے ملاقات کرنی چاہیے۔'' اُس نے تجویز پیش کی۔ ''وہ ہماری مدد کرسکتا ہے۔''

مارک نے اُس اخبار کے دفتر سے رابطہ کیا جس میں جولیان کا مضمون شائع ہوا تھا۔ نمبر لینے کے بعد اُس نے جولیان کا نمبر ڈائل کیا۔

ایک گھنٹے بعد وہ اُس 65 سالہ پُروقار، پُراعتماد شخص کے سامنے بیٹھے تھے جو سلجھے ہوئے لہجے میں بات کرتا تھا۔

وہ گفتگو کرنے کے لیے تیار تھا۔ اس نے ریزوریکشن میری کے موضوع پر کھل کر بات کی اور بتایا کہ اِن واقعات کی جڑیں پرانی ہیں۔ بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں بدروح دیکھنے کے واقعات کی ابتدائی رپورٹس سامنے آئیں۔ اُس وقت تک میری بریگوی اور انا نورکس ہلاک ہو چکی تھیں جن سے اُس بے نام لڑکی کی کہانی بھی جُڑ گئی جو او ہنری کے بال روم سے نکل کر پیدل گھر کی جانب آرہی تھی

...کے قریب کار حادثے کا شکار ہوگئی۔

...ہم آپ کو یہ یاد رکھنا ہوگا کہ اُس وقت میری کی ...دیکھنے کے جو واقعات پیش آرہے تھے، اُن میں ...جانی نقصان نہیں ہوا، لیکن یہ چھٹی دہائی تھی، جس ...ان واقعات نے نیا اور خوفناک رخ اختیار کرلیا، ...ایک اس کا براہِ راست تعلق میری گیٹس کے واقعے ...

...تو خاصی پیچیدہ صورتِ حال ہے۔'' مارک نے کہا۔

''بے شک، کئی چیزیں گڈمڈ ہوگئی ہیں، اس گتھی کو سلجھانا ...نہیں۔ شاید آپ یقین نہ کریں لیکن اس مسئلے کو حل ...کے لیے میں نے مافوق الفطرت قوتوں میں دلچسپی ...والوں، روحیں بلوانے والوں سے بھی رابطہ کیا۔ وہیں ...پتا چلا کہ اِس معاملے کا تعلق چھٹی دہائی میں پیش ...آنے والے حادثے سے ہے۔ میری گیٹس کی لاش نہیں مل سکی'' اس نے کہا۔

''اور اس کی روح بھٹک رہی ہے۔'' مارک نے کچھ ...ہوئے کہا۔

''ہوسکتا ہے ایسا ہی ہو، شاید وہ اپنے قاتل کو کیفرِ کردار ...پہنچانا چاہتی تھی۔'' جولیان نے تائید کی۔

''میرے اندازے کے مطابق سڈنی وہ آخری شخص تھا ...جس سے اُس کا سامنا ہوا!''

''یہ اندازہ درست ہے۔'' جولیان نے اثبات میں سر ...ہلاتے ہوئے کہا۔ ''سڈنی میرا دوست تھا۔ ہم کالج کے ...زمانے سے ساتھ تھے، تاہم وہ تعلیم مکمل نہیں کرسکا۔ میں ...ٹرانسپورٹیشن کے کاروبار میں اُس کا پارٹنر بھی رہا۔ برسوں قبل ...اس نے دو ٹرک خریدے تھے جن پر فصلیں اور پھل لوڈ ...کر کے دوسرے شہروں میں بھیجے جاتے تھے، تاہم اچانک وہ ...اس کام سے کنارہ کش ہوگیا اور اپنے آبائی پیشے کھیتی باڑی کی ...جانب لوٹ آیا۔ دونوں ٹرک اونے پونے داموں میں ...فروخت کردیے۔ اب سے ٹھیک سات برس قبل ایک رات ...اس کا ریزوریکشن میری سے سامنا ہوا اور اب تمہارا دوست ...مارکیز لاپتا ہوگیا۔ میرے نزدیک صورتِ حال خاصی گمبھیر ...ہے۔''

''مسٹر جولیان...'' مارک کے لہجے میں اُلجھن کا عنصر ...تھا۔ ''کیا سڈنی نے کبھی آپ کو بتایا کہ وہ ٹرانسپورٹیشن کے ...کاروبار سے کیوں کنارہ کش ہوا؟ میرا مطلب ہے کہ میری ...کی موت بھی ایک ٹرک حادثے ہی میں ہوئی تھی اور سڈنی نے موت سے قبل لکھی جانے والی تحریر میں کسی موضوع پر آپ سے بات کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ کیا آپ کو اندازہ ہے کہ وہ آپ کو کیا بتانا چاہتا تھا؟''

''نہیں! یہ راز اس کے ساتھ ہی دفن ہوگیا۔'' جولیان نے سرد لہجے میں کہا۔

☆☆☆

اب انہیں سڈنی کی بیوہ ہیلن سے ملنا تھا، لیکن رات کافی بیت چکی تھی، آج ملاقات ممکن نہیں تھی۔ مارک نے سارہ کو اس کے گھر ڈراپ کردیا اور اپنی کار ہوٹل جانے والے راستے پر ڈال دی۔

اس دوران اس کا رونی سے بھی رابطہ ہوا جس نے اسے بتایا۔ ''خوش قسمتی سے آتش زدگی کے واقعے میں کوئی بڑا جانی یا مالی نقصان نہیں ہوا۔ کوزی کے اہل خانہ محفوظ ہیں۔ آگ شارٹ سرکٹ کی وجہ سے لگی تھی جس پر فائر بریگیڈ کے عملے نے بہ آسانی قابو پالیا۔''

اس نے مارک کو مطلع کیا کہ سارجنٹ وارن کی ٹیم اُس مقام پر چھان بین کر رہی ہے جہاں آخری بار مارکیز کی گاڑی دیکھی گئی تھی۔

رونی سے بات کرنے کے بعد مارک نے گہرا سانس لیا۔ اُسی بے تحاشا تھکن محسوس ہورہی تھی۔

''آج کا دن طویل تھا!'' اُس نے خود سے کہا لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ دن ابھی ختم نہیں ہوا، بہت کچھ ہونا باقی ہے۔

ٹھیک ان لحات میں، جب وہ مارکیز کی بابت سوچ رہا تھا، مخالف سمت سے آنے والی سفید مزدا، بڑے ہی پراسرار ڈھنگ سے انتہائی نزدیک سے گزری۔ اس کے ذہن میں جھماکا ہوا۔ وہ مارکیز ہی کی کار تھی۔ اس نے فوراً عقبی شیشے پر نظر ڈالی۔ وہ گاڑی تیزی سے دور ہٹتے ہوئے اندھیرے میں غائب ہوگئی۔ وہ تذبذب کا شکار تھا اور یہ فیصلہ نہیں لے پا رہا تھا کہ اُسے کیا کرنا چاہیے۔

اچانک اس کے اوسان خطا ہوگئے۔ سڑک کے بیچوں بیچ کوئی موجود تھا، ایک ہیولا، ایک سایہ... اس کی کار کے انتہائی قریب!

مارک نے پوری قوت سے بریک دبا دیا لیکن بہت دیر ہوچکی تھی... حادثے کو ٹالنا ممکن نہیں تھا... کار بے حد نزدیک پہنچ گئی تھی... ٹکر یقینی تھی... اور تب، اُن مختصر ترین لحات میں جب بریک چرچرانے کی خوفناک آواز نے ہر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

احساس کو نگل لیا تھا، گاڑی کے اسٹیرنگ کو سنبھالتے ہوئے مارک نے دیکھا، وہ میری ہی تھی!

اس کی نیلی آنکھیں ونڈ اسکرین کو چیرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانک رہی تھی، اُس کے ماتھے سے خون بہہ رہا تھا جو تازہ معلوم ہوتا تھا۔

گاڑی جھٹکے سے رک گئی۔ مارک کا چہرہ بری طرح اسٹیئرنگ سے ٹکرایا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا، اُسے لگا جیسے وہ اپنے حواس کھو بیٹھا ہو۔ اور تب، اچانک اُسے اپنے کان میں سرگوشی سنائی دی، قوت سماعت جواب دے چکی تھی، وہ سمجھنے سے قاصر رہا، سرگوشی پھر سنائی دی۔

''اے...لے...س...ہے...''

اُس نے بہ مشکل آنکھیں کھولیں۔ ناک سے خون بہہ رہا تھا، گال پر بھی زخم آیا تھا۔ وہ کمزوری محسوس کر رہا تھا، تاہم اپنے زخموں کی پروا نہ کرتے ہوئے اُس نے مڑ کر سڑک پر نظر ڈالی جو سنسان تھی، بالکل سنسان!

''وہ مجھے کوئی پیغام دینا چاہتی ہے۔'' اُس نے خود سے کہا اور دُکھتے ہوئے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔

☆☆☆

وہ سونے کی کوشش کر رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

''اس وقت کون ہوسکتا ہے؟'' اس نے تعجب سے سوچا۔ دروازہ کھولنے سے پہلے احتیاطاً پوچھا۔ ''کون ہے؟''

''دروازہ کھولو، میں ہوں رونی!'' باہر سے آواز آئی۔

اس نے فوراً دروازہ کھول دیا۔ رونی آنکھوں میں تھکن لیے باہر کھڑا تھا۔

''تم اس وقت؟'' اس نے سوال کیا۔

''ہاں...'' وہ آگے بڑھا اور اپنے بدن کو ایک کرسی پر پھیلا دیا۔ پھر چونکا۔ ''یہ تمھارے چہرے کو کیا ہوا؟'' وہ مارک کے چہرے پر لگے زخم کو دیکھ کر گھبرا گیا۔

''کچھ نہیں، ایک چھوٹا سا حادثہ پیش آیا تھا۔'' مارک نے دھیرے سے کہا۔ ''تم بتاؤ، اِس وقت یہاں کیسے آنا ہوا؟''

''ایک اہم خبر تھی، میں یہیں سے گزر رہا تھا، سوچا تمھیں خود مطلع کر دوں۔''

''کیا ہوا؟'' اُس کی دھڑکن تیز ہوگئی۔

''مارکیز کی گاڑی مل گئی ہے۔''

''کیا؟'' وہ چلّایا۔ ''اور مارکیز؟''

''اُس کا ابھی پتا نہیں چلا لیکن امید ہے کہ پولیس اُسے جلد ڈھونڈ لے گی۔ میں بھی اسی مقام سے آرہا ہوں، جہاں سے گاڑی ملی ہے۔'' اس نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔

''گاڑی کہاں سے ملی؟'' اس نے سوال کیا۔

''وہ دریا کے کنارے ہی ملی۔'' رونی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''وہ ایک غیر آباد ٹکڑا ہے، صرف چند مکانات ہیں۔ علاقے میں زیادہ چہل پہل نہیں، گاڑی کو پہاڑ میں کسی ایک کوہ میں کھڑا کیا گیا تھا، اِسی وجہ سے اُسے ڈھونڈنے میں اتنی دقت ہوئی۔''

''یہ علاقہ بال روم سے کتنا دُور ہے؟'' مارک نے پوچھا۔

''یہ بال روم سے تھوڑے فاصلہ پر ہے۔ تمھیں یاد ہے، ہم مسٹر کوزی سے ملنے گئے تھے، تب ہم سڑک کے ایک موڑ 'ڈرائیو کٹ' سے گزرے تھے، جو بالکل دریا کنارے تھا، بس وہیں۔'' اُس نے مارک کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''حیرت انگیز بات ہے، ہم اُسے کہاں کہاں ڈھونڈتے رہے اور اُس کی گاڑی مسٹر کوزی کے گھر سے چند فرلانگ کے فاصلے پر ملی!''

''واقعی حیرت انگیز!'' مارک کے منہ سے نکلا۔

''خیر، امید ہے کہ پولیس جلد مارکیز کو ڈھونڈ لے گی، بشرط کہ وہ زندہ ہو!'' رونی نے گہرا سانس لیا۔

''مجھے یقین ہے کہ وہ زندہ ہے۔'' مارک نے دھیرے سے کہا۔

''کاش ایسا ہی ہو، میں چلتا ہوں، اپنا خیال رکھنا۔'' یہ کہتے ہوئے رونی کھڑا ہو گیا۔

مارک نے اُسے دروازے تک چھوڑا جس کے بعد وہ بستر پر گر گیا۔

کہانی اختتام کی جانب بڑھ رہی تھی!

☆☆☆

وہ صبح کملائی ہوئی تھی اور اچھی خبر ملنے کی امید نہیں تھی۔ سڈنی کی اداس بیوہ ہیلن اس کے سامنے بیٹھی تھی، تاہم ایک گھنٹے کی اس ملاقات میں کوئی نئی بات سامنے نہیں آئی۔ ہیلن یہ بتانے سے بھی قاصر رہی کہ سڈنی ٹرانسپورٹیشن کے کاروبار سے یوں یک دم الگ کیوں ہوگیا تھا۔

وہ مایوسی کاندھوں پر لیے لوٹ آیا۔ مارکیز کو لاپتا ہوئے آج پانچواں روز تھا، تاہم پولیس پُرامید تھی کہ اُس کی گاڑی ملنے کے بعد جلد یہ معمّا بھی حل ہوجائے گا۔

اُس نے ہیلن کی اجازت سے سڈنی کی ڈائری اپنے پاس رکھ لی، یہ سوچ کر کہ شاید مزید کوئی سراغ مل جائے۔

اُس نے کوزی سے ٹیلی فون پر رابطہ کیا جو آج اپنے گھر کی دُرستی کی معاملے میں اُلجھا ہوا تھا۔ رونی، سارہ، ڈونلڈ اور پلسکن دفتر ہی میں تھے لیکن اُس کا دفتر جانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا، ویسے بھی جب سے مارکیز غائب ہوا تھا، دفتری سرگرمیاں ٹھپ ہوگئی تھیں۔

وہ مایوسی کی اتھاہ گہرائی میں تھا اور اپنے اگلے اقدام سے یک سر لاعلم سڑکوں پر گاڑی دوڑا رہا تھا۔

ایسے ہی بے مصرف گھومتے گھومتے اُس کی کار ایک گھر کے سامنے جا کر رکی جسے دیکھ کر وہ چونکا، کیوں کہ وہ پہلے بھی یہاں آچکا تھا۔ یہ سابق پولیس اہل کار، بل گرام کا مکان تھا جس نے پُراسرار انداز میں قتل ہونے والے تین افراد کا معمّا حل کرنے کا بیڑا اُٹھایا تھا لیکن پھر کیس سے الگ ہوگیا تھا۔

اس نے کال بیل دبائی۔ چند ساعت تک کوئی جواب نہیں آیا۔ پھر قدموں کی چاپ سنائی دی۔ دروازہ کھلا تو سارجنٹ وارن سامنے کھڑا تھا۔

''سارجنٹ تم یہاں؟'' مارک چونکا۔

''اور تم یہاں کیا کر رہے ہو نوجوان!'' سارجنٹ کے چہرے پر دوستانہ مسکراہٹ تھی۔

''دراصل وہ...'' مارک خود نہیں جانتا تھا کہ وہ یہاں کیوں آیا۔ ''بس، مسٹر بل سے چند روز قبل ملاقات ہوئی تھی، نہ جانے کیوں میرے دل میں اُن سے ملنے کی خواہش جاگی۔''

''کون ہے وارن؟'' عقب سے بل کی آواز آئی۔

''یہ مارک ہے، غالباً آپ سے پہلے بھی مل چکا ہے۔'' دروازے پر کھڑے سارجنٹ نے بلند آواز میں بل گرام کو مطلع کیا۔

''اُسے اندر لے آؤ!''

مارک اندر داخل ہوا۔ وارن نے بتایا کہ وہ مارکیز کے کیس کے تعلق سے بل سے مشورہ کرنے آیا تھا اور اب رخصت ہونے کو ہے۔ اُس نے امید ظاہر کی کہ مارکیز کو جلد تلاش کر لیا جائے گا۔

کچھ دیر بعد وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھا تلخ کافی کے گھونٹ حلق میں اُتار رہا تھا۔ چند منٹوں بعد سارجنٹ وارن نے اجازت چاہی۔ اب مارک اور بل آمنے سامنے بیٹھے

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ
جنوری 2012ء
نئے سال کی......
مسحور کن سوغات

آخری رابطہ

کٹھن حالات سے نبرد آزما، محبت کی راہوں میں خوابوں کو گروی رکھنے والی دوشیزہ کا قصۂ الم۔ آخری صفحات پر
ایچ اقبال کے سحر انگیز قلم کا جادو......

جنگ آزما

ظہیرالدین بابر اور خانزادہ......بہن اور بھائی کا بے مثال پیار اور لازوال قربانیوں کی باکمال داستان......
ڈاکٹر ساجد امجد کے قلم سے تاریخ کے سنہری اوراق

پکا دھاگا

ازدواجی زندگی کی اُلجھی ڈور کو سلجھاتی......ایک اہم معاشرتی مسئلے کو اجاگر کرتی تحریر......
مرزا امجد بیگ کا دلچسپ انداز

حضرت عزیر علیہ السلام

جلاد بادشاہ کا انبیا کو آزمانا......بھڑکتے شعلوں کا گل و گلزار میں ڈھل جانا......خوابوں کی حیرت انگیز تعبیریں......بہت سے سبق آموز حالات و واقعات سے مزین پُر فکر داستان

اس کے علاوہ

کشکول، اناڑی، محفل شعر و سخن، آپ کے خط

مزید

کاشف زبیر، منظر امام، تنویر ریاض، ڈاکٹر شیر شاہ سید، سلیم انور، مختار آزاد، ثمر عباس کی رنگارنگ دلچسپ تحاریر

اور وہ سب جو آپ سسپنس میں دیکھنا چاہتے ہیں!
تازہ شمارہ فوری حاصل کیجیے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھے۔

کئی منٹوں تک خاموشی چھائی رہی۔ ماحول میں تناؤ تھا۔ مارک اور بل دونوں ہی اضطراب کے زیرِ اثر، انجانی یادوں میں کھوئے ہوئے تھے۔

''مسٹر بل!'' اچانک مارک نے ماحول میں تیرتی خاموشی کو توڑا اور کھڑا ہوگیا۔ وہ مضطرب سا کمرے میں دائیں بائیں حرکت کررہا تھا۔ بل آنکھوں میں خدشات لیے اُسے تکتا رہا۔

وہ ٹھہر گیا، چند ساعت کچھ سوچتا رہا، پھر بل کی جانب مڑا۔ آنکھوں سے سوالات جھانک رہے تھے۔

''مسٹر بل آپ کچھ چھپا رہے ہیں... کچھ ہے! دیکھیں مارکیز... شاید وہ ابھی زندہ ہو، ہم اسے بچا سکتے ہیں... مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔''

بل چپ رہا۔ اُس کی آنکھوں میں کرختگی تھی، چہرہ تنا ہوا تھا۔

''مسٹر بل پلیز!'' مارک نے التجا کی۔ ''آپ نے ہمیں بہت سی معلومات فراہم کی لیکن ایک لڑکی اور تھی جو چالیس برس قبل لاپتا ہوگئی تھی۔ میں نہیں جانتا کہ اُس کی گمشدگی سے ان اموات کا تعلق ہے یا نہیں جن کی بابت آپ نے تحقیقات کیں، تاہم میں جانتا ہوں کہ اِس کا کوئی نہ کوئی تعلق میرے دوست سے ضرور ہے... اور مجھے یقین کہ آپ میری مدد کرسکتے ہیں۔''

بل کے چہرے سے کرختگی گھٹتی گئی، اب وہ مضمحل اور تھکا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ وہ کھڑا ہوگیا اور چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتا ہوا کھڑکی کے سامنے جاکر ٹھہر گیا۔

''زندگی عجیب ہے!'' اس نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''کبھی کبھار انسان ناقابلِ فہم صورتحال کا شکار ہوجاتا ہے جس کی توجیہ کرنے سے وہ خود کو قاصر پاتا ہے۔ میں زندگی سے بھرپور انسان تھا لیکن پھر... تمہیں یاد ہے، میں نے اپنی بیٹی کا ذکر کیا تھا؟'' وہ مڑا اور مارک کو گھورنے لگا۔

ماحول پر طاری تناؤ کے زیرِ اثر مارک خاموش رہا۔ چند منٹوں بعد بوڑھے بل کی لڑکھڑاتی آواز سنائی دی۔ ''یہ ناقابلِ یقین ہے۔ میری کیٹس... ہاں، مجھے یاد ہے، اِس نام کی ایک لڑکی لاپتا ہوگئی تھی، اور ہم کوشش کے باوجود اسے تلاش کرنے میں ناکام رہے... وہ غالباً 'ڈرائیو کٹ' کے مقام پر، جہاں دریا کے کنارے سڑک 160 کے زاویے پر مڑتی ہے، حادثے کا شکار ہوئی تھی۔ یہ موڑ آرچ ایونیو ہی پر پڑتا ہے۔ میں نے اُس مقام کا خود جائزہ لیا تھا، وہاں ٹائر کے نشانات تھے، خون کے قطرے بھی ملے... پر نہ تو ہم قاتل، نہ ہی اِس ٹرک کو ڈھونڈ پائے۔ دراصل اُن دنوں اِس ٹاؤن کے کئی افراد روزگار کے مواقع تلاش کرنے کے لیے بڑے شہروں کا رُخ کررہے تھے۔ ہم نے یہی اندازہ لگایا کہ قاتل بھی نقل مکانی کرنے والوں میں گم ہوگیا ہے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں ناکام رہا۔''

اُس نے اپنا جسم ایک شکست خوردہ انسان کے مانند کرسی پر پھیلا دیا اور چھت کو گھورنے لگا۔ وہ متوحش نظر آتا تھا۔

''جس روز میرا 'میری' نامی لڑکی سے سامنا ہوا، اُس کے اگلے دن میری بیٹی کا ایکسڈنٹ ہوگیا تھا۔ دراصل اُس وقت میں یہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھا کہ میرا سامنا کسی مافوق الفطرت قوت سے ہے۔ میں تو اُسے ایک قاتل سمجھتا تھا لیکن اس دن جب میری بیٹی اسپتال کے بستر پر زندگی اور موت سے لڑ رہی تھی، اس نے کچھ عجیب کہا...''

اضطراب نقطۂ عروج پر پہنچ چکا تھا۔ مارک نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

''اُس وقت میں اسپتال کمرے میں تنہا اُس کے بستر کے سرہانے کھڑا تھا'' بل کی آواز تھرا رہی تھی۔ ''اور اچانک میں نے اُس کے ہونٹوں کو حرکت کرتے دیکھا۔ مجھے ٹوٹے پھوٹے الفاظ سنائی دیے... اُس کی آواز بالکل بدلی ہوئی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا، جیسے اُس میں کسی اور کی روح حلول کرگئی ہو، تاہم اِس بات کا احساس مجھے بعد میں ہوا، اُس وقت تو میری توجہ کا مرکز اُس کی زبان سے نکلنے والے الفاظ تھے۔ اُس نے کہا 'وہ... شہر چھوڑ رہا ہے... نشانات چھپا رہا ہے... اُس کے بائیں ہاتھ میں چابی ہے... کٹ ڈرائیو... وہ شرابی... چہرے پر گناہ کی علامت ہے... میرا قاتل ہے... اے... لے... ہے...!' بس، میں اتنا ہی سمجھ سکا۔ اُس کے بعد اُس کے ہونٹوں نے حرکت نہیں کی...'' اُس کی آواز رندھ گئی۔

مارک نے آگے بڑھ کر اُس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''میرے پاس بھی آپ کو بتانے کے لیے کچھ ہے!'' اس کی آواز میں ٹھہراؤ تھا۔ اُس نے بل کے سامنے سڈنی کی کہانی بیان کی۔

''چالیس برس قبل اُس نے اچانک ٹرانسپورٹیشن کے کاروبار سے کنارہ کشی اختیار کرلی تھی، بالکل اچانک! کیا یہ

ممکن ہے کہ اِس معاملے کا تعلق میری کے موت سے ہو؟''

''کیا نام بتایا تم نے سڈنی جان؟'' مارک گہری سوچ میں غرق تھا۔ اچانک وہ اچھلا۔

''اوہ سڈنی، مجھے یاد آگیا... ہاں سڈنی جان... وہ... وہ سابق میئر کا بہنوئی تھا۔''

''کیا!'' مارک چلّایا۔

☆☆☆

چہار سو تاریکی چھائی تھی، سنّاٹا تھا، اچانک ایک کھٹکا ہوا... اُس کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ اُس نے مڑ کر دیکھا۔ اندھیرے سے، دھند سے دبے پاؤں ایک ہیولا برآمد ہورہا تھا اور دھیرے دھیرے اُس کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اُس کے بائیں ہاتھ میں ریوالور چمک رہا تھا۔ اور اچانک اس نے ٹریگر دبا دیا۔ ''ٹھا...''

مارک کی آنکھ کھل گئی۔ اُس کا بدن کانپ رہا تھا۔ وہ کئی ساعتوں تک بستر پر لیٹا گہرے گہرے سانس لیتا رہا۔ اچانک سرد لہر اس سے ٹکرائی۔ اس نے گردن موڑ کر دیکھا۔ کھڑکی پر ٹنگا پردہ لہرا رہا تھا۔

وہ ٹھٹھرتے ہوئے اُٹھا، کھڑکی تک گیا۔ پٹ بند کرتے ہوئے اچانک اسے نیچے سڑک پر کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس نے چونک کر چاروں طرف نظر دوڑائی، کہرے کے سبب وہ دُور تک نہیں دیکھ سکتا تھا، تاہم اُسے نیچے ہوٹل کے پارکنگ ایریا میں کوئی دوڑتا ہوا نظر آیا۔ قدموں کے چاپ سے اندازہ ہوتا تھا کہ بھاگنے والا شخص خاصی عمر کا ہے۔

''اُس کا تعاقب کرو!'' کسی نے کان میں سرگوشی کی۔

اُس نے جیکٹ پہنی اور ہوٹل سے باہر نکل کر پارکنگ ایریا میں آگیا، تاہم اب وہاں کوئی نہیں تھا۔ اپنے وجدان پر بھروسا کرتے ہوئے مارک نے مشرق کی جانب دوڑ لگا دی۔

دھند کو چیرتے ہوئے وہ آگے بڑھتا رہا۔ تب اسے اپنے دائیں جانب دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دی۔ اس نے اپنا رُخ اس سمت موڑ دیا۔ اب کار کا انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی، پھر ٹائر چرچرائے۔ وہ دوڑتا رہا۔ دھیرے دھیرے انجن کی آواز گھٹتی گئی، جس کا مطلب تھا کہ گاڑی دور ہوتی جارہی ہے۔

اب وہ ہانپنے لگا تھا۔ وہ رک گیا اور گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ سانس بحال ہونے کے بعد اُسے احساس ہوا کہ ہوٹل سے خاصا دُور نکل آیا ہے اور ایک ایسی سڑک پر کھڑا ہے، جس کے ساتھ دریا بہہ رہا ہے۔

اس نے ریلینگ پر ہاتھ رکھ دیا اور بہتے پانی پر نظر ٹکا دیں۔ اسے محسوس ہوا کہ اس مقام پر دریا زیادہ گہرا ہے، جس میں ایک راز مدفن ہے۔

یہ مقام مارک کے لیے بالکل اجنبی تھا۔ پھر اچانک جیسے کسی نے اشارہ کیا ہو، اس نے نظر اُٹھا کر سڑک کے کونے پر لگی تختی کی جانب دیکھا۔

''ڈرائیو کٹ!'' اس نے سائن بورڈ پڑھا، اور یک دم اس کے بدن میں سنسنی دوڑ گئی۔ وہ اسی مقام پر تھا، جہاں کئی برس قبل میری کی موت واقع ہوئی تھی۔ حیرت کے زیرِ اثر اس نے چاروں طرف نظریں دوڑائی۔ کچھ فاصلے پر اسے چند کاٹیج دکھائی دیے جو اندھیرے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اور پھر بالکل اچانک اس نے چند فرلانگ کے فاصلے پر بنے کاٹیج کے گرد ایک ہیولے کو حرکت کرتے دیکھا۔

''میری!'' وہ بڑبڑایا اور کاٹیج کی جانب دوڑ پڑا۔ جوں جوں فاصلہ گھٹ رہا تھا، اضطراب بڑھتا جارہا تھا۔ اب وہ کاٹیج کے دروازے کے سامنے کھڑا تھا، جو چاند کی پھیکی روشنی میں ہیبت ناک معلوم ہوتا تھا۔ اسے خطرے کا احساس ہوا، تاہم تجسس کے زیرِ اثر وہ خود کو روکنے میں ناکام رہا اور دھیرے سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگیا۔

اندر لیمپ کی مدھم روشنی تھی، جو ماحول پر چھائی بیزاری کو بڑھا رہی تھی۔ وہاں سکوت تھا، سنّاٹا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ اور پھر ایک کھٹکا سنائی دیا۔ اس نے چونک کر اس گوشے کی جانب دیکھا۔ وہاں لیمپ کی دھیمی روشنی میں ایک سایہ حرکت کررہا تھا۔ وہ چوکنا ہوگیا۔

''میری مدد کرو!'' کسی کے کراہنے کی آواز سنائی دی۔

مارک کے ذہن میں دھماکا ہوا۔ وہ مارکیز کی آواز تھی۔

وہ تیزی سے اس جانب بڑھا۔ اور وہاں، اندھیرے میں اس نے مارکیز کو زخموں سے چور، بھوک سے نڈھال انتہائی کمزوری اور اذّیت کی کیفیت میں زمین پر پڑے دیکھا۔ اس کے دونوں پاؤں بندھے ہوئے تھے، ایک کلائی کے گرد موٹی رسی بندھی تھی، جب کہ دوسرے پر گہرا زخم تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اُس نے ہاتھ کھولنے کی کوشش کی اور خود کو زخمی کر بیٹھا۔

''مارکیز!'' وہ اُس پر جھک گیا اور مارکیز کو سہارا دیا جس کی آنکھوں سے ناتوانی اور بے بسی جھانک رہی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"مارکیز ہوش میں آؤ!" وہ چلّایا اور جلدی جلدی اُس کے ہاتھ پاؤں رسی سے آزاد کرنے لگا۔

مارکیز نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھولیں جن میں غیر یقینی تھی۔

"ما۔۔رک... تم آگئے..."

"ہاں، ہاں میں آگیا دوست!" مارک کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔

یکا یک مارکیز کی آنکھیں پھیل گئی، ان میں خوف سمٹ آیا جسے اس نے موت کو بہت قریب دیکھ لیا ہو۔

"بچو!" مارک کو دونوں بازوؤں سے پکڑ کر وہ ایک جانب جھک گیا اور تب، کاٹیج فائر کے دھماکے سے لرز اُٹھا۔ گرم سنسناہٹ مارک کے کان کے پاس سے گزری۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ فائر کرنے والا شخص باہر کی جانب دوڑ رہا تھا۔ اس کے بائیں ہاتھ میں ریوالور تھا جس سے دھواں اُٹھ رہا تھا۔

بلا سوچے سمجھے مارک اُس کے تعاقب کے ارادے سے کھڑا ہوگیا۔

"ٹھہرو!" مارکیز کراہا۔ "اس کے ہاتھ میں بندوق ہے۔"

مارک نے ایک نظر اسے دیکھا۔ وہ تذبذب کا شکار تھا۔ تب اسے باہر جیپ اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی۔ فیصلہ کرنے کے لیے چند لمحات ہی میسر تھے۔ اس نے فوراً موبائل فون نکال کا مارکیز کی جانب اُچھالا۔

"رونی کو فون کرو!" وہ چلّایا۔ مارکیز نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ باہر جیپ کے ٹائر چرچرانے کی کریہہ آواز گونج رہی تھی۔ کاٹیج سے باہر آنے کے بعد اُس نے ایک سیاہ کار کو دھول کا طوفان اپنے پیچھے چھوڑتے ہوئے سڑک کی جانب بڑھتے دیکھا۔

اُس نے کار کی جانب دوڑ لگا دی۔ تب اچانک ایک اور فائر ہوا۔ وہ فوراً جھک گیا، گولی سر کے اوپر سے گزر گئی۔ کار کی اگلی سیٹ پر مارک کو ایک زخم زدہ چہرہ دِکھائی دیا، جو اگلے ہی لمحے اندھیرے میں غائب ہوگیا۔

اس نے تعاقب جاری رکھا۔ گاڑی ہر گزرتے لمحے کے ساتھ دور ہوتی جارہی تھی۔ امید دم توڑ رہی تھی۔ وہ ہانپنے لگا تھا، اور تب اسے اپنے پیچھے سائرن سنائی دیا۔

وہ مڑا۔ پولیس جیپ کی تیز روشنی اُس کی آنکھیں سے ٹکرائی۔ اس نے آنکھیں میچ کر ڈرائیونگ سیٹ کی جانب دیکھا، وہاں سارجنٹ وارن بیٹھا تھا۔

"جلدی کرو، گاڑی میں آجاؤ!" وہ چلّایا۔

مارک گاڑی میں جا بیٹھا۔ سارجنٹ نے تاریک سڑک پر دوڑتی گاڑی کا تعاقب شروع کیا۔ "واکی ٹاکی" پر پولیس اہل کاروں کو ہدایت جاری کرنے کے بعد سارجنٹ نے مارک کی جانب دیکھا، جو گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔

"مارکیز... مل گیا... وہ اِسی شخص کے کاٹیج میں تھا..." اس نے بہ مشکل کہا۔

سارجنٹ نے رفتار بڑھادی، تاہم ہر گزرتے لمحے کے ساتھ پُرپیچ پتھریلی سڑک پر دوڑتی سیاہ کار اور پولیس جیپ میں فاصلہ بڑھتا جارہا تھا۔

"ہم اسے نہیں پکڑ پائیں گے!" مارک کے لہجے میں مایوسی تھی۔

سارجنٹ نے ایکسیلیٹر دبا دیا۔ جیپ ہوا میں اُڑتی معلوم ہوتی تھی۔ دونوں گاڑیاں اب "ڈرائیو کٹ" کی جانب بڑھ رہی تھی، جہاں ایک انتہائی خطرناک موڑ اُن کا منتظر تھا۔

"وہ کون ہے، تم نے اس کا چہرہ دیکھا؟" سارجنٹ وارن نے سوال کیا۔

"نہیں، مگر..." مارک کے ذہن کے پردے پر بائیں ہاتھ میں تھاما ریوالور، ایک زخم زدہ چہرہ، ہیڈلائٹس کی آنکھوں کو چیر دینے والی روشنی اور اسٹیرنگ تھامے شرابی ٹرک ڈرائیور کا چہرہ گھوم گیا اور اُسے اپنے ذہن میں گونجتی سرگوشیوں، ٹوٹے پھوٹے الفاظ بامعنی معلوم ہونے لگے۔

اور تب، بالکل اچانک، غیر متوقع طور پر اُسے "ڈرائیو کٹ" پر ایک سفید ہیولا حرکت کرتا نظر آیا۔

"وہ... وہ دیکھو!" اس نے انگلی اُٹھا کر اس جانب اشارہ کیا۔ سارجنٹ نے اس جانب دیکھا، لیکن یہ سمجھنے سے قاصر رہا کہ مارک اُس کی توجہ کس جانب مبذول کروانا چاہ رہا ہے۔

اور تب وہ سایہ حرکت کرتا ہوا سیاہ کار کے سامنے آگیا۔ یہ لمحوں کا معاملہ تھا، ہر منظر ٹھہر گیا، سناٹا چھا گیا۔

مارک کا ذہن ماؤف ہوگیا تھا۔ اس کی آنکھیں [illegible] میں فرق کرنے کی صلاحیت کھو رہی تھیں اور تب بریک چرچرانے کی کریہہ آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی اور اس کے حواس لوٹ آئے۔

اس نے دیکھا، سیاہ کار بے قابو ہو کر ریلنگ توڑتی ہوا میں بلند ہوئی اور نیچے جا گری۔ ایک دھماکا اُس کی سماعتوں سے ٹکرایا۔

قرآن وحدیث کی اصطلاح میں سحر ہر ایسے عجیب وغریب امر کو کہا گیا ہے جو کہ شیاطین اور کافر جنات کے ذریعے کروایا جائے، ان کی ناجائز خواہشات کو پورا کر کے۔ انہیں خوش کرنے کے مختلف طریقے ہیں مثلاً کفر اور شرک کے الفاظ پر مشتمل کلمات کا منتر پڑھنا، ناپاک جگہ اور ناپاکی کی حالت میں (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ کا پاک کلام پڑھنا، غلیظ اور حرام چیزیں استعمال کرنا، حرام غذا کھانا، حرام جانور یا انسان کے اعضا مثلاً ہڈی، بال، ناخن اور خون وغیرہ استعمال کرنا، نجاست کھانا، خون پینا یا اس شیطان جن کو پلانا، کسی کو ناحق قتل کرنا، زنا اور بدکاری کرنا، نابالغ لڑکوں اور کنواری لڑکیوں کے ساتھ غیر فطری عمل کرنا، جھوٹ بولنا، دھوکا دینا اور بے ایمانی کرنا۔ یہ وہ کام ہیں جن سے شیاطین خوش ہو کر اس کا کام کرنے پر آمادہ ہوجاتے ہیں۔ اسی طرح جلے ہوئے کافر مردے کی راکھ بھی شیاطین کو خوش کرنے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ عرف عام میں اس کو ہی جادو یا سحر کہا جاتا ہے۔

مرسلہ: الہ ڈینو، لاڑکانہ

سارجنٹ نے بریک دبا دیے۔ گاڑی رکنے کے بعد وہ دونوں دوڑتے ہوئے ریلنگ کے پاس پہنچے۔ انہوں نے دیکھا، جیپ سے شعلے بلند ہورہے تھے اور پھر انہوں نے ایک سائے کو لڑکھڑاتے ہوئے جیپ سے دُور ہٹتے دیکھا۔

"ٹھہرو!" سارجنٹ چیخا۔ "ورنہ میں گولی مار..."

"ٹھا!"

اِس سے پہلے کہ سارجنٹ اپنی بات مکمل کرتا، اس شخص نے ریوالور اپنے سر پر رکھ کر ٹریگر دبا دیا تھا۔ وہ ٹوٹے ہوئے درخت کی طرح گرا اور زمین پر بکھر گیا۔ مارک کو یوں لگا، جیسے وہ سحر کے زیرِ اثر ہو۔ سارجنٹ، ٹوٹی ہوئی ریلنگ پھلانگتا ہوا نیچے کی طرف دوڑا۔ مارک نے اُس کا تعاقب کیا اور شعلے میں لپٹی کار کے پاس سے گزر کر لاش کی جانب بڑھا جس کے بائیں ہاتھ میں ریوالور تھا جس کی نال سے دھواں اُٹھ رہا۔

اُس کا بھیجا اُڑ گیا تھا، چہرہ بگڑ گیا تھا، لیکن اتنا نہیں کہ اُسے پہچانا نہ جاسکے کہ اب بھی گال پر زخم کا نشان واضح نظر آرہا تھا۔

"اوہ... یہ تو..." سارجنٹ کے منہ سے نکلا۔

وہ ایلکس ہیسلے تھا!

دریا کی طرف سے سرد ہوا اُن کی جانب دوڑ رہی تھی، پشت پر شعلے میں لپٹی جیپ تھی اور سامنے ایک لاش!

مارک نے محسوس کیا جیسے کوئی اسے دیکھ رہا ہو۔ اُس نے خوف زدہ ہوئے بغیر مڑ کر دیکھا۔ سڑک پر ریلینگ کے خستہ حال سریوں کے نزدیک، سفید لباس میں ملبوس، گھنگریالے بالوں والی میری کھڑی تھی۔

☆☆☆

کڑیاں ملتی چلی گئیں۔ گتھی سلجھنے لگی اور وہ بھول بھلیوں سے نکل آئے، تاہم یہ اتنا سہل نہیں تھا۔ مارک، جولیان، بل گرام اور کوزی نے کئی گھنٹوں تک اِس معاملے کو کھنگالا، ماضی کا تعاقب کیا۔ سارجنٹ وارن کی مدد سے پُرانے سرکاری ریکارڈز اور اخبارات کا جائزہ لیا۔ یوں، وہ معمے سے نکل آئے!

ریزرویکشن قبرستان کے گرد بھٹکتی روح میری گیٹس ہی کی تھی، جو 1958ء میں ایک دھند میں ڈوبی، ٹھٹھرتی رات "ڈرائیو کٹ" کے موڑ پر ایک اکھڑ مزاج، شرابی ٹرک ڈرائیور کی غفلت کا نشانہ بن گئی تھی۔ ٹرک کی ٹکر نے اُسے دریا کی گود میں دھکیل دیا جو اُس کے لیے تابوت ثابت ہوا۔

یہ ڈرائیور ایلکس ہیسلے ہی تھا، جس نے ظلم کی انتہا پر پہنچتے ہوئے یہ دیکھنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی کہ وہ لڑکی زندہ بھی ہے یا مرگئی اور موقع سے فرار ہوگیا۔

وہ ٹرک سڈنی جان کا تھا۔ ایلکس نے اُسی رات ٹاؤن چھوڑ دیا۔ اور شگاگو سٹی چلا گیا۔ بعد میں اس نے فون پر سڈنی کو صورتحال سے آگاہ کیا۔ سڈنی نے اِس خوف سے کہ کہیں قتل کا الزام اُس کے سر نہ آجائے، اونے پونے داموں دونوں ٹرک راتوں رات فروخت کردیے۔

بعد میں جب بل گرام نے یہ کیس اپنے ہاتھ میں لیا تو سڈنی نے ایک بار پھر اپنی گردن بچانے کے لیے اپنے بہنوئی کو جو اُس وقت ٹاؤن کا میئر تھا، اس بات پر راضی کرلیا کہ یہ کیس بند کردیا جائے۔ بعد میں سڈنی نے بھی شہر چھوڑ دیا۔

اس عرصے میں میری کی بدروح کسی ایسے شخص کی تلاش

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں بھٹکتی رہی جو اس کے قاتل کو کیفر کردار تک پہنچانے کا وسیلہ بن سکے۔

سڈنی کئی برس تک الینوئس کے ایک دیہی علاقے میں اپنی زمینوں کی دیکھ ریکھ کرتا رہا۔ 89ء میں وہ اپنے آبائی ٹاؤن لوٹ آیا جہاں ایک سرد، ٹھٹھرتی ہوئی رات اس کا سامنا میری کی بدروح سے ہوا جسے دیکھتے ہی وہ صورتِ حال سمجھ گیا۔

وہ اپنے کیے پر پشیمان تھا، اس نے اپنے قریبی دوست جولیان کو حقیقت سے آگاہ کرنے کا فیصلہ کیا لیکن دوسرے ہی دن ہارٹ اٹیک کے باعث اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

ایک بار پھر، میری کی روح کو انتظار کی اذیت سہنی تھی۔ اسی عرصے میں ایلکس ہیسلے، اُس کا قاتل شگاگو سٹی کی خاک کھنگالنے کے بعد لوٹ آیا۔ میری کا انتظار ختم ہو گیا، اس نے پھر وسیلے کی تلاش شروع کی۔ اور تب اس کا مارکیز سے سامنا ہوا، جو نیک روح کا حامل تھا۔ ابتدائی ملاقاتوں کے بعد مارکیز یہ سمجھ گیا کہ ایلکس ہی میری کا قاتل ہے۔ اس نے یہ معما سمجھا لیا، تاہم جب وہ ایلکس کو یہ سمجھانے کی غرض سے اُس کے کاٹیج گیا کہ اُسے خود کو پولیس کے حوالے کر دینا چاہیے، اُس نے دھوکے سے مارکیز پر حملہ کر دیا اور زخمی حالت میں اپنے گھر میں قید کر دیا۔ گاڑی چھپا دی جو پولیس نے سرتوڑ کوشش کے بعد ڈھونڈ نکالی۔

سارجنٹ وارن مارکیز کی تلاش میں تھا اور ایلکس کے گرد گھیرا تنگ ہوتا جا رہا تھا، اس وجہ سے اس نے مارکیز کو ٹھکانے لگانے کا فیصلہ کیا لیکن اسی رات مارک، اپنے وجدان اور چند پُراسرار اشاروں کا تعاقب کرتے ہوئے اس کے کاٹیج پہنچ گیا جہاں ایلکس نے اس پر فائر داغ دیا، تاہم خوش قسمتی سے وہ بچ گیا۔

پولیس کا خیال تھا کہ تیز رفتاری کے باعث ایلکس کی گاڑی قابو سے باہر ہو گئی تھی اور ریلنگ توڑتے ہوئے پہاڑ سے نیچے جا گری جس کے بعد اس نے پولیس سے بچنے کے لیے خودکشی کر لی، تاہم مارک جانتا تھا کہ اصل کہانی کچھ اور ہے۔

جن دنوں مارکیز اسپتال میں زیرِ علاج تھا، اس نے مارک کو بتایا کہ جب سے ایلکس جنکس ٹاؤن لوٹا تھا، سرگوشیاں اُس کا بھی پیچھا کر رہی تھیں، جن کی وجہ سے وہ نیم پاگل ہو گیا تھا۔

اُس نے مارکیز کے سامنے متعدد بار یہ دعویٰ کیا تھا کہ پولیس اُسے نہیں پکڑ سکتی اور اگر کسی طرح پولیس اُس تک پہنچ بھی گئی تو وہ خودکشی کو ترجیح دے گا اور اس نے ایسا ہی کیا۔

لیکن معاملہ اتنا سادہ نہیں تھا، کیوں کہ وہ ایک بار پھر جنکس ٹاؤن سے فرار ہونے میں کامیاب ہو جاتا، تاہم اُس موقعے پر میری نے اپنے قاتل کے سامنے خود کو ظاہر کر کے اُس کے ارادوں کو خاک میں ملا دیا۔

جب پُرانے کیس کھولے گئے اور وسیع تناظر میں جدید خطوط پر تحقیق کی گئی تو چالیس سال قبل پُراسرار انداز میں ہلاک ہونے والے تینوں افراد کے راز سے بھی پردہ اُٹھ گیا۔ شگاگو سے ریزوریکشن پر تحقیق کرنے کے ارادہ سے ٹاؤن کا رُخ کرنے والا جیمز ڈنکز دراصل ایلکس کا دوست تھا جسے ایلکس نے میری کی روح کے بارے میں ملنے والی خبروں کے بعد حقیقت کا سراغ لگانے کی غرض سے یہاں بھیجا تھا۔

باقی دو افراد کا حقیقتاً اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ قبرستان کے نزدیک چاقو کے وار سے ہلاک ہونے والے شخص کو دشمنی کی بنا پر قتل کیا گیا تھا، جب کہ جس شخص کی لاش دریا سے ملی تھی، وہ بدنصیب لٹیروں کا نشانہ بن گیا تھا۔

☆☆☆

مارکیز کی صحت یابی کے بعد ''چپس کیمونیکشن'' کے اہل کار نیا کارخانے لگانے کے منصوبے کے ارادے سے پھر سرگرم ہو گئے۔ انہوں نے انتہائی محدود وقت میں دل جمعی کے ساتھ کام مکمل کیا اور اپنی رپورٹس مرتب کر کے ہیڈ کوارٹر روانہ کر دیں۔

مارک بھی روانگی کے لیے تیار تھا۔ وہ اپنا سامان پیک کر رہا تھا۔ ایک طرف جہاں گھر لوٹنے کی خوشی تھی، وہیں یہ دُکھ بھی تھا کہ وہ ایک خوبصورت قصبے اور اچھے دوستوں سے دُور جا رہا تھا، پراسی کا نام زندگی ہے!

کچھ دیر بعد وہ ہوٹل کی لابی میں تھا، جہاں اس کے تمام ساتھی موجود تھے۔ انہوں نے اُسے مختلف تحفے دے اور نیک تمناؤں کے ساتھ رخصت کیا۔

کچھ منٹوں بعد وہ ٹیکسی میں سوار تھا، جو ''آرچر ایونیو'' پر دوڑ رہی تھی۔ جب ٹیکسی ریزوریکشن قبرستان کے قریب سے گزری، اُسے لگا، جیسے اسے کوئی الوداع کہہ رہا ہو، کوئی ایسا، جو وقت کے صحرا میں بھٹکنے کے بعد اب سکون کی وادی میں اُتر چکا ہے۔

اُس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی!

ابتدائی دور میں کیتھولک چرچ یہودیوں کا شدید مخالف رہا۔ جن ملکوں پر کیتھولک چرچ کا اثر تھا وہاں یہودی تیسرے درجے کے شہری کی زندگی بسر کرتے تھے اور ان پر پابندیاں عاید تھیں۔ ان کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جاتا تھا لیکن اس سے یہ مطلب نہ لیا جائے کہ یہودی مظلوم قوم تھے۔ بلکہ نہایت نامساعد حالات میں بھی ان کی سازشیں اور مکاریاں جاری تھیں۔ یہ ہر فرد کو دھوکا دے کر لوٹنا جائز سمجھتے تھے پھر ان کی اجارہ دار فطرت بھی کسی دوسرے کو برداشت نہیں کرتی تھی۔ یہودیوں میں کاروبار کی فطری صلاحیت تھی لیکن یہ اسے نہایت منفی انداز میں استعمال کرتے اور جہاں ہوتے وہاں کی معیشت کو اپنے قبضے میں کر کے دوسروں کو اپنا معاشی غلام بنا لیتے تھے۔ حالانکہ یہ تعداد میں تھوڑے ہی ہوتے تھے اور اسی وجہ سے مار کھاتے تھے جب مقامی لوگوں کا پیمانہ صبر لبریز ہو جاتا تو وہ یہودیوں کی صفائی پر تل جاتے تھے۔

اس وجہ سے کم سے کم یورپ میں یہودیوں کے لیے کوئی ایک ہزار سال نہایت کٹھن رہے تھے۔ شاید ہی کوئی ملک یا حکومت رہی ہو جس نے یہودیوں کے خلاف کارروائی کی ہو اور ان کا قتل عام نہ کیا ہو۔ فلسطین سے بے دخلی کے بعد روع میں یہ اٹلی میں آباد ہوئے۔ جب یہاں ان کو نشانہ بنایا گیا تو یہ رفتہ رفتہ یورپ کے دوسرے ممالک میں پھیلنے لگے۔ وسطی اور مشرقی یورپ میں ان کے ساتھ وہی سلوک روا رکھا جو اٹلی میں ہو رہا تھا کیونکہ یہاں بھی کیتھولک چرچ کا اثر تھا۔ مشرقی یورپ میں یونانی چرچ کا اثر بھی تھا جو یہود دشمنی میں کسی طرح کیتھولک چرچ سے کم نہیں تھا۔ ایسے میں یہودیوں نے اپنی عافیت اسی میں سمجھی کہ وہ مغرب کی طرف بڑھتے چلے جائیں۔ ایشیا میں یہودی زیادہ تر مسلم ممالک میں آباد تھے۔ یہاں ان کے ساتھ رواداری اور نرمی کا سلوک ہوتا تھا۔ اکثر مسلم مملکتوں میں انہیں پوری مذہبی اور معاشرتی آزادی حاصل تھی۔ بلکہ حکومتوں کا ان کے ساتھ رویہ اتنا نرم تھا کہ یہ بڑے بڑے عہدے بھی حاصل کرتے تھے اور پورے امن و سکون سے رہتے تھے مگر یورپ میں صورتِ حال قطعی مختلف تھی۔

اٹلی، فرانس اور کیتھولک چرچ کا اثر تھا یہودیوں کے لیے حالات نہایت دشوار تھے۔ ایسے میں ان کی آخری امید انگلینڈ، جرمنی اور اسکینڈے نیوین ممالک سے وابستہ ہو گئی تھی جو نئے نئے عیسائی ہوئے تھے اور یہاں یہود دشمنی میں اتنی شدت نہیں تھی۔ پندرھویں صدی عیسوی یورپ میں تبدیلی کا سال تھا۔ ایک طرف تو اسپین کی مسلم سلطنت اپنے آخری دموں پر تھی۔ دوسری طرف جرمنی میں مارٹن لوتھر کی اصلاحی

جادو ٹونے پر یقین رکھنے والے مذہب کا تعارف جو یورپ میں تیزی سے پھیلا

پراسرار مذہب

مریم کے خان

اس کرۂ ارض پہ لاتعداد مذاہب پھیلے ہوئے ہیں۔ اہلِ اسلام، اہلِ ہنود، یہود و نصاریٰ، پارسی، بودھ، جین، کنفوشس کے علاوہ اشجار پرست، آتش پرست، بت پرست مگر سب کی تعلیم میں ایک نکتہ مشترک ہے کہ معاشرہ اصول و ضوابط کا حامل بنے مگر یہ ایک ایسا مذہب ہے جس کی تعلیم ہی یہ ہے کہ سازشیں تیار کرو، افراتفری پھیلاؤ۔ یہ مذہب نہایت تیزی سے پوری دنیا میں پھیل رہا ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ امریکا اور کئی دیگر ممالک کے سیاست دانوں کی بہت بڑی تعداد اسی مذہب کے پیروکار ہیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تحریک نے ایک انقلاب برپا کر دیا تھا۔ وہ پوپ کے خدائی اختیارات میں شرکت کے خلاف تھا کیتھولک مذہب میں پوپ خدا کا نمائندہ ہوتا ہے اور وہ جس کے گناہ چاہے معاف کرسکتا ہے۔

مارٹن لوتھر کی اصلاحی تحریک نے مغربی یورپ کے ممالک خاص طور سے انگلینڈ، جرمنی اور اسکینڈے نیوین ممالک کو متاثر کیا اور یہاں پروٹسٹنٹ چرچ کا ظہور ہوا اور یہ ممالک کیتھولک چرچ کی گرفت سے نکل گئے۔ یہی یہودیوں کا بنیادی مقصد تھا کیونکہ وہ جان گئے تھے کہ کیتھولک چرچ انہیں کبھی معاف نہیں کرے گا۔ اسپین میں جلد یہودیوں کو اس کا عملی تجربہ بھی ہوا جب مسلمانوں سے نمٹنے کے بعد وہاں کے حکمرانوں اور پادریوں نے یہودیوں کو بھی عیسائی ہو جانے ورنہ اسپین سے نکل جانے کا حکم دیا۔ اس حکم کے بعد کسی یہودی کا وہاں بہ حیثیت یہودی رہنا ناممکن تھا۔ شاید اس وقت یہودیوں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اگر انہیں اس دنیا میں چین سے جینا ہے تو اس کے لیے بہت ضروری ہے، وہ حکومتوں کو اپنے قابو میں کریں اور جو ملک ان کے قابو میں نہ آسکیں انہیں تباہ کر دیں۔ یہی سوچ فری میسن یا فری میسنری تحریک کا آغاز تھی۔

فری میسنری کی تاریخ کے دو حصے ہیں۔ ایک 1717ء سے پہلے کا ہے جب فری میسنری تحریک تاریکی میں تھی، اس کے اصول وقواعد غیر واضح تھے اور اس کا کردار بھی پر اسرار سمجھا جاتا تھا۔ اس وقت خیال تھا کہ فری میسن جادوگری کی رسومات میں ملوث ہیں۔ عام آدمی اس سے دور رہے کیونکہ فری میسنری کا ممبر بننے کے لیے دولت مند یا معاشرے میں اثر ورسوخ کا حامل ہونا لازمی تھا۔ کیونکہ ان کا مقصد ہی طاقت کے مراکز کو اپنے قابو میں کرنا تھا۔ اس طرح عام لوگ خود بہ خود اس سے دور رہے۔ آج بھی یہی حال ہے۔

فری میسنری کے قبل از تاریخ دور پر بے شمار کتابیں لکھی گئیں جن میں کوشش کی گئی کہ اس کے ارتقاء کو واضح کیا جائے لیکن کسی بھی کتاب یا مضمون میں کوئی تسلی بخش وضاحت نہیں ملتی۔ لیکن عجیب بات ہے تقریباً تمام ہی لوگ فری میسنری سے یہود کا بنیادی تعلق شعوری طور پر نظر انداز کرنے کی کوشش کرتے ہیں یوں جب وہ فری میسنری کا ذکر کرتے ہیں تو ایسا لگتا ہے وہ اسے یہودیوں سے الگ کوئی چیز سمجھتے ہیں۔ حالانکہ فری میسن یہودی اصطلاحات نہایت روانی سے استعمال کرتے ہیں جیسے ڈیوڈ اسٹار، سولومن ٹیمپل اور ہولی لینڈ وغیرہ۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی حج کی پوری کیفیت اور طریقہ کار بیان کر دے لیکن اس میں اسلام یا مسلمانوں کا نام نہ لے۔

انگلینڈ میں تیرھویں صدی عیسوی میں یارک اور رائل کیسل سے لے کر پورے انگلینڈ بلکہ اسکاٹ لینڈ اور آئرلینڈ میں بھی جا بہ جا پتھر یلی عمارتیں بنیں جن کو اسٹون میسن کہا جاتا تھا۔ عمارتوں کے لیے لفظ مینشن اسی لفظ سے نکلا ہے۔ اسٹون میسن فری میسنری کی سرگرمیوں کے لیے مخصوص تھے مگر وہ یہاں کیا کرتے تھے اور ان کی سرگرمیوں کے مقاصد کیا تھے۔ آج بھی تاریخ اس بارے میں خاموش ہے۔ تیرھویں صدی میں عیسائیت انگلینڈ کا اکثریتی مذہب نہیں تھی بلکہ اسکاٹ لینڈ اور آئرلینڈ کے باشندے اپنے پرانے مذہب پر قائم تھے۔ ان کا مذہب مظاہر پرستی تھا۔ اسی علاقے میں انگلینڈ کی تاریخ کے اولین یہودی آبادکاری ہوئی۔

بارھویں صدی کے آغاز میں یہودی انگلینڈ پہنچ گئے تھے۔ فرانس میں وہ پہلے سے موجود تھے اور ان دو ممالک میں یہودیوں کو کیتھولک کلیسا کے جبر سے کسی حد تک نجات ملی تھی۔ فرانس کیتھولک ملک تھا لیکن اسپین کے ساتھ ہونے کی وجہ سے وہاں کے علمی ماحول نے فرانس کو بھی متاثر کیا تھا۔ جب اسپین میں مسلم سلطنت عروج پر تھی اور وہاں ہزاروں چھوٹے بڑے مدرسے تعلیم دے رہے تھے جن میں غیر ملکی طلبا بھی تھے اور ان میں سب سے زیادہ تعداد فرانس سے تعلق رکھنے والے طلبا کی تھی۔ یہی وجہ تھی کیتھولک ہونے کے باوجود فرانس میں اعلیٰ طبقے میں روشن خیالی موجود تھی اور وہاں چرچ کا عمل دخل ایک خاص حد سے زیادہ نہیں تھا۔ بادشاہ اور امرا اپنی رائے پر عمل کرتے تھے اور ہر بات کے لیے چرچ کی طرف دیکھنے کا رواج نہیں تھا۔

اس کے باوجود یہودی خود کو فرانس میں محفوظ محسوس نہیں کرتے تھے۔ اس لیے وہ فرانس کے مقابلے میں کہیں پسماندہ ملک انگلینڈ چلے گئے کیونکہ وہ کیتھولک چرچ کی گرفت سے آزاد تھا اور پندرھویں صدی میں انگلینڈ نے کیتھولک چرچ سے ناتہ توڑ لیا۔ یہی کام جرمنی، اسکینڈے نیوین ممالک، آسٹریا اور سوئٹزرلینڈ نے بھی کیا۔ انہوں نے نئے چرچ سے وابستگی اختیار کی۔ بالآخر یہودی کیتھولک چرچ کا اثر توڑنے میں کامیاب رہے تھے۔ اگرچہ یہ کہنا مشکل ہے کہ مارٹن لوتھر کی اصلاحی تحریک کے پیچھے ان کا کتنا ہاتھ تھا کیونکہ مارٹن لوتھر بھی یہودیوں کو پسند نہیں کرتا تھا لیکن وہ مکمل مذہبی بنیاد پر تشدد کے خلاف تھا۔ دوسری طرف یہودی کیمونل

اس کی تحریک کی مکمل حمایت کرتی تھی۔

مارٹن لوتھر کی تحریک کا فطری نتیجہ ایک آزاد سیکولر سوسائٹی کی صورت میں نکلنا تھا جس میں انسان اپنے کسی فعل کے لیے چرچ کو جواب دہ نہیں تھا اور اس پر صرف ملکی قوانین کی پاسداری لازمی ہوتی۔ رفتہ رفتہ یورپ کے ان ممالک میں ایسا ہی معاشرہ تشکیل پاتا چلا گیا۔ علمی اور پھر صنعتی انقلاب نے اسے مہمیز دی تھی۔ یورپ میں سائنسی علوم اور خاص طور سے ریاضی اور طب کی تعلیم زیادہ تر یہودی اساتذہ دیتے تھے اور انہوں نے سائنسی تعلیم کے ساتھ اپنے شاگردوں میں سیکولر نظریات کے بیج بھی بوئے تھے۔ یہ شاگرد جب عملی زندگی میں آئے اور بڑے بڑے عہدوں تک پہنچے تو انہوں نے لاشعوری طور پر یہودیوں کے لیے کام شروع کر دیا۔

کیتھولک مذہب میں انسان گناہ گار ہے۔ اس لیے اسے نہ صرف گناہوں سے اجتناب کرنا ہوتا ہے بلکہ خود کو پاک صاف کرنے کے لیے کڑی ریاضت اور خود اذیتی اختیار کرنا پڑتی ہے۔ عیسائیوں میں ان راہبوں کا بڑا مقام تھا لیکن ہر شخص اس طرح دنیا سے کٹ کر نہیں رہ سکتا تھا اور نہ ہی گناہوں سے پاک کرنے کے لیے خود کو اذیت دے سکتا تھا۔ پھر کیتھولک مذہب دنیاوی ترقی کے خلاف بھی تھا۔ عوام کی تعلیم پر پابندی لگادی جاتی تھی اور سوائے بائبل کے کوئی بھی کتاب پڑھنا منع تھا۔ بلکہ جہاں چرچ کا زیادہ اثر تھا وہاں کسی قسم کی کتاب پڑھنے پر سزا دی جاتی تھی۔ کیونکہ اس وقت مذہبی کتب کے علاوہ کوئی سائنسی اور علمی کتاب پڑھنا مسلمانوں کی مدد کرنے کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔ اس چیز نے بھی مغربی یورپ کے لوگوں کو مذہب سے بیزار کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ یہاں اسپین سے قربت کی وجہ سے علوم اور فنون کا کچھ اثر پہنچا تھا اور یورپیوں میں بھی علمی ذوق پیدار ہو رہا تھا۔ پروٹسٹنٹ مذہب کی کامیابی کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔

یہودی مذہب میں ایک چیز جو اسے محدود کرتی ہے وہ اس کا نسلی ہونا ہے یعنی صرف پیدائشی یہودی ہوسکتا ہے کوئی اور یہودی مذہب قبول کرلے تب بھی وہ یہودی نہیں ہوسکتا ہے۔ یہی مجبوری اس وقت بھی آڑے آئی جب یورپی اقوام نے عیسائیت قبول کرنا شروع کی اور دیکھتے ہی دیکھتے عیسائی طاقت ور ہوتے چلے گئے۔ یہودی جو پہلے رومیوں اور مصریوں کے غلام تھے اب عیسائیوں کے تحت آگئے۔ بعد میں اپنی بقا کے لیے یہودیوں نے جب کیتھولک چرچ کا زور توڑا اور ایک نئے سیکولر یورپ کے قیام کی راہ ہموار کی تب بھی ان کو یہی مسئلہ تھا کہ بہت بڑی تعداد میں اپنے حامی ہو جانے والے عیسائیوں کو کس طرح اپنے مقاصد کے لیے استعمال کریں کہ ان کو کبھی احساس نہ ہو کہ وہ یہودیوں کے مقصد کی تکمیل کر رہے ہیں۔ تب انہوں نے ایک ایسی سوسائٹی بنانے کا سوچا جو بہ ظاہر معاشرے کے ہر فرد کے لیے ہو لیکن در حقیقت اس کا کام یہودی ایجنڈے کی تکمیل کرنا ہو۔ غالباً یہی سوچ فری میسنری کی بنیاد بنی۔

اس کے باوجود یہ کہنا مشکل ہے کہ فری میسنری کا آغاز درحقیقت کس ملک سے اور کب ہوا۔ مگر غالب امکان یہی ہے کہ اس کا آغاز بارھویں صدی میں انگلینڈ سے ہوا تھا جیسا کہ بتایا ہے کہ اس وقت انگلینڈ پر عیسائیت کا غلبہ نہیں تھا اور پھر بعد میں کیتھولک چرچ کی مخالفت کی وجہ سے یہاں یہودیوں کے لیے ایک نرم گوشہ بھی پیدا ہو گیا تھا۔ انہوں نے اس کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے معاشرے کے اعلیٰ طبقوں میں اثر و رسوخ حاصل کرلیا۔ اس کے لیے انہوں نے سیکولرازم اور گناہ پر مائل انسانی فطرت کو استعمال کیا۔ فری میسنری نفس کے معاملے میں پوری طرح آزاد ہوتا تھا اور اس پر کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں لگائی جاتی تھی۔ وہ نفس کی تسکین کے لیے کچھ بھی کرنے کو آزاد تھا۔ یہ چیز بھی اعلیٰ طبقے کے لیے کشش کا سبب بنی جو ہمیشہ سے عیش وعشرت کا دلدادہ رہا۔

اس کے باوجود فری میسنری کو آغاز میں بہت ڈھک چھپ کر کام کرنا پڑتا تھا کیونکہ عام عیسائی جن کا تعلق پروٹسٹنٹ چرچ سے تھا۔ وہ بھی یہودیوں اور ان سے متعلق کسی چیز کو پسند نہیں کرتے تھے۔ شاید اسی بنا پر فری میسنری کا یہودیوں سے تعلق نظر انداز کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی رہی ہے۔ اس سے انکار تو کسی صورت ممکن نہیں ہے کیونکہ اس کی تمام رسومات اور اصطلاحات اصل میں یہودیوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ ڈیوڈ اسٹار جسے ستارہ داؤدی بھی کہتے ہیں اس سوسائٹی کا ایک نشان تھا۔ لیکن فری میسن اسے ایک نبی کی نشانی کے طور پر نہیں لیتے ہیں بلکہ وہ اس کا تعلق جادوگری اور شیطانی قوتوں سے جوڑتے ہیں۔ یہ ان کے نزدیک طاقت کی علامت ہے۔ جب فری میسنری اپنی مخصوص تقریبات میں جمع ہوتے تو وہ اس علامت کو فرش پر بنا کر اس کے گرد ایک دائرہ کھینچ کر ستارے کی نوکوں پر شمعیں جلا دیتے۔ ستارہ داؤدی اس طرح بنتا ہے کہ دو تکونوں کو آپس میں اس طرح رکھا جائے کہ وہ چھ نوکوں والا ستارہ بن جائے۔ یہ انسانی جسم کی علامت بھی ہے۔ مگر وہ اس سے جادوگری کی کس قسم کی رسومات ادا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرتے تھے اس بارے میں شاید کسی فری میسن کو ہی علم ہوسکتا ہے۔ دوسرے لوگ اس بارے میں صرف قیاس کر سکتے ہیں۔ افواہوں کا زور زیادہ ہے اور حقیقت کا علم کم ہے۔

فری میسنری میں شروع سے رازداری پر بہت زور دیا جاتا رہا ہے کسی فرد کو بہت کڑی آزمائشوں سے گزرنے کے بعد ہی ممبر شپ دی جاتی اور ممبر بننے کے لیے، دولت مند یا علمی صلاحیت کا ہونا ضروری تھا۔ ان میں سے بھی ہر فرد کو ممبر نہیں بنایا جاتا تھا بلکہ اس کے رجحانات اور شخصیت کی مکمل چھان بین کے بعد ہی اسے ممبر بنایا جاتا تھا پھر اس سے ایک خاص تقریب میں حلف لیا جاتا تھا جس میں صرف اس سے اوپر درجے کے لوگ شریک ہوتے۔ فری میسنری میں ممبران کی شناخت ایک دوسرے سے بھی خفیہ رکھی جاتی تھی۔ تقریبات میں ممبران عام طور سے چہرے پر نقاب لگا کر آتے تھے۔ ایک درجے کے ممبر ایک دوسرے سے واقف ہو سکتے ہیں لیکن وہ اپنے اوپر کے ممبروں سے واقف نہیں ہوتے جب تک وہ خود ان کے سامنے نہ کھل جائے۔ عام طور سے حکومتوں میں شامل کار پردازوں کی شناخت خفیہ رکھی جاتی تھی لیکن دولت مندوں، بڑے تاجروں، صنعت کاروں اور عوام میں مشہور افراد کے بارے میں جان کر یہ خبر پھیلائی جاتی تھی کہ وہ بھی فری میسن ہیں تاکہ عوام میں فری میسنری کے بارے میں اچھا تاثر پیدا ہو۔

ابتدائی فری میسنریوں کے بارے میں بہت کم معلومات ہیں۔ جو لوگ فری میسن بن جاتے تھے وہ اس بات کو چھپاتے تھے۔ انگلینڈ کے شاہ ہمیشہ سے سیکولر مزاج رکھنے والے تھے اور وہ چرچ کو اس سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے کہ وہ ان کے سر پر تاج رکھ دے۔ جس اولین حکمران کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ وہ فری میسن ہو سکتا تھا وہ شاہ اولیور کرامویل تھا جو چارلس اول کو پھانسی دے کر اقتدار میں آیا تھا۔ اس نے ملک میں آمریت قائم کی تھی اور وہ شاہی تاج پر مذہبی غلبے کے سخت خلاف تھا۔ شاہ رچرڈ کا دور یہودیوں کے لیے سخت تھا کیونکہ وہ مذہبی خیالات رکھتا تھا اور یہودیوں کے بارے میں تعصب پرست تھا۔

اسی شاہ رچرڈ کو جسے شیر دل رچرڈ بھی کہتے ہیں صلیبی جنگ سے واپسی پر فرانس میں ہونے والی ایک لڑائی میں قتل کر دیا گیا۔ اس کے بارے میں مشہور ہے اس کا قاتل ایک فرانسیسی فری میسن تھا اور اسے شاہ رچرڈ کو قتل کرنے کی ذمے داری سونپی گئی تھی۔ یوں ہمیں فری میسنری آغاز سے ہی بین الاقوامی سازشوں میں ملوث نظر آتی ہے۔ دوسری طرف یہودی شاہ رچرڈ کے بھائی کی حمایت کر رہے تھے جو سیکولر مزاج رکھتا تھا اور عیش و عشرت کا عادی تھا۔ اس نے اپنی فرانسیسی محبوبہ سے شادی کیے بغیر بادشاہ بنتے ہی ملکہ کا درجہ دے دیا تھا۔ اس کی ماں بھی فرانسیسی شاہی خاندان سے تھی اور شاہ ہنری کی بھتیجی تھی لیکن وہ کٹر مذہبی خیالات رکھتی تھی اور شاہ رچرڈ کو مذہبی جنونی بنانے میں اسی عورت کا ہاتھ تھا۔ لیکن دوسرا بیٹا اس کے قابو سے باہر تھا۔ وہ بیوی کی وجہ سے ماں سے نفرت کرتا تھا۔ ماں نے صرف بیٹے کی مخالفت میں ملک میں جمہوریت پسندوں کا ساتھ دیا۔

اس وقت انگلینڈ میں عوام اور امرا جمہوریت کا مطالبہ کر رہے تھے اور وہ شاہ کے اختیارات محدود کرنا چاہتے تھے۔ اس مطالبے کے پیچھے بھی فری میسنریوں کا نام لیا جاتا ہے۔ یہ یہودیوں کا پرانا کھیل ہے وہ دونوں فریقوں کو ہاتھ میں رکھتے ہیں تاکہ ہوا ان پر آنچ نہ آئے۔ جیسے رومیوں اور شامیوں میں آویزش کے وقت دونوں فریقوں کی مالی مدد کرتے تھے۔ بعد میں رومن شام کے علاقے پر قابض ہو گئے تو انہوں نے ان سے مذہبی معاملات میں دخل نہ کرنے کا معاہدہ کر لیا۔ یہودیوں نے اسی معاہدے کے تحت رومیوں سے حضرت عیسیٰؑ کے خلاف عدالتی کارروائی کروائی تھی اور انہیں سولی کی سزا دلوائی۔ حالانکہ رومن گورنر اس سزا کے خلاف تھا، آخری حربے کے طور پر اس نے یہودیوں کے سامنے یہ اختیار رکھا کہ سولی کی سزا ایک بدنام زمانہ چور اور قاتل کو دی جائے اور حضرت عیسیٰؑ کو چھوڑ دیا جائے لیکن یہودی علما نے متفقہ ہو کر کہا۔ ”چور کو چھوڑ دیا جائے لیکن عیسیٰؑ کو سولی دی جائے۔“

تیرھویں صدی تک انگلستان کے یہودی اتنے طاقتور ہو چکے تھے کہ ایک طرف وہ فری میسنری کے ذریعے خواص کو اپنے قابو میں لا رہے تھے دوسری طرف وہ براہ راست شاہ انگلستان کے انتخاب میں بھی دخل اندازی کرنے لگے تھے۔ کرامویل کے دور میں یہ بات ثابت بھی ہو چکی تھی۔ وہ جسے چاہتے اسے تخت تک پہنچا کر دم لیتے تھے چاہے اس کے لیے انہیں کیسی ہی سازشیں کیوں نہ کرنی پڑیں۔ مگر ساتھ ہی وہ خود کو ان معاملات سے الگ تھلگ ظاہر کرنے کی بھی پوری کوشش کرتے تھے۔ وہ کسی دیمک کی طرح اندر سے کسی ملک کو چاٹ جاتے اور آخر تک ان کا وجود کہیں نظر نہیں آتا۔ یہی وجہ ہے کہ اقتدار کے کھیل میں بہ ظاہر کہیں بھی یہودیوں نظر نہیں آتے تھے۔ حالانکہ وہ موجود ہو پوری طرح۔

فری میسنری کے باقاعدہ خدوخال 1717ء کے بعد واضح ہوئے جب ایک کے قواعد وضوابط تحریر کی صورت میں لائے گئے اور اس کا تنظیمی خاکہ بنایا گیا۔ تنظیم کے لحاظ سے فری میسنری کے کئی شعبے ہو سکتے ہیں۔ لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ کسی ملک میں یہ تمام شعبے موجود ہوں۔ ملک کی اہمیت کے لحاظ سے یہاں مکمل فری میسنری یا اس کا کچھ شعبے کام کرتے ہیں۔ پاکستان میں بھی انگریزوں کے دور سے ایک فری میسن لاج کام کرتا آیا ہے۔ یہ کراچی میں فریئر ہال میں تھا اب پتا نہیں یہ فری میسن لاج قائم ہے یا نہیں۔

تنظیم کے شعبے یہ ہیں۔

”فری میسنری، گرینڈ لاج، میسونک لاج، میسونک لاج آفیسرز، گرینڈ ماسٹر، پرنس ہال فری میسنری اور ریگولر میسونک جیوریڈکشنز۔“

کئی صدیوں کے ارتقاء کے بعد فری میسنری تحریک ایک سوسائٹی کے روپ میں سامنے آئی۔ اس کے قواعد وضوابط تشکیل پائے اور سب سے اہم بات کہ فری میسنری اتنے طاقت ور ہو گئے کہ اب وہ کھل کر کام کر سکتے تھے کیونکہ ملک کے اعلیٰ ترین عہدیدار فری میسنری تھے۔ اٹھارویں صدی کے بعد سے انگلستان میں شاہی خاندان کے اکثر ارکان اور لارڈز بھی اس سوسائٹی کے ممبر بن چکے تھے، ان میں اکثریت اپنی وابستگی چھپاتے تھے۔ پارلیمنٹ میں فری میسن سے وابستگی رکھنے والوں کی اکثریت ہو گئی تھی، چاہے یہ کسی بھی پارٹی سے تعلق رکھتے ہوں۔

فری میسنری کو اپنی سرگرمیاں جاری رکھنے کی مکمل اجازت تھی اور پولیس بھی ان کی سرگرمیوں میں مداخلت کی مجاز نہیں تھی۔ ان کے خلاف کسی شکایت پر پولیس خود کارروائی کی مجاز بھی نہیں تھی اور اسے وزارت داخلہ کو اس بارے میں رپورٹ کرنا پڑتی تھی۔ لیکن دفتر جا کر یہ رپورٹ کہاں غائب ہو جاتی تھیں اس کا کچھ علم نہیں۔ اٹھارویں صدی کے دوران جب فری میسنری منظم اور نہایت طاقتور ہو چکے تھے تب تو ان کے خلاف کارروائی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن اس سے بھی پہلے عام افراد کی طرف سے فری میسنری کے خلاف کی جانے والی شکایت کا کوئی بھی نتیجہ سامنے نہیں آتا تھا۔

منظم ہونے سے پہلے، سترھویں صدی کے دوران پورے انگلستان، آئرلینڈ اور اسکاٹ لینڈ سے فری میسنری کے خلاف سینکڑوں شکایات ریکارڈ کا حصہ بنیں اور ان میں سے بعض تو نہایت سنگین نوعیت کی تھیں جن سے براہ راست کوئی فرد یا طبقہ متاثر ہوا تھا۔ لیکن ان پر کسی قسم کی کوئی تحقیق نہیں ہوئی یا اگر ہوئی تو اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا تھا۔ ایسی ہی ایک شکایت ویلز کے ایک چھوٹے سے قصبے بیلا کے لوگوں نے مقامی فری میسنری لاج کے بارے میں کی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ یہاں جادوٹونے کی رسومات ادا کی جاتی ہیں اور ان میں انسانی جانوں کی قربانی دی جاتی ہے۔ قربانی کے لیے بچے اور نوجوان دوشیزائیں ان کے گاؤں سے اغوا کی جاتی ہیں۔ یہ شکایت مقامی شیرف کے دفتر میں کی گئی۔

شیرف آفس کے انچارج افسر نے اس درخواست کو مسترد کر دیا۔ اس نے گم شدگیوں کو معمول کے مطابق قرار دیا تھا اور ان کے خلاف کسی قسم کی کارروائی سے انکار کر دیا۔ لیکن دیہاتیوں کی درخواست ریکارڈ میں آچکی تھی اور اب تاریخ کا ایک حصہ ہے۔

ایسی ہی ایک درخواست شمالی انگلستان کے ایک ساحلی قصبے کے میئر نے کی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ جب سے ان کے علاقے میں فری میسنری نے اپنی سرگرمیاں شروع کی ہیں وہاں جانوروں میں وبائیں پھیلنے لگی ہیں اور کسانوں کے کھیت خراب ہو جاتے ہیں۔ وہ جو فصل لگاتے ہیں وہ اُگتی نہیں ہے یا اُگتی ہے تو کچھ دن بعد جل جاتی ہے۔ میئر نے اپنی درخواست میں اس بات کی نشان دہی کی کہ قصبے کے وہ لوگ جو فری میسن ہیں ان کے مویشیوں کو نہ تو وبائیں لگتی ہیں اور نہ ان کی فصلیں خراب ہو رہی ہیں۔ میئر نے خبردار کیا کہ اگر حکومت نے جلد اس معاملے میں کوئی قدم نہیں اُٹھایا تو جلد مشتعل لوگ قانون اپنے ہاتھ میں لے لیں گے۔ لیکن اس درخواست کا نتیجہ یہ نکلا کہ حکومت کی جانب سے علاقے میں ایک فوجی دستہ بھیج دیا گیا جو فری میسن ممبران کی حفاظت کرنے لگا۔ میئر کی شکایت پر کوئی توجہ نہیں دی گئی۔

ایسی ہی سینکڑوں شکایات ملک بھر سے حکومت کو موصول ہو رہی تھیں لیکن ان پر کوئی کارروائی نہیں کی جاتی تھی۔ جہاں لوگ از خود فری میسنری کے خلاف کارروائی کرنا چاہتے تھے وہاں پولیس اور فوج میدان میں آجاتی اور لوگوں کو روک دیا جاتا تھا۔ مگر حکومت ہر جگہ ان کی حفاظت نہیں کر سکی تھی۔ آئرلینڈ کے شہر بلفاسٹ میں قائم ایک فری میسنری اسٹون میسن پر مقامی افراد چڑھ دوڑے اور انہوں نے اس کے اندر گھس کر توڑ پھوڑ کرنے کے بعد اسے آگ لگا دی۔ اس ہجوم کی قیادت ایک مقامی راہب کر رہا تھا جو یہودیوں سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نفرت کرتا تھا۔اس نے مقامی لوگوں کو اُکسایا کہ اس عمارت میں جادوگری کی رسمیں ادا کی جاتی ہیں اور اس کے نتیجے میں یہاں وبائی امراض پھیلتے ہیں۔ان دنوں طاعون نے انگلستان میں تباہی پھیلا رکھی تھی۔مرض کی شدت سے ہر تین میں سے ایک آدمی مر چکا تھا۔لاشوں کے ڈھیر اتنے تھے کہ دفنانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اس لیے لاشوں کو ایک جگہ جمع کر کے ان پر تیل چھڑک کر آگ لگا دی جاتی تھی۔

لوگ پہلے ہی پریشان تھے اس لیے جب ان کو فری میسنری کے خلاف اکسایا گیا تو وہ اس کے مقامی اسٹون میسن پر چڑھ دوڑے اندر قربان گاہ اور ایسا سامان نظر آیا جو جادوگری میں استعمال ہوتا ہے تو انہوں نے عمارت کو آگ لگا دی لیکن کوئی فری میسن ہاتھ نہیں آیا تھا کیونکہ وہ فرار ہو گئے تھے۔بعد میں راہب کو گرفتار کر لیا گیا اور اسے مقامی لارڈ کی عدالت نے جلاوطن کر دیا تھا۔یہ واحد پرتشدد واقعہ تھا جو آئرلینڈ میں فری میسنری کے خلاف پیش آیا تھا۔راہب کے خلاف جس لارڈ کی عدالت میں مقدمہ چلا اس کے بارے میں خیال تھا کہ وہ خود بھی فری میسن ہے۔

ان چند واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ فری میسنری نے اپنی نادیدہ گرفت میں انگلستان کو کس طرح جکڑ لیا تھا۔یہاں بادشاہ تک قانون کے آگے جواب دہ تھا لیکن فری میسنری ہر قسم کے قانون کی گرفت سے آزاد تھے اور ان کا تحفظ ریاست کی ذمے داری تھی۔اٹھارویں صدی میں فری میسن باقاعدہ منظم ہوئے اور سوسائٹی کے خدوخال کو دستاویزات کی صورت میں پیش کیا گیا۔اس وقت سوسائٹی کا مقصد کنگ سولومن ٹیمپل کی ازسرِنو تعمیر قرار پایا۔

☆☆☆

اٹھارویں صدی میں فری میسنری انگلستان میں منظم ہوئے کہ لوگ فری میسنری کو ایک ایسی خفیہ تنظیم تصور کرتے تھے جو جادوگری کے ذریعے لوگوں کو اپنے اثر میں لے لیتی تھی عام خیال تھا کہ اس کے ممبران جادوگری اور قربانی کی قدیم و پراسرار رسومات ادا کرتے تھے۔کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ رسومات کس طرح اور کس مقصد کے لیے ادا کی جاتی تھیں۔فری میسنری کے اکثر اراکین غیر یہودی تھے لیکن اس کی اصول وقواعد اور اصطلاحات سراسر یہودی ہوتی تھیں۔

ایک بات کی وضاحت کر دی جائے کہ عیسائیت بہ ظاہر یہودیت سے الگ مذہب ہے لیکن اس کی جڑیں یہودیت میں ہی پیوست ہیں کیونکہ عہد نامہ قدیم یعنی توریت عیسائیوں کے لیے بھی مقدس کتاب ہے اس کے ساتھ ہی عہد نامہ جدید بائبل کی صورت میں موجود ہے۔بنی اسرائیل کے پیغمبروں کے بارے میں عیسائیوں کے خیالات اور عقائد بھی وہی ہیں جو یہودیوں کے ہیں۔عقائد،عبادات اور رسومات کے طریقہ کار میں فرق کے باوجود عیسائیت اصل میں یہودیت کی ایک بڑھی ہوئی شاخ ہے۔اس میں اور یہودیت میں بنیادی فرق تبلیغ کا ہے یہودیت میں تبلیغ اور کسی کو یہودی بنانے کا کوئی تصور نہیں ہے۔وہ احکامات خداوندی اور شریعت موسیٰؑ کو صرف بنی اسرائیل کے لیے مخصوص سمجھتے ہیں۔یعنی یہودی صرف نسلی ہو سکتا ہے۔جب کہ عیسائیت میں وسعت پذیری ہے اس میں ہر قوم اور نسل کا فرد شامل ہو سکتا ہے۔یہی وجہ ہے عددی لحاظ سے عیسائیت ایک بڑا مذہب ہے۔

عیسائیت میں بھی بہت ساری اصطلاحات یہودیوں کی ہی استعمال کی جاتی ہیں۔اس کے برعکس یہودی عیسائیت کی کسی چیز کو قبول نہیں کرتے ہیں کیونکہ ان کے لیے یہ ان کے دین میں اضافہ ہے لیکن عیسائی قدیم بنیادی مذہب کو مانتے ہیں کیونکہ وہ ان کی اصل بھی ہے۔جیسے مسلمان اپنے مذہب پر عمل کرنے کے باوجود قدیم پیغمبروں اور ان پر نازل ہونے والی کتابوں پر بھی یقین رکھتے ہیں اور اسے اپنے ایمان کا ایک حصہ قرار دیتے ہیں۔ہماری تاریخ وہی ہے جو بنی اسرائیل اور بنو اسماعیل کی ہے۔

اب قارئین کے لیے سمجھنے میں آسانی ہوگی کہ عیسائی یہود دشمن ہونے کے باوجود اتنی آسانی سے فری میسنری کی طرف راغب کیسے ہو گئے۔کیونکہ اس سوسائٹی میں صرف وہی مذہبی اصطلاحات اور رسومات رکھی گئی تھیں جو بیک وقت عیسائیوں اور یہودیوں کے لیے قابل قبول ہوں۔بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ عیسائی بھی انہیں مانتے ہیں اس لیے ان کے لیے فری میسنری ہونا اتنا مشکل نہیں تھا۔اٹھارویں صدی میں دیکھتے ہی دیکھتے فری میسنری کامیاب ترین سوسائٹی بن گئی۔ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اعلیٰ طبقے کے کسی فرد کے لیے فری میسن نہ ہونا بہت تعجب کی بات سمجھا جاتا تھا۔خاص طور سے انگلستان میں اس کی کامیابی غیر معمولی تھی۔انگلستان میں اس کا گرینڈ لاج قائم ہوا۔پھر یورپ کے دوسرے ملکوں میں بھی اس کے لاجز اور گرینڈ لاجز بننے لگے۔سوسائٹی میں بنیادی حیثیت گرینڈ لاج کو حاصل ہوتی ہے۔یہاں سے ملک میں فری میسنری کے تمام امور کی نگرانی کی جاتی ہے۔عام لاجز بے شمار ہو سکتے ہیں لیکن گرینڈ لاج ایک ہی ہوتا ہے۔کیونکہ عام لاجز کے بنے

پر کوئی پابندی نہیں تھی اس لیے جلد مغربی یورپ میں کئی اراکین لاجز بن چکے تھے۔یہ اتنی تیزی سے پھیلے کہ بیسویں صدی کے آغاز میں یورپ کا شاید ہی کوئی ایسا قابل ذکر شہر ہو جہاں فری میسنری لاجز نہ ہوں۔اس وقت فری میسن کی تعداد لاکھوں تک جا پہنچی تھی۔

برصغیر میں بھی سوسائٹی نے لاجز بنائے اور شاید ہی کوئی اہم شہر ایسا ہو جہاں فری میسنری کا کم سے کم ایک لاج نہ ہو۔سوسائٹی کا بنیادی مقصد واضح کر دیا گیا تھا کہ وہ ہیکل سلیمانی اور قدیم یہودی سلطنت کا احیا چاہتے تھے لیکن اس بات کا پرچار پریس اور رسائل میں بہت کم کیا جاتا تھا۔فری میسنری صحافیوں سے روابط نہیں رکھتے تھے اور نہ ہی سوسائٹی میں پریس ریلیز جاری کرنے کی روایت تھی۔ان کا انداز یہ ہوتا تھا کہ دنیا ہمارے بارے میں جو چاہے کہے ہم اس کی تردید یا تصدیق کیے بغیر اپنا کام جاری رکھیں گے۔یہی وجہ ہے کہ آج تک کسی بڑے فری میسن عہدیدار کی طرف سے سوسائٹی کے اغراض ومقاصد کے بارے میں کچھ سامنے نہیں آیا ہے۔حالانکہ اس سوسائٹی کو قائم ہوئے صدیاں بیت چکی ہیں لیکن اس کے گرد چھائی پراسراریت کی دھند آج بھی موجود ہے۔اس کے اصل کرتا دھرتا کون ہیں اور اس کا تنظیمی طریقہ کار کیا ہے نیز اس کے مقاصد کے حصول کے لیے کیا ذرائع اختیار کیے جاتے ہیں یہ سب راز میں ہے۔کہتے ہیں کہ فری میسنری میں راز داری کی اتنی اہمیت ہے کہ اگر کوئی فری مسن سوسائٹی کے راز فاش کرنے کا ارادہ کرے تو یہ اسے عمل کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے ہیں۔

اٹھارویں صدی میں فری میسنری کھل کر سامنے آئی اس کی کچھ وجوہات تھیں۔پہلی وجہ تو سوسائٹی کا طاقتور ہونا اور حکومتوں پر مکمل غلبہ حاصل کرنا تھا۔دوسری اہم وجہ اب وقت آ گیا تھا کہ سوسائٹی اپنے مقصد کے حصول کے لیے عملی کام کرے اور یہ مقصد اسرائیل کا قیام تھا۔ویسے تو اسرائیل ہر یہودی کے ذہن میں قائم تھا لیکن اب وہ اسے اس کی پرانی حیثیت میں اور درست مقام پر قائم کرنا چاہتے تھے۔مگر اسرائیل کے قیام میں سب سے بڑی رکاوٹ سلطنتِ عثمانیہ تھی۔اس وقت سارا مشرق وسطیٰ اور افریقا تک سلطنتِ عثمانیہ کا ایک حصہ تھا۔ترکی کے مسلم خلیفہ اگرچہ روایتی طور پر فراخ دل اور تعصب سے پاک تھے۔سلطنت میں یہودیوں کو مکمل آزادی حاصل تھی لیکن جب صیہونیت کے بانی کارل تھیوڈور ہرزل نے خلیفہ سے ملاقات کی اور اسے پیش کش کی اگر خلیفہ یہودیوں کو فلسطین میں زمین خریدنے اور آباد ہونے کی اجازت دے دیں تو یہودی سلطنت پر چڑھا تمام قرض اُتارنے کے لیے تیار ہیں۔

یہودیوں کو امید تھی کہ خلیفہ ان کی بات مان جائے گا۔لیکن خلیفہ نے نہایت حقارت سے کارل ہرزل کی یہ پیش کش مسترد کر دی اور اس سے کہا۔"اگر تم فلسطین میں صرف ایک گز زمین کے بدلے بھی یہ پیش کش کرو تو میں قبول نہیں کروں گا۔ہم نے یہ زمین بہت خون دے کر حاصل کی ہے،کوئی ہم سے اسے صرف خون کے بدلے حاصل کر سکتا ہے۔"

خلیفہ کے اس جواب نے یہودیوں کو سلطنتِ عثمانیہ کا دشمن بنا دیا اور وہ اسی دن سے اس کے خلاف سازشوں میں لگ گئے۔مغربی ممالک اور خاص طور سے برطانیہ ان کی پشت پر تھا۔برطانیہ کی نظریں خاص طور سے مشرق وسطیٰ پر مرکوز تھیں لیکن جب تک عثمانی اس علاقے پر قابض تھے یہاں ان کی دال گلنا مشکل تھی۔لارنس آف عربیہ تو صرف ایک ایجنٹ تھا،بیسویں صدی کے آغاز میں ایسے لاتعداد برطانوی ایجنٹس مشرق وسطیٰ میں سرگرم تھے اور ان کا مقصد یہاں سے سلطنتِ عثمانیہ کا خاتمہ کرنا تھا۔بالآخر ان کی سازشیں رنگ لائیں۔عرب ترکوں کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے اور بیشتر عرب علاقوں میں ترکوں کے خلاف بغاوت پھیل گئی۔اس میں شریف مکہ کا کردار اہم تھا کیونکہ وہ یہاں سب سے اہم برطانوی مہرہ تھا۔

یورپ اور پھر روس سے جنگوں نے عثمانی سلطنت کو کمزور کر دیا تھا اور اس کے یورپی مقبوضات ایک ایک کر کے اس کے ہاتھ سے نکلتے جا رہے تھے۔روس نے شیشان کا علاقہ چھین لیا تھا اور آرمینیا اور آزربائیجان پر بھی اس کا قبضہ ہو چکا تھا۔اب اس کی حریص نظریں ترکی کے ایشیائی علاقوں پر مرکوز تھیں۔فوجی لحاظ سے ترکی اس وقت بھی بہت طاقتور تھا اس کا توپ خانہ دنیا میں سب سے بڑا اور جدید تھا۔دنیا کی تیسری بڑی بحریہ ترکوں کی تھی۔لیکن معاشی لحاظ سے سلطنت زوال پذیر تھی۔صنعتی انقلاب میں اس کا حصہ نہ ہونے کے برابر تھا حالانکہ علمی اور سائنسی لحاظ سے ترک کسی طرح پیچھے نہیں تھے۔لیکن ایک طرف یورپی ممالک اس کے دشمن ہو رہے تھے،صدیوں بعد انہیں بدلہ لینے کا موقع مل رہا تھا،وہ مسلمانوں کے اس مرکز کو بہر صورت ختم کر دینا چاہتے تھے۔اسے ختم کیے بغیر وہ مسلم ممالک پر غلبہ نہیں پا سکتے تھے اور مسلم ممالک پر غلبہ پائے بغیر فری میسنری کا مقصد پورا نہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوسکتا تھا یعنی ہیکل سلیمانی کی دوبارہ تعمیر۔

اپنی سازشوں میں یہودیوں کو مغربی ممالک اور امریکا کی ۔ خاص طور امریکا بسایا ہی یہودیوں کے لیے تھا۔ نیویارک کی وال اسٹریٹ پر یہودی ہمیشہ سے قابض رہے ہیں اور وال اسٹریٹ سرمایہ دارانہ نظام کی جڑ ہے۔ دنیا کی دو تہائی دولت اس چند مربع میل کے علاقے میں پائی جاتی ہے۔ پھر وہائٹ ہاؤس اور پنٹاگون جیسی خالص یہودی اصطلاحات کا حامل واشنگٹن یہودیوں کے قبضے میں کیوں نہ ہوتا۔ یہاں یہودیوں کی طاقت کا مرکز وہائٹ ہاؤس یا پنٹاگون نہیں ہیں بلکہ یہ مرکز ایک کسی قدر غیر معروف جگہ ہے جسے فیڈرل ریزرو کہا جاتا ہے۔

فیڈرل ریزرو وہ ادارہ ہے جسے امریکا میں ڈالرز چھاپنے کا اختیار حاصل ہے اور یہ مکمل طور پر خود مختار ادارہ ہے۔ کس قدر تعجب کی بات ہے، دنیا کا چھوٹے سے چھوٹا اور معمولی سا ملک بھی اپنی کرنسی خود چھاپنے کا اختیار رکھتا ہے لیکن سپر پاور امریکا اس معاملے میں اتنا بے بس ہے کہ اپنی کرنسی خود چھاپنے کا اختیار نہیں رکھتا ہے بلکہ یہ اختیار یہودیوں اور سرمایہ داروں کے نمائندے فیڈرل ریزرو کے پاس ہے۔ وہ جب چاہے اور جتنی تعداد میں چاہے ڈالرز چھاپ سکتا ہے۔ امریکی حکومت اسے چھاپنے یا نہ چھاپنے کا مشورہ دے سکتی ہے لیکن مجبور نہیں کرسکتی۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد بعض ڈیموکریٹس سیاستدانوں نے ایک تحریک شروع کی کہ فیڈرل ریزرو کو لازماً امریکی حکومت کے کنٹرول میں ہونا چاہیے۔ لیکن ری پبلکن کی جانب سے اس کی مخالفت کی گئی اور تحریک دب گئی۔

پھر جب صدر کینیڈی اقتدار میں آیا تو اس نے فیڈرل ریزرو کو حکومت کے تحت لینے کا منصوبہ بنایا لیکن اس سے پہلے وہ اس پر عمل کرتا اسے قتل کردیا گیا۔ بہ ظاہر اس کا قاتل بوتھا تھا لیکن بعد میں ایسے شواہد سامنے آئے کہ کینیڈی کا قتل اصل میں کہیں اور سے ہوا تھا اور بوتھا کی چلائی گولیوں سے صدر کینیڈی کی موت واقع نہیں ہوئی تھی۔ ویڈیو کا جب جدید تکنیک سے جائزہ لیا گیا تو پتا چلا کہ صدر کو گولی سامنے سے لگی تھی۔ یعنی بوتھا کو صرف استعمال کیا گیا تھا۔ اسے پولیس نے گرفتار کرنے سے پہلے مار دیا۔ یوں یہ راز ہمیشہ کے لیے چھپ گیا۔ تعجب کی بات ہے کہ صدر کینیڈی کے قتل کی سازش میں فیڈرل ریزرو والے معاملے کا کہیں بھی ذکر نہیں ہے بلکہ اس کا ملبہ سی آئی اے پر ڈال دیا۔ کہانی یوں بنی کہ صدر کینیڈی نے سی آئی اے کے بال و پر کترنے کا فیصلہ کیا کیونکہ یہ اکثر اپنی حدود سے تجاوز کرکے اہم ملکی معاملات میں دخل دینے لگی تھی۔ یہ بات سی آئی اے کے خفیہ حلقوں کو پسند نہیں آئی اور انہوں نے صدر کینیڈی کو سازش کے تحت قتل کرادیا۔ لیجیے معاملہ ہی نمٹ گیا۔ فیڈرل ریزرو اور یہودیوں کا کہیں نام نہیں آیا۔ سی آئی اے کو کوئی فرق نہیں پڑا تھا کیونکہ وہ پہلے ہی خاصی بدنام تھی۔

تقریباً یہی معاملہ صدر لنکن کے ساتھ پیش آیا۔ وہ متوسط طبقے سے اٹھ کر امریکی صدارت تک پہنچا تھا۔ اس کی زندگی محنت اور جفاکشی کا نمونہ تھی جب اس نے امریکی اقتدار پر یہودیوں کے گہرے سائے محسوس کیے تو اس نے ان کے اثر کو کم کرنے کی کوشش کی۔ اسے بھی قتل کردیا گیا اور الزام ایک سفید فام انتہا پسند پر لگادیا جو سیاہ فاموں کو غلامی سے آزاد کرانے پر لنکن سے ناراض تھا۔ ان دو مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ فری میسنری یا یہودی امریکا میں کس قدر طاقتور ہیں۔ یہاں انہوں نے نام بدل کر خفیہ کلب بنا رکھے ہیں۔ ایسے کلبس میں امریکی ایوان نمائندگان اور صدارت کے امیدواروں کو منتخب کیا جاتا ہے۔ گزشتہ ڈیڑھ سو سال میں ایک بھی امریکی صدر ایسا نہیں ہے جس کا انتخاب پہلے ان کلبس میں نہ ہوا ہو اور جسے یہودیوں کے یہ کلبس صدارت کے لیے چن لیں وہی امریکی صدر بنتا ہے۔ دنیا کا یہ طاقتور ترین ملک کس طرح سے یہودیوں کا غلام ہے خود امریکی بھی اس بارے میں بہت کم جانتے ہیں۔

انگلستان کے مقابلے میں امریکی ایوان اقتدار پر یہودیوں کا اثر بہت زیادہ ہے۔ حالانکہ امریکا میں فری میسنری انگلستان کے مقابلے میں بہت بعد میں آئی۔ اگرچہ یہودی بہت پہلے امریکا میں آباد ہوچکے تھے۔ جب نیویارک میں پہلی باقاعدہ آبادی بنی تو اس وقت یہودی پہنچ گئے تھے۔ ان میں ہالینڈ سے تعلق رکھنے والے یہودی بھی تھے۔ ڈچ آبادی ایک دیوار کے پیچھے محدود تھی اور اس علاقے کو وال اسٹریٹ کہا جاتا تھا۔ یہی وال اسٹریٹ آج دنیا کا معاشی حب ہے۔ اس وقت امریکا پر برٹش راج تھا اور یہاں بھی گورنر حکومت کرتے تھے۔ برطانوی راج کی آڑ میں یہودیوں اور فری میسنری نے خود کو خوب مضبوط کیا اور جب انہوں نے محسوس کیا کہ اب انہیں برطانوی راج کے پردے کی ضرورت نہیں ہے تو انہوں نے امریکا کی آزادی کی حمایت شروع کردی۔ یہاں بھی یہودیوں نے وہی کھیل کھیلا۔ وہ جنرل جارج

واشنگٹن کی پارٹی کو بھی رقم دے رہے تھے اور برطانیہ کو بھی جنگ کے لیے قرض فراہم کررہے تھے۔ جارجیا میں قائم بارود سازی کی فیکٹری بیک وقت دونوں فریقوں کو گولہ بارود فراہم کررہی تھی اور یہ ایک یہودی کی ملکیت تھی۔ یہ بات یقینی ہے اس جنگ میں یہودیوں نے خوب فائدہ اُٹھایا۔ واشنگٹن کامیاب رہا اور امریکی ہمیشہ کے لیے یہودیوں کے چنگل میں پھنس گئے۔

پہلی جنگ عظیم میں یہودیوں نے اپنے اس مہرے کو کھل کر استعمال کیا۔ انہیں ترکی کی سلطنت سے بدلہ چکانا تھا اور اب وقت آگیا تھا کہ وہ فلسطین میں اپنی حکومت قائم کرتے۔ لیکن اس وقت برطانیہ ہی عالمی طاقت تھا اور امریکا پس منظر میں تھا۔ پہلی جنگ عظیم نے برطانیہ کے ساتھ کئی یورپی طاقتوں کے کس بل نکال دیئے تھے سب سے بڑھ کر ترکی شکست کھا گیا اور اس کے حصے بخرے کردیے گئے۔ فری میسنری کامیاب رہے انہوں نے خلافت کا خاتمہ کرکے اپنا بدلہ لے لیا تھا لیکن ابھی یہودی سلطنت قائم کرنے کے لیے مزید کام کرنا تھا۔ ترکی کو عرب ممالک سے بے دخل کرکے اس پورے خطے کو چھوٹی چھوٹی مملکتوں میں تقسیم کرکے ان پر مغرب کے پٹھو حکمران بٹھادیے گئے۔

پہلی جنگ عظیم میں یہودیوں نے برطانیہ کے لیے جو خدمات انجام دی تھیں ان کا صلہ انہوں نے فلسطین کی صورت میں مانگ لیا اور برطانیہ نے نہایت فراخ دلی سے مسلم علاقے یہودیوں کو عطا کردیے۔ جہاں صدی کے آغاز میں ایک بھی یہودی نہیں تھا وہاں دوسری جنگ عظیم تک دس لاکھ یہودی آچکے تھے۔ انہوں نے رقم کا لالچ، جبر، دھوکا اور سیاست کو استعمال کرکے فلسطین میں بہت بڑی زمین حاصل کرلی لیکن ابھی ایک مملکت کا قیام دور تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد امریکا دنیا کی سب سے بڑی سپر پاور بن گیا اور اس کی آشیرواد سے اقوام متحدہ نے فلسطین کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کرکے اس کا بڑا حصہ یعنی پچپن فیصد یہودیوں کو دے دیا اور اسرائیل کا وجود عمل میں آگیا۔

فری میسنری کا اثر جرمنی میں اگرچہ انگلستان جتنا نہیں تھا لیکن یہاں بھی شاہ اور اس کے مصاحب اس کے اثر سے محفوظ نہیں تھے۔ جرمنی وہ ملک تھا جہاں یہودی سب سے بڑی تعداد میں آباد تھے۔ یہ ملک کی کل آبادی کا تین فیصد تھے۔ آٹھ کروڑ کی آبادی میں ان کی تعداد صرف پچیس لاکھ بنتی تھی۔ لیکن پہلی جنگ عظیم کے بعد یہ تین فیصد یہودی ملک کی ستانوے فیصد صنعتوں، سو فیصد بینکوں اور مالیاتی اداروں کے مالک بن چکے تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ معاشی لحاظ سے انہوں نے جرمنوں کو بالکل ہی غلام بنا لیا تھا۔ اس کا فطری نتیجہ نازی ازم کی صورت میں نکلا۔ ایڈولف ہٹلر ایک انا کا مارا تھا ذہنیت کا بیمار تھا۔ پھر بھی اس نے یہ درست نتیجہ نکالا کہ اگر یہودیوں کے چنگل سے ملک کو نہ نکالا گیا تو جرمن کبھی ترقی نہیں کرسکیں گے۔ اس نے نازی فلسفہ ایجاد کیا اور یہودیوں کے خلاف نفرت پھیلانے لگا۔ درحقیقت یہ نفرت پہلے سے جرمنوں میں موجود تھی۔ جرمن محسوس کرتے تھے کہ تین فیصد یہودی ان کا استحصال کررہے ہیں۔ اسی بنا پر نازی پارٹی کو حیرت انگیز مقبولیت حاصل ہوئی۔ ہٹلر اقتدار میں آیا اور اس نے جنگ کی تیاری شروع کردی۔

لیکن کیا دوسری جنگ عظیم اور یہودیوں کا قتل عام صرف ہٹلر کے سر جاتا ہے؟ کیا دوسروں کا اس میں کوئی ہاتھ نہیں تھا؟ اس کا جائزہ لینے کے لیے عام یہودیوں پر فری میسنری کے اثر کا جائزہ لینا ہوگا۔ یہ بات نہایت تعجب انگیز ہے کہ فری میسنری میں یہودیوں کی تعداد بہت کم تھی، اکثر علاقوں میں تو ایک بھی یہودی کسی بھی لاج کا ممبر نہیں تھا۔ اعلیٰ درجے کے یہودی جن میں تاجر، صنعتکار، سائنس داں اور سوسائٹی میں نمایاں حیثیت رکھنے والے تھے، ان میں سے بھی بہت کم فری میسن تھے۔ ان کے مقابلے عیسائیوں میں شاید ہی کوئی اونچی پوزیشن کا آدمی ہو جو فری میسن نہ ہو۔ اس کا مطلب تھا کہ فری میسنری اصل میں یہودیوں کے لیے بھی نہیں تھی اور اس کا اصل مقصد طاقت کے مراکز کو اپنے قابو میں رکھنا تھا۔ ظاہر ہے سیاسی طاقت یہودیوں کے پاس نہیں تھی۔

فری میسنری نے اپنے دوسرے عہد میں اپنا مقصد کھل کر بیان کردیا تھا کہ وہ ہیکل سلیمانی اور یہودیوں کی قدیم سلطنت کا احیا چاہتے تھے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا عام یہودی بھی ان سے متفق تھے؟ اگر وہ فری میسنری کی طرف نہیں آئے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس کے مقاصد سے متفق نہیں تھے؟ عام لوگوں کی نسبت یہودی ان لوگوں اور ان کے مقاصد سے بہتر واقف تھے۔ کیونکہ ان میں سے کچھ لوگ اس سوسائٹی کے پیچھے تھے اور خود یہودیوں سے رازداری ممکن نہیں تھی۔ یہودی جانتے تھے کہ اگر فلسطین میں اسرائیل کا قیام عمل میں آیا تو ان کو وہاں جانا پڑے گا۔ ابھی تک تو یہودیوں کا کوئی وطن نہیں تھا، اگر کوئی ملک یہودیوں کو جلاوطن کرنا چاہتا تو انہیں لازمی کسی دوسرے ملک بھیجنا پڑتا۔ جب کہ کوئی دوسرا ملک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یہودیوں کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔لیکن اسرائیل بن جانے کی صورت یہودیوں کے پاس متبادل ملک آجاتا اور ان کو مجبور کیا جاتا کہ وہ اپنے ملک چلے جائیں۔ یہودی یہ بھی جانتے تھے کہ اسرائیل فلسطینی مسلمانوں کی لاشوں پر بنے گا اور اس صورت میں مسلمان بھی انہیں چین سے بیٹھنے نہیں دیں گے۔اسرائیل میں رہنے کا مطلب زندگی ایک جنگی مورچے میں گزارنا بھی ہوسکتا تھا۔آج ایک عام اسرائیلی بھی مستقل اعصاب شکن حالات میں زندگی گزار رہا ہے۔اسے نہیں معلوم کہ کب کوئی خودکش فلسطینی بمبار اس کے پاس خود کو اڑا لے یا کوئی راکٹ آکر اس کے گھر پر گرے۔

اسرائیل کے مقابلے میں یہودی یورپ اور امریکا میں سکون اور عیش سے زندگی گزار رہے تھے اور اس زندگی کو چھوڑ کر ایک نئے ملک کو بسانے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھے۔آج بھی یہودیوں کی ایک بہت بڑی تعداد یورپ اور امریکا میں آباد ہے اور کسی صورت اسرائیل جانے کو تیار نہیں ہے۔بلکہ نوے کے عشرے تک اسرائیل ہجرت کا رجحان الٹ گیا ہے اور اب اسرائیلی واپس جارہے ہیں۔حالانکہ اسرائیل میں ان کو ہر ممکن سہولت اور آسائش فراہم کی گئی ہے لیکن وہ جنگ کے ماحول میں نہیں رہنا چاہتے اور اسرائیل کی پالیسی میں امن نام کی کوئی چیز ہی نہیں ہے۔یہ ملک اپنے قیام سے ہی جنگ کی حالت میں ہے اور امریکا اور مغربی طاقتوں سے بے پناہ اسلحہ حاصل کرتا رہا ہے۔پھر اسرائیل اپنے ہاں بھی جدید ترین اسلحہ بناتا ہے۔اس کے پاس غیر مصدقہ اطلاعات کے مطابق دو سے زیادہ ایٹم اور ہائیڈروجن بم ہیں۔ان کے علاوہ بھی اسرائیل نیوکلیئر بموں کی تمام جدید اقسام اپنے پاس رکھتا ہے اور اس کا ذخیرہ دنیا میں چوتھے نمبر پر آتا ہے۔فری میسنری اسرائیل کے خالق اور سب سے بڑے حامی ہیں۔ اس وجہ سے عام یہودی فری میسنری سے دور رہے۔

مگر فری میسنری جانتے تھے کہ کون سا کام کس طرح کرنا ہے۔انہیں معلوم تھا کہ عام یہودی عیش و آرام کی زندگی چھوڑ کر اُجاڑ بیابان اسرائیل جانے پر راضی نہیں ہوگا اس لیے انہوں نے طے کیا کہ اگر یہودی آسانی سے اسرائیل نہیں جائیں گے تو بہت مشکل سے جائیں گے اور ایسا ہی ہوا۔ایک منصوبے کے تحت جرمنی کو جنگ میں دھکیلا گیا اور پھر ہٹلر سے یہودیوں کا قتل عام کرایا۔ساٹھ لاکھ یہودیوں کے قتل کی کہانیاں بنائی ہوئی ہیں۔اس کہانی کو ایرانی صدر نے متعدد بار چیلنج کیا ہے۔اسے ایک فرضی کہانی، سازش کا حصہ قرار دیا ہے۔

وہاں صرف اتنا ہوا تھا کہ یہودیوں کو مارکاٹ کر ان کے گھروں سے نکالا گیا اور ان کو زبردستی کیمپوں میں بھیجا گیا۔ جہاں سے ان کو فلسطین جانے کے لیے تیار کیا جانے لگا۔بے سروسامان کیمپوں میں پڑے ہوئے یہودی اتنے تنگ آئے ہوئے تھے کہ ان میں سے بہت سارے فلسطین جانے کے لیے تیار ہوگئے جہاں ان کو صیہونی آرگنائزیشن کی طرف سے زمین اور رقم فراہم کی جارہی تھی تاکہ وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہوسکیں۔مگر عام یہودی خوشی سے نہیں آئے تھے۔یہ مجبوری کا سودا تھا۔

جنگِ عظیم کے دوران بحری جہازوں میں بھر بھر کر یہودیوں کو غیر قانونی طور پر فلسطین منتقل کیا گیا۔لاکھوں یہودی جنگِ عظیم کے دوران فلسطین آئے۔جنگِ عظیم کے بعد تباہ شدہ ممالک کے عوام نے اپنے ہاں یہودیوں کو بسنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔مقامی لوگ یہودیوں کی جائدادوں پر قابض ہو چکے تھے انہوں نے جائیدادیں واپس کرنے سے انکار کر دیا۔حکومتوں نے یہودیوں کو متبادل زمین دینے سے انکار کر دیا۔خصوصاً مشرقی یورپ کے ممالک کا رویہ زیادہ سخت تھا پھر کمیونزم کی وجہ سے عام یہودی بھی واپس جانے سے کترا رہے تھے کیونکہ وہ کاروباری تھے اور اب مشرقی یورپ میں سوشلسٹ نظام آگیا تھا۔اس پر بیشتر یہودیوں نے امریکا پناہ حاصل کرنے کی درخواست کی لیکن امریکا کا رویہ حیرت انگیز تھا۔امریکا نے مشرقی یورپ سے تعلق رکھنے والے دوسرے لوگوں کو تو فراغ دلی سے شہریت عطا کی لیکن یورپ سے کسی ایک یہودی کو بھی لینے سے انکار کر دیا۔

وجہ صاف ظاہر ہے صیہونی چاہتے تھے کہ یہودی اسرائیل جاکر آباد ہوں اور امریکی انتظامیہ ان کے اشارہ ابرو پر کام کر رہی تھی۔یہی حال یورپی ممالک کا تھا۔انہوں نے صدیوں سے آباد یہودیوں کو حیلے بہانوں سے تنگ کرنا شروع کر دیا تاکہ وہ فلسطین چلے جائیں۔پھر روس میں آباد یہودیوں کو روسی حکومت کی طرف سے خصوصی اجازت ملی کہ وہ جاکر اسرائیل میں آباد ہوسکتے ہیں۔جب کہ سوویت یونین کسی جیل سے کم نہیں تھا جہاں رہنے والوں کو ملک سے باہر جانے کی اجازت نہیں تھی۔کمونزم ایجاد یہودیوں کی ہے لیکن یہ نظام ان کو سوٹ نہیں کرتا کیونکہ وہ نجی ملکیت کے شدید حامی ہیں۔اسی لیے روس میں آباد یہودیوں کی بڑی تعداد نے اسرائیل جانے کا فیصلہ کیا اور موجودہ اسرائیل میں یہودیوں کی

تعداد کا ساٹھ فیصد روسی مہاجروں پر مشتمل ہے۔یوں فلسطین میں یہودیوں کی آبادی اتنی ہوئی کہ اسرائیل کا قیام عمل میں آسکا۔روس کے علاوہ ایران میں صدیوں سے آباد یہودی بھی اپنی مرضی سے اسرائیل آئے۔

فری میسنری صیہونیت کی ماں ہے اسی کے بطن سے یہودیوں کی اس انتہا پسند تحریک نے جنم لیا۔صرف صیہونیت ہی نہیں بلکہ سینکڑ ازم (یا شیطان پرستی) بھی فری میسنری سے ہی نکلا ہے۔اس کے علاوہ بھی کئی ایسی خفیہ تنظیمیں جو مغربی حربوں سے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے کام کر رہی ہیں وہ فری میسنری کا ایک حصہ ہے۔حد یہ کہ عیسائی انتہا پسندی کو بھی فری میسنری نے اپنا حصہ بنالیا ہے۔دور جدید میں کئی ایسے انتہا پسند عیسائی گروپ ہیں جن کے نزدیک دنیا کے ہر مسئلے کا حل مسلمانوں اور اسلام کو ختم کر دینا ہے۔(ایسے ہی گروپ سے تعلق رکھنے والے ایک فرد نے گزشتہ دنوں ناروے میں بے گناہ لوگوں کو قتل کیا لیکن میڈیا پر کسی نے سوال نہیں اُٹھایا کہ یہ کیسی انتہا پسندی ہے) ایسے گروپوں کو فری میسنری اور دوسرے یہودی گروپوں کی مکمل حمایت حاصل ہے۔

فری میسنری کا ایک مقصد یعنی اسرائیل کا قیام پورا ہو چکا ہے۔کئی سو سال پہلے یہودی مملکت کا حصول اس کا مقصد قرار پایا تھا لیکن ابھی دوسرا مقصد یعنی ہیکل سلیمانی کی تکمیل ہونا باقی ہے۔اس کے لیے اسرائیل اور دنیا بھر کے صیہونی اس کوشش میں ہیں کہ کسی طرح مسجد اقصیٰ کو شہید کر دیا جائے اور پھر اس کی جگہ ہیکل سلیمانی کی تعمیر کی جائے۔ہیکل کی تعمیر کے لیے ساز و سامان تک آچکا ہے اس کا مکمل نقشہ تیار ہوگیا ہے۔حد یہ کہ ہیکل کے خادموں کے لیے مخصوص لباس تک تیار کرلیا گیا ہے۔نوجوانوں کے ایسے گروپ بن گئے ہیں جو ہیکل کی تکمیل کے بعد یہاں خدا کے حضور گائے کی قربانی کریں گے۔اس کے لیے ان کی مکمل تربیت کی جاچکی ہے۔ بس ان کو اس لمحے کا انتظار ہے جب وہ ہیکل کی تعمیر شروع کریں۔

یہودیوں کے کئی ایک فرقے صیہونیت اور اسرائیل کے قیام کے مخالف ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ ان کی مذہبی کتابوں نے انہیں ایک ملک بنا کر رہنے سے منع کیا ہے اور اسرائیل کے قیام کا مطلب ہے وہ اپنے مذہب کی نافرمانی کر رہے ہیں۔تب یہ لوگ کون ہیں جنہوں نے فری میسنری کی بنیاد رکھی اور اسرائیل کے قیام کو اس کا نصب العین بنایا۔فری میسنری کا آغاز اصل میں کہاں سے ہوا؟ان میں جادوگری کی رسومات کہاں سے آئیں۔فری میسنری بہ ظاہر تو ایک یہودی سوسائٹی ہے لیکن اس میں بہت ساری اصطلاحات اور طور طریقے ہمیں قدیم مصریوں والے ملتے ہیں۔ایسا کیوں ہے۔امریکی ڈالر پر بنی خفیہ ایک آنکھ سے کیا مراد ہے؟یہ جاننے کے لیے ہمیں تاریخ کے اس دور میں جانا ہوگا جہاں سے یہودیت کا آغاز ہوتا ہے۔

ارضِ مقدس سے مصر جانے والے بنی اسرائیل مذہب کے لحاظ سے سادہ اور پکے توحید پرست تھے۔اس وقت ان کے مذہب میں شرک کی ذرا سی بھی آمیزش نہیں تھی لیکن جب حضرت یوسفؑ کے انتقال کے بعد بنی اسرائیل مصر میں غلام بنا لیے گئے اور مصریوں کے ماتحت آئے تو ان میں بھی وہ خرابیاں در آئیں جو ان کے آقاؤں میں تھیں۔یہ مصری رسم و رواج اپنانے لگے اور جادو ٹونا شروع کر دیا۔یہودیوں میں جادو کی ابتدا مصر سے ہی ہوئی تھی ورنہ الہامی مذاہب میں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔مصر جادوگروں کا ملک تھا۔کئی سو سال تک مصر میں رہ کر بنی اسرائیل بدل گئے۔اب وہ خالص توحید پرست نہیں رہے تھے۔پھر اللہ نے حضرت موسیٰؑ کو مبعوث فرمایا اور انہوں نے بنی اسرائیل کو غلامی سے نجات دلا کر دوبارہ توحید کی طرف لانے کی کوشش شروع کی۔اس وقت فرعون اور اس کے حامیوں کے ساتھ بنی اسرائیل کا ایک طبقہ بھی حضرت موسیٰؑ کی مخالفت پر اُتر آیا۔

حضرت موسیٰؑ نے جب فرعون کے دربار میں اس کے جادوگروں کو شکست دی اور وہ سب کے سب رب موسیٰؑ پر ایمان لے آئے۔لیکن مصر میں صرف یہی جادوگر نہیں تھے ان کے علاوہ بھی بے شمار ہزاروں کی تعداد میں جادوگر تھے لیکن یہ سب سے بڑے جادوگر اور عالم ضرور تھے۔کیونکہ انہوں نے ایک ہی معجزے سے جان لیا کہ موسیٰؑ سچے ہیں اور وہ اللہ پر ایمان لے آئے۔اس پر فرعون اتنا طیش میں آگیا کہ اس نے ایمان لانے والوں کو ان الفاظ میں دھمکی دی۔"میں تمہارے ہاتھ پاؤں کٹوا کر تمہیں کھجور کے خشک تنے پر سولی چڑھادوں گا۔"

اس زمانے میں یہ سب سے خوفناک سزا ہوتی تھی جو سزائے موت کے مجرموں کو دی جاتی تھی۔فرعون مصر ویسے ہی بہت ظالم اور اذیت پسند ہوتے تھے۔اس لیے اس نے جادوگروں کو سب سے خوفناک سزا سنائی تھی۔کھجور کا خشک تنا کھپروں والا ہوتا ہے اور سیدھا بھی نہیں ہوتا اس لیے اس سے لٹکانے سے آدمی کی جان فوراً نہیں نکلتی اور وہ سسک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سسک کر جان دیتا ہے۔لیکن یہ خوفناک سزا سننے کے باوجود ان نوسلموں نے ایمان سے پھرنے سے انکار کر دیا اور فرعون نے ان کو کبھی ہوئی دردناک سزا دے دی۔ اس کے جلادوں نے ان مظلوموں کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر انہیں کھجور کے خشک تنے سے گلے میں ڈھیلی رسی باندھ کر لٹکا دیا۔ان کی جان بہت اذیت سے نکلی تھی۔ کہتے ہیں ان اعلیٰ درجے کے ساحروں کی تعداد چار سو تھی اور ان میں سے کسی ایک نے بھی فرعون کے خوف سے ایمان سے پھرنے کی کوشش نہیں کی۔اللہ تعالیٰ کو ان کی یہ قربانی اور ایمان کے لیے استقامت اتنی پسند آئی کہ اپنی آخری کتاب قرآن کریم میں اللہ نے کسی واقعے کا اتنا ذکر نہیں کیا جتنا کہ اس واقعے کا کیا ہے۔

فرعون اور اس کے مصاحب اور ان سے بھی زیادہ باقی رہ جانے والے جادوگر بُری طرح تلملا رہے تھے اور ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ حضرت موسیٰؑ اور ان کے دین کو کس طرح برباد کر دیں۔ دنیا کا معاملہ فرعون کے ہاتھ میں تھا اور اس نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ آخر میں وہ تمام بنی اسرائیلیوں کو صفحہ ہستی سے مٹانے کو بھی تیار ہو گیا تھا۔مگر اللہ کی مرضی کچھ اور تھی اور حضرت موسیٰؑ اپنی قوم کو بہ حفاظت مصر سے نکال لائے۔دوسری طرف مصری جادوگر جان چکے تھے کہ وہ میدان میں حضرت موسیٰؑ اور ان کے لائے دین کا مقابلہ نہیں کر سکتے اس لیے انہوں نے عیاری سے کام لیا اور جادوگروں کا ایک خاندان یا ان کا ایک حصہ منافقانہ طور پر ایمان لے آیا۔ یہ ظاہر وہ بنی اسرائیل کا حصہ بن گئے تھے لیکن اندر سے وہ اپنے کافرانہ مصری عقائد پر قائم رہے تھے۔ وہ عام بنی اسرائیلیوں سے الگ رہتے تھے اور صرف اپنے مخصوص حلقے میں اُٹھتے بیٹھتے تھے۔آغاز میں انہوں نے اپنی نسل خالص رکھنے کے لیے اپنی ہی بہنوں اور بیٹیوں سے شادیاں کیں اور یہ فعل مصر پوں میں برا نہیں سمجھا جاتا، پھر اپنے طور پر وہ ایک اعلیٰ اور ارفع مقصد کے لیے کام کر رہے تھے اس لیے ان کے نزدیک مکروہ ترین افعال بھی جائز تھے۔

جادوگروں کا یہ ٹولہ بنی اسرائیل کے ساتھ مصر سے نکلا اور کچھ عرصے بعد ان کا ایک حصہ بن گیا۔یہی لوگ تھے جو کمزور ایمان والے بنی اسرائیلیوں کو بھڑکاتے تھے اور انہیں توحید پرستی سے روکتے تھے۔انہوں نے کوشش کی کہ بنی اسرائیل میں شرک کو رواج دیا جائے۔مگر جب بچھڑا بنا کر اسے پوجنے والوں کا خوفناک انجام سامنے آیا اور پھر جہاد سے انکار پر بنی اسرائیل کو چالیس سال تک صحرا میں بھٹکنے کی سزا ملی تو اس سے عام بنی اسرائیلی شرک سے گریز کرنے لگے۔

تب اس فرقے نے دوسرے حربے استعمال کیے اور بنی اسرائیل میں احکامات خداوندی سے انکار اور نفس پرستی کو پھیلانے لگے۔ ان کا یہ حربہ کامیاب رہا۔ پھر انہوں نے علمائے بنی اسرائیل میں جگہ بنانی شروع کی۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ توریت اور دوسرے احکام خداوندی میں تحریف کرنے لگے اور دنیا کے عوض غلط فتوے جاری کرنے لگے۔رفتہ رفتہ یہ رواج اتنا بڑھا کہ بنی اسرائیلیوں نے اسے غلط سمجھنا چھوڑ دیا۔توریت میں اتنی تحریف کی گئی کہ چند سو سال بعد درست توریت بس چند لوگوں تک محدود ہو گئی۔قوم کے اعمال مجموعی طور پر اتنے خراب ہو گئے اور متواتر نبیوںؑ کی آمد کے باوجود بنی اسرائیل نے اپنی روش درست کرنے سے انکار کیا بلکہ یہ نبیوںؑ کے درپے ہو جاتے اور انہوں نے اکثر انبیا کرامؑ کو شہید کر دیا۔اس پر اللہ کا غضب نازل ہوا۔ بنی اسرائیل بابلیوں کے حملے میں تباہ و برباد ہو گئے اور باقی بچ جانے والوں کو غلام بنا کر بابل یعنی موجودہ عراق لے جایا گیا۔بابلی جادوگری میں کسی طرح مصریوں سے کم نہیں تھے۔ یہاں اس فرقے کو جادوگری سیکھنے کا مزید موقع ملا اور پھر بابلی حکمرانوں سے قربت کی وجہ سے وہ مزید طاقتور ہوتے گئے۔

کسی قوم میں سازشی فرقہ اس وقت تک کامیابی حاصل نہیں کر سکتا جب تک وہ خود کو اور اپنے اصل مقاصد کو پوشیدہ نہ رکھے۔اس فرقے نے بھی خود کو پوشیدہ رکھا۔ یہ عام یہودیوں کے ساتھ رہے لیکن ان سے الگ تھلگ بھی رہے۔انہوں نے دوسرے بنی اسرائیلیوں سے رشتے داریاں قائم نہیں کیں۔ یہ جہاں رہے اپنی آبادی بھی الگ رکھتے تھے اور اپنے بچوں کو باہر نہیں جانے دیتے تھے جب تک وہ سمجھدار نہ ہو جائیں۔

اگرچہ عام یہودیوں کا کردار اور دین کے معاملے میں ان کا رویہ قابلِ رشک نہیں تھا لیکن اپنے طور پر وہ کم سے کم توحید پرست تو تھے جب کہ یہ فرقہ اندر سے اپنے پرانے مذہب پر قائم تھا۔

سوال یہ ہے کہ آخر مصری علامات کو استعمال کرنے والا یہ فرقہ دنیا پر اپنا غلبہ کیوں چاہتا ہے۔اس مقصد کے لیے یہ صرف عیسائیوں کو نہیں بلکہ خود یہودیوں کو بھی اپنے مقصد کے لیے استعمال کر رہا ہے۔ہیکل سلیمانی کی از سرِ نو تعمیر عام یہودیوں کے لیے ایک سبز باغ تو نہیں ہے جس کی آڑ میں اسرائیل کا قیام اور ساری دنیا کے یہودیوں کو اس جگہ جمع کرنا ہے۔اس کے لیے انہوں نے قدیم مذہبی کتابوں کی پیش

گوئیوں کو استعمال کیا۔جن میں ایک مسیحا کی آمد کا ذکر ہے جو بنی اسرائیل کو دوبارہ سے عروج پر لے جائے گا اور ساری دنیا کو ان کے زیرِ نگیں کر دے گا۔ یہ مسیحا توحید کا بول بالا نہیں کرے گا بلکہ ساری دنیا کو ایک چھوٹی سی قوم کا غلام بنا دے گا۔کوئی معمولی سی عقل رکھنے والا شخص بھی کسی نبیؑ کے لیے یہ کردار سوچ سکتا ہے۔انبیاؑ کی آمد کا مقصد بالکل واضح ہے وہ انسانوں کی اللہ کی عبادت کرنے اور صرف اسی کو اپنا معبود ماننے کی تعلیم دینے کے لیے آتے تھے اور اپنا کام بنا کسی صلے کے کرتے تھے کسی ایک نبیؑ نے بھی یہ نہیں کہا کہ وہ دنیا میں کسی ایک گروہ یا قوم کو بالادست کرنے آیا ہے۔

تب جس مسیحا کا یہودی اور بالخصوص یہ فرقہ انتظار کر رہا ہے وہ نبیؑ کس طرح ہو سکتا ہے۔عجیب بات ہے کہ عیسائی پہلے کسی مسیحا کی آمد کا انتظار نہیں کرتے تھے لیکن اب ان میں ایک ایسا فرقہ پیدا ہو گیا ہے جو نزول مسیح کا قائل ہے اور اس کا عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ دوبارہ دنیا میں آئیں گے اور اس خاص فرقے کے عیسائیوں کو براہِ راست جنت میں لے جائیں گے وہ اسے انگریزی میں RAPTOR کہتے ہیں۔اردو میں اس کے معنی ہیں (فضا میں نجات)۔عیسائیوں میں یہ عقیدہ کہاں سے آیا؟ مزید حیرت انگیز بات ہے کہ یہ عقیدہ بنیاد پرست عیسائیوں کا ہے جو یہودیوں سے نفرت کرتے ہیں اور جب ان سے یہودیوں کے بارے میں پوچھا جائے کہ ان کا انجام کیا ہو گا تو وہ بلا جھجک کہیں گے کہ جناب عیسیٰؑ کی دوبارہ آمد اور ان پر ایمان لائے بغیر کوئی شخص جنت میں نہیں جائے گا دوسرے لفظوں میں وہ یہودیوں کو جہنم کا مستحق قرار دے رہے ہیں۔

فری میسنری کی جدید تاریخ میں یہودیوں کی ہمیشہ لبرل عیسائیوں کی طرف سے حمایت ملی۔لیکن 1980 میں اسرائیل کی طرف سے لبنان پر حملے اور فلسطینی کیمپوں میں بے گناہ اور معصوم فلسطینیوں کے قتل عام کے بعد مغرب کے لبرل حلقے اسرائیل کی حمایت سے پیچھے ہٹنے لگے۔اس وقت ایسا لگ رہا جیسے اسرائیل عالمی برادری میں تنہائی کا شکار ہو جائے گا۔مگر اس موقع پر اسرائیل غیر متوقع طور پر اس حلقے کی حمایت حاصل ہو گئی جس کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔یہ مغرب کے قدامت پرست عیسائی تھے جن کی یہودیوں سے کبھی نہیں بنی۔ان قدامت پرستوں کی حمایت اتنی زیادہ ہے کہ شاید خود یہودی بھی اسرائیل کے اتنے حامی نہ ہوں جتنے کہ یہ عیسائی قدامت پرست ہیں۔آج کل یہی اسرائیل کے سب سے بڑے سرپرست ہیں۔

اس نئے عیسائی فرقے جسے نیو بورن بھی کہتے ہیں۔یہ عقیدہ پایا جاتا ہے حضرت عیسیٰؑ اس وقت دنیا میں آئیں گے جب تمام یہودی اسرائیل میں جمع ہوں گے۔اس کے بعد عظیم جنگ ہو گی۔ پھر آپؑ آئیں گے اور دنیا میں موجود تمام عیسائیوں کو براہِ راست جنت میں لے جائیں گے۔لیکن وہ صرف عیسائی جا سکیں گے جو نیو بورن ہوں گے اور دنیا میں نجات کے نظریے پر یقین رکھتے ہوں گے۔(نیو بورن فرقے کی جنت ماترا سے قطع نظر یہ بات قابلِ غور ہے کہ نئے عیسائی فرقے کے عقائد ان اسلامی عائد کی توثیق کرتے ہیں جو ساڑھے چودہ سو سال سے اپنی جگہ اٹل ہیں مگر بعض مغرب ذوق مسلمان کم علمی کی بنا پر انہیں تنقید کا ہدف بناتے ہیں۔

یہودی ان قدامت پرستوں کے نظریات سے اچھی طرح واقف ہیں اور ساتھ ہی نہایت تجاہل عارفانہ سے ان کی مدد بھی وصول کر رہے ہیں۔ہیکل سلیمانی کی دوبارہ تعمیر عام یہودیوں کا عقیدہ نہیں ہے اور نہ ہی اسرائیل کا قیام ان کے عقیدے میں شامل ہے بلکہ اسرائیل ان کے عقیدے اور الہامی کتابوں کی تلقین کے سراسر خلاف ہے۔اسی طرح عیسائیوں میں حضرت عیسیٰؑ کی آمد کا نظریہ موجود نہیں تھا لیکن اب یہ عقیدہ موجود ہے اور خاص بات یہ ہے دوسری جنگِ عظیم کے بعد بننے والے امریکی صدور میں سے اکثر اسی نیو بورن فرقے سے تعلق رکھتے ہیں۔صدر بش اور اس کی تقریباً ساری کابینہ اسی فرقے سے تعلق رکھتی تھی۔سمجھ میں یہ نہیں آتا ہے کہ صیہونی یا فری میسنری اپنے مقصد کے لیے عیسائیوں کو استعمال کر رہے ہیں یا پھر نیو بورن فرقہ یہودیوں کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کر رہا ہے۔

فری میسنری اب کھل کر نیو ورلڈ آرڈر کے نام پر سامنے آ گئی ہے۔ یہ ساری دنیا پر اپنا راج چاہتے ہیں اور دنیا ان کے بنائے نظام کی تباہ کاریاں اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود دم بہ خود اور بے بس ہے۔سرمایہ دارانہ نظام کے ستائے لوگ وال اسٹریٹ پر قبضے کی بات کر رہے ہیں ایسے میں یہودی ایک بار پھر اپنے پرانے ایجنٹوں کو آگے بڑھا رہے ہیں جو کمیونزم کے مردہ گھوڑے کو پھر سے زندہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔لیکن یہ گھوڑا زندہ ہونے والا نہیں۔

..... فری میسنری دنیا پر مکمل غلبے کے لیے اپنے لیڈر کا انتظار کر رہے ہیں جسے وہ اینٹی کرائسٹ یا مسیحا کہتے ہیں اور ہم اسے دجال کہتے ہیں۔

+++

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سراب

راوی : شہباز ملک

تحریر: کاشف زبیر

وہ پیدائشی مہم جو تھا۔ بلند وبالا پہاڑ، سنگلاخ چٹانیں، برف پوش چوٹیاں اور نگاہ کی حدوں سے آگے کی بلندیاں اسے پیاری تھیں۔ اسے ان میں ایک کشش اور ایک للکار سی ابھرتی محسوس ہوتی کہ آؤ ہمیں دیکھو، مسخر کرو اور ہمارے سحر میں مسحور ہو کر اپنا آپ مٹا ڈالو۔ اسے یہ سب حقیقت لگتا مگر کیا واقعی یہ حقیقت تھا یا محض سراب..... ایسا سراب جو آنکھوں کے راستے ذہن ودل کو بھٹکاتا ہے، جذبوں کو مہمیز دیتا ہے مگر اسودگی اور اطمینان چھین لیتا ہے۔ سیرابی لمحوں کے فاصلے پر دکھائی دیتی ہے مگر وہ لمحہ حقیقت میں کبھی نہیں آتا۔ اس کی زندگی بھی سرابوں کے ایسے دائروں میں گزری اور گزرتی رہی۔ وقت کے گرداب میں ڈوبتے ہوئے نوجوان کی سنسنی خیز اور ولولہ انگیز داستان حیات۔

بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں سے گندھی ایک تہلکہ خیز کہانی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

بابا کا اصرار تھا کہ مجھے کیڈٹ کالج بھیج دیا جائے جبکہ میں آرمی میں نہیں جانا چاہتا تھا۔ میرے انکار کو انہوں نے انا کا مسئلہ بنالیا۔ اس دور میں میرے لیے واحد اچھی یاد سویرا ہے جو میرے دل کا حصہ تھی لیکن اس سے پہلے کہ میں اس کے لیے ماں جی کے سامنے دست سوال دراز کرتا وہ میرے بھائی کا مقدر بنادی گئی اور میں ہمیشہ کے لیے حویلی سے نکل آیا۔ یہاں سے زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا۔ تعلیم مکمل کر کے میں نے کاروبار شروع کیا۔ سفیر، مونا اور ندیم جیسے دوست ملے لیکن ایک روز مری سے واپس آتے ہوئے نادر علی کا اپنے اوباش دوستوں سمیت ہم سے ٹکراؤ ہوگیا تھا پھر یہ ٹکراؤ ذاتی انا میں بدل گیا۔ دشمنی اور دربدری کا ایک سلسلہ شروع ہوا جو دراز ہوتا چلا گیا۔ ایک طرف مرشد علی، فتح خان اور ڈیوڈ شا جیسے لوگ میرے دشمن ہورہے تھے تو دوسری طرف سفیر، ندیم اور وسیم جیسے جاں نثار دوست بھی تھے۔ اس کے بعد ہنگاموں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیا جس کی کڑیاں سرحد پار تک چلی گئی تھیں۔ اور قسمت مجھے کسی منہ زور سمندری لہر کی طرح اپنے دوش پر لیے پھرتی رہی۔ میں دوبارہ اپنے وطن لوٹا تو فتح خان سے ٹکراؤ ہوگیا۔ اس کے آدمیوں کو شکست دے کر میں اندرون ملک آ گیا۔ میری بھانجی شمی اپنے ددھیال جارہی تھی کہ اس کی کار پر فائرنگ ہوئی۔ فائرنگ سے اس کا منگیتر بری طرح زخمی ہوگیا۔ میں عتیق کے کمرے میں داخل ہوا تو دیکھا کہ ایک لمبے بالوں والا شخص عتیق کے آکسیجن ماسک کو کھول رہا ہے۔ میں نے للکارا تو وہ کھڑکی سے کود کر بھاگا۔ اس کے پیچھے میں بھی کود گیا مگر وہ نہ ملا پھر میں اپنی کار میں بیٹھا ہی تھا کہ پیچھے سے گردن پر پستول کی نال آ لگی۔ میں نے مڑ کر دیکھا، وہی شخص تھا جس کے تعاقب میں، میں کھڑکی سے کودا تھا۔ وہ مجھے گرفتار کر کے مرشد کے پاس لے گیا۔ کئی دن کے بعد میں اس کی قید سے فرار ہوا۔ میرے ساتھ زریں نامی وہ مظلوم لڑکی بھی تھی۔ راجا صاحب کے بنگلے پر پہنچا۔ زریں کا علاج کرایا پھر ایک روز ہم سب عتیق کو اسپتال سے لانے پہنچے تاکہ اس کا علاج حکیم قاؤس سے کراسکیں۔ حکیم قاؤس اس کا علاج کرنے لگا۔ زریں نے فرمائش کردی کہ میں یہاں بند رہ کر خود کو قیدی محسوس کر رہی ہوں۔ میں اسے لے کر سیر کے لیے نکلا تھا کہ دشمنوں نے گھیر لیا۔ ان سے بچتے بچاتے ہم نکلے تو راستہ بھٹک کر ایک ایسے علاقے میں پہنچ گئے جو مری وغیرہ کی طرف جاتا تھا۔ ہماری گاڑی بھی خراب ہوگئی۔ ایک ڈاکٹر نے آبادی تک پہنچانے کا وعدہ کرلیا۔ ہم اس کے ساتھ اس کے بنگلے پر پہنچے تو احساس ہوا کہ ہم قید ہو چکے ہیں۔ زریں کی طبیعت بھی خراب ہوگئی تھی۔ بعد میں پتا چلا کہ ڈاکٹر نے ہم پر ایک خطرناک وائرس کا تجربہ کیا ہے۔ زریں جانبر نہ ہوسکی۔ ڈاکٹر کی آواز مائیک سے آرہی تھی کہ اب تمہارا نمبر ہے۔ تبھی ڈیوڈ شا آ گیا۔ وہ ڈاکٹر کا فنانسر تھا۔ اس نے مجھے رہا کرالیا اور کہا کہ اگر تم مجھے پراسرار وادی تک پہنچادو تو میں مرشد سے بھی گلوخلاصی کرادوں گا۔ اس کے بعد شا نے مجھے اپنے ایک آدمی کے ساتھ کردیا کہ وہ مجھے شہر چھوڑ آئے مگر راستے میں ہی اس کی نیت بدل گئی۔ وہ دروازہ کھول کر نیچے کودا۔ وہ پستول سے فائر کرتا کہ ایک کتیتے مارشل کے پستول والے ہاتھ پر منہ مارا تھا۔ براؤن نامی وہ کتا مونا کا تھا۔ سفیر وغیرہ اس کی مدد سے مجھ تک پہنچے تھے۔ ان کے ساتھ میں شہر آ گیا۔ وہ سب ایران کے راستے پاکستان پہنچے تھے، پہلے ہم اس بنگلے میں پہنچے جہاں وہ لوگ ٹھہرے ہوئے تھے پھر اسلحہ وغیرہ پہنچانے کا انتظام کیا اور مونا و سادھنا کو عبداللہ والے بنگلے پر پہنچانے کا انتظام کیا پھر شہلا کی تلاش میں نکلے۔ اس نے بتایا کہ اس سے ہوٹل میں آ کر ملوں۔ میں اس سے ملنے پہنچا تھا بائیک کھڑی کر رہا تھا کہ نال کی چبھن محسوس ہوئی اور آواز آئی ”ادھر سے چلو اس سے پہلے کہ یہ چل جائے۔“ .... یہ آواز فتح خان کی تھی۔ وہ مجھے نزدیکی پارک میں لایا اور بولا کہ میں دشمنی ختم کررہا ہوں۔ تمہیں ایمن کو پاکستان بلانا ہوگا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ ایمن کو قبضے میں کر کے اس کے باپ سے ہیروں کے متعلق معلومات چاہتا ہے۔ میں گھر آیا تو پتا چلا کہ میرے دوست شہلا کو اغوا کر لائے ہیں۔ تبھی مجھے عبداللہ کے ذریعے معلوم ہوا کہ راجا صاحب نے مجھ اپنے محل میں بلایا ہے۔ میں ہیلی کاپٹر سے وہاں پہنچا تو پتا چلا کہ راجا صاحب کو کینسر ہوگیا ہے۔ وہ پھر بھی پُراسرار وادی کی طرف جانا چاہتے تھے۔ جب میں انڈیا میں تھا تو وہ ایک بار جانے کی کوشش کر چکے تھے، راستے میں انہیں ڈیوڈ شا بھی ملا تھا مگر برف والے نے انہیں واپس کردیا کہ ہاتھ والے کو لے کر آؤ۔ میں عمر دراز سے مل کر کمرے میں لوٹا تو رات کے وقت ایک خوبصورت ملازمہ نے مجھ پر قاتلانہ حملہ کردیا بعد میں پتا چلا کہ وہ اپنی بہن کی موت کا انتقام لینے آئی تھی۔ اسلام آباد واپس آیا تو فتح خان کا آدمی جو قید میں تھا، اسے شہلا نے قتل کردیا۔ ہم نے وسیم اور سعدیہ کی شادی کرادی اور واپس آرہے تھے کہ ایک لڑکی کو اغوا کرنے والے نظر آئے۔ ہم نے ان کے قبضے سے لڑکی کو برآمد کیا۔ گھر آئے تو رات کے وقت کچھ لوگ کتوں کو بو سنگھا کر لاتے نظر آئے۔ وہ فتح خان کے آدمی تھے اور شہلا کے کپڑوں کی بو سونگھ کر وہاں پہنچے تھے۔ ان سے نمٹنے کے بعد میں نے شہلا کو راضی کیا کہ وہ مجھے بینک کے لاکر تک پہنچادے تاکہ میں چائنیز بریف کیس حاصل کرلوں۔ وہ مجھے لے کر اپنے بنگلے پر پہنچی۔ ہم دیوار پھاند کر اندر پہنچے تھے کہ شہلا نے پستول نکال کر شہباز سے کہا کہ تمہارا کھیل ختم ہوگیا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

شہلا کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی جیسے اس نے سچ مچ میرا کھیل ختم کردیا ہو۔ ”یہ تمہارا خیال ہے۔“ میں نے سکون سے کہا۔ ”میرا کھیل کم سے کم تمہارے ہاتھوں ختم نہیں ہوگا۔“

وہ پیچھے ہٹ گئی۔ ”تم غلط سمجھ رہے ہو، میں تمہیں مارنا نہیں چاہتی ہوں۔ تم ان چند افراد میں سے ہو جن پر ہاتھ اٹھانے کو دل نہیں چاہتا۔“

”تب یہ پستول کس خوشی میں نکالا ہے؟“

وہ پیچھے ہٹتے ہوئے برآمدے میں داخلی دروازے تک پہنچ گئی تھی۔ اس نے مجھ پر سے نظر ہٹائے بغیر لاک کے اوپر لگا ایک بٹن دبایا تو اس کی سرخ روشنی جل اٹھی تھی۔ اس نے جواب دیا۔ ”یہ پستول میں نے صرف اس لیے نکالا ہے کہ تم مجھے روکو مت۔“

”تمہارا کیا خیال ہے اس طرح تم مجھ سے بچ جاؤ گی۔“ میں نے ایک قدم آگے بڑھایا۔

اس نے اضطراری انداز میں پستول سیدھا کرلیا۔ ”شہباز آگے مت آؤ ورنہ میں گولی چلا دوں گی مجھے اس کے لیے مجبور مت کرو۔“

”تم نے پلان اچھا بنایا، خود کو خوف زدہ ظاہر کیا اور مجھ سے پستول حاصل کرنے میں کامیاب رہیں۔“ میں نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ اب میں اس سے چار قدم دور تھا۔

”شہباز بس۔“ اس کے چہرے پر سختی نمودار ہوئی تھی۔ ”اب ایک قدم بھی آگے مت آنا۔“

”ورنہ تم مجھے گولی ماردو گی۔“ میں نے مذاق اُڑانے والے انداز میں کہا۔ ”لیکن کس چیز سے، اس خالی پستول سے۔؟“

”تم مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔“ اس نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ ”پستول میں میگزین موجود ہے۔“

”مجھے اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔“ میں نے آہستہ سے جیب میں ہاتھ ڈالا اور باہر نکالا تو اس میں پستول کا میگزین دبا ہوا تھا۔ اس کی نظر بے ساختہ پستول کے دستے کی طرف گئی۔ میرے لیے ایک لمحے کی مہلت کافی تھی۔ میں نے پستول والا ہاتھ تھام کر اوپر کردیا۔ اس نے گولی چلادی تھی لیکن وہ ہوا میں گئی۔ میں نے اسے دوسرے فائر کی مہلت نہیں دی اور پستول چھین لیا۔ پستول چھن جانے کے بعد اس نے مشتعل ہو کر گالی دی اور مجھے لات مارنے کی کوشش کی۔ میں نے ذرا سا گھٹنا موڑ کر اس کا وار روکا اور اسے دیوار کی طرف دھکیل دیا۔ میں اسے کوئی نقصان پہنچانا نہیں چاہتا تھا اس لیے کوئی ایسا وار کرنے سے گریز کیا جس سے اسے چوٹ لگے۔ وہ دیوار سے ٹک کر ہانپنے اور مجھے گھورنے لگی۔ اگر کوئی انسان کسی دوسرے کو آنکھوں سے قتل کرسکتا تو اس روز میرا بچنا ناممکن تھا، شہلا مجھے کچھ ایسی ہی نظروں سے گھور رہی تھی۔ ایاز نے گیٹ کے اوپر سے جھانکا۔ ”سب ٹھیک ہے؟“

”پہلے نہیں تھا لیکن اب ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ذرا باہر دیکھنا اس فائر کا ردعمل نظر آرہا ہے۔“

”نہیں جناب صرف ایک کتا تھا فائر ہوتے ہی اس نے پولیس والوں کی سی تیزی سے ایک طرف دوڑ لگادی اور اب باہر کوئی نہیں ہے۔“ ایاز خوشگوار موڈ میں تھا۔

”یار دیکھو کہیں کوئی گھر سے نہ جھانک رہا ہو اور اسے ہماری سرگرمیاں مشکوک لگیں تو وہ پولیس کو کال کرسکتا ہے۔“

”نہیں ایسا کوئی نہیں ہے، فائر کی آواز زیادہ دور تک نہیں گئی ہے اور اگر کسی نے سنا بھی ہے تو اسے کوئی پٹاخہ یا کسی گاڑی کے سائلنسر کا مس فائر سمجھا ہوگا۔“

شہلا نے اپنی حالت پر قابو پالیا تھا، وہ پھیکے انداز میں مسکرائی۔ ”تم نے مجھے بے وقوف بنادیا۔ میگزین دیکھ کر میں ایک لمحے کے لیے یہی سمجھی کہ پستول خالی ہے۔“

”میں ہمیشہ اپنے پاس اضافی میگزین رکھتا ہوں۔“ میں نے دوسرا میگزین واپس جیکٹ میں رکھ لیا۔ ”اب یہ دروازہ کھولو اور کوئی حرکت مت کرنا۔“

اس نے شکست خوردہ انداز میں لاک کے فنگر پرنٹ ریڈر پر اپنا انگوٹھا رکھا اور چند لمحے بعد کلک کی ہلکی سی آواز کے ساتھ دروازہ کھل گیا۔ جیسے ہی دروازہ ذرا سا کھلا اندر لاؤنج میں خود بہ خود روشنی ہوگئی۔ شہلا نے یہاں واقعی جدید ترین سسٹم نصب کرایا تھا۔ لاؤنج زیادہ بڑا نہیں تھا لیکن اپنی سجاوٹ اور فرنیچر کی وجہ سے بڑا نظر آرہا تھا۔ اندر جاتے ہوئے میں نے ایاز سے کہا۔ ”ہوشیار رہنا۔“

”باہر کی طرف سے آپ بے فکر رہیں۔“

میں شہلا کے ساتھ اندر آیا تو دروازہ خود بہ خود بند ہوگیا۔ یہ کوئی نصف کنال پر پھیلا ہوا پوری طرح کورڈ مکان تھا۔ سوائے سامنے کے چھوٹے لان اور کار پورچ کے۔ لاؤنج کے ایک طرف بہترین کچن تھا اور اس سے آگے دو کمروں کے دروازے نظر آرہے تھے۔ یہ عام دروازے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھے۔ مکان اندر سے بہت صاف ستھرا اور چمک رہا تھا۔ شہلا نے کہا۔ ”یہ اندر سے سینٹرلی اے سی ہے اور یہاں ہوا کی آمد و رفت کی کوئی جگہ نہیں ہے اس لیے گرد و غبار اندر آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

”تمہارا پلان کہاں ہے؟“

وہ مجھے کچن سے آگے ایک کمرے میں لائی یہ بیڈ روم تھا۔ اس نے الماری کھولی اور اس کے ایک خفیہ خانے سے ایک چھوٹی سی پلاسٹک کور والی فائل نکال کر میری طرف اچھال دی۔ میں نے فائل کیچ کی۔ ”پلان اس میں ہے؟“

”اس میں صرف آؤٹ لائن ہے۔“ وہ بولی اور پھر اپنے ماتھے پر انگلی ماری۔ ”اصل پلان یہاں محفوظ ہے۔“

میں جھنجلا گیا۔ ”تو تم بلاوجہ یہاں لائی ہو، کیا مجھے تمہارا سر توڑ کر اس میں سے پلان نکالنا پڑے گا؟“

وہ ہنسی۔ ”اس کی ضرورت نہیں ہے، میں جو تعاون کر رہی ہوں۔ لیکن یہ ضروری ہے اسے دیکھ کر تم میرا پلان آسانی سے سمجھ جاؤ گے۔“

”شہلا۔“ میں نے کسی قدر سخت لہجے میں کہا۔ ”تم میری نرمی سے ناجائز فائدہ اُٹھانے کی کوشش کر رہی ہو۔“

وہ ڈرنے کے بجائے مزید شوخ ہو گئی۔ ”کیوں کیا مجھے اس کا حق نہیں ہے، میں ایک حسین عورت ہوں۔“ اس نے کہتے ہوئے بُل کھانے کے انداز میں اپنا سراپا دکھایا۔ ”کیا نہیں ہوں؟“

”اگر ہو تو یہ کون سا موقع ہے؟“

اس نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”یہی تو موقع ہے، یہاں کوئی نہیں ہے بس میں اور تم ہیں۔“

”سمجھ لو میں بھی نہیں ہوں۔“ میں نے جلدی سے کہا۔

”اچھا۔“ وہ چیلنج کرنے والے انداز میں بولی۔ ”تب میں کپڑے بدل رہی ہوں کیونکہ میں یہاں اکیلی ہوں اور یہ باسی کپڑے اب برداشت نہیں ہو رہے ہیں۔“

موسم ایسا نہیں تھا کہ اس کا لباس اتنی جلدی خراب ہوتا۔ مکان پر راکٹ حملے میں بھی وہ کمبل میں ہونے کی وجہ سے محفوظ رہی تھی یعنی اس کے کپڑے گرد سے بچ گئے تھے۔ یہ سراسر اس کی بدمعاشی تھی۔ میں نے کہا۔ ”کپڑے بدلنے کی ضرورت نہیں ہے اپنے کچھ کپڑے اور دوسرا سامان لے لو جس کی تمہیں ضرورت پڑ سکتی ہے۔“

اس نے منہ بنا کر مجھے دیکھا۔ ”تم میں ذرا بھی سینس آف ہومر نہیں ہے۔“

”جس قسم کا سینس آف ہومر تم چاہتی ہو وہ بالکل بھی نہیں ہے۔ اب جو کرنا ہے دس منٹ کے اندر کر لو کیونکہ اس کے بعد یہ جگہ باقی نہیں رہے گی۔“ میں نے کہا اور جیب سے ایک آتش گیر ٹائم بم نکالا۔ عبداللہ نے ان بموں کا ایک پورا سیٹ دیا تھا۔ شہلا کے ساتھ یہاں آتے ہوئے میں ایک لے آیا کہ شاید کہیں ضرورت پڑ جائے۔ ”میں نے اس پر دس منٹ بعد کا وقت سیٹ کر دیا ہے اور یہ دیکھو ٹائمر چل پڑا ہے۔“ میں نے ٹائمر کو آن کرنے والا بٹن دبا کر اسے اسٹاپ واچ دکھائی۔

”یہ کیا کر رہے ہو؟“ اس نے چیخ کر کہا اور میری طرف لپکی لیکن اس کے قریب آنے سے پہلے میں نے پاؤں اٹھا کر اسے روکا اور پھر بستر کی طرف دھکیل دیا۔ وہ پلٹ کر بستر پر جا گری۔ اس کے اٹھنے سے پہلے میں نے اس کی کمر پر پاؤں رکھ دیا۔ اس نے ترنت کر اُٹھنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی اور میرے پاؤں تلے کسی زہریلی ناگن کی طرح بُل کھانے لگی۔

”بس اب کچھ مت کرنا، اگر اس مکان کے ساتھ جل کر مرنا نہیں چاہتی ہو تو جو کرنا ہے دس منٹ میں کر لو بلکہ اب ساڑھے نو منٹ رہ گئے ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے پاؤں ہٹا لیا۔ وہ تیزی سے اُٹھی اور ملتجی لہجے میں بولی۔

”پلیز شہباز یہ مت کرو میں نے بڑی محنت سے اس مکان کو اس شکل میں ڈھالا ہے۔ مجھے اس جگہ سے محبت ہے۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”افسوس کہ تم نے محبت کرنے کے لیے ایک بے جان مکان کو پسند کیا ہے صرف نو منٹ رہ گئے ہیں۔“

”ہاں کیونکہ آج کے انسان محبت کے لائق کہاں ہیں۔“ وہ تلخی سے بولی۔ ”میں اس مکان کو تباہ ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔“

میں نے اسے خبردار کیا۔ ”شہلا تم باتوں میں وقت ضائع کر رہی ہو، ابھی تمہارے پاس موقع ہے۔ یہاں تمہاری کوئی اہم چیز ہے تو اسے نکال لو اب آٹھ منٹ رہ گئے ہیں۔“

وہ سمجھ گئی کہ میں اس کی بات نہیں سنوں گا۔ وہ الماری کی طرف لپکی تو میں نے پستول اس کی طرف سیدھا کر لیا۔ ”کوئی غلط حرکت کرنے سے پہلے سوچ لینا مجھے گولی

چلانے میں وقت نہیں لگے گا۔“

اس نے ایک چرمی بیگ نکالا اور پھر کچھ کپڑے نکال کر ایک خالی بیگ میں ڈالے۔ اسی بیگ میں اس نے ایک لاکر سے زیورات کے ڈبے نکال کر رکھے۔ چرمی بیگ پر نمبروں والا لاک تھا۔ لیکن بیگ اس نے صرف زپ سے بند کر دیا۔ یقیناً چرمی بیگ میں کوئی قیمتی چیز تھی۔ اس نے پانچ منٹ میں سب تیار کر لیا اور مجھ سے کہا۔ ”میں نے سب لے لیا ہے۔“

”اس بیگ میں کیا ہے؟“

”اس میں میری کچھ اہم چیزیں ہیں۔“ اس نے واضح جواب دینے سے گریز کیا۔ میں نے مطالبہ کیا۔

”مجھے دکھاؤ ورنہ یہ بیگ یہیں چھوڑ جاؤ۔“

وہ سمجھ گئی کہ میں نہیں مانوں گا۔ مجبوراً اس نے نمبروں والا لاک ترتیب دے کر کھولا اور بیگ میری طرف بڑھا دیا۔ اس میں خاصی مالیت کی کرنسی تھی۔ یہ شاید ایک کروڑ روپے تھے۔ پانچ ہزار والے نوٹوں کی بیس گڈیاں تھیں۔ کرنسی کے علاوہ اس میں کچھ نہیں تھا۔ میں نے اطمینان کر کے بیگ اسے واپس کر دیا۔ اس نے کسی قدر حیرت سے مجھے دیکھا۔

”تم اسے واپس کیوں کر رہے ہو؟“

”کیونکہ یہ رقم تمہاری ہے اور مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے۔“

”باہر چلو۔“ اس نے خوف زدہ انداز میں کہا۔ ”تم نے جو بم لگایا ہے وہ پھٹ نہ جائے؟“

میں اس کے ساتھ مکان سے باہر آیا اور دروازہ بند کر دیا۔ اس کا تالا خودکار طریقے سے لگ جاتا تھا اور اسے دوبارہ کھولنے کے لیے شہلا کے انگوٹھے کی ضرورت پڑتی، میں نے باہر آتے ہی بم جیب سے نکال کر اس کا ٹائمر آف کر کے اسے ری سیٹ کر دیا اب اسے دوبارہ ایکٹو کرنا پڑتا۔

اس نے بے یقینی سے میری طرف دیکھا۔ ”تم نے یہ بم تو لگایا ہی نہیں۔“

میں نے بم جیب میں رکھ لیا۔ ”اس کی ضرورت نہیں مس شہلا، یہ مذاق تھا کیسا لگا؟“

اس کے چہرے پر بیک وقت غصے، بے بسی اور شک کے تاثرات نمودار ہوئے۔ ”تم واقعی مذاق کر رہے تھے؟“

”ہاں میرا مذاق ایسا ہی ہوتا ہے اور کیا تم نے مجھے مرشد یا فتح خان جیسا کوئی نفسیاتی مریض سمجھ رکھا ہے جو دشمن سے وابستہ ہر چیز کو تباہ کرنے پر تل جاتے ہیں، چاہے وہ کتنی ہی خوب صورت کیوں نہ ہو۔ مجھے تمہارا یہ گھر بہت اچھا لگا اور جو چیز مجھے اچھی لگے میں اسے تباہ نہیں کرتا۔“

اس نے سکون کا سانس لیا اور چہک کر بولی۔ ”شہباز تم نے میرا دل جیت لیا ہے، آئی لو یو۔“

”معاف کرنا مجھے تمہارے دل کی ضرورت نہیں ہے، مجھے لاکر میں پڑا اپنا بریف کیس چاہیے۔ اگر تم بلاوجہ کی ٹانگ اڑا کر نہ رکھتیں تو میں اب تک خود لاکر تک رسائی حاصل کر چکا ہوتا۔“

”اس پلان کی مدد سے۔“ اس نے فائل کی طرف اشارہ کیا۔ ”تم نہایت آسانی سے لاکر تک پہنچ جاؤ گے۔“

”اس میں کیا ہے؟“

”اس میں بینک کے اندر کا مکمل نقشہ ہے اور لاکر روم کی تصاویر ہیں۔ حفاظتی انتظامات کے بارے میں مکمل معلومات ہیں۔“

”بینک کے اندر کوئی تمہارا مددگار بھی ہے شاید اس کا نام لیاقت ...“

”میں نے اس وقت غلط بتایا تھا اس کا نام شاہد منظور ہے اور وہ بینک میں سیکورٹی سپروائزر ہے۔ اب بینک والے گارڈز نجی سیکورٹی کمپنیوں سے لیتے ہیں لیکن سپروائزران کا اپنا ملازم ہوتا ہے خاص طور سے جن بینکوں میں زیادہ کیش یا لاکرز ہوتے ہیں وہاں لازمی بینک کا اپنا ملازم سیکورٹی سپروائزر ہوتا ہے کیونکہ ایسے واقعات ہو چکے ہیں جب گارڈز ہی رات کو بینک لوٹ کر فرار ہو گئے۔“

”شاہد منظور تم سے تعاون پر آمادہ ہے ممکن ہے وہ تمہیں بے وقوف بنا رہا ہو اس کا کام نکل چکا ہے۔“ میں نے کہا تو شہلا کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ بتا چکی تھی کہ اس نے اپنے حسن کا جال ڈال کر شاہد منظور کو پھنسایا تھا۔

”میں نے بتایا تھا وہ کچھ نہیں جانتا ہے لیکن اس کی مدد سے میں سب معلوم کر چکی ہوں اور بذات خود جا کر دیکھ بھی چکی ہوں کیونکہ اس کی اکثر ڈیوٹی رات کو ہوتی تھی، میں اس سے ملنے کے بہانے بینک پہنچ جاتی تھی۔ مجھے کیش روم اور لاکر روم دروازوں کے کوڈز بھی معلوم ہو گئے ہیں۔“

”ان کے کوڈز ہر روز بدل دیے جاتے ہوں گے؟“

”نہیں ان کے کوڈز ہر ہفتے بدلے جاتے تھے۔ پانچ مختلف کوڈز ہیں اور ہر پانچویں ہفتے پہلے والا کوڈ آ جاتا ہے میرے پاس تمام کوڈز ہیں۔“

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہم صحن میں کھڑے بات کر رہے ہیں۔ شہلا بہت خوش تھی کہ میں نے اس کے اس خوب صورت ٹھکانے کو تباہ نہیں کیا۔ ایاز نے گیٹ کے اوپر سے جھانکا۔ ”شہباز صاحب باقی گفتگو راستے میں بھی ہو سکتی ہے۔“

میں نے اس سے اتفاق کیا اور سہارا دے کر شہلا کو دیوار پر چڑھانا چاہا لیکن وہ خود ایک ہی چھلانگ میں اوپر چڑھ گئی اور پھر دوسری طرف چھلانگ لگا دی۔ اس نے مجھے صحیح سے بے وقوف بنایا تھا وہ تو مجھے بروقت ترکیب سوجھ گئی اور میں پستول لینے میں کامیاب رہا ورنہ امکان تھا وہ ہمارے ہاتھ سے نکل جاتی۔ جب تک میں باہر آیا ایاز نے پچھلے حصے میں بٹھا کر جیپ اسٹارٹ کر چکا تھا۔ میں بیٹھا اور اس نے جیپ آگے بڑھا دی۔

”جب فائر ہوا تو کسی طرف سے ردعمل نہیں آیا تھا۔“ ایاز نے کہا۔ ”لیکن کچھ دیر سے بائیں طرف کے ایک مکان سے ایک بڑی بی آر کئی بار جھانک چکی ہیں۔ ان کو شک ہو رہا تھا۔“

”ممکن ہے پولیس کو کال کر دی ہو؟“

”ہو سکتا ہے۔“ ایاز نے کہا اور مجھے یاد دلایا۔ ”خاتون کی آنکھیں بند کرنی ہیں۔“

میں عقب میں آیا اور شہلا کے احتجاج اور مزاحمت کے باوجود اسے دوبارہ ہتھکڑی لگا کر اس کی آنکھوں اور منہ پر ٹیپ لگا دیا۔ اس کے دونوں بیگ اس کے پاس تھے۔ واپس آ کر میں نے فائل کھولی۔ اس میں سچ مچ بینک کا مکمل اندرونی نقشہ تھا اور ایک ایک چیز کی وضاحت تھی۔ اس کے ساتھ لاکر روم کی فل سائز تصاویر تھیں یہ کسی بہترین ڈیجیٹل کیمرے سے لی گئی تھیں اور ان کی ریزولوشن لاجواب تھی۔ ایک کمپیوٹر پرنٹ آؤٹ پر نمبروں سے کھلنے والے تالوں کے نمبرز لکھے تھے۔ دو تالوں کے پانچ مختلف کوڈز تھے جن میں سے ایک ہفتے میں ایک بار استعمال ہوتا تھا۔ رات کے وقت بینک میں چار گارڈ ہوتے تھے۔ دو باہر اور دو اندر ہوتے تھے۔ ہر چار گھنٹے بعد اندر اور باہر والوں کی ڈیوٹی بدل جاتی تھی۔

سیکورٹی سپروائزر بینک کے اندرونی حصے میں ہوتا تھا جہاں تک کسی گارڈ کی رسائی بھی ممکن نہیں تھی۔ اگر کوئی ڈکیتی کی نیت سے بینک میں آئے اور اندر والے گارڈز پر بھی قابو پا لے تب بھی وہ سیکورٹی سپروائزر پر قابو نہیں پا سکتا تھا۔ سیکورٹی سپروائزر اندر کیمروں کی مدد سے بینک کے باہر اور بیرونی ہال ہر جگہ مکمل نظر رکھے ہوئے ہوتا تھا اور ذرا سا خطرہ دیکھتے ہی وہ نہ صرف الارم بجا دیتا بلکہ پولیس اور سیکورٹی کمپنی کو بھی کال کر دیتا۔ ڈاکو اندر نہیں گھس سکتے تھے کیونکہ انہیں سیف روم کا دروازہ کاٹنا پڑتا اور یہ آسان کام نہیں تھا۔ بینک والوں نے واقعی بہت اچھے حفاظتی انتظامات کیے تھے۔ ان کی موجودگی میں ڈاکا مارنا یا بینک میں گھسنا آسان کام نہیں تھا۔ لیکن شہلا کا کہنا تھا کہ اس کا حیران کن حد تک آسان پلان تھا جس کی مدد سے بینک میں با آسانی گھسا جا سکتا تھا۔ ہم واپس آئے تو وسیم گیا ہوا تھا۔ اسے اس عورت کے ٹھکانے کا پتا چلانا تھا جسے گزشتہ رات فاضلی اس کوٹھی میں لے گیا تھا۔ ایاز شہلا کو نیچے لے گیا اور میں نے وسیم کے نمبر پر کال کی۔

”کام ہو گیا؟“

”جی جناب، اس عورت کا پتا مل گیا ہے۔ اونچی پارٹی ہے۔ ایف سیکٹر میں ایک اپارٹمنٹ میں رہتی ہے۔ نام شبانہ ہے اور کام کا آپ کو پتا ہے۔“

”فاضلی وہاں سے نکلا یا نہیں؟“

”فاضلی نکلا تھا لیکن جو آدمی اس کے پیچھے تھا اس کی بائیک اچانک پنکچر ہو گئی اور فاضلی نکل گیا اس کے بعد وہ دوبارہ کوٹھی کی طرف نہیں آیا۔“

”اس کی قسمت اچھی ہے کئی بار وہ میرے نشانے پر آنے کے بعد نکلا ہے۔“ میں نے سرد آہ بھری۔ ”شبانہ کے لیے کیا پروگرام ہے؟“

”اسے آج رات گھر سے نکلنے پر اُٹھا لیا جائے گا اور اگر وہ نہیں نکلی تو یہ کام کل کیا جائے گا۔“

”تم نے ٹھیک سوچا ہے اس کے گھر میں گھسنا مناسب نہیں ہوگا۔“

”میں نے آپ کی موبائل کمانڈ سینٹر والی بات پر غور کیا ہے۔ یہ بالکل ممکن ہے ہمیں اس کے لیے ایک عدد طاقت ور انجن والی وین یا مائیکرو بس درکار ہوگی۔“

”اندازاً کتنے کی مل جائے گی؟“ میں نے دل ہی دل میں اپنے اثاثوں کا حساب لگاتے ہوئے کہا۔

”اچھی حالت میں پرانی وین یا مائیکرو بس آٹھ کے آس پاس میں مل جائے گی۔“

”میں ایاز کے ذمے یہ کام لگاتا ہوں اسے گاڑیوں کے بارے میں بڑی اچھی طرح علم ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ کون سی چیز کہاں سے مل جائے گی۔“

”یہ ٹھیک رہے گا اسے میرے پاس بھیج دیں۔“ وسیم نے کہا۔ ”اس خبیث کے آدمیوں والا معاملہ سفیر دیکھ لے گا۔“ اس نے مرشد کا نام لینے سے گریز کیا۔

”اس کے لیے میں بھی یہاں ہوں۔“ میں نے کہا اور فون بند کر دیا میں نے ایاز کو بلایا۔ اسے اپنے پاس موجود تمام رقم دی۔ یہ کوئی دس لاکھ کے قریب رقم تھی۔ اسے وسیم کے پلان کے بارے میں سمجھایا۔ ”ہمیں ایک اچھی حالت میں وین یا مائیکرو بس کی ضرورت ہے۔ کوشش کرو کہ یہ کام آج ہو جائے اگر مطلوبہ گاڑی مل جائے تو اس کا سودا کر لینا۔“

”میں ابھی روانہ ہو جاتا ہوں۔ میں کئی ایسے شوروم سے واقف ہوں جہاں اس قسم کی گاڑی مل سکتی ہے۔“

”گڈ اسی وجہ سے میں نے تمہارا انتخاب کیا ہے۔“ میں نے کہا اور سفیر کے بارے میں پوچھا۔ ”وہ کہاں ہے؟“

”نیچے بیتو کے ساتھ مرشد کے آدمیوں کے ساتھ لگے ہوئے ہیں۔“ ایاز مسکرایا۔ ”انہوں نے میری ڈیوٹی سنبھال لی ہے۔“

میں نیچے آیا تو قیدیوں کے کمرے سے شور کی آواز آ رہی تھی غالباً یہ جمیل تھا۔ وہ واویلا مچا رہا تھا۔ ”ہائے ربا... اوئے ظالما... ہائے... اوئے نہ مار۔“

میں نے اندر جھانکا تو بیتو اسے پنچنگ بیگ کے طور پر استعمال کر رہا تھا اور اس کا ناک منہ برابر کر دیا تھا۔ سفیر مار دھاڑ والے کاموں سے ذرا گریز کرتا تھا خاص طور سے جب وہ ہاتھ سے کرنا پڑیں اس لیے وہ ایک طرف کھڑا تماشا دیکھ رہا تھا۔ دوسرے کا نام شاید خرم تھا۔ اس کے پاؤں میں گولی لگی تھی اور وہ ایک طرف دیوار سے ٹکا ہوا کانپ رہا تھا۔ گزشتہ روز کے مقابلے میں اس کی اکڑ میں کمی آئی تھی۔ بھوک، گولی کے خراب ہوتے زخموں کی تکلیف اور سردی کے ساتھ مسلسل خاطر تواضع نے اس کو سیدھا کر دیا تھا۔ میں اندر آیا اور سفیر سے پوچھا۔

”ان کی یادداشت بہتر ہوئی؟“

سفیر مسکرایا۔ ”بہت حد تک.... اسے یاد آ گیا ہے کہ راحیلہ کا قتل اس نے کیا تھا۔“ اس نے خرم کی طرف اشارہ کیا۔ ”اور یہ کام اس نے مرشد کے کہنے پر کیا تھا۔“

”کیا فائدہ یہاں یہ اقرار کر رہا ہے لیکن اسے پولیس کے حوالے کیا تو یہ مکر جائے گا اور وہی راگ الاپے گا جو اسے مرشد سمجھائے گا۔“ میں نے مایوسی سے کہا تو وہ بلبلا گیا تھا۔

”نہیں میں پولیس کے سامنے بھی یہی کہوں گا۔“

وہ ہمیں بے وقوف سمجھ رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”ایسے نہیں تم صاف ستھرے ہو کر یہ بیان ریکارڈ کراؤ گے کبھی تمہاری جان چھوٹے گی۔“

وہ بدکا۔ ”کیسا بیان؟“

”یہی کہ تم نے مرشد کے حکم پر کیا کیا جرائم کیے ہیں جیسے اس صحافی عورت راحیلہ کا قتل کیا اور بھی جرم کیے ہوں گے۔“

اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ”اگر میں بیان دیدوں تو کیا تم مجھے چھوڑ دو گے؟“

”کیوں نہیں۔“ میں نے بلا تامل کہا۔ ”ہمیں مرشد کے جرائم کا ثبوت درکار ہے تمہارا کوئی اچار تو نہیں ڈالنا ہے۔“

بیتو کا دل بھر گیا تھا اس نے جمیل کو چھوڑ دیا اور وہ دیوار سے ٹیک لگائے ہانپ رہا تھا۔ میں نے بیتو کی طرف دیکھا۔ ”اس نے کچھ اگلا ہے؟“

”اسی نے تو بتایا ہے کہ راحیلہ کا قتل خرم نے کیا ہے۔“ بیتو بولا۔ ”پر یہ حرامی پن کر رہا ہے پورا بات نہیں بتا رہا تھا پھر ہم کو غصہ دلایا اور اس کا منہ خراب کر دیا۔“

بیتو کے مکوں نے جمیل کے منہ پر کوئی نصف درجن زخم ڈال دیئے تھے اس کی ایک آنکھ سوجن کی وجہ سے بند ہو رہی تھی اور دوسری میں خون اُترا ہوا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ ان سے اب بیان حاصل کر لیا جائے۔ میں بیتو اور سفیر کو باہر لایا۔ ”ان سے بیان حاصل کرنا ہے لیکن پہلے ان کی حالت ٹھیک کرنا ہوگی ورنہ ویڈیو میں تیار کیا ہوا بیان صاف تشدد کی مدد سے حاصل کیا ہوا نظر آئے گا۔“

”اس میں تو کئی دن لگ جائیں گے۔“ سفیر نے اعتراض کیا۔ ”منے نے دوسرے کا حلیہ کچھ زیادہ ہی بگاڑ دیا ہے۔“

”زخم کا حلیہ کسی قدر بہتر ہے۔ اسے کھانے پینے کو دو اور کوئی دوا بھی دیدو۔ اس کی حالت جلد بہتر ہو جائے گی۔“

”کھاپی کر وہ دوبارہ اپنی بات پر اڑ گیا تو؟“

”اس کا علاج ہے جمیل کو قربان کر دیں گے اس کے انجام سے عبرت پکڑ کر وہ مان جائے گا۔“

”جیسا تم کہو۔“ سفیر نے کہا۔ ”لیکن اس بیان کو کہاں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

استعمال کرو گے عدالتوں میں اس قسم کی چیزوں کو تسلیم نہیں کیا جاتا۔"

"لیکن عدالت انہیں بالکل نظر انداز بھی نہیں کرتی ہے۔ حالات اور واقعات کی کڑی ملا کر ایک نتیجے پر پہنچا جا سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "ان سے بیان حاصل کرنے کی تیاری کرو ہم انہیں زیادہ دن یہاں نہیں رکھ سکتے۔"

سفیر نے خرم کو دوسرے صاف ستھرے کپڑے دیئے اور اسے اپنے زخم صاف کرنے کا موقع بھی فراہم کیا۔ باہر لا کر اسے کھانے پینے کو بھی دیا تھا۔ پھر سفیر نے اسے کچھ دوائیں دیں اور ایک اینٹی بایوٹنگ انجکشن لگایا تاکہ اس کے زخم کی تکلیف کم ہو۔ جمیل کو اس سلسلے میں بالکل نظر انداز کر دیا تھا دو دن سے اسے کھانے اور پینے کو کچھ نہیں دیا تھا اور پیاس سے اس کی حالت بُری ہو رہی تھی۔ ایسا ضروری تھا تاکہ خرم عبرت پکڑتا رہے اور اسے احساس رہے کہ کسی قسم کے انکار کی صورت میں اس کے ساتھ کیا ہو سکتا ہے۔ ہمارے پاس ڈیجیٹل کیمرا نہیں تھا لیکن آئی فون میں بہترین قسم کا میگا پکسل کیمرا موجود تھا جو ہائی ڈیفینیشن مووی بھی بنا سکتا تھا اور اس کے اندر کئی جی بی کی میموری تھی جس میں یہ مووی با آسانی محفوظ کی جا سکتی تھی۔ میں نے اسے استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ ریکارڈنگ اسی کمرے میں کی جانی تھی کیونکہ یہاں سوائے خالی دیواروں کے اور کچھ نہیں تھا۔ دیواروں پر آف وائٹ میٹ فنش پینٹ تھا۔ اگرچہ دیواروں پر خون کے دھبے آ گئے تھے لیکن کسی ڈٹرجنٹ ملے پانی اور کپڑے سے انہیں با آسانی صاف کیا جا سکتا تھا۔ خرم کو دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا اور آئی فون کو مووی ریکارڈنگ پر سیٹ کر کے ایک اسٹول پر رکھ دیا تھا اس سے بہت واضح اور بغیر کسی حرکت کے مووی بن رہی تھی۔ تیز روشنی والا بلب آئی فون کے پیچھے تھا اس لیے خرم پوری طرح واضح تھا۔ آئی فون میں آواز کی ریکارڈنگ کا سسٹم بھی تھا۔ میں نے آواز بدل کر خرم سے پہلا سوال کیا۔

"تم نے راحیلہ کو پہلی بار کب دیکھا؟"

اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور بولا۔ "جب وہ مرشد ہاؤس میں تھی۔"

"تم نے دیکھا تو اس وقت وہ کیسی حالت میں تھی؟"

"وہ بے ہوش تھی اور اس کے سارے کپڑے پھٹ گئے تھے۔"

"کیا اس کے ساتھ زیادتی ہوئی تھی؟"

"لگتا تو ایسا ہی تھا لیکن میں نے اپنی آنکھ سے کچھ نہیں دیکھا تھا۔" اس نے جواب دیا۔

"تم مرشد کے لیے کیا کام کرتے ہو؟"

"جو مرشد بادشاہ کہیں۔"

"اگر وہ کہے کہ کسی کو قتل کرنا ہے، کسی عورت کو اغوا کر کے لانا ہے یا کسی کا گھر جلا دینا ہے تو تم یہ سب کرتے ہو؟"

اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں کیونکہ اگر وہ اقرار کرتا تو ایک طرف قانون کے شکنجے میں اس کی گردن پھنستی تو دوسری طرف مرشد اسے نہ بخشتا۔ بلکہ قانون سے تو وہ شاید بچ جاتا لیکن مرشد اسے اس کے گھر والوں سمیت نمونہ عبرت بنا دیتا۔ مگر وہ جواب دینے سے انکار بھی نہیں کر سکتا تھا مجبوراً اس نے سر ہلایا۔ "جی جو بھی کہیں وہ مجھے کرنا ہوتا ہے۔"

"تمہارا کام مرشد ہاؤس سے باہر ہوتا ہے۔ اس دن تمہیں اندر کیوں بلایا گیا تھا۔"

"وہ مجھ سے کہہ گیا تھا کہ اس عورت کو..."

"کس عورت کو نام سے بتاؤ؟"

"راحیلہ کو ٹھکانے لگانا ہے۔" اس نے بہ مشکل کہا۔ اتنی مشکل تو اسے اس مظلوم عورت کا گلا دبانے میں پیش نہیں آئی ہو گی جتنی اس کے قتل کے اقرار میں پیش آ رہی تھی۔

"تمہیں کس نے حکم دیا تھا کہ اس عورت کو قتل کر دو؟"

اس بار اس نے تھوک نگلا اور کئی سیکنڈ کی کوشش کے بعد بولا۔ "مرشد بادشاہ نے۔"

"یہ مرشد بادشاہ کون ہے؟"

اس نے تعجب سے کہا۔ "جناب سارا زمانہ جانتا ہے مرشد بادشاہ کون ہیں۔"

"اس کا اصل اور پورا نام بتاؤ؟"

"سید مرشد علی ولد سید مستفید علی۔" خرم نے جواب دیا وہ سمجھا نہیں تھا کہ میں نے یہ سوال کیوں کیا تھا میں اس بیان کو عدالتی نقطہ نظر سے حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تاکہ مرشد کا وکیل اس میں سقم تلاش نہ کر سکے۔ میں نے مرشد ہاؤس کا پتا پوچھا تو اس نے وہ بھی فر فر بتا دیا۔ پھر میں اصل سوال کی طرف آیا۔

"مرشد نے اس صحافی عورت راحیلہ کو قتل کرنے کا حکم کیوں دیا تھا؟"

"یہ تو مرشد بادشاہ ہی جانتے تھے۔ وہ بس حکم دیتے ہیں اور ہمارا کام تعمیل کرنا ہوتا ہے۔" خرم نے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"تو تم نے حکم کی تعمیل کی اور اس مظلوم عورت کا گلا دبا کر اسے ہلاک کر دیا؟"

اس نے بڑی مشکل سے سر ہلایا۔ "مجبوری تھی مرشد بادشاہ کا حکم تھا۔"

"واضح الفاظ میں بتاؤ کہ تم نے کیا کیا؟"

"میں نے اس کا گلا دبا کر اسے ہلاک کر دیا تھا۔" وہ ہیجانی انداز میں بولا۔ "اس سے زیادہ اور کیا صاف بتاؤں۔"

"راحیلہ کی لاش کا کیا ہوا تھا؟"

"مجھے اس بارے میں نہیں معلوم وہ فاضلی لے گیا تھا۔" خرم نے بتایا تو میں چونک گیا۔ یعنی فاضلی اس معاملے میں بھی ملوث تھا۔ میں نے بیان کو مضبوط کرنے کے لیے اس سے مزید سوالات کیے اور اس بات کو یقینی بنایا کہ ذکر راحیلہ اور مرشد کا ہی کیا جا رہا ہے۔ تقریباً بیس منٹ کی ریکارڈنگ تھی۔ کام مکمل کر کے ہم باہر آئے اور آئی فون پر ہی ریکارڈنگ دیکھی۔ سب کچھ بہترین طریقے سے ریکارڈ ہوا تھا۔ اب ہمیں کمپیوٹر کی ضرورت تھی تاکہ سی ڈیز پر اس بیان کی کاپیاں بنا سکیں لیکن یہاں کمپیوٹر نہیں تھا۔ وہ عبداللہ والی کوٹھی میں تھا۔ میں نے عبداللہ کو کال کی۔

"عبداللہ ہم نے مرشد کے ایک آدمی سے بیان حاصل کر لیا ہے اور اسے مووی کی صورت میں ریکارڈ کر لیا۔"

"کیسا بیان جناب؟"

میں نے اسے مختصر تفصیل بتائی تو وہ خوش ہو گیا۔ "یہ کام کی چیز ہاتھ آئی ہے۔"

"تم ایسا کرو اس مووی کی کئی کاپیاں بنا لو یہاں کمپیوٹر نہیں ہے۔"

"میرے پاس ایک لیپ ٹاپ ہے وہ بھیج دیتا ہوں۔"

"نہیں اس کے بجائے یو ایس بی کے ساتھ اپنا آدمی بھیج دو میں چاہتا ہوں کہ تمہارے بنگلے میں موجود کمپیوٹر کا ماہر اس مووی کو مزید بہتر اور مختصر کر دے کیونکہ آئی فون میں اس کا سائز خاصا بڑا آیا ہے اور پھر اسے پوری طرح چیک کرنے کے بعد سی ڈی یا ڈی وی ڈی پر منتقل کرے۔"

"میں سمجھ گیا میں وسیم صاحب کے ساتھ ذرا مصروف تھا اس لیے گاڑی اور بائیک کبھی نہیں بھیج سکا تھا اب دونوں ایک ساتھ بھیج رہا ہوں۔" عبداللہ نے کہا۔

"وسیم کہاں ہے؟"

"میرے ساتھ ہیں۔"

"بات کرانا۔" میں نے کہا تو عبداللہ نے موبائل وسیم کو دیدیا۔

"کیا ہو رہا ہے؟"

"کمانڈ سینٹر کے لیے آلات کا انتخاب کر رہے ہیں ابھی کچھ دیر میں ایاز کے ساتھ وین دیکھنے کے لیے جانا ہے۔"

"ایاز یہاں ہے؟"

"نہیں وہ باہر ہے مجھے باہر سے پک کرے گا۔"

میرے ساتھی سمجھدار تھے وہ بلاوجہ عبداللہ والی کوٹھی کی طرف جانے سے گریز کرتے تھے۔ تاکہ دشمن کی وہاں تک رسائی کا اندیشہ کم سے کم رہے۔ "کال گرل والے معاملے کا کیا بنا؟"

"آدمی اس کی نگرانی کر رہے ہیں اور جیسے ہی وہ باہر نکلے گی اسے اٹھا لیں گے۔"

"میرا خیال ہے اسے بھی اسی ٹھکانے پر لے آؤ۔" میں نے کہا۔ "یہاں خاصی گنجائش ہے اور پوچھ گچھ میں بھی آسانی رہتی ہے۔"

"یہی مناسب ہوگا۔" وسیم نے کہا میں نے اسے مرشد کے آدمی سے حاصل شدہ اقبالی بیان کے بارے میں بتایا تو وہ بھی خوش ہو گیا۔

"یہ زبردست کام ہوا ہے اب آیا نا اونٹ پہاڑ تلے۔"

"لیکن زیادہ خوش فہمی کی ضرورت بھی نہیں ہے، مرشد فی الحال بہر طاقت ور اور بارسوخ ہے۔"

"لیکن شہباز صاحب کبھی نہ کبھی تو اونٹ پہاڑ تلے آئے گا۔ یہ ایک مسلمان کی حیثیت سے میرا ایمان ہے کہ اللہ ظالم کی رسی ایک حد تک دراز کرتا ہے اور جب رسی کھینچتا ہے تو اسے کہیں پناہ نہیں ملتی۔"

"میں تم سے متفق ہوں اور اسی بھروسے پر اپنی جدوجہد جاری رکھے ہوئے ہوں۔"

"شہلا کے معاملے کا کیا بنا؟"

میں نے اسے بتایا۔ "اس کے پاس کوئی ایسا پلان ہے جس کی مدد سے بینک میں داخل ہو کر کارروائی کرنا بہت آسان ہو جائے گا۔"

"اس سے پلان نکلوائیں لیکن اس پر اعتماد نہ کریں۔"

"اعتماد تو بالکل نہیں ہے لیکن یہ بہت شاطر عورت ہے

آج بھی ہاتھ سے نکل گئی تھی۔" میں نے وسیم کو بتایا کہ شہلا کے خفیہ ٹھکانے پر پہنچ کر اس نے کیا حرکت کی تھی۔

"آپ کو وہاں پر بھی اس کے ہاتھ باندھ کر رکھنے چاہیے تھے۔"

"بھائی انسان ہوں غلطی انسان سے ہوتی ہے۔"

وسیم سے بات کر کے میں نے موبائل بند کر دیا۔ پھر کچھ خیال آیا اور میں نے عبداللہ کو کال کی۔ "یار اپنے آدمی سے کہنا کھانے کے لیے بھی کچھ لیتا آئے ابھی تک دوپہر کا کھانا نصیب نہیں ہوا۔"

"ہم تو بھوک سے فوت ہونے والا ہے۔" بیتو نے دور سے کہا۔

عبداللہ ہنسا۔ "آپ فکر نہ کریں یہاں ٹفن پیک ہو رہے ہیں آج خواتین نے زبردست چکن بنایا ہے۔"

فون بند کر کے میں نے بیتو کو خوش خبری سنائی اس کی باچھیں کھل گئی تھیں۔ "شوبی قسم سے باہر کا کھا کھا کر میرا منہ اتر گیا ہے۔ کتنے دن بعد دیدی کے ہاتھ کا کھانا ملے گا۔"

"بیٹے اگر مونا نے بنایا ہو تو یہ منہ بالکل اُتر جائے گا۔" سفیر نے بیتو کا گال تھپتھپا کر کہا۔ "تمہیں ابھی اس کے ہاتھ کے کھانوں کا تجربہ نہیں ہے۔"

"یار کیوں جھوٹ بول رہا ہے اتنا اچھا تو بناتی ہے۔ شادی سے پہلے تو تو کھانے کے لیے مرا جاتا تھا۔ ہر روز اس کے گھر ڈنر پر مصر ہوتا تھا۔"

سفیر نے سرد آہ بھری۔ "یار وہ شادی سے پہلے کا دور تھا اس وقت تو وہ اُبلا ہوا چقرا بھی کھانے کو پیش کرتی تو میں خوشی خوشی کھا جاتا۔"

"لیکن میں اُبلا ہوا چقرا کسی صورت نہیں کھا سکتا۔" میں نے کہا۔ "مجھے یاد ہے اس وقت وہ بہت اچھا بناتی تھی اگرچہ اسے سب بنانا نہیں آتا تھا۔"

"بس بھائی شادی ہوتے ہی وہ سب بھول گئی۔"

سفیر نے ایک اور سرد آہ بھری۔ تو بیتو فکرمند نظر آنے لگا اس نے فوراً سعدیہ کا نمبر ملایا۔

"دیدی ہم بات کرتا ہے، آج کھانا کس نے بنایا ہے... ہاں ہم ٹھیک ہے ... ہم کھانے کا پوچھ رہا ہے... اچھا..." کچھ دیر بعد اس نے مرے ہوئے انداز میں کہا۔ "پلاؤ مونا دیدی نے بنایا ہے اور بروسٹ بھی ... صرف شامی کباب آپ نے بنایا ہے۔" اس نے فون بند کر کے ہماری طرف دیکھا۔ "ہم صرف شامی کباب کھا کر گزارا کرے گا۔"

"یہ میری بیوی کی توہین ہے۔" سفیر بولا۔ "تمہیں پلاؤ اور بروسٹ بھی کھانا ہوگا۔"

"اچھا ہم چکھ لے گا۔" بیتو نے درمیانی راستہ نکالا۔

"یار پہلے خود کہہ کر اس بے چارے کو ڈرا دیا اور اب اپنی بیوی کے ہاتھ کا بنا کھلانے پر اصرار کر رہے ہو۔"

"ہاں آپ خود کھائے گا بیوی آپ کا ہے۔" بیتو نے جلدی سے کہا۔ "ہم مجبور نہیں ہے آپ مجبور ہے۔"

سفیر نے سر ہلایا۔ "یہ تو تم نے پتے کی بات کی منے واقعی مجبور تو میں ہوں تم سب مرد آزاد ہو۔"

کچھ دیر بعد عبداللہ کے آدمی کار اور بائیک لے کر آ گئے۔ کار وِٹز تھی اور بائیک وہی تھی جو میں نے ایاز کے ساتھ جا کر لی تھی۔ وہ کھانوں سے بھرے کئی ٹفن بھی لے کر آئے تھے۔ ان میں سے ایک نے پیغام بھی دیا۔

"یہ ٹفن واپس چاہییں۔ دوبارہ کھانا بھیجنے کے کام آئیں گے۔"

بیتو اور سفیر نے کھانا لے جا کر دوسرے برتنوں میں منتقل کیا اور گھڑ بیویوں کی طرح صرف وہی نکالا جو ابھی کھانا تھا باقی فریج میں محفوظ کر دیا۔

وہ یو ایس بی لائے تھے اسے آئی فون سے لگا کر مووی اس میں کاپی کی۔ یو ایس بی اور خالی ٹفن لے کر وہ ٹیکسی میں رخصت ہو گئے جسے وہ راستے سے ساتھ لیتے آئے تھے۔ ان کے جاتے ہی ہم کھانے پر ٹوٹ پڑے کیونکہ بھوک سے سب کا برا حال تھا۔ خلاف توقع پلاؤ اور بروسٹ سب سے مزے کا ثابت ہوا کیونکہ وہ سعدیہ نے بنایا تھا اور شامی کباب مناسب تھے یہ شاہین نے تیار کیے تھے۔ مونا نے مٹن بنایا تھا اور یہ بھی شاندار تھا۔ کھانے کے دوران مجھے خیال آیا اور میں نے بیتو سے ایک ٹرے منگوا کر اس میں تھوڑی تھوڑی ہر چیز نکالی اور اسے شہلا کو بھجوا دیا۔ یقیناً اسے بھی بھوک لگی ہوگی۔ البتہ قیدیوں کے بارے میں فیصلہ ہوا کہ ان کے لیے فی الحال فاقہ ہی مناسب ہوگا کیونکہ ابھی ان سے اور بھی بہت کچھ اگلوانا تھا۔

بیتو خوش تھا اس نے جوابی کارروائی کے طور پر مٹن کو فضول قرار دیا کیونکہ وہ مونا نے بنایا تھا اس پر دونوں کی ہلکی پھلکی جھڑپ ہوئی تھی۔ ہلکی پھلکی اس لیے کہ کھا پی کر دونوں پر خمار طاری ہونے لگا تھا۔ بیتو کمبل لے کر وہیں صوفے پر دراز ہو گیا اور سفیر نے پہلے فلور کے بیڈ روم کا رُخ کیا۔ وہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مونا سے دوری کا پورا فائدہ اُٹھا رہا تھا۔ یعنی ڈٹ کر سو رہا تھا۔ میں نے کھانے میں ہاتھ ہلکا رکھا تھا۔ صابر صبح وسیم کے ساتھ چلا گیا تھا اس لیے اب یہاں بس ہم تین تھے۔ شہلا اور قیدیوں کی نگرانی کے لیے کسی نہ کسی کا جاگتے رہنا ضروری تھا۔ میں نے دو کپ کافی تیار کی اور شہلا کے کمرے کا رخ کیا۔ وہ بھی پیٹ بھرنے کے بعد کمبل میں دبکی ہوئی اونگھ رہی تھی۔ اس نے نہا دھو کر کپڑے بدل لیے تھے۔ صبح صابر نے گیزر میں تازہ لکڑیاں ڈالی تھیں اس لیے ابھی تک گرم پانی آرہا تھا۔ شہلا نے ایک عدد اونی لیگن کے ساتھ چھوٹی سی فراک نما شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ جس کا گلا تا حدِ نگاہ کشادہ تھا۔ اوپر سے اس نے سامنے سے بٹنوں سے بند ہونے والا ایک بگی اسٹائل کا سوئیٹر پہن رکھا تھا۔ اس کے صرف دو نچلے بٹن بند تھے اور وہ گریبان کی کشادگی میں دخل اندازی سے قطعی گریزاں تھا۔ میں نے حسبِ معمول پہلے لاحول پڑھی اور پھر اس سے کہا۔

''کیا خیال ہے اب کام کی بات کی جائے؟''

اس نے پرخمار نظروں سے مجھے دیکھا۔ ''کرو تمہیں کس نے روکا ہے؟''

میں نے کافی کا دوسرا مگ بستر کے ساتھ دراز پر رکھ دیا۔ ''شہلا مجھے تمہارا پلان چاہیے ہم بینک میں کس طرح بہت آسانی سے گھس سکتے ہیں اور اپنا کام کر سکتے ہیں؟''

وہ کمبل ایک طرف کر کے بیٹھ گئی اور جلدی سے کافی کا مگ اٹھا لیا۔ ''اُف کتنے دنوں بعد اچھی کافی نصیب ہوئی ہے۔''

میں ایک طرف رکھی صوفہ نما سٹنگ پر ٹک گیا۔ ''یہ میرے سوال کا جواب تو نہیں ہے۔''

''جواب بہت سادہ سا ہے۔'' اس نے ایک سپ لے کر کہا۔ ''تم میری مدد سے بینک میں داخل ہو گے۔ کیونکہ تم نے اندر کے حفاظتی انتظامات دیکھ لیے ہوں گے؟ کوئی باہر موجود گارڈز پر قابو پالے تب بھی وہ بینک کے سیف روم اور لاکرز والے حصے میں داخل نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ اندر شاہد منظور یا اس کی جگہ کوئی دوسرا سیکورٹی سپروائزر ہوتا ہے۔ وہ باہر گڑبڑ محسوس کرتے ہی پولیس کو کال کر دے گا اور الارم بجا دے گا۔ اس کے حصے میں اسی وقت داخل ہوا جا سکتا ہے جب وہ اندر سے لاک کھول دے۔''

''یہ لاک کون کھلوائے گا؟''

''میں۔'' اس نے ایک خاص پوز بناتے ہوئے اپنے سینے پر ایک ادا سے یوں انگلی رکھی کہ مجھے پھر لاحول پڑھنا پڑی۔ ''کیوں کیا میں یہ کام نہیں کر سکتی؟''

''تم کیا نہیں کر سکتی ہو۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن خدا کے لیے اس وقت اپنی توجہ صرف پلان پر مرکوز رکھو۔''

''اتنی جلدی کی کیا ضرورت ہے ابھی تو بہت وقت ہے۔''

میرے پاس وقت نہیں ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''میں تمہیں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ تاخیر سے یہ معاملہ خراب ہو سکتا ہے۔ فتح خان کے علم میں یہ لاکر ہے اور وہ خود وہاں براہ راست کارروائی کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اگر وہ خود نہ کرے تب بھی ہماری راہ میں روڑے تو اٹکا سکتا ہے۔''

فتح خان کا ذکر سن کر وہ فکرمند ہو گئی۔ ''وہ کیسے؟''

''بہت آسان ہے وہ بینک انتظامیہ کو لاکر کے بارے میں بتا دے گا اور ممکن ہے لاکر اور اس میں رکھی اشیا سرکاری تحویل میں لے لی جائیں۔''

''ہاں اس کا خطرہ ہے۔'' اس نے تسلیم کیا۔

''اسی لیے میں کہہ رہا ہوں ہمارا جلد از جلد لاکر تک پہنچ جانا ضروری ہے اور پلیز سیدھی ہو کر بیٹھو۔''

شہلا سنجیدہ ہو گئی کیونکہ اس نے اپنا خاص پوز ترک کر دیا اور سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ ''ٹھیک ہے میں راضی ہوں اب بتاؤ یہ کام کب کرنا ہے۔ اصل میں مجھے قابلِ اعتماد ساتھی میسر نہیں تھے ورنہ میں بہت پہلے یہ کام کر چکی ہوتی۔ اس کام کے لیے کم سے کم پانچ افراد کی ضرورت ہے۔''

''اب تمہیں ساتھی میسر ہیں۔ تم ایک بار ہمیں بینک کے اندر تک پہنچاؤ گی اس کے بعد کا کام ہمارا ہے۔''

''صرف ساتھی ہی نہیں بلکہ کچھ خاص اوزار بھی درکار ہوں گے۔ لاکر سخت ترین میٹل کے ہیں لیکن یہ میٹل بہت زیادہ موٹی نہیں ہے اسے ڈرل اور الیکٹرک آری کی مدد سے آسانی سے کاٹا جا سکتا ہے۔''

''یہ دونوں چیزیں بھی مل جائیں گی۔'' میں نے کہا۔ ''بس اتنا سا پلان ہے تمہارا؟''

''ہاں میں نے کہا تھا نا کہ تم حیران رہ جاؤ گے۔ بتاؤ اس سے سادہ پلان اور کوئی ہو سکتا ہے۔'' وہ فخر سے بولی۔

میں نے غور کیا اور پھر اعتراف کیا۔ ''شاید نہیں۔''

''میں نے بہت محنت کر کے یہ کام کیا ہے۔ ایک بار میں نے اندر پہنچ کر شاہد منظور کو قابو کر لیا تو اس کے بعد پھر کیا

رہ جاتا ہے۔''

''چار عدد گارڈز پھر بھی باقی رہ جائیں گے اگر ان میں سے کسی ایک نے بھی ہتھیار ڈالنے سے انکار کیا تو مسئلہ ہو جائے گا۔ کیونکہ فائر کی صورت میں ہمارے پاس اتنا وقت نہیں رہے گا کہ لاکر کاٹ سکیں۔''

''میں نے اس کی ترکیب بھی سوچ لی ہے۔ میں کافی بنا کر لے جاؤں گی۔ اس میں بے ہوشی کی دوا ہو گی۔ اگر میں گارڈز کو کافی پیش کروں گی تو سردی کی وجہ سے وہ انکار نہیں کریں گے۔''

''ممکن ہے ان میں سے کسی کو کافی پسند نہ ہو اور وہ انکار کر دے۔''

اس سوال پر شہلا بھنا گئی تھی۔ ''تو تم لوگ کس مرض کی دوا ہو جو ایک رہ جائے گا اسے تم قابو نہیں کر سکتے؟''

درحقیقت شہلا کا منصوبہ بہترین تھا۔ بینک کے دفاعی انتظامات کا اس سے بہتر توڑ ممکن ہی نہیں تھا۔ توڑ وہ پہلے ہی کر چکی تھی بس اب اسے عملی طور پر آزمانا تھا۔ میں نے جو سوالات کیے تھے وہ بائی دی وے تھے کیونکہ اس قسم کے منصوبوں میں سو فیصد درستی ممکن نہیں ہے خطرے کا عنصر کم ہو سکتا ہے لیکن ختم نہیں ہو سکتا۔ ناکامی کے امکانات ہر حال میں ہوتے ہیں۔ میں صرف اسے چھیڑ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے ہم یہ کام کر لیں گے۔ لیکن تم شاہد منظور کو اپنی بات ماننے پر کس طرح مجبور کرو گی۔''

''پستول کی مدد سے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''بلکہ شاید اس کی ضرورت بھی نہ پڑے کیونکہ میں وہی کافی اسے بھی دوں گی۔ پھر بھی پستول لازمی ہو گا۔''

میں سوچ میں پڑ گیا تھا۔ شہلا کو اسلحہ دینا خطرے سے خالی نہیں تھا وہ اس سے ناجائز فائدہ بھی اٹھا سکتی تھی۔ وہ سمجھ گئی کہ میں کیا سوچ رہا ہوں۔ اس نے کہا۔ ''تم کئی ہو گے اور میں ایک پستول سے سب کو تو ہینڈز اپ نہیں کر سکتی دوسرے میں وہاں کوئی حرکت کروں گی تو یہ تو پھنسنے والی بات ہو گی۔ مجھ پر اعتماد کرو۔''

میں نے سر ہلایا۔ ''شاید ایسا ہی کرنا پڑے، لیکن مجھے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرنا پڑے گا۔''

''میرے خیال میں اس کی ضرورت نہیں ہے، میں نے دیکھا ہے تم جو کہتے ہو تمہارے ساتھی بے چون چرا اس پر عمل کرتے ہیں۔''

''کیونکہ وہ مجھ پر اعتماد کرتے ہیں لیکن اس قسم کے معاملات میں مشورہ بہتر ہوتا ہے۔ ایک دماغ کے مقابلے میں کئی دماغ یقیناً زیادہ بہتر سوچ سکتے ہیں۔''

شہلا کچھ فکرمند لگ رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ''شہلا بعض اوقات مجھے تم سے ڈر لگتا ہے۔''

''مجھ سے؟'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''میرے خیال میں تو میں نہایت شریف آدمی ہوں اور خواتین کو مجھ سے ڈرنے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔''

''اسی لیے تو ڈر لگتا ہے۔'' وہ بولی۔

میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''زمانہ ہی بدل گیا ہے پہلے خواتین مردوں کی بدمعاشی سے ڈرتی تھیں اور اب شرافت سے ڈرنے لگی ہیں۔''

وہ جھنجلا گئی۔ ''میرا مطلب ہے کہ کہیں تم لاکر میں موجود پروفیسر کا دوسرا اسٹف بھی میرے حوالے کرنے سے انکار نہ کر دو۔''

''میں تم سے کہہ چکا ہوں مجھے صرف اپنے بریف کیس سے مطلب ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ لاکر سے سوائے بریف کیس کے اور کچھ نہیں لوں گا۔''

شہلا کے چہرے پر اطمینان نمودار ہوا۔ ''اب مجھے یقین ہے۔''

''ویسے بینک سے تم کہاں جاؤ گی؟''

''کہیں بھی جاؤں گی۔ تمہیں نہیں بتا سکتی۔ بینک سے ہمارے راستے الگ ہوں گے۔''

''تو طے ہے۔'' میں کھڑا ہو گیا اور اس کا خالی ہونے والا مگ بھی اُٹھا لیا۔ ''میرا خیال ہے ایک دو دن میں کارروائی کر لیں گے۔ تم شاہد منظور سے رابطہ کس طرح کرو گی؟''

''میرے پاس اس کا نمبر ہے۔ صرف یہ معلوم کرنا ہو گا کہ اس کی شفٹ کب کی ہے۔''

میں نے سوچا اور شہلا سے شاہد منظور کا حلیہ پوچھا۔ اس نے بڑی وضاحت سے اس کے بارے میں بتایا۔ اس کی سب سے اہم نشانی یہ تھی کہ وہ لنگڑا کر چلتا تھا کسی زمانے میں اسے عرق النسا کا مرض ہو گیا تھا جو علاج سے ٹھیک ہو گیا لیکن اس کی ٹانگ میں لنگ چھوڑ گیا۔ میں نے کہا۔ ''عورتوں کا شوقین لگتا ہے مرض بھی کون سا ہوا جس میں نسا آتا ہے۔ یہ اس کے کردار میں بھی لنگ چھوڑ گیا ہے۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شہلا ہنسی۔ ”ٹھیک کہا تم نے عورتوں کا شوقین ہے بلکہ ترسا ہوا ہے۔ خوب صورت عورت دیکھتے ہی اس کی عقل گھاس چرنے چلی جاتی ہے۔“

”جیسا کہ تمہارے کیس میں ہوا۔“

”یقین کرو اگر اس کی جگہ کوئی ذرا بھی مضبوط کردار کا آدمی ہوتا تو مجھے کبھی بینک کے اس حصے میں آنے کی اجازت نہ دیتا لیکن وہ ایسا ٹھرکی ہے کہ بس میری آواز سن لے بستر مرگ پر ہوگا تو وہاں بھی بلا لے گا۔“ وہ بولی تو میں نے اسے افسوس سے دیکھا۔ شہلا دیکھنے میں خوب صورت اور باوقار لگتی تھی لیکن اس کا کردار کسی کال گرل سے بہتر نہیں تھا۔ اصل میں ہماری ایلیٹ کلاس مادر پدر آزاد ہو چکی ہے۔ ویسٹرن لائف اسٹائل میں یہ ویسٹ والوں سے بھی آگے نکل گئے ہیں کیونکہ ویسٹ والوں کا کم سے کم ضمیر تو زندہ ہوتا ہے ان لوگوں کا تو ضمیر بھی مردہ ہو چکا ہے اور یہ کسی گلی سڑی لاش کی طرح اس ملک اور معاشرے پر مسلط ہو چکے ہیں۔ ہمارے ملک کے موجودہ بگاڑ کا ذمے دار یہی ایلیٹ کلاس ہے۔ یہ اس ملک میں رہتے ہیں۔ یہاں کاروبار اور ملازمتیں کرتے ہیں، تعلیم حاصل کرتے ہیں، تفریح کرتے ہیں اور بہترین گھروں میں پوری آسائشوں کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں لیکن یہ خود کو پاکستانی نہیں سمجھتے ہیں۔ ان کی اصل دولت اور جائداد بیرونِ ملک ہے اور ان کے پاسپورٹ اور بیگز ہمیشہ تیار رہتے ہیں کہ جیسے ان پر یا خدانا خواستہ ملک پر کوئی برا وقت آیا تو یہ فوری طور پر یہاں سے نکل جائیں گے۔ ضروری نہیں ہے ان میں تمام لوگ خراب ہی ہوں۔ ان میں بہت سارے اچھے لوگ بھی ہوں لیکن میں ان تمام لوگوں کو اس ایلیٹ کلاس کا سمجھتا ہوں جو خود کو پاکستانی نہیں سمجھتے۔ انہوں نے خراب وقت کے لیے اپنا ٹھکانہ پہلے ہی کہیں اور بنا لیا ہے۔ ان میں وہ معمولی الیکٹریشن بھی شامل ہے جو موقع ملنے پر اس عزم کے ساتھ ملک سے نکلتا ہے کہ دوبارہ یہاں واپس نہیں آئے گا اور وہ ارب پتی بھی شامل ہے جو منہ میں سونے کا چمچ لے کر پیدا ہوا ہو اور اس کا عمر کا بڑا حصہ ملک سے باہر گزرا ہو۔

بدقسمتی سے یہ ایلیٹ کلاس دن بہ دن بڑھتی جا رہی ہے یعنی ایسے افراد کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے جو پاکستان کو اپنا ملک سمجھتے ہی نہیں ہیں اور جب وہ اسے اپنا ملک نہیں سمجھیں گے تو اس کے مسائل سے ان کا کیا تعلق ہوگا۔ شہلا کا شمار بھی ایسے ہی پاکستانیوں میں ہوتا تھا جن کی پاکستانیت صرف ایک شناختی کارڈ اور ایک گرین پاسپورٹ تک محدود تھی۔ میں اس کے کمرے سے نکلا تو مجھے اپنا دل بوجھل محسوس ہو رہا تھا۔ بیتو اور سفیر سو رہے تھے میں کافی کے مگ کچن میں رکھ کر باہر صحن میں نکل آیا۔ سورج کی روشنی اپنے آخری دموں پر تھی۔ کچھ دیر بعد اندھیرا چھا جاتا اور سردی کی شدت میں اضافہ ہو جاتا۔ صحن میں سردی تھی کیونکہ سورج مغرب کی طرف جھکنے سے یہ حصہ سائے میں آ گیا تھا۔ سابق مالک نے یہاں کچھ پودے لگائے تھے جو دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے مرجھا گئے تھے۔ ایک نارنگی اور ایک عدد لوکاٹ کا درخت لگا ہوا تھا۔ دونوں پانی کی کمی سے سوکھے کا شکار ہو رہے تھے۔ کیونکہ ڈھلان ہونے کی وجہ سے بارشوں کا پانی بھی تیزی سے بہہ جاتا تھا اور ان کو بہت کم پانی ملتا تھا۔ میں نے صحن میں لگے نلکے اور پائپ کی مدد سے انہیں پانی دیا۔

ممکن ہے مجھے پھر موقع نہیں ملتا اور ممکن ہے میں دوبارہ یہاں نہیں آتا لیکن آج مجھے موقع مل رہا تھا تو میں ان کو کیوں پانی نہ دیتا۔ آپ یقین کریں جب میں نے ان درختوں کو پانی دیا تو میرے اندر موجود بوجھ ہلکا ہونے لگا اور کچھ دیر میں، میں اس بوجھ سے آزاد ہو گیا تھا۔ پانی پڑنے سے مٹی اور درختوں سے انوکھی خوشبو آئی تھی جیسے وہ خوشبو کے ذریعے میرا شکریہ ادا کر رہے ہوں۔ اچانک موبائل کی بیل بجی تو میں چونک گیا۔ وسیم کال کر رہا تھا۔ میں نے کال ریسیو کی۔ ”ہیلو۔“

”شہباز صاحب۔“ وسیم نے خوشگوار لہجے میں کہا۔ ”خوشخبری ہے شبانہ ہاتھ آ گئی ہے۔ وہ دوپہر میں باہر نکلی تھی ایک جگہ ہمارے آدمیوں نے اسے روک لیا اور اپنی گاڑی میں بٹھا کر لے آئے ہیں۔ فی الحال اسے آنکھ، منہ اور ہاتھ بند کر کے رکھا ہے۔ رات کو آپ کی طرف منتقل کریں گے۔“

”یہ اچھا ہوا کوشش کرنا وہ کسی کو دیکھنے نہ پائے اور ہم رات میں ہی اس سے پوچھ گچھ کر کے اسے صبح سے پہلے واپس چھوڑ دیں گے۔“

وسیم فکرمند ہو گیا۔ ”کیا اسے واپس چھوڑنا مناسب ہوگا؟“

”میرے خیال میں یہی بہتر ہے کیونکہ اس کے مستقل غائب ہونے کی صورت میں فاضلی چونک جائے گا اور وہ بہت شاطر آدمی ہے۔ ہم اسے سمجھا سکتے ہیں کہ منہ بند

کیے میں اس کی عافیت ہے۔ امکان یہی ہے کہ وہ زبان بند رکھے گی۔“

”ٹھیک ہے۔“ وسیم نے آمادگی ظاہر کی۔ ”میں نے مرشد کے آدمی کے اعترافی بیان کی ویڈیو دیکھی ہے۔ اسے دیکھ کر یقیناً مرشد کی ہوا خراب ہو جائے گی۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے۔ ویسے وہ کتے کی دُم ہے مشکل سے ہی سیدھا ہوگا لیکن اسے جھٹکا ضرور لگے گا۔ اسے یہ ویڈیو کسی طریقے سے پہنچا دی جائے بلکہ آج ہی پہنچا دی جائے۔“

”میں کسی کے ذمے یہ کام لگاتا ہوں۔“ اس نے کہا۔

”لیکن کوئی کچا طریقہ اختیار مت کرنا جس سے ہمارے کسی آدمی پر آنچ آئے۔“ میں نے اسے خبردار کیا۔

”آپ فکر نہ کریں میں کسی اور سے کام لوں گا۔“ وسیم نے کہا۔ ”میں اور ایاز ایک وین پسند کر آئے ہیں۔ یہ فورڈ کا کوئی دس سال پہلے کا ماڈل ہے ہمارے ہاں یہ زیادہ نظر نہیں آتا ہے۔ لیکن بہت اچھی اور مضبوط قسم کی گاڑی ہے اس کا انجن بہت طاقت ور ہے اور مالک نے بہت سنبھال کر رکھی تھی۔ اصل میں وہ سیاحت کا شوقین ہے اور اس نے گھومنے پھرنے کے لیے وین لی تھی۔ اسی میں رہائش بھی رکھتا تھا۔ مگر آج کل حالات گھومنے پھرنے والے نہیں ہیں اس لیے وہ باہر شفٹ ہو رہا ہے اور گاڑی سیل کر رہا ہے۔“

میں نے سرد آہ بھری۔ ”ہاں یار جو بھی یہاں سے جانے کی استعداد رکھتا ہے وہ جا رہا ہے اور بس وہی رہ رہا ہے جو استعداد نہیں رکھتا۔“

وسیم نے کہا۔ ”صرف چھ لاکھ میں مل گئی ہے۔ انجن اے ون ہے بس اپنی مرضی کے لحاظ سے کچھ تبدیلیاں کرانی ہیں اور اس پر کوئی دو لاکھ کا خرچ آئے گا۔ میں نے مشینیں بھی چن لی ہیں جو وین میں نصب کرنی ہیں اس کی مکمل تیاری میں کوئی ایک ہفتہ لگے گا۔“

”ٹھیک ہے تب تک ہم شہلا والا معاملہ نمٹا لیتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”اس نے پلان بتایا ہے اور مجھے اچھا بھی لگا ہے لیکن تم آ جاؤ تو اس پر ڈسکس کرتے ہیں۔“

”میں رات میں شبانہ کو لے کر آؤں گا۔“ وسیم نے کہا۔ ”شاید نو یا دس بجے تک آؤں گا۔“

وسیم سعدیہ کے ساتھ تھا اور یقیناً اس بہانے اس کے ساتھ رہنا چاہتا تھا اس لیے میں نے جلد آنے پر اصرار نہیں کیا۔ سعدیہ کا اس پر زیادہ حق تھا۔ وسیم سے بات کر کے میں اندر آیا تو سفیر جاگ گیا تھا اس نے مجھے دیکھتے ہی معنی خیز انداز میں کہا۔ ”خاتون سے کیا راز و نیاز ہو رہے تھے بڑی دیر تک اندر رہے؟“

”لگتا ہے تم سونے کے بجائے نگرانی کرتے رہے تھے۔“ میں صوفے پر دراز ہو گیا۔ ”خاتون نے اپنا پلان اگل دیا ہے۔ مجھے اچھا لگا ہے رات کو وسیم اس کال گرل کو لا رہا ہے جسے فاضلی ساتھ لے گیا تھا۔“

”اچھا۔“ سفیر نے دلچسپی سے کہا۔ ”ویسے یار اس قسم کی خواتین کچھ زیادہ ہی ہمارے پلے پڑنے لگی ہیں۔“

”بس یار قسمت کی بات ہے۔“

سفیر نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”مزے کی بات ہے ہمیں کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔“

میں نے اسے گھورا۔ ”بیٹے تم مونا کی غیر موجودگی میں کچھ زیادہ ہی آپے سے باہر نہیں ہو جاتے ہو۔“

”تو بھی یار بن کر رہ سالا نہ بن۔“ سفیر نے ڈھٹائی سے کہا۔ ”یہ بتا کوئی چائے کافی ملے گی؟“

”کیوں نہیں، کچن میں دونوں کو ایجاد کرنے کا سامان موجود ہے ہمت کر اور میرے لیے بھی بنا لا۔“

سفیر نے سرد آہ بھری۔ ”بیوی نے نکما کر دیا غالب ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے۔“

میں ہنسا۔ ”ہاں اب نہ آدمی رہے ہو اور نہ کام کے۔“

سفیر نے کھا جانے والی نظروں سے مجھے دیکھا۔ ”بکواس نہ کر کچھ عرصے بعد تو بھی شوہر ہوگا۔“

”یہ تو ہے پر شوہر شوہر میں بھی فرق ہوتا ہے بھائی۔“

سفیر چائے بنانے کے لیے چلا گیا۔ کچھ دیر بعد بیتو جماہیاں لیتا ہوا اُٹھ گیا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ”شوبی یہ آج کل ہم کو اتنا نیند کیوں آنے لگا ہے۔“

”برخوردار اس عمر میں سب کام زیادہ ہوتے ہیں۔ بھوک زیادہ لگتی ہے، نیند زیادہ آتی ہے اور لڑکیاں زیادہ اچھی لگتی ہیں۔“

”اس کے بعد آدمی کی شادی ہو جاتی ہے۔“ سفیر چائے لے کر لاؤنج میں آیا۔ ”بھوک مر جاتی ہے، نیند اُڑ جاتی ہے اور آدمی صرف اپنی بیوی کو دیکھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔“

”تمہارے کیس میں تو ایسا نہیں ہوا ہے۔“ میں نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اپنا کپ اُٹھا لیا۔ ”تمہیں بھوک بھی خوب لگتی ہے اور نیند بھی خوب آتی ہے اور جہاں تک لڑکیوں کے اچھا لگنے لا تعلق ہے تو تمہارے شوق میں آج بھی کمی نہیں آئی۔“

چائے اسی قسم کی خوش گپیوں میں ختم ہوئی۔ بیتو برتن اٹھا کر لے گیا اور میں نے سفیر سے کہا۔ ”تو نے اپنی سابقہ گرل فرینڈ سے رابطہ کیا؟“

”کیا خوب یاد دلایا۔“ اس نے موبائل اٹھایا۔ ”اس کا نمبر مل گیا ہے لیکن بات کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔“ اس نے کال ملائی۔ ”یاسمین میں سفیر بات کر رہا ہوں۔“ سفیر نے کہہ کر موبائل کی طرف دیکھا اور خفت سے بولا۔ ”الو کی پٹھی نے لائن کاٹ دی۔“

”لگا رہ یار کب تک لائن کاٹے گی آخر کبھی تو لائن دینے پر مجبور ہوگی۔“ میں نے اسے حوصلہ دیا اور اس نے دوبارہ نمبر ملایا۔

”یاسمین پلیز لائن مت کاٹنا میری بات تو سنو... ٹھیک ہے... مجھے تسلیم ہے... اچھا کب مبارک ہو... میں نے بھی کرلی ہے ... ہاں اسی مونا سے ...“ سفیر کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ یاسمین کی شادی ہوگئی تھی اور شاید اسی لیے وہ سفیر سے بات نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔ مگر سفیر کم نہیں ہے اس نے کسی طرح اسے باتوں میں پھنسا لیا۔ کوئی دس منٹ کی گپ شپ کے بعد وہ مطلب کی بات پر آ گیا۔ ”یاسمین تمہارا تعلق اخباری دنیا سے ہے مجھے ایک صحافی خاتون کے مرڈر کے بارے میں معلوم کرنا ہے... ہاں میں راحیلہ کی بات کر رہا ہوں... اچھا تم نے اس پر آرٹیکل لکھا ہے۔“

میں نے اشارے سے سفیر سے کہا کہ وہ اس سے ملاقات کا کہے۔ سفیر نے سر ہلایا اور کچھ دیر بعد ملاقات کی بات کی۔ ”ہاں مجھے اس سلسلے میں ضروری معلومات درکار ہیں اگر تم کہیں باہر مل سکو تو...“

کچھ دیر بعد سفیر نے موبائل بند کر دیا اور میری طرف دیکھا۔ ”یار وہ تو خود اس معاملے میں تحقیق کرتی رہی ہے اور اس نے راحیلہ کے مرڈر پر کئی کالم لکھے ہیں۔“

”کوئی کام کی بات بتائی ہے؟“

”بہت ہی کام کی بات ہے۔ راحیلہ اپنے آخری دنوں میں مرشد کی وزارت کی کرپشن پر کئی پروگرام کر چکی تھی اور اسے اس سلسلے میں باقاعدہ دھمکیاں مل رہی تھیں۔“

”کیا پولیس کو ان دھمکیوں کے بارے میں نہیں بتایا گیا تھا؟“

”پولیس۔“ سفیر طنزیہ انداز میں ہنسا۔ ”وہ مرشد کی غلام بنی ہوئی ہے پہلے بھی تھی لیکن جب سے وہ حکومت میں آیا ہے بندہ بے دام بنی ہوئی ہے۔“

”اس کا مطلب ہے کیس کی تفتیش جان کر غلط رُخ پر کی جا رہی ہے۔ راحیلہ کے شوہر اختر ملک پر فرد جرم عائد کی گئی ہے؟“

سفیر نے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں ابھی تک پولیس نے اس کے خلاف چالان پیش نہیں کیا ہے۔“

”میرا خیال ہے وہ صرف مرشد کو بچانے کی کوشش کر رہی ہے۔ اختر ملک کے خلاف کمزور کیس پیش کیا جائے گا اور اگر اختر کھل کر مرشد پر الزام نہیں لگا رہا ہے تو اس کا مطلب ہے وہ بک گیا ہے یا ڈر گیا ہے۔“

”اس کا اندازہ چالان سے ہو جائے گا، اگر پولیس نے مضبوط کیس بنایا تو اس کا مطلب ہوگا کہ اختر بکا نہیں ہے اور پولیس اسے لٹکانے یا لمبی مدت کے لیے جیل بھیجنے کی پوری کوشش کر رہی ہے۔“

”تیری ملاقات والی بات پر اس نے کیا کہا؟“

”راضی تو ہوگئی ہے لیکن کوئی وقت نہیں دیا۔ ان دنوں وہ اپنے شوہر کے ساتھ اپنی ماں کے گھر گئی ہوئی ہے۔ ایک ہفتے بعد واپسی ہوگی۔“

”اس میں تو ابھی وقت ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہمیں گزشتہ کچھ عرصے کے اخبارات مل سکیں۔“

”کہیں اور سے تو مشکل ہے لیکن کسی لائبریری میں مل جائیں گے۔“ سفیر نے کہا۔ ”یار اولپنڈی میں کسی ایجنسی کے پاس سے مل سکتے ہیں۔“

میں نے ایاز کو کال کی وہ ابھی تک نہیں آیا تھا۔ ”یار ایسا ہو سکتا ہے کہ کسی ایجنسی سے گزشتہ دو مہینے کے پرانے اخبار مل جائیں۔ کسی اچھے اخبار کا پنڈی ایڈیشن ہو؟“

”کوشش کرتا ہوں راجا بازار میں ایک ایجنسی والا ہے سنا ہے اس کے پاس مل جاتے ہیں۔ میں آتے ہوئے لیتا آؤں گا۔“ اس نے کہا۔

”ابھی تم کہاں ہو؟“

”پنڈی میں ایک کزن ہے اس سے ملنے آیا ہوں۔“ ایاز سے بات کر کے میں نے فون بند کیا تو سفیر نے کہا۔ ”یار یہ ایاز کچھ عرصے سے ہمارے ساتھ ہے اور اس

کے خلوص میں بھی کوئی شبہ نہیں ہے لیکن ہم اس کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے۔“

”ہاں اس نے کبھی اپنے حالات اور پس منظر کے بارے میں بات نہیں کی۔“

”کسی نے پوچھا بھی نہیں؟“

میں نے سر کھجایا۔ ”نہیں کبھی خیال ہی نہیں آیا۔“

”وہ بے چارہ بھی کیا سوچتا ہوگا کہ ہمیں صرف اس کے کام سے غرض ہے اور اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“

”ہمیں اس کا خیال رکھنا چاہیے۔“

بیتو کچن سے آ گیا۔ ”کس کا خیال رکھنا چاہیے۔“

”ایاز کا ہم اس کے ماضی کے بارے میں کچھ جانتے ہی نہیں ہیں۔“ میں نے کہا تو بیتو بولا۔

”ہم جانتا ہے۔ ایاز بھائی بہت اچھا آدمی ہے۔ وہ اپنی ایک کزن کو پسند کرتا تھا پر اس کا باپ دولت مند تھا اور ایاز بھائی دولت مند نہیں تھا اس لیے اس نے ایاز بھائی کو رشتہ نہیں دیا اپنا بیٹی کا شادی کہیں اور کر دیا۔“

”تم اس کے بارے میں جانتے ہو۔ اس کے گھر والوں کے بارے میں؟“

”ایاز بھائی کا ماں اس کے بچپن میں مر گیا تھا۔ باپ کا کچھ عرصے پہلے انتقال ہوا ہے۔ ایک بہن ہے اس کا شادی ہو گیا ہے اور وہ اپنے شوہر کے ساتھ سعودی عرب میں ہوتا ہے۔“ بیتو نے ایاز کے پس منظر کا خلاصہ پیش کیا۔

”یہ بے چارہ دل پر چوٹ کھائے ہوئے ہے۔“ سفیر نے کہا۔

”لیکن بہادر آدمی ہے اس نے اسے دل کا روگ نہیں بنایا۔“

”یہ تو ہے۔“ سفیر نے تائید کی۔ ”ورنہ ہمارا ساتھ کیوں دیتا اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ ہمارے دشمن کتنے خطرناک اور سفاک ہیں۔“

بیتو نے کہا۔ ”شوبی ویڈیو کا کیا ہوا جو بنایا تھا؟“

”اسے مرشد کو بھیجنے کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ وسیم اسے کسی طریقے سے مرشد ہاؤس تک پہنچائے گا۔“

”ہمیں یہ کیسے معلوم ہوگا کہ اس پر کیا اثر ہوا ہے؟“ سفیر نے نقطہ اُٹھایا۔

”میرے پاس مرشد ہاؤس کے نمبر ہیں کہیں باہر سے اسے کال کریں گے۔“

سفیر نے نفی میں سر ہلایا۔ ”فتح خان کو کال کرنے کا نتیجہ دیکھ لیا ہے مرشد کو کہیں سے کال کرنا بہت خطرناک ہو سکتا ہے۔“

”پی سی او سے کال کریں گے۔“

”اس کا سراغ تو اور آسانی سے لگ جاتا ہے۔“

”تب خود ملاقات کے لیے چلے جاتے ہیں۔“ میں نے جھنا کر کہا۔

بیتو نے مداخلت کی۔ ”شوبی آپ کے پاس اتنا سارا سم ہے جیسے آپ فتح خان سے ایک سم سے بات کرتے ہو اور اسے کہیں استعمال نہیں کرتے ہو اسی طرح مرشد کے لیے بھی ایک سم رکھو لو اس سے بس اسی سے بات کیا کرو۔“

میں نے سفیر کی طرف دیکھا۔ ”بات تو اس نے ٹھیک کی ہے۔“

”ٹھیک ہے لیکن کال یہاں سے نہیں کرنی ہے بلکہ کسی اور جگہ جا کر کال کرنی چاہیے ورنہ ایک ہی علاقے سے کال کی جائے تو مرشد اور اس کے گرگے سمجھ جائیں گے کہ ہم یہیں کہیں موجود ہیں اور ایک ہی علاقے میں تلاش کرنا زیادہ مشکل کام نہیں ہے۔“

میں نے سر ہلایا۔ ”میرے ذہن میں ایک خیال آیا ہے ہمیں ہر ہفتے اپنی سمز تبدیل کر لینی چاہییں تاکہ دشمن اگر بے خبری میں بھی سراغ لگا رہا ہو تو وہ ہم تک نہ آ سکے۔“

بیتو ہنسا۔ ”تو آپ اور کیا کر رہا ہے جب سے پاکستان آیا ہے کوئی درجن سمز بدل چکا ہے۔ یہ تو ہفتے سے بھی پہلے بدلا ہے آپ نے۔“

”وہ تو مجبوری میں تبدیل کیں لیکن اب اسے معمول بنا لینا چاہیے۔“

باہر تاریکی چھا رہی تھی۔ سردی کے دنوں میں بھوک زیادہ لگتی ہے اور دوپہر میں کھایا پیا ہضم ہو چکا تھا اس لیے بیتو کھانا گرم کرنے چلا گیا۔ سفیر نے شہلا کے پلان کے بارے میں پوچھا میں نے اسے مختصراً بتایا۔ سفیر کو بھی اچھا لگا تھا۔ اس نے کہا۔

”بس اس میں ایک قباحت ہے کہیں اندر جا کر اس کا ارادہ نہ بدل جائے؟“

میں چونکا۔ ”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ وہ ڈبل کراس کر جائے۔ شاہد منظور کو قابو کرنے کے بجائے اسے ہمارے بارے میں مس گائیڈ کر دے کہ ہم ڈاکو وغیرہ ہیں اور اسے یرغمال بنا کر بینک لوٹنے آئے ہیں۔“

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سفیر کی بات نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

واقعی شہلا ایسا کر سکتی تھی اور اپنے بچاؤ کے لیے وہ ایسا کرنے میں حق بہ جانب ہوتی۔ اس نے ہم سے وفاداری کا حلف نہیں اٹھایا تھا۔ اگر وہ اندر پہنچ کر اُلٹا شاہد منظور کو ہمارے خلاف استعمال کر لیتی تو ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ گارڈز سے مقابلہ کرنا ہمارا مقصد نہیں تھا۔ شہلا سیف روم میں پہنچ کر سیف ہو جاتی اور ہم وہاں اس کا کچھ نہیں بگاڑ پاتے۔ میں صوفے پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ''یار تو نے تو عقل کی بتی کھول دی ہے۔''

سفیر مسکرایا۔ ''بس یار شادی کے بعد مرد کی عقل ایسی ہی ہو جاتی ہے۔ کبھی گدھے کی طرح کام کرتی ہے اور کبھی لومڑ بن جاتی ہے یہ خیال مجھے ایسے ہی آیا ہے۔''

''لیکن خوب آیا ہے، مجھے سو فیصد یقین ہے شہلا کے ذہن میں یہی پلان ہوگا۔ ہم سے چھٹکارا پانے کا بھلا اس سے بہتر طریقہ اور کیا ہو سکتا ہے۔''

''تب اس کا کوئی حل سوچ کہ وہ اپنی مرضی نہ کر سکے۔''

''ابھی وسیم آتا ہے تو سب مل کر سوچتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ بیتو کھانا گرم کر کے لے آیا تھا سب نے کھانا کھایا۔ پھر میرے کہنے پر بیتو نے دونوں قیدیوں کو فی کس ایک ایک گلاس پانی اور آدھی خشک روٹی دی تھی۔ اس نے واپس آ کر اطلاع دی۔ ''شوبی جمیل کے ہاتھ کا زخم خراب ہو رہا ہے اس میں پس پڑ گیا ہے اور بو بھی آ رہا ہے۔''

میں نے سفیر کی طرف دیکھا۔ ''یار اس کا علاج کرنا پڑے گا۔ ورنہ اس کا ہاتھ نہ ضائع ہو جائے۔''

''ویسے تو ضائع ہو جائے تو اچھا ہے اس نے کون سے اس ہاتھ سے اچھے کام لینے ہیں لیکن اس صورت میں یہاں گند ہو گی۔'' سفیر نے سر ہلایا۔ ''میں اسے دیکھتا ہوں۔''

سفیر طبی امداد کا کورس کر چکا تھا اور اسے مرہم پٹی، انجکشن لگانا اور دوسرے چھوٹے موٹے کام آتے تھے۔ بلکہ اس کا دعویٰ تھا کہ وہ گولی بھی نکال سکتا ہے بشرط کہ وہ کسی اعضا یا ہڈی میں نہ لگی ہو۔ بیتو اس کے ساتھ چلا گیا۔ میں نے سفیر سے کہا کہ ان سے کچھ اگلوانے کی کوشش بھی کرے۔ مجھے یقین تھا وہ بہت کچھ جانتے تھے۔ فی الحال انہوں نے جو بتایا تھا اس پر کام کر رہے تھے۔ وسیم جس کال گرل کو لا رہا تھا اسے سب سے نچلے فلور کے واحد بیڈ روم میں رکھنے کا فیصلہ کیا کیونکہ اوپر صرف دو کمرے ایسے تھے جن میں کسی کو قید کیا جا سکتا تھا اور یہ دونوں کمرے استعمال میں تھے۔ وسیم نو بجے آ گیا تھا۔ اس کے ساتھ صابی بھی تھا۔ میں نے دروازہ کھولا تو وسیم کی گاڑی اندر آئی۔ وہ اپنی لینڈ کروزر لے آیا تھا۔ اب صحن میں گاڑیاں کھڑی کرنے کی جگہ نہیں رہی تھی۔ ایاز کی جیپ مشکل سے آتی۔ بہر حال گاڑیوں سے یہ فائدہ تھا کہ ہمیں کسی وقت کہیں جانے میں مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ ورنہ ایک ہی گاڑیوں کے ہوتے ہوئے یہ مشکل رہتی تھی کہ تین افراد کہیں الگ الگ نہیں جا سکتے تھے۔

''فاضلی کی منظور نظر کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اندر ہے۔'' وسیم نے اشارہ کیا اور آہستہ سے پوچھا۔ ''ایاز ابھی تک نہیں آیا؟''

''نہیں وہ پنڈی میں اپنے کسی کزن کے گھر گیا ہے اور اسے اخبار بھی لانے ہیں۔''

''اخبار کس لیے؟''

''گزشتہ دو مہینے کے حالات حاضرہ سے باخبر ہونے کے لیے۔'' میں نے جواب دیا۔ اس دوران میں وسیم نے لینڈ کروزر کا عقبی دروازہ کھولا اور شبانہ نامی اس خاتون کو اس طرح برآمد کیا کہ اس کے سر پر کسی تکیے کا غلاف چڑھا ہوا تھا اور اس کے ہاتھ عقب میں پلاسٹک کی ہتھکڑی سے بندھے ہوئے تھے۔ وسیم نے اسے نیچے اُترنے کو کہا اور ہم اسے نیچے لے آئے۔ سیڑھیوں سے وسیم اسے پکڑ کر اتارتا رہا تھا۔ وہ سہمی ہوئی تھی اور بے چون چرا اس کے حکم پر عمل کر رہی تھی۔ اسے بیڈ روم میں لا کر وسیم نے اس کے ہاتھ کھول دیئے لیکن اسے کہا کہ جب تک ہم کمرے سے باہر نہ جائیں وہ چہرے سے غلاف نہیں اتارے گی۔ ہم باہر آ گئے۔ وسیم نے کہا۔

''اس نے ابھی تک ہم میں سے کسی کا چہرہ نہیں دیکھا ہے۔''

''یہ اچھی بات ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اس سے کچھ پوچھا ہے؟''

''ابھی تک نہیں اصل میں، میں وین والے کام میں لگا رہا اور اسے لا کر عبداللہ والی کوٹھی کے تہ خانے میں بند کر دیا تھا۔ یہ اب تک وہیں بند رہی تھی۔ وسیم کھانا کھا کر آیا تھا اور کچھ چیزیں ہمارے لیے بھی لایا تھا۔ ان میں گاجر کا حلوہ اور سعدیہ کا بنایا ہوا پیزا تھا۔ ہم کھا چکے تھے لیکن گاجر کا حلوہ

اور پیزا اپنی جگہ خود بنا لیتے ہیں۔ موسم کی مناسبت سے دونوں چیزوں نے مزہ دیا۔ اس دوران میں، میں وسیم کو اس کی غیر موجودگی کی مکمل رپورٹ دی اور اس نے ہمیں بتایا کہ وہ آج سارا دن کیا کرتا رہا۔

''عبداللہ کے آدمی محنتی اور مضبوط ہیں لیکن ان کے پاس تربیت نہیں ہے۔ میں نے ان کی تربیت کے لیے ایک پروگرام مرتب کیا ہے اور منیر کو ان کا سپروائزر بنا دیا ہے وہ پڑھا لکھا ہے اور میرے دیئے ہوئے پروگرام کو آسانی سے سمجھ گیا تھا۔ ان میں سے اکثر کی تعلیمی قابلیت بھی کم ہے اسے بھی بڑھانے کی ضرورت ہے میں نے عبداللہ سے کہا کہ وہ کچھ ٹیوٹرز کا بندوبست کرے۔ جو ان کو تعلیم دیں۔ کچھ نیا اسلحہ اور نئے آلات منگوائے ہیں۔ ان کو اس کی تربیت بھی دی جائے گی۔''

''یہ کچھ زیادہ لمبا پروگرام نہیں ہے؟''

''تعلیمی پروگرام تو لمبا ہو سکتا ہے باقی آلات اور اسلحے کا استعمال تو ایک دو ہفتے میں سیکھا جا سکتا ہے۔ ان میں دست بدست لڑنے کی استعداد بھی کم ہے۔ اس کے لیے بھی ایک استاد کا بندوبست کیا جا رہا ہے۔''

''کتنے افراد ہیں؟''

''ایک درجن ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''یہ سب عبداللہ والی کوٹھی میں ہوتے ہیں۔''

''مشکوک کوٹھی کی نگرانی پر کتنے لوگ ہیں؟''

''مستقل دو افراد وہاں ہوتے ہیں وہ الگ الگ دور سے نگرانی کر رہے ہیں اور ریڈیو کی مدد سے آپس میں رابطہ رکھا ہوا ہے۔ لیکن ابھی تک کوئی پروگریس سامنے نہیں آئی ہے۔''

''ویڈیو کا کیا بنا اسے مرشد تک کیسے پہنچایا جائے گا؟''

''صبح جو ہاکر اخبار دینے مرشد ہاؤس جاتا ہے اسے راستے میں یہ سی ڈی دیدی جائے گی اور وہ اخبار کے ساتھ اسے بھی مرشد ہاؤس کے گیٹ کیپرز کے سپرد کر دے گا۔''

''مناسب طریقہ ہے۔'' میں نے تسلیم کیا۔

سفیر اور بیتو بھی اس میٹنگ میں شامل تھے۔ اس دوران میں اخبارات سے لدا پھندا ایاز بھی آ گیا۔ اس نے بیتو اور وسیم کی مدد سے یہ بے شمار اخبارات نیچے پہنچائے۔ علیک سلیک کے بعد اس نے کہا۔ ''جناب اس میں کچھ اخبارات کم ہیں لیکن میرا خیال ہے جس مقصد کے لیے آپ نے منگوائے ہیں وہ پورا ہو جائے گا۔''

اخبارات لاؤنج میں رکھ دیئے گئے اور ایاز بھی میٹنگ میں شامل ہو گیا جس کا ایجنڈا بینک لاکر تک رسائی کا شہلا کا پلان تھا۔ میں نے تمام تفصیلات ان لوگوں کے سامنے رکھیں اور پھر سفیر کے خدشے کا ذکر کیا کہ شہلا ڈبل کراس کر سکتی ہے۔ ایاز نے تائید کی۔ ''وہ کر نہیں سکتی ہے جناب، ڈبل کراس کرے گی۔''

''اسے استعمال کرنے سے پہلے اس کا کوئی سدِباب کرنا ہوگا۔'' وسیم نے کہا۔

ہم اس پر بحث کرنے لگے کہ کیا سدباب کیا جا سکتا ہے۔ لیکن کوئی ایسا حل سمجھ میں نہیں آ رہا تھا جس سے شہلا کو یقینی طور پر کوئی غلط قدم اُٹھانے سے روکا جا سکے۔ جیسے سفیر کے ذہن میں یہ خیال آیا تھا کہ شہلا ڈبل کراس کر سکتی ہے اسی طرح اس کے ذہن میں ممکنہ سدِباب بھی آیا۔

''یار ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم اس کے جسم سے کوئی ڈیوائس باندھ دیں جو اسے کسی غلط حرکت سے روکے۔''

وسیم نے اسے گھورا۔ ''کیا ریموٹ کنٹرول کی مدد سے اسے کنٹرول کرنا ہے؟''

''ایک منٹ۔'' میں نے ان کی بحث شروع ہونے سے پہلے کہا۔ ''میرا خیال ہے سفیر ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ہم کوئی آلہ نہیں بلکہ اس کے جسم سے ایک ایسا بم منسلک کریں گے جو ریموٹ کنٹرول سے بلاسٹ کیا جا سکتا ہو اور اگر اسے اتارنے کی کوشش کی جائے تب بھی وہ بلاسٹ ہو جائے۔''

بیتو نے غور کیا۔ ''جیسا کہ فلموں میں دکھایا جاتا ہے۔''

''بالکل وہی...'' میں نے کہا۔

''ایسا بم آئے گا کہاں سے؟'' سفیر نے پوچھا۔ ''فلموں کی بات اور ہے۔''

میں نے وسیم کی طرف دیکھا۔ ''تمہاری معلومات اس بارے میں زیادہ ہیں۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''ایسا بم بنانا بالکل ممکن ہے لیکن بم کی کیا ضرورت ہے ہم بم جیسی کوئی چیز شہلا کے جسم سے باندھ دیں گے تو وہ اسے بم تسلیم کرے گی۔''

بیتو پر جوش ہو گیا۔ ''اس کا باپ بھی کرے گا۔''

''نہیں منے باپ تک جانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' وسیم نے اسے پچکار کر کہا۔ ''شہلا تسلیم کر لے ہمارے لیے یہی کافی ہے۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''چلو ایک نقلی بم سہی لیکن آئے گا کہاں سے؟''

''میں تیار کر لوں گا۔'' وسیم نے کہا۔ ''تھوڑا بہت سامان درکار ہوگا وہ بازار سے لے آئیں گے۔ ایک سرکٹ چاہیے ہوگا وہ میں کسی الیکٹرانکس والے سے بنوا لوں گا۔ ریموٹ ٹی وی کا چلے گا۔''

''ٹھیک ہے تب یہ کام جلد از جلد کر لو۔'' میں نے کہا۔ ''اب ذرا اس خاتون سے بات ہو جائے۔''

''اس کے سامنے نقاب میں جانا ہوگا۔'' وسیم نے کہا اور اپنی جیکٹ سے تین عدد سیاہ ٹوپیاں نکالیں جو موڑ کر پہنی جاتی ہیں اور انہیں پورا کھول لیا جائے تو یہ پورا منہ چھپا لیتی ہیں۔ ''ان میں آنکھوں کی جگہ سوراخ کرنا ہے۔''

بیتو قینچی لے آیا اور ہم نے ٹوپیوں میں آنکھوں والی جگہ کاٹ کر سوراخ بنا دیئے۔ پھر پہن کر دیکھا تو اس میں ہمارے خدوخال مکمل طور پر چھپ گئے تھے۔ میں، سفیر اور وسیم شبانہ والے کمرے میں آئے۔ میں نے پہلے اسے نہیں دیکھا تھا کیونکہ اس کے منہ پر غلاف تھا۔ میرا خیال تھا وہ مخصوص پھنکار برسی کوئی صورت ہوگی۔ جیسا کہ اس پیشے والیوں کے چہروں پر پائی جاتی ہے لیکن وہ ایک عام سی گھریلو عورت نظر آئی۔ بے شک وہ خوب صورت تھی لیکن اس کے چہرے پر نہ تو واہیات تاثرات تھے اور نہ وہ میک اپ سے لدی ہوئی تھی۔ اس کی جسامت بھی موزوں تھی۔ چہرہ، جسم کہیں کہیں سے کسی قدر بھاری تھا۔ وہ بستر پر بیٹھی تھی اور ہمیں دیکھ کر مزید سہم کر بیڈ کے ساتھ دبک گئی۔ اس نے لرزتی آواز میں کہا۔ ''کون ہو تم لوگ کیا چاہتے ہو؟''

اس کی آواز بھی عام سی تھی۔ اس میں سیکس اپیل یا کوئی خاص کیفیت نہیں پائی جاتی تھی۔ سفیر اور وسیم چاقو لے آئے تھے۔ کسی عورت کو آتشیں اسلحہ اتنا خوف زدہ نہیں کرتا جتنا کہ دھار والے آلات کرتے ہیں۔ چاقو دیکھ کر اس کی حالت مزید خراب ہوگئی تھی اور اس نے بلبلا کر کہا۔ ''خدا کے لیے تم لوگ کیا چاہتے ہو؟''

میں باس کی طرح کرسی کھینچ کر اس کے پاس بیٹھ گیا اور غرا کر بولا۔ ''اگر میں کہوں تمہاری جان لینا چاہتے ہیں تو؟''

''مگر کیوں؟'' وہ رودی تھی۔ ''میں نے کیا کیا ہے؟''

''تم کل رات کہاں گئی تھیں؟''

اس کی آنکھیں اس سوال پر پھیل گئیں وہ ہکلا کر بولی۔ ''میں... میں کچھ گاہکوں کے ساتھ گئی تھی۔''

''وہ تمہیں کہاں لے گئے تھے؟''

''میں نہیں جانتی کار کے شیشے تاریک تھے۔ میں نے صرف ایک کوٹھی دیکھی لیکن مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں تھی؟''

''تمہیں کس شخص کے لیے وہاں لے جایا گیا تھا؟'' میں اس کے الفاظ کا تجزیہ کر رہا تھا۔

''میں اس کا نام نہیں جانتی۔'' اس نے جھجک کر جواب دیا۔

''کیا تم لے جانے والوں میں سے کسی کو جانتی ہو؟''

''نہیں...''

''جھوٹ مت بولو۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''تم اس طرح انجان لوگوں کے ساتھ کس طرح جا سکتی ہو؟''

وہ سہم گئی۔ ''میرا کام ہی ایسا ہے مجھے لوگوں کے ساتھ جانا پڑتا ہے۔''

''تم نے لے جانے والوں سے پیشگی معاوضے کا مطالبہ کیا تھا؟''

اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ''ہاں لیکن تمہیں کیسے پتا چلا؟''

''سوال مت کرو میرے سوال کا جواب دو۔''

''میں پہلی بار ان کے ساتھ جا رہی تھی اور مجھے خدشہ تھا کہ صبح وہ مجھے معاوضہ دینے سے انکار نہ کر دیں۔''

''تمہیں اندازہ نہیں تھا کہ وہ کس قسم کے لوگ ہیں، وہ چاہتے تو تمہیں معاوضہ ایک گولی کی صورت میں دے سکتے تھے اور تمہیں کسی نامعلوم قبر میں ہمیشہ کے لیے دفن کر دیا جاتا۔''

اس نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیری۔ ''مجھے نہیں معلوم کہ وہ کس قسم کے لوگ تھے لیکن تم یہ سب کیوں پوچھ رہے ہو۔ ان سے تمہارا کیا تعلق ہے؟''

''ہمیں اس شخص سے دلچسپی ہے جس کے لیے تمہیں وہاں لے جایا گیا تھا۔''

اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات آ گئے۔ اس نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔ ''وہ بہت عجیب آدمی تھا میں اس کے بارے میں نہیں بتا سکتی، میں نے کبھی یہ سب نہیں کیا جو کل رات مجھے اس شخص کے لیے کرنا پڑا تھا۔''

اس کی بات قابلِ غور تھی۔ اچانک مجھے ایک خیال

آیا۔ ''وہ شخص معذور تھا بستر پر تھا؟''

شبانہ اُچھل پڑی تھی۔ ''تت... تم یہ سب جانتے ہو پھر مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''میں نے کہا نا سوال نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''تم جتنی جلدی سوالوں کے جواب دو گی اتنی جلدی تمہیں یہاں سے چھٹکارا مل جائے گا۔''

اس کے چہرے پر امید نظر آئی۔ ''میں... میں ہر سوال کا جواب دوں گی۔ تم جو کہو گے میں مانوں گی بس مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچانا۔''

''اس شخص نے تم سے کیا کروایا؟''

اس نے بے بسی سے دیکھا۔ ''مجھ سے مت پوچھو، بے شک میں بُری عورت ہوں لیکن مجھے بتاتے ہوئے گھن آ رہی ہے۔ میں نے بہت گندے لوگوں کو دیکھا اور سہا ہے لیکن اتنا غلیظ آدمی میری نظر سے نہیں گزرا۔ اس کی حرکتوں پر شیطان بھی شرما جائے۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ مجھے اس شخص کے پاس لے جایا جا رہا ہے تو مجھے کسی بھی معاوضے کے بدلے اس کے پاس جانے کو تیار نہ ہوتی۔''

''تم وہاں جا کر بھی تو انکار کر سکتی تھیں؟''

''میں نے انکار کیا تھا۔ اس پر لمبے بالوں والے نے مجھے مارا اور قتل کرنے کی دھمکی دی تھی۔''

''لمبے بالوں والا شخص جو تمہیں لے کر گیا تھا؟''

''ہاں وہی، مجھے اس سے بہت ڈر لگا تھا۔''

''صبح اس نے تمہیں واپس چھوڑا تھا؟''

''نہیں وہ کوئی اور شخص تھا۔ یقین کرو جب تک میں وہاں سے نکلی نہیں میرا دم انکار رہا۔ وہ سب بہت خوفناک لگ رہے تھے۔ گھر آ کر بھی مجھے بہت دیر تک یقین نہیں آیا۔''

شبانہ نے سب کچھ سادگی سے بیان کر دیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس نے ہم سے کوئی بات نہیں چھپائی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ''کیا ان میں سے کسی نے تمہیں دوبارہ بلانے کو کہا؟''

''اسی ذلیل شخص نے کہا جس کے ساتھ میں نے رات گزاری تھی لیکن میں نے سوچ لیا تھا کہ اب دوبارہ مر کر بھی اس کے پاس نہیں جاؤں گی۔''

''تب تمہاری عافیت اسی میں ہے کہ عارضی طور پر اپنے گھر سے کہیں اور چلی جاؤ۔''

اس کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ ''کیا مطلب؟''

''معذور شخص بہت خطرناک آدمی ہے اور اس کا تعلق ایک دولت مند سیاسی خاندان سے ہے۔ اس کے پاس بدمعاشوں کی پوری فوج ہے اور وہ جسے چاہے اُٹھوا سکتا ہے یا ہمیشہ کے لیے غائب کرا سکتا ہے۔ میری بات سمجھ رہی ہو؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''ہاں... اگر میں نے جانے سے انکار کیا تو وہ مجھے اُٹھوا لے گا۔''

''بالکل وہ نفسیاتی مریض ہے اور ایک بار اس نے تمہیں اُٹھوا لیا تو امکان ہے پھر تمہیں رہائی نصیب نہیں ہو گی۔''

''بلکہ زندگی سے رہائی مل جائے گی۔'' وسیم نے کہا۔

''میں... کہیں اور چلی جاؤں گی۔''

''اسی میں تمہاری بہتری ہے اور اگر کسی وجہ سے ان کے ہاتھ آ جاؤ تو ہمارے بارے میں کسی صورت مت بتانا۔ ورنہ تمہاری بچت کا ایک فیصد امکان بھی باقی نہیں رہے گا۔'' میں نے اسے ڈرایا۔ ''بالکل انجان اور معصوم بن جانا۔ تم ہمارے بارے میں کچھ نہیں جانتی ہو اس لیے ان کو کچھ نہیں بتا سکو گی لیکن وہ آدمی کی زبان پر یقین کرنے والے لوگ نہیں ہیں وہ تم پر تشدد کریں گے۔''

''تشدد بھی ایسا ویسا نہیں کریں گے۔'' سفیر نے بھی اسے ڈرانے میں اپنا حصہ ڈالا۔ ''وہ تمہیں جلائیں گے، کاٹیں گے، تمہارے ناخن کھینچیں گے اور تمہاری ہڈیاں توڑ دیں گے۔''

''بالآخر تم ان کے تشدد کے جان ہار جاؤ گی اور وہ بغیر کسی احساس کے تمہاری کچلی اور ٹوٹی پھوٹی لاش کسی نامعلوم قبر میں دفنا دیں گے۔'' میں نے کہا۔

''اس لیے تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ اپنی زبان بند رکھو۔'' وسیم نے کہا اور میں کھڑا ہو گیا۔ ہم باہر آئے اور چہروں سے ٹوپیاں اُتاریں۔ سفیر نے اپنا شانہ تھپکا۔

''کیا پرفارمنس دی ہے آج۔''

''یہ تو واضح ہو گیا ہے کہ اس کوٹھی میں نادر علی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''وہ مکمل طور پر معذور ہونے کی وجہ سے عورت کے قابل نہیں رہا ہے لیکن اس کی ہوس کم نہیں ہوئی ہے۔ وہ دولت اور طاقت کے بل بوتے پر اپنی تسکین کا سامان کر رہا ہے۔''

''یہی سامان اس کی موت کا سامان ثابت ہوگا۔'' وسیم نے کہا۔ ''شہباز صاحب ہمارے ہاتھ زبردست مہرہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آیا ہے۔ اگر ہم نادر کو وہاں سے اُٹھالیں تو مرشد گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو جائے گا۔"

میں نے تلخی میں سر ہلایا۔ "تم مرشد کو غلط پیمانے پر تول رہے ہو۔ وہ اس قسم کا شخص ہے کہ اس کے نزدیک انسان کی کوئی حیثیت نہیں چاہے وہ اس کا کوئی خونی رشتے دار ہی کیوں نہ ہو۔ نادر اب اس کے لیے بھائی نہیں بلکہ ایک بوجھ اور ذمے داری ہے اور اگر اسے اس سے چھٹکارا مل جائے تو میرا خیال ہے وہ خوش ہوگا۔"

"تب وہ اس سے چھٹکارا کیوں نہیں حاصل کر لیتا۔" سفیر نے اعتراض کیا۔ "اس کے لیے یہ کوئی مشکل کام تو نہیں ہے۔"

"تم نے ٹھیک کہا ہے لیکن اس کی خاندانی مجبوریاں ہوں گی اور یقیناً نادر نے اپنی حفاظت کا کوئی نہ کوئی بندوبست کر رکھا ہوگا۔ وہ احمق نہیں ہے یہ سب بھیڑیا فطرت لوگ ہیں جو ذرا سا کمزور ہوا سے مل کر پھاڑ کھاتے ہوں گے اس لیے کوئی کمزور ہونا نہیں چاہے گا۔"

"شاید آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن اس کے باوجود یہ ہماری ایک بڑی کامیابی ہے۔" وسیم نے کہا۔

"اس سے انکار نہیں ہے دشمن کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننا بہترین حکمت عملی ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن ہمارا اصل ہدف مرشد ہے۔"

سفیر نے بحث سمیٹتے ہوئے کہا۔ "اب اس کا کیا کرنا؟"

اس کا اشارہ شبانہ کی طرف تھا۔ میں نے کہا۔ "میرا خیال ہے اسے آج ہی اس کے فلیٹ تک چھوڑ آتے ہیں۔"

"کون جائے گا؟" سفیر نے پوچھا۔

"میں اور تم۔" میں نے کہا۔ "ہم نے آج سارا دن آرام کے سوا کچھ نہیں کیا ہے اس لیے اچھا ہے ذرا جسم کھل جائے گا۔"

سفیر تیار نہیں تھا وہ آرام کے موڈ میں تھا مگر میں نے اسے انکار کا موقع نہیں دیا۔ شبانہ کو پہلے کی طرح منہ پر تکیے کا غلاف چڑھا کر اوپر لائے۔ اسے لے جانے کے لیے بھی لینڈ کروزر منتخب کی کیونکہ ایک تو اس کے عقبی حصے میں وہ کسی کو نظر نہیں آتی دوسرے یہ رفتار کے معاملے میں بھی باقی گاڑیوں سے بہتر تھی۔ وسیم نے اس کے سامنے والے حصے میں ایک عدد شاٹ گن اور ایک خود کار رائفل رکھی تھی۔ ڈیش بورڈ میں ایک سائلنسر لگا پستول تھا اور باقی پستول وغیرہ ہمارے پاس موجود تھے۔ شبانہ خوف زدہ تھی اور ہماری منتیں کر رہی تھی کہ اسے نقصان نہ پہنچائیں۔ اس کا خیال تھا کہ ہم اسے کہیں ٹھکانے لگانے کے لیے لے جا رہے ہیں۔ میں نے اسے تسلی دی۔

"اگر نقصان پہنچانا ہوتا تو اتنی زحمت کیوں کرتے جہاں ہیں وہیں تمہیں گولی مار کر کہیں دفن کر دیتے۔"

وہ بہت بزدل تھی اور اپنی نہ ہونے والی وفات کا ماتم کر بھی اس کی ہوا خراب ہو گئی تھی۔ اس لیے جب اسے گاڑی کے پچھلے حصے میں بٹھایا تو وہ خاموشی سے دبک گئی۔ اسے خبردار کر دیا تھا کہ راستے میں کسی قسم کا شور شرابا اس کی رہائی کے امکانات کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دے گا اس کے حق میں بہتر یہی ہے کہ خاموش بیٹھے۔ ہم کوئی گیارہ بجے کوٹھی سے نکلے اور اسلام آباد کی طرف روانہ ہوئے۔ سردی یقیناً شدت کی تھی لیکن دھند نہیں تھی اور سڑک صاف تھی اس لیے ہم بیس منٹ بعد اسلام آباد میں تھے۔ وسیم نے مجھے شبانہ کے فلیٹ کا پتا سمجھا دیا تھا۔ اس کی وجہ سے میں نے اور سفیر نے راستے میں غیر ضروری گفتگو سے گریز کیا لیکن جب اس کے فلیٹ کے سامنے اسے اُتار کر وہاں سے روانہ ہوئے تو سفیر نے سرد آہ بھری۔

"وہ بھی کیا زمانہ تھا جب ہم رات رات بھر اسلام آباد اور پنڈی کی سڑکوں پر مٹرگشت کیا کرتے تھے۔"

"میرے دوست وہ زمانہ پھر آئے گا لیکن کیا خیال ہے اس وقت کی کچھ یاد نہ تازہ کر لی جائے۔"

"کیا مطلب کہیں چلنا ہے؟" سفیر نے دلچسپی سے پوچھا۔

"ہاں یاد ہے صدر میں ایک چھوٹا سا کیفے ہے جو رات بھر کھلا رہتا ہے اور اس کی کافی لاجواب ہوتی تھی۔"

"ہاں یاد آ گیا شاید دو سال پہلے آخری بار ہم گئے تھے۔" سفیر نے یاد کیا۔ "کیا اب بھی ہوگا؟"

"امکان تو یہی ہے کیفے اتنی جلدی بند نہیں ہوتے ہیں۔" میں نے گاڑی کا رُخ اس طرف موڑ دیا۔

"لیکن یار ایسی تفریح پر جاتے ہوئے اب ڈر لگتا ہے کہیں نہ کہیں کوئی بدبخت دشمن ٹکرا جاتا ہے۔"

"خدا پر بھروسا رکھو یار آج سارے دشمن اپنے کمبلوں اور رضائیوں میں دبکے ہوں گے۔"

"کہاں بھائی انہیں بھی ہماری طرح چین نہیں۔" سفیر نے کہا۔ "وہ بھی سڑکوں پر مارے مارے پھرتے

ہوں گے۔"

"بس آج کوئی نہ ملے، آج میرا موڈ اچھا ہے۔" میں نے کیفے کے سامنے گاڑی روکی۔ کیفے کھلا ہوا تھا اور اس کی بیرونی آرائش سے لگ رہا تھا کہ اس نے ترقی کی ہے۔ ہم اندر آئے، ایک کونے والی میز منتخب کی، یہاں روشنی کم تھی اور اگر کوئی بدبخت دشمن آ بھی جاتا تو اس کا امکان کم تھا کہ اس کی بدنظر ہم پر پڑے۔ سفیر نے کافی کا کہا اور سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔

"تو نے پھر شروع کر دی؟"

"ختم کب کی تھی یار، مونا سے چھپ کر پیتا ہوں۔" سفیر نے سگریٹ سلگائی۔ "اس نے سگریٹ کے پیچھے دماغ کی دہی کر دی تھی۔ مجبوراً اس کے سامنے چھوڑنا پڑی تھی۔"

"اور پیٹھ پیچھے پی رہا ہے۔"

"بھائی اسی کا نام ازدواجی زندگی ہے۔" سفیر نے آہ بھری تو اس کے منہ سے دھواں نکلا تھا۔ "میاں بیوی کی زندگی کی گاڑی میں جھوٹ اور چھوٹے موٹے دھوکوں کا آئل نہ ہو تو گاڑی انک انک کر چلتی ہے اور انجن سیز ہونے کا خطرہ بھی رہتا ہے۔"

"تو نے بہت جلد ترقی کر لی ہے۔" میں نے اسے خراجِ تحسین پیش کیا۔ "خیر تیرے ازدواجی معاملات تو چلتے رہیں گے۔ یہ بتا کہ میری مرشد کے خلاف حکمتِ عملی کیسی ہے؟"

"مناسب ہی ہے لیکن ابھی تک ہم نے کوئی واضح قدم نہیں اُٹھایا صرف مرشد کے اقدامات کا جواب دیتے رہے ہیں۔"

"دیکھو یار مرشد اور ہمارے وسائل اور اسٹیٹس میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اس کے پاس جاہل مریدوں اور کرائے کے بدمعاشوں کی کوئی کمی نہیں۔ ہمارے پاس گنے چنے ساتھی ہیں اور سب قیمتی ہیں۔ مالی وسائل بھی لامحدود نہیں ہیں۔ اوپر سے پولیس بھی میرے پیچھے ہے۔ اس صورت میں ہماری پوزیشن دفاعی بنتی ہے لیکن رفتہ رفتہ ہم اس کے خلاف اپنی پوزیشن بھی مضبوط کر رہے ہیں۔"

"ہم مرشد کو قانونی میدان میں شکست نہیں دے سکتے، اول تو اس پر کوئی الزام نہیں ہے دوسرے اگر کوئی الزام لگ بھی جائے تو اس کے وکیل اسے چھڑا سکتے ہیں۔ وہ کرپٹ عدالتی نظام کو خرید سکتا ہے اپنے اثر رسوخ سے فیصلے تبدیل کرا سکتا ہے۔"

"یار ابھی وہ طاقت ور ہے لیکن وقت ہمیشہ ایک سا نہیں رہتا ہے۔ ضرورت اس چیز کی ہے کہ ہم صبر سے کھڑے رہیں اور اچھے وقت کا انتظار کریں۔ جب مرشد کا بُرا وقت آئے گا تو وہ خود ہم سے تصفیہ چاہے گا۔"

"اور جب بُرے وقت سے نکل جائے گا تو دوبارہ فرعون بن جائے گا۔" سفیر نے تلخی سے کہا۔ "یہ مرشد کا مستقل حل نہیں ہے۔"

"تب تیرے خیال میں مستقل حل کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔ "مرشد سے صلح کر لی جائے؟ تو جانتا ہے یہ ممکن نہیں ہے۔ دوسرا حل یہ ہے کہ سب چھوڑ کر یہاں سے چلے جائیں اور پیچھے ہمارے جو لواحقین رہ جائیں انہیں مرشد کے رحم و کرم پر چھوڑ جائیں۔" میرا لہجہ بھی تلخ ہو گیا۔

سفیر خاموش ہو گیا تھا وہ سگریٹ پھونکے جا رہا تھا۔ ویٹر کافی لے آیا اور اس نے سلیقے سے کافی سرو کی۔ ویٹر کے جانے کے بعد میں نے کہا۔ "سفیر میری ایک بات مان..."

"بکواس نہ کر۔" اس نے میری بات کاٹی۔ "تو کیا سمجھ رہا ہے میں اس جنگ سے جان چھڑانا چاہتا ہوں۔ مونا کے ساتھ کہیں جا کر سکون سے رہنا چاہتا ہوں۔"

"اب تو بکواس کر رہا ہے، کیا میں تجھے جانتا نہیں ہوں؟ میں بالکل بھی ایسا نہیں سمجھ رہا ہوں میں تیرے سامنے متبادل آپشن رکھ رہا ہوں۔ تو یہاں نہیں تھا تو میں دشمن کے خلاف اکیلا تھا لیکن مجھے یہ اطمینان بھی تھا کہ تو اور مونا دشمن کی پہنچ سے باہر ہیں اور یہ چیز مجھے طاقت ور بناتی تھی۔ اب میں تیرے ساتھ کے باوجود خود کو اتنا مضبوط محسوس نہیں کر رہا ہوں۔ تو اور مونا ایک بار مرشد کی قید میں رہ چکے ہیں۔ تو نہیں جانتا وہ وقت مجھ پر کتنا بھاری گزرا تھا۔"

"وہ وقت دوسرا تھا اس وقت ہم کمزور تھے، آج ہم اس کے مقابلے میں کہیں بہتر پوزیشن میں ہیں۔" سفیر نے کہا۔

"پھر بھی تو مایوس ہے۔" میں نے جواب دیا تو سفیر شرمندہ نظر آنے لگا۔

"تو ٹھیک کہہ رہا ہے شاید میرے اعصاب اب اتنے مضبوط نہیں رہے ہیں۔"

"دیکھ یار حالات میں نرمی گرمی آتی رہتی ہے، اصل بات یہ ہے کہ انسان ہمت نہ ہارے۔" میں نے کافی اُٹھائی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جوٹھنڈی ہونے جارہی تھی۔

”تو ٹھیک کہہ رہا ہے اب تو رقم کی کمی بھی نہیں ہے۔ بیرون ملک بینک میں ہمارے کروڑوں روپے موجود ہیں۔“

”پھر راجا عمر دراز کا مکمل تعاون بھی حاصل ہے۔“

”لیکن اس کا یہ تعاون بے سبب نہیں ہے۔“ سفیر نے نقطہ اٹھایا۔

میں نے سر ہلایا۔ ”تو ٹھیک کہہ رہا ہے وہ چاہتا ہے کہ میں اس کے ساتھ ہمالیائی وادی تک کا سفر کروں۔ مگر اس کی اپنی حالت اچھی نہیں ہے ڈاکٹر نے اسے جواب دیدیا ہے۔“

”بڑی بھرپور شخصیت ہے راجا عمر دراز کی۔“

”اتنی ہی بھرپور زندگی بھی گزاری ہے اس نے۔“

”ڈیوڈ شا کا معاملہ کہاں تک پہنچا؟“

”میری اس سے بات ہوئی ہے اور میں نے اسے بتادیا ہے کہ اس کے آدمی نے بدعہدی کی اور مجھے مرشد کے حوالے کرنا چاہا تھا۔“

”اس کا کیا ردِعمل تھا؟“

”ایسا لگا جیسے اسے میری بات کا یقین نہیں آیا مگر مجھے اس کی پروا نہیں ہے میری بلا سے وہ جہنم میں جائے۔ اگر یقین نہیں کرتا۔“

”لیکن اسے یقین آگیا کہ اس کے آدمی نے مرشد کے ساتھ مل کر اسے ڈبل کراس کیا ہے تو اس کا کیا ردِعمل ہو گا۔“

”کچھ بھی نہیں ابھی وہ مرشد کا کچھ بگاڑنے کی پوزیشن میں نہیں ہے اور جب اس کا کام نکل جائے گا تو مرشد کا جھٹکا کردے گا وہ کسی کو معاف کرنے والوں میں سے نہیں ہے۔“

”وہ بھی مجھے مرشد کی نسل کا لگتا۔“

”کچھ اسی قسم کا شخص ہے، لیکن اس کے عزائم مرشد سے بہت زیادہ بلند ہیں۔“

”تیرا کیا خیال ہے وہ وادی تک کیوں جانا چاہتا ہے؟“

”مجھے اس کے پس پشت گوروں کی مخصوص نفسیات نظر آتی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں دنیا کی ہر چیز اور ہر دریافت پر اصل میں ان کا حق ہے اور اگر کوئی اور یہ کام کرجاتا ہے تو وہ ان کی حق تلفی کرتا ہے اور ان کا مجرم ہے۔ وادی تک ولیم شا، اس کا آسٹریلین ساتھی اور راجا عمر دراز پہنچے تھے اس طرح وادی کی دریافت میں وہ تینوں شریک تھے لیکن شاید ولیم شا نے صرف اسی لیے وادی کے بارے میں لب کشائی سے گریز کیا کہ وہ اس میں عمر دراز یا اپنے ساتھی کو حصے دار بنانا نہیں چاہتا تھا۔ مگر موت اور حالات نے اسے مہلت نہیں دی۔ اس کے بیٹے برٹ شا کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی مگر ڈیوڈ شا وہاں کے لیے پاگل ہو رہا ہے۔“

”شہباز تم نے بتایا کہ وہ تمہاری مدد کے بدلے مرشد سے تمہارا تصفیہ کرانے کے لیے تیار تھا؟“ سفیر نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”لیکن تم نے دیکھ لیا مرشد نے اس کے تصفیے کو اس کے منہ پر مارنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی۔“ میں نے اسے یاددلایا۔

”وہ ٹھیک ہے یار پر ہم ڈیوڈ شا کو استعمال تو کرسکتے ہیں۔“

”وہ کیسے؟“

”تو ڈیوڈ شا سے بات کرا اور اسے بول کہ تو اب بھی اس کے ساتھ معاہدے میں مخلص ہے اگر وہ مرشد سے ہماری جان چھڑا دے تو تو اس کے ساتھ وادی جائے گا۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میرا پہلے بھی ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔“

”بے شک ارادہ نہ ہو لیکن بات کرنے میں کیا حرج ہے وہ کون سا سجن ہے جس سے کیا عہد نبھانا ضروری ہوگا۔“

”بھائی تم جانتے نہیں ہو وہ کتنا شاطر آدمی ہے اس نے مجھ سے قرآن کریم پر عہد لیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ میں قرآن پر کیا ہوا عہد نہیں توڑ سکوں گا وہ تو خدا نے احسان کیا اور میری خود ہی جان چھوٹ گئی اور مجھے اس کے ساتھ کیا ہوا عہد نبھانا نہیں پڑا۔ اب میں نے اس سے بات کی تو وہ مجھے اسی طرح پھانس لے گا۔“

”فی الحال وہ برطانیہ میں یا کہیں اور ہے اور تم اس کے قبضے میں بھی نہیں ہو اس لیے بات کرو اور اس سے تعاون پر آمادگی ظاہر کرو۔“

”اس کا فائدہ؟“

”سب سے بڑا فائدہ تو یہ ہوگا کہ ڈیوڈ شا مرشد کی کلیں دبائے گا اور وہ اسے صاف انکار بھی نہیں کرسکتا ہے۔ وہ ہمارے خلاف کارروائیاں روکنے پر مجبور ہوجائے گا۔“

”مجھے ایسی کوئی خوش فہمی نہیں ہے۔“ میں نے سوچ کر کہا۔ ”لیکن اگر تو کہتا ہے تو میں اس سے بات کرکے دیکھتا ہوں۔“

ڈیوڈ شا کا فون نمبر میں نے اپنے ای میل اکاؤنٹ میں محفوظ رکھا تھا۔ آئی فون سے اکاؤنٹ کھولا۔ اس میں انٹرنیٹ ہمہ وقت آن رہتا ہے۔ ڈیوڈ شا کے پیلس کا نمبر نوٹ کیا اور اس سم سے اسے کال ملائی جو میں نے صرف دشمنوں سے رابطے کے لیے مخصوص رکھی تھی۔ فون ڈیوڈ شا کے مہذب بٹلر نے اٹھایا اور نہایت شائستگی سے مجھے بتایا کہ مسٹر ڈیوڈ شا شام کی چائے پینے میں مصروف ہیں اس لیے میں کچھ دیر بعد کال کروں۔ میں نے کہا۔

”میں پاکستان سے کال کررہا ہوں اور یہ کال مسٹر ڈیوڈ شا کے لیے بہت اہم ہے۔ تم ان سے بات کرواور اگر وہ انکار کرتے ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا لیکن میں دوبارہ کال نہیں کروں گا۔“

بٹلر نے چند لمحے میرے الفاظ تولے اور بولا۔ ”آپ ایک منٹ کے لیے ہولڈ کریں۔“

ایک منٹ بعد ڈیوڈ شا کی سرد آواز ابھری۔ ”ہیلو۔“

”شہباز ملک بات کررہا ہوں۔“

”شہباز۔“ اس نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ”تم نے مجھ سے جھوٹ بولا ہے تم میرے آدمی کو دھوکا دے کر نکل گئے تھے۔“

”کس قسم کا دھوکا جب کہ تم مجھے ویسے ہی رہا کرنے والے تھے؟“ میں نے چبھتے لہجے میں کہا۔ ”یا تمہارا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا اور دھوکا تم مجھے دے رہے تھے۔“

”مارشل کا بیان بالکل الگ ہے، اس کی موبائل کال کا ریکارڈ نہیں ملا۔“

”مارشل اس وقت کہاں ہے؟“

”میں نے اسے واپس بلالیا ہے۔“

”کیا میں اس سے بات کرسکتا ہوں؟“

”وہ یہاں نہیں ہے۔“ ڈیوڈ شا نے کہا۔

”تمہارے پاس اس کا نمبر ہوگا، تم اسے کال کرسکتے ہو اور مجھے کانفرنس میں لے لو۔“

”اس سے تم کیا مقصد حاصل کرنا چاہتے ہو؟“

”میں ابھی اس کے جھوٹ کا پول کھول دیتا ہوں تم سنتے رہنا۔“

ڈیوڈ شا نے سوچا اور پھر مارشل کو کال کی اس دوران میں میری کال ہولڈ پر چلی گئی تھی۔ اس لیے مجھے نہیں معلوم کہ ڈیوڈ شا نے اس سے کیا کہا۔ لیکن ایک منٹ بعد وہ بھی اس کال میں شامل تھا۔ اس نے کاٹ کھانے والے لہجے میں کہا۔ ”شہباز تم بچو گے نہیں۔“

”تم نے کوشش تو پہلے بھی کی تھی اور مجھے مرشد کے حوالے کرنا چاہا تھا لیکن بازی الٹ گئی۔“

”تم جھوٹ بول رہے ہو۔“ اس نے ڈھٹائی سے کہا۔ ”جب میں تمہیں رہا کرنے گیا تو تمہارے ساتھیوں نے حملہ کردیا اور میرے آدمیوں کو ہلاک کردیا۔ میں بڑی مشکل سے اپنی جان بچا سکا تھا۔“

”یہ غلط ہے تم مجھے فیصل مسجد لے کر نہیں گئے تھے جہاں تم نے میرے ساتھیوں کو مجھے حوالے کرنے کو کہا بلکہ تم مجھے راول ڈیم لے گئے تھے اور وہاں مرشد کے آدمیوں کے حوالے کرنے کی کوشش کی تھی، میری خوش قسمتی کہ میں جان بچانے میں کامیاب رہا۔“

”جھوٹ بولتے ہو تم میں تمہیں فیصل مسجد کی طرف ہی لے گیا تھا۔“

”مسٹر ڈیوڈ شا تم سن رہے ہو۔“ میں نے کہا۔ ”مارشل نے اپنے منہ سے اقرار جرم کرلیا ہے۔“

مارشل غرایا۔ ”بکواس کرتے ہو تم میں نے کوئی اقرار جرم نہیں کیا ہے۔“

”ڈیوڈ شا تم نے سنا یہ مجھے میرے ساتھیوں کے حوالے کرنے فیصل مسجد کی طرف لے گیا تھا۔ لیکن اگلے دن کے اخبارات تمہیں بتائیں گے کہ اس روز فیصل مسجد یا اس کے آس پاس ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوا تھا جس میں کم سے کم دو افراد کی ہلاکت ہوئی ہو لیکن راول ڈیم کے پاس ایسا واقعہ ضرور ہوا تھا جس میں فائرنگ اور جانی نقصان ہوا تھا۔ اگر میرے ساتھیوں نے اس پر فیصل مسجد کے پاس حملہ کیا تھا تو یہ واقعات راول ڈیم کے پاس کیوں ریکارڈ کیے گئے۔ اخبارات چیک کرنے کے لیے تمہیں زیادہ زحمت نہیں کرنا پڑے گی۔ انٹرنیٹ پر اب تمام اہم پاکستانی اخبارات دستیاب ہیں اور ان کے پرانے شمارے بھی مل جاتے ہیں۔“

میرے الفاظ نے مارشل کو گنگ کردیا تھا غالباً اس نے سوچا نہیں تھا کہ یہ سب اخبار میں آیا ہوگا۔ اس کی خاموشی نے ڈیوڈ شا کو مشکوک کردیا اس نے یخ بستہ لہجے میں کہا۔ ”مارشل اب تم کیا کہتے ہو؟“

”یہ ... یہ جھوٹ کہہ رہا ہے۔“ مارشل جو پہلے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بلڈوگ کی طرح غرارہا تھا اب کسی نازک مزاج پلے کی طرح چیاؤں چیاؤں کرنے لگا۔

''اگر یہ جھوٹ کہہ رہا ہے تو ٹھیک ہے لیکن اگر اخبارات نے کوئی اور کہانی سنائی تو...''

''پلیز... پلیز ڈیوڈ شا مجھے معاف کردو۔'' مارشل گڑگڑانے لگا۔ ''مجھ سے غلطی ہوئی میں مرشد کی باتوں میں آگیا تھا۔''

''باتوں میں یا لالچ میں؟'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''ڈیوڈ شا تم خود کو بہت توپ چیز سمجھتے ہو، تمہارے خیال میں تمہاری ضمانت اس ملک کے حکمران بھی نہیں ٹھکرا سکتے، لیکن تمہارا ایک معمولی اور قدموں میں لوٹنے والا غلام کس طرح تمہارے الفاظ کو تمہارے منہ پر مار گیا۔''

''شہباز ملک۔'' وہ غرایا۔

''پہلے ان لوگوں سے حساب لے لو پھر مجھ سے بات کرنا۔'' میں نے کہا۔ ''میں اب بھی تم سے تعاون کرنے کو تیار ہوں لیکن اس بار کسی معاہدے کی بات کرتے ہوئے اپنی ضمانت مضبوط کرلینا۔''

میں نے کال کاٹ دی اور سم نکال لی۔ سفیر نے سکون کا سانس لیا وہ مجھے مستقل اشارے کیے جارہا تھا کہ میں نے کچھ زیادہ ہی دیر بات کرلی ہے اور ڈیوڈ شا کا کوئی بھروسا نہیں ہے وہ باہر سے بیٹھے بیٹھے یہاں میرے خلاف ڈوریاں ہلا سکتا تھا۔ ''اتنی دیر بات کرنے کی کیا ضرورت تھی؟'' سفیر نے برہمی سے کہا۔ ''ان کے بارے میں جانتے نہیں ہو۔''

''بس یار بات ہی ایسی ہورہی تھی۔ مارشل کا پتا تو صاف سمجھو اور مرشد بھی مشکل میں پڑنے والا ہے۔'' میں نے میز پر ایک نوٹ رکھا اور کھڑا ہوگیا۔ ''لیکن تو بھی ٹھیک کہہ رہا ہے ہمیں احتیاط کرنی چاہیے اور یہاں سے فوری روانہ ہوجانا چاہیے۔''

میں اور سفیر باہر آئے اور بروقت آئے جیسے ہی ہم لینڈ کروزر میں بیٹھے ایک سفید کار وہاں آکر رکی اور اس سے چار آدمی نکل کر کیفے کی طرف لپکے تھے۔ تاریک شیشوں کے پیچھے وہ ہمیں نہیں دیکھ سکے تھے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں مشین گن تھی اور باقی بھی یقیناً مسلح تھے۔ اندر جانے سے پہلے ان میں سے ایک بولا۔ ''سگنل یہیں سے آرہے تھے ہوشیاری سے وہ بہت خطرناک ہیں۔ لیکن گولی نہیں چلانی ہے ان کو زندہ قابو کرنا ہے۔''

آنے والے چاروں افراد مقامی تھے اور ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ جن کے لیے آ... ان سے صرف چند قدم کی دوری پر اس لینڈ کروزر کے... شیشوں کے پیچھے موجود تھے۔ جیسے ہی وہ اندر گئے میں... گاڑی کا انجن اسٹارٹ کیا اور اسے پارکنگ سے نکا... ہوئے اپنی طرف کا شیشہ نیچے کیا۔ سفیر نے اضطراب... کہا۔ ''یہ کیا کررہے ہو؟''

''دیکھتے جاؤ۔'' میں نے کہا اور اپنا پستول نکال... سفید کار کے اگلے دونوں پہیوں پر ایک ایک فائر... اور دونوں دھماکے سے برسٹ ہوگئے۔ فائر کی آواز بھی... اندر گئی ہوگی لیکن جب تک وہ چاروں اندر سے برآمد ہو... ہماری گاڑی کوئی دو سو گز دور جاچکی تھی۔ سفیر پلٹ کر دیکھ... تھا۔ میں نے فرار ہوتے ہوئے حد رفتار کا خیال رکھا... کیونکہ صدر کے علاقے میں ٹریفک پولیس ہوتی تھی اور... پیچھے آنے میں زیادہ دیر بھی نہیں لگائی۔ سفیر نے ان کو... آتے اور اپنی کار کا معائنہ کرتے دیکھ کر قہقہہ مارا۔

''اب مزہ آئے گا سالوں کو ہمیں پکڑنے آ... تھے۔''

میں ڈرائیونگ کے ساتھ آس پاس نظر بھی ر... ہوئے تھا کیونکہ مجھے شک تھا کہ وہ صرف ایک گاڑی... ساتھ نہیں آئے ہوں گے۔ ابھی ہم نصف کلومیٹر دور... ہوں گے کہ ایک ذیلی سڑک سے ایسی ہی ایک سفید کار نکل... ہمارے پیچھے آنے لگی۔ میں نے سفیر سے کہا۔ ''بیٹے ہوشیا... ہوجا اب مزہ لینے کی باری ہماری ہے۔''

''کیا ہوا؟''

میں نے عقبی آئینے میں دیکھتے ہوئے رفتا... بڑھائی۔ ''مجھے شک ہے یہ سفید کار ہمارے پیچھے آرہی ہے۔''

سفیر نے پلٹ کر دیکھا، لینڈ کروزر کی رفتار بڑھتے ہی... عقب میں آنے والی گاڑی کی رفتار بھی بڑھ گئی تھی۔ میں نے... گاڑی دائیں طرف ایک آبادی کی طرف گھمادی۔ فوراً ہی... سفید کار بھی اسی طرف گھوم گئی۔ سفیر نے اضطرابی لہجے میں... کہا۔ ''وہ ہمارے پیچھے آرہی ہے۔''

''یار اس سے بھی نمٹنا پڑے گا۔'' میں نے گاڑی کو... گلیوں میں گھماتے ہوئے کہا۔

سفیر نے کہا۔ ''تو بس دیر مت کرو ورنہ یہ کال کر کے... مزید مصیبتوں کو نہ بلالیں۔''

''تیرا نشانہ اچھا ہے۔ اوپر والے خانے سے نکل کر...

سائلنسر والے پستول سے کار کے ٹائروں اور ونڈ اسکرین کو نشانہ بنانے کی کوشش کر۔''

سفیر نے ڈیش بورڈ کے خانے سے سائلنسر لگا پستول نکالا اور چھت والا خانہ کھولتے ہوئے اس سے باہر نکلا۔ اسے باہر آتے دیکھ کر عقبی کار کی رفتار کم ہوئی اور اسی مناسبت سے میں نے بھی رفتار کم کی۔ وہ کوئی پچاس گز کی دوری پر تھی۔ سفیر نے نشانہ لے کر آدھے منٹ سے کم وقت میں کار پر پورا میگزین خالی کردیا۔ سائلنسر کی وجہ سے آواز نہیں آئی تھی لیکن سفید کار کا ایک ٹائر ضرور دھماکے سے پھٹا تھا اور اس کی ونڈ شیلڈ پر بھی کئی سوراخ نمودار ہوگئے تھے۔ اب وہ تعاقب کے قابل نہیں رہی تھی۔ پتا نہیں اندر موجود افراد میں سے کسی کو گولی لگی تھی یا نہیں۔ لیکن گاڑی ضرور رک گئی تھی۔ سفیر کے واپس بیٹھتے ہی میں نے رفتار بڑھادی۔ سفیر خوش تھا۔

''کیسا رہا نشانہ؟''

''شاندار رہا، مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم نے اتنی ترقی کرلی ہے۔''

''دبئی میں ایک شوٹنگ کلب جوائن کیا ہوا تھا وہاں میں نے دو ٹرافیاں بھی جیتی تھیں۔'' سفیر نے سرد آہ بھری ''عجلت میں بھاگتے ہوئے دونوں ٹرافیاں وہیں رہ گئیں۔''

''کوئی بات نہیں یار ایسی ٹرافیاں یہاں بھی بہت مل جاتی ہیں جتنی کہو اور ان پر جو چاہے لکھوالو۔''

سفیر نے مجھے گھورا۔ ''تیرا مطلب ہے وہ نقلی ٹرافیاں تھیں جیسا کہ ہمارے ہاں کھلاڑی اور دوسرے شعبوں سے تعلق رکھنے والے لوگ بنواتے ہیں؟''

''نہیں مجھے پورا یقین ہے وہ ٹرافیاں تجھے شوٹنگ کلب والوں نے ہی دی ہوں گی لیکن کیا مونا کو اس کا یقین تھا؟''

''نہیں بھائی اسے ایک لمحے کو بھی یقین نہیں آیا تھا اس کے خیال میں، میں بازار سے بنوا کر لایا ہوں۔'' سفیر نے عقبی آئینے میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یار یہ بیویاں شوہروں کو اتنا جھوٹا کیوں سمجھتی ہیں؟ ویسے لگتا ہے ان سے پیچھا چھوٹ گیا ہے۔''

''یعنی اور کوئی پیچھے نہیں ہے۔'' میں نے کہا اور اس دوران میں گاڑی دوبارہ مین روڈ پر نکال لی تھی۔ ''تیرا منحوس اندیشہ درست ثابت ہوا ڈیوڈ شا برطانیہ میں بیٹھ کر یہاں اپنے اثر و رسوخ سے ... صلاحیت رکھتا ہے۔''

''منحوس کے بجائے آپ ... تھے۔'' سفیر نے ملامت سے کہا۔ ''اس نے ... بھی فوراً روانہ کردیا۔''

میں نے اس کی بات پر غور کیا۔ ''ان کا انداز ... نہیں تھا کیونکہ صرف ایک نے مشین گن اٹھائی ہوئی تھی اور وہ شاید ڈرانے دھمکانے کے لیے تھی۔ وہ ہمیں اٹھانے آئے تھے۔''

''شکر ہے مجھے بروقت عقل آگئی اور ان کے اٹھانے سے پہلے ہم خود اٹھ گئے۔ ورنہ ابھی بندھے ہوئے جارہے ہوتے۔'' سفیر نے اپنی پیٹھ خود تھپکی۔ ''تیرا اندیشہ درست ثابت ہوا ہم کہیں جائیں اور دشمن سے ٹکراؤ نہ ہو یہ ممکن ہی نہیں ہے۔''

''لیکن اس بار ہم نے خود بیل کو دعوت دی تھی۔'' میں نے فیول گیج کی طرف دیکھا۔ گاڑی میں ڈیزل کم ہورہا تھا۔ اگرچہ ایاز نے ایسا بندوبست رکھا تھا کہ عقبی حصے میں پانچ پانچ گیلن کے چار کین بھرے رکھے تھے۔ لیکن یہ صرف ہنگامی حالات کے لیے تھے۔ میں نے نظر آنے والے پہلے پیٹرول پمپ کی طرف گاڑی موڑ دی اور ڈیزل پمپ کے سامنے روکتے ہوئے لڑکے کو ٹنکی فل کرنے کو کہا۔ اس نے مجھ سے چابی لے کر نوزل ٹینک میں لگا دی۔ میں اور سفیر نیچے اتر آئے۔ سردی کی وجہ سے پیٹرول پمپ اور آس پاس ویرانی تھی، اسٹیشن میں واحد گاڑی ہماری تھی۔ سفیر کو کچھ فطری مسئلہ درپیش ہوا اور وہ واش روم کی طرف چلا گیا۔ لڑکا دیکھنے میں کم عمر لگ رہا تھا لیکن جب میں نے غور سے دیکھا تو مجھے اپنے خیال کی تردید کرنا پڑی۔ وہ پچیس سے اوپر کا تھا اور اس کے سوا وہاں کوئی اور نظر نہیں آرہا تھا۔ میں نے میٹر پر تیزی سے بدلتے ہندسوں کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ادائیگی کہاں کرنی ہے؟''

عام طور سے اتنے بڑے پمپس پر دو تین آدمی ہوتے ہیں اور کیش ہینڈلنگ کا کام ایک ہی آدمی کرتا ہے۔ لیکن یہاں بس یہی لڑکا تھا اس نے جواب دیا۔ ''مجھے دو صاحب۔ میں اندر دے آتا ہوں۔''

ٹنکی فل ہوگئی تھی اس نے نوزل نکالی۔ میں نے میٹر دیکھا اور اسے ایک بڑا نوٹ دیا اس نے کہا۔ ''آپ کو چینج

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لا کر دیتا ہوں۔''

وہ نوٹ لے کر آفس کی طرف چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں ٹہلتا ہوا ری فریش منٹ شاپ کی طرف گیا۔ حیرت انگیز طور پر وہاں بھی کوئی نظر نہیں آیا۔ ممکن ہے میں عام آدمی ہوتا تو اس چیز کو نظر انداز کر دیتا اور میرا ذہن کسی شک کی طرف نہیں جاتا لیکن میرے تو دن رات غیر معمولی حالات میں گزرتے تھے اور معمول سے ہٹی کوئی چیز بھی مجھے فوراً متوجہ کرتی تھی۔ سفیر ابھی واپس نہیں آیا تھا میں شاپ میں داخل ہوا۔ مکمل گلاس وال کی وجہ سے باہر سے اندر کا منظر نظر آتا تھا لیکن بہت ساری چیزیں ڈسپلے میں رکھی تھیں اس لیے سب کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ کاؤنٹر خالی تھا۔

''کوئی ہے؟'' میں نے آواز دی اور پھر موبائل نکال کر سفیر کو کال کی۔ اس نے کئی بیل جانے کے بعد کال ریسیو کی۔ ''اوہ بھائی کہاں ہے کیا کوئی بڑا مسئلہ ہو گیا ہے؟''

''ہاں نہیں کوئی مسئلہ نہیں سب ٹھیک ہے۔'' سفیر نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔

''تو بس آجاؤ۔'' میں نے کہا اور پستول نکال لیا۔

''میں آرہا ہوں تم گاڑی اسٹارٹ رکھو۔'' سفیر بولا اور میں تیزی سے باہر آیا۔ لڑکا ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ میں گاڑی میں آ گیا اور اس کا انتظار کرنے لگا۔ وہ کوئی ایک منٹ بعد نمودار ہوا اور میری طرف آنے لگا۔ میں نے دیکھا اس کا ایک ہاتھ پیچھے کی طرف تھا۔ اس نے کھڑکی کے پاس آ کر رقم والا ہاتھ سامنے کیا۔

''یہ لو صاحب بقیہ۔''

میں نے رقم لیتے ہوئے اس کے دائیں شانے پر نظر رکھی تھی اور جیسے ہی وہ حرکت میں آیا میں نے دروازہ کھولتے ہوئے اس کو مارا۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے جا گرا اور اس سے پہلے کہ وہ اٹھتا میں نے باہر نکل کر اس کے ہاتھ میں دبا ہوا پستول چھین لیا۔ ساتھ ہی اس کا بازو مروڑتے ہوئے اسے اپنے سامنے ڈھال بنا لیا۔ لڑکا تلملایا لیکن میری گرفت سے نہیں نکل سکا۔ میں نے اس کی گردن بازو میں لے لی اور اسے دباتے ہوئے پوچھا۔

''اندر کیا ہو رہا ہے کون ہو تم لوگ؟''

''چھوڑ مجھے۔'' اس نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔ ''ورنہ تیرا ساتھی نہیں بچے گا۔''

میرا شک درست نکلا ان لوگوں نے سفیر کو یرغمال بنا لیا تھا۔ میں نے اس کی گردن کو جھٹکا دیا۔ ''تم لوگ ڈاکا مارنے آئے ہو؟ کتنے ساتھی ہیں تمہارے؟''

اس نے جواب نہیں دیا تو میں نے گرفت سخت کر دی۔ اس کی سانس رک رہی تھی اور وہ ہوا کے لیے مچل رہا تھا۔ میں اسے کھینچ کر گاڑی کے پیچھے لے آیا۔ یہاں میں اندر موجود افراد کے نشانے سے محفوظ تھا۔ جب اس کا دم تقریباً نکلنے والا ہو گیا تو میں نے گرفت ڈھیلی کی اور اپنا سوال دہرایا۔ اس بار اس نے جواب دیا۔ ''اندر میرے ...تین ساتھی...اور ہیں۔''

''پیٹرول پمپ والے کہاں ہیں؟''

''انہیں باتھ روم میں بند کر دیا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

تو یہ وجہ تھی انہیں سفیر کو بھی ہینڈز اپ کرنا پڑا تھا کیونکہ وہ واش روم کی طرف گیا تھا اور اس نے یقیناً قیدیوں کو دیکھ لیا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''اپنے ساتھیوں سے کہو شرافت سے ہتھیار پھینک کر باہر آجائیں میں وعدہ کرتا ہوں تمہیں فرار کا موقع دوں گا۔''

''وہ نہیں مانیں گے۔'' اس کا سانس بہتر ہو گیا تھا۔ ''وہ تمہارے ساتھی کو مار دیں گے۔''

اسی لمحے آفس کا دروازہ کھلا اور دو افراد سفیر کو ڈھال بنا کر باہر آئے اور انہوں نے للکار کر مجھ سے کہا۔ ''خبردار چھوڑ دے اسے ورنہ تیرے ساتھی کو مار دوں گا۔''

''یہ میرا ساتھی نہیں ملازم ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اگر تم شرافت سے یہاں سے فرار نہ ہوئے تو میں اسے مار دوں گا۔ یہاں ایک فائر ہوا تو پولیس آجائے گی۔''

''اندر دو ٹلے بھی بند ہیں۔'' ان میں سے ایک استہزائیہ انداز میں بولا۔ اس نے سفیر کی گردن سے شاٹ گن لگا رکھی تھی۔ ''چھوڑ اسے ورنہ اس کا جھٹکا کر دوں گا۔''

وہ سکہ بند اور چھٹے ہوئے مجرم لگ رہے تھے اور بولنے کے انداز سے لگتا تھا مرنا مارنا اس کے لیے کوئی نئی چیز نہیں تھی۔ اپنا پستول میں پہلے ہی جیکٹ میں رکھ چکا تھا اور میرے ہاتھ میں لڑکے کا پستول تھا میں نے گہری سانس لی اور پستول پھینک دیا۔ شاٹ گن والے نے لڑکے کی طرف اشارہ کیا۔ ''اسے بھی چھوڑ دے۔''

میں نے لڑکے کو دھکا دیا۔ ''مجھے اس کا کیا کرنا ہے۔''

جیسے ہی میں سامنے آیا دوسرے نے مجھ پر ایک رائفل تان لی۔ ''چل اندر۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں آگے بڑھا، وہ مجھے اور سفیر کو اندر لے آئے۔ اندر ایک آدمی اور تھا اور اس نے دونسبتاً معقول نظر آنے والے افراد پر گن تان رکھی تھی۔ لڑکا اب سنبھل گیا تھا اور سخت مشتعل تھا۔ وہ گالیاں دے رہا تھا۔ میں نے شاٹ گن والے سے کہا۔ ''اسے چپ کراؤ۔''

''اوئے چپ کر جا۔'' شاٹ گن والے نے لڑکے سے کہا۔ ''پہلے ان سے نمٹ لیں پھر اسے بھی دیکھ لیں گے۔''

''چاند جی۔'' وہاں پہلے سے موجود مسلح فرد نے دونوں میں سے ایک آدمی سے کہا۔ ''شرافت سے تجوری کھول دے ورنہ تیرا سر کھول دوں گا۔''

''میں سچ کہہ رہا ہوں۔'' اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ''اس تجوری کو صرف مالک کھول سکتا ہے میں منیجر ہوں یہاں پر۔''

''بکواس نہ کر ہمیں پتا ہے تو منیجر بنتا ہے لیکن اس پیٹرول پمپ کا اصل مالک تو ہی ہے۔'' مسلح آدمی نے کہتے ہوئے اچانک منیجر کے پاؤں پر گولی ماری۔ اس کی دہاڑ فائر کی آواز میں دب گئی تھی۔ وہ پاؤں پکڑ کر دوہرا ہو گیا تھا۔ مسلح آدمی منیجر کی طرف جھکا۔ ''پتا چلا ایک گولی کی تکلیف کیسی ہوتی ہے جلدی بول ورنہ دوسرے پاؤں میں بھی گولی مارتا ہوں۔''

دوسرے آدمی کی حالت خراب ہو گئی تھی۔ اس نے گھگھیائے انداز میں منیجر سے کہا۔ ''سر خدا کے لیے بتا دیں یہ لوگ بہت ظالم ہیں۔''

''لیکن منیجر حوصلے والا آدمی تھا اس نے اپنے ساتھی سے کہا۔ ''جب مجھے معلوم ہی نہیں ہے تو بتاؤں کیا؟''

''یہ اس طرح نہیں مانے گا۔'' مسلح آدمی نے پیچھے ہٹ کر رائفل سیدھی کی، میں سمجھا کہ وہ منیجر کے دوسرے پاؤں میں گولی مارنے جا رہا تھا لیکن اس نے اچانک ہی دوسرے آدمی کو گولی مار دی۔ گولی اس کے سینے میں عین دل کے مقام پر لگی تھی اور وہ تڑپ کر چند لمحے میں مر گیا۔ میں اور سفیر دم بہ خود رہ گئے تھے۔ ہم نے سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ ڈاکو اتنے سفاک ثابت ہوں گے۔ منیجر تڑپ گیا تھا۔ وہ اپنے ساتھی پر جھکتے ہوئے چلایا۔

''کریم... یہ کیا کیا ظالموں؟'' وہ اسے اُٹھانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن وہ دم توڑ چکا تھا اور جب منیجر نے یہ بات محسوس کی تو وہ دھاڑیں مار کر رونے لگا۔ ''یہ چار چھوٹے بچوں کا باپ تھا۔''

گولی مارنے والے نے منیجر کو لات ماری۔ ''بکواس نہ کر بچوں کی اولاد، اگر تو بھی اس کی طرح مرنا نہیں چاہتا ہے تو تجوری کھول دے۔''

لڑکے کے پاس اسلحہ نہیں تھا اس کا پستول بھی دوسرے آدمی نے لے لیا تھا۔ لیکن باقی تین افراد رائفلوں سے مسلح تھے۔ ایک کے پاس شاٹ گن تھی اور باقی دو کے پاس بارہ بور کی رائفلیں تھیں اور وہ ہماری طرف سے پوری طرح چوکنا تھے۔ اس آدمی کو مرتے دیکھ کر میرا خون کھولنے لگا تھا۔ لیکن فی الحال میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ منیجر نے گولی مارنے والے کی طرف دیکھا۔ ''تم بے شک مجھے مار دو لیکن میں تجوری نہیں کھول سکتا۔''

یہ چاروں ڈاکو خاصی دیر سے اس پیٹرول پمپ پر موجود تھے اور وہ خوف زدہ بھی لگ رہے تھے۔ وہ اب جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتے تھے۔ گولی مارنے والے نے اب رائفل کا رخ سفیر کی طرف کر دیا۔ ''اگر نہیں بتائے گا تو میں اسے مار دوں گا۔ اس کے بعد اس کی باری آئے گی۔'' اس نے میری طرف اشارہ کیا۔ ''اور پھر تیرے پیٹرول پمپ کے ایک ایک آدمی کو مار دوں گا۔ بول تجوری میں رکھا مال بچائے گا یا ان لوگوں کو؟''

''تم پاگل ہو۔'' منیجر نے خوف زدہ ہو کر کہا۔ ''ایک آدمی کو مار چکے ہو اور سب کو مار دو گے۔''

سفیر کی طرف رائفل کا رُخ دیکھ کر میرا خون خشک ہو گیا تھا۔ رائفل بردار درندہ صفت آدمی تھا اور اس نے اچانک ایک آدمی کو مار کر ثابت کر دیا تھا کہ وہ کسی کو سکون سے قتل کر سکتا ہے۔ ایسے لوگ بہت خطرناک ہوتے ہیں۔ نفسیاتی مریض ہوتے ہیں۔ میرا ہاتھ اپنی جیکٹ میں رکھے پستول کی طرف جا رہا تھا لیکن یہ کام میں اتنی آہستگی سے کر رہا تھا کہ کسی کو احساس نہ ہو۔ سفیر نے اس سے کہا۔ ''اوہ بھائی میرا کیا قصور ہے۔''

''تیرا قصور ہے۔'' رائفل والے نے دانت نکوس کر کہا۔ ''اس کے پیٹرول پمپ پر پیٹرول بھروانے آیا ہے تو قصور تو ہوا نا۔''

''تم پاگل ہو۔'' سفیر نے اس سے کہا اور منیجر کو مشورہ دیا۔ ''اسے تجوری کھول دو ورنہ یہ واقعی سب کو مار دے گا۔''

''میرے پاس واقعی تجوری کا نمبر نہیں ہے ورنہ میں ان کو دے دیتا۔''

''لگتا ہے تو یوں نہیں مانے گا۔'' رائفل والے نے منیجر سے کہا۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ سفیر کو گولی مارنے والا ہے۔ اس کے دونوں ساتھی بھی اس کی اور سفیر کی طرف متوجہ تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ اب مجھے حرکت میں آجانا چاہیے۔ ذرا سی تاخیر ناقابلِ تلافی نقصان کا سبب بن جائے گی۔ میرا ہاتھ جیکٹ کی جیب سے چند انچ دور تھا اور انہوں نے سوچا بھی نہیں ہوگا کہ میں مسلح ہو سکتا ہوں۔ میں شاید ہی کبھی اتنی تیزی سے حرکت کی ہو جتنی اس وقت کی تھی۔ میں سلپ ہوا اور زمین پر گرنے سے پہلے پستول نکال کر رائفل والے پر گولی چلا چکا تھا گولی اس کے سینے پر لگی اور وہ پلٹ کر پیچھے گرا میری حرکت کی وجہ سے رائفل والے کی توجہ میری طرف ہو گئی تھی اور اس نے سفیر پر گولی نہیں چلائی تھی۔

اس کے دونوں مسلح ساتھی ایک لمحے کے لیے حیرت سے مفلوج ہو گئے تھے اور اسی مہلت کا فائدہ اُٹھا کر میں نے انہیں شوٹ کر دیا۔ انہیں رعایت دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ میرے اور سفیر کے بالکل پاس تھے اور انہیں گولی چلانے کا موقع مل جاتا۔ اتنے قریب سے نشانہ خطا جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ان میں سے ایک کو گولی سر میں لگی اور وہ فوراً مر گیا جب کہ دوسرا اپنے گردن میں ہونے والے سوراخ سے خون روکنے کی کوشش کرتے ہوئے ڈھیر ہو گیا۔ سفیر نے بھی اپنا پستول نکال لیا تھا اور رائفل والے کو ایک گولی اور ماری۔ وہ زندہ تھا اور رائفل اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ڈاکوؤں کا ساتھی لڑکا دہشت کے عالم میں ساکت کھڑا تھا پھر اس نے اچانک حرکت کی اور تیزی سے آفس سے باہر نکل گیا۔ سفیر اس کے پیچھے لپکا تھا لیکن میں نے اسے روک دیا۔

''اسے چھوڑ یہاں سے نکلنے کی فکر کر پولیس آنے والی ہوگی۔''

''منیجر یا مالک اپنی ٹانگ پکڑے ہمیں اُلجھن سے دیکھ رہا تھا میں نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو ہم پولیس کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتے اس لیے تم پولیس کو کہانی سناؤ گے کہ ڈاکوؤں کا آپس میں جھگڑا ہو گیا تھا اور انہوں نے ایک دوسرے پر گولیاں چلائیں۔ یہ مر گئے اور باقی بچنے والے بھاگ گئے۔ میری بات سمجھ رہے ہو؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''تم ہمارے محسن ہو، میں پولیس سے یہی کہوں گا۔''

''تمہارے پاس موبائل ہے؟''

''اس نے چھین لیا تھا۔'' منیجر نے رائفل والے کی طرف اشارہ کیا تو میں نے اس کے لباس کی تلاشی اور موبائل برآمد کر کے منیجر کی طرف بڑھا دیا۔

''پولیس اور ایمبولینس کے لیے کال کرو۔''

سفیر پہلے ہی باہر نکل گیا تھا۔ میں باہر جانے لگا تو منیجر نے ایک بار پھر شکریہ ادا کیا۔ ڈاکوؤں کا ساتھی لڑکا فرار ہو گیا تھا۔ میں باہر نکلا تو سفیر نے گاڑی اسٹارٹ کر رکھی تھی اور میرا انتظار کر رہا تھا میرے بیٹھتے ہی چلا دی۔ ''کیا اسے تسلی دینے لگا تھا؟''

''نہیں اسے موبائل دے رہا تھا تاکہ وہ پولیس کو کال کر سکے۔''

''کیا قسمت ہے اپنی جہاں جاؤ کوئی دشمن جاں یا جانِ کا دشمن مل جاتا ہے۔''

''بس یار کیا کہہ سکتے ہیں یہ بھی خدا کا احسان ہے کہ وہ ہمیں محفوظ رکھتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''رفتار ذرا کم کرو یہ اسلام آباد کا علاقہ ہے کہیں پولیس نہ پیچھے آجائے۔''

سفیر اعصاب زدہ ہو رہا تھا اس نے گہری سانس لی اور رفتار کم کر دی۔ یہ انسانی خون دیکھنے کا فطری ردعمل تھا۔ خود میرے اعصاب پر بھی بوجھ آ رہا تھا۔ حالانکہ جن کو مارا تھا وہ انسانی صورت میں درندے تھے۔ انہوں نے ایک عام بے گناہ شخص کو بلاوجہ گولی مار کر ہلاک کر دیا تھا۔ ایک کو زخمی کیا تھا اور باقی لوگوں کے لیے بھی ان کے عزائم قاتلانہ تھے۔ اس کے باوجود ہمیں اچھا محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے سفیر سے کہا۔ ''کسی سے اس کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جتنی بار ذکر کریں گے ہمارے اعصاب پر اتنا ہی بوجھ آئے گا۔''

سفیر نے سر ہلایا۔ ''میں نیند کی دوا لے کر سوؤں گا مجھے اس طرح سے نیند نہیں آئے گی۔''

''یہ بہتر رہے گا۔''

کچھ دیر بعد ہم ہائی وے پر آ گئے تھے۔ اسی اثنا میں وسیم کی کال آ گئی۔ ''کہاں ہیں آپ لوگ؟''

''اسے ڈراپ کر کے ذرا پرانی یادیں تازہ کرنے چلے گئے تھے۔'' میں نے لہجے کو شگفتہ بنانے کی کوشش کی۔ ''راستے میں ہیں دس منٹ میں پہنچ جائیں گے۔''

''اوہ شکر ہے یہاں ٹی وی پر دکھا رہے ہیں کسی پیٹرول پمپ پر زبردست فائرنگ ہوئی ہے اور چار پانچ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بندے مرے ہیں۔ ابھی پولیس اور ایمبولینس آ رہی ہے۔"

میں نے وسیم کو تسلی دے کر فون بند کیا اور سفیر سے کہا۔ "بھائی میڈیا بہت تیز ہو گیا ہے۔ ہم سے پہلے ہماری خبر گھر پہنچ جاتی ہے۔"

"دیکھتے ہیں منیجر ہمارے مطلب کا بیان دیتا ہے یا نہیں۔"

جب ہم گھر پہنچے تو ٹی وی پر لائیو کوریج آ رہی تھی۔ زخمی منیجر کو ایمبولینس میں منتقل کیا جا رہا تھا اور رپورٹرز نے ایک پولیس افسر کو گھیر رکھا تھا وہ بیان دے رہا تھا۔ وسیم اور بیتو دیکھ رہے تھے۔ بیتو ہمیں دیکھ کر چہکا۔ "شوبی شکر ہے آپ ادھر نہیں تھا ورنہ ہم سمجھا کہ آپ بھی اس مارا ماری میں شامل ہے۔"

"یار ہوا کیا ہے؟" میں بھی ٹی وی کے سامنے بیٹھ گیا۔

وسیم نے بتایا۔ "ایک پیٹرول پمپ پر چھ ڈاکو آئے تھے۔ انہوں نے سارے عملے کو یرغمال بنا کر بند کر دیا اور لوٹ مار کرنے لگے اس دوران میں انہوں نے گولی مار کر پیٹرول پمپ کے کیشیر کو ہلاک کر دیا اور منیجر کو زخمی کر دیا۔ بعد میں ڈاکوؤں میں لوٹ کے مال پر آپس میں لڑائی ہوئی اور انہوں نے ایک دوسرے پر فائرنگ کر دی تین ہلاک ہو گئے اور تین فرار ہونے میں کامیاب رہے۔"

"ڈاکو اسی قابل تھے، بے چارہ کیشیر مفت میں مارا گیا۔" میں نے افسوس کیا۔ خبر ختم ہوئی تو وسیم اور بیتو ہماری طرف متوجہ ہوئے۔ میں نے ان کو شبانہ کے بارے میں بتایا۔ "وسیم اب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ اس کوٹھی میں نادرے اس لیے اس کی زیادہ نگرانی کی ضرورت ہے۔"

"میں نے مزید دو آدمی لگا دیئے ہیں، وہ کوشش کر رہے ہیں کہ اس کوٹھی کے آس پاس کوئی ٹھکانہ مل جائے۔ جہاں سے اس کوٹھی پر مستقل نظر رکھی جا سکے۔" وسیم نے کہا۔

"ایک اہم خبر یہ ہے کہ میری ڈیوڈ شا سے بات ہوئی ہے۔" میں نے کہا تو وسیم اور بیتو میری طرف متوجہ ہو گئے۔ وسیم نے پوچھا۔

"کیا بات ہوئی؟"

میں نے اسے مارشل اور مرشد کے گٹھ جوڑ کے بارے میں بتایا۔ "مجھے خاصی حد تک یقین ہے ڈیوڈ شا اصل بات جان گیا ہے۔"

"اس کا فائدہ؟" وسیم نے کسی قدر مایوسی سے کہا۔ "میرا نہیں خیال کہ وہ مرشد جیسے کام کے مہرے سے اپنے تعلقات خراب کرے گا۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو شاید وہ ابھی تعلقات خراب نہ کرے لیکن مجھے یقین ہے مستقبل میں ڈیوڈ شا اسے کوئی نہ کوئی سزا ضرور دے گا۔ میں نے اسے اپنے تعاون کا چارہ بھی ڈال دیا ہے۔"

"وسیم ٹھیک کہہ رہا ہے یار ڈیوڈ شا اور مرشد ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔" سفیر نے وسیم کی تائید کی۔ "اگر ایسا ہوتا تو وہ کال پر اپنے شکاری کتے کیوں بھیجتا؟"

اس بار وسیم اور بیتو چونک گئے اور ان کو بتانا پڑا کہ ہمارے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا تھا۔ وسیم تشویش زدہ ہو گیا۔ "شہباز صاحب یہ بات ثابت کرتی ہے کہ ہمارے دشمن ہمارا سراغ لگانے کے لیے جدید ترین ذرائع استعمال کر رہے ہیں۔ اس صورت میں بہتر ہے کہ ہم رابطے کے لیے موبائل کا استعمال بہت محدود کر دیں۔ صرف انتہائی ناگزیر صورت میں استعمال کیا جائے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" میں نے کہا۔ "لیکن میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کس طرح بالکل درست جگہ پہنچ گئے۔"

"آپ کو پہلے بھی تجربہ ہو چکا ہے جب فتح خان ڈیوڈ شا کے ساتھ تھا اور اس نے آپ کو موبائل کی مدد سے تلاش کر لیا تھا پھر ابھی مرشد کے آدمیوں نے یہی کام کیا اور اب ڈیوڈ شا بھی کر رہا ہے۔ آج کل ایسی پورٹیبل ڈیوائسس عام ہو گئی ہیں جو ایک مخصوص فریکوئنسی پکڑ کر اس کی سمت اور فاصلہ بتا سکتی ہیں۔ پہلے یہ کام صرف موبائل کمپنیاں کر سکتی تھیں اب ہر وہ فرد کر سکتا ہے جس کے پاس ایسی کوئی ڈیوائس ہو۔ یہ فریکوئنسی بھی خود پکڑ لیتی ہے بس اسے موبائل کا ایم آئی نمبر دینا ہوتا ہے۔" وسیم نے تفصیل سے بتایا۔ "یہی وجہ ہے کہ اب وہ لوگ جو ملکوں اور حکومتوں سے چھپتے ہیں وہ موبائل استعمال کرنے سے قطعی گریز کرتے ہیں۔"

"ہمیں بھی ایسا ہی کرنا چاہیے۔" سفیر نے کہا۔ "ویسے آج کل وائرلیس فون عام ہو گئے ہیں۔"

"یہ بھی نیٹ ورک کے تحت کام کرتے ہیں اور ان کا سراغ لگانا بھی آسان ہے۔" وسیم نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں نے کہا نا اس خطرے سے بچنے کا واحد طریقہ موبائل کے استعمال سے پرہیز ہے۔"

"جیسے بچے پیدا نہ کرنے کا واحد طریقہ شادی سے گریز ہے۔" سفیر نے مثال پیش کی۔ وسیم ہنسا۔

"اب شادی سے کوئی فرق نہیں پڑتا، ہمارے آقا امریکہ میں چالیس فیصد بچے بغیر شادی کے پیدا ہو جاتے ہیں اور میں ممکن ہے کوئی ایسا ہی بچہ مستقبل میں امریکہ کا صدر بن جائے۔"

"بھائی ہمارے ہاں بھی اب ایسے بچوں کی کمی نہیں ہے۔" سفیر نے ٹھنڈی سانس لی۔ "ہائی سوسائٹی میں اب کوئی یقین سے نہیں کہہ سکتا ہے کہ وہ جسے باپ کہہ رہا ہے وہی اس کا باپ بھی ہے یا نہیں۔"

ہم معاشرے کی خرابیوں پر بات کرنے لگے اور یہ گفتگو اس وقت تک جاری رہی جب تک سب نے جماہیاں لینا نہیں شروع کر دیں۔ ایاز پہلے ہی سونے جا چکا تھا۔ بیتو حسب معمول سب سے پہلے سونے کے لیے اٹھ گیا میں نے رات کے پہرے کے بارے میں پوچھا تو وسیم نے کہا۔ "صابر دن بھر آرام کرتا رہا ہے اب وہ رات بھر پہرہ دے گا۔"

"یعنی ہم سب سوئیں گے۔" سفیر نے خوش ہو کر کہا۔

بیتو کے جانے کے بعد وسیم نے اچانک کہا۔ "شہباز صاحب کوئی مسئلہ ہوا ہے اور آپ دونوں نے بتایا نہیں۔"

میں نے سفیر کی طرف دیکھا اور سر ہلایا۔ "لیکن تمہیں کیسے پتا چلا؟"

"آپ اور سفیر کا انداز دیکھ کر، دونوں کچھ پریشان اور معمول سے ہٹے ہوئے لگ رہے تھے۔"

میں نے گہری سانس لی۔ "تمہارا اندازہ درست ہے۔ پیٹرول پمپ پر ہونے والی واردات میں ہم بھی شامل ہو گئے تھے۔ تین ڈاکو ہمارے ہاتھ سے مارے گئے ہیں۔" میں نے کہا اور وسیم کو تفصیل سے اس واقعے کے بارے میں بتایا۔ اس نے شکوہ کیا۔

"مجھے کیوں نہیں بتایا؟"

"یار اس واقعے کے بعد ہم دونوں کی حالت عجیب سی ہو گئی تھی۔ سچی بات یہ ہے کہ اس بارے میں بات کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا اب تمہیں یا کسی کو بتاتے تو بار بار سب دُہرانا پڑتا اور میں اس بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔"

وسیم نے سر ہلایا۔ "میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں۔ اس طرح کسی انسان کی جان لینا دوسرے انسان کے لیے آسان نہیں ہوتا ہے درندوں کی بات اور ہے۔ وہ قتل عام کر کے بھی پُرسکون اور معمول کے مطابق رہتے ہیں۔"

"یہی تو مسئلہ ہے ہم درندے نہیں ہیں۔" میں نے سرد آہ بھری۔ "ورنہ مرشد یا اس جیسے لوگوں سے نمٹنا کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ بس ہمیں ان کی سطح پر آنا پڑے گا۔"

"یہ کام ہم سے ہو نہیں سکتا۔" سفیر کھڑا ہو گیا۔ "اچھا یاروں میں تو چلا سونے اب صبح ملاقات ہوگی۔"

سفیر کے جانے کے بعد کچھ دیر میں اور وسیم اپنے آئندہ کے لائحہ عمل پر بات کرتے رہے خاص طور سے شہلا کی مدد سے بینک لاکر تک رسائی کے بارے میں غور کرتے رہے۔ ہم جلد از جلد اس کام کو نمٹا لینا چاہتے تھے۔ اگرچہ اس کا ہماری اصل جدوجہد سے کوئی تعلق نہیں تھا لیکن یہ ہماری ایک ذمے داری تھی جسے بہرصورت پورا کرنا تھا۔ رات بہت ہو چکی تھی اور شہلا یقیناً سو چکی تھی لیکن اصل بات یہ تھی کہ وہ جس طرح سوتی تھی ہم میں سے کوئی اس کے کمرے میں جانے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے شہلا سے بات کرنے کا معاملہ صبح تک کے لیے ملتوی کر دیا گیا۔ ہم سونے کے لیے اٹھ گئے۔ سفیر تو نیند کی دوا لے کر مزے سے سو گیا تھا لیکن مجھے بہت مشکل سے اور بہت دیر سے نیند آئی تھی۔ خواب میں بھی مجھے وہی ڈکیت اور پیٹرول پمپ کا کیشیر دکھائی دیا تھا۔ اچٹتی ہوئی نیند تھی اس لیے جب صبح جاگا تو سر بھاری ہو رہا تھا اور جسم یوں ٹوٹ رہا تھا جیسے ہلکا سا بخار ہو۔ بستر سے اُٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ بیتو ناشتا بنا رہا تھا یعنی انڈے اُبال رہا تھا اور ڈبل روٹی سینک لی تھی۔ اس کے ساتھ چائے تھی۔ وہ کمرے میں آیا۔

"کیا بات ہے شوبی آپ ابھی تک اُٹھا نہیں۔" اس نے پردے ہٹاتے ہوئے کہا۔ فوراً ہی کمرہ سورج کی روشنی سے بھر گیا تھا۔

"نہیں یار شاید طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا تو شوبی نے فوراً میرا ماتھا چیک کیا اور تشویش سے بولا۔

"آپ کو تو بخار ہو رہا ہے۔"

"کوئی نہیں یار ہلکی سی حرارت ہے۔" میں اُٹھ بیٹھا۔ "ابھی ناشتا کر کے کوئی دوا لوں گا تو ٹھیک ہو جائے گی۔"

"آپ جلدی سے آجاؤ ناشتا تیار ہے، ہم سفیر بھائی کو اُٹھاتا ہے۔" بیتو نے باہر جاتے ہوئے کہا۔ جب تک میں واش روم سے فارغ ہو کر آیا اس نے سفیر کو کسی نہ کسی طرح اُٹھا دیا تھا مجھے دیکھ کر وہ بیتو پر چڑھ دوڑا۔

"یہ ٹھیک ٹھاک پھر رہا ہے اور تم نے کہا کہ اس کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

طبیعت بہت خراب ہے۔'' وہ یوں اُٹھائے جانے پر سخت جھنجلایا ہوا تھا۔

''ہاں طبیعت خراب ہے۔'' بیتو نے اصرار کیا۔ ''دیکھو نا بخار ہے۔''

''اوہ بھائی معمولی بخار ہے۔'' میں نے کہا۔ ''رات کو ٹھیک سے نیند نہیں آئی تھی۔''

''آپ ناشتا کر کے اور دوا لے کر سو جاؤ۔''

''میں تبھی سونے جا رہا ہوں۔'' سفیر غرایا۔ ''اب مجھے بارہ بجے سے پہلے مت اُٹھانا۔''

''ہم بارہ بجے بھی نہیں اُٹھائے گا۔'' بیتو خفا ہو گیا۔ ''ناشتا بھی خود بنانا اپنے لیے۔''

''چلو چھوڑو۔'' میں نے اس کا شانہ تھپکا۔ ''مجھے ناشتا دو اور وسیم کہاں ہے؟''

''وہ تو صبح سویرے چلا گیا۔'' بیتو نے بتایا۔ ''ایاز بھائی بھی ان کے ساتھ ہے انہوں نے گاڑی کا کچھ کام کرنا ہے۔''

وسیم اور ایاز یقیناً وین کے سلسلے میں گئے تھے۔ میں نے ناشتا کیا میرا ڈبل روٹی کھانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا اس لیے بیتو کے اصرار پر دو ابلے انڈے لے کر میں نے دو عدد پین کلر لے لیں۔ بیتو نے شہلا کا ناشتا بھی بنا دیا تھا لیکن اس کے کمرے میں جانے سے صاف انکار کر دیا۔ ''ہم اس بے ہودہ عورت کے کمرے میں نہیں جائے گا۔ شرم اس کے پاس سے بھی نہیں گزرا ہے۔''

''لاؤ یار میں لے جاتا ہوں۔'' میں نے کہا تو بیتو نے ٹرے کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے شہلا کا ناشتا اُٹھایا اور اپنی چائے لے کر اس کے کمرے میں آیا تو خلاف توقع وہ جاگ کر ایکسر سائز میں مصروف نظر آئی۔ اس نے سردی کی پروا کیے بغیر صرف ٹی شرٹ اور اوپنی لیکن پہن رکھا تھا اور یقیناً خاصی دیر سے ایکسر سائز کر رہی تھی کیونکہ اس کا چہرہ سرخ اور ہلکے پسینے سے نم تھا۔ میں نے ٹرے بستر پر رکھ دی۔

''تو یہ ہے تمہاری فٹنس کا راز۔''

اس نے شوخی سے دیکھا۔ ''صرف یہی نہیں میں باقاعدگی سے سوئمنگ بھی کرتی ہوں۔ سچی بات ہے تمہاری قید میں سوئمنگ کو مس کر رہی ہوں ورنہ ہفتے میں چار دن دو گھنٹے کے لیے پول جاتی ہوں۔''

''کوئی کلب جوائن کیا ہوا ہے؟''

''نہیں۔'' اس نے منہ بنایا۔ ''وہاں صرف بور خواتین ہوتی ہیں جو پانی میں اُتر کر بھی دوسروں کی غیبتیں ہی کر رہی ہوتی ہیں میرے پاس ایک فائیو اسٹار ہوٹل کی پول ممبر شپ ہے۔''

''جہاں مرد زیادہ ہوں گے تمہیں دیکھنے کے لیے۔'' میں نے طنز کیا۔

''ہاں تو اس میں کیا بُرائی ہے۔'' اس نے ڈھٹائی سے کہا۔ ''کسی کے دیکھنے سے میں گھس تھوڑی جاؤں گی۔''

ایکسر سائز کر کے اس نے بیگ سے کپڑے نکالے۔ ''میں بس دس منٹ میں شاور لے کر آتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے میں پھر آجاؤں گا۔'' میں نے باہر کا رخ کرتے ہوئے کہا اور شہلا کے کمرے سے نکل کر مرشد کے آدمیوں والے کمرے میں آیا۔ تین دن میں فاقے، زخموں اور مار نے ان کے سارے کس بل نکال دیے تھے اور مجھے دیکھتے ہی وہ گڑگڑانے لگے تھے۔ جمیل نے تقریباً روتے ہوئے کہا۔

''خدا کے لیے ہمیں چھوڑ دو ہم سب بتا چکے ہیں۔''

''اب ہم اور کچھ نہیں جانتے۔'' خرم بولا۔

''تم لوگ بہت کچھ جانتے ہو۔'' میں نے انہیں گھورا۔ ''مجھے معلوم ہے تم جیسے چھٹے ہوئے لوگ اتنی آسانی سے اقرار نہیں کریں گے۔ لیکن ہمیں بھی کوئی جلدی نہیں ہے ابھی تو صرف تین دن ہوئے ہیں۔ ایک ہفتہ یونہی گزرے گا اور بھوک سچ معنوں میں تمہارے وجود کو کھرچے گی تب تم زبان کھولو گے۔''

''میرا زخم خراب ہو رہا ہے۔'' خرم نے اپنی ٹانگ کی طرف اشارہ کیا۔ ''اگر یہ زیادہ خراب ہو گیا تو میں اسی طرح مر جاؤں گا۔''

''تو کیا ہوگا، اگر تم مر جاؤ گے تو مرشد کے پاس آدمیوں کی کوئی کمی نہیں ہے اسے دوسرے مل جائیں گے اور رہے تمہارے گھر والے تو ماں باپ بہن بھائی چند دن رو کر صبر کر لیں گے۔ اگر بیوی بچے ہیں تو بیوی دوسری شادی کر لے گی یا محنت مزدوری کر کے بچوں کو پال لے گی۔ بہ شرط اسے حرام کھانے کی عادت نہ پڑ گئی ہو اس صورت میں وہ آسانی سے رقم کمانے کا سوچے گی اور تم اچھی طرح جانتے ہو کہ عورت اگر جوان اور خوب صورت ہو تو کس طرح آسانی سے رقم کما سکتی ہے۔'' میں نے اسے ذہنی اذیت دینے کے لیے کہا اور نتیجہ میری توقع کے عین مطابق نکلا تھا وہ چلانے اور مجھے گالیاں دینے لگا۔ ''بھونکتا ہے تو کتے۔''

''چلو تم دل کو تسلی دے لو۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن ذرا

اپنے جیسے ان لوگوں کے بارے میں سوچو جو کبھی مرشد کے لیے وہی سب کرتے تھے جو تم کر رہے ہو اور وہ بھی تمہاری طرح مارے گئے تھے۔ آج ان کے گھر والے کس حال میں ہیں۔ کیا تم نہیں جانتے؟ بلکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مرشد کے حکم پر تم نے ان گھروں کو مزید عذاب میں دھکیل دیا ہو۔ ان کو ان کے گھروں سے بے دخل کر دیا ہو۔ اپنے جیسے مرنے والے مرشد کے غلاموں کی بیوی، بیٹی یا بہن کو اُٹھا کر مرشد کے عشرت کدے تک پہنچا دیا ہو۔ مرشد ہی تم بھیڑیوں کا سردار ہے اور بھیڑیوں کا ایک ہی اصول ہوتا ہے اگر تمہارا ساتھی کمزور پڑے تو اسے بھی پھاڑ کھاؤ۔'' میرا لہجہ تلخ ہو گیا۔ خرم سسک سسک کر روتے ہوئے دیوار سے سر ٹکرا رہا تھا۔ میں نے جمیل کی طرف دیکھا۔ ''کیا اس کی بیوی بہت حسین ہے یا کوئی بہن بھی ہے۔''

جمیل نے ایک نظر خرم کو دیکھا اور بولا۔ ''اس کی بیٹی ہے بیوی تو مر چکی ہے۔ بیٹی پندرہ سال کی ہے۔''

خرم کی کیفیت سمجھ میں آ رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ''بیوی کیسے مری، ظاہر ہے ابھی اس کی مرنے کی عمر تو نہیں ہوگی؟''

''اس نے خودکشی کر لی تھی۔'' جمیل نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''کیوں؟''

''یہ بات کوئی نہیں جانتا، ممکن ہے یہ جانتا ہو۔'' اس نے خرم کی طرف اشارہ کیا، خرم نے نفی میں سر ہلایا۔

''میں بھی نہیں جانتا۔ اس نیک بخت نے کیوں خودکشی کی تھی۔ میں کام سے دو دن کے لیے پاک پتن شریف گیا ہوا تھا۔''

''تمہیں وہاں مرشد نے بھیجا تھا؟''

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ''تت... تمہیں کیسے پتا چلا؟''

میں نے اس کا سوال نظر انداز کر کے پوچھا۔ ''اس نے جس کام سے بھیجا ہوگا بہ ظاہر اس کی بھی کوئی اہمیت نہیں ہو گی۔''

خرم کھڑا ہو گیا۔ ''کیا... کیا کہنا چاہ رہے ہو تم؟'' اس کے انداز میں وحشت آ گئی۔ میں نے اسے دھکا دے کر دوبارہ بٹھا دیا۔

''میری بات کا جواب دو، پیچھے گھر میں تمہاری بیوی اکیلی تھی۔''

''ہاں۔'' اس نے بادل نہ خواستہ اقرار کیا۔ ''میری بیٹی اپنے چاچے کے گھر رہنے گئی تھی۔ زیبا گھر میں اکیلی تھی۔''

میں خرم کے پاس بیٹھ گیا۔ ''خرم کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ تمہاری عدم موجودگی میں کوئی تمہارے گھر آیا ہو اور تمہاری بیوی کے ساتھ زیادتی کی ہو؟''

''نہیں ایسا نہیں ہو سکتا ہے۔'' اس نے کانپ کر کہا۔

''کیوں ممکن نہیں ہے۔'' میں نے طنز کیا۔ ''جب تم اور تمہارے جیسے غلام مرشد یا اس کے کسی منظور نظر کے لیے کسی کی بہو بیٹی یا بہن کو اُٹھا لا سکتے ہیں تو کوئی تمہارے ساتھ یہی کام کیوں نہیں کر سکتا ہے۔ آخر تمہیں کس لیے دو دن کے لیے گھر سے دور بھیجا گیا تھا۔''

خرم کا چہرہ رفتہ رفتہ سرخ ہو رہا تھا۔ جمیل اسے غور سے دیکھ رہا تھا اس نے کہا۔ ''خرم اس کی باتوں میں نہ آ یہ تجھے بہکا رہا ہے۔''

''کیونکہ ایسا تمہارے ساتھ نہیں ہوا اس لیے تم کہہ سکتے ہو۔'' میں نے اس کی طرف دیکھا اور خرم سے کہا۔ ''اگر یہاں سے زندہ بچ جاؤ تو اس بارے میں جاننے کی کوشش ضرور کرنا کہ تمہاری عدم موجودگی میں زیبا کے ساتھ کیا ہوا تھا اور ممکن ہے تم واپس جاؤ تو تمہاری بیٹی....''

''نہیں.... نہیں۔'' خرم چلانے اور پھر رونے لگا تھا۔

میں نے افسوس سے اسے دیکھا۔ مرشد جیسے درندوں کا ساتھ دینے والے یہ چھوٹے درندے یہ نہیں سوچتے کہ جب بڑے درندے کو کہیں اور سے شکار نہیں ملے گا تو وہ ان کو ہی پھاڑ کھائے گا۔ میں ان کے کمرے سے نکل آیا۔ اس شور شرابے میں سفیر اُٹھ گیا تھا اور مجبوراً ٹھنڈا ناشتا کر رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔

''یہ اندر واویلا کیوں ہو رہا ہے؟''

میں نے اسے مختصراً خرم کے بارے میں بتایا۔ ''مجھے شبہ ہے مرشد یا اس کا کوئی آدمی اس کی بیوی پر بھی ہاتھ صاف کر گیا تھا اور اس عورت نے خودکشی کر لی۔''

سفیر نے سرد آہ بھری۔ ''یار مرشد کے اندر کسی انسان کا دل نہیں ہے؟ وہ اتنے زیادہ ظلم کس طرح کر لیتا ہے؟''

''تم اس کے بارے میں اپنے پیمانے سے سوچ رہے ہو۔ وہ اس طرح سوچتا ہی نہیں ہے۔ اس کے خیال میں وہ جو کرتا ہے ٹھیک کرتا ہے اور اس کا ہر کام جائز اور درست ہوتا ہے۔'' میں نے کہا اور شہلا کے کمرے کی طرف آیا وہ شاور لے کر آ چکی تھی اور اس وقت ناشتا کر رہی تھی۔ بلکہ ناشتا بھی ختم

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کر چکی تھی۔ اس نے میری طرف دیکھا۔

"خاصی دیر لگا دی تم نے۔"

"اور اب تم مزید دیر مت کرو۔" میں نے کہا۔ "میں چاہتا ہوں ایک دو دن میں لاکر کا معاملہ نمٹا لیا جائے تاکہ میں سکون سے دوسرے معاملات پر توجہ دے سکوں۔"

"میں خود بھی یہی چاہتی ہوں۔"

"تب شاہد منظور سے بات کرو۔"

"مجھے موبائل دو۔" اس نے کہا تو میں نے اپنا موبائل ایک نئی سم کے ڈال کر اس کے حوالے کر دیا۔

"کوئی غلط حرکت مت کرنا اور اسپیکر آن کر لو میں بھی تمہاری اور شاہد منظور کی گفتگو سنوں گا۔" اس نے ناگواری کے تاثر کے ساتھ اسپیکر آن کر لیا اور پھر ایک نمبر ملایا۔ بیل جانے لگی اور خاصی دیر بعد کسی نے کال ریسیو کی۔

"ہیلو۔"

"شاہد؟" شہلا نے کہا۔

"رخسانہ؟" اس نے کچھ دیر بعد بے یقینی سے کہا۔

"ہاں میں ہوں۔"

شاہد منظور کھل اٹھا تھا کم سے کم اس کی آواز سے ایسا ہی لگ رہا تھا۔ "اوہ مائی ڈیئر تم کہاں غائب ہو گئی تھیں میں مستقل تمہارے موبائل پر ٹرائی کرتا رہا۔ میں تم سے ملنے کے لیے بے تاب ہو رہا ہوں۔"

"مجھ سے ملنے کے لیے یا میرے لیے بے تاب رہے ہو۔" شہلا نے معنی خیز اور لوچ دار لہجے میں کہا۔

شاہد منظور جیسے پاگل ہو گیا تھا اس نے جذبات میں ڈوبی آواز میں کہا۔ "یہی کہہ لو جان تم سے ملنے کے لیے بے تاب ہوں۔ لیکن سنو تم مجھے شام کو کال کرنا ابھی میری بیوی گھر میں ہے۔"

میں دنگ رہ گیا تھا وہ شادی شدہ تھا اور اس کی دیدہ دلیری کا یہ عالم تھا کہ وہ ایک عورت سے اپنی ڈیوٹی کے دوران ملتا تھا۔ اس سے پہلے وہ فون بند کرتا شہلا نے اس سے کام کی بات پوچھ لی۔ "آج کل تمہاری کون سی شفٹ چل رہی ہے؟"

"رات کی۔" اس نے بتایا۔

"تب شاید میں رات کو آؤں۔" شہلا نے کہا۔

"سچ۔" وہ بے قابو ہونے لگا۔ "میں تو سوچ رہا تھا تم اب نہیں آؤ گی اور میں تمہاری قربت سے ہمیشہ کے لیے محروم رہوں۔"

"پکا نہیں ہے شام کو کال کر کے بتاؤں گی۔" شہلا نے اس کی بات کاٹ کر کہا اور کال کاٹ دی۔ میں نے اس سے موبائل لے لیا۔

"تو تم اس سے رخسانہ کے نام سے ملتی رہی ہو؟"

"ظاہر ہے میں اپنے اصل نام سے نہیں مل سکتی۔" اس نے کہا۔ "میں اپنا حلیہ بھی بدلتی ہوں۔"

"یعنی وہ تمہیں اس حلیے میں دیکھے تو پہنچان نہیں سکے گا۔"

"آسانی سے نہیں پہنچان سکے گا۔" اس نے تصحیح کی۔ "میں میک اپ مختلف انداز میں کرتی ہوں اور بالوں کا اسٹائل چینج کر لیتی ہوں۔"

"تم اس سے کتنی بار مل چکی ہو؟"

"تین بار۔" اس نے جواب دیا۔

"یہ تینوں ملاقاتیں بینک میں ہوئی ہیں؟"

"نہیں ایک بار تو میں اس سے ریستوران میں ملی تھی اور وہ مجھے ہوٹل لے گیا۔ پھر اس ملاقات میں، میں نے اس سے تمام تفصیلات لے لیں اور اسے تجویز دی کہ وہ مجھ سے اپنی نائٹ ڈیوٹی میں کیوں ملاقات نہیں کر لیتا اس کا ہوٹل کا خرچ بچ جائے گا اور اسے بیوی کو جواب بھی نہیں دینا پڑے گا کہ وہ کہاں رہا تھا۔ اسے یہ تجویز اچھی لگی اس کے بعد ہماری دو ملاقاتیں بینک میں ہوئیں۔"

"کیا گارڈز کو اندازہ نہیں ہے کہ تم کیوں وہاں جاتی تھیں؟"

"کیوں نہیں ہے لیکن ان میں سے کسی نے مجھے نہیں دیکھا ہے میں عبایا میں جاتی ہوں اور میرا چہرہ تک چھپا ہوتا ہے۔ صرف شاہد نے مجھے چہرے سے دیکھا ہے۔ ویسے اس نے گارڈز سے بنا کر رکھی ہے۔ وہ ان کا سپروائزر ہے اور ان کو کچھ نہ کچھ فائدہ دیتا ہوگا جس کے بدلے وہ اپنی زبان بند رکھتے ہوں گے۔"

میں اگلا سوال کرتے ہوئے ہچکچایا۔ "شہلا کیا تمہیں یہ سب عجیب نہیں لگا۔ کوئی عورت خود کو رقم کے لیے بیچے تو طوائف کہلاتی ہے۔ تم خود کو کس درجے پر رکھتی ہو؟"

"جو تم چاہو سمجھ لو۔" اس نے لاپروائی سے کہا۔ "مجھے ایسی باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ یہ بتاؤ اب کیا پروگرام ہے وہ اس ہفتے نائٹ شفٹ میں ہے اور کل ہفتہ ہے اس لیے اس کی آخری نائٹ شفت ہوگی پھر اتوار سے اس کی جگہ کوئی اور آجائے گا۔"

"میرا خیال ہے آج ہی کام نمٹا لیا جائے۔" میں نے

کہا اور باہر آیا۔ عبداللہ کو کال کی۔ "عبداللہ مجھے چار افراد اور کچھ سامان چاہیے۔ ایک چھوٹی لیکن طاقت ور ڈرل جو دھات میں سوراخ کر سکے اور ایک سخت فولاد کاٹنے والی برقی آری اور اسے استعمال کرنے کا ماہر بھی چاہیے۔"

عبداللہ چونکا۔ "کیا آپ نے بینک میں گھسنے کا پلان بنا لیا ہے؟"

"پلان طے ہو گیا ہے۔"

"شہباز صاحب میں بھی اس میں شامل ہونا چاہ رہا ہوں۔" عبداللہ نے کہا۔ "میرے پاس ایک تجویز ہے۔"

"تب تجویز اور آدمیوں سمیت آجاؤ۔" میں نے کہا۔ پھر کال کاٹ کر وسیم کو فون کیا۔ اسے اپنے ارادے سے آگاہ کیا۔ وہ فکر مند ہو گیا۔

"شہباز صاحب یہ کچھ جلد بازی نہیں ہوگی۔ ابھی ہم نے بینک کے حفاظتی انتظامات کا خود سروے نہیں کیا ہے۔ صرف شہلا کی دی ہوئی معلومات پر اتنا بڑا قدم اُٹھانا مناسب ہوگا۔"

"ہاں کیونکہ ہم تمام انتظامات کے ساتھ جائیں گے۔ عبداللہ آرہا ہے آدمی وہ لائے گا اور یقیناً کوئی نہ کوئی بیک بھی رکھیں گے۔ تم نے کہا تھا کہ ایسی ڈیوائس تیار کر سکتے ہو جو بہ ظاہر بم جیسی لگے گی؟"

"بالکل میں نے سامان بھی لے لیا ہے۔" اس نے کہا۔ "صرف ایک گھنٹا لگے گا اسے جوڑنے میں۔"

"واپسی کب تک ہوگی؟"

"دوپہر تک آجاؤں گا۔"

بیتو میرے لیے فکر مند تھا۔ اس نے نہ جانے کس سے چکن کارن سوپ بنانا سیکھ لیا تھا اور اس وقت میرے لیے وہی بنا رہا تھا۔ فون پر بات کرنے کے لیے میں نیچے والے فلور پر آگیا تھا تاکہ شہلا کے کانوں تک اتفاقیہ بھی کچھ نہ پہنچ سکے۔ بیتو نے کہا۔ "شوبی آج یہ کام مت کرو، آپ کا طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے یار دوائی لے کر بالکل سیٹ ہو گیا ہوں۔" میں نے کہا۔ "یہ کیا بنا رہے ہو؟"

"چکن کارن سوپ۔" اس نے کہا۔ "کل صابر بہت سارا سامان لے کر آیا تھا اس میں چکن اور گوشت بھی ہے۔"

"تمہیں چکن کارن سوپ بنانا آتا ہے؟"

"دیدی سے ایک بار سیکھا تھا۔" اس نے سوپ میں کارن فلور ڈال کر چمچ گھماتے ہوئے کہا۔ "دعا کرنا اچھا بنے، آپ کا واسطے بنا رہا ہے۔"

میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے مجھے اتنے اچھے دوست دیئے ہیں کہ ان کے ہوتے ہوئے اس سے مرشد جیسے دشمن کی شکایت کرنا ناشکری لگ رہا ہے۔ کچھ دیر میں بیتو نے سوپ پیالے میں نکال کر میرے سامنے رکھا اور ساتھ میں ساسز کا سیٹ بھی رکھا۔ "اپنی مرضی سے ساسز ملا لو۔ پھر بتاؤ ہم کیسا سوپ بناتا ہے؟"

"میں نے سرکا کم رکھا اور چلی اور سویا ساس زیادہ ڈالا تھا جب پہلا چمچ لیا تو اسی سے اندازہ ہو گیا کہ سوپ بہترین ہے۔ "شاندار بیتو تم نے کمال کر دیا ہے۔" میں نے تعریف کی تو وہ خوش ہو گیا۔

"ہمارا کیا کمال ہے شوبی۔"

"نہیں یار کمال ہے تم نے پہلی بار بنایا اور اتنا اچھا بنایا ہے۔"

"ٹھیک ہے تب ہم بھی پیے گا۔" بیتو نے کہا اور اپنے لیے نکالنے لگا۔

میں نے اس کی بات پر غور کیا۔ "تو تمہارا پہلے سوپ پینے کا کوئی ارادہ نہیں تھا؟"

اس نے اپنا پیالا میز پر رکھا اور اس میں ساسز ملاتے ہوئے سادگی سے کہا۔ "آپ جانتا ہے ہم صرف مزے کا چیز کھاتا پیتا ہے۔ کم مزے کا چیز صرف مجبوری میں کھاتا پیتا ہے۔"

میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ سیانا بیتو سوپ مجھ پر ٹیسٹ کرنے کے بعد خود پینے پر آمادہ ہوا تھا لیکن اس سے اس کے خلوص میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ سوپ پیتے ہوئے میں بینک میں گھسنے کے پلان کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتا رہا۔ اس کے کچھ منفی پہلو بھی ہوں گے جو فی الحال ہماری نظروں سے اوجھل تھے۔ جیسے سفیر نے شہلا کی طرف سے ڈبل کراس کے امکان کی نشان دہی کی تھی اور ہم نے اس کا سدباب سوچ لیا تھا۔ مگر کچھ پہلو اور بھی ہو سکتے تھے۔ عمل سے پہلے پلان پر اچھی طرح غور کر لینا مناسب تھا کیونکہ اس سے پہلے ہم میں سے کسی نے اس قسم کا کوئی کام نہیں کیا تھا۔

عبداللہ کی بات سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کوئی بیک اپ پلان رکھنا چاہتا تھا تاکہ اگر بینک کے اندر جانے والے کسی مشکل میں پڑ جائیں تو دوسری ٹیم ان کی مدد کر سکے اور ان کو بہ حفاظت وہاں سے نکال سکے۔ اگر عبداللہ ایسا کوئی منصوبہ لا رہا تھا تو میں نے یہ ذمے داری اسے ہی سونپنے کا فیصلہ کیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں خود کو بینک کے اندر کے معاملات تک محدود رکھنا چاہتا تھا۔ میں وہ نقشہ لے آیا جو شہلا نے تیار کیا تھا اور اس میں بینک کے اندر کی مکمل وضاحت موجود تھی۔ یہ آرکیٹیکٹ ڈیزائن تھا جو شہلا نے نہ جانے کیسے حاصل کرلیا تھا۔ اس میں سیف روم اور لاکر روم کی مکمل وضاحت موجود تھی۔ اندر جانے کے راستوں کے بارے میں بتایا گیا تھا۔ لیکن حفاظتی انتظامات کی تفصیل نہیں تھی۔ میں نقشہ لے کر شہلا کے پاس آیا۔

''تم نے بینک کے حفاظتی انتظامات کے بارے میں مکمل بریف نہیں کیا ہے۔ صرف گارڈز کے بارے میں بتایا ہے وہ بھی ادھورا۔''

''پوچھو کیا پوچھنا چاہتے ہو؟''

میں نے نقشہ اس کے سامنے رکھا۔ ''اس میں بتاؤ اندر گارڈز کہاں ہوتے ہیں؟''

''مرکزی حال میں۔'' اس نے نقشے پر وضاحت کی۔ ''وہ کہیں بھی حرکت کرسکتے ہیں۔ واش روم بھی اسی حصے میں ہیں اور صرف سیف روم اور لاکر والا حصہ بند ہوتا ہے۔''

''لاکر اور سیف روم یہ ہیں۔'' میں نے نقشے پر انگلی رکھ کر وضاحت کی۔ ''اس میں داخلے کا راستہ صرف ایک ہے اس کے علاوہ بھی کوئی راستہ ہے؟''

''نہیں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''بس یہی ایک دروازہ ہے جس پر نمبر لاک ہوتا ہے اور میرے پاس اس کا نمبر بھی ہے۔''

میں نے اس کی بات پر غور کیا۔ ''یعنی تم اسے باہر سے بھی کھول سکتی ہو؟''

''ہاں لیکن اس کی ضرورت کیا ہے۔ میں اندر جاؤں گی تو شاید خود دروازہ کھول دے گا۔''

''کیمرے کہاں کہاں ہیں؟''

دو تو کیش کاؤنٹر پر لگے ہیں۔'' اس نے انگلی رکھ کر جگہوں کی وضاحت کی۔ ''ایک بینک کے داخلی دروازے پر ہے اور ایک اے ٹی ایم کو کور کرتا ہے۔ ایک ریسیپشن کے اوپر لگا ہے۔ یہ پانچ کیمرے بینک کو تقریباً کور کرلیتے ہیں۔''

سیف روم یا لاکر روم میں کیمرے نہیں تھے۔ ان کیمروں کا ریکارڈنگ اور مانیٹرنگ سسٹم سیف روم میں ہی تھا۔ میں نے شہلا سے کہا۔ ''تم کئی بار وہاں جا چکی ہو تو کیا کیمروں نے تمہاری تصویر محفوظ نہیں کی ہوگی؟''

''بالکل کی ہوگی لیکن ایک ہفتے بعد کیمروں کی کیسٹیں صاف کردی جاتی ہیں۔ میرا اب کوئی ریکارڈ ان کیمروں میں موجود نہیں ہے۔''

''ہم وہاں سے نکلتے ہوئے یہ کیسٹیں بھی نکال لیں گے۔'' میں نے فیصلہ کیا۔

''یہ تو لازمی ہے ورنہ واردات کے بعد یہ ساری کیسٹیں لازمی چیک کی جائیں گی۔''

میں شہلا سے حفاظتی انتظامات کے بارے میں مزید پوچھتا رہا حتیٰ کہ میں نے محسوس کیا کہ اب اس کے پاس بتانے کو کچھ نہیں ہے۔ میں اس کے کمرے سے نکلا اور اوپر لاؤنج اور صحن والے حصے میں آیا۔ صابر اوپر ہی ہوتا تھا۔ وہ گیٹ پر نظر رکھتا تھا اور کسی آئے گئے کو وہی ریسیو اور سی آف کرتا تھا۔ وہ بے چارہ اکیلا ہی ہوتا تھا اور کوئی اسے کمپنی نہیں دیتا تھا۔ میں اس سے گپ شپ کرنے لگا تو وہ خوش ہوگیا۔ کوئی نصف گھنٹے بعد عبداللہ آگیا۔ اس کے ساتھ چار افراد تھے۔ خاص بات یہ تھی کہ عبداللہ ان کے لیے وہ مخصوص وردیاں بھی لایا تھا جو اس بینک کے گارڈز پہنتے تھے یہ بالکل ویسی وردیاں تو نہیں تھیں لیکن ان سے ملتی جلتی تھیں اور رات کے وقت کوئی دیکھتا تو اسے محسوس بھی نہیں ہوتا۔ وہ اپنے ساتھ ایک چھوٹی لیکن جدید ترین ڈرل مشین اور ایک ایسی برقی آری لایا تھا جو سخت ترین دھات کو بھی کاٹ سکتی تھی۔ اس کا ایک آدمی یہ دونوں آلات استعمال کرنا جانتا تھا اور اس نے موقع پر اس کا عملی مظاہرہ کرکے دکھایا۔ برقی آری نے پانچ ملی میٹر موٹی فولادی ٹکڑے کو ایک منٹ میں دس انچ تک کاٹ دیا۔ عبداللہ نے بتایا کہ عام طور سے لاکر اتنی موٹی دھات سے بنائے جاتے ہیں دھات کی موٹائی اس سے کم ہوسکتی ہے اس سے زیادہ نہیں۔

اگر ہم سیف روم میں داخل ہوجاتے تو اس کے بعد صرف دس منٹ کی کاروائی تھی۔ دس منٹ میں اپنا کام مکمل کرکے ہم وہاں سے روانہ ہوجاتے۔ عبداللہ کے ساتھ آئے آدمی اوپر رہ گئے تھے اور میں اس کے ساتھ نیچے آیا۔ عبداللہ کو پلان کا بتایا تو وہ غور سے سنتا رہا تھا۔ جب میں خاموش ہوا تو اس نے کہا۔ ''میرا خیال ٹھیک ہے لیکن جہاں تک شہلا کا تعلق ہے اس پر بہت ہوشیاری سے دباؤ رکھنا ہوگا۔ میں نے محسوس کیا ہے یہ اس سے کہیں زیادہ چالاک عورت ہے جتنی نظر آتی ہے۔ اگر اسے ذرا بھی محسوس ہوا کہ ہم نقلی ہے تو یہ اپنا کام کرجائے گی۔''

''وسیم کا کہنا ہے بم بالکل اصلی لگے گا۔ وہ اس میں

بارودی اسٹک اصلی لگائے گا لیکن باقی سرکٹ سے اس کا تعلق نہیں ہوگا۔''

عبداللہ نے کہا۔ ''اگر آپ کچھ وقت دیتے تو میں اس قسم کا اصلی بم بنوالیتا۔''

''میرا خیال ہے اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ویسے بھی ہم خاصے لوگ ہوں گے اور شہلا دھوکا دینے کی ہمت نہیں کرے گی۔''

''ٹھیک ہے اب میری تجویز سنیں۔''

''ایک منٹ پہلے وسیم اور ایاز کو آنے دو پھر بتانا۔ دوپہر کا وقت ہو چلا تھا لیکن کسی نے کھانے کا بندوبست نہیں کیا تھا بیتو نے بتایا کہ ایاز آج کہیں سے اسپیشل پائے اور نان لے کر آئے گا۔ اس لیے سب ہی بے تابی سے اس کا انتظار کررہے تھے۔ وسیم اور ایاز ایک بجے آئے تھے۔ انہوں نے وین کے کچھ کام کروانا تھا اور وسیم نقلی بم کا سامان بھی لے آیا تھا۔ پائے کھانے کے بعد اس نے اس بم کو جوڑنے کا مظاہرہ کیا۔ اس میں ایک سرکٹ سے بے شمار تار نکل رہے تھے اور ان کے رنگ خوف ناک قسم کے ہرے نیلے پیلے اور سرخ تھے۔ ٹی وی کا ریموٹ استعمال کرنے سے سرکٹ پر ایل ای ڈی جلتے بجھتے جس سے ایسا تاثر ملتا کہ سرکٹ ایکٹو ہوگیا ہے۔ وسیم نے چمڑے کی ایک پٹی سے سارے تاروں کو اس طرح گزارا کہ اب انہیں کاٹے بغیر الگ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ پھر اس پٹی میں ایک چھوٹی سے بارودی اسٹک لگائی جس میں تار لگا دیئے تھے۔ سفیر نے کہا۔

''بھائی ایسا نہ ہو کہ ریموٹ کا بٹن دبانے سے سچ مچ بم بلاسٹ ہوجائے۔''

وسیم مسکرایا۔ ''ایسا نہیں ہوگا اگر تمہیں یقین نہیں ہے تو یہ لو پکڑو۔'' اس نے بم سفیر کو پکڑا دیا۔

''باپ رے۔'' اس نے بوکھلا کر اسے بیتو کو تھما دیا اور اس نے صوفے پر پھینک دیا اور بگڑ کر بولا۔

''سفیر بھائی آپ کو ہم قربانی کا بکرا نظر آتا ہے۔''

کاش کے تم ہوتے۔'' سفیر نے سرد آہ بھر کر کہا۔ ''قربانی پاس ہے اور میرے پاس کوئی بکرا نہیں ہے۔''

''یہ ابھی دو دانت کا نہیں ہوا ہے۔'' وسیم نے چھیڑنے کے انداز میں کہا۔

''غلط ہمارا اتنا سارا دانت ہے۔'' بیتو نے فوراً اپنی بتیسی کی نمائش کی۔ ''ہمارا تو سامنے کا دانت بھی دو سے زیادہ ہے۔''

برکلے اسکوائر کے گھر کا آسیب

لندن کے مشہور سڑک برکلے اسکوائر پر واقع اس گھر میں پیش آنے والے پُراسرار واقعات میں بھوت اور عفریت کی روایتوں کا ایک امتزاج پایا جاتا ہے۔

گزشتہ ایک صدی سے زائد عرصے سے اس گھر سے وحشت خیز کہانیاں جنم لے رہی ہیں۔ کہا جاتا تھا کہ اس گھر کی بالائی منزل میں رات گزارنے والا اگلی صبح تک پاگل ہوچکا ہوتا ہے یا جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔

اس مکان سے منسوب کردہ مشہور کہانیوں میں سے ایک تین ملاحوں کے متعلق تھی۔ مکان حسب دستور خالی پڑا تھا اور یہ ملاح سونے کے لیے کسی جگہ کی تلاش میں تھے۔ مکان کو خالی دیکھ کر یہ تالا توڑ کر اندر داخل ہوگئے۔ رات کو عجیب وغریب قسم کے شور سے ان کی آنکھ کھل گئی۔ مکان کی بالائی منزل سے عجیب ہیبت ناک آوازیں اٹھ رہی تھیں۔ ملاحوں میں سے ایک تو اتنا خوف زدہ ہوا کہ آوازوں کے منبع کی جستجو کیے بغیر وہاں سے بھاگ نکلا۔ دوسرے دو ''شور مچانے والے'' کا سامنا کرنے کے لیے وہاں رک گئے۔

بھاگ نکلنے والا ملاح ایک پولیس والے سے جاٹکرایا۔ پولیس والے کی منت سماجت کرکے ملاح نے اسے گھر تک چلنے پر آمادہ کرلیا۔ واپس پہنچنے پر پتا چلا کہ پیچھے رہ جانے والے دونوں ملاح ہلاک ہوچکے ہیں۔ ان کی موت کے صحیح اسباب کا تعین کبھی نہ کیا جاسکا لیکن دونوں مرنے والوں کے چہرے پر موت کے بعد بھی خوف ودہشت کے تاثرات منجمد ہوکر رہ گئے تھے۔

مرسلہ: فہمیدہ شمیم، کراچی

''منے بکرے کے کل چار دانت ہوتے ہیں اور انسان کے بتیس۔'' وسیم نے اسے حسابی انداز میں سمجھایا۔ ''یعنی بکرے کا ایک دانت انسان کے آٹھ دانت کے برابر ہوتا ہے۔ اس لیے اگر تمہارے سولہ دانت ہوئے تو تم دو دانت کے شمار کیے جاؤ گے۔''

''تو کیا ہمارا دانت سولہ سے کم ہے؟'' اس نے بے یقینی سے کہا۔

''یہ تو چیک کرنا پڑے گا، ذرا منہ کھولنا۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بیتو کی سمجھ میں ذرا دیر سے آیا کہ وہ اس کے ساتھ کیا کھیل کھیل رہے تھے اور اس نے خفگی کے اعلان کے طور پر واک آؤٹ کیا۔ پیٹ بھر کر پائے کھانے کے بعد سب ریلیکس موڈ میں تھے تمام امور طے پا چکے تھے۔ عبداللہ نے حفاظتی پلان کا اضافہ کیا تھا۔ وہ اپنے مزید سات ساتھیوں اور تین گاڑیوں سمیت بینک کے آس پاس الرٹ پوزیشن میں موجود ہوتا۔ ہم سب ایک دوسرے سے شارٹ رینج ریڈیو کی مدد سے رابطے میں ہوتے اور جیسے ہی کوئی غیر معمولی بات ہوتی سب کو پتا چل جاتا۔ وسیم کے تجویز کردہ آلات آ گئے تھے۔ یہ ایک جیسی فریکوئنسی پر کام کرنے والے درجن بھر مختصر سے ریڈیو تھے جن کو کلپ کی مدد سے کالر میں لگا لیا جا سکتا تھا اور چھوٹا سا ایئر فون اور مائک کان میں فٹ آ جاتا۔ اس کے کان والے حصے پر انگلی رکھنے سے مائک کام کرتا اور نارمل میں سب ایک دوسرے کی آواز اس پر سن سکتے تھے۔

ہم نے اپنا اسلحہ نکال کر چیک کیا اس کی صفائی کی۔ سفیر اور بیتو کا اس مہم میں حصہ نہیں تھا اس لیے وہ سونے کے لیے چلے گئے۔ سفیر نے بہانہ کیا کہ اسے اور بیتو کو رات کو جاگ کر پہرہ دینا ہوگا اس لیے ابھی وہ سو رہے ہیں۔ شام کو میں نے طبیعت بہتر محسوس کر کے غسل کیا اور دوسرے کپڑے پہنے۔ یہاں کپڑے دھونے کا کوئی سسٹم نہیں تھا صابر میلے کپڑے نیچے وادی میں ایک لانڈری میں دے آتا تھا۔ میں شہلا کے کمرے میں آیا تو وہ بستر پر منتظر بیٹھی تھی۔ ”کیا سوچ رہی ہو؟“

”کچھ نہیں۔“ اس نے گہری سانس لی۔ ”شہباز اگر ہم ناکام رہے اور پکڑے گئے تو میری کتنی بدنامی ہوگی۔“

”تو کیا ہوا تمہیں تو اس سے بھی نام ملے گا۔“ میں نے سادگی سے کہا۔ ”بائی دی وے تمہیں یہ خیال کہاں سے آ گیا میں نے دیکھا ہے تم عزت جیسی چیز کو ہمیشہ جوتے کی نوک پر رکھتی ہو۔“

”میری ذاتی زندگی الگ چیز ہے لیکن سوسائٹی میں میری ساکھ اور مقام ہے۔“

”جیسی سوسائٹی میں ہوگا اس میں سب تمہارے جیسے ہوں گے اس لیے تم فکر مت کرو۔“ میں نے کہا۔ ”ہم نے آج ہی بینک میں کارروائی کا فیصلہ کر لیا ہے اس لیے تم شاہد منظور کو کال کرو۔“

اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ ”ابھی تو پانچ بجے ہیں اس کی ڈیوٹی رات آٹھ بجے شروع ہوتی ہے۔“

”تم سے ملاقات کے لیے اسے کچھ خاص انتظامات کرنے پڑتے ہوں گے۔ کیونکہ وہ پوری طرح اطمینان کرنے کے بعد ہی تمہیں بلاتا ہوگا؟“

”ہاں یہ تو ہے لیکن میں اسے آٹھ بجے سے پہلے کال کر کے کیا کہوں جب کہ وہ خود آٹھ بجے بینک پہنچے گا اور اسے معلوم ہوگا کہ آج کی ملاقات کے لیے حالات سازگار ہیں یا نہیں۔“

”ٹھیک ہے تم آٹھ بجے کال کرنا۔“

”کامیابی یا ناکامی دونوں صورتوں میں، میں یہاں واپس نہیں آؤں گی اس لیے میرے سامان کا کیا ہوگا؟“

”یہ یہیں رہے گا۔“ میں نے کہا۔ ”کامیابی کی صورت میں یہ تمہیں جہاں کہو گی پہنچا دیا جائے گا لیکن اگر ناکامی ہوئی تو تم یہیں واپس آؤ گی اس لیے سامان کہیں اور پہنچانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

”یہ طے نہیں ہوا تھا۔“ اس نے تیز لہجے میں کہا۔ ”اگر تمہاری وجہ سے ناکامی ہوئی تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہوگا۔“

”درست ہے لیکن ایک ناکامی کے بعد ہمیں دوسری کوشش کرنا ہوگی اور اس کوشش میں تم برابر کی شریک ہوگی۔“

”مجھے کسی دوسری کوشش میں شریک نہیں ہونا ہے۔“ وہ جھنجلا گئی۔

”ٹھیک ہے اس صورت میں لاکر میں موجود چیزوں سے بھی تمہارا کوئی تعلق نہیں ہوگا۔“ میں نے کہا تو اس کے چہرے پر زلزلے کے سے تاثرات نظر آئے تھے۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

”کیوں اگر تم شریک نہیں ہوئیں تو پھر تم چیزوں کا دعویٰ بھی نہیں کر سکتی ہو اس صورت میں ہم جو مناسب سمجھیں گے وہ کریں گے۔“

وہ کچھ دیر سوچتی رہی پھر اس نے شکست خوردہ انداز میں کہا۔ ”ٹھیک ہے مجھے منظور ہے۔“

میں باہر آیا تو وسیم نقلی بم کو مکمل کر کے چیک کر رہا تھا۔ اسے شہلا کے پاؤں سے گزار کر اس کے تاروں کو کسنے کے بعد سرکٹ سے جوڑ کر اسے آن کرنا تھا اور بہ ظاہر ایسا لگتا کہ ان میں سے کوئی بھی تار الگ کرنے یا اسے پاؤں سے اُتارنے کی صورت میں بم بلاسٹ ہو جائے گا۔ دیکھنے میں ہی خوف ناک نظر آ رہا تھا۔ ایاز بھی آ گیا۔ اس نے کہا۔ ”کیا شہلا خوشی سے اسے پاؤں سے بندھوا لے گی؟“

”خوشی سے تو نہیں لیکن مجبوراً بندھوا لے گی۔“ وسیم نے جواب دیا۔

رات کی تاریکی چھاتے ہی سب اُٹھ گئے تھے۔ وہ کچن میں جمع تھے۔ آپس میں ہنس بول رہے تھے۔ اس وقت مجھے سویرا کا خیال آیا اور میں چپکے سے صحن میں نکل آیا۔ موبائل سے اس کا نمبر ملایا۔ بیل جانے لگی لیکن وہ کال ریسیو نہیں کر رہی تھی۔ شاید کہیں اور تھی۔ میں کوشش ترک کر کے اندر آ گیا۔ وسیم نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔

”ہمیں کتنے بجے نکلنا ہے؟“

”یہاں سے ہم نو بجے روانہ ہو جائیں گے لیکن بینک میں تقریباً بارہ کے آس پاس میں داخل ہوں گے۔“ میں نے کہا۔ ”عبداللہ اپنے آدمیوں کو بلا لو جو ساتھ جائیں گے۔“

عبداللہ نے انہیں بلا لیا اور میں نے ان کو بریف کیا کہ بینک میں داخل ہونے کے بعد ہمیں کیا کرنا ہے۔ چاروں گارڈز کو واش روم میں بند کرنا تھا اور پھر ان کی جگہ دو باہر پوزیشن سنبھال لیتے اور باقی دو اندر میرے ساتھ لاکر کھولنے کی کارروائی میں حصہ لیتے۔ ان کو اچھی طرح سمجھا کر میں نے ان سے پوچھا۔ ڈرل مشین اور برقی آری استعمال کرنے کا ماہر میرے ساتھ اندر ہوتا۔ یہ ضروری تھا کہ شاہد منظور ہماری صورت نہ دیکھنے پائے۔ سفیر نے بیتو کو دوا میں ملا کر دی تھی جسے کافی میں شامل کرنا تھا اور کافی کا یہ تھرماس شہلا لے کر جاتی۔

اب آخری مرحلہ رہ گیا تھا جس میں شہلا شاہد منظور کو کال کر کے اپنے آنے کی اطلاع دیتی اور ہم روانہ ہو جاتے۔ آٹھ بجے میں اور وسیم شہلا کے کمرے میں آئے۔ وہ پینٹ شرٹ اور سویٹر پہن کر تیار ہو گئی تھی۔ اس نے ہمیں دیکھتے ہی کہا۔ ”ایک بات تو بتانا بھول گئی تھی، یہاں عبایا کہاں سے آئے گا۔“

”کسی دکان سے لے لیں گے۔“ وسیم نے کہا۔ میں نے موبائل شہلا کی طرف بڑھایا۔

”شاہد کو کال کرو۔“

اس نے موبائل لے کر نمبر ملایا۔ شاہد نے فوراً کال ریسیو کی۔ اسپیکر فون میں نے آن کر دیا تھا اس کی آواز آئی۔ ”رخسانہ یہ تم ہو؟“

”ہاں تم دفتر آ گئے ہو؟“

”ہاں کیا تم ملنے آ رہی ہو؟“

”ہاں میں آج رات کسی وقت آؤں گی اپنے گارڈز کو بتا دینا۔“

”اب میں ایک ایک پل گن کر گزاروں گا۔“ شاہد منظور نے سخت جذباتی لہجے میں کہا اور شہلا نے فون بند کر دیا۔ میں نے اس سے موبائل لے کر جیب میں رکھا اور کہا۔

”اب ایک کام اور کر لیا جائے۔“

شہلا چونکا ہو گئی۔ ”کیسا کام؟“

وسیم نے اسے نقلی بم نکال کر دکھایا۔ ”اسے تمہارے پاؤں پر باندھا جائے گا۔“

”یہ کیا ہے؟... لیکن کیوں؟“

”یہ ایک عدد ریموٹ کنٹرول بم ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اور اگر اسے بلاسٹ کر دیا جائے تو تمہارے جسم کے پرخچے اُڑ جائیں گے، اپنی پینٹ کا پائنچہ اوپر کرو۔“

شہلا کھڑی ہو گئی۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے گھمایا اور اوندھے منہ بستر پر گرا کر اس کی کمر پر گھٹنا رکھ دیا۔ اس کا بازو میرے قابو میں تھا اور اس کے لیے ہلنا بھی ممکن نہیں تھا۔ وہ دبی زبان میں گالیاں دینے لگی لیکن ہم نے اس کی پروا کیے بغیر بم اس کے پاؤں سے باندھ دیا تھا اور جب وسیم نے اسے باندھ دیا تو میں نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ تڑپ کر سیدھی ہوئی تھی لیکن اس سے پہلے بم کو کھولنے کی کوشش کرتی وسیم نے ریموٹ کا بٹن دبایا اور بم کے سرکٹ سے ٹون کی آواز کے ساتھ روشنیاں جلنے بجھنے لگی تھیں۔ شہلا دہشت زدہ ہو کر ساکت ہو گئی۔

”شہباز کمینے یہ کیا کیا ہے؟“

”اپنی زبان کو قابو میں رکھو۔“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ”یہ ریموٹ کنٹرول بم ہے جسے پانچ سو گز کی دوری سے بھی اُڑایا جا سکتا ہے اور اگر تم نے اس کا کوئی تار کھینچا یا اسے اُتارنے کی کوشش کی تو یہ فوراً پھٹ جائے گا۔“

”لیکن کیوں؟“ وہ چلائی۔

”تاکہ تم بینک کے اندر جانے کے بعد ہمیں ڈبل کراس کرنے کی کوشش نہ کرو۔ یہ بم تمہیں ایسی کسی کوشش سے روکے گا۔“

شہلا نے شرر بار نظروں سے مجھے دیکھا اور پھر اس نے وہ حرکت کی جس کے بارے میں ہم نے سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ یک دم گھوم کر بستر سے نیچے آئی اور اپنی بم والی ٹانگ میرے پیروں کے درمیان کر دی۔ اس نے بم کی دو تاروں کو چٹکی سے پکڑ لیا تھا اور زہریلے لہجے میں بولی۔ ”بس شہباز ملک اب تم نے حرکت کی تو میرے ساتھ تمہارے ٹکڑے بھی اُڑیں گے۔“

جاری ہے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

عامل

محترم معراج رسول صاحب
السلام علیکم!
سرگزشت میرا پسندیدہ ڈائجسٹ ہے۔ میں بڑے شوق سے پڑھتا ہوں۔ اگست 2011ء میں آپ نے پُراسراریت نمبر دے کر مجھے مہمیز کیا ہے۔ میں اپنی خودنوشت بھیج رہا ہوں لیکن مجھے اجازت نہیں ہے کہ میں خود کو ہر ایک پر ظاہر کردوں اس لیے میں نے اپنا اور اپنے شہر کا نام تبدیل کردیا ہے۔ نام مقام بدلنے کے بعد اگر پسند کریں تو میری سچ بیانی شاملِ اشاعت کرلیں۔ اس میں بیان کردہ تمام واقعات سوفیصد سچے ہیں۔

پروفیسر یوسف عطاری
(کراچی)

میں نے ایک ایسے گھرانے میں آنکھ کھولی جہاں دولت کی فراوانی تھی۔ ابو کی دو ٹیکسٹائل ملیں اور پنکھے، واشنگ مشین وغیرہ بنانے کے کارخانے تھے۔ ہر طرح کا عیش و آرام میسر تھا اس کے باوجود ہمارے گھر کا ماحول مذہبی تھا۔ دادا جان تو دنیا سے کنارہ کش ہوکر ہمہ وقت یادِ الٰہی میں مشغول رہتے تھے۔

مجھے بھی شروع ہی سے عبادت میں لطف آتا تھا۔ میں نے جب سے نماز پڑھنا شروع کی تھی الحمدللہ میری کوئی نماز قضا نہیں ہوئی۔ گیارہ سال کی عمر سے میں تہجد کی نماز پڑھ رہا ہوں اور اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے درود شریف ورد زبان ہے۔

میرے دوسرے بھائی بہن صوم وصلوٰۃ کے پابند تو تھے لیکن وہ دنیا داری میں اُلجھے ہوئے تھے۔ وہ مجھے مولوی، علامہ اور مولانا کہہ کر چڑایا کرتے۔

ایک دن عشاء کی نماز کے بعد ابو میرے کمرے میں آئے تو میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں نے کہا۔ ''ابو آپ نے ناحق زحمت کی مجھے بلا لیا ہوتا۔''

''بیٹا!'' ابو نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''ابھی تمہاری عمر صرف گیارہ سال ہے اور تمہارے سامنے پوری زندگی پڑی ہے۔ عبادت اچھی چیز ہے لیکن تارک الدنیا ہوکر صرف عبادت کرنے کا حکم بھی نہیں ہے۔''

''آپ درست فرمارہے ہیں ابو!'' میں نے کہا۔ ''میں نے دنیا ترک تو نہیں کی ہے۔''

''میں بھی یہی کہنا چاہتا ہوں کہ کہیں عبادت سے تمہاری تعلیم متاثر نہ ہو۔''

''آپ مطمئن رہیے ابو! ایسا ہرگز نہ ہوگا۔''

اللہ تعالیٰ نے مجھے اتنا زبردست حافظہ عطا فرمایا تھا کہ کوئی بھی عبارت محض ایک دفعہ پڑھنے کے بعد میں بھولتا نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں ہر کلاس میں پوزیشن لیتا تھا۔ میں نے اسکول کی تعلیم کے دوران ہی میں، محض سات سال کی عمر میں قرآن پاک حفظ کرلیا تھا۔

دادا جان میرے اس طرزِ عمل سے بہت خوش تھے۔ میں دیر تک ان سے دینی معاملات پر گفتگو کیا کرتا تھا۔ وہ بتاتے تھے کہ ہمارے جدِ اعلیٰ حضرت مجدد الف ثانیؒ سے بیعت تھے، پھر ہمارے ایک بزرگ نے حضرت باقی باللہ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ دادا جان بھی نقش بندیہ سلسلے کے ایک بزرگ حضرت غلام ربانی مجددی سے بیعت تھے۔

میں ان سے اکثر ضد کرتا تھا کہ مجھے اپنے پیر صاحب سے بیعت کرادیں۔ دادا جان فرماتے تھے۔ ''یوسف بیٹا! تم ابھی بہت چھوٹے ہو۔ وقت آنے پر یہ بھی ہوجائے گا۔''

میری عبادت اور تعلیم ساتھ ساتھ جاری تھی۔ میں نہ صرف درود شریف کا ورد کرتا رہتا تھا بلکہ دادا جان کی رہنمائی میں مختلف وظائف بھی شروع کردیے تھے۔ مراقبے کا عمل میں نے اپنے طور پر شروع کردیا۔ اس عمل سے میری طبیعت میں یکسوئی پیدا ہوئی اور اس میں لطف آنے لگا۔ پھر اس کے اثرات بھی ظاہر ہونے لگے۔ مجھے قبل از وقت علم ہوجاتا تھا کہ آیندہ کیا ہونے والا ہے؟ غیب کا علم تو صرف اس ذات پاک کو ہے لیکن وہ چاہے تو اپنے بندوں کو بھی نواز سکتا ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یہ سب بتانے کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ میں آپ کو اپنی عبادت و ریاضت سے مرعوب کرنا چاہتا ہوں۔ میں تو... صرف وہ پس منظر بیان کررہا ہوں جس کی بدولت میں آج اس مقام پر ہوں۔

ایک رات تہجد کی نماز کے بعد میں درود پاک کا ورد کرتے کرتے سوگیا۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں ایک ساحل پر کھڑا ہوں۔ گھر کے دیگر افراد بھی موجود ہیں۔ میرے سامنے ہی ایک بڑی سی بادبانی کشتی کھڑی ہے۔ پھر ایک طرف سے سفید لباس میں ایک بزرگ برآمد ہوتے ہیں۔ وہ بزرگ دبلے پتلے لیکن انتہائی بارعب شخصیت کے مالک تھے۔ چہرے پر ایسا نور تھا کہ نگاہ نہیں ٹھہرتی تھی۔ میں نے ایک نظر ان کے چہرے پر ڈالی پھر گھبرا کر نظریں جھکالیں۔

انہوں نے میرے تمام گھر والوں سے فرمایا۔ ”آپ لوگ اس کشتی میں سوار ہوجائیں۔“

سب لوگ اس کشتی کی طرف بڑھے اور ایک ایک کرکے بیٹھنے لگے۔

میں بھی اس طرف بڑھا تو بزرگ نے فرمایا۔ ”یوسف تم اس کشتی میں نہیں بیٹھو گے۔ تمہاری منزل دوسری ہے۔“

پھر اس سے پہلے کہ میں ان سے کوئی سوال کرتا میری آنکھ کھل گئی۔ میں گھبرا کر اُٹھ کے بیٹھ گیا۔ یہ کیسا خواب تھا؟ میں دادا جان کے کمرے کی طرف دوڑا۔ میں جانتا تھا کہ وہ اس وقت جاگ رہے ہوں گے اور کسی وظیفے میں مصروف ہوں گے۔

میں نے ڈرتے ڈرتے ان کے کمرے میں جھانکا تو حسبِ توقع وہ جاگ رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ شفقت سے مسکرائے اور اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا۔

”کیا بات ہے یوسف بیٹا؟“ انہوں نے شفیق لہجے میں پوچھا۔

میں نے انہیں اپنا خواب سنادیا۔

یہ سن کر دادا جان آبدیدہ ہوگئے اور میری پیشانی چوم کر بولے۔ ”تم بہت خوش قسمت ہو بیٹا! میرا اندازہ ہے کہ وہ کوئی بہت بڑے بزرگ ہوں گے یا حضرت خضر علیہ السلام ہوں گے۔ انہوں نے واضح کردیا ہے کہ زندگی کے اس سفر میں تمہاری منزل دوسرے افراد سے مختلف ہے۔“

میں دیر تک دادا جان کے پاس بیٹھا رہا۔ مجھے ان کے پاس بیٹھ کر عجیب سا سکون ملتا تھا، عجیب سی ایک خوشی کا احساس ہوتا تھا۔

اذانِ فجر کے بعد دادا جان اُٹھ کھڑے ہوئے۔

اس دن کے بعد سے میری زندگی کے شب و روز ہی بدل گئے۔ میں اشراق اور چاشت کی نمازیں بھی پابندی سے پڑھنے لگا اور درود و وظائف میں بھی اضافہ ہوگیا۔ اس کے باوجود ابو کی خواہش کے مطابق میری دنیاوی تعلیم بھی جاری تھی۔ میں چوبیس گھنٹے میں سے صرف چار گھنٹے سوتا تھا۔

ایک دن عجیب واقعہ پیش آیا۔ ابو اس رات بینک سے پچاس ہزار روپے لائے تھے، صبح انہیں کسی پارٹی کو ادائیگی کرنا تھی۔ ان دنوں پچاس ہزار کی رقم بہت خطیر ہوتی تھی۔

چھٹی کا دن تھا۔ میں اشراق کی نماز کے بعد کچھ دیر سونے کی تیاری کررہا تھا کہ ابو کی بلند آواز سنائی دی۔ ”پیسے آخر گئے کہاں؟“

دادا جان کی موجودگی میں کسی کی اتنی جرأت نہ تھی کہ وہ بلند آواز میں بات کرے، ابو کی بھی نہیں۔

میں گھبرا کر اپنے کمرے سے نکل آیا۔

امی ابو سے کہہ رہی تھیں کہ آپ الماری میں تو اچھی طرح دیکھ لیجیے۔

”الماری میں دیکھنے کا کیا سوال؟“ ابو نے کہا۔ ”میں نے رقم اس بریف کیس میں رکھی تھی، اس میں سے غائب ہے۔“

میں نے سارا ماجرا سن کر بے اختیار آنکھیں بند کرلیں۔ اس میں میرے کسی ارادے کو دخل نہیں تھا۔

بند آنکھوں میں پہلے تو بہت سے منظر گڈمڈ ہوئے۔ پھر مجھے رشید نظر آیا۔ وہ ریلوے اسٹیشن پر بیٹھا تھا۔

رشید ہمارا ایک ملازم تھا۔ ابو نے حال ہی میں ترس کھا کر اسے ملازم رکھا تھا۔ وہ آدمی پہلے ہی دن سے مجھے پسند نہیں آیا تھا۔

میں نے کوشش کی تو مجھے اسٹیشن کا نام بھی نظر آگیا۔ رشید کے انداز میں گھبراہٹ تھی اور وہ بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا۔

میں نے جھٹکے سے آنکھیں کھولیں اور ابو سے کہا۔ ”ابو، آپ کے پیسے رشید نے چُرائے ہیں۔“

”کسی پر بلا سوچے سمجھے الزام نہیں لگاتے بیٹا!“ ابو نے کہا۔

”میں الزام نہیں لگارہا ہوں بلکہ حقیقت بیان کررہا ہوں ابو!“ میں نے کہا۔ ”وہ اس وقت اسٹیشن پر موجود ہے اور یہاں سے فرار کی تیاری کررہا ہے۔“

”اسے تو میں نے خود ہی گجرات جانے کو کہا تھا۔“ ابو نے کہا۔

میں سٹپٹا گیا۔ واقعی میرے پاس اس بات کا کوئی ثبوت نہیں تھا کہ چوری رشید ہی نے کی ہے۔

میری آنکھیں ایک مرتبہ پھر خود بہ خود بند ہوگئیں۔ پھر میرے سامنے بہت سے منظر گڈمڈ ہوئے۔ آخر دھند چھٹ گئی۔ مجھے ایک مرتبہ پھر رشید نظر آیا۔ اس مرتبہ وہ ہمارے بنگلے میں تھا اور دبے پاؤں ابو کے کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ بہت آہستگی سے دروازہ کھول کر ابو کے کمرے میں داخل ہوا، میز پر رکھا ہوا بریف کیس اُٹھایا اور باہر نکل گیا۔ باہر لان میں جاکر اس نے بریف کیس کھول کر رقم نکالی اور اسے اپنی چادر میں باندھ لیا۔ پھر اس نے بریف کیس دوبارہ ابو کے کمرے میں رکھا اور بہت خاموشی سے باہر نکل گیا۔

میں نے پھر آنکھیں کھول دیں اور ابو سے کہا۔ ”ابو میں نے غلط بیانی سے کام نہیں لیا۔ پیسے رشید ہی نے چُرائے ہیں۔ اس سے پہلے کہ وہ گاڑی میں بیٹھ کر نکل جائے، آپ پولیس کو اطلاع دے دیں۔“

اچانک دادا جان کمرے میں داخل ہوئے تو ابو گڑبڑا گئے۔ دادا جان شاذ و نادر ہی کسی کے کمرے میں جاتے تھے۔ انہوں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”یوسف ٹھیک کہہ رہا ہے۔ رقم رشید ہی نے لی ہے۔“

ابو نے فوراً پولیس کو ٹیلی فون کردیا۔ پولیس نے رشید کو اس وقت گرفتار کیا جب وہ گاڑی میں بیٹھ چکا تھا۔ اس کے پاس سے چوری کی رقم بھی برآمد ہوگئی۔ اس میں سے چند سو وہ خرچ کرچکا تھا۔

اس واقعے کے بعد ابو اور گھر کے دوسرے افراد مجھ سے مرعوب رہنے لگے۔

مجھ سے بڑے دو بھائی تھے۔ احسن بھائی ان دنوں تعلیم سے فارغ ہوکر کاروبار میں ابو کا ہاتھ بٹا رہے تھے۔ وہ کاروبار کو مزید توسیع دینا چاہتے تھے اور دن رات محنت کررہے تھے۔ مجھے ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ مجھے حیرت ہوتی تھی کہ لوگوں میں پیسا کمانے کی اتنی ہوس کیوں ہے؟ انسان کو باعزت زندگی گزارنے کے لیے کیا چاہیے؟ دو وقت کی روٹی، پہننے کو لباس اور سر چھپانے کو ایک چھت!

احسن بھائی ان دنوں کسی کے اشتراک سے فیصل آباد میں ایک اور ٹیکسٹائل مل لگانے کی کوشش کررہے تھے۔ اس سلسلے میں لاہور کے ایک سرمایہ دار سے ان کی ملاقاتیں ہورہی تھیں۔ میرے کانوں میں بھی اُڑتی اُڑتی یہ خبریں پڑ رہی تھیں۔

اس دن میں نمازِ مغرب کے بعد واپس آیا تو برآمدے میں مجھے احسن بھائی ملے۔ ان کے ساتھ ایک صاحب اور بھی

کراچی
ماہنامہ پاکیزہ

شمارۂ سالِ نو نمبر
کی ایک جھلک

عمیرہ احمد...... عکس
عکس در عکس پھیلے سلسلۂ زندگی کے پوشیدہ پہلوؤں کی کھوج و جستجو کا سفر

شیریں حیدر
شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں
اپنے مخصوص کرداروں کے ساتھ مسلسل ناول کے پُرتحیر نشیب و فراز

ناہید سلطانہ اختر...... زندگی
زندگی کی تلخ و شیریں حقیقتوں سے روشناس کراتا آپ کی پسندیدہ مصنفہ کے قلم سے لکھا نیا سلسلے وار ناول

راحت وفا...... ایک تھی نینان
انسانی ذہن کی نفسیاتی الجھنوں، کیفیات اور احساسات کے گرد گھومتا سلسلے وار ناول

انجم انصار اور نمرہ احمد
کے دلکش و خوب صورت ناولٹ

ثمینہ عظمت علی، رخ چوہدری، عظمیٰ سید افتخار، رضوانہ پرنس، عنیقہ محمد بیگ اور عنیزہ سید کی دلچسپ و پُراثر تحریریں

آپ کی آرا و نگارشات سے سجے مستقل سلسلے

کیا آپ نے اس ماہ کا پاکیزہ پڑھا؟ نہیں! کمال ہے!

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھے۔ وہ خاصے بھاری بھرکم آدمی تھے۔ جسم پر تھری پیس سوٹ تھا۔ کلائی میں انتہائی بیش قیمت گھڑی تھی اور ہاتھ میں خاصی بھاری سونے کی انگوٹھی تھی۔ بچپن ہی سے میری عادت تھی کہ میں کسی بھی نئے آدمی کو دیکھ کر پہلے بہت بھرپور انداز میں اس کا جائزہ لیتا تھا۔

میں نے انہیں سلام کیا تو انہوں نے مسکرا کر جواب دیا۔

"میرا چھوٹا بھائی ہے۔" احسن بھائی نے میرا تعارف کرایا۔

اچانک میری آنکھیں بند ہوگئیں اور بند آنکھوں کے سامنے کچھ مناظر گڈمڈ ہوئے۔ پھر ایک منظر واضح ہوگیا۔ وہی صاحب کسی سے کہہ رہے تھے۔ "بس یار ایک دفعہ یہ احسن پھنس جائے تو مزہ آجائے تبھی دوسرے آدمی نے کہا کہ احسن کا باپ بہت سیانا ہے، وہ اتنی آسانی سے تمہاری باتوں میں نہیں آئے گا، مجھے اس شخص کے مخاطب کا چہرہ نظر نہیں آرہا تھا۔ احسن بھائی کا پارٹنر بولا کہ میں نے احسن کو پھنسالیا ہے، بس اس سے مشینری کے نام پر پانچ لاکھ روپے لے لوں، پھر احسن کا باپ بھی کچھ نہیں کر سکے گا۔ مل کے لیے جو زمین میں نے احسن کو دکھائی ہے، وہ تو سرکاری ملکیت ہے۔

اچانک جھٹکے سے میں نے آنکھیں کھول دیں۔ اس قسم کے مناظر مجھے چند سیکنڈ ہی نظر آتے تھے۔ میں نے نظریں اُٹھا کر اس شخص کو دیکھا تو اس نے گھبرا کر نظریں چُرالیں اور جلدی سے آگے بڑھ گیا۔ احسن بھائی اسے لے کر ڈرائنگ روم کی طرف بڑھے۔ تو میں نے ان سے کہا۔ "احسن بھائی! ذرا میری بات سن لیں۔"

احسن بھائی نے حیرت سے مجھے دیکھا کیونکہ میں نے ان سے کبھی اس انداز میں بات نہیں کی تھی۔ پھر وہ نرم لہجے میں بولے۔ "بعد میں بات کرلینا، ابھی تو میں مصروف ہوں۔"

"اس کی بات سن لو یار!" احسن بھائی کا مہمان جلدی سے بولا۔ "بچہ مجھے بہت غصے والا لگ رہا ہے۔"

"ارے نہیں منور صاحب!" احسن بھائی نے کہا۔ "یوسف تو بہت اچھا اور سلجھا ہوا بچہ ہے۔"

"احسن بھائی! میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔" میں نے کہا۔

"اچھا بھئی آؤ۔" احسن بھائی نے کہا پھر منور سے مخاطب ہوئے۔ "منور صاحب میں ابھی حاضر ہوا۔"

میں انہیں لے کر لان میں آگیا۔ احسن بھائی کے انداز میں جھنجلاہٹ سی تھی۔ "ہاں، یوسف! بولو کیا بات ہے؟"

"احسن بھائی!" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "یہ شخص منور فراڈ ہے۔ آپ اس سے کسی قسم کی ڈیلنگ نہ کریں۔"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" احسن بھائی جھنجلا کر بولے۔ "منور صاحب لاہور کے بہت بڑے بزنس مین ہیں۔ وہ بھلا میرے ساتھ دھوکے بازی کیوں کریں گے؟"

"وہ دھوکے باز ہیں۔" میں نے کہا۔ "انہوں نے فیکٹری کے لیے جو زمین آپ کو دکھائی ہے۔ وہ ان کی ملکیت نہیں ہے بلکہ سرکاری ملکیت ہے۔ آپ چاہیں تو اس کی تصدیق کرسکتے ہیں۔"

احسن بھائی نے حیرت سے مجھے دیکھا، پھر بولے۔ "تم یہ سب کیسے جانتے ہو؟"

"میں تو یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ مشینری کے لیے آپ سے پانچ لاکھ روپے مانگ رہے ہیں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

احسن بھائی اچھل پڑے اور بولے۔ "پانچ لاکھ کی بات تو ابھی صرف منور صاحب اور میرے درمیان ہے۔ اس کا تذکرہ تو میں نے ابو سے بھی نہیں کیا ہے۔ تم......؟"

"بس آپ ان کے ساتھ کوئی اشتراک نہ کریں ورنہ نقصان میں رہیں گے۔" میں نے کہا اور انہیں حیران پریشان چھوڑ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا کیونکہ نماز عشاء سے قبل مجھے ایک وظیفہ بھی مکمل کرنا تھا۔

اس واقعے کے دو دن بعد ابو نے مجھے اپنے کمرے میں بلوایا۔ ابو کے ساتھ احسن بھائی بھی بیٹھے تھے۔

ابو نے مجھ سے کہا۔ "یوسف! تمہاری اطلاع بالکل درست تھی۔ وہ شخص منور واقعی دھوکے باز تھا۔ وہ بزنس مین ضرور ہے لیکن ہیرا پھیری کے کام زیادہ کرتا ہے لیکن تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ دھوکے باز ہے؟"

"ابو یہ تو میں خود بھی نہیں جانتا۔" میں نے سچائی سے جواب دیا۔ "بس مجھے معلوم ہوجاتا ہے۔"

"تم نے مجھے اتنے بڑے نقصان سے بچایا ہے۔" احسن بھائی نے مسکرا کر کہا۔ "بتاؤ۔ تم انعام میں کیا لوگے؟"

"مجھے صرف آپ کی دعائیں چاہئیں۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "اب اگر اجازت ہو تو میں جاؤں؟"

"ہاں ہاں بیٹا۔ تم جاؤ۔" ابو نے کہا۔

وقت سبک رفتاری سے گزرتا رہا۔ میں نے میٹرک کرلیا اور ابو کی خواہش پر کالج میں داخلہ بھی لے لیا لیکن میری عبادت اور ریاضت کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ میں نے اب زیادہ بات کرنا

ترک کر دیا تھا، صرف دادا جان سے بات چیت کر لیتا تھا۔ وہی میری ذہنی کیفیت کو سمجھ سکتے تھے۔

ایک دن عشاء کے بعد میں نے دیر تک مراقبہ کیا۔ اس دن مجھے عجیب سی بے چینی تھی۔ پھر نہ جانے کب میری آنکھ کھل گئی۔

میں نے دیکھا کہ میں ایک لق و دق صحرا میں بھٹک رہا ہوں۔ گرمی کی شدت سے میرا بدن جھلسا جا رہا تھا اور پیاس کے باعث حلق میں کانٹے سے پڑ رہے تھے۔ میں دو قدم چلتا، پھر گر پڑتا۔ میرے قدموں تلے جھلسا دینے والی ریت تھی اور میرے قدم ٹخنوں تک اس میں دھنسے ہوئے تھے۔ تا حدِ نظر ہولناک صحرا پھیلا ہوا تھا اور میں اس بے کراں صحرا میں بھٹک رہا تھا۔ اس کے باوجود نہ جانے کس امید پر گرتا پڑتا آگے بڑھ رہا تھا۔

پھر میں چلتے چلتے بالکل نڈھال ہوگیا اور جھلستی ہوئی ریت پر گر پڑا۔ میرے سر پر آگ برساتا ہوا سورج تھا اور جسم کے نیچے تپتی جلتی ریت۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میرا آخری وقت آگیا ہو۔ میں نے اپنے نامہ اعمال پر نظر ڈالی۔ مجھ گناہ گار کے پاس آخرت کے لیے کچھ بھی نہ تھا۔ میں کیا ضمیر لے کر اس رب رحیم کے حضور حاضر ہوتا؟ میں نے ایسا کون سا کام کیا تھا کہ مجھے بخش دیا جاتا۔ میں نے عبادت کی تھی لیکن یہ کوئی ایسا کام نہیں تھا جس پر فخر کیا جائے۔ عبادت اور نمازوں کی ادائیگی تو فرض ہے۔ یہ تو مجھے کرنا ہی تھی۔

اپنی بے بسی پر میری آنکھوں میں آنسو آگئے اور میں نے کہا۔ "اے مالک رب کائنات! تو غفور و رحیم ہے۔ تو انتہائی بخشنے والا مہربان ہے، میرے حضور اپنے پیارے حبیب حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صدقے میں مجھے بخش دینا۔" پھر میں نے کلمہ پڑھا اور آنکھیں موند لیں۔

اچانک مجھے ایسا لگا جیسے کوئی میرے سر پر ہاتھ پھیر رہا ہو۔ میں نے بہت مشکل سے آنکھیں کھولیں کیونکہ نقاہت کے باعث آنکھیں کھولنا بھی مشکل تھا۔

میرے سامنے نورانی چہرے والے ایک بزرگ تھے۔ ان کے چہرے پر نور کے ساتھ ساتھ ایک جلال بھی تھا۔ کشادہ پیشانی، بڑی روشن آنکھیں، گٹھا ہوا مضبوط جسم اور گھنی ڈاڑھی!

ان کے لمس میں نہ جانے کیسی تاثیر تھی کہ میری کھوئی ہوئی توانائی واپس آنے لگی۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا۔ "تو اس صحرا میں کیا کر رہا ہے؟"

"میں راستہ بھٹک گیا ہوں حضرت!" میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"تو راستہ نہیں بھٹکا ہے۔" انہوں نے فرمایا۔ "تو [illegible] صحیح راستے پر جا رہا ہے، اس راہ کی [illegible] ہے۔ آ میرے ساتھ آ۔" یہ کہہ کر وہ بزرگ ایک طرف چل دیے۔

میں بھی گرتا پڑتا ان کے پیچھے چلتا رہا۔

کچھ ہی دور چلنے کے بعد مجھے ایک بستی دکھائی دی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ یہ بستی مجھے پہلے نظر کیوں نہ آئی۔

اب ہم صحرا سے نکل کر ایک نخلستان میں چل رہے تھے۔ وہ بزرگ مجھے ایک جھونپڑی نما مکان میں لے گئے۔ وہاں ایک کمرے میں چٹائی بچھی ہوئی تھی اور وہاں گرمی کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ بزرگ نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولے۔ "تو مسافر ہے، بھوکا ہوگا۔ میں تیرے لیے کچھ کھانے کو لاتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گئے۔ چند منٹ بعد وہ کمرے میں داخل ہوئے۔ ان کے ہاتھ میں چھوٹی سی ایک بالٹی، ایک کٹورہ اور مٹی کی ایک رکابی میں کھجوریں تھیں۔

انہوں نے کھجوروں سے بھری ہوئی رکابی میرے سامنے رکھ دی اور فرمایا۔ "اس وقت یہ کھجوریں اور بکری کا دودھ ہی میسر ہے۔"

میں نے بسم اللہ کر کے کھجور منہ میں رکھی۔ انتہائی لذیذ اور میٹھی کھجور تھی۔ اتنی خوش ذائقہ کھجوریں اس سے قبل میں نے کبھی نہیں کھائی تھیں۔

میں نے کھجوریں کھانے کے بعد خوب سیر ہو کر بکری کا خوش ذائقہ دودھ پیا تو مجھے اپنے جسم میں ایک نئی توانائی دوڑتی محسوس ہوئی۔

میں کھانے سے فارغ ہوا تو بزرگ نے فرمایا...... "نماز کا وقت ہوگیا ہے۔" یہ کہہ کر وہ اُٹھنے لگے۔

"حضرت!" میں نے جلدی سے کہا۔ "نماز تو میں بھی ادا کروں گا۔"

"آؤ میرے ساتھ!" بزرگ نے کہا اور ایک طرف چل دیے۔

اسی وقت میری آنکھ کھل گئی۔ مجھ پر لرزہ طاری تھا اور پورا جسم پسینے میں تر تھا۔ میرے کمرے میں عجیب سی مسحور کن خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

میں ہمت کر کے اُٹھا اور گرتا پڑتا دادا جان کے کمرے کی طرف بھاگا۔

دادا جان مجھے اس حالت میں دیکھ کر گھبرا گئے۔ انہوں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نے مجھے اپنے سینے سے لگالیا۔ ان کے سینے سے لگ کر میرے جسم کا لرزہ کچھ کم ہوا۔ پھر انہوں نے پانی کا گلاس میرے ہونٹوں سے لگادیا۔ میں پورا گلاس ایک ہی سانس میں پی گیا۔

"یوسف بیٹا!" دادا جان نے شفیق لہجے میں کہا۔ "تم شاید بھول گئے کہ پانی ٹھہر ٹھہر کر تین سانسوں میں پینا چاہئے۔"

"مجھے افسوس ہے دادا جان!" میں نے سر جھکا کر کہا۔ پھر انہیں تفصیل سے اپنے خواب کے بارے میں بتایا۔

دادا جان بھی بُری طرح رونے لگے اور بولے۔ "تم خوش قسمت ہو بیٹا! میری پوری زندگی عبادت و ریاضت میں گزر گئی لیکن میں ایسی شخصیت کے دیدار سے محروم رہا۔"

پھر میں نے دادا جان ہی کے ساتھ نماز تہجد ادا کی اور اذانِ فجر تک ان ہی کے کمرے میں رہا۔

اب میرے روز و شب بالکل ہی بدل گئے۔ میں ساری ساری رات عبادت میں گزارنے لگا۔ میں مہینے میں بعض اوقات دس اور بعض اوقات پندرہ روزے بھی رکھ لیتا تھا لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ مجھے ہلکی سی کمزوری کا بھی احساس نہیں ہوتا تھا۔ بڑے دونوں بھائی اپنے کاروبار میں مگن رہے اور دل بھر کے دنیا کماتے رہے۔ میں اپنی دنیا میں مگن رہا۔ یہ نہیں ہے کہ وہ دین سے بے بہرہ تھے۔ وہ نمازیں بھی پڑھتے تھے اور روزے بھی پابندی سے رکھتے تھے لیکن دنیاداری کے تمام تقاضے بھی پورے کرتے تھے۔ وہ کاروبار کے سلسلے میں غلط بیانی سے بھی کام لیتے تھے اور وہ تمام ہتھکنڈے استعمال کرتے تھے جو دوسرے کاروباری حضرات روا رکھتے ہیں۔

میں کبھی ان لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کرتا تھا تو وہ مجھے مولوی اور ملا جیسے خطابات سے نوازتے تھے۔ ان کی اس روش سے میرے اور ان کے درمیان فاصلے بڑھتے گئے۔

بی اے کے امتحان میں پوری یونیورسٹی میں میری دوسری پوزیشن تھی۔

ابو میری اس کامیابی پر بہت خوش تھے۔ دونوں بھائیوں نے اس پر بھی میرا مضحکہ اُڑایا کہ ایسی ذہانت کا کیا فائدہ؟ یہی ذہانت اگر تم پری میڈیکل یا پری انجینئرنگ میں دکھاتے تو کوئی بات بھی تھی۔

"اس سے کیا ہوتا؟" میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"اس سے کیا ہوتا؟" ناصر بھائی نے ہنس کر کہا..... بے وقوف، تم ڈاکٹر یا انجینئر بن کر زندگی گزارتے۔"

"چلو ڈاکٹر یا انجینئر نہ سہی، تم ایم بی اے یا سی اے کر سکتے تھے۔" احسن بھائی نے کہا۔

"کیا آپ لوگوں کے نزدیک تعلیم صرف اسی لیے حاصل کی جاتی ہے کہ کہیں اچھی ملازمت کی جائے؟" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "تعلیم تو ذہن کو وسعت دیتی ہے، انسان کو جینے کا قرینہ سکھاتی ہے۔"

"تو آپ نے جینے کا قرینہ سیکھ لیا؟" ناصر بھائی نے کہا۔

"میں تو ابھی مُبتدی ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ "نہ جانے اس زندگی میں یہ قرینہ سیکھ بھی پاؤں گا یا نہیں۔ ہاں کوشش ضرور کرتا رہوں گا۔ افسوس تو مجھے ان لوگوں پر ہوتا ہے جو دنیاوی دولت ہی کو کامیابی کی بنیاد سمجھتے ہیں۔ اللہ تبارک تعالیٰ ان پر رحم فرمائے۔" کہہ کر میں وہاں سے اُٹھ گیا۔

میری دونوں بڑی بہنیں البتہ میری باتوں کو توجہ سے سنتی تھیں۔ دونوں ہی اعلیٰ تعلیم یافتہ تھیں لیکن صوم وصلوٰۃ کی پابند تھیں۔ میری باتوں کا ان پر اتنا اثر ہوا تھا کہ انہوں نے شرعی پردہ اختیار کرلیا تھا۔ وہ کسی بھی چچازاد یا ماموں زاد کے سامنے نہیں آتی تھیں۔

احسن بھائی اکثر طنزیہ لہجے میں امی سے کہتے تھے۔ "یوسف نے ان دونوں کو بھی اپنے رنگ میں رنگ لیا ہے۔ مجھے تو فکر ہے کہ ان دونوں کی شادیاں کیسے ہوں گی؟"

"یوسف جیسا ہی کسی مسجد کا پیش امام انہیں بھی مل جائے گا۔" ناصر بھائی طنز کرتے۔

ایک دن یہی بات میں نے سنی تو میں تلملا گیا۔ میں نے زندگی میں پہلی دفعہ احسن بھائی سے تلخ لہجے میں کہا۔

"آپ لوگ مسجد کے پیش امام کو اتنا حقیر کیوں سمجھتے ہیں؟ کبھی آپ نے سوچا ہے کہ کڑاکے کی سردی میں فجر کے وقت اذان کون دیتا ہے؟ جھلستی ہوئی دوپہروں میں جب آپ لوگ اپنے اٹر کنڈیشنڈ کمروں سے باہر نکلنا بھی گوارا نہیں کرتے، اس وقت ظہر کی نماز کا بلاوا کون دیتا ہے؟ یہ مسجد کا امام ہی ہے جو اپنا آرام وسکون چھوڑ کر اس رب غفور کے بلاوے کا اعلان کرتا ہے۔ آپ کی نظروں میں وہ حقیر ہے؟ آپ لوگوں نے بچپن میں جن اساتذہ سے کلام پاک پڑھا ہے۔ کیا وہ حقیر لوگ تھے؟ آپ لوگوں کو شرم آنا چاہیے۔ یہی حصولِ علم اور حصولِ سند میں فرق ہے۔ آپ نے سند ضرور حاصل کی ہے لیکن آپ علم سے کوسوں دور ہیں۔"

وہ دونوں جانتے تھے کہ وہ بحث میں مجھ سے نہیں جیت

سکیں گے اس لیے احسن بھائی نے ڈانٹ دیا۔ "تم بڑے چھوٹے کی تمیز بھی بھلا بیٹھے ہو۔ بند کرو اپنی یہ تقریر!"

میں خاموشی سے اپنے کمرے میں آ گیا اور اسی وقت میں نے فیصلہ کرلیا کہ اب ان لوگوں کے معاملات میں نہیں بولوں گا۔ اتمام حجت کے لیے جو کچھ مجھ سے ہوسکتا تھا، وہ کر چکا تھا۔

اسی وقت ایک ملازم نے آ کر کہا کہ آپ کو بڑے صاحب یاد کررہے ہیں۔ ہمارے دادا جان کو سب بڑے صاحب کہتے تھے۔ میں ان کے کمرے میں پہنچا تو بہت ملول تھا۔ دادا جان نے شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "یوسف بیٹا! زیادہ افسردہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ لوگ عقل کے اندھے ہیں۔ ابھی ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آئے گا۔ جب ٹھوکر لگے گی تو خود ہی ان کی آنکھیں کھلیں گی۔"

دادا جان کا اشارہ میرے بھائیوں کی طرف تھا۔ انہیں یقیناً اس واقعے کی اطلاع مل چکی تھی۔

"دادا جان! افسوس تو مجھے اس بات کا ہے۔ کوئی غیر بھی ہوتا تو مجھے تکلیف ہوتی لیکن وہ تو میرے اپنے ہیں۔ میں انہیں کی آخرت تباہ ہوتے کیسے دیکھ سکتا ہوں؟"

"بیٹا! زیادہ کبیدہ خاطر ہونے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔" دادا جان نے کہا۔ "اللہ تبارک وتعالیٰ جسے چاہتا ہے توفیق دے دیتا ہے۔" پھر وہ موضوع بدل کر بولے۔ "یوسف بیٹا! میرا خیال ہے کہ تم اعلیٰ تعلیم کے لیے ملک سے باہر چلے جاؤ۔"

"دادا جان! میں بھی یہی سوچ رہا ہوں کہ جامعۃ الازہر چلا جاؤں۔"

"بہت نیک خیال ہے بیٹا!" دادا جان نے کہا۔ "میری بہت آرزو تھی کہ میں اس عظیم الشان یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کروں لیکن حالات نے مجھے موقع ہی نہ دیا۔ مجھے یقین تھا کہ تم ہی میرے اس خواب کو تعبیر دو گے۔"

پھر دادا جان دیر تک مجھ سے تصوف اور معرفت کی باتیں کرتے رہے۔

پھر میں حصولِ علم کے لیے جامعۃ الازہر چلا گیا۔ وہاں بھی مجھے بہت عجیب وغریب تجربات ہوئے۔ ایسے بھی لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں جو بظاہر بہت نیک اور پارسا نظر آتے تھے لیکن ان کا باطن ایسا نہیں تھا۔

☆☆☆

اسلامی علوم کی اعلیٰ تعلیم کے بعد میں پاکستان لوٹ آیا۔

اصلاح قرآن وسنت میں سحر (جادو) ایسے امر عجیب کو کہا جاتا ہے جس میں شیاطین کو خوش کرکے ان کی مدد حاصل کی گئی ہو، پھر شیاطین کو راضی کرنے کی مختلف صورتیں ہیں، کبھی ایسے منتر اختیار کیے جاتے ہیں جن میں کفر وشرک کے کلمات ہوں اور شیاطین کی مدح کی گئی ہو یا کواکب ونجوم (ستاروں) کی عبادت اختیار کی گئی ہو یا کوئی بھی ایسے اعمال اختیار کیے جاتے ہیں جو شیطان کو پسند ہوتے ہیں، مثلاً کسی کو ناحق قتل کرکے اس کا خون استعمال کرنا یا جنابت اور نجاست کی حالت میں رہنا۔ طہارت سے دور رہنا، وغیرہ۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کے پاک فرشتوں کو ان اقوال وافعال سے خوش کیا جاتا ہے جن کو فرشتے پسند کرتے ہیں، مثلاً تقویٰ، طہارت اور پاکیزگی، بدبو اور نجاست سے اجتناب، ذکر اللہ اور اعمال خیر، اسی طرح شیاطین کو خوشی ایسے اقوال وافعال سے حاصل ہوتی ہے جو شیاطین کو پسند ہوں، اسی لیے سحر (جادو) عموماً ایسے ہی لوگوں کا کامیاب ہوتا ہے جو گندے اور نجاست میں رہتے ہیں، پاکی اور اللہ تعالیٰ کے نام سے دور رہتے ہیں۔ خبیث کاموں کے عادی ہوتے ہیں، باقی شعبدے اور ٹوٹکے یا ہاتھ کی چالاکی کے کام یا مسمریز وغیرہ کو مجازاً سحر کہا جاتا ہے۔ (روح المعانی)

مرسلہ: صدیقہ بانو، لاہور

کاروبار سے تو مجھے کوئی دلچسپی تھی نہیں یا یوں کہہ لیں کہ ایسے کاروبار سے کوئی دلچسپی نہیں تھی جیسا کاروبار میرے بھائی کررہے تھے۔ میرے لیے ایک ہی راستہ تھا کہ میں درس و تدریس کا شعبہ اپنالوں۔

دادا جان بہت ضعیف ہوچکے تھے۔ ان کی بینائی بھی متاثر ہوگئی تھی اور صحت بھی بہت گر گئی تھی۔

ہاں ابو میں مجھے ایک خوشگوار تبدیلی نظر آئی۔ وہ اب دین کی طرف راغب ہوگئے تھے۔ ان کی زیرنگرانی کئی فلاحی ادارے چل رہے تھے۔

میں نے پاکستان آ کر یہاں کی مختلف یونیورسٹیوں میں ملازمت کی درخواست دے دی۔

اس دن میں تہجد کے لیے اُٹھا ہی تھا کہ ایک ملازم دوڑتا ہوا میرے پاس آیا اور بولا۔ "یوسف میاں! جلدی چلیے،

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بڑے صاحب کی حالت بہت خراب ہے۔ وہ آپ کو بلا رہے ہیں۔"

میں ننگے پیر بھاگتا ہوا دادا جان کے کمرے میں پہنچا۔ ان پر غشی طاری تھی۔ میں نے گھبرا کر انہیں آواز دی۔ "دادا جان..... آنکھیں کھولیں دادا جان!"

میری آواز پر انہوں نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا۔ میں نے تڑپ کر پوچھا۔ "آپ کی طبیعت مجھے اچھی نہیں لگ رہی ہے۔ میں ڈاکٹر کو بلاتا ہوں۔"

"میرے پاس بیٹھ جاؤ بیٹا۔" دادا جان نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ ان کی حالت حیرت انگیز طور پر سنبھل گئی تھی۔ "اب ڈاکٹر کو بلانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں بیٹا۔" وہ سنبھل کر بولے۔ "مجھے ذرا اُٹھا کر بٹھا دو۔"

میں نے انہیں اُٹھایا اور گاؤ تکیے کے سہارے سے بٹھا دیا۔

"یوسف بیٹا! میں اب چراغ سحری ہوں۔ میں نے زندگی بھر جو کچھ کمایا ہے، وہ تمہیں سونپنا چاہتا ہوں کہ تم ہی میرے جانشین بننے کے اہل ہو۔"

"ایسی باتیں کیوں کر رہے ہیں دادا جان؟" میں نے روتے ہوئے کہا۔

"میرے پاس وقت کم ہے بیٹا!" دادا جان نے کہا۔ "آؤ میرے سینے سے لگ جاؤ۔"

میں بے اختیار ان کے سینے سے لگ گیا۔

انہوں نے مجھے سینے سے لگا کر زور سے بھینچا اور تین دفعہ بلند آواز میں کہا۔ "اللہ، اللہ، اللہ۔"

مجھے ایسا لگا جیسے میرا سینہ نور سے بھر گیا ہو اور جسم میں خون کی بجائے آگ دوڑ رہی ہو، میری سانس بُری طرح پھول گئی اور چہرہ پسینے میں تر ہو گیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اچانک ہی میرا جسم بھاری ہو گیا ہو۔

میں نے دادا جان کی طرف دیکھا۔ وہ گاؤ تکیے سے ٹکے ہوئے تھے، ان کا چہرہ لٹھے کی طرح سفید ہو رہا تھا۔ انہوں نے دھیمے لہجے میں مجھ سے کہا۔ "یوسف بیٹا! گھبراؤ مت۔ یہ کیفیت عارضی ہے۔ میں نے اپنا تمام علم..... ادو وظائف اور ریاضت سب کچھ تمہیں منتقل کر دیا ہے۔ اب میں سکون سے مر سکوں گا۔" پھر انہوں نے بلند آواز میں کلمہ پڑھا اور ان کی گردن ڈھلک گئی۔

میں بے اختیار چیخ کر ان کی طرف بڑھا۔ "دادا جان!"

پھر مجھے خیال آیا کہ زندگی تو اللہ کی امانت ہے۔ وہ جب چاہے اپنی امانت واپس لے لے۔ میں نے دادا جان کو سیدھا کر کے لٹایا اور ان کا منہ ڈھانپ دیا۔

اسی وقت ابو اور امی بدحواس سے کمرے میں داخل ہوئے اور مجھ سے بولے۔ "یوسف کیا ہوا ابا جان کو۔ وہ کریم بتا رہا تھا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ان کی طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی؟"

مجھے پُرسکون دیکھ کر وہ یہی سمجھے کہ دادا جان کی حالت سنبھل گئی ہے اور وہ سو رہے ہیں۔

"ابو!" میں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ "دادا جان..... اب اس دنیا میں..... نہیں رہے۔" شدتِ غم سے میرا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ اس دن مجھے احساس ہوا کہ میں دادا جان سے کتنی شدید محبت کرتا ہوں۔

"کیا کہہ رہے ہو بیٹا؟" ابو نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"جی ہاں ابو!" میں نے بہ مشکل جن آنسوؤں کو آنکھوں میں روک رکھا تھا وہ بہہ نکلے۔ "دادا جان، ہم سے بہت دور چلے گئے۔"

ابو اور امی بلک بلک کر رونے لگے۔

میں نے اپنے آنسو خشک کیے اور کسی بزرگ کی طرح بولا۔ "ابو، روتے نہیں ہیں۔ رونے سے مرنے والے کی روح کو اذیت پہنچتی ہے۔"

ذرا سی دیر میں پورا گھر وہاں جمع ہو گیا۔ میرے دونوں بھائی بھی وہاں آ گئے۔ وہ بھی افسردہ تھے۔ گھر کے ملازمین بلک بلک کر رو رہے تھے۔

ظہر کی نماز کے بعد دادا جان کے جسد خاکی کو مٹی کے حوالے کر دیا گیا۔

گھر کے دوسرے لوگ تو چند دنوں میں اس صدمے سے سنبھل گئے لیکن مجھے سنبھلنے میں کئی ہفتے لگ گئے۔

میں اب اپنا کمرا چھوڑ کر دادا کے کمرے میں منتقل ہو گیا تھا۔

ہاں، دادا جان کی وصیت کے بارے میں تو میں بتانا بھول ہی گیا۔ انہوں نے اپنی تمام منقولہ اور غیر منقولہ جائداد شرعی لحاظ سے ابا جان کے نام کی تھی، سوائے فیصل آباد کی ایک ٹیکسٹائل مل اور ڈیفنس سوسائٹی کے ایک بنگلے کے۔ یہ دونوں چیزیں انہوں نے میرے نام کی تھیں۔

میں بھلا اس جائداد کا کیا کرتا لیکن مجھے ایسا محسوس ہوتا

تھا جیسے یہ بھی گویا دادا جان کا حکم ہو۔ سو میں نے ان کے حکم کے آگے سر جھکا دیا۔ میں نے فیکٹری کا انتظام ایک دیانت دار اور نیک منیجر کے ہاتھ میں دے دیا۔ میں نے سوچا تھا کہ ڈیفنس کے اس بنگلے میں خود منتقل ہو جاؤں گا۔ شاید دادا جان بھی یہی چاہتے تھے کہ میں دوسرے لوگوں سے الگ تھلگ رہوں۔

زندگی پھر اسی ڈگر پر چل پڑی۔ میرا زیادہ وقت تو عبادت اور ریاضت میں گزرتا تھا۔ ہاں میں کچھ وقت امی اور ابو کے لیے ضرور نکال لیتا تھا۔

اس دن بھی میں امی کے پاس بیٹھا تھا۔ وہ مجھ سے بولیں "یوسف بیٹا! میں سوچ رہی ہوں کہ اب تمہاری بھی شادی ہو جانی چاہیے۔ ناصر تم سے صرف تین ہی سال تو بڑا ہے اور اس کے ماشاءاللہ چار بچے ہیں۔"

"چھوڑیے امی!" میں نے مسکرا کر کہا۔ "مجھ جیسے مولوی ملا کو کون اپنی بیٹی دے گا؟"

امی غالباً میرا طنز سمجھ گئیں اور بولیں۔ "تم بھی کن لوگوں کی باتوں کو دل پر لیے بیٹھے ہو۔ تم ہامی تو بھرو۔ لڑکیاں تو کئی ہیں میری نظر میں۔"

"امی، اگر آپ کا حکم ہے تو میں اس سے انکار نہیں کر سکتا لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ لڑکی اسلامی شعائر سے بے بہرہ نہ ہو۔ ورنہ میری ساری زندگی اذیت میں گزرے گی۔"

"ارے بیٹا، تم اس طرف سے مطمئن رہو۔ تمہاری بہنیں اگر تمہارے لیے کسی لڑکی کو پسند کریں گی تو کچھ دیکھ کر ہی پسند کریں گی۔"

میری دونوں بہنیں واقعی میری مزاج آشنا تھیں۔

میری دونوں بہنوں نے بہت عجلت کا مظاہرہ کیا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اسی انتظار میں بیٹھی ہوں کہ کب میں شادی کے لیے ہامی بھروں۔ ان دونوں نے ایک مہینے کے اندر اندر ایک لڑکی تلاش کر لی۔ یہ قول امی کے لڑکی صوم وصلوٰۃ کی پابند ہے اور چاند کا ٹکڑا ہے۔ میری بھابیوں اور بھائیوں کو تو میری شادی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ امی اور دونوں بہنیں ہی سرگرم تھیں۔

میں نے ان سے کھلے الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ شادی بہت سادگی سے ہو گی۔ لڑکی والوں سے کہہ دیں کہ ہمیں کسی بھی قسم کا جہیز نہیں چاہیے۔ برات میں صرف گھر کے افراد ہوں گے۔ کسی بھی قسم کی بدعت قطعاً نہیں ہو گی۔

یوں دو ماہ بعد انتہائی سادگی سے میری شادی ہو گئی اور فرزانہ میری دلہن بن کر آ گئی۔

وہ واقعی صوم وصلوٰۃ کی پابند اور باحیا لڑکی تھی اور اللہ نے اسے حسن کی دولت سے بھی جی بھر کے نوازا تھا۔

مجھے یہ جان کر خوش گوار حیرت ہوئی کہ فرزانہ بھی تہجد کی نماز پابندی سے ادا کرتی ہے۔ اس نے بتایا کہ میں گزشتہ کئی برس سے تہجد پڑھ رہی ہوں۔ وہ اکثر نفلی روزے رکھ لیتی تھی۔

دو ہی مہینے میں مجھے احساس ہو گیا کہ میری بھابیوں کا سلوک اس کے ساتھ اچھا نہیں ہے۔ وہ اللہ کی بندی تو منہ سے کچھ کہتی ہی نہیں تھی لیکن میں اس کے احساسات سے بے خبر کیسے رہ سکتا تھا۔ میں نے سوچا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ میں دادا جان کے دیے ہوئے بنگلے میں منتقل ہو جاؤں ورنہ یہاں رہ کر تو تنخیاں بڑھنے کا امکان تھا۔

میں جانتا تھا کہ میرے اس فیصلے سے امی اور ابو کو تکلیف ہو گی۔ میں ان کی اجازت کے بغیر یہ کر بھی نہیں سکتا تھا۔

ایک دن حسبِ معمول میں نمازِ عصر کے بعد ان کے پاس بیٹھا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ امی سے کیسے کہوں کہ میں اب دوسری جگہ منتقل ہونا چاہتا ہوں۔ اس دن میری دونوں بہنیں صفیہ اور سلطانہ بھی آئی ہوئی تھیں۔ وہ دونوں بھی وہیں موجود تھیں۔

اچانک امی نے کہا۔ "یوسف بیٹا! میں ایک بات کہوں، بُرا تو نہیں مانو گے؟"

"ارے امی! کیسی باتیں کرتی ہیں آپ؟" میں نے جلدی سے کہا۔ "میں بھلا آپ کی بات کا بُرا مان سکتا ہوں۔ آپ تو یہ کہہ کر بھی مجھے گناہ گار کر رہی ہیں۔"

امی نے چند لمحے توقف کیا، پھر بولیں۔ "بیٹا میں چاہتی ہوں کہ اب تم اپنے گھر میں منتقل ہو جاؤ۔ بیٹا! میں تمہاری بھابیوں کا رویہ بھی دیکھ رہی ہوں اور بھائیوں کا بھی۔ فرزانہ بے چاری تو بے زبان ہے۔ وہ ان کے طعنے بھی ہنس کر برداشت کر لیتی ہے۔"

"ہاں یوسف!" صفیہ باجی نے کہا۔ "امی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ دونوں بھابیاں فرزانہ کو بات بے بات اس کی غربت کا طعنہ دیتی ہیں اور اس پر یوں حکم چلاتی ہیں جیسے وہ ان کی ملازمہ ہو۔"

"امی، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن میری بھی ایک شرط ہے۔ آپ کبھی میرے ساتھ رہیں گی۔"

امی مسکرا کر بولیں۔ "تم کیا سمجھتے ہو میں تمہیں چھوڑ دوں گی؟ میں کچھ دن تمہارے پاس گزاروں گی اور کچھ دن یہاں رہوں گی۔"

امی نے خود ہی میری مشکل آسان کر دی۔ میرا خیال

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے کہ انہوں نے ابو سے اس موضوع پر بات کر لی تھی ورنہ وہ اپنے طور پر تو اتنا بڑا فیصلہ نہیں کر سکتی تھیں۔

میں فرزانہ کو لے کر اپنے بنگلے میں منتقل ہو گیا۔ مجھے ملازم کی ضرورت نہیں تھی لیکن امی نے اصرار کر کے ہمارے ایک پرانے ملازم نورالامین کے بیٹے شریف اور اس کی بیوی کو بھی ہمارے پاس بھیج دیا۔

نئے گھر میں آ کر فرزانہ بہت خوش تھی۔ میں بھی خوش تھا کہ یہاں مجھ پر کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں تھی۔

اس دوران ملتان ---- یونیورسٹی میں مجھے ملازمت کی پیشکش ہوئی۔ میں نے وہ پیشکش قبول کر لی اور ملتان چلا گیا۔

میرے اوراد و وظائف اور دوسرے عملیات بھی جاری تھے۔ اس دوران مجھ پر یہ انکشاف بھی ہوا کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھے کسی بات سے آگاہ کرنا چاہتا ہے تو میری آنکھیں خود بہ خود بند ہو جاتی ہیں اور بند آنکھوں کے سامنے ایک فلم سی چلنے لگتی ہے۔ اس کے برعکس اگر میں اپنے طور پر مراقبہ کر کے کچھ جاننا چاہوں تو مجھے واضح طور پر کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ بس کچھ خفیف سے اشارے ملتے ہیں۔

ایسا ہی ایک تجربہ مجھے ملتان میں بھی ہوا۔ یونیورسٹی کے رجسٹرار آفس سے دو سو کے قریب چھپی ہوئی ڈگریاں چوری ہو گئیں۔ زیادہ امکان اس بات کا تھا کہ چرانے والے نے ان پر وائس چانسلر اور دوسرے متعلقہ اہل کار کی مہر بھی لگائی ہو گی۔

اس انکشاف کے بعد نزلہ رجسٹرار پر گرا۔ وہ بے چارے انتہائی شریف اور درویش صفت آدمی تھے۔ مجھے یقین تھا کہ وہ ایسی گری ہوئی حرکت کر ہی نہیں سکتے۔ مجھ سے ان کی اچھی یاد اللہ تھی۔ اکثر شام کو وہ میرے غریب خانے پر آ جاتے تھے اور دیر تک مجھ سے دینی معاملات پر گفتگو کرتے تھے۔

جس دن ڈگریوں کی چوری کا انکشاف ہوا۔ وہ حیران پریشان میرے پاس آئے۔ مجھے اس وقت تک چوری کا علم نہیں تھا۔ میں نے گھبرا کر پوچھا۔ ”صفی اللہ صاحب، خیریت تو ہے۔ آپ اتنے پریشان کیوں ہیں؟“

”انہوں نے مجھے بتایا کہ میرے دفتر سے دو سو کے قریب ڈگریاں چوری ہو گئی ہیں اور الزام مجھ پر آ رہا ہے۔“

میں نے انہیں تسلی دی کہ آپ پریشان نہ ہوں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے چاہا تو آپ پر بالکل آنچ نہیں آئے گی۔“

”مولانا صاحب!“ صفی اللہ صاحب نے گلوگیر لہجے میں کہا۔ ”میں نے زندگی بھر عزت سے ملازمت کی ہے۔ اب جب میں ملازمت سے سبکدوش ہونے والا ہوں تو میری عزت پر یہ داغ لگ رہا ہے۔“

میں نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”اللہ جل شانہ ہی عزت کا رکھوالا ہے۔ وہ کبھی کسی کے ساتھ زیادتی نہیں ہونے دیتا۔“

پھر میں نے مراقبہ کیا اور جاننے کی کوشش کی کہ وہ ڈگریاں کس نے چوری کی ہیں؟ میں نے کئی منٹ تک مراقبہ کیا لیکن کوشش کے باوجود مجھے واضح طور پر کچھ بھی دکھائی نہ دیا، بس مبہم سے اشارے سے موصول ہوئے، رفیع، گلستان! میں کوشش کے باوجود ان اشاروں کو سمجھ نہ سکا۔

اسی وقت اذانِ مغرب کی آواز آئی۔ میں نے صفی اللہ صاحب سے کہا۔ ”آیئے صفی اللہ صاحب! پہلے نماز ادا کر لیں، پھر اس مسئلے پر غور کریں گے۔ وہ پاک بے نیاز آپ کے حق میں بہتر ہی کرے گا۔“

ہم دونوں قریبی مسجد میں نماز ادا کرنے چلے گئے۔ مسجد سے واپسی پر میں نے صفی اللہ صاحب کو کھانے پر روکنا چاہا لیکن وہ معذرت کر کے چلے گئے۔

میں اُلجھا ہوا سا اپنے کمرے میں آ گیا۔ میں نے ایک مرتبہ پھر مراقبہ کیا لیکن اس مرتبہ بھی مجھے وہی اشارے موصول ہوئے، رفیع، گلستان!

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان اشاروں کا کیا مطلب ہے؟

دوسرے دن میں یونیورسٹی گیا تو کلاس میں پڑھاتے ہوئے بھی میرا ذہن اُلجھا رہا۔ میں نے طالب علموں سے معذرت کر لی کہ آج میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ آج میں آپ لوگوں کو نہ پڑھا سکوں گا۔

طالب علم میرے مزاج آشنا ہو گئے تھے اس لیے وہ خاموشی سے باہر چلے گئے۔

میں بے اختیار صفی اللہ صاحب کے دفتر کی طرف روانہ ہو گیا۔ صفی اللہ صاحب آج کل سے بھی زیادہ افسردہ اور پریشان تھے۔

میں نے ان سے پوچھا۔ ”صفی اللہ صاحب! آپ کے عملے میں کوئی رفیع نامی شخص بھی ہے؟“

انہوں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”آپ اچھی طرح سوچ کر بتائیں۔ ممکن ہے اس نام کا شخص آپ کے عملے میں ہو؟“ میں نے اصرار کیا۔

”میں گزشتہ سات سال سے اس عہدے پر تعینات ہوں مولانا صاحب! اس سے پہلے بھی میں دس سال تک

اسسٹنٹ رجسٹرار رہا ہوں۔ میں عملے کے ایک ایک فرد کو اس طرح جانتا ہوں۔ ان میں سے کسی کا نام رفیع نہیں ہے۔“

”عجیب بات ہے۔“ میں خود کلامی کے انداز میں بولا۔ ”ممکن ہے آپ کے عملے میں اس نام کا کوئی چپراسی یا دفتری کلرک ہو۔“ میں نے کہا۔

”میں نے آپ سے عرض کیا ہے نا کہ میں اپنے عملے کے چپراسی سے لے کر اسسٹنٹ رجسٹرار تک سب کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ کسی کے نام کے ساتھ رفیع کا سابقہ یا لاحقہ نہیں ہے۔“ پھر وہ کچھ سوچ کر بولے۔ ”ہاں ایک ہیڈ کلرک کا نام محمد رفیع ضرور ہے لیکن رفیع.....“

میں چونک اُٹھا۔ میں نے کہا۔ ”آپ ذرا ان ہیڈ کلرک صاحب کو یہاں بلوائیں۔“

اب صفی اللہ صاحب کے چہرے پر مجھے ناگواری کے تاثرات نظر آئے۔ انہوں نے کہا۔ ”مولانا صاحب، میں شفیع صاحب کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ.....“

”آپ انہیں یہاں بلائیں تو۔“ میں نے کہا۔ ”میں ان سے ایسی کوئی بات نہیں کروں گا جس سے ان کی دل آزاری ہو۔“

اسی وقت ان کے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ انہوں نے ریسیور اُٹھا کر کہا۔ ”السلام علیکم!..... جی ہاں جناب..... میں کوشش کر رہا ہوں..... جی نہیں..... ٹھیک ہے، جو آپ مناسب سمجھیں، کریں۔“ انہوں نے شکستہ لہجے میں کہا اور ٹیلی فون کا سلسلہ منقطع کر کے بولے۔ ”وائس چانسلر صاحب کا ٹیلی فون تھا۔ وہ کہہ رہے تھے کہ اگر ایک گھنٹے کے اندر اندر چور کا سراغ نہ ملا تو مجبوراً وہ کیس پولیس کے حوالے کر دیں گے، اب تو اللہ ہی عزت رکھنے والا ہے۔“

”اللہ تبارک وتعالیٰ بہتر کرے گا، آپ ذرا شفیع صاحب کو یہاں بلوایئے۔“

انہوں نے بے بسی سے میری طرف دیکھا اور گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔

تھوڑی دیر بعد بھاری جسم کا ایک شخص کمرے میں داخل ہوا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں عجب سی چمک تھی۔ اس نے ایک نظر مجھ پر ڈالی، پھر صفی اللہ صاحب سے مخاطب ہوا۔ ”جی سر، آپ نے مجھے یاد فرمایا؟“

”ہاں.....“ صفی اللہ صاحب چونک کر بولے۔ ”شفیع صاحب، چور کا کوئی سراغ ملا؟“

”سر، مجھ سے زیادہ تو آپ کو علم ہو گا۔“ اس نے جواب دیا۔

”شفیع صاحب!“ اچانک میں نے اسے مخاطب کیا۔ ”صفی اللہ صاحب، بہت پریشان ہیں۔ آپ تو خود بھی بال بچے دار آدمی ہیں۔ ان کی پریشانی سمجھ سکتے ہیں۔ آپ لوگ ان کی مدد نہیں کریں گے تو کون کرے گا؟“

”مولانا صاحب! ہم بھی پریشان ہیں۔ ہم سے جو بن پڑے گا، ضرور کریں گے۔“

صفی اللہ صاحب نے بتایا کہ مولانا یوسف صاحب ہماری ہی یونیورسٹی میں پڑھاتے ہیں۔

”میں جانتا ہوں۔“ شفیع مسکرا کر بولا۔ ”مولانا صاحب کے شاگرد ان کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ میرا ایک بھتیجا عارف ان ہی کا شاگرد ہے۔“

”اچھا اچھا، عارف میاں آپ کے بھتیجے ہیں؟“ میں نے مسکرا کر کہا۔ ”آپ کے ماشاء اللہ کتنے بچے ہیں؟“

”میرے دو بچے ہیں۔ ایک بیٹا اور بیٹی۔“ شفیع نے جواب دیا۔

”کیا آپ کے صاحبزادے بھی اسی یونیورسٹی کے طالب علم ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”جی نہیں۔“ شفیع نے جواب دیا۔ ”رفیع نے بی اے کرنے کے بعد ملازمت کر لی تھی۔“

اس کے منہ سے رفیع کا نام سن کر میرے ساتھ ساتھ صفی اللہ صاحب بھی چونک اُٹھے۔

”اچھا، ماشاء اللہ!“ میں نے کہا۔ ”آپ کے صاحبزادے آج کل کہاں ہیں؟“

میرے سوالات سے شفیع کچھ پریشان ہو گیا تھا۔ وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔ ”وہ یہیں ملتان میں ہے۔“

میں نے صفی اللہ صاحب سے کہا۔ ”صفی اللہ صاحب! آپ غالباً بھول گئے کہ آپ کو وائس چانسلر صاحب نے یاد فرمایا تھا۔“ اس کے ساتھ ہی میں نے انہیں باہر جانے کا اشارہ کیا۔

وہ آدمی ذہین تھے، میرا اشارہ سمجھ گئے اور بولے۔ ”اچھا آپ تشریف رکھیں، میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔“

ان کے ساتھ ہی شفیع نے بھی جانا چاہا لیکن میں نے اس سے کہا۔ ”شفیع صاحب، ذرا کچھ دیر رک جائیں، مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنا ہے۔“

شفیع کے چہرے پر اُلجھن کے تاثرات ظاہر ہوئے لیکن وہ بولا کچھ نہیں۔

صفی اللہ صاحب کے جانے کے بعد میں نے اس سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کہا۔ ”شفیع صاحب! اب میں جو کچھ پوچھوں اس کا جواب ذرا سوچ سمجھ کر دیجئے گا۔“

”جی؟“ وہ تلخ لہجے میں بولا۔ ”آپ کو مجھ سے کیا پوچھنا ہے مولانا صاحب؟“

”آپ یہ بتایئے کہ رفیع نے وہ ڈگریاں کسے فروخت کی ہیں؟“

اچانک اس کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ وہ ہکلا کر بولا۔ ”یہ آ..... آپ کیسی بات کر رہے ہیں مولانا صاحب؟“

”وائس چانسلر صاحب کیس پولیس کے حوالے کرنے والے ہیں۔“ میں نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔ ”اگر آپ نے سچ سچ بتا دیا تو میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آپ پر آنچ نہ آئے گی۔ دوسری صورت میں نہ صرف آپ کی ملازمت جائے گی بلکہ آپ کے بیٹے کی ملازمت بھی جاتی رہے گی۔ رسوائی اور بدنامی الگ ہوگی اور ممکن ہے آپ دونوں کو جیل کی ہوا بھی کھانا پڑے۔“

”مولانا صاحب، میں.....“

”آپ نے مجھے نہ بتایا تو پولیس اپنے طور پر آپ سے اُگلوا لے گی۔“ میں نے اسے مزید خوف زدہ کیا۔ ”بتایئے، رفیع نے وہ ڈگریاں کسے بیچی ہیں؟“

”میری عزت آپ کے ہاتھ میں ہے مولانا صاحب!“ شفیع گڑگڑا کر بولا۔

”عزت دینے والا تو وہ رب رحیم ہے شفیع صاحب!“ میں نے کہا۔

”مولانا صاحب، میرے بیٹے نے اس ذلیل حرکت پر مجھے اُکسایا تھا۔ میں بھی اس کی باتوں میں آ گیا۔ اصل میں اگلے ماہ میری بیٹی کی شادی ہے اور میرا ہاتھ بہت تنگ ہے۔“

”شفیع صاحب، آپ آدھے گھنٹے کے اندر اندر تمام ڈگریاں لے آئیں۔ آپ کو جتنی رقم کی ضرورت ہے، میں آپ کو دوں گا۔“ پھر میں کچھ سوچ کر بولا۔ ”ایسا کریں، صفی اللہ صاحب کو بھی اپنے ساتھ لے جائیں۔“

”لیکن وہ.....“

”وہ کچھ نہیں کہیں گے۔“ میں نے کہا۔ ”میں انہیں سمجھا دوں گا۔ وہ خود بھی عزت دار آدمی ہیں، وہ آپ کے خلاف کوئی بھی کارروائی نہیں کریں گے۔“

میں نے اُٹھ کر کمرے کے باہر جھانکا، صفی اللہ صاحب باہر برآمدے میں ٹہل رہے تھے۔

میں نے انہیں بلا کر ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا اور ان سے کہا کہ آپ شفیع صاحب کے خلاف کوئی کارروائی نہ کیجئے گا۔

آدھے گھنٹے کے اندر اندر صفی اللہ صاحب تمام مسروقہ ڈگریوں سمیت لوٹ آئے۔

شفیع نے وہ ڈگریاں چوری کر کے اپنے بیٹے کو دی تھیں۔ اس نے انہیں گلستان کتاب گھر کے مالک کے ہاتھوں بیس ہزار روپے میں فروخت کر دیا تھا۔ گلستان کتاب گھر کا مالک جعلی ڈگریوں کا کاروبار کرتا تھا۔

صفی اللہ صاحب چاہتے تھے کہ ان لوگوں کے خلاف کارروائی ہو لیکن وہ شفیع کی وجہ سے مجبور تھے۔ گلستان کتاب گھر کے مالک کو پکڑا جاتا تو لامحالہ شفیع صاحب بھی لپیٹ میں آتے۔

میں نے وعدے کے مطابق شفیع کو بیس ہزار کی رقم ادا کر دی۔ وہ واقعی ضرورت مند تھا۔

اس ایک واقعے کے بعد ہی نہ جانے کچھ لوگوں کو یہ کیسے علم ہو گیا کہ میں نے صفی اللہ صاحب کی مدد کی ہے اور انہیں کوئی تعویذ وغیرہ دیا ہے کہ چور خود ہی تمام ڈگریاں واپس کر گیا۔

اس کے بعد لوگ میرے پاس اپنی حاجتیں لے کر آنے لگے۔ میں حتی المقدور ان کی پریشانیاں دور کرنے کی کوشش کرتا تھا۔

☆☆☆

میں نے کئی یونیورسٹیوں میں پندرہ طویل برس گزار دیے۔ سر اور ڈاڑھی کے بالوں میں سفیدی آ گئی۔ میری عبادت اور ریاضت میں بھی اضافہ ہو گیا۔ میں مشکل سے دو گھنٹے سوتا تھا۔ میں بوڑھا ہو چلا تھا لیکن فرزانہ کے چہرے پر ابھی تک وہی شگفتگی اور شادابی تھی۔ مجھے اللہ نے اپنی ہر نعمت سے نوازا تھا۔ مجھے یونیورسٹی سے خاصا معقول مشاہرہ ملتا تھا۔ اس کے علاوہ ٹیکسٹائل مل کی آمدنی تھی جو میرا منیجر ہر ماہ میرے بینک اکاؤنٹ میں جمع کرا دیتا تھا۔ میں نے بینک کو بھی سختی سے ہدایت کر دی تھی کہ میری رقم پر کسی بھی قسم کا سود نہ دیا جائے۔ بس ایک ہی خلش تھی کہ اس پاک بے نیاز نے مجھے اولاد کی نعمت سے محروم رکھا تھا۔ میں نے اسے بھی مشیت ایزدی سمجھ کر قبول کر لیا۔ فرزانہ بھی بہت صابر و شاکر تھی۔ اس کی زبان پر کبھی اس محرومی کا تذکرہ نہیں آیا۔ ہاں میں اللہ تعالیٰ سے دعا ضرور کرتا تھا کہ اے مالک کون و مکاں، تو غفور الرحیم ہے، تیری رحمتیں بے پایاں و بے کراں ہیں۔ اے رب ذوالجلال! مجھ پر بھی نظرِ کرم فرما دے اور مجھے اولاد کی نعمت سے سرفراز فرما!

یقیناً اس میں اللہ جل شانہ کی کوئی مصلحت تھی کہ میری دعا اب تک باریاب نہیں ہوئی تھی۔

شدید گرمیوں کے دن تھے۔ یونیورسٹی میں بھی تعطیلات

تھیں۔ میں نمازِ ظہر کے بعد ذرا کمر سیدھی کرنے کے لیے لیٹ گیا تھا۔

اچانک اطلاعی گھنٹی بجی، شریف نے آ کر اطلاع دی کہ یونیورسٹی کے کچھ طالب علم آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔

میں ان کے بے وقت آنے پر چونک اُٹھا۔ میں نے شریف سے کہا کہ انہیں نشست گاہ میں بٹھاؤ۔ میں ابھی آ رہا ہوں۔

میں نشست گاہ میں پہنچا تو وہاں میرے کئی طالب علم موجود تھے اور سب کے چہروں پر افسردگی تھی۔

ان میں سے ایک نے مجھے بتایا کہ میرے ایک طالب علم سعید کا انتقال ہو گیا ہے۔

”انا للہ وانا الیہ راجعون۔“ میری زبان سے بے اختیار نکلا، پھر میں نے پوچھا۔ ”آپ لوگوں کو یہ اطلاع کب ملی؟“

”سر، ابھی کچھ دیر پہلے اس کے گاؤں سے کسی نے ٹیلی فون کر کے بتایا ہے۔“ طالب علم نے جواب دیا۔

سعید بہت ذہین اور سلجھا ہوا بچہ تھا۔ میں اسے بہت پسند کرتا تھا۔ وہ بہاول نگر کے نزدیک کسی گاؤں میں رہتا تھا۔

”سر، ہم لوگ بہاول نگر جا رہے تھے۔“ ایک طالب علم نے کہا۔ ”ہم نے سوچا کہ آپ کو بھی مطلع کر دیں۔“

”بہت اچھا کیا کہ آپ لوگوں نے مجھے مطلع کر دیا۔ چلیے، میں بھی اس بچے کی آخری رسومات میں شریک ہو جاؤں گا۔“ پھر میں نے شریف سے گاڑی نکالنے کو کہا۔

گاڑی نکالنے کی نوبت شاذ و نادر ہی آتی تھی۔ میرا قیام یونیورسٹی کے نزدیک ہی تھا۔ شریف میرا ڈرائیور بھی تھا۔

اس قیامت خیز گرمی میں ہم لوگ بہاول نگر کے لیے روانہ ہو گئے۔ طالب علموں میں سے ایک کے پاس بھی گاڑی تھی۔ کچھ طالب علم میری گاڑی میں سوار ہو گئے تھے۔

ہم بہاولنگر پہنچے تو سعید کا جنازہ تیار تھا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ اس کی حرکت قلب بند ہو گئی تھی۔ مجھے اس بچے کی موت کا بہت افسوس تھا۔

واپسی کے سفر میں میرے ساتھ صرف شریف تھا۔ کچھ طالب علم بہاول نگر میں ہی رہ گئے تھے۔ بقیہ اس طالب علم کی گاڑی میں بیٹھ گئے تھے۔

میں وہاں سے نمازِ عشاء کے بعد نکلا تھا۔

چلتے چلتے اچانک گاڑی کے انجن سے عجیب سی آواز آئی اور دوسرے ہی لمحے ایک دھچکے سے رک گئی۔ میں وظیفے میں مصروف تھا اس لیے کچھ بول نہ سکا۔ شریف گاڑی سے اُترا اس نے انجن کا جائزہ لیا، پھر مجھ سے بولا ”صاحب جی، گاڑی کے انجن میں کوئی ایسی خرابی پیدا ہو گئی ہے جو میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔“

میں نے اشارے سے اسے پُرسکون رہنے کو کہا اور اپنا وظیفہ مکمل کرنے لگا۔

وظیفے کے بعد میں نے اس سے پوچھا۔ ”شریف، معلوم کرو کہ یہ کون سی جگہ ہے۔ کیا یہاں رات گزاری جا سکتی ہے؟“

”صاحب جی، میرا خیال ہے کہ میں گاڑی میں ٹھہرتا ہوں۔ آپ کے لیے کسی سواری کا بندوبست کر دیتا ہوں۔ یہاں آپ کہاں رات گزاریں گے۔ میں گاڑی کی مرمت کرا کے صبح پہنچ جاؤں گا۔“

”اس وقت بھلا کون سی سواری ملے گی؟“ میں نے کہا۔

”آپ گاڑی ہی میں تشریف رکھیں، میں کوشش کرتا ہوں۔“ یہ کہہ کر شریف گاڑی سے اُتر گیا۔ دن کی جھلسا دینے والی گرمی کے برعکس اس وقت موسم خنک تھا۔ یہی تو صحرائی علاقے کی خاصیت ہوتی ہے۔ ان علاقوں میں دن میں انتہائی شدید گرمی پڑتی ہے اور رات جوں جوں گزرتی ہے، خنکی بڑھتی جاتی ہے۔

میں پھر ایک وظیفے کا ورد کرنے لگا۔ وقت آہستہ آہستہ گزرے جا رہا تھا۔ وظیفے کے اختتام پر میں نے کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالی۔ رات کے دو بج رہے تھے۔ میں اس رات بالکل سو نہیں سکا تھا اس لیے اب تہجد تو نہیں البتہ صلوٰۃ اللیل پڑھ سکتا تھا۔

میں گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکلا ہی تھا کہ شریف لوٹ آیا۔

”میں نے تم سے کہا بھی تھا کہ اس وقت کوئی سواری نہیں ملے گی۔“ میں نے نرم لہجے میں کہا۔ ”دیکھو، میاں نزدیک کہیں پانی مل جائے تو میں وضو کر لوں۔“

”صاحب جی، آبادی یہاں سے بہت دور ہے۔ اس صحرائی علاقے میں پانی کہاں؟“ شریف نے کہا پھر چونک کر بولا۔ ”ہاں مجھے یاد آیا، بہاول نگر سے چلتے وقت آپ کے شاگردوں نے ایک کین میں پانی بھر کے رکھ دیا تھا کہ شاید گاڑی میں ڈالنے کی ضرورت پڑ جائے۔ انہوں نے کہا تھا کہ پانی میٹھا ہے، ضرورت پڑنے پر اسے پیا بھی جا سکتا ہے۔“

میں نے اللہ کا شکر ادا کیا اور اس پانی سے وضو کر کے وہیں ریت پر مصلی بچھا کر نماز ادا کی۔

نماز کے بعد شریف نے مجھ سے کہا۔ ”صاحب جی، آپ گاڑی میں ہی آرام کریں۔ اب تو صبح ہی کچھ ہو سکے گا۔“

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اس وقت سونے کا کوئی محل نہیں تھا۔ میں تہجد سے فجر تک مختلف وظائف کرتا تھا۔ میں گاڑی کی عقبی نشست پر بیٹھ گیا اور شریف سے کہا کہ تم سونا چاہو تو سو جاؤ۔ میں تو ویسے بھی جاگتا رہتا ہوں۔

شریف میرے معمولات سے واقف تھا اس لیے وہ گاڑی کی اگلی نشست پر بیٹھ کر سو گیا۔

مجھے وظیفے میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ پھر رات کی سیاہی پر سفیدی غالب آنے لگی۔ وہاں تو کہیں سے بھی اذانِ فجر کی آواز بھی سنائی نہ دی۔ میں نے گھڑی دیکھ کر نمازِ فجر ادا کی اور تلاوت کلام پاک میں مصروف ہو گیا۔ بچپن ہی سے میرا معمول تھا۔ نمازِ فجر کے بعد میں تین پاروں اور بعض اوقات پانچ پاروں کی تلاوت کرلیا کرتا تھا۔ دادا جان مرحوم و مغفور فرماتے تھے کہ یوسف بیٹا! تمہاری قرأت بہت اچھی ہے۔ تلاوت میرے ہی کمرے میں آ کر کیا کرو۔

میں نے قرأت شروع کی تو شریف بھی اُٹھ گیا۔ اس دن مجھ پر عجیب سے جذب کا عالم طاری تھا۔ میں بہت ڈوب کر قرأت کر رہا تھا۔ مجھے کلام الٰہی حفظ تو تھا ہی، عربی پڑھنے کے بعد اس کے معنی بھی سمجھ میں آتے تھے۔ یوں قرأت میں بہت زیادہ لطف آتا تھا۔

میں بہت جذب کے عالم میں قرأت کر رہا تھا۔ میری آواز اس صحرا میں دور دور تک گونج رہی تھی۔

اس دن میں نے پانچ پاروں کی تلاوت کی تھی۔ تلاوت سے فارغ ہو کر میں نے دعا کے لیے ہاتھ اُٹھا دیے۔

اب ہر طرف اچھا خاصا اجالا پھیل گیا تھا۔ شریف نے مجھ سے کہا۔ ”صاحب جی! آپ گاڑی ہی میں رکیں۔ میں یہاں سے واپسی کا انتظام کرتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ ایک طرف چلا گیا۔ وہ نہ جانے کون سا علاقہ تھا۔ دور دور تک آبادی کا نام و نشان نہیں تھا۔ ایک پتلی سی سڑک تھی جس پر ہماری گاڑی ٹھہری ہوئی تھی اور دور تک بے کراں صحرا بکھرا ہوا تھا۔ صحرا کی وسعت دیکھ کر بے اختیار مجھے برسوں پہلے دیکھا ہوا خواب یاد آ گیا۔ تا حدِ نظر ریت ہی ریت تھی۔ ریت کے ایک ایک ذرّے میں اللہ جل شانہ کی صناعی کارفرما نظر آ رہی تھی۔ بے ساختہ میں سورۂ رحمٰن کی تلاوت کرنے لگا۔ سورۂ رحمٰن تو یوں سمجھیے کلام پاک کی زینت ہے۔ اسے عروس القرآن بھی کہا گیا ہے۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس صحرا کا ذرّہ ذرّہ میرے ساتھ تلاوت کر رہا ہو۔ میری آواز بلند سے بلند تر ہوتی چلی جا رہی تھی۔

میں تلاوت سے فارغ ہوا تو مجھے ایسا لگا جیسے گاڑی کی دائیں طرف کوئی کھڑا ہو۔ میں نے گھوم کر دیکھا۔ وہ کوئی فقیر تھا۔ اس کے جسم پر میلا کچیلا پیوند زدہ لباس تھا، گلے میں چھوٹے بڑے موتیوں کی مالائیں تھیں، ہاتھوں کی انگلیوں میں انگوٹھیاں تھیں اور اس کے شانے سے ایک کشکول بھی لٹک رہا تھا۔

مجھے حیرت ہوئی کہ اس ویرانے میں یہ فقیر اچانک کہاں سے آ گیا۔ میں گاڑی کا دروازہ کھول کر نیچے اُترا اور حسب عادت اسے سلام کیا۔ اس نے میرے سلام کا جواب دیا۔ پھر بہ غور میرا جائزہ لینے لگا۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا تا کہ اسے کچھ دے سکوں۔ اچانک فقیر کی کرخت آواز آئی۔ ”رہنے دے اسے، میں جانتا ہوں، تیرے پاس دونوں قسم کی دولت با افراط ہے۔ دین و دنیا دونوں کی دولت تیرے پاس ہے۔“

میں اس کی بات پر چونک اُٹھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھنے کی کوشش لیکن فقیر کرخت لہجے میں بولا۔ ”دھن دولت، زمین جائداد سب یہیں رہ جائے گی۔ انسان کے ساتھ اس کے اعمال جاتے ہیں۔ تو زندگی کی بے ثباتی کو اچھی طرح جانتا ہے۔ اس وقت بھی ایک جواں مرگ جنازے کو کاندھا دے کر آ رہا ہے۔“

میں اس کی بات پر بُری طرح چونک اُٹھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”آپ کون ہیں بابا؟“

”میں تو اس سوہنے رب کا ایک حقیر سا بندہ ہوں۔ بس خلق خدا کی خدمت کرتا ہوں اور خوش رہتا ہوں۔ تو بھی اس سوہنے رب کے بندوں کی خدمت کر، ہمیشہ سکھی رہے گا۔“

”میں کوشش تو کرتا ہوں بابا!“ میں نے کہا۔ ”کہ میری ذات سے دوسروں کو فائدہ ہی پہنچے۔“ یہ کہہ کر میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی تا کہ اس کے بارے میں مزید کچھ معلوم کر سکوں۔

”میرے بارے میں جان کر کیا کرے گا؟ میں تو پچھلے کئی دنوں سے تیرے انتظار میں یہاں بھٹک رہا ہوں۔“

”میرے انتظار میں؟“ میں نے حیرت سے کہا۔ ”میرے انتظار میں کیوں؟“

”میرے پیر و مرشد کا یہی حکم ہے۔“ فقیر نے کہا اور عقیدت سے آنکھیں موند لیں اور جھوم کر بولا۔ ”میرے پیر و مرشد سائیں!“

میں گویا اچھل پڑا۔ مجھے ایک مرتبہ پھر اپنا وہ خواب یاد آیا جو میں نے برسوں پہلے دیکھا تھا۔ ایسا ہی صحرا تھا جب میری ملاقات ایک بزرگ سے ہوئی تھی۔

”تُو بہت قسمت والا ہے۔“ فقیر نے کہا۔ ”میرے پیر و مرشد تجھ پر مہربان ہیں۔ یہ اپنی امانت سنبھال؟“ یہ کہہ کر اس نے اپنی انگلی سے بھدی سی ایک انگوٹھی اُتاری اور میری طرف بڑھا دی۔ ”اسے اپنی انگلی میں پہن لے۔ تُو ہر قسم کے جادو، بلاؤں اور جنات کے شر سے محفوظ رہے گا۔“ پھر اس نے کہا۔ ”میرے نزدیک آ۔“

میں نے انگوٹھی اپنی انگلی میں پہنی اور بے اختیار اس کے نزدیک چلا گیا۔ فقیر نے مجھے سینے سے لگا لیا اور زور سے بھینچا۔

ایک مرتبہ پھر میری وہی کیفیت ہوئی جو دادا جان کے سینے سے لگنے کے بعد ہوئی تھی۔ اس مرتبہ وہ کیفیت زیادہ شدید تھی۔ میرے پورے جسم میں گویا آگ سی بھر گئی تھی۔ پسینا پانی کی طرح بہنے لگا تھا۔ فقیر نے ”اللہ ہو“ کا نعرہ بلند کیا اور صحرا کی وسعتوں میں گم ہو گیا۔

میں گاڑی سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ رفتہ رفتہ میری حالت معمول پر آنے لگی لیکن مجھے اپنے اندر عجیب سی تبدیلیوں کا احساس ہو رہا تھا۔ میں نے پانی کا ایک گلاس پیا تو مجھے کچھ سکون ملا۔ پھر میں گاڑی کا دروازہ کھول کر اگلی نشست پر بیٹھ گیا۔

سورج آہستہ آہستہ بلند ہو رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی گرمی کی شدت میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔

اسی وقت شریف لوٹ آیا۔ اس کے کچھ بتانے سے پہلے ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ ناکام لوٹا ہے۔ وہ نزدیکی بستی میں کچھ لوگوں سے ملا تھا لیکن ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو گاڑی کے انجن کے بارے میں جانتا ہو۔ مکینک بہاولنگر میں مل سکتا تھا۔

حیرت انگیز بات یہ تھی کہ یہ تمام باتیں مجھ پر خود بہ خود منکشف ہوئی تھیں۔

”فکر مت کرو شریف۔“ میں نے کہا۔ ”گاڑی کو یہیں چھوڑو اور شہر پہنچنے کی کوشش کرو۔“ میں نے کہا۔

”لیکن صاحب جی! ہم لوگ شہر کیسے پہنچیں گے؟“ شریف نے تشویش سے کہا۔

”اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس پریشانی میں ڈالا ہے تو وہی ہمیں اس پریشانی سے نکالے گا بھی۔“ میں نے کہا، پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ”شریف! گاڑی میں پٹرول وغیرہ تو ہے، کہیں اس کا پانی تو خشک نہیں ہو گیا ہے؟“

”میں ایک مرتبہ پھر دیکھ لیتا ہوں صاحب جی!“ شریف نے کہا۔ اس نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر سیلف لگایا تو پہلی ہی کوشش میں گاڑی کا انجن اسٹارٹ ہو گیا۔ شریف نے حیرت سے مجھے دیکھا، پھر بولا ”صاحب جی، یہ تو کرشمہ ہو گیا۔ آپ نے تو کمال کر دیا۔“

”شریف! اس میں میرا کوئی کمال نہیں ہے۔ شاید اس پاک بے نیاز کی یہی مرضی تھی کہ ہم یہاں رکیں۔“ میں نے کہا۔

مجھے اچانک اس فقیر کا خیال آ گیا۔ اگر ہماری گاڑی خراب نہ ہوتی تو اس فقیر سے کیسے ملاقات ہوتی۔ اللہ رب العزت کے بھید بھلا انسان کب جان سکتا ہے۔

”اب حیرت چھوڑو اور روانہ ہو جاؤ۔“ میں نے مسکرا کر شریف سے کہا۔

اس نے جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھا دی۔

☆☆☆

اس سفر سے واپسی پر تو میرے شب و روز بدل کر رہ گئے تھے۔ اب دنیا اور اس کی آسائشوں سے بے رغبتی مزید بڑھ گئی تھی۔ نیند برائے نام رہ گئی تھی۔ اب میرا تمام وقت یادِ الٰہی میں بسر ہوتا تھا۔

مجھے یونیورسٹی میں پڑھاتے ہوئے پچیس سال گزر چکے تھے۔ ان برسوں میں مجھے خوشیاں بھی ملیں اور صدمے بھی سہنا پڑے۔ میرے والدین کا سایہ بھی میرے سر سے اُٹھ چکا تھا۔ صفیہ باجی کا بھی انتقال ہو چکا تھا۔ سلطانہ بھابی اپنے گھر میں خوش تھیں۔ ان کی اولاد بھی جوان ہو چکی تھی۔ اب تو فرزانہ کے چہرے پر بھی بڑھاپے کے آثار واضح ہونے لگے تھے۔ وہ واقعی جنتی عورت تھی۔ اس نے زندگی بھر میری خدمت اور اطاعت کی تھی۔ نیک اور صالح بیویاں بھی قسمت سے ملتی ہیں۔

اب مجھے ملتان سے بھی روانگی کا حکم مل گیا تھا حالانکہ اس شہر میں مجھے روحانی خوشی حاصل ہوتی تھی۔ اس شہر میں اللہ جل شانہ کے کئی نیک بندے آسودۂ خاک ہیں۔ میں سید ناظر شاہ رکن عالمؒ کے مزار پر حاضری دیا کرتا تھا، پھر کافی دیر وہاں گزار کر لوٹتا تھا۔ ہر نوچندی جمعرات کو حضرت بابا فریدؒ کے مزار پر حاضر ہوتا تھا۔

ایک دن بابا فرید گنج کے مزار پر حاضری کے دوران مجھے کچھ اونگھ سی آ گئی۔ اچانک میرے کانوں میں آواز آئی۔ ”یوسف! اب یہاں سے کوچ کر۔ تیرے آبائی شہر کو تیری ضرورت ہے۔“

پھر اچانک ہی میں بیدار ہو گیا۔ میں مزار شریف کے حجرے میں ہی تھا۔ وہاں عجیب سی مسحور کن مہک پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے دو رکعت نماز ادا کی اور واپس ملتان آ گیا۔

میں نے دوسرے ہی دن یونیورسٹی کو درخواست دے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دی کہ اب مجھے سبکدوش کر دیا جائے۔

نصیر الدین صاحب میرے پڑوسی تھے۔ بہت نیک اور بامروت انسان تھے۔ وہ اکثر میرے پاس آجایا کرتے تھے۔

اس دن میں نمازِ فجر سے فارغ ہونے کے بعد تلاوتِ کلام پاک کر رہا تھا کہ اطلاعی گھنٹی بج اٹھی۔ شریف نے آکر اطلاع دی کہ نصیر الدین صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ وہ مجھے بہت پریشان لگ رہے ہیں۔

نصیر الدین صاحب واقعی بہت پریشان بلکہ حواس باختہ تھے۔ میں نے تشویش سے پوچھا۔ ”حضرت خیریت تو ہے؟ آپ اتنے پریشان کیوں ہیں؟“

”مولانا صاحب! میں آپ کو کیا بتاؤں۔ میں تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔“ یہ کہہ کر وہ رونے لگے اور بولے۔ ”اگر خودکشی حرام نہ ہوتی تو میں اس وقت مرجانا پسند کرتا۔ اس بدنامی اور رسوائی سے تو موت ہی بہتر ہے۔“

میں نے بہ غور ان کی آنکھوں میں جھانکا تو اچانک مجھ پر سب کچھ منکشف ہوگیا کہ نصیر الدین صاحب کی بڑی بیٹی سعدیہ ان کے ڈرائیور افضل کے ساتھ فرار ہوگئی تھی۔

”آپ پریشان نہ ہوں نصیر الدین صاحب!“ میں نے کہا۔ ”سعدیہ تھوڑی دیر میں واپس آجائے گی۔“

نصیر الدین صاحب نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ان کے چہرے پر حیرت کے آثار تھے۔

”آپ میری بات کا یقین کریں۔“ میں نے کہا ”ہاں اگر ممکن ہو تو سعدیہ اور اس بدبخت افضل کا کوئی استعمال شدہ کپڑا مجھے لا دیں۔“

افضل ان کے بنگلے ہی کے سرونٹ کوارٹر میں رہتا تھا۔ چند منٹ بعد وہ افضل کی ایک قمیص اور سعدیہ کا استعمال شدہ دوپٹا لے آئے۔

”اب آپ جائیں اور سعدیہ کی واپسی کا انتظار کریں۔ اللہ جل شانہ نے چاہا تو وہ دونوں ایک گھنٹے کے اندر اندر لوٹ آئیں گے۔“

نصیر الدین صاحب اپنے گھر چلے گئے۔ میں نے شریف کو ہدایت کی کہ اس وقت میں ایک بہت ضروری وظیفہ کر رہا ہوں۔ اس دوران میں کسی کو بھی میرے کمرے میں مت آنے دینا۔ پھر میں نے کمرا اندر سے بند کیا اور ان دونوں کے کپڑے سامنے رکھ کر ایک انتہائی زود اثر اور آزمودہ وظیفہ شروع کر دیا۔ وہ بہت جلالی وظیفہ تھا۔ میں پانی کا جگ لے کر بیٹھا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد مجھے پانی کے چھینٹے چہرے پر مارنے کی ضرورت پڑتی تھی۔

آدھے گھنٹے کے اس وظیفے نے مجھے ہلکان کر دیا۔ وظیفے سے فارغ ہو کر میں نے غسل کیا تو خاصا پُرسکون ہوگیا۔ مجھے یقین تھا کہ اس جلالی وظیفے کے باعث افضل اور سعدیہ واپس آنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ میں دل جوئی کے لیے نصیر الدین صاحب کے گھر چلا گیا۔

وہ بے چارے مجھے دیکھ کر خوش ہوگئے۔ انہوں نے مجھے ملاقاتیوں کے کمرے میں بٹھایا اور بولے۔ ”مولانا صاحب! آپ ہی میری عزت کا بھرم رکھنے والے ہیں۔“

”یہ کہہ کر مجھ گناہ گار کو مزید گناہ گار مت کریں نصیر الدین صاحب! عزت دینے والی ذات اس رب رحیم کی ہے۔ میں تو اس کا ایک حقیر بندہ ہوں۔“

اچانک دروازہ کھلا اور ایک خوبرو نوجوان حواس باختہ سا کمرے میں داخل ہوا۔ اسے دیکھ کر نصیر الدین بپھر کر بولے۔ ”نمک حرام! میں نے تجھے اپنی اولاد... کی طرح رکھا، تو نے مجھے اس کا یہ صلہ دیا۔“

وہ نوجوان اچانک میرے قدموں میں گر پڑا اور روتے ہوئے بولا ”مجھے معاف کر دیں بابا جی! میں بہت گھٹیا اور کمینہ آدمی ہوں۔“

”معافی مجھ سے نہیں، نصیر الدین صاحب سے مانگو۔“ میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ”سعدیہ کہاں ہے؟“

”باہر گاڑی میں موجود ہے۔“ اس نے بتایا۔

وہ نہ صرف نصیر الدین صاحب کی بیٹی کو لے گیا تھا بلکہ ان کی گاڑی بھی لے گیا تھا۔ نصیر الدین صاحب تو اس نوجوان کو پولیس کے حوالے کرنا چاہتے تھے لیکن اس میں بھی ان ہی کی رسوائی تھی۔ بیٹی باعزت واپس آگئی تھی۔ یہی بہت تھا۔

☆☆☆

پھر میں کراچی آگیا لیکن افضل نے مجھے نہ چھوڑا۔ اس کی تو کایا پلٹ ہوگئی تھی۔ وہ ہر وقت یادِ الٰہی میں گم رہنے لگا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ دل و جان سے میری خدمت بھی کرتا تھا۔ میں نے لاکھ چاہا کہ افضل میرے پاس سے چلا جائے لیکن اس نے کہیں جانا گوارا نہ کیا۔ اس دن سے شریف کی بجائے افضل میرا خدمت گار بن گیا۔ میں اب بھی زیادہ وقت یادِ الٰہی میں گزارتا ہوں اور خود کو دنیا والوں کی نظروں سے چھپائے ہوئے ہوں۔ اسی وجہ سے میں نے اپنا اور تمام شہروں کے نام بدل دیے ہیں تاکہ لوگ میری ریاضت میں مخل نہ ہوں۔

جن گزیدہ

محترمہ عذرا رسول صاحبہ
السلام علیکم!
سرگزشت میں پُراسراریت نمبر کا اشتہار دیکھا۔ اپنا ایک واقعہ بھیج رہی ہوں۔ اب بھی جب وہ ایام یاد آتے ہیں تو خوف کی ایک لہر پورے جسم میں دوڑ جاتی ہے۔ خدا گواہ ہے کہ ایک ایک سطر صحیح ہے لیکن اس میں افسانوی طرزِ بیان شامل نہیں کر سکی ہوں پھر بھی اگر آپ کو پسند آجائے تو اسے ضرور شامل کریں۔

شمیم
(کراچی)

ہمارا گھر تین منزلہ ہے۔ میں اور باجی درمیانی منزل میں رہتے تھے۔ اوپر کا حصہ خالی پڑا رہتا یا مہمانوں کے مصرف میں آتا۔ گرمیوں میں باجی اور میں اوپر سونے لگے، رات گئے تک نیند نہ آتی اور ہم دونوں ہنستے بولتے رہتے۔ قصے کہانیوں میں لگے رہتے۔ ایک رات کا ذکر ہے کہ جب ہم نے سونے کے ارادے سے آنکھیں بند کیں تو مجھے اپنے پاؤں کی طرف بے انتہا وزن محسوس ہوا۔ رفتہ رفتہ یہ وزنی چیز پورے جسم پر چھا گئی اور اس نے مجھے اس طرح بے تحاشا مارنا شروع کیا کہ میرے دانت آپس میں ٹکرانے لگے اور سارا جسم لرزنے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ ہلنے جلنے کی طاقت مفقود ہوگئی ہے۔ بدن شل ہے۔ نہ ہل سکتی تھی، نہ کلمہ پڑھ سکتی تھی۔ مشکل سے آیۃ الکرسی پڑھ سکی اور اس کی برکت سے یہ بلا دور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوئی۔ جب ذرا ہوش آیا تو میں نے باجی کو آواز دی، وہ جاگ رہی تھیں۔ پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟“

میں نے کہا ”ڈر لگ رہا ہے۔“

کہنے لگیں ”یہی حال میرا ہے۔“ پھر ہم لوگ ہمت کر کے نیچے کی منزل میں آ گئے۔ ایک بات عرض کر دوں، بہت ہی ڈھیٹ واقع ہوئی ہوں، بہت کم ڈرتی ہوں۔ رسالوں میں پُراسرار کہانیاں پڑھ کر کبھی خوف زدہ نہیں ہوتی۔ خیر وہ باقی رات امن سے گزر گئی۔

صبح کو آنکھ کھلی تو ڈر کا نام ونشان بھی نہ تھا۔ تمام سہیلیوں کو یہ قصہ مزے لے لے کر سنایا اور ان کی گھبراہٹ کا لطف اُٹھایا۔ البتہ دوسری رات اس جگہ سونے پر تیار نہ تھی کیونکہ کل رات اتنی غیبی مار کھائی تھی کہ اس کا تصور بھی تکلیف دہ تھا۔ جب میں نے اوپر سونے سے انکار کیا تو امی نے خوب ڈانٹ پلائی۔ کہا۔ ”نہیں، تمہیں اوپر ہی سونا پڑے گا۔ یہ سب وہم ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں۔“

میں نے کہا ”تو پھر امی! آپ کو بھی میرے ساتھ ہی سونا چاہیے۔“

خیر ہم اوپر جا کر لیٹ گئے مگر نیند کا کوسوں پتا نہ تھا۔ باجی بھی جاگ رہی تھیں اور ڈر رہی تھیں۔ یکا یک مجھے اپنا بدن پھر شل ہوتا محسوس ہونے لگا۔ بہ مشکل تمام امی کو اُٹھایا۔ اف! یہ امی کا چہرہ تھا..... اس قدر ڈراؤنا اور اس درجہ بھیانک کہ میری چیخ نکل گئی۔

میں نے کہا۔ ”خدارا، امی! آپ مجھے نیچے لے چلیں۔ میں یہاں ایک منٹ نہیں ٹھہر سکتی۔“

خیر صاحب! امی سہارا دے کر نیچے لائیں۔ سب گھر والے گھبرا کر اُٹھ گئے۔ غرض پوری رات اسی خوف واضطراب میں گزر گئی۔ سورج نکلا تو اور بھی حالت خراب ہو گئی مگر میں نے اپنی خرابی صحت کا ذکر امی سے نہیں کیا۔ خفا جو ہونے لگتیں مگر نہ جانے خود امی کو کیا ہوا؟ چیخ مار کر رونے لگیں۔

اس کے بعد مجھے ایسا لگا کہ کوئی نادیدہ ہاتھ میری پشت سے جسم میں داخل ہو کر کلیجا نکال رہا ہے۔ بیان نہیں کر سکتی کہ اس احساس سے کتنی تکلیف ہو رہی تھی۔ اب بہن کی حالت بھی خراب ہونے لگی۔ ان پر بھی شدید اضطراب طاری ہو گیا۔ لیکن سب سے زیادہ کرب وتکلیف میرے چہرے سے نمایاں تھی۔ چاہتی تھی کہ مجھے کوئی پیٹھ کی طرف سے پکڑ لے، کسی طرح چین نہ آتا تھا۔ امی نے جو یہ حال دیکھا تو پڑوس کی ایک عورت کے ساتھ کسی مولوی صاحب کے پاس بھیج دیا۔ انہوں نے گلے میں ڈالنے کے لیے تعویذ دیا اور فرمایا۔ ”جنات“ کا اثر ہے۔“ ہدایت کی کہ کبھی کھلی جگہ غسل نہ کرنا اور غسل خانے میں بھی کپڑوں سمیت نہانا۔ گھر آ کر میں نے تعویذ گلے میں ڈال لیا مگر کس قیامت کا تھا وہ جن کہ اس تعویذ سے بھی اس کا بال بیکا نہ ہوا۔

ایک رات میں لیٹی تھی اور عالم ہوش میں تھی۔ پڑوس میں جو لڑائی جھگڑا ہو رہا تھا اس کا شور بخوبی سن رہی تھی۔ یکا یک میں نے دیکھا (یعنی محسوس کیا بستر پر لیٹے لیٹے) کہ میں گھر سے دروازے سے باہر نکل رہی ہوں اور اس وقت ہماری بیٹھک سے (جو کہ باہر دروازے سے متصل ہے) ایک بے انتہا لمبا شخص برآمد ہوا۔ سیاہ چمک دار رنگ، بڑی بڑی سرخ آنکھیں، سفید لٹھے کی دھوتی لیکن میلی۔ سر پر صافہ، گلے میں تعویذ، بنیان کی طرز کی واسکٹ اور ہاتھ میں حد درجہ چمک دار چھری، میں نے دیکھا کہ یہ شخص ابا جان کو ننگی ننگی، گندی گندی گالیاں دے رہا ہے۔ ہمارے گھر کے سامنے مندر ہے۔ اس کے ساتھ سرس کا درخت کھڑا ہے۔ پھر اس ہیبت ناک شخص نے اتنی ہیبت ناک چیخ ماری کہ میرے کان کے پردے پھٹ گئے اور میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں، دیکھا کہ میرے دونوں ہاتھ کانوں پر ہیں اور میں تھر تھر کانپ رہی ہوں۔ یہ ایک طویل داستان ہے۔ اس داستان کو دُہرانے کے لیے میری روح بے قرار تھی لیکن میں مارے ڈر کے اس کہانی کو دُہرانا نہیں چاہتی تھی لیکن آج چاہے کچھ ہو جائے، میں اس کہانی کو اول سے آخر تک سنا کر رہوں گی۔

ہمارے مکان کے سامنے سرس کا جو درخت ہے، اس کے سائے میں محلے کے بچے اور دوپہر کو تمام بھنگنیں بیٹھتی ہیں۔ ہمارا نوکر بھی وہیں پلنگ ڈال کر بیٹھتا ہے۔ اس وقت بھی پلنگ وہیں پڑا تھا اور چند بچے اس درخت پر چڑھ کر لنگر ڈال رہے تھے۔ پڑوس کا چھوٹا بچہ (جو ہمارے گھر کا پلا ہوا تھا) بھاگا بھاگا آیا اور ابا جان سے کہنے لگا۔ کہ بابا جان پلنگ پر بچے چڑھے ہوئے ہیں۔ آپ چلیے اور انہیں اُٹھا دیجیے (یہ پلنگ نوکر کا تھا اور وہ اس وقت برف لینے گیا تھا) سب نے کہا کہ بچوں کو کھیلنے دو لیکن پڑوس والے بچے نے ضد کی اور مجبور ہو کر ابا جان کو جانا پڑا۔ اس وقت دوپہر کے ٹھیک بارہ بجے تھے بلکہ ٹیلم ٹیک دوپہر۔ ابا اور پپو (وہی پڑوس کا لڑکا) وہیں بیٹھ گئے۔ یکا یک اس قدر زور کا دھماکا ہوا کہ خدا کی پناہ! سارا محلہ لرز گیا۔ تمام عورتیں اور مرد روتے پیٹتے گھر سے نکلے کہ ہائے! بابا کی خیر نہیں۔ ہم لوگوں کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ گھبرا کر کھڑکی

میں سے جھانکا تو عجیب نظارہ سامنے تھا۔ وہ پہاڑ سا پیڑ زمین پر گرا پڑا تھا۔ بجلی کے تار ٹوٹ گئے تھے۔ راستہ بند ہو گیا تھا۔ سب نے کہا کہ ابا جان، پپو اور ہمارا گائے کا بچہ سب اسی پیڑ کے نیچے دب گئے ہیں۔ لوگ کلہاڑیاں لے کر دوڑے۔ درخت کی شاخوں کو کاٹ کر راستہ بنایا۔ خدا کا شکر ہے کہ ابا ابھی سلامت تھے۔ پپو بھی، سب کے معمولی خراشیں آئی تھیں۔ ہاں البتہ گائے کے بچے کی حالت نازک تھی۔ جو دیکھتا حیرت کرتا، سب مبارک باد دیتے۔ حیرانی یہ ہے کہ اتنا بڑا تناور اور چھتنار درخت یکا یک کیسے گر گیا؟ نہ آندھی، نہ زلزلہ، نہ طوفان اور درخت کا یہ حادثہ! عجیب بات یہ کہ درخت درمیان میں سے کٹ کر گرا تھا جڑ اور کچھ حصہ اپنے مقام پر قائم تھا۔ سب نے کہا کہ اسے بھی گرا دیا جائے ورنہ نقصان پہنچائے گا۔ لیجیے رات کے ٹھیک بارہ بجے وہ حصہ بھی خود بہ خود زمین بوس ہو گیا (جیسے کسی نامحسوس زلزلے نے اسے اکھاڑ پھینکا ہو) رات کو درخت گرنے سے پہلے کسی نے بڑی طاقت کے ساتھ میری چارپائی کو ہلایا اور یہی حادثہ ہماری پڑوسن کے ساتھ پیش آیا جس کے بچے کو ہم نے پالا تھا۔ وہ ڈر کے مارے اُٹھ کر ٹہلنے لگی۔ میں اور باجی وضو کر کے غسل خانے سے آ رہے تھے کہ میں نے دیکھا کہ پلنگ (جو چھت پر پڑا تھا) خود بہ خود ہوا میں اُڑتا چلا آ رہا ہے۔ یا حیرت! میں اور باجی دونوں اس پلنگ کی زد میں تھے (یعنی ہمارے سر پر گرتا) ہم دونوں بھاگے اور پلنگ دھماکے کے ساتھ زمین سے ٹکرایا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ اگر ہم دونوں نہ بھاگتے تو پلنگ ہمارے سروں پر گرتا اور گردن ٹوٹ جاتی۔ اب حادثات کا طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔

دو چار روز گزرے تھے کہ بڑے بھائی جس ٹیکسی میں جا رہے تھے، وہ گہرے کھڈ میں گر گئی۔ اس کھڈ میں پانی بھرا ہوا تھا۔ بھائی جان کی جان تو اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ بچ گئی، البتہ چوٹیں سخت آئیں جبکہ ان کے ساتھ بیٹھے ہوئے ایک پولیس کانسٹیبل کی ٹانگ ٹوٹ گئی اور ٹیکسی چلانے والے کے دماغ کی کوئی نس پھٹ گئی۔ بے چارہ کئی روز اسپتال میں پڑا رہا۔ چھوٹے بھائی حادثے کی خبر سن کر کراچی سے آئے تو یہ تشویش ناک خبر لائے کہ ”میرا اسکوٹر اُلٹ گیا تھا اور میں سڑک کے بجائے میدان میں جا گرا تھا اس لیے بچ گیا۔“ یہ خطرناک حادثات اور حیرت ناک جانبری۔ ہم خدا کا شکر بھی ادا کرتے تھے اور ستم ظریف قسمت کا شکوہ بھی۔ اب صورت حال میں ایک اور تبدیلی ہو گئی، اب یہ صورت (جسم پر بوجھ محسوس ہونا) بدھ کی رات میں رونما ہونے لگی۔ کبھی کبھی ایسا لگتا کہ کوئی بھاری بھرکم بلی میرے اوپر کود گئی۔ کسی نے شانے پر دونوں ہاتھ سے گھونسے مارے۔ میں کبھی باجی مذاق کر رہی ہیں۔ دیکھا کہ وہ سو رہی ہیں۔ کھانے پینے سے کوئی دلچسپی نہ رہ گئی تھی۔ ہر غذائی چیز سے نفرت، گوشت کھا رہی ہوں اور اچانک گھن آنے لگتی۔ مچھلی پہلے بڑے شوق سے کھاتی تھی اور اب وہ میری چڑ بن گئی۔ مہینے میں ایک دو روز تو کھانا مطلقاً حرام تھا۔ خشک چیزیں مثلاً چنے مجبوراً نگل لیتی تھی لیکن کب تک؟ پھل، دودھ، کھی غرض ہر خوراک سے نفرت سی ہو گئی تھی۔ بے شک چائے ضرور پیتی تھی۔ اس کے بعد یہ شکایت پیدا ہوئی کہ جو چیز کھاتی اسے معدہ قبول نہ کرتا۔ متلی ہوتی، اُبکائیاں آتیں اور قے آ جاتی۔ کافی علاج کرایا مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ رات بھر اس قدر گرمی لگتی جیسے انگاروں پر لوٹ رہی ہوں۔ بار بار اُٹھ کر ٹھنڈا پانی پیتی اور ٹھنڈا پانی سر پر ڈالتی اور پنکھے کے نیچے لیٹ جاتی۔ الغرض مسلسل حالت بگڑتی چلی گئی۔ بخار پیچھا نہ چھوڑتا۔ سر درد کے دورے تو پڑتے ہی تھے، معدے میں بھی شدید درد رہنے لگا۔ پھر ہم کچھ دن کے لیے کراچی آئے تو کرنل گنج کانپور کے ایک بزرگ جو چند مہینے کے لیے کراچی آیا کرتے تھے، کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انہوں نے ایک تعویذ دیا، بازو پر باندھا۔ اس سے معدے کی تکلیف ختم ہو گئی۔ پھر ہم لاڑکانہ نے چلے گئے۔ ایک دن جب میں دوپہر کے وقت آنکھیں بند کیے لیٹی تھی تو بند آنکھوں نے یہ دیکھا کہ ایک سپیرا کہیں سے آیا اور کہنے لگا۔ ”شیم! میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔“

میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں اور امی کو آواز دے کر اپنے پاس بلا لیا۔ یہ سلسلہ کئی روز تک چلتا رہا۔ پہلے وہ (سپیرا) اکیلا ہوتا تھا۔ پھر اس کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی آنے لگے۔ اب تو میری حالت اور خراب ہو گئی۔ گھر والے بھی پریشان تھے۔ امی نے کچھ دعائیں پڑھیں اور کہا کہ ”اگر سپیرے کے واقعے میں کوئی صداقت ہے تو مجھے خواب میں بتا دیا جائے۔“ یہ کہہ کر سو گئیں۔ خواب میں دیکھا کہ ایک سپیرا آیا ہے اور کہہ رہا ہے ”میں شیم کو ہرگز نہ چھوڑوں گا۔ اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ خواہ تم کچھ کر لو۔“

خوف ودہشت سے امی کی آنکھ کھل گئی۔ بڑے بھائی لاہور میں تھے، چھوٹے کراچی میں۔ انہوں نے چھوٹے بھائی کو کراچی خط لکھ کر تمام صورت حال سے مطلع کیا۔ چھوٹے بھائی نے چند سفلی عالموں سے رجوع کیا۔ انہوں نے کہا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کوئی گھبرانے کی بات نہیں۔"

ہم نے حالات سے سمجھوتا کرلیا تھا اور راضی بہ رضا ہوکر بیٹھ گئے تھے۔ اس کے بعد وہ سپیرا تو کبھی نظر نہیں آیا البتہ خوف کی شکایت بدستور رہی۔ یعنی ہر وقت ڈر لگے جارہا ہے۔ ہمیں اب تک کسی سفلی عمل کا گمان نہ تھا بلکہ خوف و دہشت کی اس کیفیت کو نفسیاتی مرض سمجھ رہے تھے۔

جب لاڑکانہ میں ہنگامے شروع ہوئے تو ہم لوگ کراچی منتقل ہوگئے۔ یہاں بھی ان بلاؤں نے پیچھا نہ چھوڑا۔ سب لوگ کہتے کہ میں بیمار ہوں (چہرے سے ایسا ہی لگتا تھا) لیکن ڈاکٹر کہتے تھے کہ کوئی بیماری نہیں، صرف وہم ہے۔ کبھی میں محفلوں کی جان تھی، نہایت زندہ دل، طباع، خوش مذاق۔ میری سہیلیاں سمجھتی تھیں کہ میں بے حد مطمئن زندگی بسر کررہی ہوں لیکن انہیں کیا معلوم کہ مجھ پر کیا گزر رہی ہے۔ سلیقہ مندی اور صفائی میں ہم دونوں بہنوں کی مثال دی جایا کرتی تھی کہ آپ کی لڑکیاں واقعی ہر لحاظ سے قابل قدر ہیں۔ لیکن اب یہ قابلِ قدر لڑکیاں "تصویرِ عبرت" بن کر رہ گئی تھیں۔

ہاں تو جب کراچی آنے کے بعد حالات اور بگڑنے لگے تو لوگوں نے مشورہ دیا کہ "تین ہٹی پر نورانی شاہ کا مزار ہے۔ شمیم کو وہاں لے جاؤ۔ نیاز دلاؤ، ان سے روحانی امداد طلب کرو، وہ بشارت دیتے ہیں اور سب کچھ ظاہر ہوجاتا ہے۔"

میں نے اس مشورے پر کوئی توجہ نہ دی۔ تین ہٹی سے بارہا گزری ہوں لیکن کبھی اس طرف قدم نہیں اُٹھے جبکہ تین ہٹی پر ہی میری ایک سہیلی بھی رہتی ہے پھر ایک روز باجی کی ایک دوست مل گئیں، شہناز نام تھا۔ اس کی حالت بھی خراب ہوگئی تھی یعنی اس پر بھی کوئی اثر تھا۔ آخر شہناز کو پھول والے بابا کے پاس لے گئے۔ پھول والے بابا نے تعویذ دے کر شہناز کو مشورہ دیا کہ تم نورانی شاہ کے مزار پر جاؤ۔ شہناز کو نورانی شاہ کے مزار پر لے جایا گیا۔ وہاں جاکر شہناز کی حالت غیر ہوگئی۔ حال کھیلنے لگی۔ اس نے کہا۔ "میرا نام ربانی ہے۔ میں مکان چاہتا ہوں مکان!"

غرض تین گھنٹے تک شہناز کا یہی جناتی دورہ جاری رہا۔ قصہ مختصر شہناز کے مشورے سے ہم بھی نورانی میاں کے مزار پر گئے۔ وہاں مزار کی جالی پکڑ کر بیٹھنا پڑتا ہے۔ تو خیر میں جمعرات کو نورانی میاں کے مزار پر گئی اور جالی پکڑ کر بیٹھ گئی۔ ایسا لگا کہ بجلی کا کرنٹ لگ گیا۔ عجیب سی حالت ہوگئی۔ وہاں ایک صاحبہ آتی ہیں جن کا دعویٰ ہے کہ ان پر نورانی شاہ تشریف لاتے ہیں۔ وہ مجھے گھور گھور کر دیکھنے لگیں پھر کہا

"تم پر جنات کا اثر ہے۔ تمہاری آنکھوں کی چمک بتا رہی ہے۔" باجی سے کہا کہ "تم پر بھی جادو کرایا گیا ہے۔"

ہمیں کچھ یقین آیا، کچھ نہ آیا۔ امی کو بتایا انہوں نے کہا کہ تم اس عورت کے چکر میں نہ پڑو البتہ مزار پر جاتی رہو۔

ایک روز شب جمعہ میں تو میری مصیبت ہی آگئی۔ سوئے تو دیکھا کہ عجیب سی جگہ ہے، اندھیرا پھیلا ہوا ہے۔ دو عورتیں بیٹھی جھوم رہی ہیں پھر ایک سایہ نما وجود زمین پر لیٹا نظر آیا۔ اتنا لمبا چوڑا کہ بیان نہیں کرسکتی۔ اس کے جسم پر، اگر اسے جسم کہا جائے، بال تھے۔ سائے کی شکل مجھے نظر نہ آئی۔ اب جو دیکھا تو وہ دونوں عورتیں جو بیٹھی جھوم رہی تھیں نظروں سے اوجھل ہوگئی ہیں، پھر وہی سایہ جو زمین پر لیٹا ہوا تھا، مجھ پر چھاتا چلا گیا۔ اتنی تکلیف ہوئی۔ بدن میں اتنے کانٹے چبھے کہ بیان نہیں کرسکتی۔ میں نے بے قرار ہوکر آنکھیں کھول دیں۔ اس کے بعد بھی پاؤں کے تلوؤں اور جسم میں کانٹے چبھنے کا احساس ہوتا رہا۔ بیداری میں بھی اپنے وجود پر اس قدر وزن محسوس ہورہا تھا کہ بیان نہیں کرسکتی۔ پھر نہیں معلوم کس طرح نیند آگئی۔ دیکھا کہ بے تحاشا رقص کررہی ہوں اور کہیں سے گانے کی آواز آرہی ہے، کوئی یہ گیت گا رہا ہے کہ

جانِ من اِک نظر تو اِدھر دیکھ لے
جانِ من تو اِک نظر اِدھر دیکھ لے

اس سے پہلے بھی ایک مرتبہ اس گیت کی آواز میرے کان میں آئی تھی، میں نے پوچھا۔ "کسی نے ریڈیو کھولا ہے یا پڑوس میں کوئی گا رہا ہے؟" تو سب نے انکار کیا۔ یعنی یہ سب خواب میں دیکھ رہی ہوں۔ جی ہاں، وہی گیت جاری تھا اور وہی رقص۔ اور قص بھی اس قدر بے غیرتی کے ساتھ کہ خدا کی پناہ! ایک اجنبی مرد ادھر سے ہے اور دوسرا بائیں طرف۔ اور میں دونوں کے درمیان رقص گناہ کررہی ہوں۔ میں نے دوپٹا سر سے اُتار لیا اور یہ تصور کرنے لگی کہ ریحانہ ہوں۔ بالکل اسی طرح کی فراک پہنے ہوئے جیسی ریحانہ پہنتی ہے۔ کوئی کہہ رہا ہے کہ "تم شمیم نہیں ہو، ریحانہ ہو۔" صبح تک عالم خواب میں یہی رقص مستانہ جاری رہا۔ صبح اٹھ کر امی اور ابا جی کو بتایا اور جو تکلیف مجھ پر گزری تھی، اس کی تفصیل بیان کی۔ ماں باپ کس قدر پریشان ہوئے ہوں گے، آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں۔ میں نے عاجز آکر درگاہ الٰہی میں دعا کی کہ:

"یا الٰہی! مجھے اس روحانی عذاب سے نجات دے اور مجھ پر جو اثر بھی ہے اسے ظاہر کردے۔"

شام کے وقت پھر حضرت نورانی شاہ کے مزار پر حاضر ہوئی تو اچانک گردن کو جھٹکے لگنے لگے۔ میں نے گردن کو قائم رکھنے کی بے حد کوشش کی، اس خیال سے کہ شاید نفسیاتی اثر سے گردن خود بہ خود ہلنے لگی ہے لیکن گردن برابر کسی خودکار کھلونے کی طرح اِدھر اُدھر ہل رہی تھی، آنکھیں بند تھیں۔ سب کی گفتگو سن رہی تھی مگر نہ ہل جل سکتی تھی، نہ بول سکتی تھی۔ سر بے انتہا بھاری ہورہا تھا۔ باجی کی سہیلی نے پوچھا کہ "آپ کون ہیں بتائیں؟" لیکن میں کیا بتاتی؟ کچھ دیر بعد یہ حالت رفع ہوگئی۔ وہیں ایک صاحبہ آتی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ "جونا مارکیٹ میں میراں سید علی شاہ کا مزار ہے۔ اس مزار پر جاؤ۔ تمہارے سر پر جو جن مسلط ہے۔ وہ خود بول اُٹھے گا اور نام ونشان بتادے گا۔" پھر ہم نے یہ معمول بنایا کہ جمعرات کو نورانی میاں کے مزار پر جاتے تھے اور جمعہ کو میراں سید علی شاہ کے مزار پر۔ دوسری جمعرات کو میں نورانی شاہ کے مزار پر بے انتہا کھیلی یہاں تک کہ بے حال ہوگئی۔ اسی عالم میں کسی عورت کا پاؤں میرے جسم سے لگ گیا۔ پاؤں کا لگنا غضب ہوگیا۔ جنون جو طاری ہوا مجھ پر تو اس عورت کو بے تحاشا پیٹنے لگی۔ خود بہ خود میری زبان سے نکلا کہ "سامنے سے ہٹ جاؤ۔ میں اسے جان سے ماردوں گا، گلا دبادوں گا۔"

میں برابر انہی فقروں کو دُہرائے جارہی تھی۔ جو بھی سامنے آتا اس پر حملہ کر بیٹھتی۔ حاضری کے درمیان چیخ چیخ کر رو رہی تھی۔ جالیوں سے سر ٹکرا رہی تھی۔ شام کے چھ سے رات کے دس بج گئے۔ سلام بھی ختم ہوگیا۔ مگر میں اپنی اصلی حالت پر نہ آئی۔ پھر مجھے قے آئی۔ جونا مارکیٹ والی صاحبہ نے پوچھا۔ "کیا اس وقت تک حال کھیلے گا، جب تک قوالی نہ ہوگی؟"

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ نڈھال ہوکر فرش پر گر گئی اور انہی خاتون کی گود میں کھیلنا شروع کردیا۔ الغرض عجیب تماشا تھا، یہاں تک کہ قوال آگئے۔ ڈھولک پر تھاپ پڑی تو مجھے ہوش آگیا۔ البتہ اب دوسری عورتیں تڑپنے لگیں۔

دوسرے روز جمعے کا دن تھا۔ ہم میراں سید علی شاہ کے مزار پر گئے، وہاں پر ایک چکی لگی ہوتی ہے۔ مریضوں یا جن گرفتہ اور آسیب زدہ لوگوں کو اس چکی کے گرد گھمایا جاتا ہے۔ اگر واقعی وہ کسی جن کے زیر اثر ہوتا ہے تو اس کا داہنا ہاتھ چکی سے چپک جاتا ہے۔ اس پر بے خودی طاری ہوجاتی ہے اور پھر وہ سب کچھ بتانے لگتا ہے۔ میں اور شہناز دونوں اس چکی کے گرد گھومنے لگے۔ ہم دونوں گھوم رہے تھے کہ میری سہیلی شہناز یکا یک نگاہوں کے سامنے سے اوجھل ہوگئی اور میں بڑی تیزی سے لٹو کی طرح گھومنے لگی۔ شہناز کہیں نظر نہ آئی، اب میں سچ مچ گھبرا گئی۔ دل کہہ رہا تھا کہ خدا کے لیے یہاں سے بھاگ چل، میں نے بار بار باجی اور ان کی سہیلی سے پوچھا کہ میں چکی کو چھوڑ دوں، میرا داہنا ہاتھ چکی سے چپک گیا تھا مگر انہوں نے منع کیا۔ باجی نے بعد میں بتایا کہ اس وقت میری آنکھیں خون کبوتر کی طرح لال تھیں اور میں چکی کو چھوڑ کر بھاگ گئی تھی مگر پھر آکر چکی سے چپک گئی اور پیچھے کی طرف گئی۔ میری بتیسی بند ہوگئی تھی۔ لوگوں نے پوچھا کہ "آپ کون ہیں؟" مگر میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس سب کچھ رہا تھی، بس بولنے چالنے کی قوت سلب ہوگئی تھی اور مسلسل اس شدت سے گھورے جارہی تھی جیسے آنکھیں حلقۂ چشم سے باہر نکل پڑیں گی۔

جنّات ہمیں نظر کیوں نہیں آتے؟

یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا تسلی بخش جواب نہ ملنے پر عموماً انسان جنّات کے وجود سے ہی انکاری ہوجاتا ہے۔ اس کا جواب حضرت ابن عباس سے یہ روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب جنوں کے باپ "سومیا" کو پیدا کیا اور اس سے اس کی کوئی خواہش پوچھی، تو اس نے اللہ کے حضور اپنی عرض پیش کی کہ مالک! میری خواہش ہے کہ ہم تو تیری سب مخلوقات کو دیکھ سکیں مگر تیری دوسری مخلوقات ہمیں نہ دیکھ سکیں۔" اللہ تعالیٰ جل شانہ ہونے اس کی یہ خواہش پوری فرمادی۔ چنانچہ جنات ہمیں دیکھ سکتے ہیں مگر ہم انہیں دیکھنے سے قاصر ہیں۔ "سومیا" نے اللہ تعالیٰ سے اپنی ایک اور خواہش کا اظہار کیا کہ ہم بوڑھے ہونے کے بعد پھر سے جوان ہوجائیں اور موت کے بعد ہمیں زمین میں دفن کیا جائے۔ مالک حقیقی نے اس کی یہ خواہش بھی پوری فرمادی۔ چنانچہ جب جنّات انتہائی بوڑھے ہوجاتے ہیں تو وہ طبعی موت سے پہلے ایک بار پھر سے جوان ہوجاتے ہیں اور پھر طبعی عمر پانے کے بعد جب موت آتی ہے تو زمین میں دفن کیے جاتے ہیں، واضح رہے کہ جنّات کی عمریں ہزاروں سال ہوتی ہیں۔

مرسلہ: آفتاب احمد خان، ساہیوال

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہر لفظ اور کلمہ اپنے اندر اثر رکھتا ہے خواہ وہ کسی بھی زبان کا ہو مثلاً دوست، ماں، بہن، بھائی اور محبوب وغیرہ کہ ان میں محبت اور مٹھاس کے اثرات ہیں چنانچہ ان الفاظ سے اگر کسی اجنبی کو بھی مخاطب کیا جائے تو اس کے اوپر خوشگوار اثر ہوتا ہے اور وہ پکارنے والے کے لیے اپنے دل میں اپنائیت اور لطافت محسوس کرتا ہے جبکہ بدمعاش، شیطان، بے ایمان، بدکار، سود خور، شرابی وغیرہ جیسے الفاظ سے اگر کسی اپنے ہی آدمی کو مخاطب کیا جائے تو اس کے دل میں نفرت و غصہ کے جذبات، پکارنے والے کے خلاف پیدا ہونے لگتے ہیں۔ یہ اصولی بات ایسی ہے جس پر خود مشاہدہ سب سے بڑی دلیل ہے۔ بہرحال جب یہ بات ثابت ہے تو پھر عملیات کے فن میں کالے اور سفلی عمل یا نوری اور قرآن و حدیث پر مشتمل عملیات کے الفاظ و کلمات میں پائے جانے والے اثر پر کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بس فرق یہ ہے کہ کالے اور سفلی عمل کے منتر کفر اور شرکیہ الفاظ پر مشتمل ہوتے ہیں اور انہیں پڑھ کر شیاطین اور کافر و مشرک جنات کو مخاطب کیا جاتا ہے جن سے ان جنات پر خوشگوار اثر ہوتا ہے اور پھر وہ عامل کے ساتھ تعاون کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح نوری یا جائز عملیات میں قرآنی آیات، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے تعلیم فرمودہ کلمات اور دعائیں، صحابہ و تابعین اور بزرگانِ دین کے مجرب اوراد و وظائف نیز اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ بھی اپنے اندر بے مثال اور نہایت طاقت ور اثر رکھتے ہیں، پس ان پاک کلمات کے پڑھنے سے اللہ تعالیٰ کی رحمت متوجہ ہوتی ہے اور اس کی معصوم مخلوق یعنی فرشتے خوش ہو کر اس کے پاس جمع ہو جاتے ہیں جیسا کہ احادیث میں ہے۔ اسی طرح نیک

دوسرے جمعے کو ہم، میں اور باجی پھر میراں سید علی شاہ کے مزار پر حاضر ہوئے۔ باجی مزار کی طرف گئیں، میں دوسرے حجرے میں چلی گئی۔ وہیں میری حاضری ہوگئی، حاضری سے مطلب ہے بے خودی طاری ہو جانا۔ مسلسل تین گھنٹے اس قدر کھیلی کہ دماغ کی نسیں چٹخنے لگیں۔ میں سر کو روکنا چاہتی تھی لیکن وہ برابر ہلے جا رہا تھا۔ اس شدت سے کہ خدا کی پناہ! پورے حجرے میں لوٹتی پھرتی تھی۔ باجی کی سہیلی نے پوچھا۔ ”آپ شمیم کو نہیں چھوڑیں گے؟“

یہ سن کر میری مٹھیاں بھنچ گئیں۔ دانت سختی سے بند ہو گئے۔ یہ کیفیت ہسٹریا سے مشابہت رکھتی ہے۔ بہرحال بڑی دیر کے بعد ہم گھر واپس لائے گئے۔ دو تین روز خیریت سے گزر گئے۔ پیر کے روز کا قصہ ہے کہ میں روٹی پکا رہی تھی کہ اچانک گردن کو جھٹکے لگنے لگے۔ میں جلدی سے باورچی خانے سے باہر آئی مگر جنّاتی دورے کی شدت میں کمی نہ آئی۔

آخر کار مجھے لٹا دیا گیا۔ مزار سے جو پانی لائے تھے، وہ پلایا گیا۔ کچھ دیر کے بعد میں تڑپ کر اٹھی اور پلنگ پر ہی کھیلنے لگی۔ کھیلتے میں یہ محسوس ہوتا کہ بالوں سے شائیں شائیں کی آوازیں نکل رہی ہیں۔ پورے تین گھنٹے تک یہی حالت رہی۔ بار بار سجدے میں گر پڑتی اور کلمہ پڑھتی۔ حالت اتنی خراب ہوئی کہ بھائی بھی گھبرا گئے۔ طے یہ ہوا کہ کسی عامل یا جن اُتارنے والے کے پاس چلنا چاہیے کیونکہ فقط مزار پر جا کر حال کھیلنے سے کام نہیں چلا۔

آخر ایک عامل صاحب کا نام تجویز ہوا لیکن پتا چلا کہ وہ ہزارے چلے گئے ہیں اور کبھی جون تک آئیں گے۔ میری حالت اس قدر خراب تھی کہ جون تک انتظار ممکن نہ تھا۔ چنانچہ ایک پانی والے بابا کے پاس گئے۔ وہ بھی جنّات کے ایکسپرٹ تھے۔ انہوں نے میرا حال دیکھ کر کہا۔ ”جنّ وغیرہ کچھ نہیں ہے۔ اگر کوئی ثابت کر دے کہ جن کا اثر ہے تو میں دو ہزار روپے دوں گا۔“

یہ سن کر بڑے بھائی خوش ہوئے کیونکہ ریحانہ، جسے وہ رانی کہتے تھے، اس الزام سے بری ہو جاتی تھی کہ اس نے ہم پر کچھ کرایا ہے۔ چھوٹے بھیّا نے کہا کہ ”میں نہ کہتا تھا کہ جنّ جادو کا قصہ نہیں، محض نفسیاتی بیماری ہے۔“

مگر نفسیاتی بیماری کہہ دینے سے ہمارے مرض میں تو کوئی افاقہ ہوا نہیں، وہی تکلیف تھی اور وہی حال۔ گھر کا ماحول بعض اوقات بے حد پُراسرار ہو جاتا تھا اور دونوں بھائی بھی اس پُراسراریت کو محسوس کرتے تھے لیکن منہ سے اقرار نہ کرتے تھے۔

شہناز بے چاری بھی اسی جنّاتی مرض میں مبتلا اور ایک پھول والے بابا کے زیرِ علاج تھی۔ ہم بھی ان کے پاس گئے۔ پھول والے بابا نے ہم پر نظر ڈالی اور چھری لے کر کچھ پڑھنے لگے۔ مگر حاضری نہ ہوئی، یعنی ہم پر حال طاری نہ ہوا تو فرمانے لگے۔ ”بھیجا ہوا لگتا ہے۔“

نہ جانے اس فقرے سے ان کا کیا مطلب تھا؟ انہوں نے ایک گنڈا عنایت کیا۔ جونہی میں نے گھر آ کر گنڈا گلے میں باندھا، سر کا پچھلا حصہ من بھر کا ہو گیا اور حال کی سی کیفیت

جنّات بھی اس سے خوش ہوتے ہیں۔ یہ ان پاک کلمات کا اثر ہے۔

دوسری بات اصولی یہ ہے کہ سفلی عمل میں جو کلمات اور منتر ہوتے ہیں انہیں براہِ راست شیاطین جنات کو مخاطب کر کے ان سے مدد مانگی جاتی ہے اور یہ بڑے شیطان یعنی ابلیس ہی کی ذریت اور اولاد ہے اس ابلیس نے شیطانی کاموں کے لیے باقاعدہ شیاطین مقرر کیے ہوئے ہیں اور ہر شیطان کی ڈیوٹی تقسیم کر رکھی ہے کوئی انسانوں کو بہکانے پر مقرر ہے۔ کوئی لڑائی جھگڑا کروانے پر مقرر ہے، کوئی قتل و قتال پر مقرر ہے تو کوئی میاں بیوی میں جھگڑا اور نا اتفاقی کرواتا ہے، کسی کے ذمے بھرے گھر کو اُجاڑنے کی ڈیوٹی ہے تو کوئی نفرت و عداوت پیدا کرواتا ہے، غرضیکہ دنیا میں جتنے بھی شیطانی اور گناہ کے کام ہوتے ہیں تو ان کے انجام پانے میں ابلیس اور اس کی شیطان ذریت بھی حصّہ دار ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ نے اتنی قدرت بہرحال شیطان کو دی ہے لیکن اس کے ساتھ انسان کو بھی یہ قدرت دی ہے کہ وہ صحیح اور غلط، جائز و ناجائز اور حلال و حرام میں تمیز کر کے اپنے اختیار پر عمل کرے۔ شیطانی کاموں میں ایک سحر اور جادو یا کالا علم اور سفلی عملیات بھی ہے، ظاہر ہے ابلیس نے اس کے لیے بھی باقاعدہ ایک گروہ بنا کر شیاطین کی ڈیوٹیاں لگا رکھی ہیں، سفلی اور جادو کے منتروں اور کالے عملیات میں اسی گروہ سے مدد مانگی جاتی ہے پس اس گروہ کو موکلات اور گروہ کے ہر فرد کو موکل کہا جا سکتا ہے۔ یہ ہے حقیقت، موکلات کی۔

مرسلہ: فصیحہ خانم، راولپنڈی

طاری ہونے لگی۔ میں نے ڈر کر گنڈا اُتار دیا تو ذرا طبیعت سنبھلی۔ جمعے کے روز پھر میراں سید علی شاہ کے مزار پر حاضری ہوئی۔ ہاتھ فوراً چکی سے چپک گیا اور میں پہیے کی طرح چکی کے گرد گھومنے لگی، جس طرح بچے لٹو گھماتے ہیں اسی طرح کوئی پُراسرار قوت چکی کے گرد مجھے گھما رہی تھی۔ میرے منہ سے ہیبت ناک چیخیں نکل رہی تھیں اور بار بار کہہ رہی تھی۔ ”ہائے مر گیا، ہائے مر گیا، چھوڑ دے ظالم چھوڑ دے۔ ارے سنگدل! میرا قصور معاف کر دے۔“

لوگوں نے مجھے زبردستی پکڑ کر مزار کی جالی کے پاس بٹھا دیا۔ وہاں بھی کھیلتی رہی، جھومتی رہی۔ اگر کوئی مجھے روکنے کی کوشش کرتا تو میں اس کو ڈانٹتی کہ ”بھاگ جاؤ، میرے قریب نہ آؤ۔“

وہیں ایک صاحبہ موجود تھیں جنہوں نے کہا کہ ”میں سیدانی ہوں۔“ انہوں نے مجھ سے کہا کہ ”بتا تو کون ہے؟ تو بچی کو کیوں ستا رہا ہے؟“

میرے ذریعے جنّ نے جواب دیا ”میں نہیں بتاؤں گا، میں نہیں چھوڑوں گا۔“ ان سیدانی صاحبہ نے ضد کی۔ ”نہیں، تجھے بتانا پڑے گا، تجھے چھوڑنا پڑے گا۔“

اس پر مجھے غصہ آ گیا یا یہ کہ جن کو غصہ آ گیا اور میں نے انہیں بُری طرح پیٹ ڈالا، پھر اچانک میری آواز مردوں کی طرح بھاری ہو گئی اور اول فول بکنا شروع کر دیا۔ دوسرے جمعے کو مزار پر گئی تو میں نے مٹھیاں بھینچ لیں۔ پاؤں پٹخنے لگی، میری گردن کمر سے لگ گئی اور چیخنے لگی۔ ”ارے ظالم! میری گردن نہ توڑ، میری گردن ٹوٹ رہی ہے۔“

یہ محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی میری گردن مروڑ رہا ہے اور وہ بیچ میں سے ٹوٹ جائے گی۔ میں فرش پر تڑپ رہی تھی۔ ایک خاتون نے میرے بال پکڑ لیے اور پوچھا کہ ”تو کون ہے؟ اپنا نام بتا۔“

میں نے کہا کہ ”مجبور نہ کرو، میں اپنا نام نہیں بتا سکتا۔“

سوال کیا کہ ”تیرے ساتھ کتنی فوج ہے؟“ تو میں نے جواب دیا کہ ”فوج نہیں ہے۔ میں اکیلا ہوں۔“

عصر کی اذان شروع ہوئی تو میں نے پانچ سات بار کلمہ پڑھا۔ میں رو رہی تھی اور خدا کو پکار رہی تھی۔ پھر چند لمحے بعد میں نے حاضرین کو مخاطب کر کے کہا۔ ”میری گردن ٹوٹ چکی ہے، چند لمحے کا مہمان ہوں۔

خدا حافظ!“

پھر میں بے ہوش ہو گئی، بے ہوشی چند لمحے طاری رہی۔ اس کے بعد ہوش و حواس بحال ہو گئے۔ سب نے کہا کہ ”نیاز دلاؤ، شیرینی ہوش میں آ گئی۔“ چنانچہ بہت سی مٹھائی منگوا کر نیاز دلوائی گئی۔ نیاز دلوانے کے تھوڑی دیر بعد ہی پھر سر بھاری ہونا شروع ہو گیا جو علامت ہے جنّاتی دورے کی۔ اس بار کمر پر زبردست دباؤ محسوس ہوا۔ بڑی سخت تکلیف تھی مگر میں خاموشی کے ساتھ اس تکلیف کو سہہ رہی تھی۔ آخر زمین پر گر گئی۔ یعنی دورہ پڑ گیا یا جنّ آ گئے۔

لوگوں نے کہا ”تمہاری تو گردن ٹوٹ گئی تھی، تم تو مر گئے تھے پھر تم کہاں سے آ گئے؟“

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تو میں قہقہے مار کر ہنسنے لگی مگر زبان سے کچھ نہ کہا۔ آخر مجھے لوگ گھر لے آئے۔ پھر اگلے جمعے مزار پر گئی تو چکی پر ہاتھ رکھتے ہی چپک گیا، تکلیف کے مارے ، کمر دُہری ہونے منہ سے آہ نکلی، شدتِ تکلیف کے سبب اور پھر زبان بند ہوگئی، شام تک یہی ہوتا رہا۔ اب شہناز اور نسیم بھی آ گئیں۔ ان پر بھی جناتی اثرات ہیں۔ انہوں نے کہا کہ "چکی پر چلو۔" میں بالکل ٹھیک ٹھاک تھی لہٰذا میں نے کہا کہ "تم ہو آؤ۔ میں نہیں جاؤں گی۔" لیکن وہ بضد ہوگئیں اور میں بھی مجبوراً ان کے ساتھ چکی پر چلی گئی۔ چکی کے قریب جاتے ہی وہ دورہ پڑ گیا۔ بُری طرح چیخنے چلّانے لگی۔ "ہائے! میری کمر! ارے میری کمر ٹوٹی۔"

اب میں نے پنجابی میں گفتگو شروع کر دی۔ پھر فرش پر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں سے سر پیٹنے لگی۔ فرش پر تڑپنے لگی، بال نوچنے لگی۔ پھر اُٹھ کر بھاگی اور مزار کی طرف گئی، جالی پکڑ لی، پھر چلّانے لگی۔ "اوئی ظالما! میری عابدہ بڑی بیمار ہے۔ ایک ہی بیٹی ہے۔ اگر وہ مر گئی تو کیا ہوگا۔ ایک ہی بیٹی ہے۔ اسے پانی کون پلائے گا، گھر پر وہ بالکل تنہا ہے۔ صبح جتنی جلدی کہو گے، آ جاؤں گی، اب مجھے جانے دو۔"

میرا انداز بالکل ایسا تھا گویا کسی سے مخاطب ہوں، کوئی میرے سامنے موجود ہے، جب اس طرح بکواس کر چکی تو غصہ آ گیا۔ کہنے لگی کہ "اچھا! دیکھتی ہوں تو مجھے کس طرح روکتا ہے؟"

یہ کہہ کر میں دروازے کی طرف دوڑی۔ لوگوں نے پکڑ لیا۔ میں دہاڑی۔ "شمیم، اوئے ذلیل، کمینی، آج تیرا جنازہ نکالوں گی۔ دیکھوں تجھے کون بچاتا ہے؟"

باجی سامنے کھڑی تھیں، ان سے کہا۔ "سلطانہ! کتیا، آج تیرا جنازہ بھی نکالنا ہے۔"

یہ ہنگامہ جاری تھا کہ میرے بازو سے وہ تعویذ نکل کر زمین پر گر گیا جو رحمان شاہ نے دیا تھا اور میں نے بے تحاشا رحمان شاہ کو گالیاں دینا شروع کر دیں کہ "بدمعاش بڈھا، اس نے یہ تعویذ دیا تھا کہ معدے کا درد دور ہو جائے گا مگر اس کا مطلب کچھ اور تھا۔ بڑا حرام زادہ ہے۔ شمیم کی ماں کا کلیجا اپنی زبان سے چاٹوں گی۔ دیکھنا ایک ایک کو مار دوں گی۔ وہ مجھے بھگانا چاہتا ہے۔ میں اس سے بھی بدلہ لوں گی۔" گویا اب مجھ پر جن کے بجائے کسی مادہ جن یا جنی کا تسلط ہو گیا تھا۔ "آج میں شمیم کی بدولت قید ہوئی ہوں، اسے کھائے بغیر نہ چھوڑوں گی۔" یکا یک مزار کی جالی سے میرا سینہ اور پیٹ چپک گئے۔ میں فریاد کرنے لگی کہ:

"ہائے، میرا معدہ چھدا، ہائے میرا کلیجا پھٹا۔"

یقین کیجیے بُری طرح ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔ اس عالم میں رات ہوگئی۔ دوسرے دن بھی یہی بے خودی طاری رہی۔ اس حالت میں خوب رقص کیا، خوب ناچی۔

اب کل یعنی 17 جون اتوار کو نماز مغرب کے بعد میں جناب سیدہ کی کہانی سنانے لگی جب اس شعر تک پہنچی کہ:

صدیقہ نام رکھا ہے تو نے بتول کا
جھوٹا نہ کیجیو مجھے صدقہ رسول ؐ کا

تو یکا یک سارے جسم میں کانٹے چبھنے لگے۔ شدید قسم کی سردی اور بے چینی محسوس ہونے لگی۔ خیر بہ مشکل کہانی کو پڑھنا شروع کیا تو محمد ؐ کے نام پر حالت غیر ہوگئی۔ اس وقت میں یہ سطور لکھ رہی ہوں، ہاتھ پاؤں کانپ رہے ہیں، مشکل سے لکھا جا رہا ہے۔"

☆☆☆

تقریباً ایک سال تک زندگی اسی طرح بوجھ بنی رہی۔ شاید یہ سلسلہ طویل ہوتا کہ ایک دن سرِ راہ "وہ" مل گئے۔ انہوں نے اپنا نام ہر کسی کو بتانے سے منع کیا ہے۔ اس لیے وہ لکھ رہی ہوں۔ انہوں نے مجھے روک لیا۔ میرے ساتھ امی بھی تھیں۔ وہ بھی رک گئیں۔ تب وہ امی سے بولے۔

"باجی اس پر سایہ ہے۔ مجھے میرے پیر نے ایک عمل بتایا ہے۔ میں عامل نہیں ہوں، پیر کے حکم پر لوگوں کے کام آتا ہوں۔ کوئی پائی پیسا نہیں لیتا۔ اگر آپ کہیں تو میں اس کے لیے کچھ کروں؟"

اندھے کو کیا چاہیے، دو آنکھیں۔ امی فوراً راضی ہوگئیں۔ وہ ہمارے گھر تک آئے۔ اس وقت تک مجھے کچھ بھی محسوس نہیں ہو رہا تھا مگر جیسے ہی انہوں نے کمرے میں پہنچ کر جانماز بچھائی اور کچھ پڑھنا شروع کیا، مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے میرے اندر انگارے بھر دیے ہوں، یہ کیفیت آدھے گھنٹے تک رہی پھر مجھے نیند آ گئی۔ سو کر اُٹھی تو وہ صاحب جا چکے تھے۔ امی سے معلوم ہوا کہ بہت پوچھنے کے بعد بھی نہ تو انہوں نے اپنا نام بتایا اور نہ پتا۔ ایک گلاس شربت کے علاوہ ہر چیز کے لیے منع کر دیا تھا۔ وہ دن ہے اور آج کا دن، پھر ایسے دورے نہیں پڑے۔ اب تو میں تین بچوں کی ماں ہوں۔

ایمان فروش

محترم ومکرم معراج رسول
السلام علیکم!
سرگزشت ایک انفرادی نوعیت کا ڈائجسٹ ہے۔ اس کی کہانیاں بھی الگ انداز کی ہونی چاہئیں۔ اسی خیال کے تحت اپنے علاقے کا ایک مشہور واقعہ قلمبند کرکے ارسال کررہا ہوں، امید ہے پسند آئے گا۔

محمد اکرم چوہدری
(جہلم)

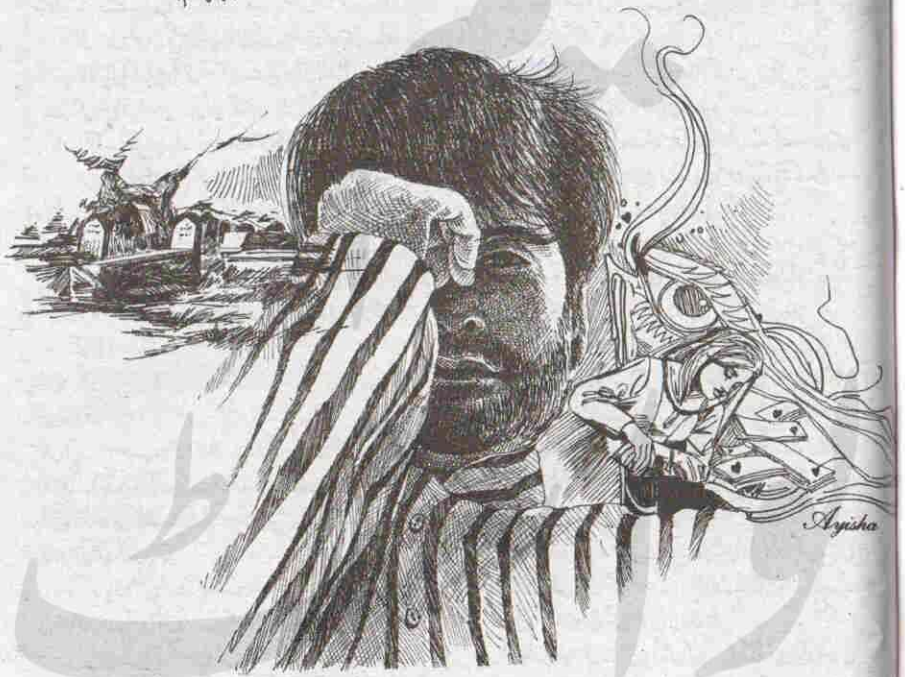

اس دن گرمی نے گویا اگلے پچھلے تمام ریکارڈ توڑ دیے تھے۔ ایسی جھلسا دینے والی لو چل رہی تھی کہ انسان کچھ دیر اگر کھلے آسمان تلے کھڑا ہو جائے تو جھلس کر رہ جائے۔ لاہور میں تو یوں بھی بہت شدید گرمی ہوتی ہے۔ یہ تو غنیمت ہے کہ اس زمانے میں لوڈشیڈنگ کا عذاب نہیں تھا۔ لائٹ جاتی ضرور تھی لیکن صرف اس وقت جب کوئی فنی خرابی واقع ہوگئی ہو۔ بجلی کے تار ٹوٹ گئے ہوں یا کوئی پی ایم ٹی اُڑ گئی ہو۔

میں دفتر سے نکلا تو سورج نصف النہار پر تھا۔ باہر نکلنے کو بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن باہر نکلنا ضروری تھا۔ میں ایکسپورٹ امپورٹ کا کاروبار کرتا ہوں، دواسازی کی ایک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

فرم میں میرے اچھے خاصے شیئر ہیں اور گجرات میں پنکھوں اور واشنگ مشین کی ایک فیکٹری لگانے کی تیاری کر رہا ہوں۔

ان دنوں میرا چھوٹا سا صرف ایکسپورٹ امپورٹ کا کاروبار تھا۔ مجھے ایک کلائنٹ سے ملنا تھا۔ میرے پاس پُرانی سی ایک مزدا تھی۔ اس کا انجن بہت مضبوط تھا لیکن گاڑی میں ائر کنڈیشنر نہیں تھا۔

میں گرمی میں جھلستا اور لو کے تھپیڑے کھاتا ہوا اپنے کلائنٹ کے دفتر پہنچا تو معلوم ہوا کہ ان کے گھر سے فون آ گیا تھا اور وہ بہت ایمرجنسی میں گئے ہیں۔ وہ میرے لیے پیغام چھوڑ گئے تھے کہ آج کی میٹنگ اب پرسوں شام میں ہوگی۔

میں بری طرح جھنجلا گیا لیکن پھر یہ سوچ کر میں نے اپنے غصے پر قابو پالیا کہ ایمرجنسی تو کسی کے ساتھ بھی ہو سکتی ہے۔

میں وہاں سے باہر نکلا تو سورج پہلے کی طرح آگ برسا رہا تھا۔ مجھے اچانک شدید پیاس کا احساس ہوا۔

مزنگ چونگی کے نزدیک پہنچ کر مجھے چھوٹا سا ایک ریسٹورنٹ نظر آیا۔ میں نے گاڑی روکی اور اُتر کر ریسٹورنٹ میں آ گیا۔ اس مختصر سے وقت میں پسینا پانی کی طرح میرے چہرے پر بہنے لگا۔ میں نے ویٹر سے ٹھنڈی یخ بوتل لانے کو کہا اور خود پنکھے کے نیچے بیٹھ کر رومال سے اپنا پسینا خشک کرنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد ویٹر کولڈ ڈرنک لے آیا۔ میں بوتل پی ہی رہا تھا کہ نزدیکی میز پر بیٹھے ہوئے دو نوجوان بلند آواز میں ایک دوسرے کو بُرا بھلا کہنے لگے۔ گرمی شدید ہو تو لوگ جھنجلا کر ایک دوسرے سے لڑ ہی پڑتے ہیں۔

''تو کیا سمجھتا ہے کہ تو میرے پیسے کھا جائے گا؟'' ایک نوجوان چیخ کر بولا۔

''زیادہ حلق مت پھاڑ۔ جب میں نے تجھ سے کوئی رقم لی ہی نہیں ہے تو واپس کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

''او بھائی! آنکھوں میں دھول کیوں جھونک رہا ہے۔'' پہلا نوجوان بھنا کر بولا ''اگر تیرے پاس ابھی پیسے نہیں ہیں تو بعد میں دے دینا لیکن تو تو پیسے لے کر مکر رہا ہے۔''

''بکواس مت کر۔'' دوسرا نوجوان بھی غضبناک ہو گیا ''میں تجھ سے پیسے کیوں لوں گا اور تیرے پاس ہے کیا جو تو کسی کو کچھ دے گا۔''

قریب تھا کہ وہ دونوں گتھم گتھا ہو جاتے کہ آس پاس کی میزوں پر بیٹھے ہوئے چند لوگ وہاں پہنچ گئے۔

ایک صاحب بولے ''آپ لوگ چہروں سے تو پڑھے لکھے معلوم ہوتے ہیں پھر سرِعام یوں گالم گلوچ کیوں کر رہے ہیں؟''

''بڑے صاحب! اگر میری جگہ آپ ہوتے تو آپ کو بھی غصہ آ جاتا۔'' پہلے نوجوان نے کہا ''اس نے دو مہینے پہلے مجھ سے پانچ ہزار روپے قرض لیے تھے۔ میں نے تقاضا کیا تو یہ صاف مکر گیا۔ یہ کہاں کا انصاف ہے۔''

''جب میں نے پیسے لیے ہی نہیں ہیں تو واپس کیوں دوں؟'' دوسرے نوجوان نے کہا ''ہاں، اگر میرے پاس پیسے ہوتے تو میں اسے کچھ رقم قرض دے دیتا۔''

''آپ لوگ اس جھگڑے کو سرِعام نمٹانے کے بجائے اگر گھر میں بیٹھ کر نمٹا لیں تو بہتر ہوگا۔''

''کیسا جھگڑا جناب!'' دوسرا نوجوان برہم ہو کر بولا ''میں نے اس سے کوئی رقم نہیں لی ہے۔''

''تو قسم کھا کر یہ بات کہہ سکتا ہے کہ تو نے مجھ سے پیسے نہیں لیے ہیں؟'' پہلے نوجوان نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

''ہاں، میں قسم کھانے کو تیار ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' پہلا نوجوان بولا ''میرے ساتھ مسجد میں چل اور قرآن پر ہاتھ رکھ کر یہ بات کہہ دے کہ تو نے مجھ سے کوئی رقم نہیں لی۔''

''اگر میں نے قرآن کو گواہ بنا کر یہ بات کہہ دی تو؟''

''تو پھر میں تجھ سے کسی رقم کا مطالبہ نہیں کروں گا۔ پھر اس کا فیصلہ اللہ ہی کرے گا۔'' پہلے نوجوان نے کہا۔

''آپ سب لوگ بھی گواہ رہیے گا۔'' دوسرے نوجوان نے کہا پھر پہلے نوجوان سے بولا ''چل تیری یہ آرزو بھی پوری کر دوں۔''

وہ دونوں اُٹھ کر کھڑے ہوئے تو میں لرز کر رہ گیا۔ میں لپک کر ان کے پاس پہنچا اور بولا ''صرف پانچ ہزار کے لیے قرآن مجید کو درمیان میں کیوں لاتے ہو؟''

''پھر آپ ہی بتائیں، میں کیا کروں؟'' پہلا نوجوان بے بسی سے بولا۔

''کتنی رقم ہے تمہاری؟'' میں نے چند لمحے سوچنے کے بعد پوچھا۔

''پانچ ہزار!'' پہلے نوجوان نے جواب دیا۔

''تم قرآن مجید کو بیچ میں مت لاؤ۔ یہ رقم میں تمہیں دے دیتا ہوں۔''

وہ نوجوان حیرت سے مجھے دیکھنے لگا جیسے اسے میرے

یہ واقعہ 1971ء کا ہے۔ دو لڑکیاں کار میں امریکا کی ریاست مسوری کے قصبے بینی ہل سے سینٹ لوئس کی طرف جا رہی تھیں۔ لوئیسیانا کے مشرق میں انہوں نے کار روکی۔ مقصد تھوڑی دیر آرام اور دوپہر کا کھانا تناول کرنا تھا۔

کھانا شروع کرنے کے تھوڑی دیر بعد انہیں ایک مکروہ سی بدبو اپنے قرب وجوار میں پھیلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ایک لڑکی نے مڑ کر دیکھا اور دیکھتی رہ گئی۔ جھاڑیوں کی جھنڈ میں ایک لمبا چوڑا اگوریلا نما عفریت کھڑا انہیں گھور رہا تھا۔

لڑکیوں کے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ فوراً اپنی گاڑی کی طرف بھاگیں اور اندر گھس کر دروازے بند کر لیے۔ وہ اسی وقت وہاں سے فرار ہو جاتیں لیکن گاڑی میں گھسنے کے بعد انہیں خیال آیا کہ گاڑی کی چابیاں کھانے کے سامان کے ساتھ ہی رہ گئی ہیں۔ وہ عفریت اتنی دیر میں جھاڑیوں سے باہر نکل آیا تھا اور اب چابیوں اور ان کے درمیان کھڑا تھا۔

لڑکیوں نے اس عفریت کا جو حلیہ بیان کیا اس سے انسان اور بندر کا ایک ملا جلا تاثر اُبھرتا ہے۔ ایک لڑکی کے بیان کے مطابق۔

''یہ دونوں پیروں پر بالکل سیدھا کھڑا تھا اور چلتے ہوئے اس کی کمر میں خم پیدا نہیں ہوتا تھا جیسا کہ دیگر انسان نما جانوروں کے ساتھ منسوب کیا جاتا رہا ہے۔ اس کے بازو لمبے لمبے تھے اور کمر سے نیچے تک جھول رہے تھے۔ اس کے بازوؤں پر گھنے بال تھے لیکن ہتھیلیاں بالکل صاف تھیں۔ ہمیں اسے بڑی اچھی طرح دیکھنے کا موقع ملا کیونکہ یہ گاڑی کے بالکل قریب آ گیا تھا اور اس نے گاڑی کا دروازہ کھولنے کی کوشش بھی کی۔ معلوم ہوتا تھا کہ گاڑی سے اس کا واسطہ پہلی بار نہیں پڑا کیونکہ وہ گاڑی سے خوف زدہ نہیں تھا لیکن دروازہ کھولنے کے طریقے سے ناواقف تھا۔ جب اس نے جھک کر دیکھنے کی کوشش کی تو ہم نے گاڑی کا ہارن بجانا شروع کر دیا۔ ہارن کی آواز پر وہ مڑا اور جھاڑیوں کی طرف چل پڑا۔ تھوڑی دیر میں وہ ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ کچھ دیر بعد میں گاڑی سے نکلی اور چابیاں اُٹھا کر واپس بھاگ آئی۔

اس واقعے پر تحقیق کرنے والے نے مبینہ طور پر نظر آنے والے جانور کو موموکا نام دیا جو ''مسوری مونسٹر'' یعنی ''مسوری کا عفریت'' کا مخفف ہے۔ 1972ء کے وسط تک اس علاقے میں موموکو تلاش کرنے کی کوششیں اپنے عروج پر پہنچ چکی تھیں۔ مقامی اخبارات میں عجیب وغریب قسم کی خبریں شائع ہو رہی تھیں۔

مرسلہ: شاہد خان، سرگودھا

ذہنی توازن پر شبہ ہو۔ اب سے پچیس سال پہلے پانچ ہزار کی رقم معمولی نہیں ہوتی تھی۔

''کیا نام ہے تمہارا؟''

''میرا نام امجد ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''تو بھائی امجد! میں تمہیں پانچ ہزار دے دیتا ہوں۔''

میں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنا پرس نکال لیا۔ میں اتنی رقم رکھتا نہیں تھا لیکن میں جن صاحب سے ملنے گیا تھا، انہیں کاروباری سلسلے میں پیشگی کے طور پر یہ رقم دینا تھی۔

میں نے رقم نکالی اور امجد کی طرف بڑھا دی۔

اس نے جھجکتے ہوئے نوٹ پکڑ لیے اور بولا ''آپ عارف کے رشتے دار ہیں؟''

''کون عارف؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے مقروض کی طرف اشارہ کر دیا۔

''نہیں، میرا ان سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔'' پھر میں نے کچھ توقف کے بعد کہا ''تم عارف کو رقم وصولی کی ایک رسید لکھ دو۔ اگر یہ کام پیسے دیتے وقت کر لیتے تو آج اس کی نوبت ہی نہ آتی۔ یوں بھی شرعاً یہی طریقہ مناسب ہے۔''

اس نے ہوٹل کے ویٹر سے ایک کاغذ منگایا۔ قلم اس کی جیب میں موجود تھا۔ اس نے عارف کو رقم کی رسید لکھ کر دے دی۔

میرے دل کو قرار سا آ گیا۔ کولڈ ڈرنک بھی ختم ہو چکی تھی۔ میں نے کاؤنٹر پر جا کے پیسے دیے اور اپنی گاڑی کی طرف بڑھا۔

میں نے گاڑی کا دروازہ کھولا ہی تھا کہ پیچھے سے آواز آئی ''سنیے!''

میں نے مڑ کر دیکھا۔ عارف شرمندہ شرمندہ سا کھڑا تھا۔ میں نے نرم لہجے میں کہا ''ہاں بھئی، بولو۔''

''آپ اپنا ایڈریس تو مجھے دے دیں۔'' اس نے کہا۔

''کیوں بھئی!'' میں نے ہنس کر کہا اور اپنے رویے سے بالکل یہ ظاہر نہیں کیا کہ مجھے اس کی کوئی بات ناگوار گزری ہے۔

''وہ..... میں..... آپ..... سے ملنا چاہتا ہوں۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

2002ء میں گورنمنٹ ایم اے او کالج لاہور کے شعبۂ نفسیات کی ایک ریسرچ رپورٹ جو کہ اس ہی کالج کے دو طالب علموں محمد شفیق اور احسان الٰہی کی مرتب کردہ تھی کے مطابق عملیات کرانے والوں میں سے 60 فی صد مرد و خواتین ایسے ہوتے ہیں جو کہ اپنے جسمانی و ذہنی امراض سے پریشان ہوتے ہیں، کچھ لوگوں کے پاس علاج معالجے کے لیے پیسے نہیں ہوتے اور ان کے عزیز و اقارب انہیں آسیب زدہ سمجھ کر عامل کے پاس جانے کے لیے مجبور کرتے ہیں۔ ایسی خواتین جن کے یہاں اولاد نہیں ہوتی یا وہ اولادِ نرینہ سے محروم ہوتی ہیں، ان کی اکثریت عاملین سے رجوع کرتی ہے۔ 30 فی صد افراد کا مسئلہ ذاتی پریشانیاں ہوتی ہیں مثلاً کاروبار میں مندی، بیٹیوں کی شادیوں میں رکاوٹ، ساس بہو کے جھگڑے، مقدمے بازی، ذہنی سکون کی تلاش، انعامی بانڈز کے ذریعے دولت کا حصول، ملازمتوں میں ترقی، ٹرانسفر، اچھی اور پسندیدہ جگہوں پر پوسٹنگ وغیرہ وغیرہ۔ اور بقیہ 10 فی صد رجوع کرنے والے دشمنوں کے خلاف حسد اور نفرت کے کارفرما جذبے کے تحت ان سے ملنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ ان میں بھی خواتین کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ جو محض رقابت کی وجہ سے اپنے مخالفین کو ہر طرح نیچا دکھانے کے جذبے سے مغلوب ہوتی ہیں۔ زیادہ تر معاملات، شادی بیاہ اور رشتوں سے متعلق ہوتے ہیں کیونکہ اکثر مرد و خواتین ان لوگوں کے گھروں کو ہنستا بستا دیکھنا نہیں چاہتے جو ان کی مرضی کے خلاف شادی کر لیتے ہیں۔ اکثر اوقات عورتیں اس بات کا تعویذ لیتی ہیں کہ ان کے

میں نے جیب سے اپنا تعارفی کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔

دوسرے ہی دن عارف میرے دفتر پہنچ گیا۔

میں نے ہنس کر کہا ”آؤ بھئی عارف! کیسے آنا ہوا؟“

”اکرم صاحب! میں بہت شرمندہ ہوں۔ آپ نے امجد کو رقم دے کر میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ آپ کے وہ پانچ ہزار مجھ پر قرض ہیں۔ فی الحال آپ یہ ایک ہزار رکھ لیں۔“ اس نے اپنی جیب سے سو سو روپے کے نوٹ نکال کر میری طرف بڑھائے۔ ”میں نے امجد سے واقعی پیسے لیے تھے لیکن...“

”کیا تم جھوٹا قرآن اُٹھانے جا رہے تھے؟“ میں نے لرز کر پوچھا۔

اس نے شرمندگی سے گردن جھکا لی۔

”دیکھو عارف! میری ایک بات یاد رکھنا، زندگی میں کبھی قرآن مجید کی جھوٹی قسم مت کھانا اور یہ پیسے اپنی جیب میں رکھو۔ سمجھ لو کہ میں نے تمہیں قرضِ حسنہ دیا ہے۔ جب تمہارے پاس ہوں، مجھے لوٹا دینا۔“

”آپ کا بہت بہت شکریہ اکرم صاحب!“ عارف نے کہا ”آپ نے نہ صرف میرا قرض ادا کیا بلکہ مجھے ایک بہت بڑے گناہ سے بچا لیا۔“

عارف کے رخصت ہونے کے بعد میں سوچنے لگا کہ میں نے اسے کس گناہ سے بچایا ہے یا عذاب الٰہی سے؟

☆☆☆

میں ان دنوں جہلم میں رہتا تھا۔ وہاں ایک ڈاکٹر کے کلینک کے ساتھ ہی ابا جی کا میڈیکل اسٹور تھا۔ اللہ نے ڈاکٹر صاحب کے ہاتھ میں شفا دی تھی اس لیے ان کے کلینک پر ہمیشہ رش رہتا تھا۔ اس وجہ سے ابا جی کی دکان بھی خوب چلتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کے پاس آنے والا ہر مریض ہمارے ہی میڈیکل اسٹور سے دوائیں خریدتا تھا۔

میں ان دنوں میٹرک میں پڑھ رہا تھا۔ میں زیادہ دوست بنانے کا قائل نہیں ہوں اس لیے میری دوستی صرف عاصم اور رضوان ہی سے تھی۔ وہ دونوں ہی بہت سلجھے ہوئے تھے اور کھیل کود کے بجائے زیادہ وقت پڑھنے میں صرف کرتے تھے۔

وہ دونوں میرے ہم مزاج تھے اس لیے جلد ہی ہماری دوستی ہو گئی اور یہ دوستی وقت کے ساتھ ساتھ پختہ ہوتی گئی۔

ہم تینوں بچپن ہی سے ایک ساتھ پڑھے تھے، ویسے جب ہم نے میٹرک پاس کیا تو ایک ہی کالج میں داخلہ لے لیا۔

پھر ہم جب انٹر کر کے فارغ ہی ہوئے تھے کہ عاصم کے چچا نے اسے لندن بلا لیا۔ اس کے جانے کے بعد صرف رضوان ہی رہ گیا۔

میں نے محسوس کر لیا تھا کہ ہم جب سے کالج میں آئے تھے، رضوان پہلے کی طرح پڑھائی پر توجہ نہیں دے رہا تھا۔ انٹر میڈیٹ میں بھی وہ بس کسی نہ کسی طرح پاس ہو گیا تھا۔ مجھے اس کا بہت افسوس تھا۔ اب بھی وہ اکثر کالج سے غیر حاضر رہتا تھا۔ میں اس کی وجہ پوچھتا تو وہ ٹال جاتا۔ پھر یہ حالت

شوہر کی اور عورت میں دلچسپی نہ لینے لگیں جبکہ نوجوان لڑکے لڑکیاں اپنی پسند کی شادی کے لیے ان سے رجوع کرتے ہیں۔ اکثر عورتیں جن میں ماں اور بہنوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے اپنی بیٹی یا بہن کے لیے ان کی شادی سے قبل ہی ان عاملین سے رجوع کرتی ہیں کہ کوئی ایسا نقش حاصل کر سکیں جس کے باعث ان کا ہونے والا داماد یا بہنوئی کاٹھ کے الو کی طرح ان کے اشارے پر چلے اور جلد از جلد سسرال کے آس پاس آباد ہو جائے تاکہ اس کی آمدنی پر بلا شرکت غیرے ان کا راج ہو اور اس کی آمدنی میں لڑکے کے ماں باپ، بہن بھائی حصے دار نہ بن سکیں۔ ان مرتبین نے اس سروے سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ پچھلے بیس پچیس سالوں کے دوران ہمارے معاشرے میں جادو اور ٹونے کے رجحان میں 40 فی صد اضافہ ہوا ہے۔ جس کی وجوہات میں ہمارے معاشرے میں پھیلی ہوئی بے چینی، افراتفری، خود غرضی، بے روزگاری، ازدواجی جھگڑے، غربت و تنگدستی، مقدمہ بازی، حسد، رقابت اور راتوں رات امیر ہو جانے کی خواہشات کا بہت زیادہ عمل دخل ہے اور اس نئے رجحان کی زیادتی کے سبب بے شمار بے روزگار اور جرائم پیشہ لوگ جعلی عاملوں کا روپ دھار بیٹھے ہیں کیونکہ اس کاروبار کے لیے نہ تو تعلیم ضروری ہوتی ہے اور نہ ہی کسی قسم کا لائسنس درکار ہوتا ہے جبکہ کوئی بہت بڑی سرمایہ کاری بھی درکار نہیں ہوتی ہے۔

مرسلہ: صاحب زادہ، اٹک

ہو گئی کہ رضوان ایک ایک ہفتے کالج نہیں آتا تھا۔ میں نے کئی مرتبہ اسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن محسوس کیا کہ میرا سمجھانا اسے ناگوار گزرتا ہے۔ تنگ آ کر میں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

پھر اس نے کالج آنا بالکل ہی چھوڑ دیا۔ میں اپنی تعلیم میں مصروف رہا۔ پہلے رضوان سے اکثر جمعے کی نماز میں ملاقات ہو جاتی تھی۔ اب وہاں بھی اس سے ملاقات نہیں ہو رہی تھی۔ شاید وہ جمعے کی نماز کسی اور مسجد میں پڑھنے لگا تھا۔

میں نے بی اے کا امتحان دیا تھا کہ عاصم کچھ دنوں کے لیے لندن سے آ گیا۔ وہ سب سے پہلے میرے گھر آیا۔ اسے دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ وہ نہ صرف پڑھ رہا تھا بلکہ ایک ڈپارٹمنٹل اسٹور میں جز وقتی ملازمت بھی کر رہا تھا۔

اس نے اچانک پوچھا ”یار اکرم! آج کل رضوان کہاں ہے؟“

”یار، میری تو اس سے کئی مہینے پہلے ملاقات ہوئی تھی۔“ میں نے کہا ”مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے؟“

”یار، اس سے کسی بات پر ناراضی تو نہیں ہو گئی تمہاری؟“ عاصم نے پوچھا۔

”کیسی ناراضی یار!“ میں نے ہنس کر کہا ”وہ تو ملتا ہی نہیں۔ اس نے کالج بھی آنا چھوڑ دیا ہے۔ میں نے سبب پوچھا تو وہ ٹال گیا۔“

”پھر بھی یار! وہ دوست ہے ہمارا، تمہیں معلوم تو کرنا چاہیے تھا کہ وہ...“

”میں اس کے گھر گیا تھا۔ اسے کوئی پریشانی نہیں ہے۔ بس میرا سمجھانا اسے ناگوار گزرتا تھا اس لیے میں نے اس سے ملنا چھوڑ دیا۔ تمہیں اس کی اتنی فکر ہے تو تم ہی معلوم کر لو۔“

اس دن میں اور عاصم دیر تک بیٹھے ماضی کی خوش گوار یادوں میں کھوئے رہے۔

”یار، اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟“ عاصم نے اچانک پوچھا ”اگر تم چاہو تو میں تمہارے لندن جانے کا بندوبست کر سکتا ہوں۔“

”یار، ابا جی چاہتے ہیں کہ میں کوئی کاروبار کروں۔“ میں نے کہا ”اب میں ان کی طرح دکان لے کر تو بیٹھ نہیں سکتا۔“

”تم ایکسپورٹ امپورٹ کا لائسنس بنوا لو اور تھوڑے سرمائے سے کاروبار شروع کر دو۔“ عاصم نے کہا ”میرے ایک پھوپی زاد بابر اسلام آباد میں ہیں۔ وہ ایکسپورٹ امپورٹ کا لائسنس بھی بنوا دیں گے اور تمہاری رہنمائی بھی کر دیں گے کہ تم کم سے کم سرمائے سے کیا چیز امپورٹ کر سکتے ہو اور کیا ایکسپورٹ کر سکتے ہو۔“

”یار، یہ تو بہت اچھی بات ہے۔“ میں نے کہا ”میں بابر بھائی سے ضرور ملوں گا بلکہ تم ہی ان سے ملواؤ گے۔“

عاصم نے میرے ساتھ اسلام آباد جانے کا وعدہ کر لیا اور کئی گھنٹے میرے ساتھ گزارنے کے بعد رخصت ہو گیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دوسرے دن وہ میرے پاس آیا تو کچھ پریشان تھا۔

میرے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی اس نے بتایا ''یار، کل رضوان سے میری ملاقات ہوئی تھی۔''

''تمہاری اس سے کہاں ملاقات ہوئی؟'' میں نے پوچھا۔ ''وہ ٹھیک تو ہے؟''

''ہاں یار، ٹھیک تو ہے لیکن کچھ آوارہ قسم کے لڑکوں کی صحبت میں پڑ گیا ہے۔'' عاصم نے افسردگی سے کہا۔

''کتنا ذہین اور سلجھا ہوا لڑکا تھا۔'' میں نے افسوس سے کہا ''اس نے نہ جانے کیوں اپنی زندگی تباہ کر لی؟''

''یار اکرم!'' عاصم نے کہا ''ہم دونوں مل کر ایک مرتبہ پھر رضوان کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ شاید وہ ہماری بات مان جائے۔ وہ آخر ہمارا دوست رہا ہے۔''

''یار، تم کہتے ہو تو میں ایک مرتبہ پھر رضوان کو سمجھانے کی کوشش کروں گا۔'' میں نے کہا۔

دوسرے دن عاصم مجھے ایک ایسے ہوٹل میں لے گیا جہاں شریف آدمی جانا پسند نہیں کرتے تھے۔ میں نے سنا تھا کہ ہوٹل کی آڑ میں وہاں منشیات فروخت ہوتی ہے۔

ہمیں دیکھ کر دو بدمعاش قسم کے آدمی ہمارے پاس آ گئے۔ ان دونوں میں سے ایک شاید خود کو سلطان راہی سمجھ رہا تھا۔ اس نے لمبا کرتہ اور دھوتی باندھ رکھی تھی، پیروں میں کھسے تھے اور چہرے پر گھنی مونچھیں تھیں۔

وہ سلطان راہی ہی کے انداز میں بولا ''آؤ بادشاہو! کیا خدمت کروں آپ کی؟''

''ہمیں رضوان سے ملنا ہے۔'' عاصم نے کہا۔

''آپ بیٹھو سرکار!'' اس نے ایک میز کی طرف اشارہ کیا ''کوئی مال شال چاہیے ہو تو.....''

''ہمیں صرف رضوان سے ملنا ہے۔'' عاصم نے اس کی بات کاٹ دی۔

''جاؤ اوئے۔'' اس نے اپنے چیچے سے کہا ''اجے نوں بلا لا۔''

تھوڑی دیر بعد رضوان وہاں آ گیا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے، کپڑے میلے تھے اور چہرے پر کئی دن کا شیو تھا جس سے وہ کچھ بیمار بیمار سا لگ رہا تھا۔

اسے اس حال میں دیکھ کر میرے دل کو دھکا سا لگا اور میں بے اختیار اس سے لپٹ گیا ''تو نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے رضوان؟'' میں نے کہا۔

''بس سارا مقدر کا کھیل ہے اکرم!'' رضوان نے کہا۔

''مقدر کا نہیں، یہ سب تمہارا کیا دھرا ہے۔'' میں نے کہا ''میں نے تمہیں کتنا سمجھایا لیکن تم.....''

''اب ان باتوں سے کیا فائدہ؟'' رضوان نے کہا ''یہ لوگ میری جان نہیں چھوڑیں گے۔''

''کیوں، تم نے کیا انہیں بانڈ بھر دیا ہے یا.....''

''میں ان کا مقروض ہوں۔'' اس نے عاصم کی بات کاٹ دی ''یہ قرضہ ہر مہینے بڑھ جاتا ہے۔ اس قرض کی وجہ سے مجھے ان کے ناجائز کام بھی کرنا پڑتے ہیں۔ سیدھے سادے لڑکوں کو پھانس کر یہاں لانا پڑتا ہے، چرس فروخت کرنا پڑتی ہے۔''

''یہ تو غیر قانونی ہے رضوان!'' میں نے کہا ''تمہیں تو پولیس کسی بھی وقت پکڑ سکتی ہے۔''

''میں جانتا ہوں۔'' رضوان نے کہا لیکن اگر میں ان کی بات نہیں مانوں گا تو یہ فوراً اپنے قرض کا مطالبہ کر دیں گے اور رقم نہ ملنے کی صورت میں شاید میری جان بھی لے لیں۔''

''اب ایسا اندھیر بھی نہیں ہے۔'' عاصم نے کہا ''تم پولیس میں رپورٹ کر سکتے ہو۔''

''پولیس!'' رضوان نے طنزیہ لہجے میں کہا ''علاقے کی پولیس بھی ان لوگوں کی مٹھی میں ہے۔ وہ الٹا مجھے ہی کسی کیس میں پھنسا کر جیل بھجوا دیں گے۔ یہ لوگ مجھ پر کڑی نظر رکھتے ہیں۔ تم لوگوں سے بھی اس لیے ملنے دیا کہ یہ لوگ اکرم کو بھی پہچانتے ہیں اور تمہیں بھی۔ یہ جانتے ہیں کہ تم لوگ کسی زمانے میں میرے بہت نزدیکی دوست تھے۔''

''ان سے چھٹکارے کی کوئی صورت تو ہو گی؟'' عاصم نے پوچھا۔

''صرف ایک صورت ہے کہ ان کا قرض ادا کر دیا جائے اور میں یہاں سے کہیں دور چلا جاؤں۔''

''کتنا قرض ہے ان کا؟'' عاصم نے پوچھا۔

''میں نے ان سے صرف تین ہزار لیے تھے جواب سود سمیت بارہ ہزار ہو چکے ہیں۔'' رضوان نے کہا۔

اس زمانے میں بارہ ہزار کی رقم بہت بڑی تھی اور میں اس وقت طالب علم بھی تھا، میں تو کسی کو بارہ سو روپے دینے کی پوزیشن میں بھی نہیں تھا۔

''ٹھیک ہے۔'' عاصم نے کہا ''میں تمہارا قرض چکا دیتا ہوں۔ چلو، میری بات اس شخص سے کراؤ جس کے تم مقروض ہو۔''

''تم بھی شاید اسے جانتے ہو، استاد شیدے کا نام تم نے بھی سنا ہو گا۔''

استاد شیدا ان دنوں علاقے کا بہت بڑا بدمعاش تھا۔ اس کے کھاتے میں کئی ڈاکے اور قتل تھے لیکن وہ یوں ہی دندناتا پھرتا تھا۔

''ہاں، میں نے اس کا نام سنا ہے۔'' عاصم نے کہا ''وہ اس وقت کہاں ملے گا؟''

''وہ یہیں موجود ہے۔'' رضوان نے کہا ''پھر اسی چچے کو بلایا جو اس سے پہلے ''سلطان راہی'' کے ساتھ تھا۔

''استاد موجود ہے؟'' رضوان نے پوچھا۔

''ہاں، وہ ابھی ابھی آیا ہے۔'' چچے نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے، تم اس سے کہو کہ کچھ لوگ اس سے ملنا چاہتے ہیں۔''

تھوڑی دیر بعد ہم ہوٹل کی بالائی منزل میں استاد شیدے کے سامنے بیٹھے تھے، وہ کسرتی جسامت، دراز قد شخص تھا اور چہرے مہرے اور حلیے سے بدمعاش نہیں لگتا تھا۔

''آؤ جناب! کیسے زحمت کی؟'' اس نے ہم سے پوچھا۔

''رضوان یہ کتنا قرض ہے آپ کا؟'' عاصم نے پوچھا۔

شیدے نے چونک کر عاصم کو دیکھا، پھر بولا ''آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

''میں اس کا قرض چکانا چاہتا ہوں۔'' عاصم نے کہا۔

''آپ..... آپ اس کا قرض چکاؤ گے؟'' اس نے طنزیہ لہجے میں کہا ''کام کیا کرتے ہو آپ؟''

''تمہیں اپنی رقم سے مطلب رکھنا چاہیے۔'' عاصم آپ کے بجائے تم پر آ گیا۔

''ہٹکے بھئی ہٹکے!'' اس نے کہا پھر اس نے اُٹھ کر ایک رجسٹر اُٹھایا اور اسے کھول کر بولا ''رضوا..... ن..... رضوان ..... ہاں، یہ رہا اس کا نام۔ اس پر پندرہ ہزار روپے کی رقم واجب الادا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' عاصم نے کہا ''تم میرا پتا لکھ لو۔ کل رقم مجھ سے لے جانا۔''

''واہ جناب!'' شیدے ہنس کر بولا ''آپ نے تو حاتم طائی کی قبر پر لات ماردی۔'' پھر وہ چونک کر بولا ''ہاں، اس کے بعد رضوان مجھے اس علاقے میں نظر نہ آئے ورنہ میں اس کا کھاتا پھر کھول دوں گا۔''

''کل مجھ سے آ کر رقم لے لینا۔'' عاصم نے کہا۔ ''کہو تو میں لکھ کر دے دوں، میں رضوان کو لے جا رہا ہوں۔''

''لکھ کر دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے جناب!'' شیدے نے چبا چبا کر کہا ''اس علاقے میں کوئی ایسا مائی کا لال نہیں ہے جو شیدے کے پیسے کھا سکے۔ آپ بے شک رضوان کو لے جاؤ۔ میں پیسے لینے آ جاؤں گا۔''

''بہت مہربانی۔'' عاصم نے کہا پھر رضوان سے بولا۔ ''چلو رضوان!''

''میری بات ضرور یاد رکھنا۔ ایک ہفتے بعد رضوان اس علاقے میں نظر آیا تو اس کا کھاتا پھر کھل جائے گا۔''

باہر نکل کر رضوان، عاصم سے لپٹ کر رونے لگا اور بولا ''یار، تمہارا یہ احسان میں زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔''

''تمہیں یاد ہی رکھنا ہے تو صرف یہ یاد رکھنا کہ اب شریفانہ زندگی گزارو گے۔''

رضوان ہمارے ساتھ وہاں سے آ گیا۔ میں نے عاصم سے پوچھا ''یار، تم اتنی بڑی رقم کہاں سے لاؤ گے؟''

''میں نے لندن میں کچھ پیسے کمائے تھے۔ میرا ارادہ تھا کہ میں اپنے گھر کی بالائی منزل بنوالوں گا لیکن مکان کا کیا ہے، ایک سال بعد بھی بن سکتا ہے۔'' پھر وہ رضوان سے بولا ''تم میرے ساتھ اسلام آباد چلنے کی تیاری کرو۔ پھر میں تمہیں لندن بلوالوں گا۔ اس وقت تک تم بابر بھائی کے ساتھ رہو گے۔''

مجھے اس وقت عاصم انسان نہیں بلکہ کوئی فرشتہ لگ رہا تھا۔

دوسرے دن عاصم نے رضوان کا قرض چکایا اور اسی شام ہم لوگ اسلام آباد روانہ ہو گئے۔ مجھے بھی ایکسپورٹ، امپورٹ لائسنس کے سلسلے میں بابر بھائی سے ملنا تھا۔

ہم لوگ دو دن اسلام آباد میں ٹھہرے۔ بابر بھائی بہت منکسر المزاج اور رحم دل انسان تھے۔ انہوں نے خوشی خوشی رضوان کو اپنے گھر میں ٹھہرالیا اور لائسنس کے لیے درخواست بھی جمع کرا دی۔

ایک ہفتے بعد عاصم واپس چلا گیا۔

میں اپنے کام کے سلسلے میں اسلام آباد جاتا رہتا تھا۔ رضوان ابھی تک بابر بھائی کے ساتھ ہی رہ رہا تھا۔ مجھے ایکسپورٹ امپورٹ کا لائسنس مل گیا تو میں نے اپنا کام شروع کر دیا لیکن جلد ہی مجھے احساس ہو گیا کہ اس کام کے لیے مجھے کسی بڑے شہر میں دفتر کھولنا پڑے گا۔

ابا جی کے ایک دوست لاہور میں تھے۔ انہوں نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مجھے لاہور ہی میں ایک دفتر دلوادیا اور میرا کام شروع ہوگیا۔

دو مہینے بعد رضوان میرے پاس آیا۔ عاصم نے اس کے ویزے کا بندوبست کردیا تھا اور وہ ایک دن بعد لندن جارہا تھا۔

مجھے بہت خوشی ہوئی کہ عاصم کی وجہ سے ایک انسان کی زندگی تباہ ہونے سے بچ گئی۔

پھر رضوان لندن چلا گیا اور میں اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔

☆☆☆

مجھے کاروبار کرتے ہوئے پانچ سال گزر چکے تھے اور میرا کاروبار اب مستحکم ہوگیا تھا۔ ان دنوں موبائل فون تو تھے نہیں، کبھی کبھی عاصم یا رضوان کا ٹیلی فون آجاتا تھا۔ عاصم نے وہاں شادی کرلی تھی اور اب اپنا ڈپارٹمنٹل اسٹور چلا رہا تھا۔ رضوان بھی کاروبار میں اس کے ساتھ لگا ہوا تھا۔

اس دوران میں حالات بہت بدل چکے تھے۔ استاد شیدا ایک پولیس مقابلے میں مارا جاچکا تھا۔ اس کا گینگ بھی منتشر ہوچکا تھا۔ کچھ لوگ گرفتار ہوچکے تھے اور کچھ لوگ فرار ہوگئے تھے۔ علاقے میں اب امن تھا۔

میرا کاروبار بھی روز بہ روز ترقی کررہا تھا۔ اب میں نے مال روڈ کے انتہائی مصروف علاقے میں اپنا دفتر کھول لیا تھا۔

ان ہی دنوں رضوان اچانک میرے دفتر آگیا۔ وہ پہلے کے مقابلے میں خاصا صحت مند ہوگیا تھا۔ وہ بے اختیار مجھ سے لپٹ گیا۔

"کیسے ہو رضوان؟" میں نے ہنس کر پوچھا۔ "اور عاصم کے کیا حال ہیں؟"

"میں تو تمہارے سامنے ہوں اور عاصم بھی بالکل ٹھیک ہے، اس نے اپنا کاروبار اب لندن کے علاوہ مانچسٹر تک پھیلا لیا ہے۔ وہ ڈپارٹمنٹل اسٹور کی ایک چین قائم کرنا چاہتا ہے۔"

"مجھے یقین ہے کہ تم دونوں مل کر کاروبار کو بہت ترقی دو گے۔"

"لیکن میں اب مستقل پاکستان آنا چاہتا ہوں، یہاں کاروبار کرنا چاہتا ہوں۔ اپنے ملک کی تو بات ہی اور ہے۔"

"بہت اچھا خیال ہے۔" میں نے کہا "تم کاروبار کیا کرو گے؟"

"میں نے سوچا ہے کہ جہلم میں برف کا ایک کارخانہ لگالوں اور شہر میں ہارڈ ویئر کی ایک دکان کھول لوں۔ وہاں ہارڈ ویئر کی چھوٹی چھوٹی ایک دو دکانیں ہیں لیکن میں یہ کام بڑے پیمانے پر کرنا چاہتا ہوں۔"

مجھے بہت خوشی ہوئی، رضوان پر اللہ نے کرم کیا تھا کہ عاصم کو فرشتہ بنا کر بھیج دیا تھا۔ میں اسے اپنے ساتھ گھر لے گیا۔ میں نے بھی شادی کرلی تھی۔ میری بیوی فرحانہ بھی غائبانہ طور پر عاصم اور رضوان سے واقف تھی۔ وہ بھی رضوان کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔

اباجی نے جہلم کی دکان بیچ دی تھی۔ اب وہ میو اسپتال کے باہر میڈیکل کی ایک دکان چلا رہے تھے اور اب میرا پورا خاندان لاہور میں تھا۔ جہلم والا گھر خالی ہی رہتا تھا۔ اباجی اکثر جہلم جاتے رہتے تھے۔

دو مہینے کے اندر اندر رضوان نے ہارڈ ویئر کی ایک بہت بڑی دکان کھول لی اور اس نے خاص طور پر مجھے اور فرحانہ کو جہلم بلایا۔

اس کے والد کا انتقال ہوچکا تھا۔ اس کی والدہ موجود تھیں۔ وہ ہمیشہ بہت شفقت اور پیار سے پیش آتی تھیں۔

میں نے چاہا کہ رات کو میں فرحانہ کے ساتھ اپنے آبائی مکان میں قیام کروں لیکن رضوان نہ مانا۔ اس نے بہت اصرار کرکے مجھے اور فرحانہ کو اپنے گھر پر ٹھہرایا۔

رات کو میں اور رضوان دیر تک ماضی کی یادیں دہراتے رہے۔

میں نے اس سے پوچھا "رضوان! تم برف کی فیکٹری بھی تو لگانے والے تھے؟"

"یار، اس کے لیے زمین تو خرید لی ہے، تعمیر بھی شروع کرادی ہے لیکن....."

"لیکن کیا؟" میں نے پوچھا۔

"مشینری خریدنے کے لیے میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ پیسوں کا بندوبست ہوجائے گا لیکن اس وقت تک سیزن گزر چکا ہوگا۔ خیر، اگلے سال سہی۔"

"مشینری کتنے کی ہے؟"

"مشینری تو خاصی مہنگی ہے لیکن میں نے ایک جگہ بات کی ہے۔ ایک برف خانے کی مشینری مجھے مل رہی ہے۔ مالک کو فوری طور پر پچاس ہزار روپے کی ادائیگی کرنا ہوگی، باقی رقم میں تھوڑی تھوڑی کرکے بعد میں چکادوں گا۔" پھر وہ کچھ سوچ کر بولا "یار اکرم! اگر تم مجھے....."

"یار، یہ اگر مگر کی کیا بات ہے؟" میں نے کہا "تم کل

ی لاہور آکر مجھ سے رقم لے لو اور اپنا کام شروع کردو۔"

"میں تمہاری رقم اگلے سیزن میں ادا کردوں گا۔" رضوان نے کہا۔

"مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔ تم پہلے اپنا دوسرا قرض چکانا پھر مجھے پیسے دینا۔"

"تھینک یو یار!" رضوان نے کہا "تم نے میری بہت بڑی مشکل آسان کردی۔"

"رضوان، دوستی میں تھینک یو، شکریہ مہربانی کے الفاظ نہیں چلتے، کل مجھے بھی ضرورت پڑسکتی ہے۔ میں بھی تم سے قرض لے سکتا ہوں۔"

دوسرے دن رضوان میرے ساتھ لاہور آگیا۔ میں نے چپراسی کو بھیج کر پچاس ہزار روپے منگوائے اور رضوان کو دے دیے۔

"یار، کوئی کاغذ تو دو، میں اس رقم کی رسید لکھ دوں گا۔" رضوان نے کہا۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے ہنس کر کہا "مجھے تم پر اعتبار ہے۔"

تھوڑی دیر بعد رضوان چلا گیا۔

اس نے برف کی فیکٹری بھی قائم کرلی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ کام بھی کرنے لگی۔

پھر کئی مہینے یوں ہی گزر گئے۔ ایک سال بعد مجھے ایک ٹینڈر کے سلسلے میں ڈھائی لاکھ روپے کی ضرورت پڑی۔ میرے بینک میں اس وقت صرف دو لاکھ تھے۔

میں نے اباجی سے پیسے مانگے تو وہ بولے "بیٹا! ایک ہفتہ ٹھہر جا۔ میں نے کل ہی تو دواؤں کا نیا اسٹاک خریدا ہے۔ اس وقت تو میرے پاس بھی پیسے نہیں ہیں۔"

اچانک مجھے رضوان کا خیال آیا تو مجھے اطمینان ہوگیا کہ رقم کا بندوبست ہوجائے گا۔ ٹینڈر کی رقم جمع کرنے میں ابھی تین دن باقی تھے۔

میں اسی شام جہلم روانہ ہوگیا۔ میری گاڑی کا انجن کچھ گڑبڑ کررہا تھا۔ لمبے سفر پر میں رسک نہیں لینا چاہتا تھا اس لیے بلیولائن بس سروس کے ذریعے جہلم روانہ ہوگیا۔

ان دنوں بلیولائن بس سروس کی بسیں بہت آرام دہ ہوا کرتی تھیں۔ وہ بس ائرکنڈیشنڈ بھی تھیں۔

میں رات کو جہلم پہنچا۔ رضوان جہلم میں موجود نہیں تھا۔ اس کے بھائی نے مجھے بتایا کہ رضوان بھائی کل صبح تک واپس آجائیں گے۔

میں نے وہ رات اپنے آبائی مکان میں گزاری۔ وہاں جاکر مجھے عجیب سا احساس ہوتا تھا۔ اس مکان میں میرا بچپن اور لڑکپن گزرا تھا۔ اس مکان سے بے شمار یادیں وابستہ تھیں۔

میں رات کو اپنے مختلف دوستوں اور جاننے والوں سے ملتا رہا۔

دوسرے دن میں نے ہوٹل سے حلوا پوری کا ناشتا کیا اور رضوان کے گھر روانہ ہوگیا۔

رضوان واپس آچکا تھا۔ وہ بہت والہانہ انداز میں مجھ سے ملا اور مجھے اپنے آراستہ ڈرائنگ روم میں بٹھالیا۔ اس کے گھر کی حالت پہلے کے مقابلے میں بہت بہتر تھی۔ اس نے مکان کی دوسری منزل بھی تعمیر کرالی تھی اور گھر کے باہر چھوٹا سا لان بھی لگالیا تھا۔ مجھے اس کی خوش حالی دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔

رسمی باتوں کے بعد میں نے کہا۔ "یار رضوان! آج کل میرا ہاتھ بہت تنگ ہے۔ اگر ہوسکے تو میرے پیسے واپس کردو۔ میں کبھی تقاضا نہ کرتا لیکن مجھے اس وقت شدید ضرورت ہے۔"

"یار، میں ضرور تمہاری مدد کرتا لیکن اس وقت میرا ہاتھ بھی تنگ ہے۔" پھر وہ چونک کر بولا "تم کن پیسوں کی بات کررہے ہو؟"

مجھے اس کے انداز پر ہنسی آگئی۔ میں نے کہا "مذاق چھوڑو رضوان! مجھے اس وقت رقم کی شدید ضرورت ہے۔ مجھے پیسے نہ ملے تو میرا پانچ چھ لاکھ کا نقصان ہوجائے گا۔"

"لیکن یار، تم کس رقم کی بات کررہے ہو؟" اس نے اس مرتبہ قدرے سرد لہجے میں کہا۔

میں نے حیرت سے اسے دیکھا پھر مجھے خیال آیا کہ وہ شاید واقعی بھول گیا ہے۔ میں نے کہا "یار، تم صبح بادام کھایا کرو، تمہارا حافظہ تو ابھی سے جواب دے گیا ہے۔ تم نے مجھ سے پچاس ہزار روپے لیے تھے یا نہیں؟"

"میں نے تم سے پچاس ہزار روپے لیے تھے؟" رضوان نے حیرت سے کہا "کب؟"

مجھے بھی غصہ آگیا "یار، کیا تم بالکل بھول گئے، میں فرحانہ کے ساتھ یہاں آیا تھا اور تم نے برف خانے کے لیے مشینری کی بات کی تھی۔ تمہیں پچاس ہزار روپے کی ضرورت تھی، میں تمہیں اپنے ساتھ لاہور لے گیا تھا۔ وہاں جاکر میں نے تمہیں روپے دیے تھے یا نہیں؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"مذاق مت کرو اکرم!" رضوان نے کہا "تم جانتے ہو کہ میری یادداشت بہت تیز ہے۔ مجھے تو اسکول اور کالج کے زمانے کے وہ واقعات بھی یاد ہیں جو تمہیں بھی یاد نہ ہوں گے۔ مجھے یاد ہے کہ تم بھابی فرحانہ کے ساتھ جہلم آئے تھے اور میرے ہی گھر میں ٹھہرے تھے۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ میں تمہارے ساتھ لاہور بھی گیا تھا۔ وہاں مجھے کچھ کام تھا۔"

"اور تمہیں یہ یاد نہیں ہے کہ میں نے تمہیں پچاس ہزار روپے دیے تھے؟" میں بھنّا کر بولا۔

"یار! مجھے یاد تو جب ہوگا، جب میں نے تم سے رقم لی ہوگی۔" رضوان نے ڈھٹائی سے کہا۔

میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ میں اب تک اسے رضوان کا مذاق سمجھ رہا تھا۔ میں نے درشت لہجے میں کہا "تمہارے پاس اس وقت پیسے نہیں ہیں تو مت دو لیکن جھوٹ تو مت بولو۔"

"یار اکرم! بہت ہو چکا۔" رضوان نے کہا "میرے پاس تمہاری فضول بکواس سننے کے لیے وقت نہیں ہے۔ مجھے ابھی ایک ضروری کام سے لاہور بھی جانا ہے۔"

"بکواس تو تم کر رہے ہو۔" میں بپھر کر بولا "پچاس ہزار روپے کی خاطر دوستی کے ساتھ ساتھ اپنا ایمان بھی خراب کر رہے ہو۔"

"دوستی کا نام مت لو اکرم!" رضوان چیخ کر بولا "تم مجھ پر الزام لگا رہے ہو کہ میں نے تم سے پچاس ہزار روپے لیے ہیں اور مجھے ہی دوستی توڑنے کا الزام دے رہے ہو، تم جانتے ہو کہ میں کسی سے سو روپے بھی لوں تو اس کی رسید ضرور دیتا ہوں، دیتا ہوں یا نہیں؟" اس نے چیخ کر کہا۔

"ہاں، میں جانتا ہوں کہ تم رسید دیتے ہو۔" میں نے کہا "لیکن....."

"اب بھی کسی لیکن کی گنجائش موجود ہے۔" رضوان بھی بپھر کر بولا "میں اتنی بڑی رقم تم سے رسید دیے بغیر لے لوں گا اور تم دے دو گے؟"

"تم نے مجھے رسید دینا چاہی تھی لیکن میں نے ہی رسید لینے سے انکار کر دیا تھا۔"

"کیوں بھئی، تم نے انکار کیوں کر دیا؟"

"اس لیے کہ مجھے تم پر اعتبار تھا۔" میں نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا "لیکن وہ میری بھول تھی، مجھے تم جیسے شخص پر اعتبار کرنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ تم صرف پچاس ہزار روپے میں....."

"اچھا، اب بک بک بند کرو۔ تم میرے ہی گھر میں بیٹھ کر مجھے ہی گالیاں دے رہے ہو۔ اگر تم مہمان نہ ہوتے تو میں تمہیں اٹھوا کر باہر پھنکوا چکا ہوتا۔"

"دیکھو رضوان! میں آخری دفعہ پوچھ رہا ہوں کہ تم میری رقم واپس کرو گے یا نہیں؟"

"نہیں۔" رضوان نے کہا "میں نے تم سے قرض لیا ہوتا تو ضرور واپس کر دیتا۔"

ہماری چیخ پکار سن کر نہ صرف رضوان کے بھائی بلکہ محلے کے کچھ لوگ بھی اندر آ گئے۔

"میں لعنت بھیجتا ہوں تم پر اور تمہاری دوستی پر۔" رضوان نے کہا "تم مجھ پر اتنا بڑا الزام لگا رہے ہو؟"

"تم یہ بات اللہ کو حاضر و ناظر جان کر کہہ سکتے ہو؟"

"کہو تو میں قسم کھا کر تمہیں یقین دلاؤں یا پھر قرآن اُٹھا لوں؟"

"تم میں اتنی جرأت ہے کہ تم جھوٹا قرآن اُٹھا سکو؟" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

"میری جرأت کو چھوڑو، تم اپنی بات کرو۔"

محلے کے ایک بزرگ نے کہا "بیٹا! میں تم دونوں کو جانتا ہوں، یہ بھی جانتا ہوں کہ تم دونوں بہت اچھے دوست ہو۔ پچاس ہزار کے لیے اپنی دوستی کیوں خراب کرتے ہو؟" پھر وہ رضوان سے مخاطب ہوئے "تم حلفیہ یہ بات کہہ سکتے ہو کہ تم نے اکرم سے کوئی رقم نہیں لی؟"

"میں آپ سب کے سامنے حلف اُٹھانے کو تیار ہوں۔" رضوان نے کہا۔

"ٹھیک ہے اگر رضوان نے حلف اُٹھا لیا تو میں اس سے کسی رقم کا مطالبہ نہیں کروں گا۔ پھر یہ معاملہ میں اللہ پر چھوڑ دوں گا۔"

میرا خیال تھا کہ رضوان اب ہنس کر کہے گا کہ میں تو مذاق کر رہا تھا۔ اکرم کو پریشان کرنے میں مجھے مزہ آتا ہے لیکن جب وہ حلف اُٹھانے پر تیار ہو گیا تو میں لرز کر رہ گیا۔

اس کے گھر سے کچھ فاصلے پر مسجد تھی۔ وہ مجھے لے کر سیدھا مسجد میں پہنچا۔ محلے والوں کا مجمع بھی ہمارے ساتھ تھا۔ گھر سے باہر آنے کے بعد وہاں مزید لوگ جمع ہو گئے تھے۔

رضوان نے وضو کیا اور مسجد کی الماری سے قرآن شریف نکال لایا۔ اس نے جزدان میں لپٹا ہوا قرآن مجید

باہر نکال لیا، اسے چوما اور بولا "میں اس قرآن مجید کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے اکرم سے کوئی رقم نہیں لی۔"

میں سناٹے میں رہ گیا۔ مجھے رضوان سے اس اقدام کی توقع نہیں تھی۔

محلے کے ایک بزرگ نے کہا "اکرم! بہتر ہے اب تم بھی قرآن پر ہاتھ رکھ کر کہو کہ تم نے رضوان کو رقم دی تھی۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے چاچا!" میں نے کہا۔

"میں اپنے دعوے سے دستبردار ہوتا ہوں اور یہ معاملہ اللہ پر چھوڑتا ہوں۔" میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

میں نے رومال سے اپنے آنسو خشک کیے اور بوجھل قدموں سے مسجد سے باہر نکل آیا۔ اپنے گھر کی طرف جاتے ہوئے میرے قدم من من بھر کے ہو رہے تھے۔

مجھے رقم سے زیادہ دوستی ختم ہونے کا افسوس تھا۔ مجھے اس بات کا صدمہ تھا کہ رضوان نے محض پچاس ہزار روپے کی خاطر اپنا ایمان بیچ دیا۔

میں نے گھر جا کر اپنا بریف کیس اُٹھایا اور تانگے میں بیٹھ کر لاری اڈے کی طرف روانہ ہو گیا۔

بلیو لائن کوچ روانگی کے لیے تیار تھی۔ میں ٹکٹ لے کر بوجھل دل کے ساتھ اس میں بیٹھ گیا۔ مجھے رہ رہ کر اپنے بچپن اور لڑکپن کے وہ واقعات یاد آ رہے تھے جب میں، رضوان اور عاصم ایک دوسرے کے ساتھ کھیلتے تھے، ساتھ مل کر پڑھتے تھے اور کبھی کبھی کسی بات پر ہماری لڑائی بھی ہو جاتی تھی۔

میں نے دل ہی دل میں کہا "رضوان! میں نے تو واقعی تجھے اپنا دوست سمجھا تھا، تو اگر رقم کبھی واپس نہ کرتا تو بھی مجھے اتنا افسوس نہ ہوتا جتنا تیرے اس رویے سے ہوا ہے۔" میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

بس چلتے چلتے اچانک لہرائی تو مسافر ڈرائیور کو بُرا بھلا کہنے لگے۔

ڈرائیور نے بس اچانک ہی کچے میں اُتار دی، پھر شاید بس اس کے قابو سے باہر ہو گئی اور اچھلتی ہوئی کھیتوں میں داخل ہو گئی۔ بس میں بیٹھے ہوئے کمزور دل مسافروں کی چیخیں نکل گئیں، عورتیں تو باقاعدہ رونے لگیں۔ کچھ لوگ بلند آواز میں کلمہ طیبہ اور مختلف قرآنی آیات کا ورد کرنے لگے۔

ڈرائیور کے پاس بیٹھے ہوئے کچھ مسافر چیخ چیخ کر اسے بس روکنے کا کہہ رہے تھے۔

اچانک بس ایک جھٹکے سے رکی، ڈرائیور نے بس کو ریورس کیا اور اسے ایک مرتبہ پھر آگے بڑھا دیا۔ بس اچھل کر آگے بڑھی، پھر اس کا انجن جھٹکے سے بند ہو گیا۔

ڈرائیور کے نزدیک بیٹھے ہوئے مسافر اس پر ٹوٹ پڑے اور اسے لاتوں اور گھونسوں سے مارنے لگے۔

میں بس کے پچھلے حصے میں تھا اس لیے مجھے حیرت تھی کہ وہ لوگ ڈرائیور کو مار کیوں رہے ہیں؟

میں نے اپنی جگہ سے اُٹھ کر کہا "بھائیو! بس اس بے چارے

جادو میں استعمال ہونے والی اشیا

مختلف ذرائع سے ملنے والی معلومات کے مطابق سفلی اور کالے علم کے سلسلے میں جادوگران علوم کے ماہرین جو اصطلاحات استعمال کرتے ہیں وہ کچھ یوں ہیں۔

بانڈی کا وار، کالی دیوی، الو کا عمل، سارس وتی، ہنومان، بھیرو، پچھیا دیوی اور مسان کے وار بہت مشہور عمل ہیں۔

مسان کا عمل مردہ انسانوں کی ہڈیوں کا سفوف بنا کر شیطانی منتر پڑھ کر کسی انسان کو کھلایا جاتا ہے جس کے باعث مردے کی تمام منفی خصوصیات اس شخص میں پیدا ہو جاتی ہیں جسے یہ سفوف کھلایا جاتا ہے۔

بھیرو کا عمل، اس عمل میں عامل بکرے کے دونوں میں اپنا تیار کردہ تعویذ ڈال کر مخصوص تعداد میں سوئیاں چبھو دیتے ہیں اور یہ شیطانی عمل میاں بیوی کے دلوں میں ایک دوسرے سے نفرت پیدا کرنے کے لیے کیا جاتا ہے۔

پچھا دیوی کا عمل، اس عمل میں عامل کسی گڑیا کے جسم میں سوئیاں چبھو کر اسے ریت میں دفن کر دیتا ہے۔ اس طرح یہ عمل اس کے اپنے مطلوبہ شخص کو متعدد بیماریوں میں مبتلا کر دینے کا سبب بنتا ہے۔

الو کا عمل۔ اس عمل کا مطلب دشمن کو مکمل تباہی بربادی کے مرحلے تک پہنچا کر قبر تک پہنچا دینا ہوتا ہے۔ اس عمل کے لیے عامل کسی الو کے بازو، پاؤں اور چونچ کالے دھاگے سے باندھ کر اس کے جسم پر متعدد زخم ڈال کر اسے تڑپ تڑپ کر مرنے کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔ اس کے علاوہ عاملین کے مطابق الو کی آنکھوں سے تیارہ کردہ سرمہ جنس مخالف اور دشمنوں کو زیر کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

مرسلہ: رضا کریمی، پشاور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے قابو سے باہر ہوگئی تھی۔ یہ اس کی غلطی تھی لیکن.....''

''اس نے ایک آدمی کو اپنی بس کے نیچے کچل دیا ہے۔'' ایک صاحب بپھر کر بولے ''میں تو اس کے نزدیک ہی بیٹھا تھا۔ ونڈ اسکرین سے مجھے بھی باہر کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ ایک آدمی نے سڑک پار کرنے کی کوشش کی لیکن وہ بے چارہ بس کو دیکھ کر گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے اسی شخص کو مارنے کے لیے بس کچے میں اتار دی۔ وہ بے چارہ گھبرا کر کھیتوں کی طرف بھاگا تو اس مردود نے کھیتوں میں بھی اس کا پیچھا کیا اور اسے کچل دیا، نہ صرف اسے کچلا بلکہ بس کو ایک مرتبہ ریورس کر کے دوبارہ اس کے جسم کو روند ڈالا۔''

''یہ صاحب بالکل سچ کہہ رہے ہیں۔'' ایک نوجوان نے کہا ''میں نے بھی اس شخص کو دیکھا تھا۔''

''تم لوگ کیوں جھوٹ بول رہے ہو؟'' ڈرائیور بھنا کر بولا ''میں نے کسی آدمی کو نہیں کچلا ہے۔''

''جھوٹ مت بولو۔'' ایک عورت نے کہا ''میں نے بھی اپنی آنکھوں سے اس آدمی کو کھیتوں میں بھاگتے دیکھا تھا۔ تم نے بس کھیتوں میں اس کے پیچھے دوڑا دی۔''

''او میرے خدا!'' ڈرائیور کراہ کر بولا ''میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے کسی آدمی کو نہیں کچلا۔ میری بس کے سامنے ایک خنزیر آ گیا تھا۔ میں نے اسے بچانے کی کوشش کی لیکن وہ منحوس پھر میرے سامنے آ گیا۔ مجھے اس پر غصہ آ گیا اور میں نے اسے کچلنے کے لیے بس کو سڑک سے اُتار دیا۔ وہ اچھل کر کھیتوں میں بھاگا۔ مجھے بھی جنون سوار ہوگیا تھا کہ یہ جانور بچ کر نکلا جا رہا ہے۔ میں نے کھیتوں میں اس کا پیچھا کیا اور اسے کچل دیا، تم خود دیکھو۔'' اس نے بیک ویو مرر کی طرف اشارہ کیا۔

مجھ سمیت کئی لوگوں نے شیشے میں دیکھا۔ واقعی خنزیر مرا پڑا تھا جبکہ ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر بیٹھے شخص اور اس کے ہمنوا کا اصرار تھا کہ انہوں نے آدمی کو تڑپ تڑپ کر گرتے دیکھا ہے۔

''جھوٹ سچ کا فیصلہ ابھی ہوجائے گا۔'' ایک اور صاحب نے کہا ''اگر اس نے خنزیر کو کچلا ہوگا تو اس کی لاش بھی موجود ہوگی۔''

یہ کہہ کر وہ صاحب نیچے اُتر گئے۔ پھر تو بس کا ہر مسافر نیچے اُتر آیا۔ میں بھی تجسس میں آگے بڑھا۔ لاش پر نظر پڑتے ہی میں سکتے کے عالم میں رہ گیا۔ لاش اگرچہ بُری طرح مسخ ہوچکی تھی لیکن اس کے چہرے کا کچھ حصہ ابھی قابلِ شناخت تھا۔ وہ لاش رضوان کی تھی۔

میں نے مزید تصدیق کے لیے اس کے ہاتھوں پر نظر ڈالی۔ اس کے دائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں سبز نگینے کی انگوٹھی تھی اور بائیں کلائی پر راڈو گھڑی بندھی تھی۔ یہ دونوں چیزیں میں نے بارہا رضوان کے پاس دیکھی تھیں۔

ڈرائیور ابھی تک اپنے موقف پر ڈٹا ہوا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہاں پولیس آ گئی۔ پولیس انسپکٹر نے لاش کی جیب سے رضوان کا شناختی کارڈ بھی برآمد کرلیا۔ اس کی جیب میں اچھی خاصی رقم بھی تھی۔ انسپکٹر نے سب کے سامنے وہ رقم گنی۔ وہ پورے پچاس ہزار روپے تھے۔

ڈرائیور نے اپنے بیان میں پھر شد و مد سے وہی بات کہی کہ میں نے کسی انسان کو نہیں بلکہ خنزیر کو کچلا ہے۔

میں جانتا تھا کہ ڈرائیور جھوٹا نہیں ہے لیکن میں بھی اگر وہی بات کہتا تو لوگ میرے ذہنی توازن پر شبہ کرتے۔

میں شام کو لاہور پہنچا تو عاصم کو غیر متوقع طور پر دیکھ کر حیران رہ گیا۔

وہ والہانہ انداز میں مجھ سے لپٹ گیا۔

میں نے کہا ''عاصم! وہ رضوان.....''

''نام مت لو اس بے ایمان کا!'' عاصم نے میری بات کاٹ دی ''جانتے ہو اس نے کیا، کیا ہے؟ اس نے میرے اسٹور سے پورے چالیس ہزار پاؤنڈز کا غبن کیا ہے۔ وہ انتہائی ناقابلِ اعتبار آدمی ہے۔ تمہیں یاد ہے، میں نے اس کا قرض چکایا تھا اور اسے اپنے ساتھ لندن لے گیا تھا۔ میں نے اس سے کبھی اپنی رقم کا مطالبہ نہیں کیا، اس کا اس نے یہ صلہ دیا کہ وہ میرے اعتبار کا خون کر کے پاکستان بھاگ آیا۔ میں لعنت بھیجتا ہوں اس کی دوستی پر۔''

''کیا تمہیں رضوان کے غبن کا علم ابھی ہوا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''علم تو مجھے اسی وقت ہوگیا تھا، میں چاہتا تو اس کے خلاف قانونی کارروائی کرسکتا تھا لیکن میں نے اپنا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا۔''

''تو پھر اللہ نے آج انصاف کر دیا ہے۔'' میں نے کہا اور اسے تفصیل سے بتایا کہ رضوان کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہے۔

''اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت کرے۔'' عاصم نے کہا۔

''ہاں یار!'' میں نے شکستہ لہجے میں کہا ''اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کو معاف فرمائے۔''

ایک جاننے والے شخص کی میت میں گیا تھا۔ وہ بستی پہاڑیوں سے گھری ہوئی وادی میں واقع ہے۔ قدرت کا حسن ہر طرف بکھرا ہوا تھا۔ میں تو بس قدرت کی صناعی دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ ایسی خوبصورت وادی میں نے اس سے پہلے نہیں دیکھی تھی۔ ہم شہر والے تو اسے جنت نظیر ہی کہہ سکتے ہیں۔

قبرستان بستی سے باہر تھا مگر جھیل کے نزدیک ہونے کی وجہ سے بہت بھلا لگتا تھا۔ قبر تیار ہو رہی تھی اس لیے میں جھیل کی طرف چل پڑا۔ قبروں کے درمیان سے ہوتا ہوا میں آگے بڑھ رہا تھا۔ تمام کی تمام قبریں کچی تھیں۔ کہیں کہیں قبروں کو پھلانگنا بھی پڑا تھا۔ ابھی میں نے آدھا راستہ طے کیا تھا کہ ایک جگہ ٹھٹھک گیا۔ ٹھٹھکنے کی وجہ ایک گڑھا تھا، اس گڑھے سے ہلکا ہلکا دھواں نکل رہا تھا۔ میں مبہوت سا کھڑا سے دیکھ رہا تھا کہ راشد، جس کے ساتھ میں آیا تھا، وہ گھبرایا ہوا نزدیک آیا۔

''تم..... تم یہاں کیا کر رہے ہو، جلدی ہٹو یہاں سے۔''

''مگر کیوں؟'' میں نے پوچھا۔

''اس لیے کہ یہ عذاب گزیدہ گڑھا ہے۔'' اس کی آواز میں خوف تھا، پھر جواب میں اس نے جو کچھ بتایا، اسے میں

عذاب کا گڑھا

جناب ایڈیٹر صاحب

سلام مسنون!

ایک انوکھا لیکن سچّا واقعہ ارسال خدمت ہے۔ اس میں سبق کا پہلو ہے اس لیے میں نے سرگزشت میں بھیجنا زیادہ پسند کیا۔ کیونکہ ایسے واقعات زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچنے چاہئیں تاکہ بگڑتا ہوا زوال پذیر معاشرہ کچھ دیر کے لیے سوچنے پر مجبور ہوجائے۔ غور و فکر کرے کہ اللہ تعالیٰ عادل ہے۔ میزان عدل کسی کو بخشنے پر تیار نہیں ہے۔

محمد سلیم اختر
(راولپنڈی)

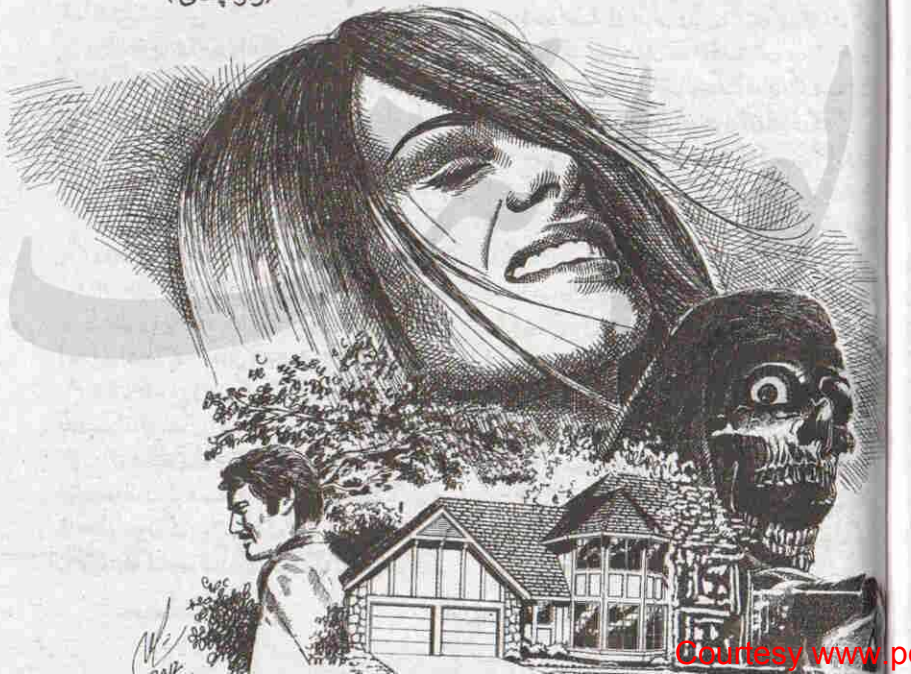

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کہانی کی شکل میں بیان کررہا ہوں۔ اس کہانی کے مرکزی کردار کی زبانی تاکہ قارئین کو صحیح لطف آسکے۔

☆☆☆

''نہیں اعجاز! میں بابر سے منسوب ہوں..... میں اس کے علاوہ کسی اور کے بارے میں سوچوں تو مجھے موت آجائے۔ میرا منگیتر، میرا جیون اور میری محبت ہے، وہی میرا سب کچھ ہے۔''

''میں اس منگنی کو تسلیم نہیں کرتا۔ ابا جان نے میرے ساتھ ظلم کیا ہے۔ وہ جانتے تھے کہ میں تمہیں چاہتا ہوں، پھر بھی انہوں نے.....''

''کیونکہ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ میں بابر کو پسند کرتی ہوں، تمہیں نہیں۔'' میں نے اعجاز کی بات مکمل نہ ہونے دی۔

''ایک معمولی سا فوجی بھلا تمہیں کیا خوشیاں دے گا؟''

''مجھے فخر ہے کہ میں ایک وطن کے محافظ کی منگیتر ہوں۔'' میں یہ کہہ کر آگے بڑھ گئی۔ تبھی پیچھے سے آواز آئی۔

''مجھے ٹھکرانا تمہیں مہنگا پڑے گا زبیدہ!''

☆☆☆

اعجاز اور بابر ایک ہی باپ کی اولاد تھے مگر ان کی ماں ایک نہ تھی۔ اعجاز ابھی دو سال ہی کا تھا کہ اس کی ماں زندگی سے ناتا توڑ گئی۔ اس کے باپ نے دوسری شادی کی اور بابر اسی بیوی سے تھا۔

اعجاز خاندان بھر کا لاڈلا تھا۔ ہر کوئی اسے ہی پیار کرتا اور اس کے ناز اٹھاتا تھا صرف اس لیے کہ اس کی ماں نہ تھی۔ لاڈ اور پیار نے اسے ضدی اور خودسر بنا ڈالا تھا۔ اس کی ہر خواہش منٹوں میں پوری کی جاتی۔ اگر حدود و قیود میں ہو تو شخصیت کی تعمیر ہوتی ہے اور اگر حدود سے تجاوز کر جائے تو شخصیت بگڑ جاتی ہے۔ یہی اس کے ساتھ ہوا تھا۔ اس کے برعکس بابر کو ہر معاملے میں نظرانداز کر دیا جاتا، مگر وہ پھر بھی خوش اور صابر تھا بالکل اپنی ماں کی طرح۔ وہ اپنے ساتھ ہونے والی ہر زیادتی کو برداشت کرنے کا عادی ہو گیا تھا۔ اعجاز کو بڑا بھائی سمجھ کر وہ اس کا بہت احترام کرتا اور اس کا ہر حکم بجالاتا تھا۔ بابر کی ماں بھی ایک صابر و شاکر عورت تھی۔ اس نے شادی سے قبل اعجاز کے باپ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اعجاز کو کبھی سوتیلے پن کا احساس نہیں ہونے دے گی۔ اور وہ اپنا وعدہ وفا کرتے ہوئے نادانستہ طور پر اپنے بیٹے کے ساتھ ناانصافی کر جاتی تھی، یہ اس کی اعلیٰ ظرفی تھی کہ وہ اعجاز کو بابر پر ترجیح دیتی تھی۔ یہ اس کی مجبوری بھی تھی کیونکہ جانتی تھی کہ

اس کی معمولی سی لغزش اسے پورے گھرانے کا دشمن بنا دے گی۔

اعجاز کے باپ کا شمار علاقے کے بڑے زمینداروں میں ہوتا تھا۔ اس کی اراضی سیکڑوں ایکڑ پر مشتمل تھی۔ لوگ جانتے تھے کہ وہ بابر کے ساتھ زیادتی اور ناانصافی کر رہا ہے مگر کوئی بھی اس کے سامنے زبان کھولنے کا حوصلہ نہ رکھتا تھا۔ بابر کو ان باتوں کی پروانہ تھی۔ نہ ہی اسے زمینداری کا شوق تھا۔ اسے صرف پڑھنے کا شوق تھا۔ وہ علاقے کے ہائی اسکول میں پڑھتا تھا اور ہر کلاس میں پوزیشن بھی لیتا تھا۔ اس کے برعکس اعجاز نے پانچ جماعتیں پڑھنے کے بعد تعلیم کا سلسلہ ختم کر دیا تھا۔ اسے صرف کتے اور پرندے پالنے کا شوق تھا۔ اس کا باپ بھی اس کی حوصلہ افزائی کرتا تھا۔ آئے دن اعجاز کی گاؤں کے لڑکوں سے لڑائی ہوتی رہتی۔ وہ ہر ایک کے ساتھ زیادتی اور ناانصافی کرتا، اس وجہ سے اسے کوئی پسند نہیں کرتا تھا جبکہ بابر کی ہر کوئی تعریفیں ہی کرتا۔ ہر کوئی اس کے اعلیٰ اخلاق کے گن گاتا۔

میں بھی اسی وجہ سے بابر کو پسند کرتی تھی۔ وہ مردانہ حسن میں بھی اعجاز سے بڑھ کر تھا۔ ہماری دور کی رشتے داری بھی تھی اور بابر مجھے پسند بھی کرتا تھا..... مگر اس نے اس کا اظہار کبھی نہیں کیا تھا۔ میں نے کئی بار اس کا راستہ روک کر اس سے بات کرنے کی کوشش کی تھی، مگر وہ کنی کترا کر نکل جاتا تھا۔ صرف ایک بار اس نے کہا تھا۔

''زبیدہ! میں بھی تمہیں پسند کرتا ہوں، مگر جب تک ہماری شادی نہیں ہو جاتی، میں تم سے بات نہیں کروں گا۔''

میں اب بابر کی طرف سے اس کا رشتہ آنے کی منتظر تھی۔ بابر نے میٹرک کا امتحان پاس کیا تو ایک روز خبر ملی کہ بابر فوج میں بطور سپاہی بھرتی ہو گیا ہے۔ میں خوش ہوئی کہ بابر اب روزگار والا ہو گیا ہے۔

ایک سال بیت گیا۔ میں بابر کی سلامتی اور ترقی کی دعائیں مانگتی رہی۔ ایک سال بعد وہ ایک ماہ کی چھٹی لے کر آیا تو میرے من میں خوشیاں بھر گئیں۔ بابر نے اپنا وعدہ نبھایا۔ اس نے اپنے ماں باپ کو بھیج کر میرا رشتہ مانگا تو میرے والدین نے میری مرضی جان کر ہاں کر دی۔ یوں اس کی چھٹی کے دوران ہی ہماری منگنی ہو گئی۔ ان دنوں میں بہت خوش تھی اور ہواؤں میں اڑتی تھی کہ میں نے جو چاہا تھا، وہی مجھے مل رہا ہے۔ یہ میری اور بابر کے جذبوں کی سچائی تھی کہ ہماری منزل آسان ہو گئی تھی۔

بابر علی کی چھٹی ختم ہو گئی اور وہ واپس یونٹ میں چلا گیا۔ طے یہ پایا تھا کہ اگلے سال جب بابر علی سالانہ چھٹی لے کر آئے گا تو ہماری شادی کر دی جائے گی۔

☆☆☆

میری اور بابر کی منگنی کیا ہوئی، اعجاز نے میرا جینا حرام کر دیا۔ اعجاز کی منگنی ساتھ والے گاؤں کے نمبردار کی بیٹی سے ہو چکی تھی۔ اس کی منگیتر کئی ایکڑ زمین کی وارث تھی۔ حسن اور خوبصورتی میں بھی وہ لاکھوں میں ایک تھی، مگر اپنے بھائی بابر سے ضد نے اسے بے قابو کر دیا تھا۔ وہ کبھی میرے گھر آجاتا اور کبھی کھیتوں میں آتے جاتے میرا راستہ روک لیتا اور یہی کہتا کہ میں نہ صرف اس کے ساتھ محبت کا اقرار کروں بلکہ اس کے ساتھ شادی بھی کرلوں۔

میں جانتی تھی کہ وہ یہ سب کچھ جان بوجھ کر کر رہا ہے۔ میں تو اسے پسند بھی نہیں کرتی تھی۔ مجھے اس کے کرتوتوں سے سخت نفرت تھی۔ اس کا علم اسے بھی تھا، مگر پھر بھی وہ اپنی عادت سے باز نہ آتا تھا۔ اس کی بدتمیزیاں روز بہ روز بڑھتی جارہی تھیں۔ میں سوچتی تھی کہ میں جب بیاہ کر اس حویلی میں جاؤں گی تو اعجاز میرا جینا حرام کر دے گا۔ پھر میں یہ سوچ کر اپنے آپ کو تسلی دے لیتی کہ میں تو شادی کے بعد بابر کے ہمراہ شہر چلی جاؤں گی۔

اعجاز کا باپ بھی بیٹے کے کرتوتوں سے آگاہ تھا اس لیے اس نے اسے بھی اپنے ساتھ زمینداری پر لگا لیا تھا تاکہ اس کا دھیان کسی اور طرف نہ جائے۔ میری اور بابر کی شادی سے قبل ہی اعجاز کی شادی کر دی گئی تو میں پُرسکون ہو گئی۔ اعجاز بھی شادی کے بعد مجھے بھول گیا۔

☆☆☆

بابر ایک سال کے بعد چھٹی پر آیا تو ہماری شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ ہماری شادی فروری 1965ء میں ہوئی تھی۔ بابر کی چھٹی 2 مارچ کو ختم ہو رہی تھی۔ اس رات ہم دیر تک جاگتے ہی رہے تھے۔ بابر نے وعدہ کیا تھا کہ وہ کوارٹر حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ جوں ہی اسے کوارٹر ملا، وہ مجھے بلا لے گا۔ میں نے اسے اعجاز کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ اس نے سب سن کر صرف اتنا کہا تھا۔ ''زبیدہ! مجھے تم پر مکمل اعتماد ہے، اعجاز میرا بڑا بھائی ہے۔ میں اس کا احترام کرتا ہوں۔ تمہیں بھی اس کا احترام کرنا ہے۔''

اگلی صبح بابر ڈیوٹی پر روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

اب بابر مہینے میں ایک بار نائٹ پاس لے کر گاؤں آجاتا اور اگلے دن واپس روانہ ہو جاتا۔ جولائی 1965ء میں جب بابر کو علم ہوا کہ میں اس کے بچے کی ماں بننے والی ہوں تو وہ بہت خوش ہوا۔ ابھی تک اسے سرکاری مکان نہیں ملا تھا۔ اس عرصہ میں اعجاز ایک بیٹے کا باپ بن چکا تھا۔ اس کا بچہ بہت ہی خوبصورت تھا۔ اعجاز کی بیوی آسیہ اس جیسی ہی عادات کی مالک تھی۔ اسے یہ غرور تھا کہ اس کا تعلق ایک امیر خاندان سے ہے۔ دونوں میاں بیوی کا میرے ساتھ کچھ اچھا برتاؤ نہ تھا مگر میں پھر بھی چھوٹی ہونے کے ناتے ان کی عزت کرتی تھی کیونکہ یہ بابر کا حکم بھی تھا۔ وہ خود بھی ان دونوں کی بے حد عزت کرتا تھا اور جب بھی چھٹی پر گاؤں آتا تو ان کے لیے کوئی نہ کوئی تحفہ ضرور لاتا تھا۔

☆☆☆

بابر یکم ستمبر 1965ء کو ہم سب سے مل کر واپس اپنی یونٹ میں چلا گیا تھا۔ وہاں سے اس نے خط لکھا۔

زبیدہ! میں خیریت سے ڈیوٹی پر پہنچ گیا تھا۔ اس ماہ مجھے سرکاری کوارٹر ملنے کی امید تھی۔ مگر اب ایسا نہ ہوگا کیونکہ ہمارے ازلی دشمن نے ہمارے وطن پر حملہ کر دیا ہے۔ میں وطن کی حفاظت کی خاطر محاذ جنگ کی جانب روانہ ہو رہا ہوں۔ میری یہ خواہش ہے کہ میں حق کی راہ میں لڑتا ہوا شہید ہو جاؤں۔ تم آنسو مت بہانا بلکہ دعا کرنا کہ پروردگار، مجھے یہ رتبہ عطا فرمائے، آمین۔ میری نشانی کی حفاظت کرنا۔ میں اگر غازی بن کر لوٹا تو پھر تمہیں کسی بھی قسم کی پریشانی نہ ہونے دوں گا۔

اللہ حافظ..... فقط..... تمہارا، بابر علی۔

☆☆☆

بابر علی کی یونٹ چونڈہ کے محاذ پر دشمن سے برسرِ پیکار تھی۔ چونڈہ کے بارے میں مجھے تمام تفصیل بعد میں معلوم ہوئی تھی کہ چونڈہ میں ٹینکوں اور انسانوں کا معرکہ ہوا تھا۔ بابر علی جس بریگیڈ میں شامل تھا، اس کی کمان جنرل عبدالعلی کر رہے تھے۔ دشمن کے چھ سو ٹینکوں کا پہلا استقبال اسی پیادہ بریگیڈ نے کیا تھا، جس کے پاس اپنے صرف چند ٹینک تھے جو ٹریننگ میں تو استعمال ہو سکتے تھے، مگر جنگ کے قابل نہیں تھے۔ آغاز جنگ سے لے کر جنگ بندی تک چونڈہ کے میدان میں جو کچھ ہوا، وہ پاک فوج کے جانبازوں کی شجاعت، حب الوطنی، بے خوفی اور فنِ حرب و ضرب کے کمال

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی ایسی داستان ہے جس کی مثال کم ہی ملتی ہے۔ بابر علی بھی اس میدان میں کسی سے پیچھے نہ تھا۔ اس کے ایک ساتھی لانس نائیک وہاب گل، جو پرسلامدینے کے لیے میرے گاؤں آیا تھا، اس نے مجھے بتایا تھا کہ بابر علی نے بہادری سے لڑتے ہوئے دشمن کے چار ٹینک تباہ کیے۔

ٹینکوں کے اس معرکے میں بھارت کے آرمرڈ ڈویژن، انفنٹری اور پہاڑی ڈویژنوں کا جو نقصان ہوا، اس کے اعداد و شمار نہیں بتائے جاسکتے کیونکہ میدانِ جنگ میں جگہ جگہ اس کے ٹینک جل رہے تھے۔ بعض بیکار کھڑے تھے اور آٹھ صحیح سلامت پکڑے گئے تھے۔ لاشیں تو گنی ہی نہ جاسکی تھیں۔ کھیت لاشوں سے پٹے پڑے تھے۔ جلتے ہوئے ٹینکوں سے کوئی بھی بھارتی سپاہی زندہ نہ نکل سکا اور اگر زندہ نکلا بھی تو وہ توپوں کے گولوں سے مارا گیا۔

☆☆☆

جب فوجی ایمبولینس ہمارے گاؤں میں داخل ہوئی تو پورا گاؤں اس کو دیکھنے کے لیے امڈ آیا اور جب یہ اعلان ہوا کہ اس میں بابر علی شہید کی میت ہے تو میرا جی چاہا کہ دھاڑیں مار مار کر روؤں۔ اپنے بال نوچ ڈالوں، مگر مجھے بابر علی کے آخری الفاظ یاد آگئے۔ شہادت تو اس کی آرزو تھی۔ اوپر والے نے اس کی آرزو پوری کردی تھی۔ اس لیے میں نے ایک آنسو بھی نہ بہنے دیا اور خاموش بیٹھی جنازہ کا انتظار کرتی رہی۔

بابر علی کا جنازہ علاقے کا سب سے بڑا جنازہ تھا۔ ہزاروں لوگوں نے اس کے جنازے میں شرکت کی تھی۔ ہر کوئی میرا حوصلہ بڑھاتا تھا اور احترام کرتا تھا کہ میں شہید کی بیوہ ہوں۔ ساتھ ہی لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ شہید کبھی مرا نہیں کرتے۔ وہ زندہ رہتے ہیں، اسی لیے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ۔

''اللہ کی راہ میں جان دینے والے کو مردہ مت کہو۔''

☆☆☆

اب بابر کی قبر ہی میری زندگی کا واحد سہارا تھی۔ یا پھر وہ نشانی جسے ابھی دنیا میں آنا تھا۔ میں صبح و شام بابر کی قبر پر جاتی، قرآن مجید کی تلاوت کرتی اور مغفرت کی دعائیں مانگ کر لوٹ آتی۔ اب یہی میرا معمول تھا۔

میری ساس پہلے ہی فوت ہوگئی تھی۔ میرے سسر نے میری ڈھارس بندھائی۔ وہ جانتے تھے، کہ ابھی بابر کی نشانی اس دنیا میں آنے والی ہے۔ میں نے ان کو کہہ دیا تھا کہ اب مجھے زندگی بھر شادی نہیں کرنی۔ اسی لیے مجھے مجبور نہ کرنا ورنہ میں یہ حویلی چھوڑ دوں گی۔ میرے سسر نے بھی مجھ پر مہربانی کی اور بابر کے حصے کی تمام جائداد میرے نام کردی۔ اعجاز نے اس پر اعتراض کیا مگر وہ نہ مانے۔ انہیں اپنے بیٹے کی شہادت پر فخر تھا۔ شہید کا باپ ہونے کے ناتے علاقے کے لوگ ان کا زیادہ ہی احترام کرنے لگے تھے اور ان کی عادات میں تبدیلی آگئی تھی۔ اب وہ غصہ بھی کم کرتے تھے اور نماز بھی پابندی سے پڑھنے لگے تھے۔

☆☆☆

مارچ 1966ء میں، میں بابر علی کی دو جڑواں بیٹیوں کی ماں بن گئی۔ اس روز میں بہت روئی تھی کہ یہ کیسے باپ کہہ کر پکاریں گی؟ انہوں نے تو باپ کی شکل بھی نہیں دیکھی اور نہ ہی دیکھ پائیں گی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ مجھے یہ فخر بھی تھا کہ میں ایک شہید کی بیوہ ہوں۔ جب میری بیٹیوں کو معلوم ہوگا کہ وہ ایک بہادر شہید کی بیٹیاں ہیں تو ان کے سر بھی فخر سے تن جائیں گے۔ ان کے دادا نے ان کے نام ''فرحت'' اور ''عصمت'' رکھے۔ وہ دونوں بہت ہی خوبصورت تھیں۔

میرے سسر نے بچپن میں ہی فرحت کی نسبت اعجاز کے بیٹے اعجاز سے طے کردی۔ یہ ان کی خواہش تھی اس لیے میں نے نہ چاہنے کے باوجود بھی ان کی بات مان لی۔ [redacted] فرحت کی منگنی کی رسم باقاعدہ طور پر ادا کردی گئی جس میں گاؤں کے لوگوں کو بھی مدعو کیا گیا۔ وہ فرحت اور عصمت دونوں کو بہت چاہتے تھے۔ گاؤں کے لوگ بھی شہید کی بیٹیاں ہونے کے ناتے ان سے بہت محبت کرتے تھے۔ ابھی وہ پانچ سال کی تھیں کہ ان کے دادا بھی چل بسے۔ ان کے جانے سے میں بے سہارا ہوگئی جبکہ اعجاز کو ہر طرح کی آزادی مل گئی۔ وہ صرف اپنے باپ کی وجہ سے خاموش تھا اور ان ہی کی وجہ سے میرا احترام کرتا تھا مگر اب کوئی روک ٹوک کرنے والا نہ رہا اور وہ اپنی کھال سے باہر آگیا۔

''زبیدہ! اب بھی وقت ہے۔ تم ابھی جوان ہو، خوبصورت ہو..... میرے ساتھ نکاح کرلو، تمہاری بقیہ زندگی بھی آرام سے گزرے گی اور تمہاری بیٹیوں کو بھی سائبان مل جائے گا۔'' یہ اعجاز کے الفاظ تھے جو اس نے باپ کی وفات کے دو دن بعد مجھ سے کہے تھے۔

''یہ ناممکن ہے اعجاز بھائی! میں صرف بابر کی ہوں۔ میری روح اور میرا جسم اس کی امانت ہیں اور میں امانت میں خیانت کی قائل نہیں ہوں۔ شاید تم نہیں جانتے کہ شہید کبھی مرا

نہیں کرتے، اس طرح میرا بابر بھی زندہ ہے۔ میرے خوابوں میں، خیالوں میں، چلتے پھرتے، سوتے جاگتے، اس کی خوشبو میرے ہمراہ رہتی ہے۔'' مگر میری کسی بات کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اس نے مختلف حیلوں بہانوں سے مجھے تنگ کرنا شروع کردیا۔ میں جانتی تھی کہ اب اسے زیادہ دکھ جائداد کے بٹوارے کا ہے۔ وہ میرے حصے کی تمام جائداد بھی ہتھیانا چاہتا تھا۔ مگر میں نے بھی اس کے آگے ہتھیار نہ ڈالنے کی قسم کھالی تھی۔ اس نے ہر ممکن کوشش کرڈالی کہ میں اس سے شادی کرلوں، مگر وہ میری قسم نہ توڑ سکا۔ میں بابر سے بے وفائی کا تصور بھی نہ کرسکتی تھی۔ جب بھی دل اداس ہوتا، میں قبرستان چلی جاتی۔ بابر کی قبر مجھے سکون اور قرار دیتی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے بابر علی زندہ ہے اور میرے پاس بیٹھا مجھ سے باتیں کررہا ہے۔ فرحت اور عصمت کو میں نے اسکول میں داخل کرادیا تھا۔ میں ان کی تعلیم و تربیت پر بہت ہی محنت کررہی تھی۔ اس کے برعکس اعجاز کا بیٹا باپ پر گیا تھا۔ اس نے گاؤں کے اسکول سے چار جماعتیں ہی پاس کی تھیں اور باپ کی عادتیں اپنا کر اسی کے نقشِ قدم پر چل رہا تھا۔ اس کے ماں باپ نے بھی اسے کھلی آزادی دے رکھی تھی۔ وہ آوارہ اور عیاش ہوگیا تھا۔ میں نے.... ....فرحت کی منگنی ختم کرنے کے بارے میں سوچنا شروع کردیا تھا۔

☆☆☆

بابر علی کی برسی نزدیک آرہی تھی۔ میں کئی دنوں سے اسے خواب میں دیکھ رہی تھی، وہ بار بار مجھ سے کہتا تھا۔

''زبیدہ! اپنا خیال رکھا کرو۔ تمہارے دشمن کسی وقت بھی تمہیں نقصان پہنچا سکتے ہیں۔''

مگر میں نے اس کی ان باتوں کو اہمیت نہ دی اور دل میں کسی قسم کا خیال نہ لائی۔

اگلے روز بابر علی کی برسی تھی۔ یہ سب ہی کو معلوم تھا کہ میں برسی والے دن سویرے سویرے بابر کی قبر پر جاتی ہوں اور دیر سے لوٹتی ہوں۔ صبح میں نماز ادا کرنے کے بعد قبرستان کی طرف روانہ ہوگئی۔ عصمت نے بھی ساتھ جانے کا کہا مگر میں نے اسے گھر پر ہی رہنے کو کہا۔ میں نے پہلے تو قبر کی صفائی کی اور پھر قرآن مجید کی تلاوت شروع کردی۔ میں تلاوت میں اس قدر مگن تھی کہ مجھے اپنے آس پاس کے علاوہ کسی بھی چیز کی خبر نہ تھی۔ اچانک ہی کسی چیز کی قبر کے جنگلے کے ساتھ ٹکرانے کی آواز سنائی دی تو میں نے نظر اُٹھا کر اس طرف دیکھا۔ ایک بڑی سی کلہاڑی قبر کے جنگلے کے ساتھ ٹکرا کر گری تھی۔ میں نے گھبراہٹ کے عالم میں پیچھے مڑ کر دیکھا تو اپنے پیچھے چند قدم پر اعجاز کو کھڑے دیکھ کر اور بھی خوف زدہ ہوگئی۔ میں جان گئی کہ یہ مجھے جان سے مار دینا چاہتا تھا اور کلہاڑی اسی کے ہاتھوں سے چھوٹ کر گری ہے۔ میں قدرت کے اس کرشمے پر حیران ہوگئی۔ مجھے اب بھی خوف محسوس ہونے لگا کہ یہ آج میری جان لے لے گا۔

مگر ایسا نہ ہوا..... قدرت نے اعجاز کو بے بس کرڈالا تھا۔ وہ مجھے قتل کرنے آیا تھا مگر کلہاڑی اس کے ہاتھوں سے کیسے نکل گئی؟

جلد ہی مجھے اس کا جواب مل گیا۔ زمین نے اعجاز کے پاؤں پکڑ لیے تھے۔ وہ نہ بھاگ سکتا تھا اور نہ ہی حرکت کرسکتا تھا، پھر زمین ہلکی سی شق ہوئی اور اس نے اعجاز کو نگلنا شروع کردیا۔ وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہا تھا۔ اونچی آواز میں مجھ سے معافی مانگ رہا تھا۔ اس نے اقرار کیا کہ وہ مجھے قتل کرنے کے ارادے سے آیا تھا۔ اس کی چیخیں گاؤں والوں نے بھی سنیں اور پھر کچھ لوگ بھی آگئے کیونکہ قبرستان گاؤں سے زیادہ دور نہ تھا۔ اعجاز نے اُن کے سامنے بھی اپنے جرم کا اعتراف کیا اور التجا کرنے لگا کہ اس کو باہر نکالا جائے۔ وہ چھاتی تک زمین میں دھنس چکا تھا۔ اس کی سانسیں بھی اکھڑنے لگی تھیں اور وہ آہستہ آہستہ زمین کے اندر دفن ہوتا جارہا تھا۔ کچھ لوگوں نے اسے کھینچ کر باہر نکالنے کی کوشش کی مگر زمین نے اسے نہ چھوڑا۔ اور وہ موت کے منہ میں چلا گیا۔ میں اور گاؤں کے لوگ خوف کے مارے گاؤں کی طرف لوٹ آئے۔ جب تمام گاؤں والوں کو علم ہوا تو لوگ اعجاز کا انجام دیکھنے کے لیے جانے لگے۔ ہر کوئی توبہ توبہ کرتا اور کانوں کو ہاتھ لگاتا۔

گاؤں اور علاقے کے لوگ اس واقعے کے عینی شاہد ہیں اور یہی کہتے ہیں کہ یہ شہید کی بیوہ کے ساتھ زیادتی کی سزا ہے اور اس حقیقت کا عملی ثبوت بھی ہے کہ شہید کبھی مرا نہیں کرتے، انہیں مردہ مت کہو۔

راولپنڈی سے صرف 42 کلومیٹر دور یہ گاؤں ہے جہاں کے قبرستان میں آج بھی وہ سرنگ نما کھڈا عبرت کا نشان ہے۔ کچھ لوگ اس سے نکلتا دھواں دیکھ کر کہتے ہیں کہ نیچے گندھک کا ذخیرہ ہے۔ آتش فشاں، مگر گاؤں والے جانتے ہیں کہ وہ عذاب کا گڑھا ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قبر گزیدہ

مکرمی مدیر اعلیٰ سرگزشت
السلام علیکم!
میں پُراسراریت نمبر کے لیے ایک انوکھا واقعہ لکھ کر روانہ کر رہا ہوں۔ اگر یہ سب مجھ پر نہ گزرتی تو میں اسے محض گپ سمجھتا مگر یقین کریں کہ اس میں ایک ذرا بھی جھوٹ شامل نہیں۔ ان تمام واقعات کا میں عینی شاہد ہوں۔ یہ اُن دنوں کا ذکر ہے جب میں کراچی میں بے روزگاری کا دکھ جھیل رہا تھا۔

اسلم انصاری
(شیخوپورہ)

یہ اس زمانے کا واقعہ ہے جب میں بے روزگاری کی وجہ سے بہت پریشان تھا۔

پتا نہیں کہ میری یہ کہانی سرگزشت کے مروجہ اصولوں کے مطابق ہے بھی یا نہیں لیکن چونکہ یہ ایک پُراسرار اور حیرت انگیز کہانی ہے۔ اسی لیے اتنے برسوں کے بعد میں اسے بیان کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

زندگی میں طرح طرح کے واقعات پیش آتے ہیں۔ ان میں کچھ سماجی ہوتے ہیں تو کچھ سیاسی۔ کبھی کبھی عام نوعیت سے ہٹ کر کچھ اور بھی سامنے آجاتا ہے جیسے میرے ساتھ ہوا۔

میں بے روزگاری سے پریشان تھا۔ اس دن بھی کسی صاحب نے ملازمت کی امید دلوائی تھی لیکن ان کے پاس جانے کے باوجود بھی کام نہیں بنا تھا۔ بہت مایوس ہو کر میں پارک میں بیٹھ گیا۔

کچھ دیر ہی ہوئی تھی کہ کوئی اور بھی میرے پاس آکر بیٹھ گیا۔ وہ ایک ادھیڑ عمر انسان تھا۔ جس کے چہرے پر اُلجھی ہوئی ڈاڑھی تھی۔ اس نے کرتا شلوار پہن رکھا تھا۔ اس کے جسم سے کچھ عجیب سی بو اُٹھ رہی تھی۔

''کچھ پریشان معلوم ہوتے ہو نوجوان؟'' اس نے نرم لہجے میں مجھے مخاطب کیا۔ اس کا لہجہ بہت نرم اور ہمدردانہ تھا۔ اس کے بیٹھنے سے مجھے جو کوفت محسوس ہوئی تھی وہ اچانک ختم ہوگئی۔ اس شہر میں کوئی تو تھا جس نے میری پریشانی بھانپ کر مجھ سے بات کی تھی۔ ''جی جناب، بہت پریشان ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''غم روزگار نے نڈھال کر دیا ہے۔''

''اوہ۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''ہمارے ملک میں یہ مسئلہ روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔''

''جی میں تو کوشش کر کے تھک چکا ہوں۔''

''تمہیں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تمہیں نوکری دلوا سکتا ہوں۔''

''آپ.....؟'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں میں جس فرم میں کام کرتا ہوں۔ اس فرم میں تمہیں نوکری مل سکتی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''کچھ شرائط کے ساتھ۔''

''میں تیار ہوں جناب آپ شرائط کو چھوڑیں۔''

''رات دس بجے ..... کیونکہ ہمارے یہاں رات کی شفٹ میں کام ہوتا ہے۔'' اس نے بتایا۔ یہ کوئی ایسی حیرت کی بات نہیں تھی۔ بے شمار ایسے محکمے ہیں جہاں راتوں کو کام ہوتا ہے۔

''میں آجاؤں گا جناب۔'' میں نے کہا۔

وہ میرے پاس سے اُٹھ کر چلا گیا۔ اتنے دنوں کی جدوجہد کے بعد کسی نے نوکری کی خوشخبری سنائی تھی اور وہ بھی ایک اجنبی ہمدرد نے۔ جس بے چارے کو میں جانتا ہی نہیں تھا۔

بہرحال میں ٹھیک دس بجے وہاں پہنچ گیا۔ وہ کسی مہربان فرشتے کی طرح پہلے سے وہاں موجود تھا۔ ''بالکل ٹھیک وقت پر آئے ہو۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''روزگار کی مار ایسی ہی ہوتی ہے۔''

''آؤ چلیں۔ ہمیں ویسٹ وہارف کی طرف جانا ہے۔'' اس نے بتایا۔

ویسٹ وہارف شہر کا ایک دور دراز علاقہ ہے۔ ساحل کے ساتھ۔ یہاں عام طور پر بڑی بڑی شپنگ ایجنسیز کے دفاتر ہیں۔ بحری جہازوں سے اُترنے والے سامان کے

گودام بھی موجود ہیں۔ سمجھ میں آنے لگا تھا کہ یہاں رات ہی کو کام کیوں ہوتا ہے۔ اس قسم کے دفاتر میں رات بھر چہل پہل رہتی ہے۔

اس نے ایک پُرانی سی وین کی طرف اشارہ کیا۔ یہ وین پارک سے باہر کھڑی ہوئی تھی۔ وہ شاید اسی وین میں آیا تھا۔ میرا اندازہ صحیح نکلا۔ اس نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی اور یہ بہت اچھا تھا۔ ورنہ اس وقت ویسٹ وہارف کی طرف جانا ایک مسئلہ ہو جاتا۔

''میرے جاب کی نوعیت کیا ہوگی جناب؟'' میں نے اس سے دریافت کیا۔

ہم کچھ دیر بعد ویسٹ وہارف کے علاقے میں پہنچ گئے۔ ہر طرف پُرانے طرز کی عمارات بنی ہوئی تھیں۔ سڑی ہوئی مچھلیوں اور سمندر کی طرف سے آتی ہوئی بو کا تاثر کچھ عجیب سا تھا۔ وہ وین کئی ذیلی سڑکوں سے ہوتی ہوئی بالآخر ایک پُرانی طرز کی عمارت کے پاس آکر رک گئی۔

ہم دونوں وین سے اترے۔ آس پاس کا علاقہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس لیے میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں اس وقت کہاں کھڑا ہوں۔

''آؤ میرے ساتھ۔'' اس آدمی نے کہا۔

ہم لکڑی کی پُرانی چرچراتی ہوئی سیڑھیوں سے ہوتے ہوئے اوپری منزل پر آگئے۔ سامنے بڑا سا لکڑی کا دروازہ تھا اس نے وہ دروازہ کھولا اور مجھے آنے کا اشارہ کیا۔

وہ ایک بڑا سا ہال تھا۔ اس ہال میں میز اور کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ جن پر لوگ بیٹھے کام کر رہے تھے۔ لیکن وہاں ایک عجیب سی خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔ وہاں دو ایسی باتیں تھیں جو مجھے کچھ مختلف محسوس ہوئیں۔ پہلی بات تو یہ کہ وہاں روشنی کا زیادہ انتظام نہیں تھا۔ اتنے بڑے ہال میں بس دو چار بلب ہی جل رہے تھے اسی لیے لوگوں کے خدوخال بہت دیر میں جا کر واضح ہوئے تھے اور دوسری بات وہاں کی خاموشی تھی۔ ورنہ ایسے دفاتر میں عام طور پر ایک شور سا مچا رہتا ہے۔ اس سے یہ اندازہ ہوا کہ یہ لوگ اپنے کام سے کام رکھنے والے لوگ ہیں۔

وہ شخص مجھے اس ہال کے ایک گوشے میں لے آیا جہاں ایک بڑی سی میز کے عقب میں... کرسی پر ایک موٹا سا آدمی بیٹھا تھا۔

''سر، اس نوجوان کو جاب کی تلاش ہے۔'' اس نے اس موٹے کو بتایا۔ ''اسی لیے میں اسے اپنے ساتھ لے آیا ہوں۔''

موٹے نے ایک ہنکارا لے کر بولنا شروع کیا۔ ''آدمی محنتی معلوم ہوتا ہے۔''

''جناب میں ہر قسم کے کام کر سکتا ہوں۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''گریجویٹ ہوں آپ جو بھی کام دیں گے آپ کو شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔''

''نام کیا ہے تمہارا؟'' موٹے نے پوچھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بے شمار دنیاؤں میں سے صرف تین سے بحث کرنا کافی ہے یعنی کرۂ ارض یا خاکی دنیا، جذباتی دنیا اور ذہنی دنیا! ان میں سے ہر دنیا ایسی ہستیوں سے آباد ہے جو اپنے اپنے ماحول میں بسنے کے لیے موزوں ہیں۔ اس کرۂ ارض پر بنی نوع انسان، حیوانات، نباتات، معدنیات وغیرہ ہیں اور ان میں سے ہر نوع ایک نوعی شعور رکھتی ہے۔ معدنیات میں پست درجے کا شعور ہے۔ اس کے بعد نباتات کا درجہ ہے پھر حیوانات کا پھر انسان کا۔ انسان میں شعور کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ شعور کا قانون یہ ہے کہ وہ پستی سے بلندی کی طرف حرکت کرتا رہتا ہے۔ چنانچہ معدنیات، نباتات اور حیوانات انسان کی طرف ارتقا کرتے رہتے ہیں۔ انسان قبل اس کے کہ فوق الانسان بنے اپنی حیات میں ارتقا کی نہ جانے کتنی منزلیں طے کر سکتا ہے اور طے کر لیتا ہے۔ اس وقت انسان کو نہ صرف اپنے خیالات و جذبات بلکہ تمام کرۂ ارض اور کرۂ ارض سے نکل کر جذباتی دنیا اور دوسری دنیاؤں پر بھی قابو حاصل ہو جاتا ہے۔ عام طور پر انسان کو صرف اپنی جسمانی دنیا اور ذہنی دنیا اور اس کے گرد و پیش کا ادراک ہوتا ہے۔ اس لیے کہ انسان کی جسمانی ہستی پوری ترقی کر چکی ہوتی ہے۔ ہم کو جذباتی دنیا اور ذہنی دنیا اور دوسری دنیاؤں کا کہاں تک علم ہے، یہ موقوف ہے اس پر کہ ہم نے اپنی دوسری ہستیوں کو کہاں تک ترقی دی ہے۔ اور اس ترقی کا انحصار ہماری قوت ارادی پر ہے۔ جتنا ہمارا ارادہ قوی اور پختہ ہوگا، اتنا ہی زیادہ ہمیں اپنے مختلف وجودوں (جذباتی وجود، ذہنی وجود اور روحانی وجود) پر تصرف حاصل ہوگا۔ اور جتنا ہمیں اپنے مختلف وجودوں پر اختیار ہوگا، اتنا ہی زیادہ ہم کو دوسری دنیاؤں (برزخ کے مختلف طبقات) میں مداخلت کا اختیار ہوگا۔ ریاضت نفس کرنے والوں کو یہ اختیار حاصل ہوتا ہے اس لیے کہ انہیں اپنے جذبات پر مکمل قابو حاصل ہوتا ہے۔ اس انسان کی قوت ارادی اس ارادۂ کل کا کرشمہ ہے۔ جو کل کائنات میں جاری و ساری ہے۔ اس قوت ارادی کے بل پر انسان نہ صرف اپنی زندگی کی مختلف نہوں کی تہذیب و ترتیب کرتا ہے بلکہ اپنے گرد و پیش کی دنیاؤں اور وہاں کی ذی شعور ہستیوں پر بھی اثر انداز ہو سکتا ہے۔ ہندو فلسفے میں

"کمال احمد۔" میں نے بتایا۔

"دیکھو کمال، اس دفتر میں کام کی نوعیت ذرا مختلف ہے۔" اس نے کہا۔

"میں نے عرض کیا نا جناب کہ میں ہر قسم کا کام کر سکتا ہوں۔"

"تمہیں قبرستانوں میں جا کر قبروں کے کتبے لکھنے ہیں۔" اس نے بتایا۔

"کیا.....!" میں گھوم کر رہ گیا۔ "قبروں کے کتبے.....؟"

"ہاں یہ ایک طرح کا سروے ہے۔" اس نے بتایا۔ "مرنے والے کا نام، تاریخ پیدائش، تاریخ وفات، اشعار غرضیکہ کتبے پر جو کچھ لکھا ہوتا ہے۔ وہ قبر سے رجسٹر میں اُتارتے جانا ہے۔"

"لیکن اس سے..... اس سے فائدہ کیا ہوگا جناب؟"

"یہ سوچنا ہمارا کام ہے۔" وہ خشک لہجے میں بولا۔ "تم بتاؤ تم یہ کام کر سکتے ہو یا نہیں؟"

"یہ سب لوگ اسی قسم کا کام کر رہے ہیں۔" مجھے ساتھ لانے والے نے چاروں طرف اشارہ کر کے بتایا۔ "یہ سب اندراج میں ہی لگے ہوئے ہیں۔"

"اس کے لیے تو مجھے قبرستانوں میں جانا ہوگا۔"

"ہاں تم یہ کام دن کے وقت کرو گے اور روزرات کو دس بجے کے بعد مجھے آ کر رپورٹ دو گے اور تمہیں اس کے لیے دس ہزار مہینہ ملے گا۔" موٹے نے کہا۔

"لیکن یہ کام تو ایک، دو مہینے کے اندر ہی ختم ہو جائے گا۔"

"کیسے ختم ہوگا روزانہ اس شہر میں سیکڑوں لوگ مرتے ہیں اور سیکڑوں کتبے تیار ہوتے ہیں۔ یہ تو نہ ختم ہونے والا کام ہے اور میرا خیال ہے کہ دس ہزار کی تنخواہ بالکل مناسب ہے۔"

میں تو چار پانچ ہزار کی تنخواہ کے لیے مارا مارا پھر رہا تھا اور وہ بھی نہیں مل رہی تھی اور اب اچانک دس ہزار مل رہے تھے اور کام بھی کوئی خاص نہیں تھا۔

"بتاؤ کیا تم اس جاب کے لیے تیار ہو؟"

"بالکل جناب۔" میں جلدی سے بولا۔ "میں اس کام کے لیے تیار ہوں۔"

"اب تم اپنا پورا پتا ہمیں لکھواؤ اس کے بعد ایڈوانس کے طور پر پانچ ہزار روپے لے جانا۔" موٹے نے کہا۔

اس وقت وہ موٹا مجھے دنیا کا سب سے نیک اور ہمدرد انسان معلوم ہو رہا تھا۔ بیٹھے بٹھائے اس طرح سے نوکری مل گئی تھی کہ اپنے آپ پر یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ اتنی اچانک اور وہ بھی پُرکشش تنخواہ کے ساتھ۔

میرے کوائف نوٹ کیے گئے۔ ایک موٹا رجسٹر میرے حوالے کیا گیا۔ اس کے ساتھ پانچ ہزار روپے بھی

انسان کو ترلوکی کہا گیا ہے۔ ترلوکی کے معنی ہیں تین دنیاؤں میں کام کرنے والا۔ یعنی انسان (ہندو نظریے کے مطابق) تین دنیاؤں کا باشندہ ہے۔ جسم کی دنیا، ذہن کی دنیا اور روح کی دنیا! انسان کے شعور کا بیشتر حصہ عموماً جسم کی دنیا میں صرف ہو جاتا ہے۔ جب وہ بے خبر سو جاتا ہے تو اس کا شعور جسمانی دنیا کی حدود سے بلند تر ہو کر توفیق و استعداد کے مطابق برزخ کی جذباتی دنیا یا ذہنی دنیا میں پہنچ جاتا ہے اور وہاں پوری قوت سے کام کرنے لگتا ہے۔ اس بیان سے یہ نتیجہ نہ نکالا جائے کہ انسانی ہستی کی صرف تین تہیں ہیں، نہیں انگنت تہیں ہیں جو ہنوز مکمل نہیں ہوئیں۔ عموماً انسانی ہستی کی صرف مذکورہ بالا تین تہیں مکمل ہوتی ہیں جن کے ذریعے وہ عموماً تین دنیاؤں کی سیر کر سکتا ہے۔ مگر اس کے معنی یہ نہیں کہ یہ تینوں ہستیاں ایک دوسرے کے اندر موجود ہیں اور ساتھ کام کرتی ہیں البتہ ان میں سے ایک ہستی دوسرے پر غالب رہتی ہے۔ بعض لوگوں کی جذباتی اور ذہنی ہستی دوسرے پر غالب رہتی ہے۔ بعض لوگوں کی جذباتی اور ذہنی ہستی اس قدر کمزور اور خام ہوتی ہے کہ وہ اپنی جسمانی ہستی سے آزاد ہو جانے کے بعد بھی اپنے جسمانی وجود کے ماحول میں پھنس کر رہ جاتے ہیں لیکن بعض تربیت یافتہ افراد میں ان کے ذہنی اور جذباتی وجود اس قدر مکمل اور پختہ ہوتے ہیں کہ وہ جسمانی زندگی ہی میں نہ صرف دوسری دنیاؤں کی سیر کر سکتے ہیں بلکہ ان دنیاؤں میں رہنے والی مخلوق کے ارتعاشات بھی قبول کرتے اور اپنے وجود کے ارتعاش (لہروں) سے ان کو جواب بھی دیتے ہیں یعنی ان کا نادیدہ مخلوق سے مکمل رابطہ قائم ہوتا ہے۔ خواب کی حالت میں عام طور پر یہ روابط بڑھ جاتے ہیں۔ ہم خواب میں نہ صرف ان ہستیوں سے ملتے جلتے ہیں بلکہ ان سے پیغامات بھی وصول کرتے ہیں۔ خواب میں نہ صرف عالم برزخ کے باسیوں سے ملاقات ہوتی ہے بلکہ اس دنیائے آب و خاک کے ان باشندوں سے بھی ملنا ہو جاتا ہے، ہماری طرح جن کا شعور عالم خواب میں کارفرما ہوتا ہے۔

اقتباس: تین دنیا از اظہار الحسن۔ مرسلہ: اسد علی خان، لاہور

دے دیے گئے نہ جانے کیسے لوگ تھے۔ جنہوں نے فوراً ہی بھروسا کر لیا تھا۔

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا جو مجھے وہاں تک لایا تھا۔

"اب میں تمہارے لیے ایک آسانی اور کر دیتا ہوں۔" اس آدمی نے کہا۔ "تم روزانہ رات کو دس بجے اسی پارک میں مجھے مل جایا کرنا۔ میری پاس وین ہوتی ہے میں تمہیں اپنے ساتھ لے آؤں گا اور واپس بھی اسی پارک تک ڈراپ کر دوں گا۔"

"یہ تو بہت بڑی مدد ہوگی جناب کیونکہ رات کے وقت اس طرف کی سواریاں نہیں ملتیں۔"

"اب آؤ میں تمہیں پہنچا دیتا ہوں۔" پھر اسی وین پر واپسی کا سفر شروع ہو گیا۔

"اگر مجھے کبھی دن کے وقت اس طرف آنا ہو تو کیا کروں گا؟" میں نے راستے میں اس شخص سے پوچھا۔ جس نے اپنا نام شمعال بتایا تھا کچھ عجیب سا نام تھا شمعال۔

"نہیں تم دن کے وقت کبھی بھی اس طرف نہیں آنا۔" اس نے سختی سے منع کر دیا۔ "دن کے وقت تمہیں یہاں کوئی نہیں ملے گا کیونکہ دن میں یہاں ایک دوسری کمپنی کا دفتر ہوتا ہے۔ ہم سروے کرنے والے رات دس بجے کے بعد یہاں آتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے جناب۔" شمعال نے مجھے پارک کے گیٹ پر اُتار دیا تھا۔ میں اس کا شکریہ ادا کرتا ہوا اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

تمام رات خوشی کے مارے بے چینی سی ہو رہی تھی۔ بہت ممکن تھا کہ ابھی یہ لوگ مجھے دس ہزار دے رہے ہوں لیکن بعد میں میری تنخواہ میں اضافہ بھی کر سکتے تھے۔

دوسری صبح سے میں نے اپنے کام کا آغاز کر دیا۔ سب سے پہلے میں اپنے علاقے کے قبرستان کی طرف نکل گیا۔

ہم مسلمانوں کے قبرستان عبرت اور ویرانی کے مرقع ہوتے ہیں۔ کوئی ترتیب ہی نہیں ہوتی ہے۔ کوئی انتظام نہیں ہوتا ہے ہر طرف جھاڑ جھنکار، گڑھے ہوتے ہیں۔

جبکہ دوسری قوموں کے قبرستان جا کر دیکھیں۔ جہاں ترتیب اور سلیقے کے ساتھ قبریں بنی ہوتی ہیں اور صفائی اور روشنی کا معقول انتظام ہوتا ہے۔

میں نے قبروں کے کتبے پڑھنے شروع کر دیے۔ قبروں پر لکھے ہوئے کتبے جن پر مختلف انداز کی تحریریں تھیں۔ کسی پر شاعری لکھی ہوئی تھی تو کسی پر کوئی آیت اور کسی پر پورا شجرۂ نسب۔

بوڑھے، جوان ایک دن سے لے کر سو سال تک کی عمر کے لوگوں کی قبریں۔ ان کتبوں کی تحریروں کو رجسٹر میں اُتارتے ہوئے عجیب سی کیفیت ہونے لگی۔

ایک طرح کی اداسی نے گھیر لیا تھا۔ قبرستان میں اِکا دُکا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لوگ تھے لیکن کسی نے مجھ پر دھیان نہیں دیا۔ کسی کو ضرورت ہی نہیں تھی کہ وہ آ کر مجھ سے سوال کرتا کہ میں یہ کیا کر رہا ہوں۔

اس شام تک تقریباً دو سو قبروں کے کتبوں کی تحریریں میں رجسٹر میں لکھ چکا تھا۔ یعنی میرا کام ختم ہو گیا تھا۔ اب مجھے صرف رپورٹ دینی تھی۔

میں نے اپنے گھر والوں کو یہ تو بتا دیا تھا کہ میری جاب لگ گئی ہی لیکن یہ نہیں بتایا تھا کہ میری جاب کی نوعیت کیا ہے۔ نہ جانے وہ کیا سمجھتے کہ میں یہ کیسا کام لے کر بیٹھ گیا ہوں۔

رات دس بجے میں پارک پہنچ گیا۔ شمعال اپنی وین کے ساتھ موجود تھا۔ میں نے وہ رجسٹر اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ ''دو سو نام ہو گئے ہیں۔''

''چلو بہت اچھی پروگریس ہے۔''

ہم پھر ویسٹ وہارف کی اسی بلڈنگ میں آ گئے۔ سب لوگ کل ہی کی طرح بڑی خاموشی کے ساتھ اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ ہر طرف ایک غیر فطری سا سناٹا پھیلا ہوا تھا۔

میں نے اس موٹے کے سامنے جا کر رجسٹر رکھ دیا۔ پھر ایک دوسرے آدمی نے اس رجسٹر کے وہ صفحات پھاڑ کر اپنے پاس رکھ لیے جن پر میں لکھ کر لایا تھا۔

شمعال نے معمول کے مطابق مجھے دوبارہ اسی پارک کے دروازے پر اُتار دیا۔

اس رات نہ جانے کیوں میری طبیعت کچھ خراب سی ہو گئی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے سینے پر کوئی بوجھ ہو لیکن صبح ہوتے ہوتے یہ کیفیت ختم ہو چکی تھی۔

البتہ صبح کے وقت مجھے کچھ کمزوری محسوس ہو رہی تھی۔ جس پر میں نے دھیان نہیں دیا۔ یہ گزشتہ دن کی تھکان کا نتیجہ ہو سکتا تھا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر میں نے پھر قبرستان کی راہ لی۔

میں اس بار بھی محلّے کے قبرستان میں آیا تھا کیونکہ ابھی وہاں کی بے شمار قبریں باقی رہ گئی تھیں۔ میں نے اپنا کام شروع کر دیا۔ وہی اجاڑ قبریں، ان کے کتبات، خوف دلاتی اور زندگی کی بے وفائی کا رونا روتی ہوئی تحریریں۔ اس دن میں نے ڈھائی سو اندراجات لکھے تھے۔

اس رات میں نے پھر شمعال کے ساتھ جا کر اپنا وہ رجسٹر اس موٹے کے حوالے کیا۔ کل کی طرح آج بھی رجسٹر کے صفحات پھاڑ لیے گئے اور میں شمعال کے ساتھ واپس آ گیا۔

اس رات طبیعت میں مزید خرابی پیدا ہو گئی۔ گھٹن اور دباؤ کا احساس پہلے سے کہیں زیادہ شدید ہو گیا تھا۔

خدا جانے ایسا کیوں ہو رہا تھا پہلے تو ایسی کیفیت کبھی نہیں ہوئی تھی۔ صبح کمزوری بھی کچھ زیادہ ہی تھی جو کچھ دیر کے بعد ٹھیک تو ہو گئی لیکن ایک سوالیہ نشان بھی تھا کہ آخر ایسا کیوں ہو رہا ہے۔

اس دن میں ایک اور قبرستان کی طرف نکل گیا۔ یہ بہت بڑا قبرستان تھا۔ میرے اندازے کے مطابق وہاں دس ہزار سے زائد قبریں تھیں لیکن اس کا بھی حال پہلے والے قبرستان سے مختلف نہیں تھا۔ وہی ہو کا عالم اور کوئی پوچھنے والا نہیں۔

میں نے اپنے کام کا آغاز کر دیا اور ابھی دس بارہ ہی قبریں نمٹی ہوں گی کہ ایک صاحب میرے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے۔

وہ ایک نورانی صورت والے بزرگ تھے جن کی آنکھیں براہِ راست مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ ''یہ کیا کر رہے ہو میاں؟'' انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

''بس جناب، زندگی کی گاڑی کو چلانے کی کوشش کر رہا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''یہ تم کیا اندراج کرتے جا رہے ہو؟''

''یہی جاب ہے میری۔''

''اوہ.....'' انہوں نے گہری سانس لی۔ ''کن لوگوں نے یہ کام دیا ہے؟''

''میں ان کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔''

''مجھے تفصیل سے بتاؤ کیونکہ ایسا کوئی کام نہیں ہوتا۔ مجھے لگتا ہے کہ تم کسی مصیبت میں پھنس گئے ہو۔''

اس وقت میرے دل میں بھی کھٹک سی ہونے لگی پھر میں نے پوری تفصیل سے انہیں سب کچھ بتا دیا۔ انہوں نے بہت غور سے میری کہانی سنی۔ میرے خاموش ہو جانے کے بعد انہوں نے دریافت کیا۔ ''اب یہ بتاؤ کہ اس ملازمت کے بعد تمہاری حالت کیسی ہے؟'' پھر مجھے یاد آیا کہ ہر رات میرے لیے عذاب کی طرح ہوتی ہے۔ میں نے وہ بھی بتا دیا۔

''میاں یہ سارا کھیل بہت پُراسرار اور خطرناک ہے۔'' انہوں نے کہا۔ ''تم روز بروز بہت تیزی سے موت کی طرف جا رہے ہو۔ وہ مخلوق تمہیں موت کی طرف کھینچ رہی ہے۔''

''مخلوق.....؟'' میں چونک گیا۔

''ہاں وہ انسان نہیں ہیں۔'' انہوں نے کہا۔ ''تم یہ کام بند کرو اور رات کو اپنی رپورٹ دینے مت جانا۔ میں تم پر کچھ پڑھ کر دم کر دیتا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ آج کی رات تم پر بہت بھاری گزرے لیکن تم پریشان مت ہونا۔ اپنا حوصلہ

بحال رکھنا اور کل صبح مجھ سے اسی قبرستان کے دروازے پر آ کر مل لینا۔ میں تمہارے ساتھ اس دفتر میں جاؤں گا۔''

''لیکن جناب انہوں نے تو کہا تھا کہ دن کے وقت وہاں کوئی دوسری کمپنی کام کرتی ہے۔''

''تم کل چلنا میرے ساتھ اور اس شیطانی رجسٹر کو یہیں کسی گڑھے میں پھینک دو۔''

ان بزرگ کی باتوں نے واقعی مجھے خوفزدہ کر دیا تھا۔ اب سمجھ میں آ رہا تھا کہ واقعی یہ سب کوئی شیطانی چکر ہے ورنہ ایسی کون سی کمپنی ہے جو قبروں کے کتبے تلاش کرتی پھرے۔

انہوں نے کہا تھا کہ وہ رات مجھ پر بہت بھاری گزرے گی اور واقعی وہ رات بہت ہولناک اور بہت بھاری تھی۔ میں اس رات شمعال سے ملنے بھی نہیں گیا۔

وہ رات انتہائی خوف، دباؤ اور گھٹن کے احساس میں گزری۔

ہر لمحے مجھے احساس ہو رہا تھا کہ کوئی میرے سینے پر آ کر سوار ہو گیا ہو۔ کچھ عجیب قسم کی غراہٹ اور دلدوز سی کی آوازیں بھی آتی رہیں۔ ایک بار میں نے شمعال کی آواز بھی سنی۔ وہ مجھے کہہ رہا تھا۔ ''کمال احمد، کمال احمد آ جاؤ۔ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔''

پتا چل گیا کہ میں واقعی کسی زبردست چکر میں پھنس گیا تھا اور وہ بزرگ کسی غیبی فرشتے کی طرح میری مدد کو آ گئے۔ ورنہ خدا جانے میرا کیا حال ہوتا۔

دوسری صبح انتہائی درجے کی نقاہت تھی۔ مجھ سے چلا بھی نہیں جا رہا تھا اور میری ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ بہرحال کسی نہ کسی طرح گرتا پڑتا ہوا میں قبرستان کے گیٹ تک پہنچ گیا۔ جہاں وہ بزرگ پہلے سے میرا انتظار کر رہے تھے۔

''لگتا ہے رات بہت بھیانک گزری ہے؟'' انہوں نے کہا۔

''جی میاں صاحب۔'' میں نے اس رات کی پوری تفصیل بتا دی۔

''کیا تمہیں وہ دفتر یاد ہے؟''

''بہت اچھی طرح۔'' میں نے جواب دیا۔ ''میں کئی بار وہاں جا چکا ہوں۔''

وہ بزرگ اکیلے نہیں تھے۔ ایک اور بزرگ بھی ان کے ساتھ تھے۔ وہ دونوں ایک چھوٹی سی گاڑی میں آئے تھے۔ دوسرے صاحب ہی ڈرائیونگ کر رہے تھے۔

راستے بھر وہ بزرگ وظیفے پڑھتے رہے اور مجھ پر دم بھی کرتے جا رہے تھے بالآخر ہم اس عمارت تک پہنچ گئے۔ اس عمارت کو دن کی روشنی میں دیکھنے کا پہلی دفعہ اتفاق ہو رہا تھا۔ وہ اینٹوں کی بنی ہوئی پُرانی عمارت تھی شاید انگریزوں کے دور کی۔ اس کے نیچے ایک بڑا سا گودام تھا جبکہ اوپری منزل پر جانے کے لیے سیڑھیاں تھیں۔ وہی سیڑھیاں جن کے ذریعے میں اوپر جاتا تھا۔

اس وقت گودام سے ایک ٹرک میں مال لوڈ کیا جا رہا تھا۔ کئی مزدور لگے ہوئے تھے اور ایک منشی صورت انسان اندراج کرتا جا رہا تھا۔ ہم لوگ جب اس کے پاس پہنچے تو اس نے سوالیہ نگاہوں سے ہماری طرف دیکھا۔

''جناب یہ اوپر کس کمپنی کا دفتر ہے؟'' بزرگ نے دریافت کیا۔

''اوپر..... نہیں تو اوپر کوئی دفتر نہیں ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''صرف ایک بڑا سا ہال ہے۔ وہ بھی پتا نہیں کب سے خالی پڑا ہوا ہے۔''

میں تو چکرا کر رہ گیا۔ ''جناب ہو سکتا ہے آپ کو معلوم نہ ہو۔'' میں نے کہا۔

''جائیں آپ لوگ خود جا کر دیکھ لیں۔'' وہ مزدوروں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

ہم اسے وہیں چھوڑ کر لکڑی کی چرچراتی سیڑھیوں کے ذریعے اوپر آ گئے۔ اس ہال کے دروازے اور کھڑکیاں ٹوٹی ہوئی تھیں اور وہ پورا ہال ہمارے سامنے تھا اور واقعی اس ہال میں کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ کوئی میز نہ کرسی..... پورے ہال کے فرش پر گرد جمی ہوئی تھی۔ ہر طرف مکڑیوں کے جالے تھے۔

''خدا کی پناہ میں..... میں تو پاگل ہو جاؤں گا۔'' مجھے چکر سا آنے لگا۔

''ان بزرگوں نے فوراً مجھے سنبھال لیا۔ ''خود کو سنبھالو میاں۔ شکر ادا کرو کہ بروقت مجھ سے ملاقات ہو گئی ورنہ جانتے ہو تمہارا کیا حشر ہوتا۔ تم موت کے منہ میں چلے جاتے اور ایک دن خود کسی بے روزگار نوجوان کو بہکا کر یہاں لے آتے۔ یہ مردوں کا کارخانہ ہے۔ یہ ایسا شیطانی سلسلہ ہے جو شاید ہر رات یہاں ہوتا ہے۔''

ہم واپس آ گئے۔ ان بزرگ نے مجھے کچھ چیزیں بتا دیں جن کے ورد سے میں اب تک محفوظ ہوں اور آج یہ کہانی لکھنے کے قابل ہوں ورنہ خدا جانے میں کہاں کہاں کسی بے روزگار کی تلاش میں بھٹک رہا ہوتا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بمبئی کے شاہ جی

محترمه عذرا رسول صاحبه
السلام علیکم!
امید ہے که بخیریت ہوں گی۔یه واقعه ان دنوں میری نظروں سے گزرا تھا جب میں ایك مشہور فلمی ہفت روزہ سے وابسته تھا۔ پھر میں نے بمبئی کی فلمی صنعت سے وابسته افراد سے رابطه کرکے پتا کیا، سب کا جواب یہی تھا که شاہ جی کی ہستی بہت پراسرار تھی۔ یه مختصر سی کتھا آپ کے قارئین کو یقینا پسند آئے گی کیونکه یه حرف به حرف سچی ہے۔

انور فرہاد
(کراچی)

لوگ انہیں بابا بنڈل شاہ کے نام سے جانتے تھے۔ مگر وہ کوئی ڈبا پیر یا نقلی عامل نہیں تھے۔ ان کی حیثیت بس ایک مجذوب کی سی تھی۔ پہلے وہ جج ہوا کرتے تھے اور انگریزی زبان پر بڑی دسترس رکھتے تھے۔ پھر جانے کب کیا ہوا کہ ان کی کایا پلٹ گئی۔ نہایت روشن ضمیر ہو گئے۔ بمبئی میں ان کی رہائش تھی مگر ان کا دل ناگپور میں لگا رہتا تھا۔ جو بھی ان سے نیاز حاصل کرنے کے لیے آتا اسے کہتے "سنگترے کھاؤ۔"

پہلے لوگ اس حکم یا ہدایت کی وجہ نہیں سمجھتے تھے پھر کچھ لوگوں پر یہ اشارہ کھلا کہ سنگترے کی مناسبت سے اشارہ ناگپور ہے کیونکہ وہاں کے سنگترے ملک بھر میں مشہور ہیں' بہت بڑی مقدار میں ایکسپورٹ بھی کیے جاتے ہیں' اسی ناگپور میں ان کے پیر و مرشد بابا تاج بھی موجود تھے۔ گویا وہ در پردہ یہ کہتے کہ ناگپور جا کر بابا تاج الدینؒ سے ملو۔

بمبئی جو اب ممبئی بن گیا ہے ابتدا ہی سے فلمی مرکز رہا ہے۔ وہاں کے بہت سے فلم والے بھی ان کی کشف و کرامات سے فیض یاب ہوتے تھے دیگر فلمی شخصیات کے علاوہ موسیقارِ اعظم نوشاد بھی ان کی روشن ضمیری کے قائل تھے۔

دہلی کے رہنے والے ایک صاحب کا اپنی بیگم سے جھگڑا ہو گیا۔ وہ بابا بنڈل شاہ کے معتقدین میں سے تھے۔ یوں سمجھیے کہ یہ کیس لے کر گئے۔ اس وقت بابا اپنی تسبیح میں مشغول تھے۔ تسبیح یہ تھی کہ وہ رسی کا بہت بڑا بنڈل بناتے تھے پھر اسے کھولتے اور پھر بناتے تھے شاید اس لیے انہیں لوگ بابا بنڈل شاہ کہتے تھے۔

وہ صاحب جو اپنی بیوی سے جھگڑے کا کیس لے کر گئے تھے' خاموشی سے بابا کے پیچھے جا کر بیٹھ گئے کہ فارغ ہوں گے تو ان سے بات کروں گا۔ مگر انہیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ کچھ دیر بعد بابا نے پیچھے دیکھے بغیر کہا۔ "اس کی ماں طوائف' اس کی نانی طوائف' طلاق دے دے اسے۔"

بابا کی بات سن کر وہ صاحب گھبرا گئے۔ بھاگتے ہوئے نوشاد صاحب کے پاس آئے کہ وہ ان کے واقف کار تھے اور آڑے وقتوں میں انہی سے مشاورت کرتے تھے۔ نوشاد صاحب سے بولے بابا نے یہ بات کہی ہے۔

"تو کیا واقعی ایسی بات ہے؟" موسیقارِ اعظم نے پوچھا۔

"جی ہاں...... مگر طوائف والی اس بات کا کسی کو پتا نہیں۔"

نوشاد صاحب اس وقت تک بابا بنڈل شاہ کے بارے میں کچھ جانتے تھے نہ ان سے ملتے تھے۔ انہوں نے پوچھا "تو پھر اب تم کیا کرو گے؟ اپنے بابا کے کہنے پر بیوی کو طلاق دے دو گے؟"

"نوشاد صاحب! یہ بات میرے لیے بہت مشکل ہے۔ میں اس سے اب بھی محبت کرتا ہوں۔"

نوشاد صاحب اس بارے میں مزید کیا کہتے' خاموش رہے۔ وہ صاحب گومگو کی حالت میں تھوڑی دیر بعد چلے گئے۔ مگر اگلے روز آ کر انہوں نے یہ خبر سنائی۔

"نوشاد صاحب! میری بیوی خود ہی مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔" پھر ذرا رک کر بولا "بابا جی کی بات پر عمل تو ہونا تھا نا۔"

موسیقارِ اعظم پڑھے لکھے اور روشن خیال تھے۔ وہ پیروں فقیروں کے چکر میں کبھی نہیں پڑے مگر اپنے دوست کی زبانی بابا بنڈل شاہ کی کراماتی باتیں سن کر ان کے دل میں شوق پیدا ہوا اور انہوں نے دل ہی دل میں سوچا۔

"کل صبح ان سے ملنے ضرور جاؤں گا۔"

اگلے روز وہ اسٹوڈیو کے اپنے کمرے میں جونہی داخل ہوئے انہوں نے ایک بزرگ کو اپنی کرسی پر براجمان دیکھا۔ بزرگ کے ساتھ ایک صاحب بھی تھے جو دوسری کرسی پر بیٹھے تھے۔ انہوں نے نوشاد صاحب کو دیکھ کر پوچھا "کیا آپ ہی نوشاد ہیں؟"

"جی ہاں۔"

"بابا جی' رات ہی سے کہہ رہے تھے کہ صبح اس میوزک والے کے پاس جانا ہے۔"

"سبحان اللہ! یہ تو واقعی روشن ضمیر ہیں۔ میرے شوق کی اطلاع انہیں بھی ہو گئی۔" نوشاد صاحب نے زیرِ لب کہا اور بڑی عقیدت' بڑے احترام کے ساتھ بابا جی کو سلام کیا۔

بابا جی ہنسنے لگے پھر خود کلامی کے انداز میں بولے "گنی ہے...... گنی ہے......" یہ بات وہ بار بار کہہ رہے تھے۔ مرید نے جو اُن کے ساتھ آیا تھا ان کی بات سن کر کہا۔

"اگر ایسی بات ہے تو انہیں کچھ دے دیجیے۔"

مرید کی بات سن کر بابا جی نے ایک سادہ کاغذ منگوایا۔ اس پر کچھ لکھا اور نوشاد صاحب کو تھما دیا۔

مرید نے کہا "یہ بابا کا لکھا ہوا چیک ہے۔"

سادہ کاغذ پر لکھا تھا "اسے 25 لاکھ روپے دے دیے جائیں۔"

نوشاد اس وقت تک بابا بنڈل شاہ کی کشف و کرامات سے پوری طرح واقف نہیں تھے۔ انہوں نے بابا جی کو چیک واپس کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے دولت نہیں چاہیے' دعا دیجیے کہ میں نیک رہوں۔"

بابا جی نے بڑی توجہ سے نوشاد صاحب کی بات سنی۔ پھر ان کی پیٹھ پر زور سے ہاتھ پھیرا اور اپنے سینے سے لگا لیا۔ پھر اس چیک کی پشت پر ایک دعا لکھ کر دی اور ارشاد فرمایا۔

"اسے عشا کی نماز کے بعد روزانہ پڑھ لیا کرو۔"

نوشاد صاحب یہ دعا باقاعدگی کے ساتھ پڑھتے رہے۔ بابا جی کی طرف سے چیک ملنے کے دو تین دن بعد پروڈیوسرز ان کے گھر آنے لگے اور ان کی طرف سے انہیں نئی نئی آفرز دی جانے لگیں۔ آنے والوں میں وی شانتا رام' من موہن ڈیسائی کے والد نانو بھائی ڈیسائی' جے بی ایچ واڈیا' وی ایم ویاس تھے۔ موسیقارِ اعظم کا ایک اصول تھا۔ وہ ایک وقت میں ایک یا زیادہ سے زیادہ دو فلموں کی موسیقی ترتیب دیا کرتے تھے اس لیے انہوں نے آنے والوں کی پیش کشیں قبول نہیں کیں۔ انہی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دنوں کی بات ہے ایک رات فلمستان کے جالان صاحب نوشاد صاحب کے گھر گئے اور انہیں 25 ہزار ماہانہ پر کام کرنے کی آفر دی۔ بعد میں نوشاد صاحب نے حساب لگایا کہ اگر میں متذکرہ تمام فلمیں سائن کر لیتا تو مجموعی معاوضہ وہی ہوتا جو باباجی نے اپنے چیک پر لکھ کر دیا تھا۔

اس واقعے کے بعد ظاہر ہے کہ موسیقارِ اعظم بھی باباجی بنڈل شاہ کے معتقد ہو گئے اور ان کے بارے میں آہستہ آہستہ انہیں بہت سی باتیں معلوم ہوتی گئیں۔ اکثر پریشان حال لوگ باباجی کے پاس پہنچ جاتے تھے اور باباجی انہیں ان کی مطلوبہ رقم کا چیک لکھ کر دے دیتے تھے۔ باباجی کا چیک ایک سادے کاغذ پر ان کے ہاتھ سے لکھا ہوا ہوتا تھا۔ ''اتنی رقم اسے دے دی جائے۔'' وہ چیک پر رقم لکھ کر دستخط کر دیا کرتے تھے۔ خدا کی قدرت کہ اس شخص کو کہیں نہ کہیں سے اتنی رقم مل جاتی تھی۔

ایک دن نوشاد صاحب باباجی کو اپنے ساتھ لے کر اے ایچ کاردار کے پاس گئے۔ باباجی کو کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ انہیں لے کر کہاں جا رہے ہیں۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب کاردار صاحب اپنی فلم ''دل لگی'' بنا رہے تھے۔ کاردار صاحب اسٹوڈیو میں اس فلم کی ایڈیٹنگ کر رہے تھے۔ دونوں ایڈیٹنگ روم میں داخل ہوئے تو باباجی نے نوشاد صاحب سے پوچھا ''یہاں کیا ہوتا ہے؟''

نوشاد صاحب کی سمجھ میں نہیں آیا کیا جواب دیں۔ بس یہ کہہ دیا ''یہاں فوٹو کھینچے جاتے ہیں۔''

''تو پھر میرا بھی فوٹو کھینچو نا'' باباجی ایک دم بول اٹھے۔

نوشاد صاحب اور کاردار صاحب گھبرا گئے۔ اب اس وقت ان کی تصویر کیسے کھینچی جائے۔ انہوں نے کچھ آئیں بائیں شائیں کرنے کی کوشش کی تو باباجی بچوں کی طرح مچل گئے۔ ''بھئی! ہم تو یہاں سے فوٹو کھنچوا کر ہی جائیں گے۔''

بہرحال اسٹل کیمرا منگوایا گیا اور باباجی کی تصویر کھینچی گئی۔ تصویر کھنچ گئی تو بولے ''ارے بھئی! تصویر مجھے بھی دکھاؤ' کیسی کھینچی ہے تم لوگوں نے؟''

وہ اب سے بہت پہلے کا زمانہ تھا۔ پرنٹ ہاتھ کے ہاتھ نہیں نکلتے تھے۔ انہیں بہت سمجھایا گیا کہ فوٹو بننے میں دیر لگے گی لیکن وہ بھلا کب ماننے والے تھے۔ آخر انہیں ایمرجنسی میں فلم رول ڈولپ کر کے تصویر بنا کر دکھا دی گئی۔

تصویر دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے ''ارے واہ! یہ تو ہو بہو میرے جیسی ہے۔'' پھر ذرا سوچ کر بولے ''کیا انہیں کچھ دینا چاہیے؟''

''انہیں چیک دے دیجئے۔'' ان کے ساتھ جانے والے مرید نے ان سے کہا۔

''ہاں..... چیک ہی مناسب رہے گا تو پھر کاغذ قلم لاؤ نا بھئی!''

انہیں سادہ کاغذ اور قلم تھما دیا گیا۔ باباجی نے اس سادے کاغذ پر لکھا۔

"PAY HIM 25 LAKHS"

اور اس کے نیچے اپنے دستخط کر دیے۔ کاردار صاحب ایسی باتوں اور چیزوں پر اعتقاد نہیں کرتے تھے انہوں نے اسے محض ایک کھیل تماشا سمجھا مگر نوشاد صاحب ان سے بولے۔

''کاردار صاحب! اس چیک کو سنبھال کر رکھیے۔ یہ ضرور کیش ہوگا۔''

کاردار صاحب کی یہ فلم کم لاگت کی تھی۔ اس سے کسی خاص کامیابی کی توقع نہیں تھی لیکن وہ سپرہٹ ہو گئی اور اس نے خوب کما کر دیا۔ اس فلم کے بعد انہوں نے مزید دو فلمیں بنائیں۔ وہ بھی بلاک بسٹر کامیابیوں سے ہمکنار ہوئیں جس کے بعد کاردار صاحب کے پاس اتنے پیسے آ گئے کہ وہ تجوری میں نوٹ پاؤں کی مدد سے ٹھونستے تھے۔ ایک دن نوشاد صاحب سے کہنے لگے۔

''باباجی کا چیک واقعی کیش ہو گیا۔''

باباجی بنڈل شاہ نے اسی طرح کا ایک چیک ایس یو سنی کو بھی لکھ کر دیا تھا جس میں بہت بڑی رقم لکھی تھی۔ چند دنوں کے بعد ایک گجراتی فنانسر سنی صاحب کے پاس آیا اور اپنی فلم بنانے کے لیے انہیں اتنی ہی رقم دی' جتنی باباجی نے اپنے چیک پر لکھی تھی۔

کاردار صاحب نے نوشاد صاحب سے جب باباجی بنڈل شاہ کے چیک کے کیش ہونے کی بات کی تو نوشاد صاحب نے کہا ''اگر آپ ان سے کچھ اور مانگنا چاہتے ہیں تو چلیں ان سے مانگ لیں۔''

کاردار صاحب نے فوراً ہی جواب نہیں دیا ذرا توقف سے بولے ''میں نے رات ایک عجیب خواب دیکھا ہے۔''

''کیسا خواب؟''

''نوشاد صاحب! میں نے خواب میں دیکھا کہ باباجی کا انتقال ہو گیا ہے۔''

باباجی نا گپاڑے میں رہتے تھے۔ نوشاد صاحب کاردار صاحب کو لے کر نا گپاڑے باباجی کے گھر پہنچے کہ باباجی کی خیریت معلوم کریں۔ وہاں جا کر پتا چلا کہ ان کا تو واقعی انتقال ہو گیا ہے اور رخصتی کا وقت بالکل وہی تھا جب کاردار صاحب نے خواب دیکھا تھا۔

دلدل

جناب ایڈیٹر صاحب
سلام مسنون!

پُراسراریت نمبر کے لیے ایک تحریر بھیج رہی ہوں۔ عرصہ قبل مجھے ایک صاحب نے یہ واقعہ سنایا تھا جو میرے ذہن پر نقش ہو گیا۔ اسے میں الفاظ کا پیرہن دے کر آپ کی خدمت میں پیش کرنے کی جسارت کر رہی ہوں۔ امید ہے، یہ سچ بیانی آپ کو بھی پسند آئے گی۔

زیبی نور
(فیصل آباد)

موسم سرما کے شروع ہوتے ہی بارش ہو گئی تو گویا موسم بھی انگڑائی لے کر جوان ہو گیا۔ سردی کی شدت بھی بڑھ گئی، گرم لباس، لحاف، پوشک اور کمبل بھی نکل آئے۔ لوگوں میں چہ میگوئیاں بھی شروع ہو گئیں کہ جب شروع دسمبر میں سرِشام ہی سے بدن کپکپانے لگے ہیں تو بعد میں کیا حال ہو گا؟ یہ فکر درمیانے درجے کے لوگوں کو تھی ورنہ اونچے طبقے کے لوگوں کے لیے سارے سامان آسائش موجود تھے۔ آدھی سردی میں ہی آتش دان اور ہیٹر نکل جاتا تھا، باقی سردی شراب کے نشے میں ڈوب کر اس کا اثر ڈائل کیا جاتا۔

یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی، روز اول سے یہ طبقاتی فرق اسی طرح قائم تھا۔ موسم بدلتے رہتے تھے اور مختلف طبقے کے لوگوں کی عمریں بھی ان کی حیثیت کے مطابق بسر ہوتی رہتی۔ حیات کا کاروبار اسی انداز میں چلتا رہا ہے اور شاید آئندہ بھی چلتا رہے لیکن..... اس وقت جو کہانی رقم کرنے بیٹھا ہوں، اس کا تعلق بھی ایسی ہی سرد رات سے تھا جب سرِشام ہی سے سڑکیں تقریباً ویران ہو گئی تھیں، گاہک نہ ہونے کے سبب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دکانداروں نے بھی بازار بند کر دیے تھے۔

وہ آخری دسمبر کی ایک یخ بستہ رات تھی جب سڑکوں پر ٹریفک برائے نام رہ گیا تھا، نائٹ ڈیوٹی کرنے والے پولیس کے کارندے یا تو فرائض منصبی کو یکسر نظر انداز کر کے ادھر ادھر ہو گئے تھے یا پھر لنڈے کی چسٹروں کے بڑے بڑے کالروں کو گردنوں تک اٹھائے اپنی ڈیوٹی انجام دے رہے تھے۔

اس وقت رات کے سوا دس کا عمل رہا ہوگا جب ایک ٹیکسی گھنٹا گھر کے بڑے چوراہے سے بائیں جانب گھوم کر اس روڈ پر آ گئی جو آبادی سے دور واقع ایک ایسے ساحلی علاقے کی طرف جاتی تھی جو ایک عرصے تک پکنک منانے والوں کے لیے توجہ کا مرکز بنا رہا پھر ادھر کچھ ایسے پراسرار اور حیرت انگیز واقعات رونما ہونے لگے کہ بیشتر لوگوں نے ادھر کا رخ کرنا ہی چھوڑ دیا۔ جتنے منہ اتنی باتیں مشہور ہونے لگیں۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ جب سے ادھر مرگھٹ بنا ہے وہاں ہندو کے جلائے جانے والے مردوں کی بدروحیں آنے جانے والوں کو تنگ کرنے لگتی ہیں۔ کچھ اس پکی آبادی کے لوگوں کو ذمے دار ٹھہراتے تھے جو خانہ بدوشوں نے وقتی طور پر قائم کر رکھی تھیں لیکن سب سے اہم وجہ یہ تھی کہ زیادہ تر لوگوں نے اس علاقے کو ''شیطانی ساحل'' قرار دے دیا تھا۔ اس خیال کے پیش نظر میڈیا والوں نے اپنا کاروبار چمکانے کی خاطر ایسی بے شمار کہانیاں گھڑنی شروع کر دیں جس نے کمزور عقیدہ رکھنے والوں کو خوف زدہ کر دیا۔ کبھی کوئی تیراک اگر اپنی غلطی سے بھی ڈوب گیا تو یہی کہانی بیان کی گئی کہ ساحل کی لہریں بھی ''جیو گھاتی'' (جان لینے والی) بن چکی ہیں غرضیکہ جتنے منہ اتنی زبانیں الٹی سیدھی افواہوں نے بیشتر لوگوں کو ادھر کا رخ کرنے سے روک دیا تھا۔ خانہ بدوشوں نے بھی ادھر سے اپنا تام توبڑہ اٹھالیا۔ حقیقت کیا تھی؟ اس کا علم کسی کو بھی نہ تھا۔

بہر حال، ٹیکسی ڈرائیور نے کچھ دور جانے کے بعد پچھلی نشست پر بیٹھی عورت کو بیومرر میں نظر بھر کر دیکھا۔ اس کی عمر اس کے اندازے کے مطابق اڑتیس اور بیالیس کے درمیان ہوگی لیکن وہ خاصی خوش شکل اور گداز جسم کی مالک ہونے کے سبب تیس سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی۔ اس کے خدوخال بھی خاصے نمایاں نظر آ رہے تھے اس لیے کہ اس سرد رات میں بھی اس نے محض ایک ساڑی اور تنگ بلاؤز پہن رکھا تھا۔ وہ چہرے سے خوف زدہ نظر آنے کی بجائے کسی گہری سوچ میں مستغرق تھی۔ ڈرائیور کچھ دیر اسے پوری توجہ سے دیکھتا رہا پھر اس نے آہستہ آہستہ گاڑی کی رفتار کم کرنا شروع کی تو عورت نے اسے پہلی بار بڑی سنجیدگی سے مخاطب کیا۔

''تم نے گاڑی کی اسپیڈ کم کیوں کر دی؟''

''یہ راستہ ساحلی علاقے کی طرف جاتا ہے خاتون!'' ڈرائیور نے اسے آگاہ کرنے کی کوشش کی۔

''جانتی ہوں۔'' وہ بے پروائی سے بولی ''تم یہ بات مجھے کیوں بتا رہے ہو؟''

''رات کے وقت تو لوگ ادھر جانے کا خیال بھی نہیں کرتے۔ آپ کو شاید اس علاقے کے بارے میں زیادہ معلومات.....''

''تمہارا نام کیا ہے؟'' عورت نے اس کی بات کاٹ کر سوال کیا۔

''عبدالکریم!''

''حیرت ہے! تم مسلمان ہو کر بھی ڈرتے ہو؟''

عبدالکریم نے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا، کچھ تامل سے اسپیڈ دوبارہ بڑھاتے ہوئے بولا ''آپ تنہا عورت ہیں اس لیے آپ کو کسی ممکنہ خطرے سے آگاہ کر رہا تھا۔''

''فکر مت کرو۔'' عورت نے کسمسا کر جواب دیا ''کام اہم نوعیت کا نہ ہوتا تو شاید میں بھی اس وقت ادھر نہ جاتی لیکن.....'' وہ ایک لمحے کے توقف سے بولی ''میرا جانا اس لیے ضروری ہے کہ یہ کسی کی زندگی اور موت کا سوال ہے۔''

''میں سمجھا نہیں۔ زندگی اور موت کا تعلق اس وقت ساحلی علاقے کی طرف جانے سے بھلا کیا ہو سکتا ہے؟''

''تم اپنے کام سے کام رکھو۔'' عورت نے سنجیدگی سے کہا پھر ایک بڑا نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا کر بولی ''میں ٹیکسی کا کرایہ تمہارے میٹر کے حساب سے دوں گی، اسے فی الحال انعام سمجھو۔ واپسی میں اس انعام کی رقم بھی دوگنی ہوگی۔''

''میں حق سے زیادہ کا لالچی نہیں ہوں خاتون! میں نے جو بات آپ کو بتانے کی کوشش کی تھی وہ ایک خاتون سمجھ کر کہی تھی۔ آپ کی ضرورت کیا ہے اب میں یہ جاننے کی کوشش بھی نہیں کروں گا۔''

ٹیکسی پھر رفتار پکڑنے لگی۔ عورت نے سکون کا ایک گہرا سانس لیا لیکن اس کے چہرے پر اب غور و فکر کی علامتیں بھی نمایاں ہونے لگی تھیں۔ اسے خود بھی نہیں معلوم تھا کہ اسے اس وقت ساحل کے کنارے اور خاص طور پر مرگھٹ کے قریب

کیوں بلایا گیا تھا؟ بہر حال کام کی نوعیت کچھ ایسی ہی تھی کہ وہ انکار بھی نہیں کر سکتی تھی۔ کچھ باتیں اور بھی عبدالکریم سے گفتگو کے بعد اس کے ذہن میں چبھنی شروع ہو گئی تھیں۔ سردی کی وجہ سے وہ گھر میں بھی بھاری لباس کے علاوہ شال استعمال کرنے کی عادی تھی جبکہ اس وقت بلانے والے نے اسے صرف ایک ساڑی میں آنے کی ہدایت کی تھی۔

ٹیکسی کا سفر جاری رہا۔ کھڑکی کے شیشے بند ہونے کے باوجود اسے اپنے جسم میں کپکپاہٹ کا احساس ہو رہا تھا جب ٹیکسی روک دی گئی۔ عبدالکریم نے اسے آگاہ کیا۔

''خاتون! آپ نے جس جگہ کا بتایا تھا، وہ آ گیا ہے۔''

''اوہ۔'' عورت نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا پھر آہستہ سے پوچھا ''کیا تم دن کے وقت بھی ادھر آتے رہے ہو؟''

''جی ہاں، کچھ عرصے پہلے برابر آتا رہتا تھا لیکن جب سے.....''

''تمہیں اسی جگہ رک کر میری واپسی کا انتظار کرنا ہوگا۔'' عورت نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا ''میں تمہیں معقول انعام دینے کا وعدہ کرتی ہوں۔''

''مجھے انعام کا لالچ بار بار نہ دیں خاتون!'' عبدالکریم نے سپاٹ لہجہ اختیار کیا ''میں جانتا ہوں کہ اس وقت آپ کو یہاں سے واپسی کے لیے کوئی سواری نہیں ملے گی اس لیے میں آپ کا انتظار کروں گا۔ اتنی رات گئے، واپسی کا پیدل سفر کرنا کسی مرد کے بھی بس کی بات نہیں ہے۔''

عورت خاموشی سے دروازہ کھول کر نیچے اتری تو سردی کی شدت سے اس کے دانت بجنے لگے۔ اس نے بہ مشکل خود پر قابو پاتے ہوئے عبدالکریم سے سوال کیا۔

''کیا تم مجھے بتا سکتے ہو کہ مرگھٹ تک جانے کے لیے مجھے کس طرف جانا ہوگا؟''

''کیا مطلب؟'' عبدالکریم کی نظروں میں گہرا تجسس مچلنے لگا ''آپ کو اس وقت مرگھٹ پر کیا کام پیش آ گیا؟ کہیں آپ ہندو تو نہیں ہیں؟'' اس کی نظریں ایک بار پھر خاتون کے باریک لباس پر پڑیں جو اس وقت سردی کے اعتبار سے قطعی ناکافی تھا۔

''میرا نام راحیلہ ہے۔'' خاتون نے ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔ پھر عبدالکریم کو مسلمان ہونے کا یقین دلانے کی خاطر کلمہ پڑھ کر بولی ''میں نہیں جانتی کہ مجھے مرگھٹ کے آس پاس ملنے کا وقت کیوں دیا گیا ہے لیکن..... کام کی نوعیت ایسی ہے کہ میں انکار بھی نہیں کر سکتی۔''

''کیا آپ مجھے کام کی نوعیت اور بلانے والے کا نام.....''

''نہیں۔ مجھے زبان کھولنے کی اجازت نہیں ہے۔'' راحیلہ خاتون نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔

''آپ کی مرضی..... مگر میں آپ سے پھر یہی کہوں گا کہ اگر یہیں سے لوٹ چلیں تو زیادہ مناسب ہوگا۔''

''مجھے واپسی میں کچھ وقت بھی لگ سکتا ہے۔ وعدہ کرو کہ تم ایک مسلمان ہونے کے ناتے میری واپسی کا انتظار کرو گے؟''

راحیلہ خاتون نے دوبارہ ٹیکسی ڈرائیور کو اپنی مجبوری کا احساس دلایا پھر اس کا جواب سنے بغیر اس سمت قدم بڑھانے لگی جس طرف مرگھٹ کا اشارہ عبدالکریم نے کیا تھا۔

اگر راحیلہ خاتون کی رہنمائی غلط نہیں کی گئی تھی تو اسے کم از کم اس یخ بستہ رات میں دو فرلانگ کا سفر پیدل ہی طے کرنا تھا۔

☆☆☆

زاہدہ خاتون حسب معمول برقع میں ملبوس تھی۔

اس وقت وہ پکی آبادی کی واحد مسجد کے پیش امام حافظ بشیر الدین کے حجرے کے باہر بیٹھی اپنی باری کا انتظار کر رہی تھی۔ حافظ بشیر الدین کا شمار ان لوگوں میں نہیں ہوتا تھا جو ضرورت مندوں کو جھڑکنے کی خاطر جھاڑ پھونک اور تعویذ گنڈا کے خاطر اپنی دکان سجاتے ہیں۔ وہ نہایت بردبار، نیک اور زاہد تھے۔ ضرورت مندوں کا علاج صرف قرآنی آیات کے ذریعے کرتے تھے جس کا کسی سے کوئی معاوضہ نہیں لیتے تھے۔ پچھلے ماہ کی اکیس تاریخ کو ان کی عمر بھی بہتر کا ہندسہ عبور کر چکی تھی، پیشانی پر سیاہ گٹے کا نشان اور چہرے پر مور پنکھ کی طرح سفید داڑھی ان کی مذہب اور عبادت سے لگاوٹ کی نشاندہی کرتی تھی، گاؤں کی اس مسجد میں پیش امام کی حیثیت سے بھی ان کو کم و بیش چودہ سال ہو گئے تھے۔ چھوٹے بڑے سب ہی ان کے عقیدت مند تھے۔

زاہدہ خاتون اپنا نمبر آنے پر حجرے میں داخل ہوئی تو حافظ بشیر الدین سامنے بیٹھے نظر آئے، ان کے سیدھے ہاتھ پر ایک ادھیڑ عمر کا شخص اور بھی موجود تھا۔ زاہدہ خاتون نے بدستور اپنا چہرہ نقاب میں چھپا رکھا تھا، وہ بیٹھ گئی تو حافظ بشیر الدین نے نہایت مہذب انداز میں آنے کا سبب دریافت کیا۔

''محترم! میں ایک شادی شدہ خاتون ہوں اور.....

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک انتہائی اہم وجہ سے آپ کے پاس پہلی بار حاضر ہوئی ہوں۔"

"تمہارے شوہر کا نام کیا ہے...... بی بی!"

"ماجد فاروقی...... وہ آپ کے پاس اکثر آتے رہتے ہیں۔" زاہدہ خاتون نے دبی زبان میں تعارف کرایا۔

"میں ماجد صاحب کو بہ خوبی جانتا ہوں...... کیا اس وقت وہ آپ کے ساتھ نہیں آئے؟"

"جی نہیں۔" زاہدہ خاتون نے مدھم اور معنی خیز انداز میں کہا "میں جس مقصد سے آئی ہوں، اس کا تذکرہ میں نے ابھی تک شوہر سے بھی نہیں کیا اور...... آپ سے بھی درخواست کروں گی کہ اگر آپ......"

"میں سمجھ رہا ہوں بی بی! مگر ایسی کیا بات ہے جو آپ ماجد صاحب کو بھی نہیں بتانا چاہتیں جبکہ میری اطلاع کے مطابق آپ اور ماجد صاحب ایک سال پہلے حج کے مقدس فریضے سے بھی سبکدوش ہو چکے ہیں۔"

"جی ہاں۔" زاہدہ خاتون نے قدرے ہچکچا کر کہا "حج کے دوران بھی کچھ ایسی حیرت انگیز باتیں میرے ساتھ پیش آتی رہی ہیں جس کا تذکرہ میں اس وقت مناسب نہیں سمجھتی۔ وہ باتیں بھی میں نے ماجد کو......"

حافظ بشیر الدین ایک لمحے خاموش رہے پھر سنجیدگی سے دریافت کیا "اس وقت کیسے آنا ہوا؟"

"دراصل میری شادی کو پانچ سال ہو چکے ہیں......" زاہدہ خاتون نے مدھم لہجے میں اصل بات کا آغاز کیا "یہ شادی ہماری پسند کی تھی اس لیے میرے والدین نے اسے پسند نہیں کیا۔ پانچ سال کے عرصے میں وہ مجھ سے ملنے بھی نہیں آئے لیکن ہماری مالی حالت کے پیش نظر ہر مہینے ایک دو بار اچھی خاصی رقم کسی نہ کسی ذریعے بھیجتے رہتے ہیں۔ میرے شوہر کو یہ بات کبھی پسند نہیں تھی۔ انہوں نے دو تین بار کہا بھی کہ میں رقم واپس کر دوں لیکن میں اپنے والدین سے تعلق ختم نہیں کرنا چاہتی تھی اس لیے میرے شوہر نے اعتراض کرنا تو چھوڑ دیا مگر وہ اس رقم کو ہاتھ بھی نہیں لگاتے اور......"

"یہ آپ کا قطعی نجی اور گھریلو معاملہ ہے بی بی! میں اس وقت آپ کے آنے کا مقصد جاننا چاہوں گا۔" حافظ بشیر الدین نے قطع کلام کرتے ہوئے پھر اپنا سوال دہرایا "اس وقت آپ کا کیسے آنا ہوا؟"

زاہدہ خاتون نے ایک نظر پیش امام کے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص پر ڈالی پھر پہلو بدل کر آہستہ سے کہا "ہم نے حج کے دوران خداوند کریم سے گھر میں اضافے کی دعا مانگی تھی جواب پوری ہونے والی ہے۔ میں اسی مقصد سے آئی ہوں کہ آپ مجھے کوئی تعویذ عنایت کر دیں کہ آنے والے ننھے مہمان کو کسی قسم کا کوئی خطرہ لاحق نہ ہو۔"

"کسی خطرے کا احساس آپ کو کیا کسی دائی نے دلایا ہے؟"

"جی نہیں۔"

"پھر......؟ اس کی کوئی نہ کوئی معقول وجہ بھی ضرور ہوگی۔"

"جی ہاں......" زاہدہ خاتون نے توقف سے جواب دیا "دراصل میں ادھر کچھ دنوں سے ایک ایسا خواب دیکھ رہی ہوں جس نے مجھے ذہنی طور پر پریشان کر دیا ہے۔ خدا نہ کرے کہ نصیب دشمناں میرا خواب سچ ثابت ہو۔ مگر ہر بار مجھے یہی نظر آیا ہے کہ آنے والا پیدائش کے چند گھنٹوں کے بعد خون کی الٹیاں کرتا ہوا خدا کو پیارا ہو گیا اس لیے میں......"

"لاحول ولاقوۃ......" حافظ بشیر الدین نے لاحول پڑھتے ہوئے جواب دیا "بی بی، اس قسم کا وہم صرف وہ کرتے ہیں جن کو خداوند بزرگ و برتر پر اعتماد نہیں ہوتا ورنہ...... کل کیا ہونے والا ہے، اس امر کا علم سوائے اس ذات بابرکات کے کسی اور کو نہیں ہوتا...... یوں بھی اس قسم کے واہموں کو دل میں جگہ دینے سے منع کیا گیا ہے۔"

"میں جانتی ہوں محترم! لیکن ایک ماں کی ممتا ضرور بے چین ہو جاتی ہے۔" زاہدہ خاتون نے عاجزی کا اظہار کیا۔ "میں ہاتھ باندھ کر درخواست کروں گی، آپ میری تسلی ہی کی خاطر کچھ نہ کچھ عنایت فرما دیں، یہ بھی آپ کی کرم نوازی ہوگی۔"

زاہدہ خاتون کی درخواست سن کر حافظ بشیر الدین کچھ دیر خاموش رہے پھر انہوں نے حجرے میں موجود اپنے ساتھی کی سمت ایک مخصوص انداز سے دیکھا تو وہ خاموشی سے اٹھ کر حجرے سے باہر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد انہوں نے زاہدہ خاتون کو قریب رکھی ہوئی صندوقچی سے ایک کچا دھاگا نکال کر دیتے ہوئے کہا۔ "بی بی! یہ پڑھا ہوا آزمودہ دھاگا ہے جسے تم مستقل طور پر اپنی کمر کے گرد باندھے رکھنا۔ انشاء اللہ تمہاری فراغت بخیر و عافیت ہوگی، رہا اس کے بعد کا معاملہ تو اس کے بارے میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ موت اور زندگی خداوند کریم کے اختیار میں ہے جس پر بندے یا کسی ڈاکٹر و حکیم کا کوئی زور نہیں چلتا ہوتا وہی ہے جو قسمت میں رقم

کر دیا گیا ہو۔"

"آپ نے جو کچھ دے دیا میں اسی کو اپنی خوش نصیبی سمجھتی ہوں۔ ویسے ایک درخواست دوبارہ کروں گی کہ میرے یہاں آنے کا......"

"ذکر میں ماجد صاحب کے سامنے نہیں کروں گا۔" حافظ بشیر الدین نے قدرے کسمسا کر کہا "اگر ناگوار خاطر نہ ہو تو ایک سوال میں بھی کروں گا۔"

"پوچھیے۔"

"کیا دوران حج کوئی ایسی بات پیش آئی تھی جس کا ذکر آپ نے فی الحال کرنا مناسب نہیں خیال کیا؟"

"ایسا ہی سمجھ لیں۔"

"آپ ادھر جو خواب دیکھ رہی ہیں کیا اس کا تعلق بھی انہی باتوں سے ہے؟"

"ہو بھی سکتا ہے لیکن...... میں پوری طرح فارغ ہونے کے بعد ہی اس کا تذکرہ کروں گی۔" زاہدہ خاتون جواب دیتے ہوئے اٹھیں پھر سلام کر کے حجرے سے باہر آ گئیں۔

☆☆☆

ٹیکسی سے راحیلہ خاتون کا فاصلہ جوں جوں بڑھتا گیا، اس کے اندر کے خوف کا احساس بھی بڑھتا رہا۔ سردی کی شدت کے علاوہ گھپ اندھیرا اور ہوا کی شائیں شائیں کی آوازیں اس کے وجود میں کپکپی پیدا کر رہی تھیں لیکن کوئی جذبہ تھا جو اس کے قدموں کو آگے بڑھتے رہنے پر مجبور کر رہا تھا۔ کام کی نوعیت اس کے لیے اپنی زندگی سے بھی زیادہ اہم تھی۔

تقریباً ایک فرلانگ کا فاصلہ اپنے اندازے کے مطابق طے کر لینے کے بعد وہ ایک لمحے کو رک گئی۔ گھپ اندھیرے اب اس کے لیے مانوس ہوتے جا رہے تھے۔ اس نے نظروں کو گھما کر اطراف کا جائزہ لیا۔ دور تک کسی ذی نفس کا کوئی وجود نظر نہیں آ رہا تھا۔ ٹیکسی کا دھندلا دھندلا ہیولا جو کچھ دیر پہلے اسے ایک موہوم سا سہارا دے رہا تھا، اب وہ بھی اوجھل ہو گیا تھا۔

اس ساحلی علاقے کے بارے میں اس نے بھی بے شمار بھیانک اور پراسرار کہانیاں پڑھ رکھی تھیں۔ آئے دن اخباروں میں اس کی تفصیل شائع ہوتی رہتی تھی۔ ایک خیال یہ تھا کہ جب سے وہاں مرگھٹ قائم ہوا ہے، رات کو مشرکوں کی گندی روحیں وہاں منڈلاتی پھرتی ہیں۔ کچھ لوگوں کا یہ خیال تھا کہ وہاں شرپسند عناصر نے اپنا اڈا بنا رکھا ہے جو لوگوں کو خود سے دور رکھنے کی خاطر بے بنیاد افواہیں پھیلا کر دوسروں میں خوف و ہراس پھیلا رہے تھے۔ متعدد بار وہاں سے لاشیں بھی برآمد ہوئی تھیں جنہیں ضروری تفتیش کے بعد ورثا کے حوالے کر دیا گیا تھا۔

پولیس بار باران افواہوں کی تردید کرتی تھی۔ خود پولیس کے اہلکار بھی رات کو ادھر کا رخ کرتے ہوئے کتراتے تھے اور افسران کو خوش کرنے کی خاطر الٹی سیدھی رپورٹیں تیار کر کے کاغذ کا پیٹ بھر دیتے تھے۔ سچ کیا تھا، اس کے بارے میں کوئی بھی کوئی حتمی رائے قائم نہیں کر سکا۔

وہ پانچ منٹ اپنی جگہ ساکت و جامد کھڑی دل کی دھڑکنوں پر قابو پاتی رہی پھر اس نے دوبارہ قدم آگے بڑھائے۔ آدھا راستہ طے کر لینے کے بعد واپس لوٹ جانا اسے منظور نہیں تھا۔ اب اس نے اپنی رفتار بھی پہلے کے مقابلے میں کچھ اور تیز کر دی تھی، یخ بستہ ہوائیں اس کے ناکافی لباس کے سبب سوئیوں کی مانند اس کے جسم میں چبھ رہی تھیں لیکن کسی کا خیال اسے ایک جذبے کے تحت قدم آگے بڑھانے پر مجبور کر رہا تھا۔

آہستہ آہستہ وہ اپنی رفتار بڑھاتی رہی تا کہ خون کی حدت تیز کر کے سردی کی شدتوں کا مقابلہ کر سکے پھر یکلخت قریب سے کسی کے حلق پھاڑ کر قہقہہ لگانے کی آواز سن کر وہ ٹھٹک گئی۔ دل کی دھڑکنیں تیز تر ہو گئیں، قہقہہ لگانے والا جو کوئی بھی تھا اس سے بیس قدم سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا مگر وہ کون تھا؟ کوئی انسان جو اس کو خوف زدہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا یا شیطانی قوتیں اسے گھیرنے کی خاطر اپنا جال بن رہی تھیں۔

"کک...... کون......" اس نے بہ مشکل اپنے خوف پر قابو پانے کی خاطر بلند آواز میں سوال کیا۔ اس کی نظریں اسی سمت جمی تھیں جدھر سے آوازیں ابھری تھیں لیکن دور دور تک کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔

راحیلہ کی آواز کی گونج کے ساتھ ہی قہقہے تھم گئے تھے لیکن، اس کا وہم نہیں تھا، اس کے کانوں نے جو آہٹ بھی محسوس کر لیتے تھے، اس قہقہے کو واضح طور پر سنی تھی۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد اس نے دوبارہ قدرے اونچی آواز میں ہمت کر کے کہا "اگر تم ہی نے مجھے یہاں آنے کی دعوت دی تھی سامنے آ جاؤ، میں راحیلہ ہوں۔"

"میں نے تمہیں تنہا آنے کو بولا تھا۔" ایک منمناتی ہوئی آواز ابھری۔

"میں تنہا ہی ہوں۔" راحیلہ نے جواب دیا "ٹیکسی میں نے دور چھوڑ دی ہے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''کیا ضرورت تھی اسے روکنے کی؟'' دوسری سمت سے بولنے والا نظر نہیں آ رہا تھا لیکن اس کے بولنے کا انداز بتا رہا تھا کہ یا تو وہ ان پڑھ اور جاہل ہے یا دانستہ آواز بنا کر بولنے کی کوشش کر رہا ہے۔

''اس وقت مجھے یہاں سے واپسی کے لیے کوئی دوسری سواری نہیں مل سکتی تھی۔'' راحیلہ نے سوال کرنے والے کو ایک معقول جواب دیا۔

ایک لمحہ دوسری جانب سے کوئی آواز نہیں ابھری پھر بدستور کھردرے لہجے میں کہا گیا ''ٹھیک ہے۔ناک کی سیدھ میں قدم اٹھاتی رہو، میں خود ہی تمہارے سامنے آ جاؤں گا۔''

راحیلہ کے وجود میں ایک بار پھر خوف کی سرد لہر سرایت کر گئی۔ اس کے ذہن نے کہا نادان، اب بھی وقت ہے، واپس لوٹ جا۔ آگے حالات خطرناک بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن وہ اتنا سفر طے کر لینے کے بعد واپس لوٹ جانے کی خاطر نہیں آئی تھی، اس نے دوبارہ قدم بڑھا دیے، اس کی نظریں پوری طرح کھلی ہوئی تھیں۔ پانچ سات منٹ چلنے کے بعد وہ پھر رک گئی ''تم کہاں ہو؟'' اس نے دل کی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے سوال کیا پھر وہ پوری توجہ سے قرب وجوار کی سن گن لینے لگی۔ سامنے کوئی نہیں تھا، دائیں بائیں بھی کوئی انسانی وجود نظر نہیں آیا پھر اس سے پیشتر کہ وہ پلٹ کر عقب میں دیکھتی اس کا توازن یکدم بگڑ گیا۔ کسی نے پشت سے اس کے گھٹنے کے جوڑ پر اتنی ماہرانہ انداز میں ضرب لگائی تھی کہ وہ سنبھل نہ سکی، لڑکھڑا کر گرنے لگی تو کسی نے اسے پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیا۔ راحیلہ کو یوں لگا جیسے وہ کسی آہنی شکنجے میں جکڑ گئی ہو، وہ جو کوئی بھی تھا اس کے اندر بلا کی قوت تھی۔ اس احساس کے ساتھ ہی بدبو کا ناقابل برداشت جھونکا اس کی ناک سے ٹکرایا۔ راحیلہ کا جی الٹنے لگا۔ اس نے خود کو اس اچانک افتاد سے چھڑانے کی ناکام کوشش کی اور ڈری ہوئی آواز میں کہا۔

''چھوڑ دو مجھے ورنہ میرا دم گھٹ جائے گا۔''

''گھبراؤ مت سندری۔ میرے ہوتے ہوئے تمہیں اور کون مار سکتا ہے۔''

''کون ہو تم......'' اس نے کسمسا کر سوال کیا۔

''تمہارا سیوک...... شمبھو جس نے تمہارا کام پورا کرنے کا وچن دیا ہے۔'' منمنا کر بولنے والے نے راحیلہ کو اپنے شکنجوں سے آزاد کیا تو اس نے پلٹ کر اس پر نظر ڈالی۔

وہ ایک قابل نفرت سیاہ فام انسانی وجود تھا۔ سرتاپا راکھ اور غلاظت میں لتھڑا ہوا۔ شاید کچھ دیر پیشتر وہ مرگھٹ پر جلائے جانے والے مردوں کی بچی کھچی راکھ کے ڈھیر پر لوٹ لگاتا رہا تھا۔ اس کے جسم پر ایک لنگوٹی کے سوا لباس نام کی کوئی اور چیز تھی۔

دو قدم کے فاصلے پر سینہ تانے کھڑا وہ راحیلہ کو ان ہوسناک نظروں سے گھور رہا تھا جو روشن انگاروں کی مانند نظر آ رہی تھیں۔ چند لمحے پیشتر بدبو کا جو بھبکا اس کی ناک سے ٹکرایا تھا وہ بھی یقیناً اسی مکروہ وجود سے پھوٹ رہا تھا۔ راحیلہ نے اسے خوف زدہ نظروں سے گھورتے ہوئے پوچھا۔

''تم نے مجھے یہاں کس لیے بلایا ہے؟ کام سے متعلق جو رقم طے ہوئی تھی وہ میں تمہیں پیشگی دے چکی ہوں۔''

''جلدی کس بات کی ہے؟ اب تم آ گئی ہو تو میرے بلانے کا کارن بھی تمہیں معلوم ہو جائے گا۔'' سیاہ فام کا لب ولہجہ معنی خیز ہی تھا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' اس بار راحیلہ نے قدرے تیز آواز میں مخاطب کیا۔ مقصد صرف یہ ظاہر کرنا تھا کہ وہ اس سے خوف زدہ نہیں ہے۔

''ناراض نہ ہو سندری!'' شمبھو نے اسے چمکارتے ہوئے بڑی لگاوٹ سے کہا ''میں نے تمہیں وچن دیا ہے، وہ اوش پورا ہوگا پرنتو درمیان میں ایک بادھا آ گیا ہے۔''

''کیسی رکاوٹ؟''

''کوئی ہے جو شمبھو کو زبان دے کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے بھی منہ پھیر کر میری مہان شکتی کو للکارا ہے۔ اسے بھی اس کی سزا بھوگنی پڑے گی۔ شمبھو سے پنجہ لڑانے والا ابھی اس دھرتی پر پیدا نہیں ہوا۔ بھوانی کا آشیرواد میرے ساتھ ہے...... جے کالی جے بھوانی۔''

''ہمارے درمیان جو سودا ہوا تھا اس میں کسی رکاوٹ کی بات نہیں ہوئی تھی۔'' راحیلہ نے تیوری پر بل ڈال کر ناگواری کا اظہار کیا ''رکاوٹ دور کرنا تمہارا کام ہے، میرا کام ہر قیمت پر تمہیں کرنا ہے۔''

شمبھو کی گندی نظر پھر راحیلہ کے عریاں بازوؤں پر ڈولنے لگیں۔

''تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ میرا کام پورا کرنے کی خاطر تم نے دس دن کا وعدہ کیا تھا۔'' راحیلہ نے تنک کر کہا ''اب تمہارے پاس صرف چار دن رہ گئے ہیں۔''

''جانتا ہوں میری رانی! تم چنتا مت کرو۔'' شمبھو نے

اپنے ہونٹوں پر زبان لہراتے ہوئے جواب دیا ''اب تم آ گئی ہو تو تمہارا کام بھی سمے پورا ہونے سے پہلے ہی ہو جائے گا۔''

''میں سمجھی نہیں، میرے آنے سے کیا فرق پڑ گیا؟''

''دھیرج سے کام لو سندری۔ اتنی جلدی بھی کیا ہے؟''

''بکواس مت کرو۔'' راحیلہ جھلا گئی ''کیا تمہیں سردی کا احساس نہیں ہو رہا؟''

''من کو مار کر اپنے اندر کی شکتی کو کام میں لانے کا گر سیکھ لو تو پھر کسی بات کی چنتا ویاکل نہیں کرے گی۔'' اس نے ڈھٹائی سے جواب دیا ''منش کو سردی کا نہیں، سردی کو منش کے اشاروں کا بھکاری ہونا چاہیے۔ اس کے لیے بڑی کٹھن تپسیا کی ضرورت ہوتی ہے۔ میری ایک بات مانو گی رانی!''

''تم شاید ہوش میں نہیں ہو۔'' راحیلہ نے بپھرنے کی کوشش کی ''بار بار اپنی گندی زبان سے مجھے سندری یا رانی مت کہو۔''

''ناری جب غصہ کرتی ہے تو اور زیادہ سندر دکھائی دیتی ہے۔'' شمبھو نے بل کھا کر بے حیائی سے کہا ''ایک بات دھیان میں رکھو۔ سفلی کا عمل کرنے والا اگر گند نہ کھائے یا گندگی سے دور رہے تو پھر بھوانی بھی اس سے روٹھ جاتی ہے۔ تم جتنی گندی بھاشا بولوگی، شمبھو کو اتنا ہی زیادہ سواد ملے گا۔'' وہ راحیلہ کو سرتاپا دیکھتے ہوئے بے شرمی سے بولا ''میرا کہا مانو تو یہ لباس بھی اتار کر شریر سے دور رکھ دو پھر سردی بھی دم دبا کر بھاگ جائے گی بھوانی کا ایک روپ، کام روپ بھی ہے اور کام روپ دیوی تب خوش ہوتی جب ''کام واسنا'' تیز ہو۔ اسی لیے کہہ رہا ہوں، واستر اتار دو۔''

راحیلہ کے تن بدن میں جیسے آگ لگ گئی۔ سردی سے زیادہ اس وقت اسے اپنے غصے پر قابو پانا مشکل ہو گیا۔ اس نے پاؤں کی جوتی اتار کر ہاتھ میں لے لی لیکن اس کے بعد وہ بے بس ہو گئی۔ شمبھو نے اسے جھپٹ کر بازوؤں میں جکڑ لیا۔ اس کے بعد وہی ہوا جو وہ چاہتا تھا، راحیلہ کا لباس تار تار ہو کر جسم سے الگ ہو گیا۔ وہ کسی کمزور پرندے کی طرح ایک شکاری عقاب کے چنگل میں پھنسی پھڑپھڑاتی رہی۔ شمبھو اسے کسی آدم خور درندے کی طرح جھنجھوڑتا رہا۔ ہر زاویے سے اس کی عزت کو تار تار کرتا رہا۔ راحیلہ نے مزاحمت کی کوشش اس وقت تک جاری رکھی جب تک وہ ہوش میں رہی پھر...... پھر احساس اس کے ڈوبتے ذہن کی طرح گھپ اندھیروں میں ڈوب کر رہ گیا!

☆☆☆

ایس پی آفس میں اس وقت ساحلی علاقے کے تھانے کا رفیق چودھری بیٹھا تھا۔

''جی رفیق صاحب!'' اس نے ایس ایچ او کو افسرانہ لہجے میں مخاطب کیا ''اب بتایئے کہ اصل واقعہ کیا ہے؟''

''سر...... وہ کل رات پھر ایک خوفناک واردات ہوئی ہے۔'' رفیق چودھری نے کہنا شروع کیا ''ایک لاش ادھیڑ عمر کی خوبصورت عورت کی تھی جس کے جسم پر کوئی لباس نہیں تھا، لباس تار تار ہونے کے سبب یہ اندازہ لگانا بھی مشکل نہیں ہے کہ کسی عادی مجرم نے اس کے ساتھ زور زبردستی کی ہے لیکن اس کے بعد جو سین مجھے نظر آیا وہ زیادہ ہولناک تھا۔''

''میں سن رہا ہوں۔'' ایس پی نے خشک انداز میں کہا تو رفیق چودھری کی زبان پھر فرفر چلنے لگی۔

''بدفعلی کرنے والے نے بدنصیب عورت کے جسم کو کسی درندے کی طرح چیر پھاڑ دیا ہے۔''

چیر پھاڑ کے حوالے پر ایس پی سنبھل کر بیٹھ گیا، ایس ایچ او نے اپنی بات جاری رکھی۔

''مجرم نے بڑی ذلالت کی تھی جناب! اس نے مرحومہ کے جسم کو نہ صرف دانتوں سے بھنبھوڑ بلکہ بعد میں اس غریب کا پیٹ پھاڑ کر اس کی آنتیں بھی کھینچ کر باہر ڈال گیا۔ اطلاع ملتے ہی میں جائے وقوعہ پر پہنچ گیا تھا، مقتولہ کے علاوہ دو ڈھائی فرلانگ دور ایک ٹیکسی بھی موجود تھی جس کا ڈرائیور بھی اسٹیرنگ پر سر ڈالے مردہ حالت میں ملا۔ میں نے آپ کو فوری موبائل پر اطلاع دی تھی سر اور آپ کی ہدایت پر دونوں لاشیں پولیس سرجن کے دفتر لے گیا۔''

''کیا لاشوں کا پوسٹ مارٹم ہو گیا؟'' ایس پی نے تعجب کا اظہار کیا۔

''تحریری رپورٹ تو کل تک مل سکے گی سر لیکن میں چونکہ وہاں کے عملے اور ڈاکٹر سے بنا کر رکھنے کا عادی ہوں اس لیے انہوں نے زبانی کلامی صرف اتنا بتایا ہے کہ مجرم نے مقتول کا دل بھی نکال لیا ہے۔''

''ڈرائیور کس حالت میں ملا تھا؟'' ایس پی نے اپنی سیٹ پر پہلو بدل کر دریافت کیا ''اس کی موت کا کیا سبب بتایا ہے؟''

''ٹیکسی ڈرائیور صاف ستھرا بندہ نظر آتا تھا جناب! اس کے سینے کو چیر کر دل نکالا گیا ہے۔''

''مائی گاڈ!'' ایس پی نے جھلاہٹ کا مظاہرہ کیا ''میری

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سمجھ میں نہیں آتا کہ جب اس ساحلی علاقے کے بارے میں متعدد وارداتوں کی کہانیاں اخبارات میں شائع ہو چکی ہیں تو لوگ رات کے وقت ادھر کا رخ ہی کیوں کرتے ہیں؟ ایک خوبصورت عورت کا ٹیکسی میں بیٹھ کر رات گئے ادھر جانا بھی تعجب خیز بات ہے۔"

کچھ توقف کے بعد وہ بولا "آپ نے ابھی کہا تھا کہ پولیس سرجن آفس کے ڈاکٹر نے بتایا ہے کہ مرنے والی کا دل بھی نکال لیا گیا ہے۔"

"جی صاحب! میں نے غلط نہیں کہا تھا۔" رفیق چودھری نے تصدیق کر دی۔ پھر اس نے کہا ساحلی علاقے پر ہونے والی کچھ وارداتیں انتہائی پراسرار اور ناقابل فہم بھی ہیں۔"

"میں سمجھا نہیں؟"

"میں اس ضمن میں زیادہ معلومات نہیں رکھتا لیکن اتنا ضرور سنا ہے کہ جعلی پیر و فقیر اور گنڈا عمل کرنے والے اکثر ضرورت مندوں سے خون آلود گندے کپڑے، سالخوردہ مردوں کی ہڈیوں اور دل وغیرہ کی فراہمی کی فرمائش بھی کرتے ہیں اس لیے موجودہ کیس میں اس نکتے کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔"

"آپ بالکل صحیح فرما رہے ہیں جناب! میں نے بھی ایسی ہی باتیں سنی ہیں لیکن ہمارے یہاں ان تعویذ گنڈے اور عمل شمل کرنے والوں کے خلاف کوئی قانون نہیں ہے۔"

"مسٹر رفیق!" ایس پی نے ایس ایچ او کی بات کاٹ کر سوال کیا "آپ نے مرنے والوں کے بارے میں اب تک کیا معلومات حاصل کی ہیں؟ ہمیں فوری طور پر اس کا پتا لگانا ہوگا تاکہ مزید تفتیش کی جا سکے۔"

"میں نے اپنے ماتحت کو ٹیکسی ڈرائیور کے کوائف معلوم کرنے کو بھیج دیا ہے سر! اس کا شناختی کارڈ اور لائسنس ٹیکسی میں موجود تھا، البتہ مرنے والی کے پرس سے کوئی ایسی چیز برآمد نہیں ہوئی جو اس کا پتا ظاہر کرتی۔ اخبار میں تصویر چھپے گی تو....."

"نہیں مسٹر رفیق! فی الحال موجودہ حادثے کی اطلاع میڈیا تک نہیں جانی چاہیے۔" ایس پی نے تاکید کی۔

"آپ نے حکم کر دیا ہے تو اب کسی کو بھنک بھی نہیں ملے گی۔ میں ٹیکسی ڈرائیور کے گھر والوں کو بھی زبان بند رکھنے کا بول دوں گا۔"

ایس پی نے دوبارہ ایس ایچ او سے کچھ پوچھنا چاہا لیکن اسی وقت رفیق چودھری کے سامنے رکھے موبائل پر سگنل موصول ہوا۔

"ہیلو..... ہاں..... ہاں، ٹھیک ہے..... اوکے..... ہاں، ایک بات اس کے گھر والوں کو بھی سمجھا دو، مرنے والے کی خبر اخبارات تک نہیں جانی چاہیے..... ہاں..... انہیں سمجھا دو کہ کل تک مقتول کی لاش ان کے گھر پہنچا دی جائے گی۔ نہیں، تم تھانے پہنچو، میں ادھر آتا ہوں۔" رفیق چودھری نے موبائل آف کرنے کے بعد ایس پی کو صورت حال سے آگاہ کیا "سر..... ٹیکسی ڈرائیور شادی شدہ ہونے کے علاوہ پڑھا لکھا بندہ تھا، اس کی گھر والی نے بتایا تھا کہ وہ نمازی اور پرہیزگار بھی تھا۔ دو سال پہلے اس کی شادی ہوئی تھی لیکن ابھی تک بے چارہ صاحب اولاد نہیں ہو سکا تھا۔"

"او۔ کے!" ایس پی نے جانے کی خاطر پر تولتے ہوئے کہا "آپ کو اب کسی طرح مرنے والی کے بارے میں بھی فوری معلومات حاصل کرنی ہوں گی۔"

"رائٹ سر.....!" رفیق چودھری نے بھی موبائل اٹھا کر جیب میں رکھ لیا۔ ایس پی اپنی نشست سے اٹھ رہا تھا جب ڈیوٹی پر مامور سپاہی نے اندر آ کر اسے سیلوٹ کرتے ہوئے کہا۔

"سر! ایک لڑکی آپ سے فوری ملنے کی ضد کر رہی ہے۔"

"کون ہے؟"

"میں نے پوچھا تھا مگر وہ بہت غصے میں نظر آ رہی ہے۔ اس نے کہا کہ وہ بغیر ملاقات کے واپس نہیں جائے گی۔ یہ بھی بتا رہی تھی کہ وہ اپنے علاقے کے تھانہ افسر کی کوئی شکایت لے کر آئی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" ایس پی دوبارہ بیٹھ گیا "بلا لاؤ اسے۔"

سپاہی کے باہر جانے کے بعد جو لڑکی اندر داخل ہوئی وہ عمر کے اعتبار سے چوبیس کے پیٹے میں تھی، خاصی قبول صورت بھی تھی لیکن اس وقت اس کا چہرہ غصے کے سبب سرخ ہو رہا تھا۔ ایس پی کا اشارہ پا کر وہ اس کے سامنے بیٹھ گئی پھر خود پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

"محترم، میرا نام شائلہ ہے، میں پوچھنا چاہتی ہوں کہ کیا آپ کے تھانوں پر عورتوں اور لڑکیوں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا جاتا ہے جیسا میرے ساتھ ہو تا رہا ہے؟"

"اس وقت آپ میرے پاس کس سلسلے میں آئی ہیں؟" ایس پی نے سوال کیا۔

"میں اپنی ماں کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرانے گئی تھی لیکن مجھے اس طرح ٹال دیا گیا جیسے میں کوئی بھکاری ہوں۔ پہلے بھی میرے ساتھ اسی تھانے کے عملے نے انتہائی بے ہودہ اور گھٹیا سلوک روا رکھا تھا۔" لڑکی کا چہرہ پھر تمتمانے لگا۔

کس تھانے کے عملے نے بدسلوکی کی اور یہ بھی بتائیں کہ "آپ کی والدہ کب سے گم ہیں؟"

"وہ کل گھر سے ساڑھے آٹھ اور نو بجے ایک سہیلی کے ہاں جانے کا کہہ کر نکلی تھیں۔ گیارہ بارہ بجے تک واپس آنے کا بول گئی تھیں لیکن میں نے جب مقررہ وقت گزرنے کے بعد ان کی سہیلی کو فون کیا تو اس نے یہی بتایا کہ امی وہاں سرے سے گئی ہی نہیں۔"

"آئی، سی۔" ایس پی نے اسے سمجھانے کی کوشش کی "ہو سکتا ہے کہ وہ کسی اور ملنے والی کے گھر چلی گئی ہوں اور اس کے اصرار پر رات اس کے پاس ٹھہر گئی ہوں۔ آپ آج شام تک اور دیکھ لیں، اس دوران میں تھانے کو ہدایت کر دوں گا کہ گمشدگی کی باقاعدہ رپورٹ درج کرے۔ میری بات سمجھنے کی کوشش کریں، ایک بار رپورٹ کے تحریر میں آ جانے کے بعد پھر کچھ ایسی قانونی دشواریاں بھی پیش آ سکتی ہیں جو آپ کو زیادہ ناگوار ہوں۔"

"میں آپ کی بات سمجھ رہی ہوں لیکن ..... مجھے یقین ہے کہ امی کو کسی نے اغوا کرایا ہوگا۔" لڑکی نے ہونٹ چباتے ہوئے جواب دیا "وہ بغیر مجھے اطلاع دیے کبھی کہیں رک نہیں سکتی تھیں۔"

"آپ کو خاص طور سے اغوا کا شبہ کیوں ہو رہا ہے؟"

"اس لیے کہ کسی وجہ سے مجھے اسی تھانے والوں نے بلاوجہ متعدد بار ہراساں کرنے کی کوشش کی تھی۔" شائلہ نے دانت پیستے ہوئے کہا "میں جس کی بات کر رہی ہوں، وہ خاصا دولت مند اور اثر رسوخ رکھنے والا ہے۔ آپ کے تھانے کے افراد بھی اسی کے اشارے پر بار بار میرے گھر کے چکر لگاتے رہے، مجھے اور امی کو کئی بار تھانے بھی بلا کر نازیبا باتیں کی گئی تھیں۔"

ایس پی نے لڑکی کا بیان غور سے سننے کے بعد سنجیدگی سے دریافت کیا "آپ کا اشارہ کس بڑے آدمی کی طرف ہے؟"

"میں سیٹھ ہاشم کی بات کر رہی ہوں۔" لڑکی نے نہایت نفرت سے اس کے نام کا اظہار کیا۔

ایس پی سیٹھ ہاشم کا نام سن کر سنبھل کر بیٹھ گیا۔ قدرے توقف سے دریافت کیا "سیٹھ ہاشم سے آپ کی کیا دشمنی ہے؟"

"دشمنی میں نے نہیں خود اس نے کی تھی۔" شائلہ بپھر کر بولی "میں اس کی پہلی بیوی تھی جس کی زندگی دو سال تک برباد کرنے کے بعد اس نے مجھے مورد الزام ٹھہرا کر طلاق دے دی، اب دوسری شادی کر کے رنگ رلیاں منا رہا ہے۔"

"طلاق کی کیا وجہ تھی؟"

"اس کی ذمے دار قدرت تھی۔" اس نے ہونٹ چباتے ہوئے دبی زبان میں کہا "میں اس کے لیے وارث نہیں پیدا کر سکی تھی اس لیے مجھ پر بانجھ ہونے کا شبہ ظاہر کر کے اس نے اپنی زندگی سے خارج کر دیا۔ اب کسی اور زندگی سے کھیل رہا ہے۔"

"آئی، سی۔" ایس پی نے اس کے چہرے کا نہایت غور سے مطالعہ کرتے ہوئے پوچھا "طلاق کے بعد کیا آپ کی طرف سے کسی نے سیٹھ ہاشم سے باز پرس تو نہیں کی تھی؟ میرا مطلب دھمکی وغیرہ سے ہے۔"

"اگر کوئی ایسا ہوتا تو شاید طلاق کی نوبت ہی نہ آتی۔" شائلہ کی آواز بھرانے لگی "ہاں، میری امی نے اس کے گھر جا کر اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کی خاطر ضرور کچھ سخت سست کہا تھا۔ ماں ہونے کی حیثیت سے وہ میرے غم کو برداشت نہیں کر سکی تھیں، ایسی صورت میں کہ جب میری شادی کے سات ماہ بعد میرے والد بھی خدا کو پیارے ہو گئے تھے۔" اس نے سانس درست کرتے ہوئے بات جاری رکھی "سیٹھ ہاشم چونکہ دولت مند ہے اس لیے اس نے تھانے والوں کو زبانی نہ جانے کیا کچھ کہہ دیا ہوگا جس کے بعد ہم ماں بیٹی کا سکھ چین بھی برباد ہو گیا۔ بار بار کی ذلت سے تو ایک بار زہر کھا کر مر جانا زیادہ بہتر ہوتا۔"

"میں آپ کا دکھ سمجھ رہا ہوں بی بی لیکن میں ایک بار پھر آپ کو مشورہ دوں گا کہ آج شام تک اور انتظار کر لیں، اس کے بعد دوبارہ بھی آپ براہ راست میرے پاس آ سکتی ہیں۔ میں آپ کی پریشانی کو دور کرنے میں ہر ممکن مدد کا یقین دلاتا ہوں۔"

"شکریہ سر! آپ سے یہی امید لے کر آئی تھی۔" شائلہ جانے کے ارادے سے اٹھنے لگی تو ایس پی نے کچھ سوچ کر پوچھا۔

"آپ کی والدہ کی کوئی تصویر ہوگی آپ کے پاس؟"

"آپ..... تصویر کا کیا کریں گے؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ہمارے اپنے بھی چھان بین کے کچھ ذرائع ہوتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ شام تک ہم ان خاص ذرائع سے آپ کے شبہے کی تصدیق بھی کرلیں۔"

لڑکی نے کچھ سوچ کر اپنا ہینڈ بیگ کھولا پھر کچھ دیر تلاش کر کے ایک تصویر ایس پی کو دے کر چلی گئی۔ ایس پی نے تصویر پر ایک سرسری نظر کر اسے رفیق چودھری کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا "متعلقہ تھانے کے علم میں لائے بغیر آپ کو کسی طرح یہ معلوم کرنا ہے کہ کیا لڑکی کا شبہ درست ہے یا نہیں؟"

"ہوجائے گا سر! آپ فکر ہی نہ کریں میں ابھی....." رفیق چودھری اپنا جملہ مکمل نہ کرسکا، تصویر پر نظر پڑتے ہی وہ بری طرح چونکا تھا۔ جسے ایس پی نے بھی محسوس کرلیا۔

"آپ خاموش کیوں ہوگئے؟" اس نے ایس ایچ او سے دریافت کیا۔

"سر..... اس کی تفتیش تو ہوچکی ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ رات ساحلی علاقے سے جس مقتولہ کی ادھڑی ہوئی لاش ملی ہے، وہ اسی عورت کی تھی۔ میں نے ایک نظر میں پہچان لیا ہے سر.....!"

"اوہ!" ایس پی جواب سن کر کسی گہری سوچ میں مستغرق ہوگیا۔

☆☆☆

ماجد فاروقی اس وقت بے حد خوش تھا۔

گزشتہ رات ہی اس نے زاہدہ کو درد شروع ہونے کے بعد اسپتال میں داخل کرادیا تھا۔ اس وقت صبح کے دس کا عمل تھا جب نرس نے آکر ماجد فاروقی سے کہا۔

"اب ہم پیشنٹ کو لے جارہے ہیں، آپ دعا کریں کہ سب بخیر ہو۔"

اس کی بات سن کر زاہدہ کے چہرے پر طاری کوئی اندرونی کرب اور شدید ہوگیا۔ اس نے ہونٹ چباتے ہوئے شوہر کی جانب دیکھا۔

"حوصلہ رکھو۔" ماجد نے تسلی دی "خدا نے چاہا تو اب ہمارا آنگن سونا نہیں رہے گا۔"

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔" زاہدہ نے اس وقت بھی کچھ اداس لہجے میں جواب دیا پھر نرس کے اشارے پر میل نرس اس کے بیڈ کو کمرے سے باہر لے آیا۔ ماجد ساتھ ساتھ رہا۔ ڈلیوری روم کے قریب پہنچ کر اس نے پھر بیوی کا ہاتھ تھام کر اسے حوصلہ دینے کی کوشش کی۔ وہ اندر چلی گئی تو ماجد فاروقی باہر رکھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گیا۔ اسے امید تھی کہ اگر خدا نے چاہا تو زچگی خیر وعافیت سے ہوگی لیکن نہ جانے کیوں دو تین روز قبل ہی اس نے محسوس کیا تھا کہ زاہدہ کچھ پریشان پریشان تھی۔ اس نے وجہ جاننے کی کوشش کی تو زاہدہ نے روہانسی آواز میں کہا تھا۔

"ماجد..... اگر کسی وجہ سے میں تمہاری خواہش پوری نہ کرسکی تو....."

"ایسی حماقت کی باتیں مت کرو۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ آنے والا ہمارا اولی عہد ہی ہوگا۔"

"میری بھی یہی آرزو ہے لیکن نہ جانے کیوں وقت جیسے جیسے قریب آرہا ہے، میرے دل میں طرح طرح کے وسوسے کروٹ بدلنے لگتے ہیں۔"

"فکر مت کرو۔" ماجد نے اسے چھیڑنے کی خاطر کہا "ایک بار اس تجربے سے گزر جاؤ گی تو پھر تمہیں اس قسم کی پریشانی دوبارہ نہیں لاحق ہوگی۔"

"خدا تمہاری زبان مبارک کرے۔"

وہ کرسی پر بیٹھا خدا سے اولاد نرینہ کی دعائیں مانگ رہا تھا، کبھی اٹھ کر ٹہلنے لگتا۔ دستی گھڑی پر نظر ڈال کر گزرتے وقت کا اندازہ لگاتا پھر دوبارہ کرسی پر بیٹھ کر کسی خوش خبری کے انتظار کی گھڑیاں گننے لگتا۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے وہ اسی ادھیڑ بن میں مبتلا تھا جب وہ نرس مسکراتے ہوئے باہر آئی، ماجد تیزی سے اٹھ کر اس کی سمت بڑھا۔

"کیا خبر ہے؟" اس نے قریب جا کر نرس سے جذباتی انداز میں سوال کیا۔

"ہماری مٹھائی کے پیسے تیار رکھیے، آپ کو خدا نے ایک صحت مند چاند سا بیٹا عطا کیا ہے۔"

"فکر مت کرو! تم نے جو خوش خبری سنائی ہے اس کے عوض میں تمہیں خاطر خواہ انعام بھی دوں گا۔"

"ہم آپ کی مسز کو کمرے میں لا رہے ہیں۔ آپ وہیں چلیں۔"

نرس دوبارہ ڈلیوری روم میں واپس چلی گئی، ماجد فاروقی خوشیوں سے سرشار روم میں واپس آگیا۔ وہ بہت مسرور تھا، خدا نے اس کی مراد پوری کردی تھی۔ پندرہ منٹ بعد زاہدہ کا بیڈ بھی کمرے میں آگیا۔ میل نرس کے جانے کے بعد وہ زاہدہ کے قریب آکر بولا۔ "میں نے کہا تھا ناں کہ خدا میری دعا ضرور سنے گا۔"

"نرس نے کہا ہے کہ وہ بچے کو ایک گھنٹے بعد یہاں

لائے گی۔"

"پھر اس میں فکر مند ہونے کی کیا بات ہے؟ جب وہ اس دنیا میں آگیا ہے تو ایک گھنٹے بعد ہمارے سامنے بھی آجائے گا۔"

"ہاں..... لیکن....."

"کیا بات ہے؟" اس نے بیوی کی بے چینی محسوس کرتے ہوئے سوال کیا "اب تمہیں کس بات کی فکر لاحق ہے؟"

"تم یہیں میرے قریب رہنا۔ جب تک ہمارا بچہ نہ آجائے، مجھے تنہا نہ چھوڑنا۔"

"کم آن زاہدہ! اب خدا کے حضور شکر ادا کرو کہ اس نے حج کے دوران ہماری گڑگڑا کر مانگی جانے والی دعا قبول کرلی ہے۔"

ماجد بیوی کو خوش کرنے کی باتیں کرتا رہا لیکن وہ محسوس کررہا تھا کہ بچے کی پیدائش کے بعد بھی زاہدہ کسی سوچ میں غرق تھی، وہ بار بار دروازے کی سمت نظر ڈالتی، دل ہی دل میں دعا کرتی کہ اس کے ذہن میں جو پریشان خیال گڈمڈ ہورہے ہیں وہ کسی طرح اس کا پیچھا چھوڑ دیں لیکن ہر گزرتا لمحہ اس کی ممتا کو کسی خوف سے اور زیادہ فکر مند کردیتا۔ ماجد کے ذہن میں بیوی کی اس پریشانی سے اب کوفت ہونے لگی تھی، وہ جھلا کر اس سے کچھ کہنا چاہتا تھا جب نرس کمرے میں خالی ہاتھ داخل ہوئی۔

"میرا بیٹا کہاں ہے؟" زاہدہ نے تڑپ کر سوال کیا۔

"وہ بھی آجائے گا۔" نرس نے سنجیدگی سے کہا پھر ماجد فاروقی سے بولی "آپ کو بڑی ڈاکٹر نے کسی کام سے یاد کیا ہے۔" وہ جتنی عجلت میں آئی تھی، اتنی ہی تیزی سے کمرے سے باہر چلی گئی۔

"لیڈی ڈاکٹر نے تمہیں کیوں بلایا ہے؟" زاہدہ نے مضطرب ہوکر شوہر سے سوال کیا۔

"قبل از وقت کیا کہہ سکتا ہوں۔" ماجد نے اٹھتے ہوئے بیوی کو تسلی دی "میں ابھی معلوم کرکے آتا ہوں، تم حوصلہ رکھنا۔"

کمرے سے نکل کر وہ سیدھے لیڈی ڈاکٹر کے پاس گیا جو اسی کی منتظر تھی۔

"مسٹر ماجد، میں آپ سے کچھ ضروری بات دریافت کرنا چاہوں گی۔"

"سب خیریت تو ہے؟" ماجد نے اس کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھتے ہوئے دریافت کیا۔

"اسپتال آنے سے قبل کیا آپ کی مسز نے آپ سے کوئی ایسی بات کہی تھی جو آنے والے مہمان سے متعلق ہو؟" ڈاکٹر نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"میں سمجھا نہیں۔ آپ کیا معلوم کرنا چاہتی ہیں؟"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو کسی بات کا علم قبل از وقت نہیں تھا۔"

"آپ مجھے اب الجھن میں مبتلا کررہی ہیں۔" ماجد نے جھلا کر کہا "آخر بات کیا ہے؟"

"بات کچھ ایسی ہی ہے جس نے خود ہمیں بھی الجھن میں مبتلا کردیا ہے۔" لیڈی ڈاکٹر نے بدستور سنجیدگی سے کہا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی "آپ کی مسز نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ ڈلیوری کے بعد ہم بچے کو گھنٹے سوا گھنٹے تک اپنی خاص نگہداشت میں رکھیں، اس کی جو وجہ بتائی تھی وہ میرے لیے اس وقت مضحکہ خیز تھی لیکن اب ہم بھی سوائے پریشانی کے اور کچھ نہیں کرسکتے۔"

"ڈاکٹر.....!" ماجد تلملا کر اٹھتے ہوئے بولا "آپ کھل کر کہیں کہ مجھے کس لیے طلب کیا ہے؟"

"ریلیکس مسٹر ماجد! میڈیکل ہسٹری میں یہ معاملہ پہلی بار میرے تجربے میں آیا ہے کہ ماں نے اپنے ہونے والے بچے کے بارے میں جس شبہے کا اظہار کیا ہو وہ بعد میں بالکل اسی انداز میں مرا بھی ہو۔"

"کیا مطلب؟" ماجد کے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں۔

"آپ کی مسز نے گزشتہ رات ہی مجھے بلا کر آپ کی غیر موجودگی میں اس عجیب وغریب شبہے کا اظہار کیا تھا کہ اس کا بچہ اس دنیا میں آنکھ کھولنے کے ایک اور سوا گھنٹے کے بعد خون تھوکتے ہوئے فوت ہوجائے گا اور....."

"ڈاکٹر.....!" ماجد فاروقی چیخ اٹھا "وہاٹ نان سنس....."

"آپ میرے ساتھ آئیں۔" ڈاکٹر اٹھ کر ماجد کے ساتھ آنے کا اشارہ کرتی ہوئی سائڈ روم میں لے گئی جہاں ایک بچے کا موبائل کاٹ رکھا تھا، اس نے کاٹ کے اوپر سے چادر اتاری تو ماجد کی نگاہیں بھی حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ کاٹ کے اندر ایک نومولود بے حس وحرکت پڑا تھا، اس کے منہ اور ناک سے اس وقت بھی خون کے قطرے رس رہے تھے، گدے کا اوپری حصہ خون سے تربتر تھا!

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیڈی ڈاکٹر نے کاٹ پر دوبارہ چادر کھینچ دی، ماجد فاروقی کے ساتھ دوبارہ اپنے کمرے میں آ کر بولی۔

''کیا جس خدشے کا اظہار آپ کی مسز نے مجھ سے کیا تھا، اس کا ذکر آپ سے نہیں کیا تھا؟''

''جی...... جی نہیں۔'' ماجد فاروقی نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

''میں نے آپ کو ایک ضروری مشورہ دینے کی خاطر یہاں بلایا تھا۔'' ڈاکٹر نے سمجھاتے ہوئے نہایت ہمدردی سے کہا ''ایک ماں کے لیے اس سے بڑا کوئی صدمہ نہیں ہوتا کہ اس کا پہلا بچہ اس طرح موت سے دوچار ہو جس کا خیال نہ جانے کیوں اس کی ممتا کو تڑپا رہا ہے۔ آپ اس موقعے پر اپنی مسز کا خیال رکھیں ورنہ ان کا ذہنی توازن بھی بگڑ سکتا ہے۔''

''میں سمجھ رہا ہوں ڈاکٹر!'' ماجد نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا ''لیکن ایسے خیالات زاہدہ کے ذہن میں کیوں کر سر ابھار رہے تھے؟''

''ہو سکتا ہے کہ اس کی کوئی بیک گراؤنڈ ہسٹری ہو۔ ان کی فیملی میں کوئی کیس ایسا ہو چکا ہو جس کی وجہ سے وہ پریشان ہوں۔''

''بہرحال۔'' اس نے سرد آہ بھر کر کہا ''ہمیں اس بچے کی موت کا بتانا تو ہوگا۔''

''آپ اپنے کمرے میں چلیں، میں کچھ دیر بعد آ کر انہیں بتاتی ہوں کہ بچہ نارمل ہوا تھا لیکن اس کے بعد کسی وجہ سے اس کی سانس اکھڑ گئی۔ خون کی الٹیوں والی بات کہنا میرے خیال میں مناسب نہ ہوگی اور...... میں آپ سے پھر درخواست کروں گی کہ ایسے حالات میں آپ اپنی مسز کو زیادہ بہتر طور پر سنبھال سکتے ہیں۔''

ماجد فاروقی نے اثبات میں سر ہلایا پھر خاموشی سے اٹھ گیا، زاہدہ کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے اس کے ذہن میں بار بار ایک سوال مچل رہا تھا۔

''جو کچھ ڈلیوری کے بعد رونما ہوا، اس کا علم زاہدہ کو قبل از وقت کس طرح ہو گیا؟''

☆☆☆

شام کا جھٹپٹا پھیلنے لگا تو شمائلہ کی بے چینی بڑھنے لگی۔ اس کی ماں کو لاپتا ہوئے جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا، اس کے اضطراب میں بھی اضافہ ہی ہو رہا تھا۔ اسے نہ جانے کیوں یقین تھا کہ ایس پی اس کی ماں کی تلاش اور بازیابی کے سلسلے میں کچھ نہ کچھ موثر قدم ضرور اٹھائے گا۔ ہر چند کہ پولیس والوں کے لیے اس کے دل میں کوئی نرم گوشہ نہیں تھا لیکن ایس پی کا طرز عمل پہلی ہی ملاقات میں اسے عام ڈگر سے ہٹ کر نظر آیا تھا۔ واپسی میں وہ ایس پی کے دفتر والوں سے اس کا فون نمبر بھی لینا نہیں بھولی تھی۔

شام کو ساڑھے پانچ بجے تو اس کی مایوسی بڑھنے لگی، وہ فون کرنے کے ارادے سے جانے لگی لیکن اسی وقت دروازے کی کال بیل سن کر اس کے قدم دروازے کی طرف اٹھ گئے۔ اس کا قیاس غلط نہیں تھا، وہ وہی ایس پی تھا جس کے بارے میں وہ چند لمحے قبل سوچ رہی تھی۔

''میری ماں کا کوئی پتا چلا؟'' ایس پی کو دیکھتے ہی اس نے بے چینی سے سوال کیا۔

''جی ہاں، میں اسی لیے حاضر ہوا ہوں۔''

''کہاں ہیں وہ؟ سب خیریت تو ہے؟'' شمائلہ کی بے چینی ایس پی کا جواب سن کر اور سوا ہو گئی۔

''کیا ہم آرام سے بیٹھ کر بات نہیں کر سکتے؟''

جواب میں وہ ایس پی کو اندر آنے کا اشارہ کر کے ایک طرف ہو گئی۔ دو منٹ بعد وہ اس کے ساتھ اس مختصر کمرے میں بیٹھی تھی جسے بطور ڈرائنگ روم استعمال کیا جاتا تھا۔

''اب بتائیں پلیز! امی کہاں ہیں؟'' ایس پی کے بیٹھتے ہی شمائلہ نے اپنا سوال پھر دہرایا۔

''آپ کے ساتھ یہاں اور کون کون رہتا ہے؟'' ایس پی نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا ''میں آپ کی امی کے بارے میں تفصیل بتانے سے قبل کچھ باتیں دریافت کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔''

''میرے ساتھ صرف میری چچی رہتی ہیں جو ایک بوتیک چلاتی ہیں۔ ان کی آمدنی خاصی معقول ہے جس سے تمام ضرورتیں پوری ہو جاتی ہیں۔''

''شادی سے قبل آپ کیا کرتی تھیں؟''

''مم...... میں......'' شمائلہ نے ہچکچا کر کہا ''میں ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب کرتی تھی۔''

''آپ کو اس بات کا شبہ کیوں ہے کہ سیٹھ ہاشم نے آپ کی والدہ کو اغوا کرانے کی کوشش کی ہوگی؟''

''کیا آپ اس سے ملے تھے؟''

''جی ہاں۔'' ایس پی نے بڑی خندہ پیشانی سے جواب دیا ''آپ کو سن کر تعجب ہوگا کہ اس نے بھی آپ کی والدہ کے بارے میں سن کر ہمدردی کا اظہار......''

''مجھے ان باتوں سے کوئی سروکار نہیں۔'' شمائلہ نے ایس پی کی بات کاٹ کر پوچھا ''امی اب کہاں ہیں؟ میں فوری طور پر ان سے ملنے کی خاطر بے چین ہوں۔''

''آپ تو مجھے غلط نہ سمجھیں، میں سیٹھ ہاشم کے نمائندے کی حیثیت سے اس وقت یہاں نہیں آیا ہوں۔'' ایس پی نے بڑی اپنائیت سے کہا ''آپ نے دفتر میں مجھ پر جس اعتماد کا اظہار کیا تھا، اسی کے پیش نظر میں اس وقت بذات خود آپ کی سامنے موجود ہوں۔''

''سوری سر!'' شمائلہ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ ایس پی کے لہجے میں کوئی تصنع یا بناوٹ نہیں تھی۔

''آپ نے دفتر میں کہا تھا کہ اگر کوئی مرد آپ کا ساتھ دیتا تو شاید سیٹھ ہاشم کو آپ کو طلاق دینے سے پیشتر اس کے دوررس نتائج پر بھی ضرور سوچنا پڑتا۔''

''میں نے غلط نہیں کہا تھا۔''

''لیکن اب آپ تنہا نہیں ہیں۔ میں آپ کے ساتھ ہوں۔'' ایس پی نے بڑے یقینی انداز میں کہا ''آپ کے دشمنوں کو کیفر کردار تک پہنچانا میرا فرض بھی ہے خواہ وہ سیٹھ ہاشم ہی کیوں نہ ہو۔''

''شکریہ لیکن میری امی کے بارے میں کیا خبر ہے؟'' شمائلہ نے بچوں کی طرح مچل کر سوال کیا۔

''وہ...... وہ اس وقت یہاں سے زیادہ دور نہیں ہیں لیکن آپ کو بڑے حوصلے سے میری بات سننی پڑے گی۔'' ایس پی اپنی نشست سے اٹھ کر شمائلہ کے قریب آ گیا، اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر مدھم لہجے میں بولا ''میں نے تمام تیاریاں مکمل کر لی ہیں۔ صرف آپ کی اجازت کی ضرورت ہے۔''

''آپ......'' شمائلہ تڑپ کر اٹھ کھڑی ہوئی، دل کی یکلخت بڑھ جانے والی دھڑکنوں کو سنبھالتے ہوئے اس نے ایس پی کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھا ''تمام تیاریوں سے آپ کی کیا مراد ہے؟''

''وہ...... اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔'' ایس پی نے دکھ بھرے لہجے میں جواب دیا پھر مختصراً ساحلی علاقے کی تفصیل ضروری قطع و برید کے بعد سنا کر کہا ''حالات و واقعات کی روشنی میں بظاہر ایسا ہی لگتا ہے جیسے وہ کسی درندے یا کسی ایسے درندہ صفت کا شکار ہوئی ہیں جسے کم از کم مسلمان نہیں کہا جا سکتا۔''

ایس پی کے آخری جملے پر شمائلہ چونکی پھر وہ ماں کی موت کی خبر سننے کے بعد پھوٹ پھوٹ پر رونے لگی۔ ایس پی بڑی شفقت بھرے انداز میں اسے حوصلہ دلاتا رہا۔ شمائلہ بڑی دیر تک اسی جذباتی کیفیت کا شکار رہی۔ بعد میں اس نے ایس پی کے مشورے پر صرف ماں کی کفن میں لپٹی لاش کا دیدار کیا اور تجہیز و تکفین کی تمام تر ذمے داری اسے سونپ دی۔

موبائل سے اتر کر وہ واپس گھر میں داخل ہوئی تو اس کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔ اگر بوڑھی ملازمہ نے اسے بروقت نہ سنبھال لیا ہوتا تو شاید وہ بے ہوش ہو کر فرش پر ہی ڈھیر ہو گئی تھی۔

☆☆☆

سیٹھ ہاشم سے شادی کا رشتہ اس نے والدین کی مجبوری سمجھ کر قبول کر لیا تھا ورنہ وہ پاؤں کی جوتی بننا کبھی گوارا نہ کرتی۔ ایک خوف اس کے تن بدن میں زہر بن کر اترنے لگا تھا۔ اس نے یہی سن رکھا تھا کہ سیٹھ ہاشم اپنے مرحوم باپ کی تمام جائداد کا بلاشرکت غیرے مالک بن گیا تھا۔ دولت کی ریل پیل میں کھیلتے ایک جوان مرد نے پہلی بیوی کو طلاق دے دی تھی۔ اب نجمہ کو اس غربت کے باوجود اپنانے کا خواہاں تھا۔ جب شادی کی بات چل رہی تھی تب اس کی ایک رازدار سہیلی نے کہا تھا۔

''یہ دولت مند مرد خوبصورت لڑکیوں کو پاؤں کی جوتی کی طرح بدلتے رہتے ہیں۔ شروع ہی سے محتاط رہنا۔ میں بھی تیرے حق میں خیر کی دعائیں کرتی رہوں گی۔''

اس بات کا کچھ اندازہ نجمہ نے اس وقت بھی لگا لیا تھا جب چم چم کرتی لمبی سی کار میں بیٹھ کر گھر سے رخصت ہوئی تھی اور جب اس کی گاڑی منزل پر پہنچی تو اس کے ذہن میں ایک عالیشان محل نما بنگلے کو کن انکھیوں سے دیکھنے کے بعد ایک ہی خیال ابھرا تھا۔

''کیا مخمل کے قیمتی اور جگمگ کرتے لباس میں ٹاٹ کا پیوند زیب دے گا؟''

اس کی پہلی رات بھی سہیلیوں کی زبانی سنے قصے کہانیوں سے بہت مختلف ثابت ہوئی۔ سیٹھ ہاشم صرف خوبصورت اور گبرو مرد ہی نہیں تھا، وہ بزنس کے نشیب و فراز کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ کسی خوبصورت جوان لڑکی کے رمز و گداز کو بھی برتنے اور ان سے کھیلنے میں بھی مہارت رکھتا تھا۔ شب عروسی کا جشن منانے سے پیشتر اس نے نجمہ کے قریب آ کر بڑی آہستگی سے اس کا گھونگٹ اٹھا کر اس کے چہرے پر [illegible]

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پھر سرسراتے لہجے میں بولا۔

"آج سے تمہارا نام نجمہ نہیں..... نغمہ ہوگا، جانتی ہو نغمہ کسے کہتے ہیں؟"

"جی نہیں....." اس نے شوہر کے بے حد اصرار کے بعد مدھم آواز میں صاف گوئی سے اپنی معصومیت کا اظہار کر دیا۔

"نغمہ ایسے راگ یا گیت کو کہتے ہیں جس کو سن کر انسان مدہوش ہو جاتا ہے۔" وہ اس کے اور قریب آ گیا "تمہارے حسن اور تمہارے نقش و نگار بھی میرے لیے نغمگی کی کیفیت ہے۔"

شوہر کا جواب سن کر وہ اور سمٹنے لگی تو سیٹھ ہاشم نے بے تکلفی سے اس کا ہاتھ تھام کر کہا "تم نہ جانے کب سے دلہن بنی بیٹھی ہو گی، تمہاری سہیلیوں نے تمہیں ٹھیر رکھا ہوگا، رسموں کی ادائیگی میں بھی خاصا وقت صرف ہو جاتا ہے۔ اتنی دیر میں بھی سر جھکائے بیٹھا رہوں تو جسم کے ساتھ ساتھ دماغ بھی تھکن سے دوچار ہو جاتا ہے اور تھکن دور کرنے کا سب موثر علاج یہ ہے کہ انسان شاور کے نیچے نیم گرم پانی سے غسل کر لے، میں تمہیں بھی یہی مشورہ دوں گا۔"

نجمہ شوہر کی بات سن کر گھبرا سی گئی۔ وہ نئی نویلی دلہن تھی، اتنی جلدی بے باکی سے اٹھ کر غسل کے لیے کس طرح جا سکتی تھی؟ جواب دینے کے بجائے وہ اپنے مہکتے وجود میں اور سمٹنے لگی۔

"اب تم میری شریک حیات ہو، اس گھر کی مالکن!" سیٹھ ہاشم نے اس کے قریب ہو کر اسے اپنے آہنی ہاتھوں کے حصار میں لے کر کہا "تمہیں ایک بات اور بتا دوں، رات نو بجے کے بعد کسی بھی ملازم کو بغیر گھنٹی کی آواز سنے ادھر آنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ میں کباب میں ہڈی برداشت کرنے کا عادی نہیں ہوں۔ تم ہر طرف آزادی سے گھوم پھر سکتی ہو۔ میرے سوا کسی اور کی نظریں تمہارے شب خوابی کے لباس پر نہیں پڑیں گی۔"

نجمہ نے بڑی بوڑھیوں اور سہیلیوں کی سمجھائی ہوئی باتوں پر عمل کرنے کی ہر ممکن کوشش کی مگر اس کی زندگی کے ہم سفر نے پیش رفت کی تو وہ زیادہ دیر مزاحمت بھی نہ کر سکی۔ ایک ہی رات میں اس نے کسی مرد کو خوش رکھنے، اس سے روٹھنے اور منانے کے بیشتر گن سیکھ لیے تھے۔ چار مہینے اس طرح گزر گئے جیسے ابھی کل کی بات ہو۔ وہ شوہر کی کمزوریوں کو بھانپ کر خود کو بڑی چابکدستی سے اس کے ذوق و شوق کے سانچوں میں ڈھالتی رہی۔

اس وقت بھی وہ اپنی ڈریسنگ ٹیبل کے قد آدم آئینے کے سامنے کھڑی خود اپنے جسم کو ستائشی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے خوبصورت جسم کے تمام نشیب و فراز اس باریک لباس سے جھلک رہے تھے جس کے نیچے کوئی زیر جامہ سرے سے پاؤں تک نہیں تھا، یہی لباس سیٹھ ہاشم کو پسند تھا۔ خود وہ بھی سونے سے قبل ایک سفید مخملی ڈریسنگ گاؤن پہننے کا عادی تھا۔

آئینے کے سامنے خود اپنے وجود سے سرشار ہوتے وقت نجمہ کے ذہن میں ایک سوال ایسا ابھرا کہ وہ خوف زدہ ہو گئی۔ اس کی اطلاع کے مطابق سیٹھ ہاشم نے اپنی پہلی بیوی کو صرف اس جرم میں بطور سزا طلاق کا پروانہ تھما دیا تھا کہ وہ اس کے لیے کوئی وارث نہیں پیدا کر سکی تھی۔

نجمہ کا ذہن اس خیال میں الجھنے لگا۔ سیٹھ ہاشم اس کے ساتھ بھی جو احتیاط برت رہا تھا اس کے بعد وہ بھی اس کے لیے کسی وارث کو جنم نہیں دے سکتی تھی۔ خاصی دیر غور و خوض کے بعد اس نے یہ فیصلہ کر لیا کہ آج وہ ہر قیمت پر اس مسئلے پر شوہر سے کھل کر بات کرے گی۔ وہ انہی خیالات میں گم تھی جب سیٹھ ہاشم حسب معمول دن بھر کی تھکن اتارنے کی خاطر غسل کرنے کے بعد سفید ڈریسنگ گاؤن زیب تن کیے باہر آیا۔ نجمہ کو آئینے کے سامنے دیکھ کر وہ بھی اس کے عقب میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ نجمہ نے اس موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شوخی سے کہا۔ "آج میں آپ کی کوئی بات نہیں مانوں گی۔"

"کیوں؟"

"آپ کو میری ایک شرط ماننی پڑے گی اس کے بعد ہی....."

میرے کہنے سے آج کی رات آپ سب کچھ خدا کی مرضی پر چھوڑ دیں، میری بات مان لیں۔"

"ٹھیک ہے۔"

اس رات بھی سیٹھ ہاشم بڑی دیر تک نجمہ کے جسم سے مختلف انداز میں سرگوشیاں کرتا رہا پھر کچھ سوچ کر بولا "تم کہیں شامکہ کے انجام سے خوفزدہ کے تو نہیں ہو؟"

"آپ جو چاہے سمجھ لیں لیکن....." نجمہ ایک مرد کے جذبات کو ابھارنے کی خاطر اس کے کشادہ سینے میں سر چھپا کر جواب دیا۔

"وہ خود اپنی حماقتوں کا شکار ہوئی تھی۔ میں نے ایک سال بعد اس سے کہا تھا کہ وہ ان گولیوں کو کھانا ترک کر دے لیکن نہ جانے اسے کیا خوف تھا کہ اس نے میری بات نہیں

مانی پھر ڈاکٹر نے مجھے بتایا کہ وہی گولیاں میرے اور میرے کسی متوقع وارث کے درمیان حائل ہو کر رہ گئی تھیں۔" سیٹھ ہاشم نے بات جاری رکھی "جب وہ اپنی من مانی کرتی رہی تو میں نے بھی ایک مرد کی حیثیت سے وہی کیا جو مجھے کرنا چاہیے تھا اور اب..... اس کی بے وقوف ماں نے مجھے کچھ دنوں پیشتر ایک سنگین دھمکی دی ہے۔"

"وہ کیا؟" نجمہ نے یوں ہی پوچھ لیا۔

"میرا خیال ہے کہ شاید وہ بیٹی کے غم میں اپنا ذہنی توازن کھو چکی ہے لیکن....." سیٹھ ہاشم نے دوبارہ نجمہ کے جسم کو اپنے سینے کی کشادگی میں بھر کر کہا "اس وقت ایسی باتیں نہ کرو کہ جس سے میرا ذہن کسی اور طرف بھٹک جائے۔"

"آپ صرف اتنا بتا دیں کہ اس کی ماں نے کیا دھمکی دی تھی؟" نجمہ نے ضد کی۔

"اس احمق عورت نے کہا تھا کہ میرا انجام بڑا بھیانک ہوگا۔"

"اب آپ کا کیا خیال ہے؟" نجمہ نے دبی زبان میں پوچھا۔

"میں نے کہا ناں کہ وہ اپنا دماغی توازن کھو چکی ہے۔" سیٹھ ہاشم نے نفرت کا اظہار کیا "میں ان باتوں پر غور کرنا بھی حماقت ہی سمجھتا ہوں۔ چھوڑو ان باتوں کو۔"

نجمہ نے بھی خاموشی ہی مناسب سمجھی۔ سیٹھ ہاشم اچانک نجمہ کو تکیہ چھوڑ کر بستر سے نیچے اتر گیا، نجمہ نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو وہ بھی پریشان ہو گئی۔ سیٹھ ہاشم دیوانوں کی طرح اپنے خوبصورت بالوں کو نوچ کھسوٹ رہا تھا۔ چند لمحے اس کیفیت سے دوچار رہنے کے بعد اس نے بدحواسی کے عالم میں کمرے سے باہر جانے کی کوشش کی مگر اس کے بعد..... جو کچھ ہوا اسے دیکھ کر نجمہ کو بھی سانپ سونگھ گیا۔

سیٹھ ہاشم دروازے کی سمت بھاگتے ہوئے یکلخت ہوا میں معلق ہو گیا۔ ایسا ہی لگا تھا جیسے کسی غیر مرئی قوت نے اسے کسی کھلونے کی طرح ہوا میں بلند کر دیا ہو۔ ایک لمحے کے بعد ہی وہ کرب ناک انداز میں چیختا ہوا دبیز قالین پر چاروخانے چت گرا۔ اس کے منہ اور ناک سے گاڑھا گاڑھا خون بہنے لگا۔ وہ منظر اس قدر بھیانک اور ہولناک تھا کہ نجمہ بھی بوکھلا کر رہ گئی۔ اپنے ناکافی لباس کا خیال کیے بغیر وہ ہذیانی انداز میں چیختی، ملازموں کو آواز دیتی ہوئی دروازے کی سمت دوڑنے لگی۔

ایک گھنٹے بعد وہ علاقے کے ایس پی کے سامنے بیٹھی سسک سسک کر شوہر کی موت کی تفصیل بیان کر رہی تھی۔ پوری تفصیل سننے کے بعد ایس پی نے صرف دو ہی جملوں پر اکتفا کیا۔

"حیرت انگیز..... ناقابل یقین۔" پھر وہ بھی کسی گہری سوچ میں غرق ہو گیا۔ "کیوں؟" یہ بات کم از کم نجمہ کے پریشان ذہن میں اس وقت نہیں آ سکی تھی۔

☆☆☆

زاہدہ کے نام کی پرچی دیکھتے ہی حافظ بشیر الدین نے اسے حجرے میں بلوا لیا۔ ماجد فاروقی سے انہیں چار روز قبل ہی نومولود کے موت کی خبر مل چکی تھی۔ جو صورت حال بیان کی گئی، اس نے بھی بشیر الدین کو سوچ میں ڈال دیا۔ کسی معصوم بچے کا اس طرح پیدائش کے ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد مر جانا کوئی حیرت انگیز بات نہیں تھی لیکن چونکہ زاہدہ قبل از وقت اس شبہے کا اظہار کر چکی تھی چنانچہ اب انہیں کیفیت سے دوچار ہو کر بچے کا فوت ہو جانا حیرت انگیز ہی تھا۔ اس کے علاوہ بشیر الدین، زاہدہ سے ان واقعات کے بارے میں معلوم کرنا چاہتے تھے جو اسے حج کے دوران پیش آئے تھے۔ ان کے بے حد اصرار کے باوجود زاہدہ نے یہی کہا تھا کہ وہ اولاد کی پیدائش کے بعد ہی ان باتوں کو زبان سے نکالے گی۔

زاہدہ نے حجرے میں داخل ہو کر حسب معمول اس شخص کو دیکھا جو بشیر الدین کے ساتھ ہی موجود تھا۔ بشیر الدین نے اس کا خاموش اضطراب محسوس کرتے ہی قریب بیٹھے ہوئے شخص کو باہر جانے کا اشارہ کر دیا۔ تخلیہ ہونے کے بعد بھی زاہدہ بڑی دیر تک سر جھکائے بیٹھی رہی۔ بشیر الدین کو اس کی قلبی حالت کا احساس تھا اس لیے انہوں نے جلد بازی سے کام نہیں لیا، کچھ دیر تک خاموشی طاری رہی پھر انہوں نے سنبھل کر محتاط لہجے میں اظہار ہمدردی کیا۔

"مجھے فاروقی صاحب کی زبانی تفصیل معلوم ہو چکی ہے لیکن موت اور زندگی خدا کے اختیار میں ہے۔ مشیت ایزدی کے آگے انسان کا زور نہیں چلتا۔ ہوتا وہی ہے جو اس کو منظور ہو اور قبل از وقت مقدر میں رقم کر دیا گیا ہو۔ یہی قانون قدرت ہے جو اس کی بزرگی اور برتری کو ثابت کرتا ہے۔"

"میں..... آپ کی بات سے انکار نہیں کروں گی لیکن سب کچھ ویسا ہی ہوا جیسے اس منحوس اور بے غیرت نے کہا تھا۔" زاہدہ نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا "میں نے قبل از وقت آپ سے اپنے خدشات کا اظہار بھی کر دیا تھا۔"

"آپ نے ابھی جس کا حوالہ دیا ہے وہ کون ہے؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بشیر الدین نے تجسس سے سوال کیا۔

"میں نے آپ سے پہلی ملاقات میں کہا تھا کہ حج کے دوران بھی کچھ حیرت انگیز باتیں میرے ساتھ پیش آ چکی تھیں، میں پہلے دن کا تذکرہ کرنا زیادہ مناسب سمجھوں گی۔"

بشیر الدین نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموش بیٹھے تفصیل جاننے کے منتظر رہے۔

"طواف کعبہ کے وقت میں ہمیشہ اپنے شوہر کا ہاتھ پکڑے رہتی تھی۔ زیادہ ہجوم ہونے کے سبب معلم اور گروپ لیڈر بھی خواتین کو یہی ہدایت بار بار کرتے ہیں کہ اپنے محرم کا ہاتھ تھامے رہیں ورنہ ہجوم میں گم ہو جانے کا اندیشہ اور اس کا تجربہ بھی پریشان کن ہوتا ہے۔"

"میں اس صورت حال سے بہ خوبی واقف ہوں۔"

"تمام ارکان پورے کرنے کے بعد جب ہمارا قیام دوبارہ مکہ میں تھا تو ہجوم بہت زیادہ نہیں تھا۔ اکثر خواتین بغیر مردوں کا ہاتھ تھامے بھی طواف کرتی نظر آئیں لیکن میں کسی وجہ سے ایسا نہیں کر سکتی تھی۔"

زاہدہ خاتون نے آخری جملہ کچھ ایسے مبہم انداز میں ادا کیا کہ بشیر الدین نے تعجب سے دریافت کیا۔

"اس کی کوئی خاص وجہ تھی یا آپ عادتاً ایسا کرتی تھیں؟"

"سب سے خاص وجہ یہ تھی کہ میں جتنی بار بھی حرم شریف میں داخل ہوئی، جتنی بار بھی طواف کیا..... کبھی ایک بار بھی مجھے کعبہ کا دیدار نصیب نہیں ہوا۔"

"یہ آپ کیا فرما رہی ہیں بی بی!" بشیر الدین نے چونک کر حیرت کا اظہار کیا "ایسا کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔"

"میرے ساتھ ایسا ہوا تھا اور میری بدنصیبی ہی تھی جو حضورؐ کے روضۂ مبارک پر سلام کے لیے بھی ایک عورت کا ہاتھ تھام کر دو مرتبہ گئی لیکن سنہری جالیاں ایک بار بھی مجھے نظر نہیں آئیں۔"

بشیر الدین کے لیے زاہدہ خاتون کا بیان ناقابل فہم ہی تھا۔ وہ چند لمحے پہلو بدلتے رہے پھر آہستہ سے بولے۔

"کیا آپ نے اس کا ذکر فاروقی صاحب سے بھی کیا تھا؟"

"جی نہیں۔"

"بی بی! ایک بات کہوں اگر ناگوار خاطر نہ ہو؟"

"اولاد کا غم دیکھنے اور سہنے کے بعد اب کسی کی کوئی بات مجھے ناگوار نہیں گزرے گی محترم!" زاہدہ خاتون نے مضمحل لہجے میں کہا "جو حیرت انگیز واقعات میرے سامنے رونما ہوتے رہے ہیں اس کی وجہ بھی جانتی ہوں لیکن ..... کم از کم شوہر کے سامنے ان باتوں کو زبان تک نہیں لا سکتی۔ اولاد کے سلسلے میں آپ کے پاس اسی وجہ سے حاضری دی تھی کہ شاید آپ کی وجہ سے، آپ کی دعاؤں کے سبب وہ منحوس گھڑی ٹل جائے جسے میں بار بار خواب میں دیکھتی تھی۔

"میرا خیال ہے کہ آپ اب بھی کھل کر مجھے اصل بات نہیں بتا رہی ہیں۔" بشیر الدین نے کریدنے کی کوشش کی "ابھی آپ کی زبان سے کسی کے لیے کچھ ایسے الفاظ ادا ہوئے تھے جو عام حالات میں استعمال نہیں کیے جاتے۔"

"میں اس بات سے بھی انکار نہیں کر سکتی۔" اس بار زاہدہ خاتون کے لہجے میں کرب سے زیادہ شدید نفرت کی آمیزش بھی تھی "میں نے اس بدبخت اور کمین الفطرت کے لیے جو الفاظ ادا کیے شاید وہ بھی اس بدذات کی اصلیت کے مقابلے میں ناکافی ہیں۔"

"آپ کس کا ذکر کر رہی ہیں؟" بشیر الدین کی دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ اس شخص کے بارے میں جاننے کے لیے بے چین تھے جس کی وجہ سے زاہدہ خاتون ناقابل یقین حالات کا سامنا کر چکی تھیں۔ خاص طور سے خانہ خدا اور حضورؐ کی سنہری جالیوں کے نظر نہ آنے والی کہانی بشیر الدین کو ہضم نہیں ہو رہی تھی۔

زاہدہ خاتون کچھ دیر گم صم بیٹھی اپنے ذہن میں گڈمڈ ہونے والے خیالات کو سمیٹتی رہیں پھر محتاط انداز میں دوبارہ گفتگو کا آغاز کیا۔

"میں آپ سے اب کوئی بات نہیں چھپاؤں گی لیکن آپ وعدہ کریں کہ ان کا ذکر میرے شوہر سے نہیں کریں گے۔"

"آپ کی زبانی مجھے حج کے دوران پیش آنے والی جس صورت حال کا علم ہوا ہے اس کے بعد میں ایسا کوئی وعدہ نہیں کر سکتا۔" بشیر الدین نے صاف گوئی سے جواب دیا "کچھ شرعی باتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو متعلقہ افراد کے علم میں نہ لانا بھی گناہ کبیرہ کے زمرے میں شمار ہوتا ہے، اس لیے میں قبل از وقت آپ سے کوئی وعدہ کرنے سے قاصر ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں آپ کی بات سمجھ رہی ہوں اور یہ بھی جانتی ہوں کہ ان باتوں کا آپ جیسے کھرے اور نیک دل انسان کے علم میں آ جانے کے بعد اس کے کیا نتائج سامنے آ سکتے ہیں لیکن ..... حالات کے پیش نظر میں بد سے بدتر صورت حال کا مقابلہ بھی کر سکتی ہوں۔ اولاد کی نعمت سے کسی

منحوس اور پلید انسان کے گندے ہتھکنڈوں کا شکار ہونے کے بعد اب مجھے جینے کی کوئی آرزو بھی نہیں رہی۔"

بشیر الدین زاہدہ خاتون کی قلبی کیفیت کا اندازہ لگا رہے تھے۔ انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ حجرے میں کچھ دیر سوگوار خاموشی مسلط رہی پھر زاہدہ خاتون نے کہنا شروع کیا۔

"یہ بات آپ کے علم میں ہے کہ میری اور ماجد کی شادی ہم دونوں کی پسند کا نتیجہ ہے۔ میرے والدین اس شادی کے حق میں نہیں تھے اسی لیے انہوں نے میری طرف سے ہمیشہ کے لیے نظریں پھیر لی تھیں۔"

"اس کے باوجود وہ آپ کو پابندی سے یا تھوڑے تھوڑے وقفے سے معقول رقم بھیجتے رہتے تھے۔"

"وہ..... وہ رقم میرے گھر کے فرضی پتے سے ضرور آتی تھی لیکن اصلیت کچھ اور تھی۔"

"میں سمجھا نہیں۔" بشیر الدین کا تجسس بڑھنے لگا "اگر وہ رقم آپ کے والدین نہیں بھیجتے تھے تو اور کون بھیجتا تھا؟"

"وہی مکروہ شخص جس کا ذکر کرتے ہوئے اس وقت مجھے گھن محسوس ہو رہی ہے۔"

بشیر الدین دوبارہ پوری طرح متوجہ ہو گئے۔

"محبت کی شادی کرنے کے بعد مجھے اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا کہ ماجد کی قلیل تنخواہ میں، میں اس عیش و آرام کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی جو مجھے اپنے والدین کے گھر میں حاصل تھا۔" زاہدہ خاتون نے کچھ توقف کے بعد کہنا شروع کیا "میری والدہ خواتین کی میت کو غسل دینے کا کام نیکی سمجھ کر کرتی تھیں، شادی سے پیشتر میں بھی ان کے ساتھ شریک رہنے لگی، ان کا کہنا تھا کہ یہ ایسا عمل ہے جس سے خدا کے علاوہ مرحومہ کے لواحقین بھی خوش ہوتے ہیں۔ بہرحال، میں نے شادی کے بعد بھی اس نیک کام کو جاری رکھا۔"

"جی ہاں، مجھے بھی اس کا علم ہے۔ بلاشبہ کسی میت کو غسل دینا کارِ ثواب ہے لیکن آپ اس وقت خاص طور پر اس کا حوالہ کیوں دے رہی ہیں؟"

"اس لیے کہ یہی عمل ان رقومات کی وصولیابی کا سبب تھا جو فرضی طور پر میرے والدین کی طرف سے آتے تھے۔"

بشیر الدین وضاحت طلب نظروں سے زاہدہ خاتون کو دیکھنے لگے۔

"شادی کے تقریباً ڈیڑھ دو ماہ بعد ایک اجنبی عورت مجھ سے ملنے آئی تھی، اس نے مجھ سے گڑگڑا کر درخواست کی تھی کہ اگر میں اس کا کام کر دوں تو نہ صرف اس کی بگڑی بن جائے گی بلکہ وہ اس کام کے عوض مجھے کم از کم بیس ہزار خوشی سے دے گی۔" زاہدہ خاتون نے رک رک کر اپنی بات جاری رکھی "رقم کا سن کر میرے اندر لالچ پیدا ہوئی، اس نے جو کام بتایا تھا، وہ میرے لیے زیادہ دشوار بھی نہ تھا چنانچہ میں نے اسے کر دیا، کام ہو جانے کے بعد بھی مجھے پہلا منی آرڈر میرے والد کے پتے سے موصول ہوا جس پر مجھے حیرت بھی ہوئی تھی لیکن ایک بار اس کام میں ملوث ہو جانے کے بعد میرے ساتھ کچھ ایسے واقعات رونما ہوئے جس کے بعد میں ایسے دلدل میں پھنس چکی تھی جس سے فرار ممکن نہیں تھا۔"

"بیس ہزار کے عوض آپ نے کیا انجام دیا تھا؟"

"وہ چنے کے برابر کوئی چیز تھی جس پر سیندور ملا ہوا تھا۔ مجھے وہ میت کی زبان کے نیچے رکھنا تھا۔"

"جس عورت نے اس کمین میں آپ سے رابطہ کیا تھا، وہ کون تھی؟" بشیر الدین نے کھسا کر سوال کیا۔

"میں اس سے واقف نہیں تھی۔" زاہدہ خاتون لمبی سانس لے کر افسردہ لہجے میں جواب دیا "جب مجھے اصلیت کا علم ہوا تو بات میرے اختیار سے باہر ہو چکی تھی۔"

"ایسی کیا مجبوری لاحق ہو گئی تھی؟"

"وہ..... وہ دراصل ایک ہندو عورت تھی جو سفلی کا عمل کرنے والے کی داشتہ تھی۔" زاہدہ خاتون کچھ توقف سے اپنی بے جا رگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا "ہندو عورت اور سفلی کے مکروہ عمل کا سن کر میں نے اسے بڑی نفرت سے دھتکارنے کی کوشش کی تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے جانے کے لیے اٹھ گئی۔ جاتے جاتے یہ بھی کہہ گئی کہ اب میں دوبارہ بھی اس کے کام کرنے پر مجبور ہوں، دوسری صورت میں وہ کسی بات کی ذمے دار نہیں ہو گی۔" زاہدہ خاتون نے پھر طویل سانس لے کر کہنا شروع کیا "میں نے اس کی بات کو محض ایک گیدڑ بھبکی خیال کیا تھا مگر اس عورت کے جانے کے دو روز بعد رات کو میں شوہر کے ساتھ سو رہی تھی جب کسی نے مجھے منہ پر ہاتھ رکھ کر جگایا۔ وہ ایک سیاہ فام مکروہ شکل کا دراز قد اجنبی تھا جس کے جسم پر ایک لنگوٹی کے سوا کوئی لباس نہیں تھا، سر تا پا وہ غلاظتوں اور گندگی میں لتھڑا ہوا تھا۔ میرا منہ اس نے اپنی شیطانی قوتوں سے اس طرح دبا رکھا تھا کہ میں کوئی آواز نہ نکال سکی۔ ایک لمحہ وہ مجھے اپنی انگاروں کی مانند دہکتی خوفناک نظروں سے گھورتا رہا پھر منمناتی ہوئی آواز میں بولا "تو نے لکشمی کو دھتکار کر اچھا نہیں کیا۔ جو کام تو ایک بار کر چکی ہے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہی میرے اشارے پر بار بار میری اچھا (خواہش) پر کرنا ہوگا۔ کیونکہ کسی مرنے والی کے منہ میں میرا دیا ہوا جنتر رکھنے والی کوئی اور مل نہیں رہی ہے۔ اس لیے تمہیں ہی کام یہ کام کرنا ہوگا ورنہ میری راتیں سونی رہیں گی۔ میں بھیروں کا سیوک ہوں۔ میری شکتی کا اندازہ تجھے کل تک ہوجائے گا۔ ایک بات اور گانٹھ سے باندھ لے۔ اگر تو نے میرا کہا ماننے سے منہ موڑا تو تجھے ودھوا (بیوہ) ہونے میں زیادہ سمے (وقت) بھی نہ لگے گا۔ اپنی زبان بند ہی رکھنا۔''

حافظ بشیر الدین تصویر حیرت بنے زاہدہ کی بات سن رہے تھے، جس نے پھر کچھ توقف سے کہا ''ہم کمرے کو اندر سے بند کر کے سونے کے عادی ہیں۔ ایسی صورت میں وہ بد ذات کس طرح اندر آیا اور کیسے واپس چلا گیا، میں یقین سے نہیں کہہ سکتی البتہ اس کے نظروں سے اوجھل ہونے کے بعد بھی میں نے دروازے کی کنڈی اندر سے لگی ہی دیکھی تھی۔''

''پھر اس کے بعد کیا ہوا؟''

''میں خاصی دیر تک جاگتی رہی تھی، پھر اس خیال سے کہ شاید وہ سب کچھ میرا وہم ہو، دوبارہ نیند کی کیفیت سے دوچار ہوگئی مگر..... اگلی صبح ہی میری خوش فہمی کافور ہوگئی۔

بشیر الدین پوری طرح ہمہ تن گوش تھے۔ زاہدہ خاتون نے سرد آہ بھر کر دوبارہ اپنی روداد شروع کی۔

''صبح میں حسب معمول بیدار ہوئی، ایک معمولی سی کسلمندی ذہن پر ضرور طاری تھی لیکن میں روزانہ کے معمول کو انجام دینے کی خاطر میں کچن میں چلی گئی۔ میں نے ناشتا تیار کرنے کے ساتھ دوپہر کو کھانے کے لیے ایک ہانڈی بھی چولہے پر چڑھا دی۔ جتنی دیر میں میں نے ناشتا میز پر رکھا، میرے شوہر بھی تیار ہو کر آ گئے۔ وہ ہمیشہ سے بہت سکون اور آرام سے ناشتا کرنے کے عادی ہیں۔ اس روز بھی وہ ناشتے کے دوران باہمی دلچسپی کی باتیں کرتے رہے۔ ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد میں اپنی عادت کے مطابق انہیں دروازے تک چھوڑنے گئی۔ اتفاق سے دروازے پر بھی ایک موضوع چھڑ گیا جس میں کچھ اور دیر ہوگئی۔ انہیں وقت کی تنگی کا احساس ہوا تو وہ بھی عجلت میں قدم اٹھاتے بس کے اڈے کی طرف روانہ ہوگئے۔ میں دروازے پر کھڑی انہیں دیکھ رہی تھی کہ مجھے اچانک ہانڈی کے جل جانے کا خدشہ محسوس ہوا۔ میں تیزی سے پلٹ کر باورچی خانے کی جانب لپکی لیکن وہاں جو منظر میری نظروں نے دیکھا وہ بھی اس قدر غیر متوقع اور ہولناک تھا کہ میں بے اختیار چیخنے لگی۔''

زاہدہ خاتون نے پھر توقف اختیار کیا اس کے بعد گہری سانس لے کر بولیں ''وہ منظر میں نے نیند سے بیدار ہو کر نہیں دیکھا تھا، اس وقت میں پورے ہوش و حواس میں تھی۔''

''ایسی کیا بات یا چیز نظر آ گئی تھی آپ کو؟'' بشیر الدین نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

''میں جب کچن کے اندر گئی تو ہانڈی ایک طرف اوندھی پڑی تھی۔ دیگر سارا سامان بھی ادھر ادھر بکھرا پڑا تھا اور..... اور دیواروں پر ہر طرف خون ہی خون نظر آ رہا تھا۔ میں چیختی ہوئی صحن میں آئی تو میرے وجود کو ایک اور جھٹکا لگا۔ جس خاتون نے مجھے پہلی بار بیس ہزار کی لاج دی تھی اور اپنی مظلومیت کا اظہار کیا تھا وہ میرے سامنے کھڑی معنی خیز انداز میں مسکرا رہی تھی۔ میں ہانڈی جلنے کے خیال سے دروازہ بند کیے بغیر آ گئی تھی اس لیے ممکن ہے کہ وہ میری اس غفلت سے فائدہ اٹھا کر اندر آ گئی ہو۔ بہر حال، اسے دیکھ کر جب مجھے رات کی ہولناک صورت حال کا خیال آیا تو میں نے اسے نفرت سے مخاطب کیا ''تم نے دوبارہ میرے گھر میں بغیر اجازت کیسے قدم رکھا؟''

''تم شاید بھول رہی ہو کہ ابھی تم رسوئی گھر سے چیختی چلاتی کیوں بھاگی تھیں؟'' اس نے بڑے ڈھیٹ لہجے میں مسکرا کر کہا پھر بڑے اطمینان سے بولی ''ڈرو مت، تم نے جو بھی دیکھا وہ کسی ایسی مہان شکتی کا چمتکار ہے جس کو تم سپنا سمجھ کر بھول گئی تھیں۔''

''تم..... تم.....'' مجھے رات کی بات یاد آئی تو اندر ہی اندر لرز اٹھی۔ میری رگوں میں خون کی گردش بھی تیز ہونے لگی۔

''میرا نام لکشمی ہے۔'' وہ کولہے پر ہاتھ رکھ کر مسکرائی ''اب یہ نہ پوچھنا کہ میرا اور شمبھو کا سمبندھ (رشتہ) کیا ہے صرف اتنا جان لو کہ میں اس کی داسی ہوں، اس کی آگیا کے پالن میں کبھی چوں چرا نہیں کرتی۔''

''مجھے ابھی کچن میں جو بھیانک منظر نظر آیا تھا وہ.....''

''میں نے کہا نا کہ وہ شمبھو کی شکتی کا چمتکار تھا۔'' اس نے میری بے بسی کا مذاق اڑاتے ہوئے جواب دیا ''تمہیں میری بات کا وشواس (یقین) نہیں آتا تو دوبارہ جا کر رسوئی میں جھانک لو۔ سب کچھ ٹھیک ہی ہوگا۔''

زاہدہ نے سمٹ کر کہا ''اس کے لہجے کے اعتماد نے مجھے تصدیق کرنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے واپس جا کر ڈرتے ڈرتے اندر جھانکا تو سب کچھ ویسا ہی تھا جیسے صبح تھا۔ یہ ایسا

حیران کن لمحہ تھا کہ میں کچھ دیر پھٹی پھٹی نظروں سے باورچی خانے کے در و دیوار کو دیکھتی رہی جہاں چند لمحہ قبل تازے خون کی لکیریں اپنا جال بن رہی تھیں۔ میں ششدر رہ گئی پھر میں نے گھر میں لکشمی نامی عورت کی موجودگی کے خیال سے پلٹ کر دیکھا تو وہ مجھے کہیں نظر نہ آئی۔ اس وقت میرے دل کی کیا کیفیت تھی! آپ اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ میں بیرونی دروازے کو کنڈی لگا کر واپس آ گئی۔ بستر پر لیٹی نہ جانے کب تک ان غیر یقینی اور پراسرار صورت حال پر غور کرتی رہی پھر حالات کے پیش نظر میں یہ سوچنے پر مجبور ہوگئی کہ..... سوائے نادیدہ گندی قوتوں کے اشارے پر خاموشی سے عمل کرنے کے میرے پاس مفر کا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔''

حجرے میں خاصی دیر گہری خاموشی طاری رہی پھر بشیر الدین نے ہونٹ چباتے ہوئے سوال کیا۔

''کیا اب بھی تم اسی شیطان مردود کے ناپاک کاموں کو انجام دے رہی ہو؟''

''جی نہیں، حج کا پروگرام طے کرنے کے بعد میں نے لکشمی سے صاف انکار کر دیا تھا۔''

''اور اس کے بعد تمہیں کوئی خطرہ پیش نہیں آیا؟''

''ایسا ہی سمجھ لیں۔'' زاہدہ خاتون نے کسمسا کر رندھی ہوئی آواز میں جواب دیا ''مجھے صرف کسی نومولود کے ہولناک انجام سے دوچار ہونے کی دھمکی دی گئی تھی۔ اب آپ کے علم میں بھی سارے حالات آ چکے ہیں۔ میں بھی پہلی ملاقات میں ان ہی خدشات کا اظہار کیا تھا۔''

''بی بی! برا نہ ماننا۔'' بشیر الدین نے کھرے لہجے میں کہا۔ ''جو کچھ ہوا وہ تمہاری نیت اور اعمال کا نتیجہ ہے۔ جو کام تم انجام دیتی رہیں وہ مشرکانہ عمل تھا جو خدا کو پسند نہیں آیا۔''

''اب آپ میرے لیے کیا کر سکتے ہیں؟'' زاہدہ خاتون نے التجائی نظروں سے دریافت کیا۔

''میں فی الحال تم سے ایک ہی درخواست کروں گا۔ تم جتنا جلدی ممکن ہو سکے ماجد فاروقی صاحب کو میرے پاس بھیج دو۔''

زاہدہ خاتون حافظ بشیر الدین کا خشک اور سرد لہجہ بھانپ کر کچھ دیر سر جھکائے بیٹھی رہی پھر خاموشی سے اٹھی اور تھکے تھکے انداز میں حجرے سے باہر چلی گئی۔

☆☆☆

ماجد فاروقی حافظ بشیر الدین کے پرانے عقیدت مندوں میں سے تھے۔ بیوی کی زبانی بلاوے کا سن کر فوراً ہی ان کی خدمت میں حاضر ہوگئے۔ اس وقت حجرے میں بشیر الدین سوا کوئی اور نہیں تھا۔

''فاروقی صاحب، میں نے اس وقت آپ کو ایک خاص وجہ سے زحمت دی ہے۔''

علم غیب کی دو اقسام ہیں 1 ذاتی علم الغیب اور 2 عطائی علم الغیب یعنی عطا فرمایا ہوا۔

1۔ ذاتی علم الغیب مالک روز و جزا و سزا۔ اللہ رب الجلیل کی ذات کے سوا کسی کو بھی نہیں۔ یعنی ذات باری تعالیٰ کے علاوہ کوئی بھی عالم الغیب نہیں۔

2۔ عطائی علم الغیب کے معنی ہیں وہ غیب کا علم جو اللہ رب العزت کی جانب سے کسی کو عطا کیا گیا ہو۔

اللہ تعالیٰ کی جانب سے اپنے خاص خاص بندوں کو تین طریقوں سے کچھ خاص باتیں بتا دی جاتی ہیں۔

1) وحی کے ذریعے 2) الہام کے ذریعے اور 3) کشف کے ذریعے

1۔ وحی: صرف نبیوں اور پیغمبروں کے لیے مخصوص ہے۔ وحی کے معنی ہیں وہ مخصوص علم جو اللہ تبارک و تعالیٰ کی جانب سے فرشتوں کے ذریعے نبی یا پیغمبر تک پہنچایا جائے جیسا کہ سورۃ ھود کی آیت نمبر۔ 49

''یہ خبریں غیب کی خبروں میں سے ہیں جن کی وحی ہم تیری جانب کرتے ہیں۔ انہیں اس سے پہلے نہ تو جانتا تھا نہ تیری قوم'' O

2۔ الہام: اللہ تعالیٰ کی جانب سے اپنے کسی خاص نیک بندے کے دل پر کوئی بات ظاہر کیے جانے کو الہام کہا جاتا ہے۔

3۔ کشف: کے معنی ہیں پردہ اٹھا دیا جانا۔ یعنی جب اللہ تعالیٰ کی جانب سے کسی نبی یا ولی اللہ کو کسی بات کے بارے میں آگاہی دینا مقصود ہو تو اللہ تعالیٰ اس کی آنکھوں کے سامنے سے پردہ اٹھا دیتا ہے تو وہ اسرار اس پر آشکارا ہو جاتا ہے۔

مرسلہ: بحرش احمد، کراچی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''آپ شرمندہ کر رہے ہیں محترم، آپ کا بلاوا بھی میرے لیے کسی سعادت سے کم نہیں ہے۔'' ماجد فاروقی نے انکساری سے کہا ''فرمائیے، کیا خدمت ہے میرے لائق؟''

''آپ کی زوجہ ابھی میرے پاس تشریف لائی تھیں، میں نے اسی ضمن میں آپ کو بلایا ہے۔''

حافظ بشیرالدین نے سنبھل کر کہا پھر سر جھکا کر، نہایت سادگی سے زاہدہ خاتون کی پہلی آمد کے بعد کی تمام تفصیل دہراتے ہوئے چلے گئے۔ ماجد فاروقی ان کی باتوں کو غور سے سنتے رہے، ان کے چہرے کی بار بار بدلتی کیفیت اس بات کی غماز تھی کہ وہ معاملے کی نزاکت کو پوری طرح سمجھ رہے تھے۔ کبھی ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل جاتیں، کبھی وہ شرمندگی سے سر جھکا لیتے اور پہلو بدلنے لگتے۔ بشیرالدین پوری کہانی دہرا چکے تو ماجد فاروقی نے نہایت ادب سے پوچھا۔

''میرے لیے اب کیا حکم ہے؟''

''میرا ذاتی خیال ہے کہ آپ کی زوجہ نے دیدہ و دانستہ جو قدم اٹھایا اور اس پر عمل کرنے پر آمادہ بھی رہیں، اس کے بعد ایک مسلمان کا ان کو اپنے نکاح میں رکھنا مناسب نہیں ہے۔ آگے آپ خود سمجھ دار ہیں۔ میں نے قرآن و سنت کی روشنی میں اپنا فرض سمجھ کر پہلی فرصت میں آپ کو سب کچھ بتانا ضروری خیال کیا تھا۔''

''میں نے بات کی تہ تک پہنچ جانے کے بعد خود بھی یہی سوچا ہے۔'' ماجد فاروقی نے ملول ہو کر اٹھتے ہوئے کہا پھر کسی جواب کا انتظار کیے بغیر حجرے سے باہر آ گئے۔ سیدھے گھر پہنچے تو زاہدہ خاتون سامنے ہی دالان میں بچھے تخت پر سر جھکائے بیٹھی تھیں۔ ماجد دور کھڑے اپنی شریک حیات کو بغور دیکھتے رہے، وہ تمام نامساعد حالات کے باوجود زاہدہ خاتون کو دلہن بنا کر لائے تھے۔ دل سے اسے چاہا تھا لیکن آج قدرت ایک ایسے موڑ پر لے آئی جہاں انہیں درست سمت میں اقدام اٹھانے کے لیے ایک اہم فیصلہ کرنا تھا۔ ایسا فیصلہ جو ایک مسلمان کا فرض بھی تھا اور ایمان بھی۔

کچھ دیر وہ دروازے کے قریب کھڑے اپنے آباد گھر کے در و دیوار پر نظر ڈالتے رہے، بیوی کے جھکے سر کا احساس ڈستا رہا، یہ بھی سوچتے رہے کہ اس آباد گھر کے سونا ہو جانے کے بعد ان کی زندگی میں باقی کیا رہ جائے گا؟ مگر ان تمام باتوں کے باوجود ایمان کی دوتی ان کے ذہن میں پوری آب و تاب سے جگمگاتی رہی۔ تھکے تھکے قدم اٹھاتے وہ زاہدہ خاتون کے قریب جا کر کھڑے ہو گئے۔ خود کو سنبھال کر پوچھا۔

''آپ ابھی حافظ بشیرالدین کے پاس گئی تھیں؟''

''جی ہاں......'' زاہدہ خاتون نے مضمحل آواز میں جواب دیا۔

''اس سے پہلے بھی ایک دفعہ جا چکی ہیں۔''

''جی، میں نے حضرت کو شروع سے اب تک جو باتیں بتائی ہیں وہ حرف بہ حرف درست ہیں۔ انہوں نے آپ سے غلط بیانی نہیں کی ہو گی۔'' زاہدہ خاتون نے تھکے تھکے لہجے میں کہا پھر نظر اٹھا کر شوہر کے چہرے پر لکھی تحریروں کو پڑھتے ہوئے بولیں ''حضرت نے اب آپ کو کیا حکم دیا ہے؟''

''کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ آپ نے مجھے پیش آنے والے حالات سے روز اول ہی آگاہ کیوں نہیں کیا؟''

''میں جس گہری دلدل میں پھنس چکی تھی اس میں آپ کو بھی شامل کرنا میں نے مناسب نہیں سمجھا تھا۔ آپ اس جذبے کو جو چاہیں نام دے لیں۔''

''حج کے دوران حرم شریف کے اندر تو آپ زبان کھول سکتی تھیں؟'' ماجد نے شکوہ کیا۔

''وہ میری غلطی ضرور تھی لیکن میں نے اس مقدس مقام پر بھی کفر کی بات چھیڑنی مناسب نہیں سمجھی۔''

''جانتی ہیں بشیرالدین صاحب نے مجھ سے کیا کہا ہے؟''

''آپ بلا تکلف ان کے حکم پر عمل کریں۔'' زاہدہ خاتون نے شوہر کے چہرے پر ایک نظر ڈال کر گردن جھکا لی۔

''کسی مشرکہ سے نکاح کرنا یا کفر کی طرف نکاح میں رکھنا، ایک مسلمان کے لیے جائز نہیں اس لیے میں آپ کو بہ ہوش و حواس خمسہ طلاق دیتا ہوں۔'' ماجد فاروقی نے طلاق کے لفظ کو تین بار رک رک کر دہرایا پھر بولے ''آپ اگر چاہیں تو عدت کے دن یہاں رہ کر بھی گزار سکتی ہیں اس لیے کہ مقدس کتابوں میں......''

''میں آپ کا فیصلہ سن لینے کے بعد اب یہاں ایک رات بھی گزارنا گوارا نہیں کروں گی۔'' زاہدہ خاتون نے قریب رکھا برقع اٹھا لیا۔ بھرائی ہوئی آواز میں بات جاری رکھی ''میں اس گھر سے اپنی ذات کے سوا کوئی اور شے بھی نہیں لے جاؤں گی البتہ...... ایک درخواست کروں گی۔ آپ اگر ہو سکے تو مجھے کچھ بھی سمجھ کر معاف ضرور کر دیں

اور...... دوسرا گھر آباد کر لیں۔'' پھر وہ شوہر کا جواب سننے کے لیے وہاں نہیں رکیں، لمبے لمبے قدم اٹھاتے ہوئے صحن عبور کیا اور اسی دروازے سے واپس لوٹ گئیں جس سے کبھی وہ دلہن کا سرخ جوڑا پہن کر بڑے ارمانوں سے داخل ہوئی تھیں۔

ماجد فاروقی کھلے ہوئے دروازے کو دل مضبوط کر کے بہت دیر تک دیکھتے رہے۔

☆☆☆

ایس پی کے کمرے میں اس وقت تھانہ انچارج رفیق بیٹھے تھے۔

''پوسٹ مارٹم کی رپورٹ اور جس اس وقت زاہدہ خاتون کے اعترافات کا ذکر کیا ہے وہ میڈیکل سائنس میں نہیں ملتے۔'' ڈاکٹر علوی نے سنجیدگی سے اپنی رائے کا اظہار کیا ''بہرحال، اس قسم کے محیرالعقول واقعات میں بھی سن چکا ہوں۔ آپ نے زاہدہ خاتون کے خلاف کیا ایکشن لیا ہے؟''

''قانون کے پیش نظر مجھے بھی وہی دشواری نظر آ رہی ہے جو آپ کو میڈیکل سائنس کے حوالے سے ہے۔'' چوہدری نے کسمسا کر کہا ''زاہدہ خاتون نے شوہر کے گھر سے رخصت ہونے کے بعد اپنی ایک سہیلی کے گھر قیام کیا ہے۔ فی الحال میں نے ان کو پابند کر دیا ہے کہ مجھے یا متعلقہ تھانے کو قبل از وقت مطلع کیے بغیر وہ کہیں دوسری جگہ منتقل نہ ہوں۔'' زاہدہ خاتون نے جس ولد الحرام شمبھو کا نام لیا، میں اس سے تو واقف نہیں ہوں لیکن جو حلیہ بیان کیا گیا ہے وہ سوائے چہرے کی رنگت کے ایک دو ایسے لوگوں پر فٹ بیٹھتا ہے جو میری اطلاع کے مطابق گندا عمل شمل کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے اس کا نام کچھ اور ہو، چہرہ چھپانے کی خاطر وہ الٹے توے کی کالک بھی جسم پر مل لیتا ہو مگر میں اسے قبر سے بھی برآمد کرنے میں دیر نہیں لگاؤں گا۔ ایک بار وہ ہتھے لگ جائے تو میں اس سے سارا کھایا پیا بھی اگلوا لوں گا۔''

''اوکے، آئی وش یو گڈ لک!'' مگر ہر اقدام کے لیے احتیاط شرط ہے اور...... یہ خبریں بھی میڈیا تک نہیں پہنچنی چاہئیں۔'' ایس پی نے سنجیدگی سے کہا پھر ضروری ہدایات دینے کے بعد اسے رخصت کر دیا۔

☆☆☆

دراز قد کا ایک دبلا پتلا شخص اس وقت تھانے کے ایک ایسے مخصوص کمرے میں بڑے سکون سے بیٹھا تھا جہاں کسی ڈھیٹ مجرم کی زبان کھلوانے کے لیے ساری اذیت ناک چیزیں موجود تھیں۔

تھانے دار، رفیق چودھری اسے کچھ دیر قہر آلود نظروں سے گھورتا رہا۔ کمرے میں اس کے اور دراز قد آدمی کے علاوہ دو سادہ لباس والے افراد بھی موجود تھے جو صورت شکل سے جلاد ہی نظر آ رہے تھے۔

''تمہارا اصلی نام کیا ہے؟'' رفیق چودھری نے مطلوبہ شخص کی اصلیت جاننے کی خاطر بے حد سرد اور سفاک لہجے میں سوال کیا۔

''نام میں کیا دھرا ہے صاحب، آپ کام کی بات کرو۔'' دراز قد والے نے بے پروائی سے جواب دیا، اس کی نگاہیں اس وقت بھی دہکتے انگاروں کی طرح پوری روشن تھیں۔ وہ اذیت پہنچانے والے سامان کو دیکھ کر ذرا بھی متاثر نہیں ہوا تھا۔

''شمبھو کون ہے؟''

''آپ کا من چاہے تو اس سیوک ہی کو شمبھو سمجھ لیں پرنتو...... دو تین نام رکھنا کوئی جرم بھی نہیں ہے۔''

''زاہدہ فاروقی کا نام سنا ہے؟'' رفیق چودھری کے تیور بہ دستور خطرناک نظر آ رہے تھے۔

دراز قد، جو شمبھو کے سوا کوئی اور نہیں تھا، مسکرا کر بولا ''اس مورکھ نے میرا کہا نہ مان کر خود اپنے پیروں پر کلہاڑی مار لی تو میں کیا کر سکتا ہوں۔''

''راحیلہ خاتون کے سلسلے میں کیا کہو گے؟'' رفیق چودھری نے دھمکتے لہجے میں اگلا سوال کیا۔

''زیادہ گرمی نہ کھاؤ صاحب! شمبھو سوائے بھوانی کے اور کسی سے نہیں ڈرتا۔'' اس نے بدستور پرسکون انداز میں جواب دیا ''میں نے اس سندر ناری کو وچن دیا تھا کہ سیٹھ ہاشم کا انت (خاتمہ، موت) بھی اسی طرح ہو گا جس انوسار اس نے چاہا تھا پر...... اس کام کو پورا کرنے کے کارن کسی ناری کے دل کی ضرورت تھی۔'' شمبھو نے اس بار اپنے مکروہ ہونٹوں پر زبان لپلپاتے ہوئے کہا ''وہ میرے کہے پر مرگھٹ تک آ گئی تو مجھے اس کے شریر کا سواد بھی مل گیا اور دل بھی...... اس کے بعد کیا ہوا؟ یہ تم بھی جانتے ہو گے۔''

''باسٹرڈ!'' رفیق چودھری غضب ناک ہو گیا، اس نے یکلخت اٹھ کر الٹے ہاتھ کا ایک بھرپور تھپڑ شمبھو کو مارا تو وہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بھی سنبھل کر بیٹھ گیا۔ سرسراتی آواز میں گال سہلاتے ہوئے بولا۔

"تم نے شمبھو کا اپمان کر کے اچھا نہیں کیا صاحب! جس دلدل میں تم نے پیر دھر دیا ہے اس کی تھاہ بھوانی اور اس کے سیوکوں کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔"

"تمہارا واسطہ بھی آج رفیق چودھری سے پہلی بار پڑا ہے جس کا نام سن کر تم جیسے حرامیوں کی بدروح بھی پناہ مانگتی ہے۔ تمہاری جوانی اور بھوانی کو دونوں کو پچھلے راستے سے نکال دوں گا۔"

اس کے بعد پیشتر اس کے کہ شمبھو کوئی جواب دیتا، عقب میں کھڑے دونوں جلاد نما فرد رفیق چودھری کے اشارے پر اس پر ٹوٹ پڑے۔ زمین پر گرا کر روئی کی طرح اس کی دھنائی کرتے رہے۔ شمبھو سر کو دونوں ہاتھوں میں چھپا کر خاموشی سے مار کھاتا رہا، جب وہ تھک کر رکے تو رفیق پھر غضبناک لہجے میں دہاڑا۔

"اس کالے سور کی ناجائز اولاد کو لے جا کر حوالات میں بند کر دو۔ کل اس کی شناخت پریڈ کی رسمی کارروائی پوری ہو جائے تو پھر اس..... اور اس کی بھوانی بھی دیکھ لوں گا۔"

"ایک بات کہوں صاحب! اگر تم اجازت دو؟" شمبھو نے لیٹے ہی لیٹے بڑے عجیب انداز میں کہا۔

"جو بھی کہنا کتوں کی طرح دم ہلا کر کہنا۔"

"کتا تو منش کا سب سے اچھا متر ہوتا ہے صاحب، پر تم تو..... اس کی دم پر پاؤں پڑ جائے تو وہ بھی پلٹ کر کاٹ لیتا ہے۔ میرا نام تو پھر شمبھو ہے۔"

"یہی بتانا چاہتا تھا؟" رفیق چودھری نے اس بار سیدھے بوٹ کی ٹھوکر ماری تو وہ کراہ کر بولا۔

"یہ تو تمہاری بات کا جواب تھا صاحب! میں تو یہ بنتی کرنا چاہتا تھا کہ کل کا انتظار مت کرو۔ اپنے من کی ساری بھڑاس آج ڈھلنے سے پہلے نکال ڈالو۔ رات بھیگنے لگی تو کھیل کھراب ہو جائے گا۔ اگلی صبح کون دیکھے گا؟ کون وشواس سے کہہ سکتا ہے، میرا کہا مان لو صاحب!"

جواب میں دو چار بھرپور ٹھوکریں شمبھو کے جسم کے مختلف حصوں پر لگیں تو وہ پھر کچھ نہیں بولا البتہ اس کی نگاہوں میں شعلوں کی لپٹ کچھ اور تیز ہو گئی۔ پھر شمبھو کو رفیق چودھری کی ہدایت کے مطابق ہتھکڑی اور بیڑی پہنا دیے گئے۔ اس کے منہ کو پلاسٹر ٹیپ سے اس طرح جکڑ دیا گیا کہ وہ اپنے ہونٹوں کو جنبش دینے کے قابل بھی نہیں رہا۔ رفیق چودھری نے اسے اپنی نگرانی میں حوالات میں بند کرنے کے بعد اس کو آہنی سلاخوں کے ساتھ کھڑا کرا کے آہنی زنجیر سے بندھوا دیا کہ..... اب شمبھو نہ بیٹھ سکتا تھا نہ گردن جھکا کر فرش پر نظر ڈال سکتا تھا۔ پھر بھی اس کے چہرے سے اضطراب نہیں جھلک رہا تھا۔ وہ بار بار رفیق چودھری کو اس طرح گھورنے لگتا جیسے اس کی حماقتوں پر اندر ہی اندر مسکرا رہا ہو۔ تمام احتیاطی تدابیر سے مطمئن ہونے کے بعد ایس ایچ او نے اپنے خاص آدمیوں کو رات بھر چوکس رہنے کی تاکید کی پھر ان دو افراد کو جو تار چ روم میں ساتھ ایک جانب لے جا کر بولا۔

"ہم نے جس حرام زادے کو پکڑا ہے، وہ شیطانی قوتوں کا مالک ہے، تم دونوں دور دور رہ کر اس کی حرکتوں پر نگاہ رکھنا۔ اگر کسی بھی قسم کا خدشہ لاحق ہو تو بے دریغ گولی مار دینا۔ اس کے بعد خس کم جہاں پاک بھی ہو جائے گا۔ ایک اہم بات اور..... اس ولد الحرام کے چہرے کے دو تین کلوز اپ بھی اتار لو۔"

"آپ مطمئن رہیں جناب! ہم کسی غفلت کا مظاہرہ نہیں کریں گے۔"

رفیق چودھری ان کو ہدایت دینے کے بعد گھر جانے کے ارادے سے باہر آیا پھر کسی خیال سے وہ بھی اسی تھانے کے ریسٹ روم میں رات گزارنے کے ارادے سے رک گیا لیکن..... دوسری صبح سب ہی کے لیے قیامت انگیز ثابت ہوئی، صبح جو عملہ ڈیوٹی پر آیا وہ بھی صورت حال دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گیا۔ سب ہی چہرے سوالیہ نشان بن کر رہ گئے تھے۔

رفیق چودھری جس ریوالونگ چیئر پر بیٹھا تھا اس پر مردہ حالت میں ملا، اس کے منہ کے علاوہ ناک اور کان سے بھی خون رس رہا تھا۔ حوالات پر پہرہ دینے والا عملہ بے ہوش ملا تھا۔ دونوں سادہ لباس والے ہوش میں آنے کے بعد بھی کوئی جواب نہ دے سکے، وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھے تھے۔ واہی تباہی بک رہے تھے۔ لاک اپ کا دروازہ بدستور باہر سے مقفل پایا گیا، اندر ہتھکڑی اور بیڑیوں کے علاوہ، وہ زنجیر جس سے شمبھو کو سلاخوں کے ساتھ باندھا گیا تھا، اسی حالت میں ملی تھی البتہ..... شمبھو کا کوئی نام و نشان تک نظر نہیں آ رہا تھا۔ ایس پی نے آ کر جائزہ لیا تو وہ بھی ہونٹ چبا کر رہ گیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk